NUARY 1986

Rs. 6-00

آندھرا پردیش دیکھنے سے پہلے ہم سے ملئے

ہمارے پابندی کے ساتھ منظم کردہ ٹورس سے استفادہ کیجئے، ہمارے ساتھ اطمینان سے سفر کیجئے۔ ہمارے گیسٹ ہاؤزوں میں شب گزاریئے۔ ہمارے ساتھ مقامات دیکھنا اتنا سستا ہے کہ خرچ کا خیال آپ کی تعطیل کو تباہ نہیں کرے گا۔

SV02

سیاحت	دیکھنے کے مقامات	دن
ترو ملا	ترو ملا، ترو پتی، منگا پورم، چندرا گری کالہستی وغیرہ	~~ہر جمعہ~~
نترالیم	نترالیم، عالمپور، پلا لا مری	ہر شنبہ
سری سیلم	سری سیلم، پاتالا گنگا، سکمارم ہائیڈرو الیکٹریکل پروجکٹ	ہر شنبہ
ناگر جونا ساگر	ناگر جونا ساگر۔ ناگر جونا کنڈہ ویو پوائنٹ۔ ایتھی پوتھلا آبشار	ہر دوسرے دن بشمول شنبہ و یکشنبہ
ورنگل	یادگیری گٹہ، کولن پاک، پمبرتی ہنمکنڈہ۔ ورنگل	ہر شنبہ
حیدرآباد	برلا مندر، گولکنڈہ فورٹ، گنڈی پیٹ سالار جنگ میوزیم، زو، چار مینار، مکہ مسجد وغیرہ	ہر روز پورا دن اور آدھا دن

مزید تفصیلات اور بکنگ کے لیے براہ مہربانی ربط پیدا کیجئے:

آندھرا پردیش ٹراول اینڈ ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ

3-6-369 B 3/3 ڈائمنڈ ہاؤس حمایت نگر

حیدرآباد 500029 فون: 77192 / 237360

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

جلد ۱۹ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۸۶ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کتابت: محمد عبدالرؤف۔ مسعود انور
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

قیمت فی پرچہ ۶ روپے
زرِ سالانہ: ۴۰ روپے
بیرونِ ہند سے: ۱۲۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱
فون آفس: 557716 رہائش: 521064

اِس تھیلے میں

نہیں آتی تو یاد اُن کی (یادِ رفتگاں)

مالِ مفت (انشائیے)

..... سلسلہ جاری ہے

کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

نثری پیروڈی

بال کی کھال (تبصرہ)

چھوٹ (منظومات)

فکر تونسوی

ایک پاکستانی اخبار کے نام

محترمی ایڈیٹر صاحب!

میں یہ خط آپ کو اس لیے تحریر کر رہا ہوں کیوں کہ یہ لفافہ مجبوراً میرے ہاتھ آ گیا ہے۔ میں نے کل ایک دکان سے گاجریں خریدیں۔ تو دکاندار نے کہا "جناب! میرے پاس ریزگاری نہیں ہے۔ جو آپ کو لوٹا سکوں۔ اس لیے براہ کرم اس ریزگاری کے بدلے میں کچھ مزید گاجریں لے جائیے۔"

میں نے ہنس کر کہا "ارے بھائی! ریزگاری تو خود سرکار کے پاس نہیں ہے، تمہارے پاس کہاں سے ہوگی۔ شکر کرو، تمہارے پاس ریزگاری نہیں ہے، مگر کم از کم گاجریں تو ہیں۔ سرکار کے پاس تو گاجریں تک نہیں ہیں۔ اچھا، اگر میں مزید گاجریں نہ خریدوں۔ تو اس کے علاوہ تمہارے پاس اور کیا کچھ ہے؟"

وہ بولا "میرے پاس ان لینڈ لیٹر ہیں۔ گاجریں مت لیجیے، ایک ان لینڈ لیٹر لے جائیے۔ کسی کو خط لکھ دیجیے گا۔ کیا آپ کے پاس کوئی محبوبہ ہے یا اس کی شادی ہو گئی ہے۔" میں صورتِ حالات کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ گزشتہ دنوں میں ایک مقامی پوسٹ آفس میں گیا۔ اور عرض کیا "مجھے دو لفافے دے دیجیے۔"

پوسٹ ماسٹر بولا۔ "جناب! لفافے سبھی فروخت ہو گئے۔"

"فروخت ہو گئے؟ کیا مطلب؟"

"جی صبح ہی صبح کچھ متوک گاہک آج کل آ جاتے ہیں، کارڈ، لفافے سبھی خرید لے جاتے ہیں۔" میں نے سوچا یہ گاجریں

بیچنے والا بھی اُن معتوک کاہکوں میں سے ہوگا۔

بہرکیف ایڈیٹر صاحب! بیروزگاری کے کرائسس سے فائدہ اُٹھا کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ مجھ کو اس لیے نہیں لکھا کیوں کہ ہر محبوبہ کی طرح بے وفا نکلی۔ اور ویسے بھی آپ کو اس لیے خط لکھ رہا ہوں۔ کہ خط لکھنے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی کام نہیں رہا۔ کام تو بہت ہیں۔ لیکن . . . مثلاً کل راہ چلتے چلتے ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے "بھائی صاحب! کیا آپ میرا ایک کام کریں گے؟"

"میں نے کہا فرمائیے!"

"میری چارپائی کا ایک پایہ اُکھڑ گیا ہے۔ چل کر اُسے ٹھیک کر دیجئے۔"

میں نے کہا "سوری! میں ایک دانشور ہوں بڑھئی نہیں ہوں۔"

وہ میری طرف اس کٹیلی نگاہ سے دیکھ کر چلا گیا۔ جیسے اُسے یہ سوچ کر بے حد افسوس ہو رہا ہو۔ کہ ایسی اُدھڑ کھاڑ شکل وصورت والے بھی اب دانشور ہونے لگے۔ تو تہذیب کا مستقبل خطرے میں ہے۔

ایڈیٹر صاحب! ایک افسوس اُسے ہوا، ایک افسوس مجھے بھی ہو رہا ہے۔ کہ ہندوستان اور پاکستان کے لیڈر تو خیر بطور بظاہر خیرسگالی ہی سہی، ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ چند شاعر اور ادیب بھی حتیٰ کہ نقاد تک ایک دوسرے سے کبھی دہلی میں اور کبھی لاہور میں ایک دوسرے سے ملاقی ہوتے رہتے ہیں۔ اور پھر غیر ضروری سفرنامے لکھتے، ڈرامے اور سٹیج پر ایک دوسرے سے دروغ بیانیاں کر کے قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔ مگر میں یہ خط یہاں کے عوام کی طرف سے وہاں کے عوام کی ناقص معلومات میں بہتری لانے کے لیے لکھ رہا ہوں۔

مثلاً گزشتہ دنوں پاکستان سے ایک عورت یہاں تشریف لائی وہ بھی اپنے آپ کو انٹلکچول کہتی تھی۔ (اللہ جانے) اور مجھ سے بڑی حیرت سے پوچھنے لگی "کیا آپ کے ملک میں عورتیں ہی رہتی ہیں؟"

جی چاہا۔ بے اختیار سیدھا سا جواب دوں۔ کہ مشرقِ وسطیٰ سے امیر سوداگر اس ملک میں عورتیں ہی خریدنے تو آتے ہیں۔ گنّے اور گاجریں خریدنے تو نہیں آتے۔ تاکہ کچھ لمحوں تک چوس چاس کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں۔

لیکن پھر سوچا، ممکن ہے اس عورت نے مذاق کیا ہو۔ کیوں کہ عرب سوداگر پاکستان کی عورتوں کو بھی گنڈیری سمجھ کر خرید لے جاتے ہوں گے۔ اس پر مجھے ہنسنا چاہیئے تھا۔ مگر ایسے موقعے پہ ہنسنے کو رذوقی سمجھا، مجھے رونا چاہیئے تھا مگر اردو زبان کے ساتھ بدسلیقگی کے باعث میرے آنسوؤں کا پورا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ اور جب تبسم نہ ہو، اشک فشانی نہ ہو صرف دو بے مزہ کام باقی رہ جاتے ہیں، یعنی یادِ خدا کرو یا کسی دوست کو خط لکھو۔

چنانچہ آپ کے نام اس خط کے ذریعہ پاکستانی عوام (عورت اور مرد دونوں) کی ناقص معلومات میں کچھ اچھائی پیدا کرنے کے لیے یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستان میں نہ صرف عورت موجود ہے بلکہ پورے معاشرے پر اس کا اقتدار ہے۔ اگرچہ وہ صرف لوک لاج کے مارے اپنے آپ کو پوری اردھنگنی کہتی ہے۔ لیکن یہ کافی مشکل مسئلہ ہے اس لیے ہندوستانی خاوند جب اپنی بیوی کو پکارتا ہے تو آواز دیتا ہے۔" میں نے کہا جی!"

گویا یہ اردھنگنی کا آسان ترجمہ ہے۔ ورنہ اگر خاوند ترجمے کی بجائے بیوی کو اور بجٹل حساب سے پکارے۔ "اردھنگنی جی!" تو کچن سے جواب آئے گا۔ "یہاں کوئی اردھنگنی نہیں رہتی۔ ساتھ والے گھر سے جا کر پوچھو۔"

مگر کچھ خاوند ایسے ہیں۔ جو ہندوستانی اناج کھاتے ہیں۔ مگر اس اناج کے معاشرے سے دور ہٹ کر رہتے ہیں۔

عورتیں حیران ہیں۔ کہ اناج تو انہیں ہضم ہو جاتا ہے۔ بیوی بچے کیوں ہضم نہیں ہوتی۔ معاشرہ ان میں قبض اور پیچش کیوں پیدا کر دیتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ نقص کس میں ہے، اناج میں، بیوی میں یا معاشرے میں ۔۔۔ بہرکیف اُنہوں نے اردھانگنی کا لفظ ترک کر دیا۔ اور بیوی کو فرنگی طرز پر نصف بہتر کہنے لگے۔

ایک مرتبہ میں نے ایک خاوند سے پوچھا۔ "اگر بیوی نصف بہتر ہے۔ تو آپ کیا ہیں؟"
بڑی بے تکلفی سے بولے۔ "نصف بدتر!"

جو خاوند بیچارے نصف بدتر ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی زیادہ تعلیم اور انقلاب کے جنون میں نعرہ لگایا تھا۔ کہ عورتوں کو بیدار ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ بدقسمتی سے عورتیں نہ صرف بیدار ہوگئیں بلکہ انقلابی بھی ہوگئیں۔ گویا ادھر وہ بیدار ہوئیں ادھر گھروں کے بچن برباد ہو گئے۔ خاوند نے شاید پُرانی قدروں کے حساب سے بیوی کو خطاب کیا۔ "جانِ من! آپ نے مجھے صبح چائے کا کپ بنا کر کیوں نہیں دیا؟"

وہ بولی "کیوں کہ ہم بیدار ہو گئی ہیں۔ صدیوں تک ہم بیویاں چائے کا کپ بن کر تم خاوندوں کے لیے جیتی رہیں مگر اب یہ استحصال ختم!"

"مگر محترمہ! آپ کے استحصال کے خلاف نعرہ تو ہم مردوں نے ہی لگایا تھا۔"
"لگایا تھا تو اب بھگتو! اُٹھ کر خود چائے کا کپ بنالو۔ میں تو دفتر جا رہی ہوں۔"
"اچھا اچھا ڈارلنگ! چائے میں ہی بنا تا ہوں۔ لیکن میرے ساتھ بیٹھ کر پیو تو سہی۔"
"میں دفتر میں بیرے سے چائے منگوا کر پی لوں گی۔"

اور خاوند یعنی بیرا اپنے لیے خود چائے بناتا ہے، شوگر اس لیے نہیں ڈالتا۔ کیوں کہ شوگر کا ڈبہ اُسے ملتا ہی نہیں۔ جب بیداری عام ہو جائے۔ تو کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں ملتی۔

لیکن ایڈیٹر صاحب! ہندوستان میں ایسی بیدار مغز عورتیں ابھی کافی اقلیت میں ہیں۔ ورنہ عورتوں کی اکثریت اب بھی گھر کی رانی کہلاتی ہے کچھ یوں کہ حکومت تو مرد ہوتا ہے، رانی تعمیل کرتی ہے۔ یعنی عورت کی حیثیت گھر میں آئینی حکمران کی سی ہے۔ ایسی آئینی حکمرانی کو پتی برتا دھرم بھی کہا جاتا ہے۔ (اور پتی برتا دھرم کا نعرہ بھی مردوں نے ہی ایجاد کیا تھا)

لیکن ہندوستان میں عورتوں کی ایک تیسری قسم بھی پائی جاتی ہے۔ بس یوں سمجھئے، وہ بیوی کم اور مکسڈ اچار زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ بیک وقت بیدار بھی ہوتی ہیں اور پتی ورتا بھی۔ یعنی ملی جلی بیوی، بالکل مکسڈ اچار سی۔

مثلاً مرد اُسے وارننگ دیتا ہے کہ اگر تم میری طرح نوکری نہیں کروگی۔ تو گھر میں ایک وقت کھانا پک سکتا ہے، دوسرے وقت بھوک ہڑتال۔ چنانچہ یہ ملی جلی بیوی دفتر میں نوکری بھی کرتی ہے اور صبح کے وقت مندرجہ ذیل کام:

۱۔ روتے ہوئے بچوں کو تھپڑ مارنا مارنے کے بعد چپ کرانا۔
مرد اخبار پڑھتا رہتا ہے۔

۲۔ سبزی چھیلنا، آٹا گوندھنا، کھانا پکانا۔
مرد شیو کرنے میں مصروف رہتا ہے۔

۳۔ بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے تیار کرنا، تیار کرتے کرتے گالیاں دینا، خاوند کو نہیں، بچوں کو۔ سمجھ دار خاوند سمجھ جاتے ہیں۔ کہ دراصل گالیاں کسے دی جا رہی ہیں۔

مَرد باتھ روم میں جاکر فلمی گیت گنگنانے لگتا ہے۔

۴. بیوی غسل خانے میں آتنی جلدی جلدی نہاتی ہے۔ جیسے کوئی متوقع خطرے کے پیشِ نظر جلدی جلدی اللہ اللہ کا نام لینے لگتا ہے۔

خاوند اپنی پتلون اور ٹکٹائی پریس کرتا ہوتا ہے۔
اور شام کو دفتر سے پیکسڈ بیوی تھکی ماندی گھر لوٹتی ہے تو پلنگ پر گر پڑتی ہے۔ خاوند پوچھتا ہے۔ "تھک گئیں"؟

"نہیں سر میں درد ہو رہا ہے"۔

"دبا دوں"؟

"نہیں، ایسپرو کی ایک ٹکیہ لا دو"۔

اور پھر بیوی ایسپرو کی ٹکیہ کو خاوند سمجھ کر کھا جاتی ہے۔ سر کو قدرے آرام سا آنے لگتا ہے۔ تو یہ سوچتی ہے، اس ٹکیہ اور خاوند میں کوئی خاص ٹکنیکل فرق تو نہیں۔ چاہو دونوں میں ایک ایسا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہر ہندوستانی کو یقین دلا دیا گیا ہے کہ ہندوستان دیہات میں رہتا ہے۔ اس لیے ہندوستانی عورت بھی زیادہ تر دیہات میں رہتی ہے۔ وہ بھینس کو چَرانے جنگل میں لے جاتی ہے۔ کیوں کہ بھینس کو یقین ہے۔ کہ وہ میری منہ بولی بہن ہے۔ یہ بہن بھینس کے لیے چارے کا گٹھا ساٹ کراتی ہے، اناج پھٹکتی اور چھانکتی ہے۔ بھینس کا دودھ دوہتی ہے اس میں پانی خود نہیں ملاتی۔ خاوند ملاتا ہے۔ کیوں کہ اسے بڑے شہر میں جاکر بیچنا ہوتا ہے۔ یعنی میاں بیوی ڈویژن آف لیبر کے سوشلسٹ اصول پر اپنے اپنے کام کرتے ہیں۔ بلکہ عورت آدھے سے زیادہ کام کرتی ہے (آدھے سے زیادہ کام میں بچے پیدا کرنا بھی شامل ہے) خاوند صرف بچوں کو ڈنڈے وغیرہ مارتا ہے اور جو بچہ اپنے باپ کو جوابی ڈنڈا عرض کر دے تو باپ بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ "تو شیر کا بچہ ہے"۔

اور پھر شیر کا بچہ گاؤں سے بھاگ کر شہر میں آجاتا ہے۔ اور کسی گھٹیا ریستوران میں جوٹھے برتن مانجھتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ دیکھا تامل ناڈو سے آیا ہوا۔ ایک مرد دہلی میں جوٹھے برتن مانجھتا ہے اس کی بیوی بڑے بازار میں بھاجی بیچتی ہے اور اُن کا بارہ تیرہ برس کا بیٹا ایک پکوڑوں کی دُکان پر گاہکوں کو آوارہ گرد اور اوباش عورتوں کے ایڈریس اور پتے بتاتا ہے۔ یعنی شیر کا بچہ عورتوں کا دلّال بن جاتا ہے۔

ایڈیٹر صاحب! میرے خط کے جواب میں یہ مت لکھیے کہ آپ کے یہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا!!

برقؔ آشیانوی

نیا سال مبارک

افلاس ہے غربت ہے نیا سال مبارک
اجناس کی قلت ہے نیا سال مبارک

کرسی تو سلامت ہے نیا سال مبارک
باقی تو وزارت ہے نیا سال مبارک

اک سمت زمیں ہے قحط تو اک سمت میں سیلاب
قدرت کی عنایت ہے نیا سال مبارک

کیوں پیٹتے ہو روٹی کو، کپڑے کو، مکاں کو
کیا اس کی ضرورت ہے نیا سال مبارک

کیوں بھوک سے فاقے سے مرے جاتے ہو لوگو
یہ وقت تو قناعت ہے نیا سال مبارک

اڑتیس برس سے تھی فقط "غلے" کی قلت
اب پانی کی قلت ہے نیا سال مبارک

تقدیر میں جنتا کی لکھی روزِ ازل سے
ذلت ہے جہالت ہے نیا سال مبارک

شکر نہیں ملتی تو ملے فکر ہی کیا ہے
اب زہر بھی امرت ہے نیا سال مبارک

کچھ صبر و قناعت بھی تو درکار ہے لوگو
جو مل گیا نعمت ہے نیا سال مبارک

کل برقؔ سے کہتا تھا یہ رستے میں نجومی
قسمت میں وزارت ہے نیا سال مبارک

* طالب خوندمیری

مرزا غالب آئی۔ اے۔ ایس

آئی۔ اے۔ ایس ہو گئے غالب کلکٹر بن گئے
شاعرِ اُردو تھے کل تک آج افسر بن گئے
مل گئی کرسی انھیں بھی افسرانہ شان کی
فائلوں کے ڈھیر نے لے لی جگہ دیوان کی
اُن کی بیٹھک میں نئے انداز کا دفتر کھلا
گھر کے اندر ہی پروٹوکول کا منظر کھلا
ڈپلومیٹک ہو گیا دو دن میں اُن کا بھی مزاج
مسکراہٹ، چڑچڑاہٹ کا انوکھا امتزاج
شخصیت ان کی اچانک ہی بدل کر رہ گئی
شاعرانہ بے نیازی ہاتھ مل کر رہ گئی
بے تکلف یار بھی اب تو انھیں کھلنے لگے
دیکھ کر طرزِ تپاک شاعراں جلنے لگے
آپ کا دل شاعری سے اس قدر اُکتا گیا
شعر خود اپنا بھی یاد آیا تو غصہ آگیا
اتفاقاً پالیا غرقِ غزل خوانی جسے
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی اُسے
وقت کے پابند اُن کے روز و شب ہونے لگے
وقت پر کھانے لگے، پینے لگے، سونے لگے
اس قدر احساس اپنی پوسٹ کا رکھنے لگے
اہلیہ سے بھی ذرا سا فاصلہ رکھنے لگے
اب وہ اُردو کی جگہ انگلش میں فرمانے لگے
جس زباں میں شاعری کی اُس سے کترانے لگے
دل ردیف و قافیہ سے بدگماں ہونے لگا
اب بجائے شعر ڈکٹیشن بیاں ہونے لگا
اسٹینو ٹائپسٹ ان کے ساتھ اِک رہنے لگی
کچھ نجی باتیں بھی وہ تنہائی میں کہنے لگی
روز و شب مصروف ان کے ساتھ جب ہونے لگی
آرزوئے وصل کی فائلوں میں وہ کھونے لگی
جب کبھی جلسے تھے وہ دو دن کیلئے بھی ٹور پر
بس اکیلی یہ ہوا کرتی تھی اُن کی ہم سفر
فکر یہ رہتی تھی اس کا رازداں کوئی نہ ہو
ایسا ہوٹل ڈھونڈھتے تھے وہ جہاں کوئی نہ ہو
اس طرح ان کی ملاقاتیں بھی آساں ہو گئیں
اُس کی زلفیں ان کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
ٹور کے پردے میں کچھ ایسی ہی باتیں ان کی تھیں
نیند ان کی تھی، دماغ ان کا تھا، راتیں ان کی تھیں
(نامکمل)

قطعہ

فیصلہ خود آپ ہی کر لیجئے
کون کلچر، کس قدر کنگال ہے
شیکسپیئر کا مکان ہے میوزیم
حضرتِ غالب کے گھر میں ٹال ہے

یوسف ناظم

وہ آرہی ہے!

اُس کا آنا تو یقینی ہے اور آنے کا وقت بھی مقرر ہے لیکن اُس کی آمد پر ہنگامہ اتنا مچا ہوا ہے کہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں وہ رستوں سے بچ کر کسی طرح وقت سے پہلے ہی نہ نمودار ہو جائے ــ یہ ذکر ہے اکیسویں صدی کا۔ سنا گیا ہے کہ ساری دنیا میں اکیسویں صدی کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اپنی عمر کے مزید ۱۰۰ سال پورے کر رہی ہے اور جب بھی ایسا کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ ریلوں، بسوں بلکہ ہوائی جہازوں میں بھی لوگ بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہیں۔ کھانے کی چیزوں پر ٹوٹ کر گرتے ہیں اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ کوئی چیز تباہ ہونے سے رہ نہ جائے۔ اسے ہم لوگ جشن کا نام دیتے ہیں۔

آنے والی صدی کیسی شکل و صورت اور ہیئت کے اعتبار سے ویسی ہی صدی ہوگی جیسی کہ اب تک ہوتی آئی ہیں لیکن صدی بہرحال صدی ہوتی ہے اس لیے سوچا جا رہا ہے کہ اس کا استقبال کس طرح کیا جائے۔ بینڈ بجا کر یا بغلیں بجا کر۔ فضا میں فاختائیں اڑائی جائیں یا زمین پر ایک آدھ خوبصورت بم چھوڑا جائے۔ ویسے چھوٹے موٹے پیمانے پر کیمیائی اشیا بنانے والے کارخانوں سے گیس کا اخراج بھی عمل میں لایا جاتا ہے کیوں کہ اس گیس کو بھی مفاد عامہ کے لیے استعمال کیے جانے کا رواج مقبول ہو رہا ہے اور لوگ ہنسی خوشی اپنی جان سے فدا ہو رہے ہیں۔ (سرکاری اعداد پر بھی بھروسہ کیا جائے تو تعداد اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے)

اکیسویں صدی کے بارے میں ایک بات یہ بھی طے ہے کہ بیسویں صدی میں اگر وحشت کا دور دورہ تھا تو اکیسویں صدی میں دہشت کا دور دورہ رہے گا۔ یہ ایک لحاظ سے ترقی ہی ہوئی کیوں کہ وحشت تو صرف ایک کیفیت ہے کسی کو ہوتی کسی کو نہیں ہوتی لیکن دہشت ہوا کی طرح کی نعمت ہے سب کو اپنا فیض پہنچاتی ہے اور یہ نہیں کہ کسی کو پہلے اپنی عزیز تو ہٹاؤ بعد میں ہوا کھانا۔

دہشت زدہ طرزِ زندگی اور خوف آلودہ نظام حیات کو چل کر بہتر سے بہتر بنانے کے لیے خاص تیاریاں کرنی پڑتی ہیں اس لیے دہشت طرازی کی مختلف اصناف کی نظری تعلیم اور عملی تربیت کی درس گاہیں جگہ جگہ قائم کی جا رہی ہیں۔ قائم تو پہلے بھی تھیں لیکن اب یہ اوپن یونیورسٹی (OPEN UNIVERSITY)

کی نوعیت کے دانش کدوں کی طرح کام کریں گی۔ ان کی ترقی کے راستے میں نہ کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوگی کسی مالی دشواری کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوگا ورنہ عام دانش کدوں میں اُستاد کو کرسی کے لیے اور طالب علم کو ایک ڈیسک کے لیے ترستے اور تڑپتے دیکھا گیا ہے۔ اکثر طالب علم تو امتحان میں صرف اس لیے ناکام ہو جاتے ہیں کہ اُن کے استاد کو بیٹھنے اور اونگھنے کے لیے کرسی نہیں ملی تھی۔ دہشت طرازی کی درس گاہوں کا رتبہ بہت بالا ہوتا ہے یہ کوئی میونسپلٹی کے مدرسے نہیں ہیں کہ بچوں کو صرف دوپہر کا کھانا دیا جا رہا ہے اور وہ بھی برائے نام۔ (بہرحال دوپہر کے اس کھانے کی وجہ سے مدرسوں میں طالب علموں کی تعلیم نہ سہی، حاضری اطمینان بخش ہو رہی ہے)

دہشت کے کچھ کام اس صدی میں بھی ہوئے ہیں لیکن ان کی رپورٹیں غور سے پڑھی جائیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کام نیم تعلیم یافتہ لوگوں کے کئے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ گولی تو چلی لیکن نشانہ خطا ہو گیا (ہمارے یہاں خطاؤں کی تو کوئی کمی ہی نہیں ہے) یا ممدوح کے اگر گولی لگی بھی تو وہ داعی گولی ثابت نہیں ہوتی (اس سے تو ٹاکرا کی دی ہوئی گولی بہتر ہوتی ہے) ٹائم بم بھی ضرور دئے ہیں لیکن یہ بھی اور ٹائم میں (ہمارے ہاں جو بھی کام ہوتا ہے اور ٹائم میں ہوتا ہے) دہشت کے کاموں میں بڑی احتیاط اور ماہرانہ کارکردگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ کاموں میں کارندوں نے اپنے پیچھے کچھ نشانات چھوڑ دیئے ہیں۔ یہ نہایت طفلانہ حرکت ہے اور یہ ایسی ہی حرکت ہے جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے کہ مرا پیچھی بچھے خراب کر کے چلا گیا۔ کبھی کبھی کتے بھی ان کارندوں کی بُو پا لیتے ہیں۔ یہ بھی بڑی ناقص حرکت ہے۔ معمولی نقب زن اگر کتوں کی مدد سے پکڑے جائیں تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ کتوں کو بھی کسی نہ کسی معاملے میں فوقیت حاصل ہونی چاہیئے لیکن دہشت طرازی کی تقاریب اور نقب زنی کے مشاغل میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ان کاموں میں کسی اور کو اپنی بو کی ہوا تک نہیں لگنے دینا چاہیئے۔

دہشت پسندی کے مشاغل میں سب سے بڑی رکاوٹ سیکورٹی ہے۔ اس نامعقول سیکورٹی کی وجہ سے کئی نیک کام رُکے پڑے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی فلاح و بہبود بھی رُکی ہوئی ہے اس لیے اب دہشت پھیلانے کے تربیتی اداروں میں طالب علموں کو سب سے پہلے سیکورٹی کی تعلیم دی جاتی ہے اور بعد میں دوسرا کام سکھایا جاتا ہے۔ انھیں اسناد بھی کچھ اس قسم کی دی جاتی ہیں کہ ان اسکولوں کے فارغ التحصیل طلبا ر حفاظتی عملے کے لیے سب سے زیادہ موزوں افراد سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح کام بڑی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ مستقبل پر نظر رکھنے والے اہل بینش و دانش کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی کے شروع ہونے سے بہت پہلے تمام بڑے ملکوں میں ارباب اقتدار کا حفاظتی عملہ دہشت پسندوں ہی پر مشتمل ہوگا۔ اور اکیسویں صدی میں تو کچھ ملکوں کے سربراہ بھی انھی درس گاہوں کے ہونہار فرزند ہوں گے۔

دہشت پسندی آج (کچھ کچھ) معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن یہ تو دنیا میں ہوتا ہی آیا ہے۔ روشن خیالی بھی آہستہ آہستہ اور رک رک کر دنیا میں آئی اور اب بھی پوری طرح کہاں آئی ہے۔ اب کہیں کہیں عدالتوں میں انصاف کے علاوہ علمی کام بھی ہو رہا ہے۔ یہ رجحان روشن خیالی کی دین ہے ورنہ عام طور پر عدالتوں میں صرف قانونی بحثیں ہوتی ہیں جن کا کوئی مصرف نہیں۔ روشن خیالی اہم ہے نہ کہ انصاف۔ روشن خیالی کے قد[illegible] جم رہے ہیں اور بیسویں صدی کے آغاز پر جو کام معیوب اور مذموم سمجھے جاتے تھے اب انھیں معزز مانا جانے لگا ہے۔ یہی صورت حال اکیسویں صدی میں دہشت پسندی کے تعلق سے ہوگی اور جمبو جیٹ کے اغوا کرنے والے معززین کو وہی اغوا شدہ جمبو جیٹ بطور تحفہ دیا جائے گا۔ (اس طیارے میں سفر کرتے والے مسافرین اگر بچ گئے تو انھیں بھی کچھ نہ کچھ دیا جائے گا) ہو سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہاتھی اور گھوڑے [illegible] انعام میں دیئے جانے کا رواج

بھی عود کر آئے۔ یہ اچھا طریقہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ انعام میں کوئی چیز دی گئی ہے ورنہ بیسویں صدی میں تو ایسے انعام بھی دیکھنے میں آئے کہ لو اور جیب میں ڈال کر چلے آؤ۔ یہ انعام کسی کو دکھانے کے لیے نہیں سب سے چھپانے کے لیے ہوتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں دہشت طرازوں کو جلسۂ عام میں ہار پھول پہنائے جائیں گے اُس وقت تک تو شاید بلٹ پروف شالیں بھی بننے لگیں۔ یہ بھی اُڑھائی جائے گی۔ جو کراس چیک دیا جائے گا اس کی رقم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی آج کل تو حکومتیں ہر قسم کی آمدنی میں اپنا حق ضرور جتاتی ہیں۔ ان لوگوں کو وثیقۂ شجاعت یا صداقت نامۂ بہادری جیسی فضول چیزیں نہیں دی جائیں گی ہر چیک کے ساتھ اعشاریہ ۴۵ کا پستول اور فولڈنگ ہیلی کاپٹر پیش کیا جائے گا۔ سونے کے تمغے ممنوع قرار پائیں گے۔ اکیسویں صدی میں اس قسم کا جھوٹ برداشت نہیں کیا جاسکے گا اور جو بھی سونے کے تمغے کے نام کی کوئی چیز بنائے گا اُسے ہمیشہ کی نیند سُلادیا جائے گا۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ اکیسویں صدی میں فنونِ لطیفہ کو بھی برداشت نہیں کیا جاسکے گا۔ آدمی کی قوت برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کمسن بچوں اور نو عمر خواتین کو فنونِ لطیفہ استعمال کرنے کی اجازت ہوگی لیکن یہ بھی خانگی طور پر۔ عام گزرگاہوں اور پبلک مقامات پر انھیں نہیں لایا جاسکے گا۔ یہ مقامات پہلے ہی سے کافی آلودہ ہیں اور مقاماتِ آہ و فغاں معلوم ہوتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں اخبارات ضرور چھپیں گے لیکن ان میں کوئی ادبی صفحہ نہیں ہوگا اور نہ کوئی ایسا کالم ہوگا جو دو چار اخباروں میں نقل ہوتا ہو۔ ان اخباروں میں ایسی تصویریں بھی نہیں چھپ سکیں گی جن کا عنوان "فرق بتاؤ" ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں امتیاز اور فرق ہوگا ہی نہیں۔

آنے والی صدی میں فلموں کے لیے کوئی سنسر بورڈ نہیں ہوگا کیوں کہ اس بیسویں صدی میں اس بورڈ نے ایسا کون سا تیر مار لیا ہے کہ اسے اکیسویں صدی میں بھی برقرار و بحال رکھا جائے۔ موجودہ صدی میں عورتوں نے بہت نقصان اُٹھایا ہے۔ اسکے ہر نقصان کی تلافی آنے والی صدی میں ضرور کردی جائے گی (یہ کوئی سیاسی وعدہ نہیں۔ پیشن گوئی ہے) اور عورتیں بھی وہی سب کچھ کرسکیں گی جو مرد کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ انھیں گوارا ہوا۔ اکیسویں صدی میں مردوں کو کم سے کم ملازمتیں دی جائیں گی اور فیملی پلاننگ میں کچھ ایسی انقلابی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں گی کہ مردوں کی شرحِ ولادت ہی کم ہو جائے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اس طرح اکیسویں صدی میں عورتیں، عورتوں ہی کے شانہ بشانہ چلیں گی۔ جو کچھ بچے کھچے مرد ہوں گے وہ ان کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ اگر اس وقت تک چاند پر کوئی کالونی بن سکی تو صرف ماہ پاروں کی کالونی ہوگی۔ اکیسویں صدی میں راشن کارڈ صرف انھی لوگوں کو دیئے جائیں گے جنھوں نے دہشت پھیلانے کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔ (مطلب یہ کہ کارڈ سبھی کو دیئے جائیں گے)۔

کوشش یہ بھی ہو رہی ہے کہ اکیسویں صدی میں زیادہ ہجوم نہ ہو۔ بڑی طاقتیں اس سلسلے میں یقیناً کوئی ایسا کام انجام دیں گی جس سے ہجوم کا سدباب ہو سکے!

نیاز سواتی
(پاکستان)

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

آج ہم نسوار بھی لائے اُدھاری ہائے ہائے — سخت مہنگی پڑ رہی ہے تیری یاری ہائے ہائے
کیوں بدستِ خود چلائی تھی کٹاری ہائے ہائے — درد سے اب ہو رہی ہے بیقراری ہائے ہائے
دو دنوں میں سُوٹ سارا ہو گیا ہے تار تار — ریڈی میڈ اس سُوٹ کی ناپائیداری ہائے ہائے
لازمی مضمون میں ہر سال ہو جاتا ہوں فیل — کیوں نہیں مضمون سارے اختیاری ہائے ہائے
بس کا مالک سیٹ بچے کو نہیں دیتا کوئی — ہم کہاں لے جائیں یہ آدھی سواری ہائے ہائے
لے چکے ہیں سارے بابو ہم سے نذرانے مگر — پھر بھی حل کرتے نہیں مشکل ہماری ہائے ہائے
بیٹا کہتا ہے کہ والد تھا شکاری شیر کا — باپ نے جس کے کوئی بدی نہ ماری ہائے ہائے
میں اگر لکھوں تو کھیرا لکھ دیتا ہے تو — کب کرے گا ترک یہ غلط شماری ہائے ہائے
ہو کے وہ میک اپ سے فارغ دل پہ ڈھائے گی ستم — تیز پہلے کرتی ہے ابرو کی کٹاری ہائے ہائے
پرسشِ غم دورِ راحت تک فقط محدود تھی — اب کوئی کرتا نہیں ہے غمگساری ہائے ہائے
یوں تو اوورلوڈ ہر گاڑی میں کم ہوتے نہیں — پکڑی جاتی ہے مگر میری ہی لاری ہائے ہائے
اُس کے ہاتھوں میں ہوٹل کا ٹوکرا میرے لئے — یوں کوئی کرتا نہیں تیمارداری ہائے ہائے
چوری کرتا ہے کوئی اور دھر لیا جاتا ہوں میں — جانے کب تک یہ رہے گی مشق جاری ہائے ہائے

مجھ کو ہر اک آدمی نوکر سمجھتا ہے نیازؔ
میرے کام آئی نہ کچھ بھی انکساری ہائے ہائے

گو غلط تنقید ہی سے وار کر دیتے ہیں لوگ — پڑھنے والوں کی نظر میں خوار کر دیتے ہیں لوگ
میں انہیں کہتا ہوں جب ہے سود لینا تو حرام — قرض دینے سے مجھے انکار کر دیتے ہیں لوگ
دوستوں میں دیکھتے ہیں جب خلوص و اتفاق — اُن کو باہم برسرِ پیکار کر دیتے ہیں لوگ
جب کہوں بہرِ خدا بحثوں میں وقفہ کیجئے — اور بھی پھر تیز تر رفتار کر دیتے ہیں لوگ
آجکل ان کو برائی سے اگر روکے کوئی — چاک اس کا جبّہ و دستار کر دیتے ہیں لوگ
سخت مہنگی بک رہی ہے دیکھتے ہیں جب زمیں — قبر بھی ماں باپ کی ہموار کر دیتے ہیں لوگ
سادہ دل بن کر کوئی بھی زندہ رہ سکتا نہیں — لاکھ بدھو ہو کوئی ہشیار کر دیتے ہیں لوگ
جو نہ سنتا ہو سفارش اور رشوت بھی نہ لے — نوکری اُس شخص کی دشوار کر دیتے ہیں لوگ

دیکھتے ہیں دو دلوں کو جب بہم ملتا ہوا
اُن کی راہوں میں کھڑی دیوار کر دیتے ہیں لوگ

(روحِ فانی بدایونی سے معذرت کے ساتھ)

دوست پر اعتبار تھا نہ رہا
وہ مرا قرضدار تھا نہ رہا

جب پولس نے مری تواضع کی
مے کا جتنا خمار تھا نہ رہا

مجھ سے سرجن نے فیس جب مانگی
مجھ کو سو کا بخار تھا نہ رہا

جب سے بیگم گئی ہیں میکے کو
گھر میں جو انتشار تھا نہ رہا

قرض اس کو دیا نہ جب میں نے
جو اُسے مجھ سے پیار تھا نہ رہا

ہم نے شعلہ کی کھائی جب پڑیا
پیٹ میں جو اپھار تھا نہ رہا

اس نے جب ہنس کے بات کی مجھ سے
وہ جو دل میں غبار تھا نہ رہا

جب قسم کھا کے اُس نے جھوٹ کہا
اُس پہ جو اعتبار تھا نہ رہا

ہم نے ہوٹل کے بل کو جب دیکھا
وہ جو رُخ پر نکھار تھا نہ رہا

احمد جمال پاشا

صاحبِ تصویر کا المیہ

علامۂ بے دل یادگارِ حضرتِ غنچہ جھنجھٹ پوری کے پاس اب ایک ایسی تصویر اُن کی عظمت کے اسلحہ خانے میں محفوظ ہوگئی تھی۔ جس کی نمائش وہ اسی طرح اپنے پورٹ فولیو سے نکال کر ضروری سمجھتے، جیسا کہ بڑی طاقتیں ترکِ اسلحہ کی مہم ایک دوسرے کے خلاف چلا کر اپنے ایٹمی ہتھیاروں کی تشہیر کیا کرتی ہیں۔

علامہ جب دساور کا، کوئی مشاعرہ لوٹ کر فاتحانہ مضافاتِ قیام گاہ کی جانب یلغار کرتے تو آس پاس کے چائے خانوں میں غیر احباب تک چائے کا ادا کیا ہوا بِل چائے خانے والوں سے واپس لے لیتے۔

علامہ احباب سے محفل گرم کرتے تو ان کے بلند بانگ عظمتی دعووں پر کوتاہ اندیش حضرات، سند کا مطالبہ کر بیٹھتے۔ جو مشاعرے اُن کے طلوع ہوتے ہی اکھڑ جاتے ان تک کے لیے وہ گھوڑے کی طرح اڑ جاتے کہ انہوں نے لوٹ لئے۔" چشم دید گواہ تک منہ دیکھتے رہ جاتے۔

اس بار علامہ دہلی سے ایک ایسی نادر و نایاب تصویر بغل میں دبائے لوٹے کہ مخالفین کے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا عجب سانحہ سا ہوگیا۔ یہ پُر عظمت تصویر صدرِ جمہوریہ کے ساتھ تھی۔ شعراء کا ایک یادگار گروپ جس میں وہ پر جلنے کے باوجود صدرِ جمہوریہ کے بائیں جانب کھڑے تھے۔ صدرِ جمہوریہ اُن پر مُسکرا رہے تھے۔ دونوں کی شیروانیاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ عزت مآب کے چہرے پر کچھ بے گانگی کے اثرات نمایاں تھے۔ مگر موصوف کا چشم دید بیان ہے کہ "ان کا انداز نہایت پُر وقار ہے۔" طبقاتی امتیاز کا احترام کرتے ہوئے علامہ تصویر میں دونے پر ریشۂ خطمی نظر آرہے تھے۔ بس جیسے کڑھاؤ پر چھننے میں جلیبی رکھی ہو۔ ان کے جسم مبارک کے کچھ حصے افقی، متوازی اور عمودی نظر آتے بقیہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ جس سے شبہ ہوتا کہ وہ اس وقت بجائے تصویر کھنچوانے کے سائیکل چلاتے یا آٹا گوندھتے میں مصروف ہیں۔ تصویر بالکل صاف تھی۔ مگر شناخت اس لیے ممکن نہ تھی کہ باچھیں کھلی ہونے کے ساتھ ساتھ منہ سورج مُکھی کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ غالباً ہونٹ تر کرنے کی کوشش میں، اوپری دانتوں کے ساتھ زبان اس طرح نکلی ہوئی تھی۔ گویا مامی تشکار کہ

ناکام پیچھا کرنے کے بعد کھڑا ہانپ رہا ہو۔ اُن کا اصرار تھا کہ "یہ تصویر اُن ہی کی ہے"۔ یہ بھی ٹھیک ہی تھا ہے کہ کسی اور چوپائے کی ایسی تصویر ممکن نہیں۔ عزت مآب سمیت جملہ شرائے تصویر کی شکلیں خدا کی بنائی ہوئی تھیں۔

راجدھانی سے وہ تصویر کے ساتھ اِس طور پر ملیٹے اور با تصویر، مارکو پولو کی طرح یوں گھومے کہ اُن کی متعدد سنجیدگی پر شبہ ہوتا کہ یہ تصویر نہیں دکھا رہے ہیں بلکہ کسی محترم ہستی کا آخری سفر توپ گاڑی پہ طے کرایا جارہا ہے۔ یہ سلسلہ گزشتہ کئی ماہ سے جاری تھا۔ اب تک اُن کے مخالفین سے تصویر دشمنوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو چکی تھی۔ جس کا ہمیں نہ علم تھا نہ اندازہ۔ ہم تو اُس وقت پہنچے جب اپنے تک تصویر کے شیشے میں سہاگ کھڑے ہوتے۔ چائے پان، سگریٹ کی دلکش پیش کش بھی اُنہیں نہ روک پاتی۔ ہماری آمد تو بس ایسی ہی تھی، جیسے فلم کے آخیر میں کوئی آدمی پہنچ جاتا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی تمام گتھیاں خود بہ خود سلجھ جاتی ہیں۔ ہیرو خودکشی سے توبہ کرلیتا ہے۔ بے قصور عاشق پھانسی کے تختے سے اُتر آتا ہے۔ رقیب موت کی چھلانگ لگا دیتا ہے۔ ورنہ پولس پکڑ لے جاتی ہے۔ اور دو دل آپس میں مل جاتے ہیں۔

ہوا یوں کہ علامہ نے ہمیں سوتے سے جگاکر وہ متنازعہ تصویر دکھائی تو ہم نے عادتاً کہا۔ "مٹھائی کھلاؤ۔" وہ روایتی سعادت مندی سے مٹھائی لانے کے لیے چل دیئے ۔ تصویر دیکھ کر رکھ دی۔ ڈارون کے نظریے پر مشکوک انداز سے غور و فکر میں ڈوب گئے۔ "اگر انسان بندر کی اولاد ہیں تو پھر اس کا سلسلہ آخر کس جانور سے ملایا جائے۔؟ کیکڑا! جلیبی سے مماثلت کس ذی حیات کی ہوسکتی ہے۔ بندر تو سیدھا سادہ چوپایہ ہے۔ مگر تصویر میں تو کوئی اور ہی مخلوق نمایاں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد، وہ حلوائی کی طرح مٹھائیاں چکھا رہے تھے۔ اچانک اس طرح اُچھلے۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

احباب کے درمیان یہ بھی کوئی خاص بات نہیں۔ تکلیفیں تو اپنے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ نے کسی کے ساتھ نیکی کی ہو قربانیاں دے کر نظروں سے گرالیا ہو تو وہ نہیں نظر انداز کرے گا۔ تو کیا غیر ڈنک مارے گا۔ نہایت مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تصویر ۔۔ ؟"

اب جو دیکھا۔ تو کمرے میں صرف ہم دو تھے۔ ایک دوسرے کو اس طرح گھور رہے تھے۔ جیسے ٹیلی فون کے تار پہ دو پرند بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ پھر بھڑ اُٹھے۔

"تصویر ۔۔۔ ؟"

"میز پر ہوگی ۔!"

"میز پر نہیں ہے ؟"

"تو نہیں ہوگی ۔!"

انہوں نے بیڈ کی خشکی پر مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے کہا ۔

"آپ ہی کے پاس ہوگی ۔!"

"تو میاں دیکھ لو ۔"

ہوٹل کے کمرے کی بساط ہی کیا ۔؟ ایک اٹیچی ۔ بریف کیس، چند کتابیں، رسالے، دعوت نامے اور کچھ حسینوں کے خطوط۔ احتیاطاً مشورہ دیا کہ "پہلے احتیاطاً ہماری تلاشی لے لیں۔" معاملہ سنگین اور علامہ بدحواس، انہوں نے بلا تکلف ٹٹول کر ہمارے کپڑوں بلکہ جسم تک کی اس طرح تلاشی لی جیسے اچانک لوٹے ہوئے دو دلوں کو ناجائز ملاقات کا موقع ہاتھ لگ گیا ہو۔ انہوں نے اس طرح ارمان نکالے کہ اب تک اُن کے شادی نہ کرنے کا معمّہ بھی حل ہوگیا۔ موزے جوتے بلکہ اُس کے تلے کا بھی جائزہ لیا۔ تلاشی ہوگئی تو ہم گھڑی بھر کے لیے اُن پر کمرہ چھوڑ کر چل دیئے۔ ۔ یہ تک ہوٹل کے منیجر سے موسم اور مہنگائی پر باتیں کرتے رہے لوٹے تو اسباب کے آموختے میں انہیں مصروف پایا۔ پھر وہ لپکے

گویا ہوئے!

"تصویر کی پُراسرار گمشدگی اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے!"

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی ناگہانی پیدائش اور امریکا کی دریافت کے بعد یہ تیسرا اہم واقعہ ہے۔"

"آپ زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں؟"

"چلیئے آپ کی ڈریسنگ کرا لائیں۔!"

انہوں نے اقوام متحدہ کی طرح معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ . . . . . ؟"

ہم نے جنوبی افریقہ کی طرح بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ تصویر کے لیے اتنے پریشان کیوں ہیں۔؟"

انہوں نے منہ ہی منہ میں ہیں کچا چباتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر لی اور اس طرح سر پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ جیسے تازہ تازہ رنڈوے ہوئے ہوں۔ ان کے جارحانہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا:

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔؟"

وہ بھینسے کی طرح ڈکرائے

"تصویر! تصویر! تصویر! تصویر!"

"آخر آپ اس کا کرتے کیا۔؟"

"میں اُٹھتے بیٹھتے اس تصویر کو دیکھتا! کھانا کھاتے میں دیکھتا! ناشتہ کرتے میں دیکھتا! سونے سے پہلے دیکھتا! سوتے سے اٹھ اٹھ کر دیکھتا۔ اور دوسروں کو دکھا کر دیکھتا! تنہا بیٹھ کر دیکھتا! تصورات میں دیکھتا! خواب میں دیکھتا! تصویر کھاتا! تصویر پیتا . . . ."

جب وہ تصویر کی غزل پر فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔ تو پہلی بار مجھے خیال آیا کہ ان کا صحیح مقام رانچی یا آگرہ ہے۔ ہم نے پوچھا!

"تصویر آپ کو اس قدر عزیز کیوں تھی۔؟"

اس کے لیے تو ہزاروں خرچ کر ڈالے شاعر ہاتھ سے نکل نہ جائے اس لیے ہوائی جہاز سے گیا تھا۔ خود گراز کو منہ مانگے دام دے کر کھڑے کھڑے تصویر حاصل کی۔ . . . .

"جیسے پٹھان قرض وصول کرتا ہے؟"

دل مت جلایئے۔"

"کیا اس سانحے کے بعد وہ راکھ نہیں ہو چکا؟"

میں کوئی انکوائری آفس ہوں جو آپ سوال پر سوال کئے جا رہے ہیں۔؟"

"غصہ سے غور کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔"

وہ غور کرنے لگے۔ ہم نے پوچھا۔ جس وقت آپ نے مجھے سوتے سے جگا کر تصویر دی تھی اُس وقت کمرے میں اور کون کون خوش صورت بزرگ براجمان تھے۔؟"

"انہوں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا!"

"ظفر اور نجمی صاحبان تھے۔!"

"پھر یہی دونوں اُچک لے گئے۔"

اُن کا چہرہ فکر سے چیچک زدہ ہو گیا۔

"بترہ صاحب؟"

"جی نہیں! وہ تو صبح سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ رات سے پہلے واپسی ممکن نہیں۔"

"رضوی اور نقوی صاحبان؟"

"جی نہیں !"

"آپ خود بھی تو آئے تھے۔؟"

"وہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"جیسے تصویر لے جانا بھول گئے۔؟"

"وہی تو غلطی ہو گئی۔"

"جرمنوں کے روس پر حملے سے بھی بڑی۔ ہمالیائی غلطی۔"

"تو پھر۔۔؟"

"بھگتو۔"

"ابھی تو شاید بک شاپ پر مل جائیں۔؟"

"لپک کر جاؤ! دکان پر ہی ہوں گے۔ انہوں نے میرے لیے کچھ کتابیں نکال کر رکھی ہوں گی۔ وہ بھی لیتے آیئے گا۔"

"آپ کو اپنی پڑی ہے۔!"

"آپ کی جان پر بنی ہے؟"

وہ سرپٹ نکل گئے۔ ہم اگلے دن کی تقریر کی تیاری کرنے لگے۔ "پیروڈی میں یہ ہوتا ہے۔ وہ ہوتا ہے۔ کیا نہیں ہوتا ہے۔ اردو میں کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ عالمی ادب میں تحریف کے شاہکار۔ نہیں اور وہ بھی تو۔" نوٹس اور پوائنٹس دیکھتے دیکھتے بے خیالی میں "تصویر" کا بھی اضافہ کر دیا۔ اتنے میں علامہ ہم پر اس طرح "نازل" ہوئے جیسے کسی گنہگار قوم پر عذاب نازل ہو رہا ہو۔ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ابھی نہیں لے گئے۔!"

ہم نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"عارفی بھی تو تھے۔؟"

"میں نے انہیں نہیں دیکھا۔"

"آپ تو صرف تصویر دیکھ رہے تھے۔"

وہ شکاری کتے کی طرح جھپٹے اور ہوا ہو گئے۔

غالباً عارفی نے کوئی ایسا ٹھوس ثبوت اپنے نہ ہونے کا فراہم کر دیا کہ وہ مطمئن لوٹے۔ اس دوران ہم تالا لگا کر لوڈو

گیارہ ہو چکے تھے۔ رات کو تقریباً ایک بجے تقریب سے لوٹے تو پرزہ ملا۔

"ساڑھے بارہ بجے تک مسلسل انتظار کر کے جا رہا ہوں۔ فجر آپ کے ساتھ پڑھوں گا۔"

واقعی مؤذن سے پہلے ان کی بانگ تصویر نے نیند حرام کر دی۔ گھونگٹ کے پٹ کی طرح در خانقاہ وا کیا تو علامہ سیلابی موج کی طرح لپک کر داخل ہو گئے۔

"صاحب آپ کہاں تھے؟"

"تقریب کو ناکام بنانے کی تو آپ ہی کی ذمہ داری تھی۔؟"

"تصویر کے لینے کے بعد ہوش کس الّو کو تھا۔؟"

آپ تو پرانے ملاقاتیوں سے اس لیے بھاگتے ہیں کہ ماضی کا بھرم نہ کھل جائے۔؟"

"چھوڑیئے صاحب پہلے ہم بہت چھیچھڑ تھے۔ ہمارا اب گریڈ ملسہ کیسی ہے۔ مگر تصویر۔؟"

"یہ تو دن دھاڑے ڈاکہ پڑ گیا۔"

وہ دن بھر جونک کی طرح اپنا خون پیتے رہے۔ احباب میں جلسۂ تعزیت کی تجویز رکھی۔ انہوں نے کارروائی رپورٹ جلسہ کی اشاعت پر زور دیا اور پبلسٹی کے فوائد سے آگاہ کیا۔ بولے!

"پبلسٹی تو اس طرح ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میرا اسکوٹر ایک پاگل سے ٹکرا گیا۔"

"دو پاگل ٹکرا گئے۔"

"پاؤں میں چوٹ آئی، پیر سوج گیا۔ فوراً اخباروں میں اس حادثے کی خبر چھپوا دی۔ جس کی سرخی تھی۔

"علامہ کا پاؤں بھاری۔"

دوسرے دن سے عیادت کرنے والوں کا "تانتا بندھ گیا۔"

"گھر اچھا خاصا زچہ خانہ بن گیا۔"

اگلا پڑاؤ ظفر کے یہاں تھا۔ شام کو۔ سامان اٹھوایا۔ بل ادا کیے۔ بیروں کے سلام کا ٹپ سے جواب دیتے ہوئے

روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی پر سامان میں علامہ بے تصویر بھی شامل تھے۔

ظفر کے یہاں اسباب بہ عجلت علامہ سے اٹھوایا۔ اُن کے پورٹ فولیو کا بار ہم نے سنبھال لیا۔ علامہ داخل ہوتے ہی ظفر سے جنگجو مرغوں کی طرح لڑنے لگے۔ ظفر اُن کے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ناشتہ پیش کرنے میں مصروف رہے۔ اس وقت وہ کچھ باقاعدہ خوشی کے موڈ میں تھے۔

علامہ بولے:

"مجھے تصویر چاہیے ناشتہ نہیں۔"

"تو مت کرو۔"

"نہیں کریں گے۔"

"رات کو کھانا بھی مت کھانا!"

"اگر بھوک لگ گئی؟"

"تو تصویر کی یاد سے پیٹ بھر لینا۔"

دونوں مرغوں کی طرح لڑنے لگے۔ میں نے گھور کر دیکھا تو دونوں نے پر سمیٹ لیے۔ ظفر نے تو پانی میں گردن ڈال دی مگر علامہ گردن پھلائے رہے۔ اتنے میں ارشد آگئے۔ علمی گفتگو چھڑ گئی۔ باتوں کے دوران بے خیالی میں علامہ کے پورٹ فولیو کی زِپ کھولی۔ شاعری کی بیاضیں، سادے پوسٹ کارڈ، رسیدی ٹکٹ، پتوں کی چھوٹی سی نوٹ بک، ماضی کے اہم ترین مشاعروں کے دعوت نامے، ہوائی جہاز کے پرانے ٹکٹ اور مسجد کی مرمت کے چندے کی رسید بک۔ مسجد کا جو پتہ درج تھا۔ اُس علاقے میں سرے سے کوئی مسجد نہ تھی۔ پھر ایک اندرونی لمبی سی زِپ تھی۔ اعمال دیکھ لیے تو خیال آیا کہ اب ذرا مال بھی دیکھ لیں۔ ایک پانچ سو روپے کا چیک اُن کے نام کسی رئیس شہر کا تھا۔ جو غالباً کسی کی ہجو اس کے منہ پر پڑھ دینے کا معاوضہ تھا۔ پچاس روپے کا بالکل نیا نوٹ اور ایک سخت قسم کا لفافہ تھا۔ اُسے کھول کر دیکھا تو اس میں وہ متنازعہ تاریخی تصویر محفوظ تھی۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بے حیائی کا

ہنسی ہنس رہے تھے ظفر کہنے لگے:

"سر تصویر کا ہنگامہ گرم رکھنے کے لیے تصویر چھپا لیتے ہیں تاکہ تصویر اور اس کی اہمیت کی پبلسٹی کا سلسلہ جاری رہے۔"

ہم نے چیک … دیر رکھ کر زِپ بند کر دی اور ملازم کو پچاس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"تصویر ملنے کی خوشی میں بھنا ہوا مرغ اور مٹھائی لیتے آؤ۔"

علامہ نے ارشد کو تصویر دکھانی چاہی وہ بولے۔

"علامہ اگر آپ نے تصویر نکالی تو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"واہ واہ! واہ! آپ سمجھتے ہیں کہ اس تصویر کی میرے پاس صرف ایک ہی کاپی ہے۔؟"

* اسمٰعیل ظریف

کب تک

یہاں کرتے رہیں گے شاعری یہ شاعراں کب تک
کھلے بندوں پھریں گی روڈ پر یہ تتلیاں کب تک
مچائی جائیں گی یہ اشتہاری شادیاں کب تک
پریشاں میزبانی میں رہیں گے میزباں کب تک
بگھارے میں بدل دیتے ہیں بریانی کو مولانا
مبارک ہو نیا یہ سال سب کو دوستو لیکن
کرو کچھ کام دھندا یا پولس میں نوکری کرلو
جو کل مہرو تھی اب مہرالنساء معلوم ہوتی ہے
توقع تو نہیں ہے ہم کو مولانا سے یہ لیکن
وظیفہ یاب ہیں لیکن ابھی ہے شوق پچپن کا
جگالی کیجیے گا پان کھاکر شوق سے لیکن
اجازت ہو تو میں اک بات پوچھوں اہل محفل سے
پگھل جاتی ہے اکثر برف کی مانند یہ دولت
ازاری تمہاری آج بھی مشکوک ہے یارو
ںاں پر کچھ ہے دل میں اور ہی کچھ ہے

وہاں دیتی رہیں گی داد گھر میں بیویاں کب تک
سر بازار ان بھونروں کی یہ آہ و فغاں کب تک
لگائی جائیں گی لڑکوں پر آخر بولیاں کب تک
اڑائی جائیں گی چوٹی میں یہ بریانیاں کب تک
صفائی ہاتھ کی دکھلائیں گے یہ مہماں کب تک
تمہیں دیتے رہیں گے ہم مبارکبادیاں کب تک
پھرو گے اس طرح بیکار بن کر پہلواں کب تک
یہ آیا پر خصوصی مہربانی مہرباں کب تک
یہ اک اک کر کے جائیں گی ہماری مرغیاں کب تک
دکھلائیں گی نواسوں کو بھی یہ جھریاں نانی ماں کب تک
در و دیوار پر یہ سرخیاں گلکاریاں کب تک
عزیزو محفلوں میں بیڑیوں کا یہ دھواں کب تک
لٹاؤ گے یہ باہر کی کمائی مہرباں کب تک
ملاتے جاؤ گے یہ خواہ مخواہ ہی ہاں میں ہاں کب تک
بجائی جائیں گی تقریر پر یہ تالیاں کب تک

ظریف اس دور کا شاعر بھی اب بشرٹ پہنتا ہے
پہن کر آؤ گے شادی کی تم یہ شیرواں کب تک

کر دیا ہے

* مجتبیٰ حسین

سرور ڈنڈا کی یاد میں

نہیں آتی جو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

سرور ڈنڈا کی یاد میں جب مضمون لکھنے کے لئے بیٹھا تو نہ جانے کیوں یہ شعر مجھے اچانک یاد آگیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ سرور ڈنڈا کی یاد مہینوں تک نہ آتی ہو اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ یاد آتے ہیں تو یاد آتے ہی چلے جاتے ہیں۔ سرور ڈنڈا کی یاد ایک نارمل یاد ہے اور وہ اسی وقت یاد آتے ہیں جب انہیں یاد آنا چاہیئے۔ مگر اِدھر کچھ عرصہ سے اُردو والوں اور بالخصوص میری عمر کے اُردو والوں کا حافظہ دن بہ دن یادوں کے بوجھ تلے دبتا چلا جارہا ہے۔ اُردو کم ہوتی جارہی ہے اور اُردو کا حافظہ بڑھتا جارہا ہے۔ کبھی کبھی ڈر ہوتا ہے کہ حافظہ یادوں کے اس بھاری بوجھ کو سہار بھی سکے گا یا نہیں۔ آدمی اور معاشرہ کی زندگی میں ایک منزل وہ بھی آتی ہے جب آدمی جھنجھلا کر یہ التجا کرتا ہے کہ اُس سے اس کا حافظہ چھین لیا جائے حالانکہ یاد کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ آدمی یوں بیٹھے بیٹھے اس سے دستبردار ہونا چاہے۔ یاد تو بڑی میٹھی اور خوشگوار سی چیز ہے بشرطیکہ آدمی کو یہ طمانیت ہو کہ اس طرح کی یاد میں آنے والے زمانہ کے افسانوں میں بھی جاری و ساری رہیں گی۔ اُردو والوں کے حافظہ کے ساتھ مشکل یہ ہو رہی ہے کہ وہ معاشرہ اور وہ نیا حافظہ اب تشکیل نہیں پا رہا ہے جو یادوں کے اس سلسلہ کو آگے تک لے جائے۔ ہر دور یادوں کی کچھ کڑیاں آنے والے دور کے واقعات اور امکانات کی کڑیوں سے جوڑ دیتا ہے۔ ہمارے پاس یادوں کی کڑیاں تو ہیں لیکن امکانات کی کڑیاں اب کم ہوتی جارہی ہیں۔ یادوں کی کڑیوں کو آگے جوڑیں تو کس سے جوڑیں۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ یادوں کو پرے اپنے ذہن سے اتار پھینکیں۔ ایک اُردو والا اٹھتا ہے تو اس کے ساتھ یا اس کے آگے پیچھے اسکی یادیں بھی اٹھ جاتی ہیں اور پھر اُس طرح کا آدمی دوبارہ پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی سے بڑی سیاسی یا سماجی شخصیت جب دنیا سے

اٹھتی ہے تو لوگ رسماً یہ کہتے ہیں کہ اس شخصیت کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پُر نہیں ہوگا ۔ یہ باتیں صرف دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ ہم نے بڑی سے بڑی شخصیت کی موت سے پیدا ہونے والے خلا کو بڑی خوش اسلوبی سے پُر ہوتے دیکھا ہے بلکہ بعض بڑی شخصیتیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جو زندہ رہتی ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے زندہ رہنے سے خلا نہ صرف پیدا ہو رہا ہے بلکہ پھیل بھی رہا ہے۔ اس کے برعکس اردو کا چھوٹے سے چھوٹا ادیب بھی اٹھتا ہے تو اس کی موت سے پیدا ہونے والا خلاء پُر نہیں ہوتا ۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں عجیب و غریب خیالات آنے لگتے ہیں ۔ حکومت جب کبھی کسی معدوم ہونے والے جنگلی جانور یا پرندے کی نسل کی حفاظت کے لئے خصوصی اقدامات کرتی ہے تو میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا اردو والوں کو جنگلی جانور یا پرندہ ہی سمجھ کر اُن کی نسل کی حفاظت کے لئے خصوصی اقدامات نہیں کئے جا سکتے؟

سرور ڈنڈا کو ہم سے بچھڑے ہوئے کم و بیش دو دہے بیت گئے ۔ سرور ڈنڈا جب ہم سے جدا ہوئے تھے تو میرے حافظہ میں ان کی یاد کو محفوظ رکھنے کی بڑی گنجائش تھی ۔ اب بیس برس بعد اپنے حافظہ پر نظر ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ بعد میں اس حافظہ میں اسی شہر حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی کتنی ہی موہنی سی شخصیتوں کی یادوں کو سجانے کے لئے جگہ گنجائش نکالنی پڑی ۔ مخدوم محی الدین ، سلیمان اریب ، علامہ حیرت بدایونی ، عالم خوندمیری ، سلیمان خطیب ، ابن احمد تاب ، اوج یعقوبی ۔ شاذ تمکنت اور نہ جانے کتنے ہی لوگ اپنا نعم البدل فراہم کئے بغیر اس دنیا سے اٹھ گئے ۔ اُردو کا حیدرآباد سمٹتا جارہا ہے اور ہم جیسوں کے حافظہ میں آباد ہوتا جارہا ہے اور یہ حافظہ کب تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے ؟

اس پس منظر میں سرور ڈنڈا کو یاد کرنے بیٹھا ہوں تو مجھے صرف سرور ڈنڈا یاد نہیں آرہے ہیں ۔ بلکہ سرور ڈنڈا کے کئی گمنام سامعین بھی یاد آرہے ہیں ، وہ سارا ادبی اور سماجی منظر نامہ میری آنکھوں میں ازسرِ نو جاگ گیا ہے جس میں بیس برس پہلے کا حیدرآباد سانس لیتا تھا ۔ وہ شکلیں نہ جانے کیا ہوئیں ، وہ آوازیں نہ جانے کہاں کھو گئیں ۔ کیا محفلیں سجتی تھیں ، کیا رونقیں لگتی تھیں ۔ ادب کے بنجارے سخن کی سوغات اپنی پیٹھوں پہ لاد کر چلے گئے اور سب ٹھاٹ پڑا رہ گیا ۔ بیس برس ہو گئے حیدرآباد کے کسی مشاعرے میں " ڈنڈا واخشیڈ " کی گونج سنائی نہیں دی حالانکہ بیس پچیس برس پہلے حیدرآباد کا کوئی مشاعرہ اس نعرے کے بغیر کامیاب نہیں ہوتا تھا ۔

اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ سرور ڈنڈا سے پہلے پہل کب ملاقات ہوئی تھی ۔ میرا تو ایسا خیال ہے کہ سرور ڈنڈا سے پہلے پہل اُسی وقت ملاقات ہوئی تھی جب میں نے زندگی میں پہلا بھرپور اور معنی خیز قہقہہ لگایا تھا ۔ ربع صدی پہلے کے حیدرآباد کی سیاسی ، سماجی اور ادبی زندگی نئی نئی تبدیلیوں سے روشناس ہو رہی تھی ۔ پرانی اقدار ٹوٹ رہی تھیں اور نئی اقدار تشکیل پا رہی تھیں ۔ وہ دور حیدرآباد کے اُردو ماحول کا زرّین دور تھا ۔ مجھے یہ دعویٰ تو نہیں ہے کہ میں سرور ڈنڈا کو بہت قریب سے جانتا تھا ۔ میرا اُن سے رشتہ وہی تھا جو ایک مداح کا فنکار سے ہوتا ہے ۔ سرور ڈنڈا کو میں نے سب سے پہلے ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا جس میں وہ اپنی مشہور نظم - ڈنڈے کی شاعری میں ، پولیس کی ڈائری میں فل اسٹاپ نہ کاما ، سنجیوا ریڈی ماما " سنا رہے تھے ۔ اُن کی نظم خوانی کا انداز ایسا اچھوتا اور نرالا ہوتا تھا کہ سیدھے سننے والے کے دل میں اُتر جاتا تھا ۔ ڈنڈا کے بعد میں نے کسی اور شاعر کو اس اچھوتے ڈھنگ سے کلام سناتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ اپنے آپ میں ڈوب

سرور ڈنڈا

دشمن بی ہور دلبر، دونوں بی رام ہوتیں
ڈنڈے میں ہے یہ قدرت اب تم سکیا چھپینا

صحرا سے لیلیٰ مجنوں سڑکوں پہ چلے آئے
معیارِ محبت کو فلموں نے گھٹا ڈالا

ایمان کے باتاں ڈُل ڈُل کو بہرواں کو سنانا مشکل ہے
ان پنڈت ہور ملاؤں کو انسان بنانا مشکل ہے

کے اور لہک لہک کے کلام سناتے جاتے تھے۔ سرور ڈنڈا کی نظم خوانی کا خمیر دکن دیس کی مٹی سے اٹھا تھا۔ دکن کے لوک گیتوں کا آہنگ اُن کی نظموں میں بسا ہوا تھا۔ ہم لوگ کبھی ان کی نظم خوانی کی تعریف کرتے تو مذاق میں کہتے "میاں! کلام ذاتی ہو تو شاعر اسی اعتماد کے ساتھ نظم خوانی کرتا ہے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ ڈنڈا نے شاعری کب شروع کی تھی مگر جس دور میں ڈنڈا نے شاعری کی وہ دور ہی ڈنڈا کی شاعری کے لئے تھا۔ سماج کئی تضادات سے گذر رہا تھا۔ مختلف مفادات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، قدم قدم پر طنز کرنے کے مواقع تھے۔ اس ماحول میں سرور ڈنڈا نے سماج کی بے اعتدالیوں پر اپنی شاعری کا ڈنڈا برسانا شروع کیا۔ ڈنڈا کی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے کہیں بھی تصنع یا مروت سے کام نہیں لیا بلکہ انہوں نے نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ ہمارے سماج کی برائیوں کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیا۔ ڈنڈا کی شاعری مظلوموں کی حمایت میں ظالم کے خلاف، مزدوروں کی حمایت میں سرمایہ داروں کے خلاف، سچائی کی حمایت میں جھوٹ کے خلاف، پاکیزگی کی حمایت میں گندگی کے خلاف ایک بھرپور وار تھی۔

ڈنڈا اپنی شاعری میں جتنے چالاک اور چوکس نظر آتے تھے۔ عملی زندگی میں اتنے ہی معصوم اور نیک نفس انسان تھے۔ خدا نے خلوص اور محبت کا جذبہ انھیں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی عطا کیا تھا جسے وہ اپنے دوستوں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے سنا تھا کہ ڈنڈا پیشہ کے اعتبار سے مصور تھے مگر میں نے کبھی اُن کی تصویریں نہیں دیکھیں۔ ہوسکتا ہے غالب کی طرح شائد انھوں نے مدرخوں کے لئے مصوری سیکھ رکھی تھی۔ کسی نے بتایا تھا کہ ڈنڈا اسکول آف آرٹ کے آخری سال میں چھ سال تک فیل ہوتے رہے۔ شاعری میں کامیاب ہونے کے لئے غالباً مصوری میں ناکام ہونا ضروری تھا۔ اُن کے لئے اصل میں شاعری ہی ذریعۂ عزت تھی۔ باقی ساری باتیں ذیلی تھیں۔

وہ زیادہ تر معظم جاہی مارکٹ کے آس پاس یا مجردگاہ کے کمرہ نمبر ۷ میں پائے جاتے تھے۔ ڈنڈا کو جتنی مقبولیت حاصل ہوئی اتنی شائد ہی کسی کے حصہ میں آئی ہو مگر اس کے باوجود وہ اپنی شاعری سے بے نیاز اور بے تعلق سے رہتے تھے۔ میں نے مشاعروں میں اکثر یہ منظر دیکھا کہ لوگ ڈنڈا کو سننے کے لئے بے تاب ہیں "ڈنڈا وانٹیڈ" کا شور بلند ہورہا ہے اور ڈنڈا کسی گوشے میں خاموش سے بیٹھے ہیں اور مائیک پر آنے سے گریز کررہے ہیں۔ وہ اکثر اپنی نظم سناکر اچانک مشاعرے سے چلے جاتے تھے۔ کئی بقیہ شعراء کے لئے ڈنڈا ہمیشہ ایک مسئلہ بنے رہے۔ مشاعرہ میں اُن کے آنے سے پہلے اور اُن کے جانے کے بعد ایک عجیب و غریب کیفیت ہوتی تھی۔ اکثر مشاعرے اُن کے جانے کے بعد خود بخود ختم ہوجاتے تھے۔ ڈنڈا کے بعد کسی شاعر

کا رنگ جمتا ہی نہیں تھا۔ اسی لئے منتظمین کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ڈنڈا کو سب سے آخر میں پڑھایا جائے۔ ڈنڈا خود بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ یا تو مشاعرہ میں بہت دیر سے پہونچتے تھے یا کسی ایسی جگہ بیٹھتے تھے جہاں سامعین کی نظر ان پر نہ پڑنے پائے۔ اُن کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ سنجیدہ شاعروں کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ ڈنڈا سچ مچ عوامی شاعر تھے۔ کوئی نئی نظم کسی مشاعرہ میں سناتے تو دوسرے ہی دن حیدرآباد کے گلی کوچوں میں اس کی گونج سنائی دیتی تھی۔

ڈنڈا کی شخصیت کا ایک عجیب وغریب پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شخصی زندگی میں بے حد مذہبی آدمی تھے لیکن سماجی زندگی میں انھوں نے ہمیشہ بائیں بازو کی طاقتوں کا ساتھ دیا۔ سیاسی جلسوں میں بھی یہ اپنا کلام سناتے تھے۔ ڈنڈا کی مشہور نظم "شاہ پور واڑی سے پہاڑی میری چلی رے میری گھوڑا گاڑی" کم از کم پچیس تیس برس پہلے کی نظم ہے۔ لیکن آج بھی آپ شاہ پور واڑی سے بھلے ہی گھوڑا گاڑی میں نہ نکلیں، موٹر گاڑی میں ہی نکلیں تو یہ نظم آپ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

ڈنڈا نے بہت کم عمر پائی لیکن اس کم عمری میں انھوں نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ کسی اور مزاحیہ شاعر کے حصے میں نہ آسکی۔ آخری دنوں میں ڈنڈا کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور وہ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد کو چھوڑ کر مدینہ چلے جانے کا فیصلہ بھی کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے سرور ڈنڈا کے اعزاز میں ایک وداعی مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ یہی اُن کا آخری مشاعرہ تھا۔ اُن سے میری آخری ملاقات اُن کے انتقال سے بیس پچیس دن پہلے گاندھی بھون کے سامنے ہوئی تھی۔ وہ رکشا میں سوار گھر جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر رکشا رکوائی۔ میں نے خیریت پوچھی۔ بولے "کئے کی خیریت میاں، کیسی خیریت۔ زندگی کے دِناں کاٹ رؤں۔ جلد ہی مدینہ چلے جاؤں گا میاں۔ دعا کرو"۔
اور کچھ عرصہ بعد سرور ڈنڈا مدینہ تو نہیں گئے البتہ اُن کی زندگی کی گھوڑا گاڑی اسی شہر میں رُک گئی اور دکنی زبان اپنے ایک اکیلے شاعر سے محروم ہو گئی۔

--

o o o

وجاہت علی سندیلوی

میرے دفتر میں جہاں چند ہی مہینے پہلے میری تعیناتی ہوئی تھی میرے دوستوں اور ساتھیوں کو مجھ سے ایک عام شکایت تھی کہ میں کسی کو اپنے گھر کا صحیح پتا نہیں بتاتا۔ وہ اسے میرے بخل پر محمول کرتے اور اکثر میری پیٹھ پیچھے یہ قیاس آرائیاں کرتے کہ میں اتنا نمبری کنجوس واقع ہوا ہوں کہ میں کسی کو اپنے گھر پر ایک پیالی چائے یا ایک گلاس شربت پلانے کا بھی روادار نہیں ہوں۔ میں اس آوازۂ خلق کو نقارۂ خدا سمجھ کر ایک عجیب احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا اور اپنے ماتھے سے بخل کا یہ مفروضہ داغ چھڑانے کے لیے طرح طرح کی حرکات مذبوحی کرنے لگا۔ اور اپنی اوقات بھول کر بات بے بات حاتم طائی بے چارے کی قبر پر لاتیں مارنے لگا۔

خود سگریٹ نہ پیتے ہوئے دوسروں کو بلا بلا کر پلانے میں ہر دن سگریٹ کی کئی ڈبیاں پھنکوا دیتا۔ خود صرف ایک پیالی پینے کا گنہگار ہوتا لیکن دفتر کے کینٹین میں اپنے اوپر طاری کی ہوئی مہماں نوازی کی بدولت بارہ چودہ چائے کی پیالیاں بسکٹ، نمکین اور میٹھے وغیرہ کے ساتھ میرے نامۂ اعمال میں لکھی جاتیں۔ چھٹیوں کے بعد اپنے وطن سے پلٹتا تو دفتر کے ہر کس و ناکس کے کام و دہن پر سندیلے کے شہرۂ آفاق لڈوؤں سے چاندماری کرتا ـــــ لیکن مرغے کی ٹانگ وہی ایک رہی ـــــ میں بخیل میری سات پشتیں بخیل کیوں کہ میں اپنے گھر کا صحیح پتا بتانے سے گریز کرتا ہوں۔

دفتر کے ہیڈ کلرک چھیلے رام جی نے غالباً میرے گھر کا سراغ لگانے کے لیے باہمی دعوتوں کا ایک چکر چلایا تھا۔ میں کسی بھی ساتھی کے گھر دعوت میں شریک نہیں ہوا اور اپنی غیر حاضری کے نو بہ نو بہانے تراشتا رہا اور جب میری باری آئی تو بیوی کے میکے چلے جانے کا بہانہ کر کے ایک ہوٹل میں ایسی شاندار دعوت کر دی کہ بعد میں خود اپنے آپ کو سمجھانا پڑا کہ جس دفتر کی تنخواہ سے ہماری روزی چلتی ہے وہاں اگر ایک مہینے ہم نے آنریری کام کر دیا تو کیا ہوا۔

میں نے گھر پھونک کر (کاش کہ پھونکنے کے لائق بھی میرا کوئی گھر ہوتا)، جو تماشا دیکھا تھا اور اپنی شاہ خرچیوں کو صابن بنا کر اپنے ماتھے سے بخل کا مفروضہ کلنک کا ٹیکا دھونے کی جو کوشش کی تھی، اُس نے خلاف توقع ایک دوسرا ہی گل کھلایا اب میرے خلاف بخل کے الزام کے ساتھ ہی ساتھ یہ افواہ بھی گشت کرنے لگی کہ میں دفتر کی ملازمت کی آڑ میں کوئی دوسرے [illegible] دھندا کرتا ہوں اور اسی لیے اپنے گھر کے پتے کو صیغۂ راز میں رکھتا ہوا ہوں۔ اور اس افواہ کے ثبوت میں میری

وہ فیاضیاں جو مجھ کو طوعاً و کرہاً کرنا پڑی تھیں ایک ایک کر کے گنوائی جانے لگیں۔

حالات کے اس پیچ و خم کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ یہ بات بھی نہیں تھی کہ میں اپنے گھر کا پتا بتاتا نہیں تھا۔ یقین مانیے کہ جس کسی نے بھی براہ راست پوچھا میں نے اپنے گھر کا پتا راستے کے نشیب و فراز کو بھی سمجھاتے ہوئے جہاں تک کہ میں خود جانتا، بڑی تفصیل سے بغیر کسی لگی لپٹی کے صاف صاف بتا دیا۔ لیکن اس کا میرے پاس کیا علاج تھا کہ ہمارے بتائے ہوئے پتے کو سن کر لوگ ہنستے، مذاق اُڑاتے اور کہتے کہ اس عجیب و غریب جغرافیے کا کوئی مکان ہو ہی نہیں سکتا ——— کیوں کہ اگر ہوتا تو چنبل کے ڈاکوؤں کو ہتھیار ڈالنے کی ضرورت ہی نہ تھی وہ بہت آسانی سے اس میں پناہ لے سکتے تھے۔

اب آپ بھی میرے مکان کا پتا سنیے۔

اکبر پور کے چوراہے سے بھیروں پرشاد کے دھرم شالے کو ایک دوغلی یعنی کچھ پکی اور زیادہ کچی جو سڑک لچکتی، مٹکتی اور کوڑے کے ڈھیروں میں غائب ہو کر پھر نکلتی چند چھوٹے چھوٹے تالابوں کے بیچ سے گزرتی، جاتی ہے اس کے دائیں اور بائیں جانب بہت سی گلیاں پھوٹتی ہیں۔ دائیں جانب کی بارہویں یا تیرہویں گلی کا نام ہے پرانی سرائے۔ نام کا نہ کوئی پتھر ہے نہ تختی لیکن بہرحال یہاں کے رہنے والے یہی نام بتاتے ہیں۔ ڈاکیے کو اس گلی میں کبھی دیکھا نہیں جو اس سلسلے میں کوئی مزید تصدیق کی جا سکتی۔ اس گلی میں اتنے بے شمار کھنڈر اور ملبے کے ڈھیر ہیں کہ یہ باور کر لینے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی کہ ان میں سے کوئی کسی پرانی سرائے کا بھی ہوگا۔ یہاں یقیناً اس قسم کے سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں کہ خدا کی خدائی سے باہر کس مسخرے نے اس اندھی گلی میں سرائے تعمیر کرنے کی جرأت کی ہوگی اور اس میں کون اپنی جان سے بیزار لوگ آ کر ٹھہرتے ہوں گے؟ لیکن ظاہر ہے کہ ان سوالات کے اُٹھانے کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے کیوں کہ اسی بچاری گلی نے مجھے اپنا سر چھپانے یا کم سے کم کسی جگہ کو اپنا گھر کہنے کا موقع دیا ہے۔ ملزم کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ جب پرانی سرائے تعمیر کی گئی ہو تو اس کے گرد و پیش کا جغرافیہ اب سے کچھ کیا بہت مختلف ہو کیوں کہ اس وقت دنیا نئی نئی آباد ہو رہی ہوگی۔

اپنے آغاز میں یہ گلی دس بارہ قدم اتنی پتلی ہے کہ اس سے ایک وقت میں صرف ایک شخص گزر سکتا ہے اگر ایک ہی وقت میں کوئی آ اور کوئی جا رہا ہو تو دونوں کو جبراً بغل گیر ہونا پڑتا ہے اور بدقسمتی سے آنے اور جانے والے اگر اجناس مختلف ہوتی ہیں یعنی ایک مرد اور ایک عورت ہوتی ہے تو کسی ایک کو باعزت اُلٹے پیروں پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے ورنہ ایک اچھا بھلا بکھیڑا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اگر آنے جانے والے کوئی گفتگو شروع کر دیتے ہیں تو دونوں ہی کے پیچھے ایک کیو سی لگ جاتی ہے اور پیچھے والے، آگے گفتگو کرنے والوں کے حسب نسب اور جنسی کردار کے متعلق طرح طرح کے ناقابل اشاعت انکشافات کرنے لگتے ہیں۔

شروع کی دو دائیں بائیں دو منزلہ عمارتوں کو چھوڑ کر گلی کے دونوں طرف کچی پکی کوٹھریوں لکڑی ٹین اور بانس کی جھونپڑیوں اور جھگیوں کا سلسلہ کافی دور تک چلا گیا ہے البتہ کہیں کہیں یہ کھنڈروں، ملبے اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے تھوڑی دور کے واسطے منقطع ہو جاتا ہے لیکن جلد ہی پھر شروع ہو جاتا ہے، گو کہ ماضی حال سے کچھ دیر دست بگریباں ہوتے کے بعد اس کے حق میں دست بردار ہو جاتا ہے۔ مستقبل کے یہاں آنے کا فی الحال کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان انسانی مسکنوں، بنیادگاہوں اور گھونسلوں کو اگر انسان کے زندہ رہنے کی ضد کی علامت سمجھا جائے تو صاحب نظر حضرات اپنے آپ میں بھی زندگی کا ایک نیا حوصلہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کے درمیان گلی کسی الھڑ حسینہ کی طرح مٹکتی، بھٹکتی، پھسلتی،

سکوتی کبھی دائیں کبھی بائیں مڑتی بڑے والہانہ انداز سے چلتی ہے۔ اور اگر کیچڑ، پانی کے گڈھوں، کوڑے کے ڈھیروں اور سوتے ہوئے کتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہاں یہ ایسی کوئی تنگ بھی نہیں ہے اور دو تین آدمی ایک ساتھ ایک قطار میں نکل سکتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے ملبوں اور کھنڈروں پر جھگیوں، جھونپڑیوں اور لکڑی کے اسٹالوں نے ایسے ہی قبضہ کر لیا ہے جیسے کسی چھپکلی کی لاش پر چیونٹیاں کرتی ہیں۔ بہرکیف مُردوں سے اگر زندوں کا کام نکل جائے تو کیا برا ہے۔ البتہ تین کھنڈر اپنی ناہمواری اور بلندی کی وجہ سے اپنا کم از کم درمیانی حصّہ بچائے ہوئے ہیں اور اب تک کھنڈر ہی کہے جاتے ہیں۔

داہنی طرف کا مقابلتاً سب سے چھوٹا کھنڈر جس کے ایک گہرے نشیب میں حوادث روزگار سے بچا ہوا ایک قابل استعمال پرانا کنواں بھی ہے، دن کے مختلف اوقات میں مختلف کاموں میں آتا ہے۔ سویرے یہ ادین ایر فراغت گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دوپہر میں دھوبی بانس کی تینچیاں لگا کر اس پر کپڑے پھیلاتا اور اپنے گدھے چراتا ہے۔ شام کو لڑکے اس پر کنکوے اڑاتے ہیں۔

منجھلے کھنڈر کی ایک پرانی بوسیدہ دیوار پر چھپر ڈال کر بھینسوں کا ایک ڈیری فارم کھول دیا گیا ہے اور اس کے ہر چار جانب کنڈوں کی کئی کئی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہاں آفتاب غروب ہونے کے بعد خانہ ساز شراب بھی بکتی ہے۔ اس کے ایک مقابلتاً ہموار نشیب میں ایک چاٹ والے کی دکان بھی ہے جو چراغ جلے کھلتی ہے۔ اس کے سامنے ملبے کو برابر کر کے جو ایک طرح کی قدرتی بینچیں بنائی گئی ہیں ان پر دن میں کتے لوٹتے اور شام کو خریدار بیٹھتے ہیں۔

تیسرا اور سب سے بڑا کھنڈر دائیں سے بائیں ایک نصف دائرے میں پھیلا ہوا ہے اس کے نشیب میں آٹے دال نمک وغیرہ اور چائے اور پان سگریٹ کے کئی لکڑی کے اسٹال باڑھا لیے ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے پرانی سرائے کا ہائڈ پارک کہہ سکتے ہیں۔ دن میں تو یہ بچوں کے کھیل کود کے میدان جانوروں کی چراگاہ اور نوجوانوں کی تفریح گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن شام کو اس کی مختلف ہموار سطحوں پر مختلف ٹولیاں آکر بیٹھتی ہیں اور نہ صرف پرانی سرائے کے کوائف اور حالات پر بلکہ پورے شہر، ملک بلکہ ساری دنیا کی خبروں اور معاملات پر آزادانہ تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ ہر شخص بلا روک ٹوک اپنی بولی بولتا ہے۔ کوئی بھوتنے پیر کی کرامتیں گنواتا، کوئی موسموں کی تبدیلی میں قرب قیامت کی علامتیں دیکھتا، کوئی مس گھوس کے چاہنے والوں کی فہرست نشر کرتا، کوئی کھنڈر کے ایک کونے میں بنائے گئے ہنومان مندر کے پرساد کی تقسیم پر اعتراض کرتا ہے۔ بولنے والوں کی رائے سے سننے والوں کو اتفاق کم اور اختلاف زیادہ ہوتا ہے اور اکثر کیا شور و تو تو میں میں اور گالی گلوچ کی نوبت آجاتی ہے اور کبھی کبھی آستینیں بھی چڑھ جاتی ہیں لیکن یہ سب کچھ عارضی ہوتا ہے اور فوراً گفتگو کے دوسرے موضوعات جو پہلے سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں چھڑ جاتے ہیں۔ چوں کہ یہاں کے دل کی نیت میں فتور نہیں ہوتا لہٰذا وہ رات گئی بات گئی کے اصول پر کاربند ہیں۔ انھیں رات کی باتیں سویرے یاد

رکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور سورج نکلتے ہی زیادہ تر مرد، عورت اور لڑکے اپنے اپنے کاموں یا مزدوری پر یا مزدوری کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔

آدھی رات کے قریب مرد اور عورتیں اٹھ جاتی ہیں تو پھر بڑے ٹیلے پر محلے کے کتّے اپنے مباحثے اور مشاعرے کر دیتے ہیں۔ انسانوں کی طرح یہ بھی بھونکتے زیادہ اور لڑتے کم ہیں، اور رات کی باتیں بھول کر دن میں ایک ساتھ گلی میں سوتے ہیں۔

قاعدے سے تو بڑے ٹیلے کا کھنڈر پر پرانی سرائے کی حد ختم ہو جاتی ہے بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی حد ختم ہو گئی ہے لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دوسرے ستر دروازے کھل جاتے ہیں۔ بڑے کھنڈر کے سینے کو چیرتی ہوئی بائیں جانب نشیب میں ملبے ہی سے نکالی ہوئی ایک ایسی پگ ڈنڈی ہے کہ جس پر قدم رکھتے ہی آپ نیچے کی طرف بے اختیار دوڑنے لگتے ہیں اور اس کے ختم ہو جانے پر بھی آپ بلا ارادہ پندرہ سولہ قدم گندے نالے کے بالکل کنارے دوڑتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک کافی کشادہ صحن آ جاتا ہے اور یہاں نالے کی بدبو کے باوجود آپ کم از کم اطمینان کی سانس لے سکتے ہیں۔

اس صحن میں جس کے چھوٹے بڑے آٹھ دس کونے ہیں، نالے کے بالکل سامنے پانچ دروں کی ایک عمارت ہے جو غالباً کیا یقیناً ملبے سے جبراً برآمد کی گئی ہے کیوں کہ اس کے تین طرف کوئی دیوار نہیں بلکہ ملبے ہی کے ڈھیر ہیں۔ ان دروں کا کچھ حصہ دھینوں اور باقی لکڑی کے تختوں، پرانے کواڑوں، سائن بورڈوں، ٹین کے ٹکڑوں اور پلاسٹک کے ٹکڑوں سے پاٹا گیا ہے۔ چار کھلے ہوئے دروں کے اندر مولا بخش صاحب اپنی بیوی پانچ بچوں اور تقریباً پچاس مرغے مرغیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور ایک در کو جس میں ایک بوسیدہ ساٹین کا دروازہ ٹانگ دیا گیا ہے اور جو ایک درمیانی کچی دیوار کی وجہ سے باقی عمارت سے علاحدہ سمجھا جاتا ہے، انھوں نے ازراہ غریب پروری مجھ کو ساٹھ روپے ماہوار کرائے پر اٹھا دیا ہے۔

ـــــ تو جی ہاں یہ ہے میرے غریب خانے کا پتا۔ آپ جب بھی چاہیں یہاں تشریف لا کر یہ شعر پڑھ سکتے ہیں ؎

انسان کے جور سے تو ہارے افلاک
افلاک کے جور سے نہ ہارا انسان!

اب یہ اور بات ہے کہ آپ کی واپسی کے وقت میرے مالک مکان اپنی مرغیوں کے انڈوں کے سلسلے میں آپ کی جامہ تلاشی لے لیں کیوں کہ ان نیک بخت مرغیوں کو انڈا دینے کے فرض کی ادائیگی کے لیے میری کوٹھری سے زیادہ کوئی پُرسکون جگہ نہیں ملتی۔ ■■■

میں شاعرِ اعظم ہوں

مفلس فاروقی

کیا میر ہے کیا غالب و سودا مرے آگے ۔۔۔ اور ذوق تو بالکل نہیں ٹکتا مرے آگے
کچھ رنگ نہیں داغ کا جمتا مرے آگے ۔۔۔ مومن ؟ ارے مومن تو ہے بچہ مرے آگے
اقبال بھی بیچارہ ہے لِٹا مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

اصلاح ولی دکنی نے مجھ سے ہی تو کی ہے ۔۔۔ حالی کی مسدس جو ہے میں نے ہی لکھی ہے
اقبال کو وہ بانگ درا میں نے ہی دی ہے ۔۔۔ اکبر کی مرے آگے کہاں دال گلی ہے
کیا چیز بھلا شاد و یگانہ مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

سیماب، جگر، جوش، فراق، حسرت، وفانی ۔۔۔ مخدوم، مجاز، اخترالایمان کہ جذبی
مجروح، عدم، فیض، اختر، ساحر و کیفی ۔۔۔ مخمور، شہریار، مظفر ہو کہ حبابی
مجھ کو تو کوئی بھی نہیں جچتا مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

اشعار میں ایہامِ معنی ہے کہ جبلی ہے ۔۔۔ لفظوں میں تنافر ہے کہ تعقید رہی ہے
فن اصل میں جو کچھ بھی ہیں ٹکروں گادی ہے ۔۔۔ نقادوں کی ٹولی مرے ٹکڑوں پہ پلی ہے
تنقید کا کچھ بس نہیں چلتا مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

چندے پہ مرے کتنے ہی چلتے ہیں ادارے ۔۔۔ چھپتے ہیں کئی میری ادارت میں رسالے
ہوتے ہیں صدارت میں مری جلسے ادب کے ۔۔۔ پیسے نے مرے مجھ کو دلائے کئی عہدے
شہرت میں کوئی کیسے بڑھے گا مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

ہو نظم، قطعہ ہو کہ غزل ہو کہ رباعی ۔۔۔ تخلیق مری صفحۂ اول پہ چھپے گی!
لکھوائی کسی سے ہے کہ خود میں نے ہے لکھی ۔۔۔ کھولے گا کبھی پول اڈیٹر کوئی میری
جرأت وہ بھلا کیسے کرے گا مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

خود میں نے مرے جشن بھی منوائے کئی بار ۔۔۔ نمبر بھی رسائل کے نکلوائے کئی بار
شعراء سے قصائد بھی ہیں لکھوائے کئی بار ۔۔۔ گلہائے عقیدت بھی پہنوائے کئی بار
قارونِ سخن لوگوں نے لکھا مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

ہر سمت ترنم کی مرے دھاک جمی ہے ۔۔۔ ہر شہر میں شہرت کی مری دھوم مچی ہے
ہر بزمِ سخن میں جو ہے اک مانگ میری ہے ۔۔۔ کیا جانیے کیا مجھ میں مگر ایسی لگی ہے
سب جھکتے ہیں مفلس نہیں جھکتا مرے آگے
میں شاعرِ اعظم ہوں کوئی کیا مرے آگے

* سرپٹ حیدرآبادی

فیملی پلاننگ

جس انسان کو، غرورِ کثرتِ اولاد ہوتا ہے
برائے راشننگ آفس وہ اِک جلّاد ہوتا ہے

نظر آتی ہے جس کے گھر میں، بچوں کی فراوانی
نظر آتا ہے وہ شاداں، مگر ناشاد ہوتا ہے

جو بچّے رکھ کے بھی کرتا ہے خواہش اور بچوں کی
وہ اپنے واسطے، خود ہی ستم ایجاد ہوتا ہے

معیشت کے اصولوں سے وہ ہو جاتا ہے بیگانہ
سبق سب بھول جاتا ہے جو اُس کو یاد ہوتا ہے

جسے کم مائگی دم بھر بھی دم لینے نہیں دیتی
بہر صورت وہ مفلس، قابلِ امداد ہوتا ہے

مقیّد ہوتا ہے جو مرد، عورت کی غلامی میں
وہی شوہر، اسیرِ قیدِ بے میعاد ہوتا ہے

جو سہتا ہے مسلسل ناز و نخرے بیوی بچوں کے
وہ رہ کر مُہر بر لب، پیکرِ فریاد ہوتا ہے

کنوارے پن میں کرتا ہے بسر جو زندگی اپنی
مصائب سے زمانے بھر کے وہ آزاد ہوتا ہے

عمل کرتا ہے جو منصوبہ بندی کے اصولوں پر
نہیں ہوتا کبھی برباد، وہ آباد ہوتا ہے

جو نل بندی و نس بندی پہ رہتا ہے عمل پیرا
نہیں ہوتا پریشاں وہ، سدا دل شاد ہوتا ہے

معاونِ نسلِ انسانی کی بندش کا نرودھ بھی ہے
تعاون اس کا بھی وجہہ مبارکباد ہوتا ہے

طریقے جتنے بھی، اسکیم میں ہیں کنبہ بندی کے
عمل جو ان پہ کرتا ہے وہی بس شاد ہوتا ہے

بہ الفاظِ دِگر سرپٹ عمل ہی کنبہ بندی پر
مجرّب اک علاجِ خاطرِ ناشاد ہوتا ہے

-:- -:- -:-

مسیح انجم

اِملی کی مدح میں

قدرت نے سرزمین دکن کو اِملی کے درختوں سے مالامال کیا ہے۔ یہاں اِملی کے بن کے بن پائے جاتے ہیں۔ اُلّو جو رانوں میں جاگنے اور مصرعۂ طرح دینے کے عادی ہوتے ہیں، اِملی کے بَنوں میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ دکن میں جاڑے کا موسم اور املی کا سیزن ساتھ ساتھ تشریف لاتے ہیں۔

اِملی پھل بھی ہے، ترکاری بھی، اور میوہ بھی۔ بچّے تو کچّی اِملیوں کو گاجروں کی طرح کھا جاتے ہیں۔ اور حسبِ استطاعت کھانسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کچّی اِملی کو کچّا کھا جانے کے لیے بلند حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ املی کے سیزن میں چھوٹے بچے اِملی کھا کھا کر بلند حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہیں۔ عورتوں کی طبیعت اگر بے تحاشہ اِملی کی طرف مائل ہو تو یہ ایک قسم کا سگنل ہے کہ عنقریب ان کے گھر ایک اور اِملی خور آنے والا ہے۔

اِملی مونث ہے۔ اس کا مذکر نہیں۔ یہی بات جب ہم نے ایک "کٹھ حجتی" قسم کے ریسرچ اسکالر سے کہی تو فرمایا "آپ قواعدِ اردو میں خاصے کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ تک نہیں معلوم کہ "اِملی" کا مذکر "اِملا" ہے اور یہ لفظ ارضِ دکن سے نِکلا ہے!"

آج کل ایسی ہی چونکا دینے والی ریسرچ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں ملنے لگی ہیں۔

املی کھانے کے بعد گلے میں ایک عجیب طرح کا لوچ پیدا ہوتا ہے۔ حیدرآبادی خواتین کے ڈھولک کے گیت اِسی لیے مشہور ہیں کہ وہ اِملی استعمال کرتی ہیں۔

اِملی سے جو آسان ڈش تیار کی جاتی ہے اس کا نام ہے، کھٹّا۔ کھٹّا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک کچّا کھٹّا۔ دوسرا بگھارا کھٹّا۔ کچّا کھٹّا تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جو سہولت انڈا ابالنے میں ہے، اس سے کہیں زیادہ سہولت کچے کھٹّے کی تیاری میں ہے۔ بیچلرس بڑی آسانی سے یہ ڈش تیار کر سکتے ہیں اور شادی کئے بغیر "بیچلرز کوارٹرس" میں برسوں زندگی گزار سکتے ہیں۔ کچّا کھٹّا تیار کرنے کا نہایت ہی آسان طریقہ، بلکہ یہی ایک طریقہ ہے کہ پہلے آپ اِملی کو پانی میں ڈال دیجیے۔ اِملی اگر کچّی ہو تو اُبال لینا چاہیئے۔ پھر سیدھے ہاتھ سے خوب متھیئے (دونوں ہاتھوں سے نہیں) متھنے کے بعد جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کو سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کی دراڑوں میں سے گزار کر چھان لیجیے اس کے بعد اصل میں نمک ملائیے مرچ اس قدر ملائیے کہ اس کی تیزی سے منہ جلنے لگے۔ نمک اور مرچ ملانے کے عمل کے دوران چکھ کر

دیکھ لینا کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ لیکن اس حد تک مت چکھئے کہ کھٹا ہی ختم ہو جائے۔ پھر اس کے بعد پیاز کاٹ لیجئے۔ لیجئے کچا کھٹا تیار!

کچے کھٹے کے ذریعہ ہوشیار بیویاں بھولے بھالے شوہروں کو کفایت شعاری کا سبق سکھاتی ہیں۔ اور پھر اس طرح پس انداز کئے ہوئے پیسوں سے وہ اپنے میک اپ کا سامان خریدتی ہیں۔ مہمانوں کو بھگانے کے لیے کچے کھٹے سے زیادہ مجرب نسخہ ابھی دریافت نہیں ہوا۔ گاؤں کی ہوشیار ساس "دیر قیام" داماد کو کچے کھٹے کے ذریعہ ہی بھگاتی ہے۔ اب ہم آپ سے کیا چھپائیں۔ ہم بھی "دیر قیام" مہمان کو بھگانے کے لیے یہی نسخہ آزمایا کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ نسخہ بھی بُری طرح ہاتھ دے جاتا ہے۔ گزشتہ مہینے ہی کی بات ہے کہ ہمارے گھر ایک ایسے مہمان آئے جو کسی طرح جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ہم تو مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے دیتے عاجز آ چکے تھے۔ چنانچہ جب پانی ہمارے سر سے اونچا ہو گیا تو ہم نے آخری حربہ کے طور پر کھٹے کو آزمانا شروع کیا اور مسلسل پانچ دن تک اپنے مہمان کی کچے کھٹے سے تواضع کرتے رہے لیکن "اثر اس پر ذرا نہیں ہوتا" کے مصداق ان پر کھٹے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ جیسے جیسے ہم کھٹا کھلاتے رہے ویسے ویسے ان کا ہاضمہ درست ہوتا گیا اور الٹا ان کی بھوک کھلتی گئی۔ جب یہ نسخہ بھی آجکل کی پیٹنٹ دواؤں کی طرح ناکام ہو گیا تو ہم نے انکی توجہ تاریخ قیام و طعام اور وزیٹنگ ویزا کی مدت کے اختتام کی جانب مبذول کروائی :

"جناب! کیا آپ جانتے ہیں کہ آج مہینے کی کونسی تاریخ ہے؟"

معزز مہمان نے مسکراتے ہوئے فرمایا "مہینے کی تاریخ تو یاد نہیں! البتہ کھٹے کی آج پانچ تاریخ ہے!"

ہاں تو ہم یہ بتانا ہی بھول گئے کہ کھٹے کی ایک اور قسم بھی ہے ——— اعجاز حسین کھٹا۔ جب بھی ہمارے دستر خوان پر کھچڑی اور کھٹا رکھ دیئے جاتے ہیں تو اعجاز حسین کھٹا بے ساختہ یاد آنے لگتے ہیں۔¹

جہاں تک بگھار سے کھٹے کی تیاری کا تعلق ہے، یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ بگھارا کھٹا تیار کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ شیخیاں بگھارنا۔ ویسے، بگھارا کھٹا اس وقت تک مزہ نہیں دیتا جب تک کہ اس میں چوڑیوں کی کھنک شامل نہ ہو۔

املی کے استعمال سے طبیعت تجارت کی طرف راغب ہوتی ہے۔ آندھرا کے جتنے بھی کامیاب تاجر ہیں وہ کسی نہ کسی عنوان سے املی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے "اڈلی" کے ساتھ "سامبر"۔ "دُڈا" کے ساتھ "سامبر"۔ چاول کے ساتھ "سامبر"۔ وغیرہ، وغیرہ کے ساتھ "سامبر"۔ "سامبر" میں املی کچھ اس طرح ملائی جاتی ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا سے کہیں زیادہ "دیدۂ بنیا" چاہیئے۔

کچی املی اوائل عمر کے ایام طے کر کے جوانی میں قدم رکھتی ہے تو وہ گدری املی کہلاتی ہے۔ گدری املی کا بدن بھی گدرایا ہوا ہوتا ہے۔ گدری املی کو دیکھتے ہی ہر ایک کے منہ میں پانی بھر آتا ہے حتیٰ کہ بڑے بوڑھے تک گدری املیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں لیکن، چوں کہ ان کے منہ میں دانت نہیں ہوتے، اس لیے صرف گھورنے پہ اکتفا کرتے ہیں۔ مصنوعی بتیسی لگا کر گدری املی کھانے سے دانت کھٹے نہیں ہوتے۔ گدری املی کا استعارہ پندرہ سولہ سال کی مہ جبیں پر "جینس" کی طرح بالکل چُست بیٹھتا ہے۔

املی کا شباب نہایت ہی عارضی ہوتا ہے۔ وہ بہت جلد گدری املی سے پکّی املی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو گھر میں کہیں بھی رکھیں، پڑی رہے گی۔

---

¹ دکنی کے مستند شاعر اعجاز حسین کھٹا جو کراچی میں مقیم ہیں۔

یہ املی کو محفوظ رکھنے کے لیے فریج کی قطعی ضرورت نہیں۔ ارضِ دکن کے باشندے جب بیرونِ ملک تشریف لے جاتے ہیں تو کھٹے کے لیے بڑے بے چین رہتے ہیں۔ حج کے لیے جانے والے بعض بزرگ تو احتیاط کے تقاضہ کے پیشِ نظر زادِ راہ کے طور پر املی کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

بیرونی ممالک میں کام کرنے والے حیدرآبادی جب اپنے وطن کو واپس لوٹتے ہیں تو ان کا جی بُری طرح کھٹی دال کھانے کی طرف مائل رہتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ املی ہی انھیں حیدرآباد کھینچ لے آتی ہے۔ ایک حیدرآبادی کو مہینے میں کم از کم ایک آدھ بار تو کھٹی ڈِش ملنی چاہیئے۔ ورنہ وہ اندر سے بالکل بجھا بجھا سا رہے گا۔ اور سارے کام چوپٹ کر دے گا۔ ہمارے دوست احباب جب کبھی خلیجی ریاستوں سے تشریف لاتے ہیں تو روزانہ ناشتہ میں کھچڑی کھٹا اور قیمہ کی فرمائش کرتے ہیں۔

ہم کوئی حکیم یا طبیب تو ہیں نہیں کہ املی کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں بتائیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ املی میں کیلشیم ہوتا ہے یا پوٹاشیم۔ البتہ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یونانی طب میں املی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یونانی اطباء املی سے اصلاحِ معدہ کا کام لیتے ہیں۔ اصلاحِ معدہ کے لیے جو یونانی دوا تیار کی جاتی ہے اسے "صفرہ شکن" کہتے ہیں۔ صفرہ شکن معدہ کی اصلاح کے لیے صف شکن کا کام انجام دیتا ہے۔ اور پھر اس کی ایسی اصلاح کرتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک صفرہ کو سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ صفرہ شکن کھٹ مٹ قسم کا ہوتا ہے۔ لڑکوں کو اگر ایک بار اس کا مزہ لگ جائے تو وہ روزانہ صفرہ کا بہانہ کر کے سارا مرتبان صاف کر دیں۔ صفرہ شکن بھوک کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ اور اشتہا کو بڑھاتا ہے۔ اسی لیے اس کو گرانی اور کنٹرول کے زمانے میں استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔

صفرہ کو مارنے کے لیے املی کا استعمال مفید ہے۔ ظاہر ہے، جب صفرہ مرے گا تو مزاج میں اعتدال پیدا ہوگا۔ اور اس اعتدال سے مزاح جنم لے گا۔ دکن میں مزاح نگاری کو محض اس لیے فروغ حاصل ہوا کہ یہاں املی کی بہتات ہے۔ باہر کے ادیب جب حیدرآباد میں بس جاتے ہیں تو پھر وہ بھی مزاح نگاری شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے شہر میں پنجاب کے دو ایسے آئی اے ایس عہدے دار بھی ہیں جو حیدرآباد آنے سے پہلے افسانہ نگار تھے۔ ہمارا اشارہ جناب بھارت چند کھنہ اور جناب نریندر لوتھر کی طرف ہے۔ جب ان دو حضرات کو املی راس آئی تو انہوں نے باضابطہ مزاح نگاری کا آغاز کیا۔ اور املی کی بدولت مزاح نگاری میں خوب نام کمایا۔ شائد اب آپ یہ پوچھیں کہ کیا آپ نے انھیں املی کھاتے یا کھٹا استعمال کرتے دیکھا ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ کھانے والے یہ تھوڑے ہی بتا کر کھاتے ہیں کہ دیکھو بھئی ہم املی کھا رہے ہیں اور کھٹے کی چسکیاں لے رہے ہیں!"

لطیفہ برطرف! اس سے آپ ہرگز یہ مراد نہ لیں کہ کھٹے کے استعمال سے مزاح نگاری آجاتی ہے۔ چنانچہ ایسی ہی غلط فہمی میں پڑ کر ہمارے ایک ناعاقبت اندیش دوست نے مزاح نگاری سیکھنے کے لیے کھٹا پینا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

دوسرے دن ہی پیچش میں مبتلا ہوکر فریش ہو گئے۔ تب ہم نے انھیں سمجھایا کہ مزاح نگاری کے لیے کھٹے سے کہیں زیادہ عقل سلیم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چوں کہ ان کے پاس عقل سلیم کی کمی تھی، اس لیے فوراً مزاح نگاری سے مستعفی ہوگئے۔

املی کو بر سر عام چٹخارے لیتے ہوئے نہیں کھانا چاہیے۔ اس سے دوسروں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ویسے، چھپ کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہمارا لٹریچر املی کے تذکروں سے خالی ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی نظریں املی کی طرف ذرا کم کم ہی گئی ہیں۔ ارض دکن میں رہتے ہوئے اور املی کھاتے ہوئے "حق املی" ادا نہ کرنا سراسر زیادتی ہے!!

□□

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں!

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵ روپے
دھرگھیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	"	۸ "
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ "
بہرحال	"	مضامین	۷ "
بالآخر	"	"	۱۲ "
تکلف برطرف	"	"	۱۴ "
قطع کلام	"	"	۱۲ "
الغنٰہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰ "
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبار خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
ملتائیں تائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵ "
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲ "
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	"	۱۲ "
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰ "
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعہ کلام	۱۲ "

پرویز یداللہ مہدی (بمبئی)

پسلی پھڑک اٹھی نگہِ انتخاب کی

نوٹ:۔ زیرِ نظر مضمون اگرچہ بالغ نظری کا متقاضی ہے تاہم 'نابالغ' قارئین بھی اسے پڑھ سکتے ہیں کہ اس سے ان کے بھی 'بلوغت' کی منزل پر پہنچنے کا موہوم سا احتمال ہے۔ (پرویز)

برسوں پہلے کسی شاعر نے فرمایا تھا ؎

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

ہم شاعرِ موصوف کے خیال کی تائید اس حد تک تو کرتے ہیں کہ بے لباسی یقیناً حضرتِ انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں اس سچائی سے بھی انکار نہیں کہ 'سترپوشی' اسی پیدائشی ننگے انسان کا تہذیبی ورثہ ہے مگر افسوس اس تہذیبی ورثے کے تئیں آزاد خیال نسل کا رویّہ ہمیشہ جارحانہ رہا، چنانچہ پہلے پہل جس لباس کی ایجاد و اختراع محض سترپوشی کی غرض سے ہوئی تھی اس میں پہلے تو جامہ زیبی کا عنصر شامل ہوا پھر اس کی جگہ 'خود نمائی' نے لے لی، اور آج یہ حال ہے کہ جو لباس کبھی تن ڈھانکنے کے لیے پہنا جاتا تھا اب وہی ڈھکی چھپی چیزوں کو اجاگر کرنے کے لیے زیبِ تن کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ملبوسات کے اسٹائیل اور ڈیزائین آئے دن موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں، اور اس تبدیلی کو دینے والوں نے فیشن کا مہذب نام دیا ہے کیوں کہ فیشن کے نام پر ہمارا جدّت پسند سماج ہر غیر مہذب اور ناشائستہ چیز کو شرفِ قبولیت عطا کر دیتا ہے فیشن ہمیشہ سیاسی نیتاؤں، اور فلمی ابھینیتاؤں کے قول و قرار کی طرح بدلتا رہتا ہے تاہم جس طرح سیاسی نیتاؤں کو 'ووٹوں' اور فلمی ابھینیتاؤں کو نوٹوں سے مطلب ہوتا ہے، اسی طرح فیشن کا مقصد بھی لباس کے پردے میں بے لباسی کے جذبے کو تسکین بہم پہنچاتا ہے، چنانچہ فیشن کی قینچی لباس کے ساتھ ویسا ہی بہیمانہ سلوک کرتی ہے جیسا کہ شیر اپنے شکار کے ساتھ یا ایک جغادری قسم کا نقاد کسی نوآموز قلمکار کے ساتھ کرتا ہے!

فیشن کی آڑ میں مردانہ لباس میں جو ناشائستگیاں راہ پا گئی ہیں وہ تو خیر صرف فرشتوں کے لکھے پر پکڑ میں آتی ہیں، البتہ زنانہ ملبوسات کی فتنہ انگیزیاں و قیامت خیزیاں آدمی کے دمِ تحریر میں آنے کے باوجود صاف بچ نکلتی ہیں کیوں کہ یہ دیکھنے والے کی "دکھتی رگ" پر ہاتھ انگلی رکھ دیتی ہیں، نتیجتاً ہر دمِ تحریر آدمی فیشن کے دامِ تعزیز میں اُلجھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے، اگلی سطور میں ہم مستورات کے چند غیر مستور ملبوسا

مختصر سا جغرافیہ بیان کرنے کی جسارت کرتے ہیں جو غیر شرعی بلکہ غیر بری، جاموں کی تعریف میں آتے ہیں، جنہیں اپنے یہاں کی فیشن پرست خواتین نے محض مغرب کی بھونڈی نقالی اور اندھا دھند تقلید میں بہ ہوش و حواس، بہ رضا و رغبت اپنایا ہے تاکہ جلی اور ہوس کی آگ کو مزید ہوا بلکہ پانی اور غذا بھی مہیا کی جاسکے۔ ذرا جگر تھام کے ملاحظہ فرمایئے...

اسکرٹ بلوز : جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ لباس دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس کا ایک حصہ جہاں تماشائی کو آہ بھرنے پر مجبور کرتا ہے، دوسرا حصہ بے ساختہ واہ کہنے پر اکساتا ہے جو حصہ آہ کی تعریف میں آتا ہے بلوز کہلاتا ہے۔ بلوز 'منی کہانی' کی طرح مختصر بھی ہوتے ہیں اور "مثنوی زہر عشق" کی طرح طویل بھی۔ یوں تو بلوز کا ہر گوشہ "غارت گر ہوش" ہوتا ہے تاہم گلا عرف گریبان پیمانہ بکف، بلکہ میخانہ بدوش" ہوتا ہے۔ خصوصاً ڈیپ نیک (DEEP NECK) والے بلوز تو بلا نوٹس دیکھنے والے کی گردن ناپتے ہیں، اس وضع کے گریبانوں کی کاٹ تلوار کی کاٹ کا کام کرتی ہے اور اخلاق کے تمام ضابطوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے، اس سے جہاں اہل بلوز کے اخلاق کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے وہیں دیکھنے والے کے اوصاف کا پوری طرح کباڑہ ہو جاتا ہے کیوں کہ ان مخصوص گریبانوں کی گہرائی و گیرائی، تماشائی کی بینائی پر راست اثر انداز ہوتی ہے اور چشم زدن میں "دشت بینائی" سے کوہ گولکان تک کی سیر بنا پاسپورٹ اور ویزا کے کروا دیتی ہے!

اب ذرا اس لباس کے دوسرے حصہ کی طرف آیئے، یہ جامہ عرف عام میں اسکرٹ کہلاتا ہے اس کی عملداری کمر سے گھٹنوں تک ہوتی ہے، اس لیے ہر آنکھ والا بلا چوں و چرا کیے، اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے، اس کے باوجود نہ گھٹنا سلامت رہتا ہے نہ آنکھ۔ کچھ عرصہ پہلے اسکرٹ کا پاکٹ اڈیشن بھی مارکٹ میں آچکا ہے، یہ 'منی اسکرٹ' کہلاتا ہے اور اس کا قافیہ بلکہ ردیف بھی اس قدر تنگ ہوتی ہے کہ یہ گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچ پاتا۔ اسکرٹ اور منی اسکرٹ میں وہی فرق ہوتا ہے جو دیواری کیلنڈر، اور جیبی جنتری، میں ہوتا ہے۔ یوں تو ہر لباس کے اپنے مخصوص آداب و آسن ہوتے ہیں لیکن منی اسکرٹ کا صرف ایک ہی آسن ہوتا ہے جس میں ذرا سی بھول چوک بعض رازہائے سربستہ کو برجستہ کھول دیتی ہے چنانچہ منی اسکرٹ پہننے کے بعد نشست و برخاست کے معاملے میں قدم قدم پر محتاط رہنا پڑتا ہے بالخصوص زینے چڑھتے یا اترتے وقت بار بار یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔

اسکرٹ اور بلوز پر مشتمل لباس چوں کہ اپنے مختصر اور محدود طول بلد اور عرض بلد کے باعث جسم کا کم سے کم رقبہ گھیرتا ہے اس لیے یہ "ہوادار لباس" کے زمرے میں آتا ہے اور تماشائیوں کی اکثریت کی ہوا بگاڑ دیتا ہے بلکہ کچھ کو تو شرطیہ پانی پانی کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لباس ملازم پیشہ اور پیشہ ور، ہر دو طبقے کی الٹرا ماڈرن خواتین میں خاصا مقبول ہے خصوصاً اس موسم میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے جب دفتروں کا مطلع گرانی الاؤنس اور بونس کی مانگوں سے ابر آلود ہو۔ یہ لباس اپنے اختصار کی وجہ سے متعلقہ افسروں اور مالکوں کے رگ و ریشے میں اس قدر انتشار بپا کرتا ہے کہ بالآخر ان کو ایک ایک منی بونس دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔!!

جینس (JEANS) : جینس، دراصل پتلون کے خانوادے کی تازہ ترین پیداوار ہے اور کمال یہ ہے کہ یہ آفت کی پرکالہ جس قدر مٹیالی، میلی، کھردری، بدرنگ اور بدوضع ہو اتنی ہی قیمتی ہوتی ہے جینس کی بلا تخصیص جینس، مردانے میں بھی دھوم ہے اور زنانے میں بھی، تاہم زنانہ جینس کی بات ہی کچھ اور ہے جس صفائی سے ایک شاعر مقطع میں اپنا تخلص فٹ کرتا ہے ہو بہو ویسی ہی صفائی اور خوبصورتی سے جینس بھی بعض حسیناؤں کے نازک بدن پر فٹ بیٹھتی ہے۔ چاہے جینس زدہ حسینہ کا مطلع، کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، مقطع البتہ صاحب ذوق حضرات سے شرطیہ
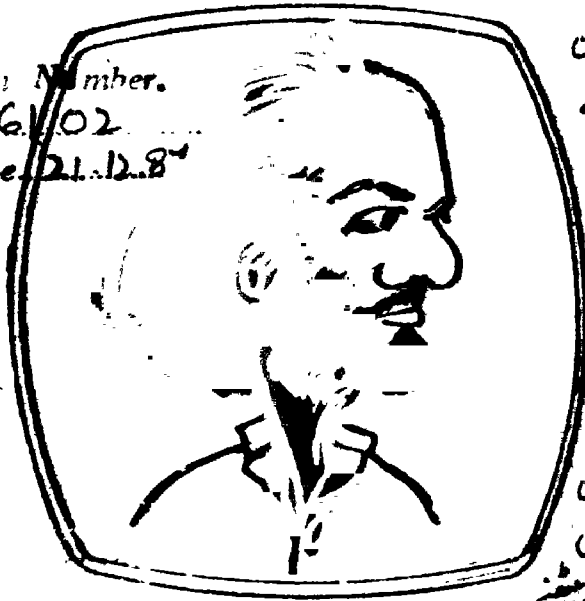
تعریف کے پھول بلکہ گلدستے وصول کرتا ہے یوں بھی جینس کی جان اس کی فٹنگ میں ہوتی ہے جو تمام اہم "سُرخیوں" کو اس خوبی سے ابھارتی ہے کہ پھر تفصیل سے خبریں پڑھنے کی حاجت نہیں رہتی، گویا لفافے کی "آوٹ لائین" (out line) دیکھ کر ہی لوگ مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ چُست جینس کسی سزا سے کم نہیں! اس کے باوجود بیشتر ماڈرن خواتین فیشن کے نام پر یہ سزا خوشی خوشی کاٹتی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ایک دعوت میں ہمیں ایک ایسی ہی "قید بامشقت" میں مُبتلا حسینہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اتفاق سے دعوت خالص ہندوستانی اسٹائیل کی تھی یعنی دسترخوان فرش پر چنا گیا تھا اور مہمان حسینہ چُست جینس کی تنگ چار دیواری میں انارکلی کی طرح چنی ہوئی تھیں لہٰذا جب میزبان نے محترمہ سے بیٹھنے کی درخواست کی تو وہ بڑی ہی دقت سے مسکرانے لگیں (مسکرانے کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھیں) چُست جینس نے ان کے تمام اعضائے رئیسہ و غریبہ پر "جمود" طاری کر رکھا تھا صرف ہونٹ آزاد تھے جو ایک تاسف انگیز مسکراہٹ کے ذریعہ دیگر اجزائے "ترکیبی" کی ترسیل سے محرومی کا اظہار کر رہے تھے۔ خاصی "جمناسٹک" کے بعد محترمہ بمشکل تمام بیٹھ سکیں اور بیٹھک بھی ایسی کہ جس پر "یوگا" کے کسی نئے "آسن" کا گمان ہو رہا تھا۔ اس قدر تہہ بہ تہہ ہو کر بیٹھی تھیں کہ لگتا تھا جیسے کھانا تناول فرمانے نہیں بلکہ دسترخوان پر "زانوئے ادب" تہہ کرنے بیٹھی ہیں۔ موصوفہ کی جینس کی چستی اور چال ڈھال کی سستی کو دیکھ کر ایک سر پھرے نے بھری محفل میں جملہ چست کر دیا۔ "محترمہ اس جینس کو سلوانے کے لیے آپ کو درزی کے ہاں کتنے دن رہنا پڑا ۔۔۔؟" جواب میں موصوفہ آگ بگولہ ہو کر اس گستاخ کو مارنے کے لیے اٹھیں لیکن وہ بھلا ان کے ہاتھ لگتا ۔۔۔ اُلٹا الہڑ کی چست جینس کے بے شمار ٹانکے اور متعدد تماشائیوں کی آنکھیں ضرور پھٹ گئیں۔

جینس عموماً ہر موسم میں پہنی جاتی ہے اور ساون کے اندھوں کے علاوہ ہوش مندوں کو بھی کچھ دیر کے لیے ہوش حواس تاب و تواں سب سے بیگانہ کر جاتی ہے!!!

ہاٹ پینٹ (HOT-PAINT): جینس میں سے اگر اس کے دونوں "پائنچے" جڑ سے سنہار دیئے جائیں تو جو حاصل تفریق آئے گا اس کا شمار بلا شبہ ہاٹ پینٹ میں ہوگا۔ گویا ہاٹ پینٹ اصل میں ہاف پینٹ ہے۔ لیکن یہ چونکہ "ہاٹ کیک" (Hot cake) کی طرح گرما گرم ہوتی ہے اس لیے ہاٹ پینٹ کہلاتی ہے۔ یہ بھی منی اسکرٹ کی طرح بہت کم جگہ گھیرتی ہے تاہم اپنے مختصر طول و عرض کے باوجود بہت کچھ عرض کر دیتی ہے۔ ہاٹ پینٹ کی خوبی یہ ہے بلکہ اس میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوتی ہیں، خرابی تو صرف دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ بہر حال جس خوبی کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ جس ہستی کے جسم کی زینت بنتی ہے اس کے درجۂ حرارت کو تو نارمل رہنے دیتی ہے لیکن اطراف و اکناف خاصی گرما گرمی پھیلا دیتی ہے نتیجتاً بے چارے تماشائیوں کا ٹمپریچر اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے بلکہ بعض کمزور ناظرین کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ ان کے ضبط کا پارہ "تھرما میٹر" کی حدود سے "باؤنس" (Bounce) کر جاتا ہے ۔۔!

مغربی ممالک میں ہاٹ پینٹ' کا شمار عموماً موسم گرما کے مقبول جاموں میں ہوتا ہے لیکن اپنے یہاں کی اڈوانس خواتین اسے اکثر کتوں کو سیر کرواتے وقت پہنتی ہیں۔ سیر تو خیر ایک بہانہ ہے اصل میں ہاٹ پینٹ' کی نمائش مقصود ہوتی ہے۔ ہاٹ پینٹ کی ایجاد نے البتہ کتا برادری کو احساس کمتری میں مبتلا کردیا ہے، کیوں کہ لوگ پہلے کبھی کبھار کتوں کی طرف بھی دیکھ لیا کرتے تھے لیکن اب ہاٹ پینٹ انھیں کہیں اور دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ ہوسکتا ہے ہاٹ پینٹ کے اس تازہ ستم پر بعض کتّے یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے ہوں، کاش ہم صرف ڈاگ نہ ہوتے ہاٹ ڈاگ (HOT-DOG) ہوتے!

ٹاپ لیس [TOPLESS] :- اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے صرف دیکھا جاسکتا ہے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جس لباس کو دیکھ کر آپ کے بیٹھے ہوئے رونگٹے اچانک کھڑے ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ یہی ٹاپ لیس ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ مشکل ضرور ہے تاہم ناممکن نہیں اردو زبان تو اس سے بھی بڑے صدمے سہہ چکی ہے لیکن ٹاپ لیس کو اپنانے والی دوشیزاؤں نے جب اسے من وعن اپنایا ہے تو ہم کیوں خواہ مخواہ ترجمے کے جھنجھٹ میں پڑیں۔ ویسے بھی کثرتِ استعمال کی وجہ سے اب یہ اپنی ہی زبان کا لفظ معلوم ہونے لگا ہے۔ عام طور سے بیشتر زنانہ ملبوسات کی عملداری شانوں سے شروع ہوتی ہے لیکن ٹاپ لیس کا "حدودِ اربعہ" شانوں کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتا، چنانچہ ان عناصرِ جسمانی پر تکیہ کرتا ہے جن کے ظہورِ ترتیب کا اُبھار دیکھنے والے کے ہوش و حواس کی ترتیب کو درہم برہم کردیتا ہے، اِن توبہ شکن عناصرِ جسمانی کی طرف ہمارے ایک پیشرو مزاح نگار نے اپنی اینگلو انڈین 'پرسنل سکریٹری' کے حوالے سے یوں اشارہ کیا ہے کہ جب وہ دو قدم چلتی تو اس کے "درمیانہ مشمولات" چار قدم کا فاصلہ طے کرتے تھے۔ ظاہر ہے جن باغی دمنہ زور اعضائے جسمانی میں سرکشی و سربلندی کا خمیر بدرجۂ اتم موجود ہو انھیں جامے کی قید میں محصور کرنا سراسر حماقت ہے، اور ٹاپ لیس' کی وبا نے اسی حماقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قلع قمع کردیا۔ شانہ بہ شانہ قسم کے ملبوسات کی بھیڑ میں ٹاپ لیس واحد لباس ہے جو "سینہ بہ سینہ" قسم کے جاموں کی تعریف میں آتا ہے۔

ٹاپ لیس کی وبا، عموماً اس موسم میں زور پکڑتی ہے جب جوانی یا جُنون کے عالم میں سرمستی بلکہ سرمستی، اشرف المخلوق کو جامے سے باہر ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ ایسے خطرناک موسم میں قدم قدم پر ٹاپ لیس کے فیوض و برکات "باغی و سرکش درمیانہ مشمولات کی حرکات و سکنات کے توسط سے دیکھنے والے پر عالمِ سکرات' طاری کرتے رہتے ہیں!!!

سی تھرو [SEE-THROUGH] :- یوں تو سبھی زنانہ لباس مقناطیسی' خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اس لیے ہر آنکھ والے کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں، لیکن سی تھرو وہ واحد جامہ ہے جس کا مقناطیس آدمی کو بیس کے سُرمہ بنا دیتا ہے۔ ہر لباس کی تراش خراش میں کچھ حصّے تازہ ہوا کی آمدو رفت کے لیے جان بوجھ کر کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں، جو سماج کے "سنسر بورڈ" کی قینچی کی زد سے اس لیے محفوظ ہوتے ہیں کہ اخلاقیات کے مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے، لیکن سی تھرو' وہ واحد پوشاک ہے جس میں انتہائی قابلِ اعتراض جگہ پر ایک جالی نما کھڑکی کی گنجائش بطور خاص رکھی جاتی ہے۔ اسے آپ اپنی سہولت کے لیے "دیدار کا دریچہ" بھی کہہ سکتے ہیں، البتہ اس دریچے کے رقبے اور سائز کا انحصار دیکھنے والے کی قوتِ برداشت اور اہلِ پوشاک کی جسمانی ساخت پر ہوتا ہے۔ سی تھرو کی اس جالی نما کھڑکی کے ذریعہ نہ صرف بادِ بہاری بلکہ بوالہوس نظروں کی کٹاری بھی صاف آر پار ہو جاتی ہے اس کے علاوہ مُفت میں اس پار سے اُس پار کا تر بتر نظارہ بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ ایسے پیشہ ورسوالی، جو سجا کر منتوں اور مُرادوں کی تھالی

تھام لیتے ہیں ہر لوگز سے پیر کے مزاج شناس کی جلال ان کی اِطلاع کے لیے عرض ہے کہ بی تھرد کی یہ جالی سوالی کی حسرت ہی نہیں دلوالہ بھی نکال دیتی ہے، گویا یہ جھرو کہ ایک دھوکہ ہے اور جالی ایک خطرناک چال ــــ

بسی تھرد چونکہ صرف جامہ ہی نہیں بلکہ دعوتِ نظارہ کا باضابطہ انوی ٹیشن کارڈ (INVITATION CARD) ہے اس لیے یہ کسی خاص موسم کا پابند نہیں، چنانچہ ہر موسم میں زبردست 'رش' لیتا ہے اور اکثر نقضِ امن کا باعث قرار دیا جاتا ہے ــــ!!

بکنی (BIKINI) :-

نظارے کو بھی تاب نہیں جس لباس کی
تعریف کیا کرے کوئی اب اس لباس کی

جی ہاں بکنی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ یہ خود کم کم ہوتی ہے بلکہ اتنی کم ہوتی ہے کہ اسے خوردبین لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے، اس کے باوجود اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ ڈھونڈنے والے کو نظر آ ہی جائے گی لیکن اِن اوصافِ حمیدہ بلکہ پوشیدہ کے باوصف یہ آتی جامے ہی کی تعریف میں ہے جب کہ حقیقتاً دیکھا جائے تو یہ زیرِ جامے کی تعریف میں بھی مشکل ہی سے آتی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ جامہ نہیں صرف "جام" ہے ایسا جام جسے دیکھ کر ہر خاص و عام جھومنے مچلنے، بہکنے اور لڑکھڑانے لگتا ہے۔ بکنی کے اختصار پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک بکنی پسند خاتون کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں پہنچی، اور شوکیس میں ٹنگی بے شمار بکنیوں کا جائزہ لینے کے بعد بالآخر انہیں ایک مہین اور مختصر ترین بکنی پسند آگئی۔ موصوفہ نے بکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیلزمین سے پوچھا "بھیگنے کے بعد یہ سکڑے گی تو نہیں ــــ؟"

سیلزمین نے جواب دیا۔ بالکل نہیں محترمہ! اس میں اب مزید سکڑنے کی گنجائش ہی کہاں ہے!"

بکنی کو ناتجربہ کار لوگ "سوئمنگ کاسٹیوم" (swimming costumes) کے زمرے میں شامل کرتے ہیں یہ بکنی کے ساتھ سراسر زیادتی ہے اگرچہ کہ بکنی اور سوئمنگ کاسٹیوم ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے باوجود ان میں وہی فرق ہے جو اک "نگہ" اور "نگاہ" میں پایا جاتا ہے بقول غالب ؎ وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے۔

بالفاظِ دیگر عام سوئمنگ کاسٹیوم اگر کسی پرانے ماڈل کی مِجھر دار بندوق کے مماثل ہے تو بکنی کو تازہ ترین تکنیک سے مزین "مشین گن" کا نعم البدل سمجھئے ــــ ویسے بکنی ہے تو سوئمنگ کاسٹیوم لیکن اسے زیبِ تن کرنے کے لیے تیراکی کی شرط نہیں، یوں بھی بکنی پہنی ہوئی حسینہ کا مقصد تیرنا نہیں، دوسروں کو ڈبونا ہوتا ہے، چاہے تماشائی کتنا ہی بڑا تیراک کیوں نہ ہو، بکنی میں ملبوس حسینہ کو دیکھ کر خشکی پر ہی غوطے کھانے لگتا ہے!

بکنی پہننے کے لیے یقیناً بڑا دل گردہ چاہیے لیکن اس میں بمشکل تمام سمائی ہوئی کا زادا کو دیکھنے کے لیے اس سے بھی بڑا دل گردہ چاہیے اس لیے بعض عاقبت اندیش حضرات اس کا شمار لباس کے زمرے میں قطعی نہیں کرتے الٹا اس کی مذمت میں یہ فرماتے ہیں کہ ؎ بقدرِ ستر نہیں ظرفِ تنگنائے لباس۔

بکنی کے لیے کسی خاص موسم کا لزوم ضروری نہیں کہ یہ موسم کی قید سے آزاد ہوتی ہے بلکہ لباس کی قید سے بھی آزاد ہوتی ہے اس کا تقاضہ سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں مزید گرمی پہنچاتا ہے۔ بکنی کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے لیے آدمی کا اپنی سطح سے نیچے اترنا لازمی ہے، اخلاقی معیار سے بھی جغرافیائی اعتبار سے بھی، کیوں کہ اسے سطحِ سمندر کے اطراف و اکناف کی آب و ہوا زیادہ راس آتی ہے، چنانچہ ایسے افراد جو سطحِ سمندر سے کافی بلندی پر رہتے ہیں جب بھی کسی ساحلی بستی کا رُخ کرتے ہیں تو ان کے مجوزہ پروگرام میں وہاں کے مشہور مقامات کی سیر کے علاوہ لبِ ساحل پر قطار در قطار لیٹی

ہوئی بکنی پوش حسیناؤں کے دیدار سے مشرف ہونے کی خواہش بھی شامل ہوتی ہے تاہم ایسے اصحاب جن کی معاشی سطح انھیں اپنی مخصوص سطح مرتفع سے نیچے اترنے کی اجازت نہیں دیتی، ان کی معلومات کی خاطر بکنی کی مختصر سی تشریح پیش ہے۔ دنیا کے نقشے پر جتنی جگہ "جزیرہ سری لنکا" گھیرتا ہے، بکنی بھی کم و بیش اتنی ہی جگہ کسی حسینہ کے بدن پر گھیرتی ہے، باقی جگہ تماشائیوں کی گھورتی ہوئی نظریں گھیر لیتی ہیں۔ اگرچہ کہ بکنی خالص انگریزی نام ہے لیکن ہمارے ایک دوست نے اردو میں اس کا نام "زنانہ تہمد" تجویز کیا ہے جبکہ ہماری ناچیز رائے میں یہ تہمد نہیں "تہمت" ہے تاہم اردو میں صرف ایک ہی لفظ اس قیامتِ صغریٰ کا متحمل ہو سکتا ہے اور وہ ہے فتنہ بلکہ فتنی بر وزن بکنی ــ بکنی اصل میں اس کوزے کا تازہ ترین روپ ہے جو صرف محاورے کی حد تک دریا کو اپنے میں سمو لیتا ہے چنانچہ جس کوزے میں چونے کا سمانا بھی مشکل ہو اس میں چھتیس، چوبیس، چھتیس (۳۶۔۲۴۔۳۶) کے فتنہ انگیز فیگر کی سمائی ایک خدائی کو دہائی دینے پر مجبور کر دیتی ہے!

متذکرہ بالا ملبوسات کی تفصیلات سے یہ عقدہ یقیناً کھل گیا ہوگا کہ دنیا کا کوئی جامہ فیشن کی زد سے محفوظ نہیں اور فیشن کی ہنر مندی انسانی عیوب کی پردہ پوشی نہیں کرتی بلکہ انہیں اور بھی طشت از بام کر دیتی ہے اس لیے ہماری نظر میں سب سے اچھا لباس وہی ہے جو عیوب کو ڈھانپتا ہو اور یہ خوبی صرف ایک ہی جامے میں پائی جاتی ہے جسے پہن کر انسان اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتا ہے چنانچہ مرزا غالب کی طرح ہم بھی صرف اسی لباس کے قائل ہیں

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
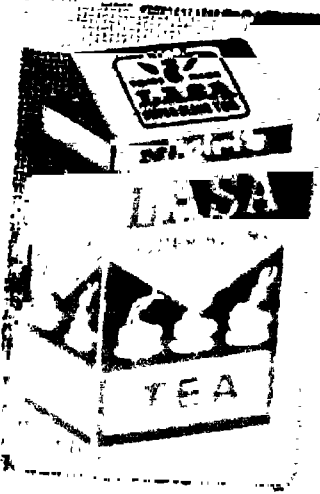
برق آشیانوی

ہفتۂ تحفظِ شہری انسانان

کچھ عرصہ پہلے ہمارے شہر میں "ہفتۂ تحفظِ جنگلی جانوران" بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا جس میں ملک کے مشاہیر، دانشور، سیاستداں اور محکمہ جنگلات کے اعلیٰ عہدہ داروں بہ شمول وزیر جنگلات جیسے عظیم "انسانوں" نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر نہایت افسوس بلکہ بے حد رنج پہنچا کہ اس میں کسی اعلیٰ درجہ کے "جنگلی جانور" کو مدعو نہیں کیا گیا۔ ہماری ناقص رائے میں "ہفتۂ جنگلی جانوران" مناتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھا جانا چاہیے تھا کہ اس کی صدارت کے لیے کسی مشہور و معروف اور معزز جنگلی جانور کو بھی مدعو کیا جاتا۔ نہ صرف صدارت بلکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بھی کسی نامور جانور کو مدعو کیا جانا بھی ضروری تھا۔ علاوہ ازیں کچھ خاص خاص قسم کے جنگلی جانوروں کو جلسے میں شرکت کا موقع دیا جاکر ان سے ان کے اہم مسایل اور جائز مطالبات دریافت کیے جاتے اور ان کی یکسوئی بھی اُن کی مرضی کے مطابق ان کے مشوروں سے کی جاتی تو نہایت موزوں و مناسب اقدام ہوتا کیوں کہ جو مسائل زیر بحث تھے وہ جنگلی جانوروں سے تعلق رکھتے تھے۔

لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ ہمیں اس بات کی فکر ہے کہ کہیں جنگلی جانوروں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ اُن کا ہفتہ صرف انسانوں نے منایا اور اس ہفتہ کی تقاریب میں انھیں بالکلیہ نظر انداز کر دیا گیا تو معلوم نہیں ان انسانوں کا کیا حشر ہوگا جنھوں نے "ہفتۂ جنگلی جانوران" منایا۔ اور اس ضرب المثل کے مصداق کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے ہم بھی ایسی ہولناک نتیجے کا شکار ہونے سے نہیں بچیں گے

غنیمت ہے کہ جنگلی جانوروں کو اس بات کا علم نہیں ہوا۔ اس لیے کہ "جنگلی جانوران" کا ہفتہ "بڑے بڑے شہروں" میں منایا گیا جو جنگلوں سے بہت دور آباد تھے۔ اگر "جنگلی جانوران" کی رعایت سے یہ ہفتہ سہواً بڑے بڑے جنگلوں میں منایا جاتا تو جنگلی جانوروں کو پتہ چل جاتا۔ اب بھی اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ کوئی جنگلی قسم کا "غدار انسان" جنگل میں جاکر جنگلی جانوروں کو اس سے آگاہ نہ

کردے (کیوں کہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ "غداری" ہمارے ملک کے خمیر میں داخل ہے) نہ صرف آگاہ کردے بلکہ انہیں اکسا کر انسانوں کے خلاف ایک منظم طریقہ پر احتجاج شروع کرادے جس کے نتیجے میں جنگلی جانوران بڑے بڑے شہروں میں جہاں صرف انسانوں نے جنگلی جانوران کا ہفتہ منایا تھا دھاوا بول دیں۔ بہر "خیریت" ابھی تک تو جنگلی جانوروں کی جانب سے ہمیں کوئی ایسی اطلاع نہیں ملی ہے۔ "ہفتۂ جنگلی جانوران" میں متعلقہ جانوروں کو نظر انداز کر دینے پر ہمیں افسوس ہے کیونکہ اُن کے ساتھ کھلی ناانصافی کی گئی ہے۔ ہم افسوس اور ہمدردی کے سوائے کچھ کر بھی نہیں سکتے کیوں کہ ہم کوئی جنگلی جانور نہیں ہیں۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں وہاں "جانوراں" تو جانوراں "انسانان" کے مسائل یا تکالیف کے بارے میں ارباب حل عقد (وہ عقد نہیں جس کے نتیجہ میں طلاق دے کر نان نفقہ بھی ادا کرنا پڑے) اگر صرف افسوس اور ہمدردی کا اظہار کر کے خاموش ہو جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ "تیقن" دے دیتے ہیں یا کوئی "حل تلاش" کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دیتے ہیں جو دس بارہ سال تک "حل تلاش" کرنے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے متمدن ممالک کا دورہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اردو کے مسئلہ کی طرح یہ کوئی حل طلب مسئلہ نہیں ہے۔

"ہفتۂ جنگلی جانوران" منا کر انسانوں نے اپنی انسانیت کا مکمل ثبوت پیش کیا ہے کیوں کہ ڈارون کے نقطۂ نظر سے یہ انسانوں کے فرائض میں داخل تھا بہ قول ڈارون خود انسان بھی صدیوں پہلے ایک "جنگلی جانور" تھا۔ یہ بات بھی اگر جنگلی جانوروں کو معلوم ہو جائے تو اُن کے مشتعل ہو جانے کا سبب بن سکتی ہے۔

اب جب کہ "جنگلی جانوران" کا ہفتہ پُرسکون ماحول میں منالیا گیا ہے تو ضرور جنگلی جانوروں کے مسائل اور اُن کا حل بھی غالباً "تلاش" کر لیا گیا ہوگا اور اس "تلاش" کے لیے کسی جنگل میں جانے کی ضرورت نہ ہوئی ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ انسانوں کی حالت جنگلی جانوروں سے نہایت ہی بدتر ہے اس لیے اب ہم اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ "ہفتۂ جنگلی جانوران" منانے کے بعد "ہفتۂ شہری انسانان" بھی ایک لحاظ سے نہیں بلکہ کئی لحاظ سے ضروری ہے۔ جنگلی جانوروں کے مسائل میں ایک نہایت اہم مسئلہ یہ زیر بحث رہا کہ جنگلی جانوروں کی تعداد جنگلوں میں دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ انسانوں کے معاملہ میں یہ مسئلہ بالکل برعکس ہے۔ اور اب تو نہایت تشویش ناک صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ جس کے بارے میں روزانہ ریڈیو اور ٹی۔وی پر انسانوں کو ضروری ہدایت بلکہ تنبیہہ دی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود انسانوں کی آبادی غیر معمولی بلکہ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی اور بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ جس طرح جنگلی جانوروں کی کمی کے باعث اُن کی تعداد کو بڑھانے کی فکر کی جا رہی ہے اس کے برعکس انسانوں کی تعداد کو گھٹانے کی فکر میں حکومت دبلی بلکہ پتلی ہوتی جا رہی ہے لیکن یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے کیوں کہ افزائش نسل کے بارے میں جانور جس قدر عقل اور دانش مندی سے کام لیتے ہیں، انسان اتنا ہی لاپرواہی اور ہوس پرستی کا شکار ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ فیملی پلاننگ پر جانور بڑی کامیابی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ایک بات سے کسی حد تک پریشان بھی ہیں کہ انسانوں نے جو جنگلی جانوروں کی تعداد کو بڑھانے کے سلسلے میں اقدامات شروع کئے ہیں اس کے نتیجے میں کہیں ایسا وقت نہ آجائے کہ جس طرح انسانوں کی آبادی سے شہر اور گاؤں اس حد تک بھر گئے ہیں کہ تِل تو تِل، خشخاش دھرنے کی جگہ باقی نہیں ہے، اُسی طرح جنگلی جانوروں سے سارے جنگل نہ بھر جائیں اور اگر جنگلوں میں خوراک کی قلت کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ شہر کا رُخ کریں گے اور انسانوں کو اپنی خوراک بنائیں گے (ویسے یہ ایک خوش آئند بات بھی ہوگی کیوں کہ اس طرح ملک کی کثرتِ آبادی کا مسئلہ حل ہونے میں بڑی مدد ملے گی) چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ایک روز ہم جیسا انسان کسی جنگلی جانور کے لیے ناشتے یا صرف ایک لقمے کے

ہی کام آجائے۔ اس لیے ہماری رائے یہ ہے کہ جنگلی جانوروں کی آبادی میں اضافے کے مسئلہ پر ذرا سوچ سمجھ کر قدم آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

غرض "جنگلی جانوران" کے تحفظ کا ہفتہ جس زور شور اور دھوم دھام سے بعض وقت شہر کی بڑی بڑی فائیو اسٹار بلکہ ٹن اسٹار (TEN STAR) ہوٹلوں میں بیٹھ کر منایا گیا اس سے ہمیں بڑی مسرت ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی اس بات پر بہایت رنج و ملال ہوا بلکہ رونا آیا کہ آج تک کبھی "ہفتہ شہری انسانان" نہیں منایا گیا۔ چنانچہ ہماری ناقص رائے میں "ہفتہ تحفظِ شہری انسانان" بھی منایا جائے تو ان کروڑوں انسانوں کے حق میں سود مند ثابت ہوگا جن کی حالت جنگلی جانوروں سے بہ درجہا بدتر ہے۔ اس وقت شہری انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ خوراک کا ہے۔ اجناس کی گرانی اور ان کے حصول کے لیے جتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے ہر انسان بخوبی واقف ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ انسان کوئی جنگلی جانور تو ہے نہیں کہ وہ اتنی معمولی بات کو سمجھ نہ سکے۔ انسان کو غذائی مسئلہ حل کرنے میں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس پر ذہنی اور بالخصوص جسمانی بوجھ اس قدر پڑتا ہے کہ اگر کسی گدھے پر اتنا بوجھ لاد دیا جائے تو وہ اٹھانے سے صاف انکار کرتے ہوئے دولتیاں جھاڑنا شروع کر دے گا اور صاف کہہ دے گا کہ "کیا آپ لوگوں نے مجھے بھی کوئی انسان سمجھ رکھا ہے"۔ گدھا تو کسی راشن کی دکان پر صبح سے شام تک کھڑے رہنے کی بجائے آسانی کے ساتھ بطور غذا کوڑا کرکٹ حاصل کرلیتا ہے۔ حالاں کہ گدھا کوئی جنگلی جانور نہیں بلکہ شہری جانور ہے جنگلی جانور تو اس آسانی سے اپنی غذا آپ حاصل کر لیتے ہیں کہ اس پر نہ صرف شہری انسانوں بلکہ شہری جانوروں کو بھی رشک آتا ہے۔

دوسرا مسئلہ انسانوں کا تن ڈھانکنے کا ہے۔ حالاں کہ یہ "جنگلی جانوران" کا نہیں "شہری جانوران" کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے صرف اس لیے کُرتا پہننا چھوڑ دیا تھا کہ ملک کے کروڑوں انسانوں کو کُرتا نصیب نہ تھا۔ آج ملک کی آزادی کو کچھ کم چالیس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی کُرتا نصیب نہیں ہوا ہے۔ گاندھی جی کے بعد پھر کوئی ایسا مہاتما نہیں پیدا ہوا جو خود بھی کُرتا پہننا چھوڑ دے۔ البتہ اُن انسانوں کی حالتِ زار پر آنسو بہانے کے بجائے صرف اظہار ہمدردی کرنے والے بے شمار پیدا ہو گئے ہیں۔

تیسرا مسئلہ انسانوں کی رہائش کا ہے۔ جنگلی جانور تو اپنی مرضی سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق رہائش کا انتظام بڑی آسانی کے ساتھ کر لیتے ہیں۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے لیے رہائش کا مسئلہ ایک دردناک عذاب بن گیا ہے۔ اب اسی کو لیجیے کہ ایک پرندہ اپنا آشیانہ کسی شاخِ گل پر بڑی آسانی کے ساتھ بنا لیتا ہے لیکن بے چارے برقی آشیانوی کو اپنا آشیانہ بنانے کے لیے کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے سب سے پہلے اس کے لیے زمین کا حاصل کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ (اور اب تو دو گز زمین بھی آسانی سے نہیں ملتی تاکہ اس آخری آشیانے میں سارے مسائل سے بے نیاز ہو کر آرام کے ساتھ قیامت تک کا عرصہ گزار سکے) اگر زمین حاصل ہوگئی تو بلدیہ سے سر توڑ کوشش کرنے کے بعد منظوری حاصل کرنی پڑتی ہے سیمنٹ کنکریٹ لوہا اینٹ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ سیمنٹ کے حصول میں مہینوں لگ جاتے ہیں اور جب سیمنٹ کے نام سے راکھ یا پتھر کا سفوف مل جائے تو جو آشیانہ تیار ہوتا ہے اس کی تیاری مکمل ہوتے ہی ترمیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تعمیر کے لیے ماہر مزدور کا ملنا بھی ایک دشوار مسئلہ ہے۔ ہر مزدور چاہے وہ برقی آشیانوی کی طرح تعمیر کی الف۔ب یا پھر (انگلش میڈیم سے تعمیر کا کام سیکھا ہو تو (AB CD) سے واقف ہو کہ نہ ہو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تاج محل اس کی ہدایات سے لے کر دس

پشت یا پھر اس سے بھی کچھ زیادہ پشت اوپر کے دادا نے ہی بنایا تھا وہ خود بھی ایک تاج محل بنا سکتا ہے لیکن اس کی مجبوری یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی شاہ جہاں موجود نہیں جو اس کے فنِ تعمیر کی قدر کر سکے۔ لیکن جب اینٹ کی دیوار تک سیدھی نہیں اٹھا سکتا تو کہہ دیتا ہے کہ خود زمین اتنی ٹیڑھی ہے کہ اس پر کوئی سیدھی دیوار تو کجا پاؤں بھی سیدھا نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے دیوار ٹیڑھی اٹھ گئی یا پھر سارا الزام ہم پر رکھ دیتا ہے کہ وہ تو بالکل سیدھی دیوار اٹھا رہا تھا لیکن ہم نے درمیان میں دخل دے کر اس سے ٹیڑھی دیوار بنوا دی۔ چنانچہ ترقی آشیانوی سر پیٹ کر رہ جانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

- ہمارے کان وعدے سننے کے لئے ہمیشہ بے چین رہتے ہیں۔ (مغربی کہاوت)
- زندگی میں خوشیاں کاٹنے سے زیادہ بونے سے حاصل ہوتی ہیں۔ (نامعلوم)
- کھلا ذہن، کھلی پاکٹ سے دولت مند ہوتا ہے (نامعلوم)
- بے مقصد زندگی ۔۔۔۔ خود ایک افلاس ہے۔ (البرٹ شوئیزر)

ملک میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جن کا کوئی مستقل روزگار ہی نہیں ہے۔ مکان بنانا تو کجا سر چھپانے کے لیے درخت کا سایہ تک نہیں ملتا۔ چنانچہ فٹ پاتھ پر دھوپ بارش اور سردی کے موسم اُن کے سروں پر سے گزر جاتے ہیں اور کئی لوگ ایسے ہیں کہ موسموں کے اُن پر سے گزر جانے کے بجائے وہ خود موسموں پر سے گزر جاتے ہیں ان مسائل کے علاوہ کئی اور مسائل ہیں جیسے بس کا انتظار، ریل کے سفر کا عذاب، حادثات سے مالی و جانی نقصانات، شہروں میں ٹریفک کے حادثات، جن کی وجہ سے لوگ اکثر اپنے بال بچوں سے کہا سنا اور لیا دیا سب کچھ معاف کروا کر نکلتے ہیں اس لیے کہ ان کے خیریت سے گھر واپس آنے کی کوئی گیارنٹی نہیں ہوتی اور اگر اتفاق سے ایک بار خیریت سے واپس آ گئے تو پھر گھر سے نکلتے وقت اس عمل کو دہرا لیتے ہیں۔

غرض جہاں بڑے بڑے دانشوروں، سیاست دانوں اور اعلیٰ عہدہ داروں نے "جنگلی جانوران" کے تحفظ کا بیڑہ اٹھایا ہے اور ان کا حل دریافت کر رہے ہیں۔ ہم ان سے ادباً گزارش کرتے ہیں ایک آدھ "ہفتہ" "تحفظِ شہری انسانان" بھی منائیں تاکہ انسانوں کو یہ شکایت نہ ہو کہ ہم جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں کہ ہمارا "ہفتہ" نہیں منایا گیا۔

عاتق شاہ

شیر آیا شیر
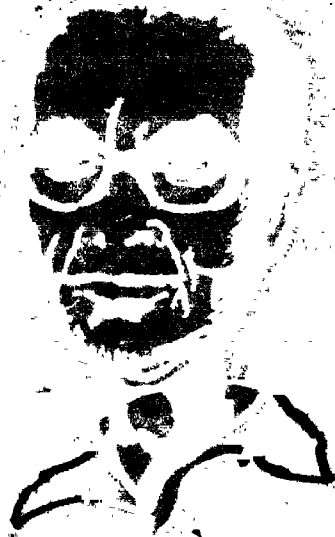
مٹی کا شیر آپ کو ہر پیر اسٹے شہر کے کسی تباہ حال محلے یا کسی تنگ اور تاریک گلی کے سامنے منہ کھولے بیٹھا ہوا نظر آنے گا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہز ماسٹرز وائس کے پرانے ریکارڈ پر کتا نظر آتا ہے۔ ویسے کتے اور شیر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کتا، کتا ہے، شیر، شیر ہے۔ کیا مجال جو کتا شیر کے سامنے غرّائے۔ شیر کی ڈکٹیٹرشپ کو کتا کیا جنگل کے سبھی جانور مانتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شہر کے تربیت یافتہ اور اعلیٰ نسل کے دو چار کتے متحد ہو کر شیر کے چیلنج کو قبول کریں۔ لیکن پھر بھی کہا نہیں جا سکتا کہ جنگل کے شیر کے سامنے ان کتوں کا کیا حشر ہوگا۔ خیر بات شیر کی ہو رہی تھی اور خواہ مخواہ یہ کتا بیچ میں آ گیا۔ میں در اصل مٹی کے اس شیر کی بات کر رہا تھا جو میرے مکان کے قریب ہے۔ اور جسے میں روز آتے اور جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ دن میں تو یہ مٹی کا ایک تودہ ہی نظر آتا ہے۔ اور وہ سارے رنگ جو اس کی شخصیت کو ابھارتے ہیں دھوپ اور بارش کی وجہ سے مدھم پڑ گئے ہیں بلکہ ایک دوسرے میں اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ پہچاننا مشکل ہے۔ البتہ گلے میں پڑا ہوا مالا واضح ہے۔ اور اس کے منہ کھولے ہوئے چہرے پر چمکتی ہوئی مونچھیں! گہرے سرخ رنگ سے ابھاری گئی ہیں اور چمکنے لگی ہیں آنکھیں بے نور ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے شیر اندھا ہے۔ اور اپنے سامنے سے گزرنے والی کسی شئے پر اس کی نگاہ نہیں۔ لیکن اندھیری اور چاندنی راتوں کی پُر اسرار خاموشی میں یہ شیر جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اور کتوں کی اس بھوں بھوں کو سن رہا ہے جو پاس سے اور دور سے آتی ہوئی سناٹوں کو چیرنے لگتی ہے۔ ایسے میں کسی بچے کے رونے کی آواز انسانی زندگی کا پتہ دیتی ہے اس کے ساتھ ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شیر گرجتا ہوا انسانی آواز کی طرف ایک جست لگائے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد تھوڑی دیر بعد شاید ڈکار کی گونجتی ہوئی طمانیت بخش آواز اس کی تسکین کا اعلان کرے۔ لیکن شیر اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اور اس کا وجود رات کی پُر اسرار خاموشیوں کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

[illegible]

انھیں دیکھنے کے بعد یقیناً آپ نے کچھ نہ کچھ سوچا ہوگا۔ میں نے بھی اکثر سوچا ہے۔ اور آج کل [illegible] ہے کہ یہ سوچ میرے ذہن پر مسلط ہے۔ مثلاً کسی دن کسی رات اور کسی لمحے مٹی کے شیر کے سامنے سے گذرتے ہوئے [illegible] میں گم ہو جاتا تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہے۔ اور ایک بے نام سا خلا میرے [illegible] سے پہلے مٹی کے شیر کو دیکھ کر ایک سوال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ اور اس کا جواب میں نے اسی [illegible] سے چاہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مٹی کا تودہ ہے۔ پہلی نظر اور پہلی ملاقات میں میں نے اس سے پوچھا تھا — تمہارا یہاں کیا کام ؟

میرا سوال بہت ہی واضح تھا۔ مطلب یہ تھا کہ تم شیر ہو۔ اور تم انسانی آبادی میں کیسے اور کیونکر گھس آئے ؟

بھلا وہ کیا جواب دیتا۔ میں آپ ہی آپ جھنجھلا کر رہ گیا۔ اس وقت میری [illegible] اور بڑھ گئی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ مٹی کا شیر میرے احمقانہ سوال پر مسکرا رہا ہے۔ جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ کیا واقعی یہ انسانوں کی بستی ہے؟

مجھے شیر کا یہ طنز اچھا نہیں لگا !

میں آپ کو کیا بتاؤں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔ اور جنگل میں شیر ہی کا قانون چلتا ہے۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں "جنگل لا" کہتے ہیں۔ اس قانون کا کوئی اور چھور نہیں ہوتا۔ خون بہانا اس کا پہلا اور آخری کام ہے۔ شروع سے آخر تک اس کا مینی فیسٹو خون سے لکھا گیا ہے۔ انصاف نام کا کوئی لفظ اس قانون میں نظر نہیں آتا۔ اس لیے جہاں کہیں بادشاہت کے نام سے جنگل کا قانون چلنے لگا وہیں شدت کے ساتھ مخالفت ہونے لگی۔ اور جمہوریت اور سوشلزم کے نعرے لگائے جانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اب رہی سہی بادشاہت دم توڑ رہی ہے۔ یقیناً یہ انسانی تہذیب کی بڑی دین ہے۔

لیکن یہ شیر ——

چند دنوں کے لیے سہی میں نے خود کو شیر کے خوفناک خیال سے آزاد کر لیا۔ اور لمبی راتوں میں آرام کرسی پر دراز آنکھیں بند کئے ہوئے ہر شئے سے بے پرواہ پڑا رہا۔ یا سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچ کر خود کو یہ احساس دلاتا رہا کہ مجھ سے زیادہ مطمئن دنیا میں اور کوئی شخص نہیں۔ واقعی یہ لمحے بڑے انمول تھے جو میں نے یونہی گزار دیئے اور مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ لمحے کیوں کر میرے وجود سے میری زندگی سے اور میری عمر کے ایک مختصر سے حصے کو لیکر کہیں فرار ہو گئے۔ شاید وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں جن کے ذہنوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ اور جو خالی ذہن خالی دماغ اور خالی دل کے ساتھ اپنی لمبی لمبی عمریں گزار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت جب ان کے یہاں دبے پاؤں آتی ہے تو وہ اس خاموشی سے خود کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کوئی چاہے تو اسے بے حسی کا نام دے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے حسی کا جواب نہیں ہوتا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں یا محروم ہوگیا ہوں جو اچانک [illegible]۔ اس کی نفسیاتی توضیح ممکن ہے۔ اور کوئی ماہر نفسیات یہ فیصلہ صادر کر سکتا ہے کہ میں مرے سے اس خوفناک درندے کے خیال سے آزاد نہیں رہا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا خیال فکر کی تہوں میں کہیں دب گیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ اب تو یہ [illegible] بعد بھی حرام ہوگئی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ موت شیر کے بھیس میں سر کھولے ہوئے

میرے گھر میں میرے کمرے میں کسی بھی وقت اچانک گھس پڑے گی!

ویسے سُننے میں اور دیکھنے میں یہ صرف مٹی کا شیر ہے لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ یہ کھاتا بھی ہے۔ اور اس کی واحد غذا گوشت ہے۔ انسان کا نہیں بکرے کا۔ آدم خور شیر تو بکرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ایک بار اُنہیں انسان کے گوشت کا مزہ لگ جائے تو بس پھر پوچھئے نہیں۔ آدم خور شیر کی اس قسم کے قطع نظر مٹی کا یہ شیر مجھے دنیا کا صرف عجیب ہی نہیں بلکہ خطرناک ترین درندہ معلوم ہوتا ہے۔ جی ہاں پہلی بار جب میں نے یہ بات سُنی تو میں حیران رہ گیا میں نے سوچا کہ شاید اس محلے کے لوگ مذاقاً یہ بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن جب میں نے خود اس منظر کو دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے یہ آنکھیں ہی تو ہیں جو سب کچھ دیکھتی ہیں۔ اب تک یہ سینکڑوں بکروں کو ہضم کر چکا ہے۔ بغیر ڈکار کے اپنا شکار آپ چٹ کر نہیں کھاتا۔ بلکہ شکار خود کھنچے کھنچے اس کے قدموں میں چلا آتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ شیر کے معتقد حضرات اپنے اپنے بکروں کو اس کے سامنے لا کر ذبح کرتے ہیں۔ اور قصاب گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑوں کو اس کے کھلے ہوئے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا پھولا ہوا پیٹ بھر کر گوشت حلق تک آجاتا ہے پھر شیر کے مجاور صاحب اشاعل شروع کرتے ہیں۔ برس کے بارہ مہینے یہی ہوتا ہے۔ مجاور صاحب کا روزگار بالکلیہ اسی شیر سے وابستہ ہے۔ لہٰذا وہ مٹی کے اس شیر کے لئے وہی پبلسٹی کرتے ہیں جو الکشن لڑنے والے کسی امیدوار کے لئے اس کا اپنا ایجنٹ کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مٹی کا یہ شیر صرف درندگی اور خونخواری کا سمبل نہیں رہا بلکہ قوت، دلیری اور فتح کا مظہر بن گیا۔ اس لئے ہر چھوٹا بڑا پہلوان کشتی سے پہلے اور ہر ٹائیگر میدان میں اترنے سے پہلے مٹی کے شیر کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتا ہے اور بکرے کی روایتی قربانی کے بعد اپنے گٹھیلے بازوؤں اور رانوں کو ٹھونک کر اپنے اطراف نظر ڈالتا ہے۔ جیسے کہتا ہو ہے کوئی رُستم کی اولاد جو میرے سامنے آئے —

شیر آیا شیر —

بچے آواز اٹھاتے ہیں!

بھاگو بھاگو ——— دوڑو دوڑو !!

شیر آیا شیر —

جہاں جہاں انسانی آبادیاں ہیں وہاں وہاں ایک ڈر اور خوف کی لہر چل رہی ہے۔ لوگ اپنے چھوٹے بڑے مکانوں میں چھپ گئے ہیں۔ اور اندر سے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ مائیں اپنے اپنے بچوں کو اس طرح آنچل میں چھپاتی ہیں جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں چھپا لیتی ہے۔

گلی کوچوں اور سڑکوں پر سناٹا ہے۔

شیر کی آمد آمد کی خبر ہے!

اب مٹی کا شیر باقی نہیں رہا۔ لیکن سُنا کہ دنیا جہاں کے تمام شیر جنگلوں کو چھوڑ کر انسانی آبادیوں کا رُخ کر رہے ہیں کیونکہ انہیں انسانی خون اور گوشت کا مزہ لگ گیا ہے۔ اور وہ بہت ہی تیزی کے ساتھ قصبوں، دیہاتوں ...

شہروں میں اپنے شکار کی تلاش میں گلی گلی کوچہ کوچہ اور سڑک سڑک گھوم رہے ہیں۔ اور جہاں کہیں انسان یا انسانوں کا جھتا مل جاتا ہے انھیں مار کر خون پی جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر، رنگ، نسل اور زبان کے نام پر۔ صوبوں اور ملک کے نام پر۔ حالانکہ ان کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کی اپنی کوئی زبان ہوتی ہے۔ یہ تو جنگلوں کے رہنے والے ہیں۔ لیکن جنگلوں کو چھوڑ کر انسانی آبادیوں میں گھس آئے ہیں۔ اور انہیں کوئی روک نہیں سکا۔ اس کرہ ارض پر پھیلی ہوئی تمام انسانی بستیوں پر شیروں کا راج بڑھتا جا رہا ہے!

شیر آیا شیر ـــــ کوئی چپکے سے کہتا ہے۔ اور سارے شہر میں اس کے آنے کی اطلاع ہو جاتی ہے اور دیکھتے دیکھتے گلی کوچے اور سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔

شور بڑھتا جا رہا ہے۔ باجے گاجوں کی آوازوں اور ڈھولوں کی تھاپ پر کورس کے بول صاف سنائی دے رہے ہیں۔

ڈھول کے آیا شیر
بول بول کے آیا شیر
گلی میں سے آیا شیر
آیا میرا ابو شیر

شیر آ رہا ہے! شیر آ گیا ہے۔ شیر کے گلے میں پھولوں کا موٹا ہار پڑا ہے۔ اس کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ انسانی خون کے نشے میں دھت وہ ناچ رہا ہے۔ سامنے اس کے اپنے ساتھی ناچ رہے ہیں۔ اور پیچھے پیچھے ایک لمبا جلوس ہے جس کی شیر قیادت کر رہا ہے۔ جلوس میں بکرے، بکریاں، بھینسے، گائے، کتے، بلیاں، گھوڑے، گیدڑ، اونٹ، ہاتھی غرض جنگل کے تمام ساتھی جانور شامل ہیں۔ جلوس بہت ہی دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے!

اور بستی کے تمام انسان اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہ محفوظ نہیں۔ سنا کہ ان میں سے چند شیر خلا میں چلے گئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی وقت کسی بھی لمحے انسانی بستیوں پر بم پھینک سکتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی قوت انھیں روک نہیں سکتی۔ کیوں اور کس لئے کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ کیونکہ مشیت ایزدی یہی ہے۔ جو بھی ہو رہا ہے اُسی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس کے حکم کے بغیر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اس لئے چپ چاپ دم سادھ کر بیٹھئے۔ شیر آ رہا ہے۔

٭ ڈاکٹر راہی قریشی
شعبۂ اُردو، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

٭ اسرار جامعی
ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی۔ پٹنہ

غزل

دستر پہ بیٹھ پُشت بہ دیوار، اور کھا
اُٹھے درد و رنج و غم کے گرفتار، اور کھا

یہ غم نہ کھا، کہ ہاضمہ تیرا خراب ہے
چورن کے فائدوں کا کر اِقرار، اور کھا

تقطیع کا یہ غم تجھے جھُوکا نہ مار دے
دستر پہ آکے بھُول جا اشعار، اور کھا

کھانے کی آرزو تجھے لائی ہے کھینچ کر
اُس کو بھی ہے کھلانے پہ اصرار، اور کھا

باہر کھڑی ہے بھوک ترے انتظار میں
اے جیل کے اسیر دگرفتار، اور کھا

کھانے سے بھوک مرتی نہیں، اتنا یاد رکھو
کھانے سے بھوک ہوتی ہے بیدار، اور کھا

بیمار میں ہوں، تو نہیں، پھر کیا تکلفات
غمخوار! غم نہ کھا، مرے دلدار، اور کھا

بیگم سے انتقام کا بس وقت ہے یہی
بیمار ہے تو بھُوکی اُسے مار، اور کھا

پھانسی کے بعد کا تو کوئی ذکر ہی نہیں
پھانسی سے پہلے پھر تو سردار، اور کھا

راہی تجھے تو آج بھی دعوت نہیں، مگر
پہلے بھی کھا چکا ہے تو اس بار اور کھا

فخرِ جاہلاں

اِک روز اپنی بیوی سے یہ شاعر نے کہا
بیگم مشاعرے کو میں آیا ہوں لُوٹ کر
بولی کہ مال لُوٹ کا جلدی سے دیجئے
تاکہ اُسے پکاؤں ابھی پیس کوٹ کر
بیوی کی کُور مغزی پہ بولا بگڑ کے وہ
اَے احمق الذی، نہ تو شاعر کو ہُوٹ کر
تو فخرِ جاہلاں ہے تجھے کیا بتاؤں میں
دادِ سخن سبھوں نے مجھے دی ہے چھُوٹ کر
بولی وہ سر کو پیٹ کے آنکھوں کو کرکے لال
بجلی گرے غضب کی ترے سر پہ ٹوٹ کر
فاقے پڑے ہیں گھر میں، تجھے فخر داد پہ
اور اتنا کہہ کے رونے لگی پھُوٹ پھُوٹ کر

پاگل عادل آبادی
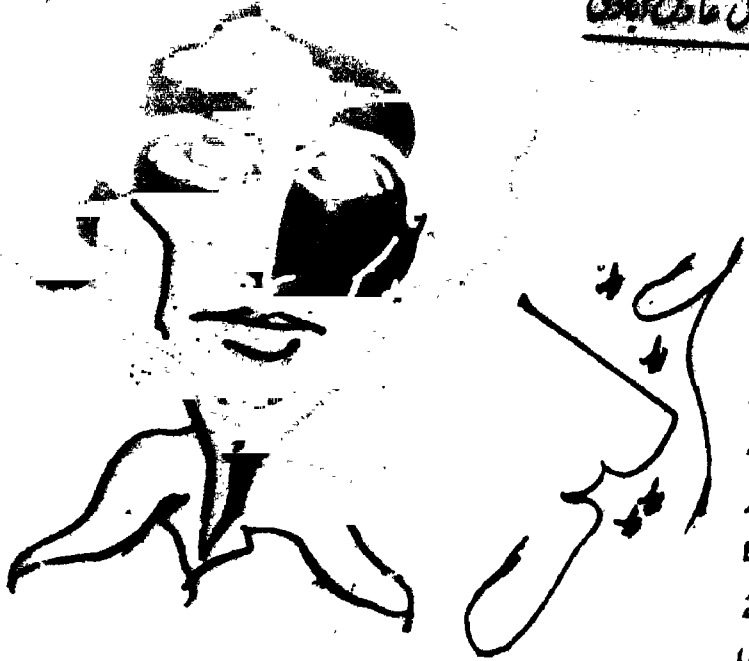
دیجیے کچھ دوا دیجیے
بال سر کے اُگا دیجیے
ہاتھ خالی نہیں جاؤں گا
کچھ تو چندہ دلا دیجیے
دَور فیملی پلاننگ کا ہے
صرف دو کی دعا دیجیے
گڑ کا مجھ کو تو پرہیز ہے
گلگلے ہی کھلا دیجیے
شیر بلّی سے ڈرنے لگا
مونچھ اُس کی مُنڈا دیجیے
مُرغ شاید پڑوسی کا تھا
گھر کا چُورن کھلا دیجیے
انڈے دیتا ہوں تم کو اُدھار
اپنی مُرغی بٹھا دیجیے
وہ جو غرقِ خوابِ غفلت میں ہیں
مار کر کِک جگا دیجیے
لیجیے دوستوں کی دُعا
قرض دے کر بھلا دیجیے
گھر کرایے کا ملتا نہیں
دل میں تھوڑی جگہ دیجیے
آٹے چندے کا ڈبّہ اگر
اُس کو آگے بڑھا دیجیے
رات بھر نیند آئی نہیں
کھٹملوں کو دُعا دیجیے
ہو چکے بور پاگل سبھی
منہ کو ڈھکن لگا دیجیے

ہر اک ٹیشن میں فیل ہے پیارے — یہ بڑھاپے کی ریل ہے پیارے
زُلفِ کشمیر جس کو سمجھا تھا — وہ پھلاویں کا تیل ہے پیارے
مر مٹا تھا میں جس کی صورت پر — وہ حسیں اب چڑیل ہے پیارے
چال کچھوے کی تھی لڑکپن میں — اب وہ طوفان میل ہے پیارے
شیخ پیچھا کرے حسینوں کا — نامناسب یہ فعل ہے پیارے
جس کو کہتے ہیں آپ لو میرج — گُڈّا گُڑیا کا کھیل ہے پیارے
گھر جنوئی بن کے تو ہُوا قیدی — تیری سسرال جیل ہے پیارے
وہ کبھی توپ تھا اٹم بم تھا — آج تو اک غلیل ہے پیارے
چُن کے جو آگیا الیکشن میں — وہ تو پھر پٹیل ہے پیارے
بیگم ایم اے ہے پاس اور پاگل
نرسری میں بھی فیل ہے پیارے

سیدہ جمال

مرحومہ بجلی کی یاد میں

وہ موسم گرما کی ایک خوبصورت اور سہانی شام تھی۔ رات کی تاریکی اب شروع ہی ہونے والی تھی۔ بیگم سیماب کے خوبصورت ڈرائینگ روم میں خواتین محو گفتگو تھیں۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ ارغنون کی سی موسیقی پیش کر رہی تھی۔ کمرہ کا نیم تاریک منظر بے حد رومان پرور تھا۔ لالٹین اور لیمپ کی کالی کالی چمنیوں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ روغن گل کی خوشبو سے کمرہ بسا ہوا تھا۔ خواتین اپنا صدیوں پرانا راگ الاپنے میں مشغول تھیں۔

ایک بزرگ خاتون اپنے پوپلے منہ سے اپنے پڑپوتے پوتیوں کی شان میں یوں گویا تھیں:

"میرا پرپوتا تو نہایت ذہین اور ہوشیار ہے۔ اس کے ذہن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی سوال، کھوج یا تجسس گھومتا رہتا ہے۔ ایک دن کہنے لگا۔

دادی اماں کمرہ کی چھتوں سے کتنی خوبصورت شیشے کی گیندیں لٹک رہی ہیں انھیں اتار دیجئے ہم کھیلیں گے اس کی دادی نے بتایا یہ گیندیں نہیں بلب ہیں۔ کبھی اس سے روشنی نکلا کرتی تھی۔ اس پر اس کی تیزی ملاحظہ ہو۔ کھٹ سے بول پڑا تو آپ لوگ اسے جلاتی کیسے تھیں کیا وہاں تک پہنچنے کے لیے سیڑھی لگائی جاتی تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ تم لوگوں کی طرح ہمیں اتنی مصیبتیں نہیں اٹھانا پڑتی تھیں کہ لالٹینوں و لیمپوں کی چمنیاں صاف کرو پھر وہ تیل ڈالو۔ بتی ٹھیک کرو۔ ہم تو بس ایک بٹن دباتے تھے۔ جھٹ [illegible] کمرہ بقعۂ نور ہو گیا۔

جانتی ہو بہوا اس پر میرے پرپوتے نے کیا کہا۔

"توبہ توبہ! بڑے کمال ہوا کرتے تھے آپ کے زمانہ کے لوگ؟"

اس پر تمام بزرگ خواتین اپنے خضاب زدہ کالے کالے بالوں والے سر ہلا ہلا کر دیر تک ہنستی رہیں۔ ہنسی کا طوفان ختم ہوا تو دوسری بزرگ خاتون اپنی رعشہ زدہ گردن کو اور زور زور سے ہلاتے ہوئے چہکیں۔

"ارے بہن میری پرپوتی تو تمہارے پرپوتے کے بھی کان کاٹنے والی ہے ایک دن اس نے کہیں پرانے سامانوں کے انبار میں پڑا ہوا استری دیکھ لیا اور بس شروع ہو گئی سوالات کی بوچھار۔

"دادی جان یہ استری یہاں کیوں پڑی ہے؟"

"[illegible] استعمال کیوں نہیں کرتیں؟"

"یہ بوتلیں اس میں کیسی پڑی ہیں۔؟"

میں نے کہا

"یہ وہ الماری ہے جس میں چیزیں ٹھنڈی کی جاتی تھیں"

"برف جمائی جاتی تھی"

"آئسکریم بنائی جاتی تھی"

"پھل ٹھنڈے کیے جاتے تھے"

لیکن تو بہ کرو بہن اتنی باتوں سے اسے کہاں تشفی ہونے والی تھی۔ میرے پیچھے تو وہ جھاڑ کا کانٹا بن کر پڑ گئی۔

"فریج کیا چیز ہے؟"

"برف کیسے جمائی جاتی ہے؟"

"آئسکریم کیسے کہتے ہیں؟"

میری امی نے ان چیزوں کی تشریح کی۔ آئسکریم کا مزیدار بیان سن کر اس کے منہ میں پانی آگیا۔

"دادی اماں آپ نے مجھے کبھی آئسکریم نہیں کھلائی"

"کبھی میرے لیے برف نہیں جمائی؟"

"لیکن اب یہ چیزیں نہیں بن سکتیں"

یہ تمام چیزیں بجلی کی کرامت تھیں۔ بیٹا!

"تو ان کرامتی بجلی بابا کو بلوائیے دادی اماں"

یہ کہہ کر وہ مچل گئی اور گھنٹوں کرامتی بابا کے لیے روتی رہی۔ ٹھیک اسی طرح جب ہم اپنے زمانہ میں دم توڑتی ہوئی اور سسکتی ہوئی بجلی کے غائب ہوتے ہوا، پانی، روشنی اور حرارت وغیرہ کے انتظار میں گھنٹوں اپنی جان کو جلایا کرتے تھے۔

ان بزرگ خاتون کی داستان نے محفل کی تمام خواتین پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ اور وہ اپنے زمانہ کی حسین یادوں میں کھو گئیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ایک سکوت سا چھا گیا۔ اس سکوت کو تیسری بڑی بی کی کراری آواز نے یکلخت توڑ دیا۔

"بی بیو! تم بچوں کی باتیں کرتی ہو۔ وہ تو نا سمجھ ہیں۔ ذرا آج کل کی نئی نسل کی خبر لو۔ ایک دن شامت کی ماری اپنی پرنواسیوں و پوتیوں کے سامنے اپنے زمانہ کے کھانا پکائے جانے کی سہولتوں اور باورچی خانہ میں استعمال ہونے والی چیزوں یعنی کوکنگ رینج، مکسی، گرائینڈر، ٹوسٹر۔ اوون وغیرہ کا ذکر کر بیٹھی۔ پہلے تو ساری لڑکیوں نے بے یقینی کے ساتھ مجھے دیکھا۔ استہزائیہ انداز میں ہنستی رہیں۔ پھر اللہ بادا کی ایک لاڈلی بیٹی پھٹ سے بول پڑی۔

"نانی اماں کہیں آپ ایک نئی الف لیلیٰ تو نہیں تیار کر رہی ہیں" دوسری بڑی بی نے اپنا سفید چونڈا پر خیال انداز میں ہلایا اور بولیں۔

"ہونہہ! اس نئی پود کا کہنا ہی کیا۔ ان لڑکیوں کو تو بس نت نئے فیشن سے کام ہے۔ اور وہ بھی موا فیشن کا معیار کتنا گر گیا ہے۔ جسے دیکھو مٹاپے کے غم میں دبلا ہوا جا رہا ہے۔ وزن بڑھانے کے لیے طرح طرح سے ڈائٹنگ ہو رہی ہے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خالص مکھن، دودھ، ملائی، گھی اور انڈا وغیرہ غذائیں استعمال کر رہی ہیں۔ کچھ پتہ بھی نہیں دبلا

کیا ہوا؟ ایک مصیبت ہوگئی کہ اسے دور کرنا ہی ہے۔ یہ لڑکیاں تو نزاکت کو بس ایک لعنت سمجھتی ہیں۔ خدا دیگی گوری رنگت انہیں پسند نہیں دھوپ میں بیٹھے بیٹھے کر گورا چٹا رنگ سنولایا کرتی ہیں۔

دوسری بڑی بی نے گل افشانی کی۔

"اے بی! ان لڑکیوں کی باتیں تو پھر بھی معصوم اور بچکانہ ہیں۔ ذرا ہماری بہوؤں کی باتیں سنیں تو کہتیں۔ رات دن ہمارے زمانے کے طعنے دے دے کر ہماری جان جلایا کرتی ہیں۔ تم لوگوں کو پتہ ہے میرے سب سے چھوٹے پوتے کی بہو بہت پڑھی لکھی آئی ہے۔ اس نے ہمارے زمانے کے اور ہمارے آبا و اجداد کے کارنامے تاریخ کے کسی باب سے پڑھ لیے ہیں۔ جب ساری بہوئیں بیٹھتی ہیں ہمارے زمانہ کی ہنسی اُڑاتی ہیں۔ ہمارے زمانے کی عورتوں کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے ہمیں طعنے دیئے جاتے ہیں۔

"کیا کاہلی اور تن آسانی کا زمانہ تھا ان لوگوں کا بھی کیتلی میں پانی رکھا ذرا سا بٹن دبایا جھٹ چائے تیار ہوگئی استری کرنا ہوا بجلی کا بٹن دبایا استری گرم۔ بٹن دبایا کپڑے دھو لیے۔ بٹن دبایا بجلی کے کرنٹ سے بھری برسات میں کپڑے سکھالیے۔ بجلی کے چولھے پر منٹوں میں کھانا پکا لیا۔ نہ کپڑوں میں کالک لگی نہ ہاتھ پاؤں گندے ہوئے"۔

ساری بہوؤں کے تو دیدے پھیل گئے۔

"یہ لوگ اتنی سست، آرام طلب اور کاہل ہوا کرتی تھیں اچھا یہ تو بتاؤ جب ان کا کام منٹوں میں ہو جاتا تھا تو باقی وقت یہ کیا کرتی تھیں؟" میرے سب سے چھوٹے پوتے کی بہو اپنی تاریخ دانی کا سکہ جماتے ہوئے بولی۔

"یہ نہ پوچھو بڑے عیش تھے اگلے وقتوں کے لوگوں کے۔ ان کے یہاں ریڈیو نام کا جادو کا ڈبہ ہوتا تھا جو بہترین گانے سنایا کرتا تھا۔ یہ لوگ گھر بیٹھے سینما دیکھ لیتی تھیں۔ کمرہ ٹھنڈا کرلیا جاتا۔ گرم کرلیا جاتا۔ بس کچھ نہ پوچھو عیش ہی عیش تھے"۔ ساری بہوئیں ہنستی رہیں لیکن ایک ذرا منطقی سی بہو ہے وہ بولی:

میں ان قصے کہانیوں پر یقین نہیں رکھتی۔ یہ تو جنوں اور بھوتوں کی مافوق الفطرت کہانیوں کی چیزیں لگ رہی ہیں جنھیں ہم اپنے بچپن میں پڑھا کرتے تھے"۔

وہ بڑی بی جب اپنی داستانِ غم سنا چکیں تو ایک مرنجاں مرنج قسم کی بزرگ خاتون ہنس کر بولیں۔

اے بی! تمہارے پوتوں اور نواسوں کی بہوئیں ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔ ان بے چاریوں کے زمانہ میں تو ہر کام مشکل ہے ہمارے وقت کی وہ آسانیاں کہاں۔ یہ زمانہ تو نگوڑا ایسا بُرا کہ دنیا سے ہر چیز ناپید ہوگئی۔ ہر آسانی ختم ہر سہولت رخصت ہمارا بھی کیا سنہرا زمانہ تھا"

دوسری انصاف پسند خاتون نے ان کی ہم نوائی کی:-

"بہنو! اگر آج کی نسل ہمارے سائنسی زمانہ کو نہیں مانتی تو ان کا کوئی قصور نہیں ایسا تو ہر نسل اور ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے آخر ہم بھی تو "اڑن کھٹولا" میر حسن کے کل کے گھوڑے علاؤالدین کے چراغ اور منصور کے قصے کو قصہ ہی سمجھتے ہیں ہمارے لیے

خبر تھی "دنیا میں پیدا ہونے والا ہر چھٹا آدمی چینی ہوتا ہے"

ایک خاتون کے لیے یہ خبر پریشان کن تھی اس کے چھٹا بچہ ہونے والا تھا۔

سبھی سند باد کے کارنامے۔ حاتم طائی کی داستان، علی بابا کے بونے اور علاؤالدین کے چراغ کے قصے محض جن بھوت، دیو اور پریوں کے فرضی قصے ہی ہوتے تھے۔ ہم نے کبھی ان پر یقین نہیں کیا؟"
ان بڑی بی کی باتوں نے باتوں کا رُخ بدل دیا اور وہ پھر اپنا پرانا راگ الاپنے لگیں۔
وفعتاً دروازہ کھلا ایک باریش بزرگ چھڑی کے سہارے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دو چار بزرگ حضرات اور بھی تھے۔ باتوں میں یہ سب شریک ہو گئے۔
بچوں کی باتیں سن کر وہ بزرگ بولے۔
"بس بھئی بس! آج کے بچوں کی نہ پوچھو۔ ان لوگوں نے تو میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ماں باپ تو انہیں کہیں لے نہیں جاتے مصیبت ہم بوڑھوں پر آتی ہے۔ بچوں کو سیر کراتے پھرو۔ ہر چھٹی کے دن انہیں سیر چاہیے۔ تفریح چاہیے۔ کبھی میلے جانے کی فرمائش۔ کبھی چڑیا گھر جانے کا زور۔ آج تو ان بچوں نے بہت تنگ کیا۔ عجائب گھر کا وعدہ کئی ہفتہ سے چل رہا تھا چنانچہ آج وعدہ پورا کر دیا لیکن وہاں جا کر بچوں نے مجھے بہت پریشان کیا۔"
"کیا پریشان کیا" ایک صاحب بولے۔
وہ باریش بزرگ جھنجھلا کر بولے؛
"بھئی انھیں میوزیم کا وہ حصہ بہت بھا گیا جس میں پرانے زمانے کی بجلی سے چلنے والی چیزوں کے ماڈل بنا کر رکھے گئے ہیں۔ ان تمام چیزوں میں وہ ٹی۔ وی اور فریج کے ماڈل پر فریفتہ ہیں۔ فریج کے ماڈل جس میں مٹی کے بنے ہوئے پھل، انڈے، آئسکریم، پانی اور دودھ کی بوتلیں سجائی گئی شرماتی نظر آتی ہیں۔ یہ چیزیں ان کا دلچسپ کھلونا بن چکی ہیں کچھ بچے ٹی۔ وی کے اسکرین کی خوبصورت پینٹنگ پر عاشق ہو چکے ہیں۔ بچے ان چیزوں کو کھلونا اور میوزیم کو دوکان سمجھ کر ضد کرنے لگے دادا جان ہمیں یہ کھلونا دلا دیجئے۔ نانا جان یہ کھلونا ہمیں دلا دیجئے۔ ان کی مانگ اور ضد نے تو ہمیں حواس باختہ کر دیا۔ اب لاکھ انہیں سمجھا رہے ہیں کہ بیٹے یہ چیزیں محض دیکھنے کی ہیں۔ نمائش کے لیے ہیں شو کے لیے ہیں۔ ہمارے تمہارے استعمال کے لیے نہیں لیکن بھلا وہ کہاں ماننے والے۔ رو رو کر برا حال کر لیا۔ بمشکل تمام انہیں گھر لایا۔

ایک بڑی بی اپنے عہد رفتہ کی یاد میں کھوئی کھوئی بولیں۔ "آہ! ایک زمانہ تھا۔ ہمارا دل بھی ان بچوں کا جیسا تھا اپنی آنکھوں سے بجلی کا زوال دیکھتے رہے۔ دھیرے دھیرے اسے غائب ہوتا دیکھتے رہے۔ بجلی کی چیزوں کا کام تو آخر میں محض نمائشی اور شو کا رہ ہی گیا تھا۔ آج پھر وہ ساری چیزیں یاد آتی ہیں تو دل مچل کر رہ جاتا ہے۔ بچے مچلے تو کیا بُرا کیا؟
دوسرے صاحب بولے۔
"ہاں بچوں نے بیجا ضد کی، لیکن جب میوزیم دیکھ کر ان کا یہ حال ہو گیا تو یہ بتایئے کہ اگر یہ لوگ آج قدیم کی محفوظ کی ہوئی بجلی سے چلنے والی اصل چیزیں اور مشین وغیرہ یہ دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہوگا؟ ہمارا کیا ہے تو یہ نوجوان غش کھا کر گر پڑیں گے۔" دفعتاً گھڑیال نے بارہ بجائے تمام بزرگ خواتین و حضرات چونک پڑے۔ اور اپنے دن ہائے پارینہ کو یاد کرتے ہوئے ٹھنڈی آہوں کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے!!

فیاض احمد فیضی

کچھ آداب اسکوٹر چلانے کے

دنیا کے نقشے میں یورپ کی آنکھ سے گرے ہوئے آنسو کی شکل کا ایک ننھا منا سا ملک ہے جس کا نام اٹلی ہے جو غالباً اس کی جسامت اور صورت کو دیکھ کر رکھا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی کوئی چیز ہوتی تو ہم اس کا نام اشکِ اعظم رکھتے۔ کہتے ہیں اور بہت سی چیزوں کے علاوہ اٹلی بے مزہ کھانوں اور دنیا کی بہترین آئسکریم، اپنی سیدھی سادی غیر جذباتی عورتوں، قطرہ قطرہ سمندر بننے والے سکّے اور تیز رفتار و پائیدار اسکوٹر کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہمارے ملک میں بے مزہ کھانے تو گھر گھر میں بیویاں بنالیتی ہیں، آئسکریم ابھی تک عیاشی کا سامان تصور کی جاتی ہے اس لیے جیسی ملے جس قدر ملے جہاں سے ملے لوگ شوق فرمالیتے ہیں، اچھی یا بُری کی تخصیص نہیں کرتے۔ عورت چاہے جذباتی ہو یا غیر جذباتی مرد ہر حال میں اسے چھیڑنے کے لیے بے قرار اور چھیڑنے کے بعد عمر بھر پشیمان رہتا ہے، اس لیے اطالوی مرد بھی اتنا ہی بے چارہ اور قابلِ رحم ہے جتنا کہ ہم اور آپ۔ اطالوی سکّہ کہ جس کا نام 'لیرا' ہے ہندستانی ایک پیسے سے بھی کم قیمت کا ہوتا ہے۔ ہم کو فخر ہونا چاہیئے کہ پہلے ہی ہمارے روپے کی اصلی قیمت محض سترہ پیسوں کے برابر ہے اور ہزاروں کی تنخواہ بھی اب مہنگائی کے اونٹ کے منہ میں زیرہ معلوم ہوتی ہے مگر ہمارا روپیہ کم از کم اٹلی کے لیرے سے تو بہتر ہی دکھائی دیتا ہے۔ البتہ دنیا کا اتنا چھوٹا سا ملک اٹلی —— ایسا اسکوٹر بنالے جو دیکھنے میں خوبصورت ہو، چلنے میں تیز رفتار ہو، مضبوطی میں پائیدار ہو اور سسرال والوں کی جیب پر بار نہ ہو تو یہ واقعی غیرت کی بات ہے۔

بہرحال، اسکوٹر چاہے امپورٹیڈ ہو، چاہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے غیر ممالک سے درآمد کرنے کے بعد انھیں یہاں جوڑا گیا ہو یا غیر ملکی اسکوٹر کو سامنے رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے اس کی نقل یہاں تیار کی گئی ہو، ہر اسکوٹر کو چلانے کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں اور اسکوٹر ہی کیوں، ہر چلنے والی چیز جیسے کسان کا ہل، معشوق کی نگاہوں کا تیر، مسخرے کی زبان، یہاں تک کہ راستے سے اٹھائے ہوئے کھوٹے سکّے کو چلانے کے بھی کچھ نہ کچھ آداب ہوا کرتے ہیں۔ اگر ان کا خیال نہ رکھا جائے تو آدمی چاروں خانے چت ہوجاتا ہے اور چوٹیں سہلاتے سہلاتے اک عمر نکل جاتی ہے۔ ویسے اسکوٹر چلانا سیکھنے سے پہلے بہتر ہے کہ آدمی سائیکل چلانا سیکھ لے۔ اس سے کئی فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سائیکل سیکھتے وقت پٹخنی کھاتے اور

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

کا سبق ملتا ہے اور سائیکل کا گرا اسکوٹر بھی پھونک پھونک کر چلاتا ہے۔ دوسرے ایک بار سائیکل کا توازن برقرار رکھنا

آجائے تو اسکوٹر پر اپنا توازن برقرار رکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ تیسرے کبھی پیغمبری وقت آن پڑے تو آدمی اسکوٹر بیچ کر سائیکل لے کر اطمینان سے چلا سکتا ہے۔ ایک بات یاد رکھنے والی یہ ہے کہ اگر آپ کاک پٹ میں کھڑے ہوکر ایروپلین کی غیر موجودگی میں پائلٹ کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کریں تو شاید آپ کو ہوائی جہاز اڑانا آجائے لیکن اسکوٹر چلانے کے لیے کافی ریاض کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی کبھی تو اسکوٹر ڈرائیونگ پر مکمل عبور حاصل کرنے کے لیے کئی اسکوٹروں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

اسکوٹر کا سب سے اہم حصہ اس کے دو پہیے ہوتے ہیں جو اسے آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں پہیے ایک ہی سائز کے ہوتے ہیں، زندگی کی گاڑی کی طرح لیکن یہ آج تک نہیں معلوم ہو سکا کہ ان میں کون سا پہیہ مرد ہے اور کون سا عورت۔ اسکوٹر میں ایک تیسرا فاضل پہیہ بھی ہوتا ہے کہ اگر دونوں میں سے کوئی بھی ایک پہیہ خراب ہو جائے تو اسے نکال کر یہ فاضل پہیہ لگایا جاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی میں (ابھی) ایسی سہولت فراہم نہیں کی جا سکی ہے۔ اسکوٹر کی دوسری اہم چیز اس کی سیٹیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی دو ہوتی ہیں اس لیے کہ دنیا کی اکثر اہم چیزیں دو دو ہوا کرتی ہیں جیسے آنکھ، کان، ہونٹ جو بالترتیب دوسروں کی برائیوں کو دیکھنے، سننے اور سنانے کے کام آتے ہیں۔ اگلی سیٹ ڈرائیور کی ہوتی ہے اور پچھلی سیٹ مالکن کی جو اسکوٹر ڈرائیور کو عام طور سے کمر سے پکڑ کر رکھتی ہے تاکہ وہ اسکوٹر یا اس کی زندگی سے پھسل کر ادھر ادھر نہ گر جائے۔ اسکوٹر چلانے والے کو ڈرائیونگ کرتے وقت دونوں ہاتھوں سے ہینڈل پر گرفت قائم رکھنی پڑتی ہے۔ کار ڈرائیونگ میں البتہ یہ سہولت ہوتی ہے کہ آپ ایک ہاتھ سے سکریٹری اور دوسرے ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھال سکتے ہیں۔ ویسے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر کسی خاتون کو بٹھانے سے پہلے یہ قول یاد رکھنا ضروری ہے کہ دنیا میں ہر کامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت اور ہر ناکام شخص کے پیچھے ایک بیوی ہوتی ہے۔

ہر اسکوٹر میں تین یا چار گیرز ہوتے ہیں اور بس۔ پہلے اور دوسرے گیر کے بیچ کا حصہ نیوٹرل یعنی غیر جانبدار کہلاتا ہے۔ نیوٹرل حالت میں اسکوٹر ہو، کار ہو یا آدمی۔ یہ خود سے نہیں چلتا، اسے دھکے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پہلا گیر اسکوٹر کو اسٹارٹ کرتا ہے، دوسرا گیر اسے مناسب چال عطا کرتا ہے اور تیسرا اور چوتھا گیر رفتار۔ لیکن آج کل زیادہ تر لوگ زندگی کے میدان میں سیدھے تیسرے یا چوتھے گیر کی رفتار میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اسکوٹر چند قدم چل کر دو تین جھٹکے لے کر ایک دم رک جاتا ہے اور پھر سے انسان کو پہلے گیر سے ابتداء کرنی پڑتی ہے۔ کہتے ہیں زندگی میں پہلا گیر، پہلی بیوی اور پہلی کامیابی انسان کو آگے کی منزلوں تک پہنچانے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں اس لیے ان کو دوسرے گیر، دوسری بیوی اور دوسری کامیابی کے حاصل ہونے تک بالکل نہیں بھولنا چاہیئے۔

کلچ CLUTCH انگریزی میں شکنجے کو کہتے ہیں۔ اب چوں کہ کلچ اسکوٹر کے گیرز اور خود اسکوٹر پر قابو رکھتا ہے اس لیے غالباً اس کا نام کلچ رکھا گیا ہے۔ کلچ CLUTCH دنیا میں دو قسم کے ہوتے ہیں ایک روسی دوسرا امریکی — ابھی تیسری دنیا کا کوئی کلچ ایجاد نہیں ہوا ہے۔

اسکوٹر میں دائیں ہاتھ اور دائیں پیر دونوں ہی کے پاس بریک مہیا کئے جاتے ہیں تاکہ راستہ میں کوئی اچھا سا فلمی پوسٹر، ٹریفک پولیس کا بدصورت ہاتھ یا کوئی خوبصورت بلا النظر آجائے تو آپ فوراً اسکوٹر دھیمی کر سکیں۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے پاس ایک چھوٹا سا بٹن ہوتا ہے جس کو دبانے سے اسکوٹر کے منہ سے ایک بڑی مکروہ آواز بلند ہوتی ہے، اسے ہارن کہتے ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت اسکوٹر کا ہارن اگر قاعدے سے بجایا جائے تو سامنے کی کھڑکی سے کبھی کبھی اچھا سا چہرہ نکل

آتا ہے اور دروازے پر کھڑی بیوی کا چہرہ اتر جاتا ہے۔ ہارن سے ذرا پرے ہٹ کر جو بٹن ہوتا ہے وہ ہیڈ لائٹ کا ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنی ہیڈ لائٹ ہمیشہ درست رکھنی چاہیئے ورنہ اپنی اور دوسروں کی زندگی میں اندھیرا ہو جانے کا بڑا روشن امکان رہتا ہے۔ اندھیری سڑک پر دنیا و مافیہا سے بے خبر چہلیں یا چہل قدمی کرتے ہوئے جوڑوں کو روشنی سے ہلانے کے لیے اسکوٹر کی ہیڈ لائٹ بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسکوٹر کے ہینڈل پر ایک چھوٹا سا آئینہ لگا یا جاتا ہے تاکہ اسکوٹر چلانے سے پہلے اور بعد میں بالوں کو سنوارا جا سکے۔ اس آئینے کو اگر آپ ذرا سا ٹیڑھا کر دیں تو پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون کے چہرے کے تاثرات بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ ویسے تو ہم نے اپنے اسکوٹر کے آئینے کے کنارے سے گلی کے آوارہ بیل کو اکثر اپنی گردن کھجاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس آئینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں آپ پیچھے سے آنے والی موٹر گاڑیوں اور ان کی سواریوں کا مشاہدہ کر سکیں۔ اس آئینے میں موٹر گاڑیاں، بسیں وغیرہ سب بہت ہی چھوٹی چھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔ البتہ کبھی اس آئینے میں کوئی بہت بڑی گاڑی، بس یا ٹرک نظر آ جائے تو ایسے میں فوراً خدا کو یاد کر لینا چاہیئے اور مہلت مل جائے تو اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لینی چاہیئے۔

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اس محاورے کو آپ نے سنا بھی ہوگا اور اس کا تجربہ بھی کیا ہوگا۔ اسکوٹر کی ایجاد دراصل اسی محاورے کو سامنے رکھ کر کی گئی تھی۔ چنانچہ اسکوٹر کے پچھلے حصّہ میں دائیں طرف ٹیڑھی کھیر جیسی سلاخ باہر کی طرف نکلی ہوتی ہے جس کا نام اس کے کام کی مناسبت سے کِک KICK رکھا گیا ہے جس طرح بمبئی میں خاندانی کاروبار کی مناسبت سے لوگ سرنیم SURNAME اختیار کر لیتے ہیں جیسے دارو والا، چونا والا، بندوق والا وغیرہ۔ اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنے پیر کی مدد سے کِک کے ساتھ طبع آزمائی کرنی پڑتی ہے۔ سردیوں کا موسم ہو، جذبات گرم اور اسکوٹر کا انجن سرد ہو اور کسی سے ملاقات کی جلدی ہو تو یہ اسکوٹر اڑیل ٹٹو کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے اور درجنوں لاتیں ہضم کرنے کے بعد ہی اس کا انجن بیدار ہوتا ہے۔ البتہ جس روز زندگی سے دل اچاٹ ہو گیا ہو، سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہو اور بیوی یا باس کی ڈانٹ سن کر گھر یا گھاٹ سے نکلے ہوں تو ماشاء اللہ وہی اسکوٹر پہلی ہی کِک میں گلا پھاڑ کر چیخنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے اسکوٹر سمیت سمندر میں کود جائیں اور سمندر میں نہاتے ہوئے کسی معشوق کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں۔

اسکوٹر چلانے کی اولین شرط یہ ہے کہ آپ اس بات کا یقین کر لیں کہ اسکوٹر آپ کا اپنا ہے یا مانگے کا۔ مانگے کے اسکوٹر کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے اصلی مالک کی اتری ہوئی صورت ہمیشہ نگاہوں کے سامنے پھرتی رہتی ہے اور ایکسی ڈنٹ کا خطرہ رہتا ہے۔ کہتے ہیں اگر کوئی شخص کار کا دروازہ کھول کر بیوی سے کہے کہ آیئے، تشریف لایئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یا تو کار اس کی نہیں ہے یا بیوی اس کی اپنی نہیں ہے۔ اسی لیے اسکوٹر میں دروازے نہیں بنائے جاتے لیکن دوسرے کی بیویاں بھی ذرا مشکل ہی سے اسکوٹر پہ بیٹھنے کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ خیر ہمارا مشورہ تو یہی ہے

کہ اسکوٹر آپ کا اپنا ہو تو بہتر ہے۔ اپنے اسکوٹر کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے والدین یا بیوی کے والدین کی کمائی سے خریدا گیا ہو اور جس پر بیٹھ کر آپ نوکری کی تلاش میں نکلے ہوں یا خسرِ محترم کے خاندانی کاروبار میں ہاتھ بٹانے چلے ہوں۔

بمبئی جیسے شہر کی سڑکوں پر اسکوٹر چلانا انتہائی آسان کام ہے صرف چند رکاوٹیں آپ کو تنگ کریں گی، ان کی آپ کو عادت ڈال لینی چاہیئے۔ اسکوٹر چلانے والوں کو چھیڑنے کی خاطر میونسپل کارپوریشن اکثر سڑکوں پر گڑھے کھود دیتی ہے۔ کچھ مزید گڑھے ٹیلی فون کے محکمے والے کھلا چھوڑ جاتے ہیں تاکہ اسکوٹر سے گرنے کے بعد ان گڑھوں میں آپ کچھ دیر آرام کر سکیں۔ برسات کے موسم میں البتہ گڑھے نہیں کھودے جاتے ضرورت بھی نہیں پڑتی: ہماری سڑکوں میں جگہ جگہ شگاف کرنے کے لیے تیز برسات ہی کافی ہوتی ہے بلکہ کچھ سڑکیں تو اتنی غیرت مند ہوتی ہیں کہ چلو بھر پانی ہی میں جگہ جگہ سے ڈوب مرتی ہیں۔ آج کل اسکوٹر کافی مضبوط بننے لگے ہیں، آسانی سے نہیں ٹوٹتے اور اسکوٹر میکنیکوں کو بڑا مال ہاتھ نہیں لگتا چنانچہ ان کی مدد کی خاطر میونسپلٹی والے سڑکوں پر جگہ جگہ اسپیڈ بریکر بھی بنوا دیتے ہیں تاکہ میکنیکوں کا کاروبار چلتا رہے۔ ویسے چھوٹی موٹی خرابیاں تو اچھے بھلے اسکوٹر میں بھی ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اسکوٹر میکنیکوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اگر آپ کو اسکوٹر کی مشینری کی اچھی معلومات نہیں ہیں تو وہ آپ کو بیوقوف بنا کر کچھ پیسے فالتو اینٹھ لیتے ہیں اور اگر انھیں یہ پتہ لگ جائے کہ آپ کی معلومات بہت اچھی ہیں تو انھیں بہت بُرا لگتا ہے اور وہ آپ سے اور زیادہ پیسے چارج کر کے آپ کی عقل کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں لیکن اگر انھیں یہ یقین ہو جائے کہ آپ بالکل اناڑی ہیں تو وہ ازراہِ رحم آپ سے واجبی مزدوری لے کر منٹوں میں آپ کا اسکوٹر ٹھیک کر دیں گے۔ اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ جب آپ اپنا مردہ یا بیمار اسکوٹر میکنیک کے پاس لے جائیں تو اپنی جنرل نالج سے اسے مرعوب کرنے کی بالکل کوشش نہ کریں بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں کہ سرکار یہ میرا اسکوٹر تو سانس بھی نہیں لیتا۔ مہربانی فرما کر اس میں جان ڈال دیجئے، میری بیوی بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔

اسکوٹر چلانے میں ایک چھوٹا سا مسئلہ ٹریفک کا بھی آتا ہے لیکن سیاست کی بازی گری اور اسکوٹر کی سواری میں خود غرضی اولین شرط ہے۔ اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے والوں کو بالکل بھول کر اپنا راستہ بناتے رہنا چاہیئے چاہے اس کے لیے آپ کو دوسروں کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ البتہ سڑک پار کرتی ہوئی عورتوں کا ذرا خیال رکھنا ضروری ہے کیوں کہ عورتوں کو خاص طور پر آتی ہوئی ٹریفک کی بجائے جاتی ہوئی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اسی طرح اکثر دیکھا گیا ہے کہ آج کل بیچ سڑک پر گائے بھینس آرام فرماتی ہیں، ان کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے ورنہ کبھی کبھی کوئی بھینس آرام کرتے کرتے اچانک اٹھ کر سڑک پر بھاگنا شروع کر دیتی ہے، ایسے میں کوئی شامت کا مارا اسکوٹر سوار سامنے آجائے تو اسکوٹر اور سوار دونوں ہی کو چھٹی کا دودھ یاد آسکتا ہے۔ یوں بھی بیوی اور بھینس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیئے، پتہ نہیں کب اُٹھ کر سینگ مار دے۔

زندگی کی دوڑ میں دوسروں کو اوورٹیک OVERTAKE کر کے آگے نکل جانے کی تمنا کس دل میں انگڑائی نہیں لیتی۔ لیکن کامیاب اوورٹیک کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں اور ان کو بُرا بھلا کہنے والے اور ان پر ہنسنے والے بہت زیادہ۔ اسکوٹر سوار کو دنیا کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے اور حادثے اور چالان کی فکر کئے بغیر، ہنسی اور دشنام سے بے نیاز دوسری گاڑیوں کو مسلسل اوورٹیک کرنے کی کوشش میں لگے رہنا چاہیئے۔ ویسے ہندوستانی قاعدہ یہ ہے کہ ذرا دور سے ہارن دے کر دائیں طرف سے اوورٹیک کرنا چاہیئے مگر یہ گناہِ بے لذت ہے اور کم از کم

اسکوٹر سواروں کو اس سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے۔ اوورٹیک تو انتہائی خاموشی سے اس طرح کرنا چاہیئے کہ دنیا حیران رہ جائے۔ اسکوٹر کی پچھلی نشست پر بے پردہ خواتین کی نشست کا خصوصی انتظام کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ ان کے رُخِ روشن عام طور پر بائیں طرف ہوتے ہیں اس لیے اگر کسی دوسرے ایسے اسکوٹر کو اوورٹیک کرنا ہو جس کی پچھلی سیٹ پر کوئی بجلی تڑپ رہی ہو تو ایسے میں ہمیشہ بائیں جانب سے اوورٹیک کرنا چاہیئے اور اس عمل سے گزرتے وقت اچانک زور سے اس طرح ہارن بجانا چاہیئے کہ 'بجلی' کی حسرت بھری نگاہیں کسی امپورٹیڈ کار شیشے سے ہٹ کر آپ کے رُخِ انور پر مرکوز ہو جائیں۔ لیکن اگر آپ کے اپنے اسکوٹر کی پچھلی نشست سے کوئی نازک سا ہاتھ نکل کر آپ کی صحت مند کمر کے گرد لپٹا ہوا ہو تو ایسے میں بہت چوکس رہنا چاہیئے، کہیں کوئی منچلا آپ کو بائیں طرف سے اوورٹیک نہ کرلے۔ پھر ایسی صورتِ حال میں خود آپ کے دل میں کسی اور کو اوورٹیک کرنے کا خیال بھی نہیں آنا چاہیئے کیوں کہ جن کے اپنے گھر شیشے کے ہوتے ہیں انھیں کتنا نیک اور پارسا رہنے کی ضرورت ہے یہ آپ سب جانتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصہ سے لوگوں نے اسکوٹر کا ایک نیا استعمال معلوم کرلیا ہے اور اب یہ قتل اور ڈکیتی میں بھی مددگار ثابت ہونے لگا ہے۔ چلتے ہوئے اسکوٹر سے بڑی آسانی سے شکار کے سینے میں گولیاں اتار دی جاتی ہیں اور پولیس حیران پریشان کھڑی رہ جاتی ہے کہ اس قدر تیز رفتار سواری پر فرار ہونے والے قاتلوں کو آخر کیسے پکڑیں۔ کچھ دنوں بعد چوری کا اسکوٹر تو گرفتار کرلیا جاتا ہے لیکن قاتل پھر بھی ہاتھ نہیں لگتے۔ آج ہم ظلم و تشدد کے جس دور میں داخل ہو چکے ہیں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی میں تشدد اور ظلم بطور اختیاری مضامین کے یونیورسٹی میں پڑھائے جائیں گے اور طلبا کو یہ چھوٹ ہوگی کہ وہ ظلم یا تشدد میں سے کوئی ایک اپنی پسند کا مضمون چن لیں۔ ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات میں بھی تشدد پسند اور قتل و غارت گری میں ماہر خصوصاً اسکوٹر چلاتے ہوئے قتل کرنے اور ڈاکہ ڈالنے میں مہارت رکھنے والے نوجوان کو ترجیح دی جائے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی اسکوٹر چلانے کی تربیت دینا شروع کردیں تاکہ وہ بڑے ہو کر کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہوں اور ملک و قوم کا نام روشن کریں۔!
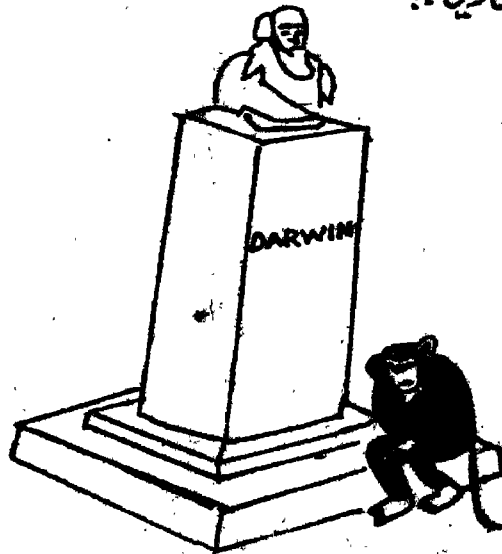
رشید عبدالسمیع جلیل

مِی رقصم

وہ جہانشادے کے غائب ہے سرِ بازار می رقصم
پھر دسہرے کے دھوکے بازپہ بے کار می رقصم

سُناتا ہوں میں ہر محفل میں اکلوتی غزل اپنی
نہیں ملتی اگر کچھ داد تو سو بار می رقصم

کیا کرتے تھے اوور ٹیک جادا پہ حسینوں کو
ہوئی آٹو کی وہ ٹکر کہ آخر کار می رقصم

وہ رکشے پر گزرتی ہے میں پیدل ٹاپ لیتا ہوں
خیالوں میں پکڑ کر دامنِ دلدار می رقصم

کیا تھا اُس نے اک وعدہ اشاروں میں کبھی مجھ سے
نہ جانے کب وفا ہوگا پسِ دیوار می رقصم

نشہ اُترا تو بتلایا مجھے لوگوں نے آ آ کر
بہت اُچھلا بہت کُودم بہ ہنروار می رقصم

بہ خالِ اُردوئش بخشم ثمائرا اور بیگن را
دہی پاپی کے زیرِ خنجرِ خونخوار می رقصم

سعودی میں تو کچھ موٹر نشیں جھاڑو پھراتے ہیں
نہ پوچھ کیسی حالت میں سمندر پار می رقصم

طُرم خاں کیوں نہ ہوں بیوی کے آگے دبکے جاتے ہیں
مجھے تو آٹھ بچے ہیں تبھی ناچار می رقصم

مری آواز کا سونا بہت سستا ہے دنیا میں
رہا زیبا گو پھر بھی ذلیل و خوار می رقصم

جہاں بجتی ہے شہنائی جلیل اکثر یہ دیکھا ہے
اِدھر پتلون می رقصم اُدھر شلوار می رقصم

مناظر عاشق ہرگانوی (بہار)

بائبل کے مطابق ـــــ خداداد نے کبھی آدمی کو اپنے پیکر سے تراشا تھا۔ وہ اشرف المخلوقات تھا۔
لیکن حضرت مچھر کا جنم کس دیوتا یا راکچھس کے ذریعہ ہوا؟ یہ ایک پہیلی ہے! میاں خسرو کو بھی حیران ہو کر کہنا پڑا ؎

کہت سنت ہیں برہ کے اچھر
کیوں سکھی، ساجن؟ نا سکھی مچھر

لیکن یہ پہیلی سلجھی کب ہے؟

تصور کیجئے ـ کمرے کی بتی گل کر کے آپ نیند کو بلانے جا رہے ہیں، تبھی وہ اپنی بانسری بجاتے ہوئے بغیر چھتری کے پیراشوٹ کی طرح آدھمکتے ہیں۔ لگتا ہے کوئی ننھا ہیلی کوپٹر چارلی چپلن کی ایکٹنگ کرتا ہوا کان کے اسٹیج پر آگیا ہے یا تاتاری فوج کے سپہ سالار کی بھٹکی ہوئی روح ہے جو اپنی فوج کے ساتھ ہوائی تحریک گیت گا رہی ہے۔ عقلمند ذی روح ہونے کی وجہ سے آپ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر یہ سنگیت کیوں؟ خون کے کاروباری پنکھ دار جونک کو مدھر گیت کی ضرورت کیوں؟ قصائی اگر بھیڑوں کو مسکرا کر ذبح کرے تو بھیڑیں انہیں اپنا محافظ کہتی ہیں۔ بھولے عوام اپنا سردار کہتے ہیں۔ پھر اگر جونکیں دھاری دار اور مچھر تان سین کا "دیپک راگ" گایا کریں تو دیپک تلے اندھیرا مچانے میں ایک موسیقانہ سہولت حاصل ہوتی ہے۔ ممکن ہے ایسے خیال پہ سنگیت پریمی بغیر سینگ پونچھ کا جانور نہ کہنے لگیں ویسے ہم آپ ایک جانور ہی ہیں۔ لیکن عقلمند جانور۔ اس لیے ہر موضوع پر آنا دانہ سوچ سکتے ہیں مگر اس عمل میں وظیفہ کرنے والے مچھر خلل پیدا کرتے ہیں۔ اگر مفکروں کی ناک پر فکر کرتے وقت مچھر نہ بیٹھ گئے ہوتے تو جانے کتنے مفکروں کا دیدار ہو سکتا۔ نیکن ناک میں دم کرنے والے مچھر بڑے مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ کچھ بھی کیجئے۔ اپنے گیت گنگناتے چلے آتے ہیں، اور یک جہتی کا سبق دیتے ہیں کیوں کہ کاٹتے وقت کسی کا مذہب نہیں دیکھتے اور نہ قومیت کا اندازہ لگانے کے لیے نام پوچھتے ہیں۔ مجلس عوام سے سڑک تک ان کی طوطی بولتی ہے۔ کچھ شور شرابہ کیا یا گڑگڑائے تو ٹانگیں اٹھا کر دیوار پر آپ کے سونے کا انتظار کرنے لگے۔ ایسے میں ڈی ایچ لارنس کی (مچھر پر لکھی ہوئی) یہ لائنیں یاد آ رہی جاتی ہیں ؎

WHAT? DO YOU, STAND ON SUCH HIGH

LEGS FOR WHY THIS LENGTH
SHRADDED
SHANK YOU ELATION.
ISITSO THAT YOU SHALL LIFT
YOUR CENTER OF GRAVITY UP WARDS
AND WEIGH NO MORE THAN AIR AS YOU
ALIGHT UPON ME STAND UPON ME
WEIGHTLESS_ You PANTHOM?
I HEARD A WOMAN CALL YOU THE
WINGED VICTORY IN SLUGGISH VOICE
YOU TURN YOUR HEAD TOWARDS YOUR TAIL
AND SMILE.

حضرت مچھر کی یہ محویت بڑی عجیب ہوتی ہے آپ اپنے پیروں کو کبھی گرتے تو کبھا اٹھائے رکھتے ہیں۔ ساکت و جامد۔ جیسے کوئی سادھو یا جوگی سادھی کے لیے بیٹھا ہو یا کسی طالب علم کا کوئی کارٹون، پنکھ لگا کر آگیا ہو، اسی کیفیت (محویت) کو دیکھ کر لارنس کے دل میں یہ گمبھیر سوال اٹھا ہوگا:

WHAT DO YOU STAND ON SUCH HIGH LEGS?

کون سا پہاڑ اٹھانے کے لیے یہ ٹٹہری کی طرح اپنے پیروں کو اٹھائے آسن کر رہے ہیں؟ کہتے ہیں، بانسری کی دھن سن کر سوئی ہوئی گوپیاں دوڑ پڑتی تھیں۔

مگر مچھروں کی مرلی، کرشن کی مرلی نہیں ہے۔ یہ پہاڑ اٹھاتے نہیں، پہاڑ ڈھاتے ہیں۔ سوتے ہوئے لوگوں کو جگانے کے لیے یہ الارم واچ کا کام کرتے ہیں۔ مگر جانے کیوں، ان کا جگانا اچھا نہیں لگتا۔ لگتا ہے، ان کو ایک ایک کر کے مسل دیا جائے۔ ہاتھی پر نشانہ باندھنا اتنا دشوار نہیں، جتنا مچھر پر۔ اس باریک ذی روح کو مارنے کے لیے کم ہوشیاری نہیں برتنی پڑتی۔ اڑتے ہوئے جہاز کو مار گرانے کے لیے جاسوس توپیں استعمال میں لاتے ہیں۔ مگر مچھروں کو مارنا دشوار ہے۔ ان کو پکڑنے کا نسخہ صرف ایک ہے کہ ہاتھ میں ذرا سا صابن لگا لیجیے اور جٹ جائیے۔ بہت جلد تک کامیابی ملے گی۔ آزمائش شرط ہے۔ مگر جناب، تہذیب کی دوڑ کے ساتھ یہ بھی مہذب ہو گئے ہیں۔ بجلی جلاتے ہی غائب۔ مچھر دانی لگا لیجے تو باہر سے ہی بیٹھے بیٹھے انجکشن لگا کر چمپت۔ دشمن فوجی چھاپہ ماروں سے یہ کسی طرح کم نہیں۔ آخر عاجز آکر ڈی ڈی ٹی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مچھر مار مہم شروع ہو جاتی ہے۔ ایک ایک دشمن گرنے لگتا ہے۔ اس رات ان کا کوئی سرگرم سنائی نہیں دیتا۔ مگر، دوسری ہی رات، نئی کمک آجاتی ہے۔ ان کے تازی حملے پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ ملیریا کے ڈاکٹر کے نام نالش ٹھونک دیجیے تو وہ بولیں گے "اگر سارے مچھر مار دیے جائیں تو ملیریا کے محکمے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ بہت سے ڈاکٹروں اور کمپاؤنڈروں کی روزی روٹی چلی جائے گی۔"

ابلیس میں آپ کا [illegible] انقلاب کی شکل کیوں نہیں اختیار کرے گا۔ اس کی جھجک اور اس کے ابال میں خلیل جبران

کی ایک کہانی بھی سینما کی طرح گھومتی نظر آئے گی ۔" اپنے عمل اور اپنی خود اعتمادی سے ایک سنت پادری نے شیطان کو پچھاڑ دیا۔ مرتے مرتے شیطان گڑگڑایا ۔ میرے ختم ہوتے ہی تمہارے چرچ لُٹ جائیں گے۔ منہدم ہو جائیں گے۔ یہ دوزخ کی آگ ہی ہے جو جنت کی آبرو بنائے ہوئے ہے"!

امراض ختم ہو جائیں گے تو ڈاکٹروں کو کون پوچھے گا ؟ ڈاکو مٹ جائیں گے تو پولیس کی قدر کون کرے گا؟ اگر سرمایہ دار مٹ جائیں گے تو پھر کمیونسٹوں کے نعرے بیکار جائیں گے ۔

شاید یہی وجہ ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری دیواروں پر جگہ جگہ لکھا ہوا نظر آتا ہے "مچھر رہے گا، ملیریا نہیں"۔ چوں کہ مچھر ہوائی فوج کے چیف مارشل بھی ہوتے ہیں اس لیے اپنی اڑانیں بھر کر سبھی کے کان میں "خاموش اجنگ" کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے جہاز کی آواز (بھنبھناہٹ) اتنی سُریلی ہوتی ہے کہ آمد کی خبر فوراً مل جاتی ہے۔

ویسے مچھروں کی بناوٹ درج ذیل عناصر سے ہوئی ہے:

M =	MOST =	بہت زیادہ
O =	OBEDIENT =	فرمانبردار
S =	SUPERVISER =	نگراں
Q =	QUEST =	جستجو
U =	UMPIRE =	ثالث
I =	ILLEGAL =	غیر قانونی
T =	TREATMENT =	علاج
O =	ORGANISATION =	انجمن

یعنی مچھر جستجو کے بہت زیادہ فرمانبردار نگراں اور غیر قانونی انجمن علاج کے ثالث ہوتے ہیں۔ اب یہ جستجو اور فرمانبرداری کس کی ہے ؟ نگرانی کہاں کی ہے اور غیر قانونی انجمن کہاں ہے؟ یہ سب محسوس کرنے کی باتیں ہیں!

فرم کے ایم ڈی صاحب ایک دن اپنے آفس میں بیٹھے خود ہی ضروری خط ٹائپ کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک بے تکلف دوست آ گئے اور انھیں دیکھ کر پوچھنے لگے ۔ "بھئی وہ تمہاری اسٹینوگرافر کہاں گئی کیا آج بھی چھٹی پر ہے"؟

"اس لیے شادی کرلی ہے" مینجنگ ڈائرکٹر صاحب نے بتایا۔

"کب اور کس سے"؟ دوست نے حیرت سے پوچھا۔

"کل شام، اور مجھ سے۔ انہوں نے کہا۔

ضیاء الحق قاسمی
(پاکستان)

غزل

اس دورِ سیاست میں وہ لیڈر نہیں ہوتا
جو شخص کہ اِک بار بھی "اندر" نہیں ہوتا

ایسے بھی ہیں بیوی سے جو کھا لیتے ہیں جوتے
ہر شخص تو احساس کا پیکر نہیں ہوتا

اُس شخص کو کہہ سکتے ہیں جورو کا بھی کچھ
نوکر تو وہ ہو سکتا ہے شوہر نہیں ہوتا

دفتر میں جو حاضر رہے پابندی سے ہر روز
چپراسی ہی ہوتا ہے وہ افسر نہیں ہوتا

جو شخص بناتا ہے سکوٹر ہی کے پنکچر
اُس شخص کا اپنا کبھی پنکچر نہیں ہوتا

اُس بس کے کنڈکٹر کی تو ہو جاتی ہے چاندی
جس بس میں کوئی ایک بھی چیکر نہیں ہوتا

شاپنگ کے لئے جائے بھی بیگم تری کیسے
گاڑی نہیں ہوتی کبھی شوفر نہیں ہوتا

بچوں کو جو کھانا بھی کھلاتا ہے تو نوکر
اُس روز تو فاقہ ہے جو نوکر نہیں ہوتا

مقروض مرا آگے ہے میں اس کے ہوں پیچھے
گھر پر نہیں ہوتا کبھی دفتر نہیں ہوتا

کچھ یاد تو ہے ہم کو سبق عشق کا اب بھی
طوطے کی طرح اب تو وہ فر فر نہیں ہوتا

اُس کار کا ٹکر سے کباڑہ ہی تو ہوگا
جس کار کے آگے کوئی بمپر نہیں ہوتا

لنڈے سے خریدا ہے ضیاءؔ تو نے جو یہ کوٹ
بیکار ہے، اس کوٹ میں استر نہیں ہوتا

صابر بہاری
(رانچی)

قاشیں

بوا جمالو نے اپنے کو کیا سنوارا ہے
لبوں پہ لالی ہے، چہرہ مگر پچھوارا ہے
بلند شیخ کی تقدیر کا ستارا ہے
میاں حلیمؔ نے مُرغا کسی کا مارا ہے

چلن لباس کا کتنا بدل گیا ہے میاں
جسے میں سمجھا تھا بیوی، نکل گیا ہے میاں
بجائے فاختہ اب تو اُڑا رہا ہے جہاز
خلیلؔ آج کا کتنا بدل گیا ہے میاں

صابرؔ غمِ معاش سے اپنا نہ دل دُکھاؤ
کھچڑی ملے تو کھاؤ سمجھ کر اسے پلاؤ
فنِ مغالطات کے قائیں کا شیر ہوں
میری گرج سنو مرے اشعار پر نہ جاؤ
گھتے گلی کے یار تمہیں کاٹ کھائیں گے
گھر سے نکل کے رات کو تنہا کہیں نہ جاؤ

٭ ٭ ٭

عابد معز
(حیدرآباد)

مزاح نگاراں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

واہ حیدرآباد

انگریزی زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے
CHARITY BEGINS AT HOME یہی کہاوت
مزاح نگاری میں بھی صادق آتی ہے۔ اپنے آپ اور اپنے گرد و
پیش کو نشانہ بنانا سہل ہے۔ دوسروں پر ہنسنے کے بجائے
اپنے آپ کو تختۂ مشق بنانا اوروں کو پسند بھی آتا ہے وہ مسکراتے
ہنسنے اور قہقہہ لگانے سے نہیں چوکتے اور یہی کامیاب مزاح
نگاری ہے۔ ہماری اس رائے سے انگریزی زبان کے مزاح نگار
مارک ٹوین بھی متفق تھے تبھی تو انھوں نے کہا تھا "بڑا مزاح نگار
وہ ہے جو دوسروں پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے خود اپنا
مذاق اڑانے کا حوصلہ رکھتا ہو"۔ اس نکتہ میں احتیاط ملحوظ
ہے اپنے آپ کا مذاق اڑانے میں دوسروں کی خفگی اور غصہ
کا احتمال بھی نہیں رہتا۔ یہ جسارت ہم نے اس لیے باندھی ہے
کہ ہمارے اپنے شہر حیدرآباد پر خاکہ لکھنے کا جواز پیدا
کیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اتنے بڑے مزاح نگار
تو ہیں نہیں کہ ابن بطوطہ کے تعاقب میں چلنا ہے تو چین
چلے گئے یا پھر جاپان چلو جاپان چلو کا دم بھرنے لگتے۔
ہمارا تو جواب حیدرآباد شہر اور حیدرآبادی ہی ہیں بھگت

لیتے ہیں۔
انسان کو پیدائش کے بعد چند چیزوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔
ماں باپ، آس پاس کا ماحول اور وہ سرزمین جسے وطن کہا
جاتا ہے یہ چیزیں اس کی گھٹی میں پڑ جاتی ہیں جو بعد میں
اس کی مجبوری اور کمزوری بن جاتی ہیں۔ ہم یہاں پیدا
ہوئے تو ہم نے اس شہر سے محبت کی۔ اس کے برخلاف
اگر ہم ٹمبکٹو میں جنم لیتے تو وہ ہمارا وطن ہوتا یہ ایک ایسا
حادثہ ہے جس میں انسان کا عمل دخل نہیں ہے۔ اس مجبوری
کے تعلق سے ایک واقعہ سنیے۔ ایک سیاح تفریح کے لیے
امریکہ گیا۔ اس نے گائیڈ کو بتلایا۔ "مجھے دنیا میں صرف دو شہر
پسند ہیں ایک میرا وطن اور دوسرا تمہارا وطن"۔ بعض اشخاص
بہتر مستقبل کی تلاش کی طرح بہتر وطن کی خاطر زندگی
میں دوبارہ پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری مرتبہ سوچ سمجھ کر بہتر
مقام کا انتخاب کرتے ہیں۔ پرانے وطن کو یاد کرتے ہوئے
نئے وطن کی خدمت میں جٹ جاتے ہیں۔
تاریخی روایت ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے
بھاگ متی کے عشق میں شہر حیدرآباد بسایا۔ شہر لوگوں کے پانی

کی ضرورت ہوتی ہے اسی لیے موسیٰ ندی کے کنارے کا انتخاب کیا محمد قلی قطب شاہ اردو شاعر بھی تھا۔ اسی لیے اس نے ندی کی مناسبت سے دعا کے لیے یہ شعر موزوں کیا ؎

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر　　رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیع

اللہ تعالیٰ قطب شاہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس کی دعا برآئی۔ اس کے سمندر میں اتنی مچھلیاں ہوئیں کہ شہر حیدرآباد پھیلتا گیا۔ موسیٰ ندی کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ بے چاری حیران پریشان سکڑ سی گئی۔ کہنے کو حیدرآباد کے حدود اربعہ ہیں لیکن حیدرآباد شہران جغرافیائی حدبندیوں کو بالائے طاق رکھ کر چار طرف خوشبو کی طرح پھیلتا گیا۔ ہم چلتے چلتے تھک جائیں گے لیکن حیدرآباد شہر ختم نہ ہوگا۔ آس پاس کے علاقے والے اپنے آپ کو بھی حیدرآباد کے شہری کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ حیدرآباد شہر ساری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ شکاگو میں حیدرآباد ملے گا۔ بقول مجتبیٰ حسین کوئی بھی پتھر اٹھائیے اس کے نیچے سے حیدرآبادی آداب عرض کرتے ہوئے برآمد ہوگا۔ لندن میں حیدرآباد موجود ہے تو ٹورنٹو میں حیدرآباد بسا ہوا ہے۔ وہ تو قلی قطب شاہ کی دوراندیشی تھی جس نے شہر بسانے سے قبل چار مینار بنوایا۔ ہاں جناب حیدرآباد شہر کا یہ جغرافیائی نشان چار سو سال بعد بھی اپنے چاروں مینار سمیت موجود ہے۔ چار مینار، شہر حیدرآباد ڈھونڈنے میں مورخین کی مدد کرتا ہے۔

حیدرآباد شہر کو جو بھی آیا، اس شہر وفا نے اس کا استقبال کیا۔ بقول آنجہانی رائے محبوب نارائن "دلی لٹی تو مامن امن حیدرآباد۔ شام اودھ ڈھلی تو حیدرآباد ہی نے شب نغمہ سنواری۔ صبح بنارس چپ ہوگئی تو حیدرآباد ہی نے جھلکی کے بھجن گا۔۔۔؟" مختلف مقامات سے لوگ حیدرآباد آئے۔ یہاں سکونت کو پرسکون جانا اور یہیں کے ہو رہے — ہم حیدرآباد کا آنے والے لوگوں کی ناز برداریاں کرتے، انھیں نوازتے اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہر میں ایرانیوں اور مدراسیوں کی ہوٹلیں مشہور ہیں۔ تجارت میں گجراتی، سندھی اور مارواڑیوں کی اجارہ داری ہے۔ سرکاری نوکریوں میں آندھرا لوگوں کی بھرمار ہے۔ ادب میں شمالی ہند کے لوگ اپنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں —!

دوسرے مقام کا کوئی بھی انسان، انسانیت کے شہر میں اپنے آپ کو پردیسی محسوس نہیں کرتا۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ حیدرآباد کی کسی بھی گلی میں کوئی بھی پردیسی نکل جائے تو اس کے ہم رنگ، ہم نسل اور ہم زبان لوگ مل جائیں گے اور وہ سب مل کر اپنی کالونی آباد کر بیٹھے ہیں۔ ہمارے شہر میں ہر مقام کی کالونی ملے گی۔ سندھی کالونی، آندھرا کالونی، گجراتی گلی، بنگالی سبھا وغیرہ۔ ہمارا شہر اس حد تک کاسمو پولیٹن بن چکا ہے کہ آج خود "حیدرآبادی" "تلاش گمشدہ" کا اشتہار بن چکا ہے۔ جب بھی ہمیں حیدرآباد اور اس کے شہری کی یاد ستاتی ہے تو ہم حیدرآبادی کو ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔ اور ناکام لوٹتے ہیں چند دن قبل ہم حیدرآبادی کو تلاش کرنے کی مہم پہ تھے کہ ہمیں ایک حیدرآبادی نظر آیا چوڑی دار اور نہ شلوار قسم کا پاجامہ "کچھ ڈھیلا اور کچھ تنگ پاجامہ جسے گرگی" کہتے ہیں، شیروانی کے پورے بٹن بند اور سر پہ پھندنے والی رومی ٹوپی پہنے فرشی آداب عرض کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم بہت خوش ہوئے احتراماً اس کے ہاتھوں کو چوما۔ وہ پریشان ہوا اور کہنے لگا "میں حیدرآبادی نہیں ہوں۔ میں تو رشید قریشی کے ڈرامہ "محبوب" میں اداکاری کر رہا ہوں۔"

جس طرح حیدرآباد شہر نے ہر نسل اور ہر مقام کے انسانوں کو گلے لگایا ویسے ہی حیدرآباد کی گود میں مختلف زبانیں پروان چڑھیں۔ دلی سے اردو حیدرآباد آئی یہاں کا ذریعہ تعلیم سرکاری زبان بنی اور شہر میں اردو کی پہلی جامعہ قائم

ہوئی۔ جب اُردو کافی ترقی پا چکی تو شہر حیدرآباد نے اردو کو چھوڑ کر تلیگو کی سرپرستی کی جو ابھی جاری و ساری ہے۔ ان دو زبانوں کے علاوہ ہمارے شہر میں دوسری زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ہم تو کہیں گے کہ ہمارے شہر میں بیک وقت کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہم نے ایک صاحب کو کہتے سُنا "حیدرآباد بہت سُندر سٹی ہے میں یہاں 20 YEARS پہلے آیا تھا اب یہاں سے پُو نیکے کو نہیں کرتا۔"

حیدرآباد شہر کے موسم کے بارے میں ہم کہیں گے کہ یہاں کا موسم یکساں اور قابل برداشت ہوتا ہے۔ ایک ہی قسم کے کپڑوں میں سال بھر گزارا جاسکتا ہے۔ ہر شہر کے موسم کی طرح ہمارے شہر میں بھی تین رت ہوتے ہیں گرما، بارش اور سرما گرمی ہوتی ہے لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ کشمیر یا اوٹی جانے کے لیے مجبور کردے (اور نہ ہی) اتنی کہ حسینوں کو اپنا رنگ ماند پڑجانے کا خدشہ لگا رہے۔ بارش وقفہ وقفہ سے ہوتی ہے شہریوں کو بھیگ کر سوکھنے کا موقع مل جاتا ہے برساتی اور چھاتہ استعمال کرنے کی شاذ و نادر ضرورت پیش آتی ہے۔ رکھے رکھے جھینگر سوراخ کردیتے ہیں یا مکڑیاں جال بُن دیتی ہیں۔ اب باقی رہا موسم سرما، وہ بھی پریشان نہیں کرتا۔ گرم کپڑوں کی ایک یا دو مرتبہ ہی ضرورت پیش آتی ہے۔ شادی کی شیروانی سے کام چلایا جاسکتا ہے۔ حسرت دل ہی میں رہ جاتی ہے کہ سرما میں اپنے آپ کو رضائی، بلانکٹ، سوئیٹر، کوٹ، مفلر، یا کم از کم بنیان میں لپیٹے گرم اور چٹ پٹے کھانوں کے ساتھ جاسوسی ناولوں کا لطف اٹھائیں، بارش کی وجہ سے گھر میں قید رہ کر صفائی کریں اور گرما کے موسم میں نقل مقام کریں۔

حیدرآباد شہر کی مشہور پیداوار کے تعلق سے شاہد صدیقی مرحوم لکھتے ہیں "اس کے کھیتوں میں جوار پیدا ہوتی ہے جسے کھا کھا کر لوگ موٹے ہو جاتے ہیں (لوگوں کو جوار کھا کر موٹے ہوتے ہوئے ہم نے نہیں دیکھا، جوار کو گیہوں اور چاول سے کم تر غذا سمجھی جاتی ہے۔ اور جوار کھانا ایک عیب سمجھا جاتا ہے جوار کی روٹی پکانا پتھر کے زمانے کا آرٹ ہے۔ جوار اور جوار کھانے والے مل جاتے ہیں لیکن جوار کی روٹی بنانے والے نہیں ملتے۔ جوار کی روٹی بنانے کے لیے نزاکت، دانائی اور ان سے زیادہ صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ تھپک تھپک کر روٹی بنانا اور پانی لگا کر سینکنا پڑتا ہے ہمارے دوست مسیح انجم کا خیال ہے کہ جسے جوار کی روٹی بنانا آتا ہے وہ ایک مثالی بیوی ثابت ہوتی ہے) اس کے جنگلوں میں سیتا پھل دستیاب ہوتا ہے جس میں وٹامن پائے جاتے ہیں (خوشی کی بات ہے AN APPLE A DAY KEEPS THE DOCTOR AWAY کی طرح حیدرآبادیوں کے لیے روز ایک سیتا پھل صحت مند رکھتا ہے۔ سائنٹسٹ مزاح نگار محمد برہان حسین اس نکتہ پر تحقیق کریں) اس کی زمین پر گھانس اگتی ہے جسے گھوڑے اور دوسرے چوپائے رغبت سے کھاتے ہیں (ہم نے بعض دوپائے کو بھی گھانس کھاتے ہوئے دیکھا ہے ان کے خیال میں گھانس کھانے سے بینائی اچھی رہتی ہے اس لیے کہ کوئی جانور عینک استعمال کرتا نظر نہیں آیا) اس کے بعض علاقوں میں نیشکر کے کھیت ہیں جس کی وجہ سے شکر سازی کی صنعت روز افزوں ترقی پر ہے اور ہم میٹھا کھانے پینے ہیں (مرحوم کو مغالطہ ہوا ہوگا، شکرین شکر سے میٹھی ہوتی ہے)

شاہد صدیقی مرحوم حیدرآباد شہر کی اہم پیداوار کو فراموش کر بیٹھے جو ہیں مضمون لکھتے وقت جسم کے مختلف مقامات پر کاٹ کاٹ کر اپنی توجہ مبذول کروا رہا ہے۔ جی ہاں آپ کا خیال صحیح ہے۔ ملیریا کے جراثیم حیدرآبادی کے خون میں دریافت کیے گئے تھے۔ یہی جراثیم مچھر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مچھروں سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔ اس خونی رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے ہم اپنے شہر میں مچھروں کی افزائش کرتے ہیں۔ انھیں اپنا خون پلا کر پالتے ہیں۔

مزاح نگاروں کے علاوہ حیدرآباد شہر کی تین چیزیں مشہور ہیں شیروانی' بریانی اور گنڈی پیٹ کا پانی۔ زینت ساجدہ لکھتی ہیں "حیدرآباد کی شیروانی خالی خالی نظر آتی ہے۔ بریانی پکانے والے نہیں کہ اب کھانے والے کہاں رہے۔ ہاں اب یہاں کی یہی ایک چیز ہے۔ گنڈی پیٹ کا پانی" شیروانی خالی نظر آنے کے ساتھ یہی لگتا ہے کہ حیدرآباد شہر، شیروانی پہننے والوں سے خالی ہو چکا ہے۔ شیروانی سینے والے چند مال غنیمت لوگ باقی ہیں جو دوسروں کے لیے شیروانیاں تیار کرتے ہیں لوگ دور دراز سے شیروانی سلوانے ہمارے شہر آتے ہیں۔ بریانی اور گنڈی پیٹ کا پانی صرف اور صرف حیدرآبادیوں کو پسند آتا ہے۔ جسے یہ دونوں چیزیں راس آ گئیں سمجھئے کہ وہ حیدرآبادی کا ہے۔ بریانی اور گنڈی پیٹ کا پانی لازم و ملزوم ہیں۔ روایت ہے کہ ایک حیدرآبادی نواب زادے نے دیارِ غیر میں بریانی کی دعوت کی۔ بریانی کے وطن حیدرآباد سے باورچی بلایا گیا۔ برتن، مصالحہ جات اور دوسرے لوازمات بھی حیدرآباد سے منگوائے گئے کہ کہیں اونچ نیچ نہ ہو جائے غرض بریانی پکوانے کے لیے حیدرآباد ی ماحول تیار کیا گیا بریانی پکی لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ نواب زادے کو غصہ آیا۔ باورچی کو طلب کیا اور وجہ دریافت کی۔ باورچی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "جان کی امان پاؤں تو عرض کروں سب چیزیں تو حیدرآباد کی تھیں لیکن گنڈی پیٹ کے پانی کی کمی رہ گئی تھی۔"

شہر حیدرآباد کی مخصوص سواری "سیکل رکشہ" ہے سیکل رکشہ دوسرے مقامات پر بھی چلتے ہیں لیکن حیدرآباد کے سیکل رکشہ منفرد ہوتے ہیں۔ سیکل رکشہ میں بیٹھنے کے لیے اردو حرف "ا" (الف) جیسے انسان کو انگریزی حرف "C" کی طرح بن جانا پڑتا ہے۔ اردو سے انگریزی میں منتقل ہونے کے لیے کبھی کپڑوں کی قربانی دینی پڑتی ہے تو اکثر و بیشتر اپنے آپ کو زخمی کرنا پڑتا ہے بسر جھکائے زمین کو دیکھتے اپنی آخرت کے بارے میں سوچتے بیٹھنا پڑتا ہے۔ سر اُٹھانے کی کوشش تو مہنگا پڑتا ہے جو لوگ اپنے آپ کو کسی وجہ سے "C" میں ڈھالنے کے قابل نہیں ہوتے وہ حیدرآباد کی مخصوص سواری سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ اس سواری میں جوتا جانے والا "سو وہ بھی ہے آدمی" اس سواری میں بیٹھنے والے لوگ موٹے تازے فربہ اندام ہوتے ہیں جب کہ رکشہ چلانے کے لیے نحیف و ناتواں، گال پچکے ہوئے کمزور آدمی کی شرط ہوتی ہے سیکل رکشہ کو لنگی پہن کر چلانا سہولت بخش ہے۔ لنگی کے ساتھ بنین خوب جچتی ہے اور جب لنگی بنین کے ساتھ ٹوپی سر کے بجائے تالو پر آ جاتی ہے تو یہ فلموں کا حیدرآبادی کردار بن جاتا ہے۔

دوسرے شہروں کی طرح حیدرآباد شہر میں بھی قابل دید مقامات ہیں۔ علم دوست بادشاہ نے کسی ہندوستانی زبان میں پہلی جامعہ قائم کی۔ ہم نے اس جامعہ کو قائم تو رکھا لیکن اس کی انفرادیت کو برقرار نہ رکھ سکے سو اس جامعہ عثمانیہ کے بدلتے مزاج کو دیکھا جا سکتا ہے! فرد واحد کی کارگزاری سالار جنگ میوزیم موجود ہے۔ اپنے آباء و اجداد سے زو میں ملا جا سکتا ہے۔ جس کے ایک حصہ میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانوں کو قید میں تو درندوں کو کھلا چھوڑا جاتا ہے۔ اسے سفاری پارک کہتے ہیں۔ ایک ہی ندی پر بنائے گئے۔ ایک دوسرے سے قریب پانچ پلوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ندی کے کنارے ایک دوسرے کے مقابل عدالت عالیہ اور دواخانہ عثمانیہ ہیں۔ اس محل وقوع میں چھپی مصلحت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ قلعہ گولکنڈہ اور گنبدیں گزرے ہوئے دور کی نشانیاں ہیں۔ شہر میں مساجد اور منادر بہترین تعمیر کے نمونے ہیں۔

"عثمان ساگر کا تالاب" ہے جس کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے کہا تھا "سنگ مرمر کا بیچ اور لیلۃ القدر کی بات کے بعد عثمان ساگر کا تالاب کی نادر ترکیب دیکھنے میں آئی۔" ان مقامات کے علاوہ ہمارے نزدیک حیدرآباد شہر کا قابل دید مقام "دیوان خانہ" ہے جو کسی زمانے میں حیدرآبادی گھر کی زینت ہوا کرتا تھا۔ بقول پروفیسر یداللہ مہدی آج لوگ آنکھوں دیکھی سے زیادہ سنی سنائی کے قائل ہو گئے ہیں ہم نے تو کوئی دیوان خانہ دیکھا نہیں ہے صرف ان کی شان و شوکت، رکھ رکھاؤ اور دبدبے کے تعلق سے سنا ہے۔ دیوان خانوں کی تعمیر کا اپنا ایک انداز تھا جہاں حیدرآبادی تہذیب پروان چڑھتی تھی۔ آج کل تو ہم نے پس ماندہ دیوان خانوں کو فنکشن پیلس بنتے ہوئے دیکھا ہے جہاں شادیاں، چھلے، عقیقے، سالگرہ وغیرہ تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔

"حیدرآباد نگینہ اندر مٹی اور پر چونا" ہمارے شہر کے تعلق سے یہ کہاوت مشہور ہے۔ یہ کہاوت کیسے وجود میں آئی؟ کوئی ریسرچ اسکالر ہی تحقیق کر کے بتلا سکتا ہے۔ ہماری اپنی رائے ہیں، مسئلہ مسائل اور پریشانیوں کے باوجود ہم جو وضعداری نبھاتے ہیں اس کی ترجمانی اس کہاوت سے ہوتی ہے۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ اس شہر میں مزاح نگاری کو ضرورت سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ زندہ دلوں نے لوگوں کے مسکرانے کے لیے زندہ دلان حیدرآباد قائم کیا۔ پہلی عالمی مزاح کانفرنس کی اور ہندوپاک کا منفرد طنزیہ و مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" پابندی سے نکالتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کے سر کئی سنجیدہ حضرات کو مزاح نگاری اور مسکرانے والوں کو قہقہہ لگانے کے لیے اکسانے کا الزام باندھا جاتا ہے۔ خود کبھی مزاح نگاری نہیں کرتے۔ کہتے ہیں اچھے کھانے پسند کرنے کے لیے باورچی ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایڈیٹر صاحب سے خواہش ہے کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ مضمون کے اس حصہ پر نہ کریں۔

نریندر لوتھر نے اپنے مضمون "حیدرآباد کا جغرافیہ" کی ابتدا میں جس خیال کا اظہار کیا تھا اس مضمون کے لکھنے کے بعد ہم ان کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہوئے انہوں نے لکھا ہے "طویل عرصہ سے حیدرآباد پر ایک جامع اور مستند مضمون کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ مضمون اس امید کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ کمی اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جائے گی"!!

"جناب آپ غور تو کیجئے، یہی بات کیا کم ہے کہ جب آپ مریں گے تو آپ کی بیوی اور بچوں کو پچاس ہزار کی رقم دی جائے گی"۔

بیمہ کمپنی کے ایجنٹ نے ایک صحافی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے مرنے سے پہلے بیوی اور بچے کون دے گا۔

کیا آپ"؟ صحافی نے مسکرا کر پوچھا۔

نسیم سحر (جدہ)
(سعودی عرب)

ہزل

سدا جو گنتے رہتے تھے کئی کمزوریاں اسکی ۔۔۔ ہوا جب فوت، اب گننے لگے ہیں خوبیاں اُس کی

ہوئے ہیں یار کی یاری سے ہم اس واسطے محروم ۔۔۔ کہ بیگم بنتی جاتی ہے نری چنگیز خاں اُس کی

وہ اَن پڑھ ہے مگر رشتہ اُسے بہتر ملا مجھ سے ۔۔۔ کہ دو شفٹوں میں چلتی ہیں اٹھارہ ٹیکسیاں اُس کی

مجھے ناصح نے اپنے گھر بُلا کر خوب جھاڑا ہے ۔۔۔ اُٹھا لایا ہوں میں بھی واپسی پہ جوتیاں اُس کی

رقیبِ روسیہ کو چُومتا ہوں میں، کہ خوش قسمت ۔۔۔ ابھی آیا ہے اُس کوچے سے کھا کر گالیاں اُس کی

یہ بجا شیخ کی مانند "ویجی ٹیرین" ہوگا ۔۔۔ کہ کھا جاتا ہے اکثر گاجریں اور مولیاں اُس کی

ہمیشہ اک پلندہ ڈاک کا لاتا ہے میرے ہاں ۔۔۔ مگر چٹھی کبھی لایا نہیں چٹھی رساں اُس کی

زنِ امروز کی ڈیمانڈ ہے یہ اپنے شوہر سے ۔۔۔ وہ اپنی مونچھ منڈوالے، پہن لے چوڑیاں اُس کی

کدورت اپنے ہمسائے سے اُس نے اس لئے پالی ۔۔۔ کہ ہمسائے کے گھر دیتی ہیں انڈے مرغیاں اُس کی

لگا ہوتا ہے ٹی وی پر ڈرامہ سیریل اُس وقت ۔۔۔ مؤذن کو گلہ ہے، بے اثر کیوں ہے اذاں اُس کی

رقیبِ روسیہ کو عید کے دن مل سکوں اے کاش ۔۔۔ محبت سے گلے لگ کر میں توڑوں پسلیاں اُس کی

ملاقی وہیں پر شیخ کی چیں بول جائے گی ۔۔۔ بنائیں یونین مل کر جو چاروں بیویاں اُس کی

وہ ہر سالی کو اپنی نصف گھر والی سمجھتا ہے ۔۔۔ گریزاں ہیں جبھی اُس شخص سے سب سالیاں اُس کی

ریسیور اپنے سر پر اُس نے برہم ہو کے دے مارا ۔۔۔ سُنی جس وقت ٹیلی فون پر عاشق نے "ناں" اُس کی

ادا کرنا ہے اُس کی سابقہ زچگی کا بل اب تک ۔۔۔ خیر پھر سے کوئی دینے لگیں اُبکائیاں اُس کی

ہزل کے ڈیڑھ دو سو شعر ہوتے ہیں تو ہونے دو ۔۔۔ نہ روکو آج شاعر کو، طبیعت ہے رواں اُس کی

نسیم اُس کی گلی میں اپنا سر پھُٹوا کے آیا تھا
وہیں جائے گا پھر جس دن کھلیں گی پٹیاں اُس کی

-○- -○- -○-

بانو سرتاج

دیکھن میں چھوٹے لگیں...

سر کو جسم کے تمام اعضاء پر فوقیت حاصل ہے۔ سر اپنے اندر رکھے ہوئے دماغ سے کام لے کر جسم کے تمام اعضاء پر حکومت کرتا ہے۔ تمام اعضاء کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ دماغ نے سوچا اور حکم دیا نہیں کہ ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک، کان سب تعمیل میں جٹ گئے۔ یہ حکومت مطلق العنان نہیں، کیوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سر نے جسم کے دوسرے اعضاء سے دشمنی پر کمر باندھی ہو۔ اپنے بڑے ہونے کا احساس اُسے سب سے مِل جُل کر رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔ سر یہ کبھی نہیں چاہتا کہ وہ ہاتھوں کو غلط کام کرنے کا حکم دے۔ نتیجے میں ہاتھ کٹ جائیں۔ پاؤں کو غلط راستے پر بڑھنے کو کہا جائے اور وہ اُس کی سزا پائیں۔ ہاں دماغ کے ناکارہ ہو جاتے، سڑ جانے کی صورت میں جسم پر سر اُس کا کنٹرول نہیں رہ جاتا۔

سر یعنی باس یعنی ہیڈ، دماغ کی ایسی سڑی ہوئی شکل ہی ہے۔

ہیڈ یا سر چاہے دو کا ہو دس کا ہو یا دس ہزار کا۔۔۔ سڑا ہوا ہوتا ہے۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہو، ہیڈ کلرک ہو، ہیڈ پوسٹ مین ہو، ہیڈ ویٹر ہو، ہیڈ کانسٹیبل یا ہیڈ ماسٹر ہو، ہیڈ بنتے ہی اُن کے ہیڈ میں کیڑے کلبلانے لگتے ہیں۔

ایک فارسی کہاوت ہے کہ لمبے آدمیوں کی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے اور پستہ قد آدمی فتنہ ہوتے ہیں۔ ہمیں لمبے آدمیوں سے اتنی رنجش کبھی نہیں ہوئی کہ اُن کے گھٹنوں میں عقل کی تلاش کرتے۔ اوپری منزل خالی ہونے کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ گھٹنوں میں عقل ہو ہی بقول شاعر ؎

یہ کیا ضرور ہے کہ ملے سب کو ایک سی عقل
آؤ نا ہم بھی کھوج کریں لمبوں میں عقل کی!

خیر یہ سب فرصت کے اوقات کے شغل ہیں جن پر پھر کبھی سوچا جائے گا۔۔۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ ایک پستہ قد آدمی سے ہمارا سابقہ پڑا اور ہم نے کہاوت کی سچائی پر ایمان لایا یہ بات ہم چھپائیں گے نہیں۔

ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے چھوٹے لال۔ قد سوا چار فیٹ۔ صورت شکل ایسی کہ بدن پر اگر گھنے بال بھی ہوتے تو چمپانزی کا گمان ہوتا۔ عادات و خصائل اسی صنف کے دوسرے بندروں سے مشابہ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بندر ہمہ وقت اپنا جسم کھجاتے ہیں چھوٹے لال کا زیادہ وقت دوسروں کو نوچنے میں گزرتا۔ موٹی فٹ بال بیوی کی جوتیوں کے طفیل میں سر کے آدھے بال غائب تھے۔ بھوری آنکھیں کوّے کی طرح حریص جو ہر دم کہیں سے کچھ اڑا لینے کی فکر میں رہتا ہے۔ کچھ نہ ملے تو ڈھور کے مرنے کی دُعا

مانگتا ہے۔ (مگر کوتے کے کوسنے سے کوئی ڈھور مرا ہو یہ آج تک تو ہم نے نہیں سُنا) زبان کٹاہ پھوڑے کی طرح تیز جو گلی میں سوراخ کردیتی ہے۔ چھوٹے لال کے بول مخاطب کے دل کو چھید کر رکھ دیتے تھے۔ ذہانت میں لومڑی کی مثال دی جا سکتی تھی۔ چھوٹے لال کی گرفت چیتے کی گرفت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ جس کو دبوچ لیا اس کا آزاد ہونا محال۔ جونک جیسے حمام خون چوس لینے کے بعد پٹ سے علیحدہ ہو کر گر پڑتی ہے اُسی طرح چھوٹے لال جب تک اپنے مخالف کو زیر نہ کر لیتے اس سے چمٹے رہتے۔ فخریہ اعلان کرتے کہ مجھ سے بگاڑ کرنے والا چین سے نہیں رہ سکتا۔

ہم نئے نئے کالج میں گئے تھے۔ ڈیپارٹمنٹ میں چار لکچرار تھے۔ دو نہایت قدآور، دو لیس ویسے جیسے ہونے چاہئے مگر ہیڈ سے انہیں تو کیا اُن کی روح کو کانپتے دیکھا۔ ہمارے جاتے ہی انہوں نے اشاروں کنایوں میں ہمیں سمجھانا چاہا مگر ہم نے صاف کہہ دیا "ہم خاتون ہیں تو کیا ہوا؟ ہم چوہے سے نہیں ڈرتے؟"

ہماری بات کی صداقت کا اندازہ بھی انہیں جلد ہی ہو گیا۔ ہم نے دو ماہ کی رخصت کی درخواست دی تھی۔ ٹی ٹائم میں اسٹاف روم میں بات ہونے لگی۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اپنی کوّے کی سی تیز آنکھوں سے ہمیں گھور کر طنز سے بولے "ہوں! تو آپ حج کے لیے جارہی ہیں۔ نو سو چوہے پورے ہو گئے کیا؟"

"نہیں ایک باقی ہے۔" ہم نے برجستہ کہا "آپ کو واپس آکر کھائیں گے۔"

ان کا چہرہ بے رنگ ہو کر رہ گیا۔

ابتداء میں وہ ہر کسی سے ہماری تعریف کرتے۔ کہتے "میری وائف انہیں دیکھ کر گھڑی ملاتی ہے۔ میں خود آپ کی آمد و رفت کو دیکھ کر اپنی گھڑی کا وقت درست کرتا ہوں۔ طلباء کو ہماری باقاعدگی، اصول پسندی اور ایمانداری کی مثال دیتے۔ ہمارے طنزیہ و مزاحیہ افسانوں کی تعریف کرتے۔ . . مگر جیسے ہی ہماری دو کہانیوں کو انعام ملا۔ ہماری سوشل و کلچرل مصروفیت بڑھی وہ رُخ بدل بیٹھے۔ پڑ گئے ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے۔ یہ تو وہ پہلے ہی جان چکے تھے کہ ہم اُن کے خوشامدی ٹٹوؤں میں شامل نہیں ہونے والے۔ بس دن رات ہمیں ذلیل کرنے کے لیے کوشاں رہنے لگے۔ انہیں ڈر تھا کہیں ہمارا باغیانہ رویّہ ان کے دوسرے چمچوں کی آنکھیں نہ کھول دے۔ وہ بھی سرکشی پر نہ اتر آئیں۔ موقع بے موقع طعنہ زنی شروع کر دیتے۔ ایک روز کہا "مسز مہرہ، بھیڑوں کے گلّے میں اگر ایک کالی بھیڑ آجائے تو سب کو راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔ جیسے ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ مہرہ صاحب کچھ کہتے اس سے پہلے ہم نے کہا "جہرہ صاحب کل آپ تھوک کر چاٹنا محاورے کا مطلب دریافت کر رہے تھے نا؟ سمجھئے آپ کل تک کسی کی تعریف کررہے ہیں مگر آج اچانک آپ کو اس میں دنیا بھر کی برائی نظر آنے لگے جس کا آپ کھلے عام ذکر بھی کرنے لگیں تو آپ کے اس اقدام کو تھوک کر چاٹنا کہیں گے۔"

ایک دن ڈیپارٹمنٹ کے طلباء نے چھوٹے لال کا گھیراؤ کر لیا۔ اُن کے کیریکٹر کے بارے میں کہیں سے کچھ سُن کر مشتعل ہو گئے تھے۔ آفس میں انہیں بند کر کے جوتے لے کر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ہم لوگوں نے انہیں شانت کیا۔ اس واقعے کے پندرہ بیس روز بعد کی بات ہے اسٹاف میں ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے بولے "جن کو پڑھانا نہیں آتا وہ کلاس میں کہانیاں سُنا کر وقت ضائع کرتے ہیں۔"

"کون؟ کون کہانی سنا رہا تھا؟ کون سی کہانی تھی؟" اردو کے صاحب جو ہیڈ کے چمچۂ خاص تھے، جلتی میں تیل چھڑکنے کی غرض سے بولے۔

ہم نے کہا "ہم سے سنئے وہ کہانی۔ بغداد کے خلیفہ کے دل میں ایک دن خیال آیا کہ معلوم کرنا چاہیئے کہ دنیا کا خوش قسمت ترین

انسان کون ہے؟" اس نے درباریوں سے دریافت کیا درباریوں نے خوشامداً خلیفہ ہی کو دنیا کا خوش قسمت انسان قرار دیا۔ خلیفہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے مدرسہ پہنچ کر مولوی صاحب سے وہی سوال کیا۔ مولوی صاحب نے کہا توقف کیجئے "ابھی جواب دیتا ہوں" مولوی صاحب نے بچوں کو چھٹی دے دی اور چلنے کی تیاری کرتے ہوئے بولے "بچو! میرے جوتے لے آؤ" تمام بچے دوڑے۔ دو لڑکے سب سے پہلے جوتوں کے پاس پہنچے اور آپس میں لڑنے لگے ہر کوئی جوتے خود لے جانا چاہتا تھا۔ آخر باہم مل کر دونوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں ایک ایک جوتا لے جائیں گے۔ دونوں لڑکے ایک ایک جوتا لے کر مولوی صاحب کے پاس آئے۔ خلیفہ حیرت زدہ یہ منظر دیکھ رہے تھے کیوں کہ وہ دونوں لڑکے اُن کے اپنے بیٹے تھے۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر خلیفہ سے کہا۔ "یہ آپ کے سوال کا جواب ہے حضور۔ جس استاد کے جوتے اٹھانے کے لیے دو شہزادے آپس میں جھگڑا کرتے ہیں اور پھر ایک ایک جوتا اٹھا کر لاتے ہیں وہ استاد دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے۔"

"بکواس" چھوٹے لال منہ بگاڑ کر بولے "اس زمانے میں اس کہانی کی کیا اہمیت ہے؟" ہم نے سمجھایا — آپ نے ہماری بات پوری سنی نہیں۔ ہم دراصل طلباء کو بتا رہے تھے کہ آج کے استاد نے اپنا مقام کھو دیا ہے۔ کل تک استاد کے جوتے اٹھائے جاتے تھے آج استاد پر جوتے اٹھائے جاتے ہیں۔"

چھوٹے لال سٹپٹا کر چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

وہ خود کیا پڑھاتے تھے! اپنے ہر لکچر میں چھپن مرتبہ اپنے غیر ممالک کے سفر کا ذکر کرتے تھے۔ جب میں شکاگو یونیورسٹی میں تھا تو میں نے ایسا کیا۔ جب اوکلاہاما یونیورسٹی میں تھا تو ویسا کیا۔ ماسکو میں فلاں سے ملاقات کی۔ ٹوکیو میں یہ دیکھا... وہ دیکھا... نہیں بتاتے تھے تو اتنا نہیں بتاتے تھے کہ لندن کے چڑیا گھر والوں نے انہیں اپنا مہمان بن جانے کا آفر دیا تھا اور وہ اسی ڈر سے صرف ایک سرٹیفکٹ لے کر بھاگ آئے تھے۔ اس سرٹیفکٹ کو اُنہوں نے اپنے لیٹر ہیڈ پر سب سے اُوپر جگہ دی تھی۔

ہمارے افسانے لکھنے سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ اکثر ہمیں دھمکاتے کہ انکم ٹیکس والوں کو خبر کر دوں گا کہ آپ کو کہانیاں لکھنے سے کافی آمدنی ہو جاتی ہے... ایک دن کہنے لگے... "ہمارے پاس پی ایچ ڈی کی تھیسس آتی ہے تو اسے جانچنے... عرق ریزی کرنے کے ہمیں سو روپے ملتے ہیں۔ اِن کو دو صفحات کی ایک کہانی لکھنے کے دو سو روپے ملتے ہیں۔ اندھیر ہے اندھیر"

"کہانی ہر کوئی تھوڑی نہیں لکھ سکتا" ہم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو جل بھن کر رہ گئے۔

جسم کا کوئی عضو سڑ جائے تو اسے جسم سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اگر سر یا ہیڈ ناکارہ ہو جائے تو اُسے کاٹ کر نہیں پھینکا جا سکتا لیکن پاگل خانے ضرور پہنچایا جا سکتا ہے... چھوٹے لال آج کل پاگل خانے میں ہیں۔ دن رات ہوا میں مکے چلا کر اپنے فرضی دشمنوں کو للکارتے رہتے ہیں "دیکھ لوں گا... اس کا قیمہ کر کے رکھ دوں گا۔ اس کو ڈس مس کر دوں گا... نہ کیا تو میرا نام چھوٹے لال نہیں.. فلاں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دوں گا۔"

دیکھن میں چھوٹے لگیں گھاؤ کریں گمبھیر... والی کہاوت ہمارے ہیڈ پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہے ہم ہمیشہ خدا سے اُن کی خیریت کی دعا مانگتے ہیں... اور بھلا کر بھی کیا سکتے ہیں؟

غزلیں

اقبال ہاشمی

صابن سے بھی لڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں
وہ خود پہ بگڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

میں نے جو کبھی آپ کے ماضی کو کریدا
رستے سے اُکھڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

کچھ روز ہی چلتے ہیں یہ مینڈھے مرے پیچھے
پھر خود ہی اکڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

گمنامی میں رہتے ہیں تر و تازہ جو بیچے
شہرت سے وہ سڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

سڑکوں پہ ٹنگی فلمی تصاویر جو دیکھوں
پاؤں وہیں گڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

زلفوں کی درازی کے جو روغن ہیں انھیں سے
گیسو مرے جھڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

ہاتھوں کے علاوہ وہ کبھی پاؤں بھی دھو کر
پیچھے مرے پڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

ہنسنے میں کشادہ ہوئے جاتے ہیں جو چہرے
غصے میں سکڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

دمدار ستارے سے نظر آتے ہیں اب وہ
ملتے ہی بچھڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

مذہب کی سمجھ ہاشمی جو کچھ نہیں رکھتے
ہٹ دھرمی پہ اڑ جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

سراج نرملی

دعوت میں آکے، آپ یوں شرمائیے نہیں
مہنگائی کا زمانہ ہے کم کھائیے نہیں

جو ہوگیا، سو ہوگیا، سب بھول جائیے
"ماضی کے واقعات کو دہرائیے نہیں"

گھر میں سکوں رہے گا، بچت بھی تو ہوگی کچھ
میکے کو جاکے، جلد پلٹ آئیے نہیں

ہوگا نہ کچھ بھی آپ کو، جاں میری جائے گی
یوں میرے سر کی، جھوٹی قسم کھائیے نہیں

سُن کر نہ دے گا، قرض کوئی دوسرا مجھے
آہستہ بولئے! ذرا، چلّائیے نہیں

پڑھنی ہیں تم کو صرف کتابیں نصاب کی
فلمی رسالے، ناول و انشائیے نہیں

تنگ آچکے ہیں ہم تو غلامی کی لائف سے
اب آپ جیسی وائف ہمیں چاہئیے نہیں

ہم جانتے ہیں، صرف یہ میک اپ کی دین ہے
بیوٹی پہ اپنی اس قدر اترائیے نہیں

مہمان ہوں، تواضع مری کچھ تو کیجئے
مجھ کو سراج! دال پہ ٹرخائیے نہیں

حلیمہ فردوس (بنگلور)

★

کتاب کے اجزائے ترکیبی

الہامی اور مقدس کتابیں آسمان سے نازل ہوئیں تو دنیادی علوم کی کتابیں مصنفوں کے قلم سے۔ گویا کتاب کا سلسلہ لا متناہی ہے۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے کتاب کا وجود بھی نہیں تھا۔ رشحات قلم یا تو پتوں پر یا لکڑی اور لوہے کے پتر پر لکھے جاتے تھے۔ جن پر آج محکمۂ آثارِ قدیمہ کی اجارہ داری ہے۔ جب کارخانوں میں چکنے چکنے سفید کورے کاغذ کی ڈھیر لگ گئی تو ہونہار بروا جن کے پات بھی چکنے چکنے تھے اسے داغدار کرنے پر تُل گئے۔ پھر مطبع کا قیام عمل میں آیا اور ان اوراقِ پریشاں کو کتابی شکل دی جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھروں، بازاروں اور خانقاہوں میں کتابوں کی ڈھیر لگ گئی۔ مگر اس ڈھیر میں سماجی۔ اصلاحی۔ سیاسی۔ سائنسی اور ادبی مفید کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر بھی اس زمانے میں مصنفوں کا کال تھا۔ بفضلِ خدا اکادمیوں کی مالی اعانت سے آج کل تو یہ عالم ہے کہ بچہ نہ صرف پیدائشی مصنف ہوتا ہے بلکہ صاحبِ کتاب بھی۔ آپ بھی اس فرق سے بخوبی واقف ہوں گے کہ پیدائشی مصنف کو صاحبِ کتاب کا شرف بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کا خواہاں بھی نہیں رہتا۔ کیوں کہ بے نیازی اس کی سرشت میں ہوتی ہے یا پھر مالی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی وہ تو بس اپنی تسکین چاہتا ہے۔ چاہے اس کے خیالات کتابی صورت میں منظر عام پر آئیں یا نہ آئیں۔ آپ نے ابھی تک غور نہیں کیا ہے تو ذرا آنکھ کھول کر دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ ہر شخص ایک کتاب بغل میں دبائے زندگی کی دوڑ میں لگا ہوا ہے چاہے وہ کتاب اس کی ہو یا کسی اور کی۔ موجودہ دور میں یہ نقل عصری حیثیت کی دلیل ہے۔

کتاب سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں۔ بس کی قطار ہو یا سینما کی یا راشن کی قطار سب جگہ انتظاری لمحوں کی کوفت صرف کتاب سے ہی دور ہوتی ہے۔ آپ مطالعہ نہ بھی کریں تو کم از کم ورق گردانی سے ہی سہی اپنا دل بہلا سکتے ہیں۔ بس اور ریل کا سفر بھی کتاب کی بدولت ہی آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے وقت دُنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ ٹرین میں آپ نچلی سیٹ پر بیٹھے کتاب کے مطالعہ میں غرق ہوں تو اوپر کی سیٹ سے بچہ اگر رفع حاجت سے فارغ بھی ہو جائے تو آپ یہی سمجھیں گے کہ کسی نے پانی انڈیل دیا ہے۔ یا پھر بس میں دو مسافر کسی بات پر لڑ پڑیں تو دوسرے مسافر اپنے اپنے طور پر مداخلت کریں گے اور جھڑکیاں بھی سنیں گے لیکن آپ کا ندھی جی

کے مقولے ''برامت گھو برامت سُنو'' پر عمل کرتے ہوئے اپنے مطالعے میں ڈوبے رہیں گے۔

اکثر نوجوان ایسی بھی کتابیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں جن کا مواد ان کے پلے بھی نہیں پڑتا مگر کتاب کے مقدمے سے وہ ایسے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ سننے والوں کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ یہ کتابیں بھی شخصیت کو پُر رعب بنانے کا اچھا ذریعہ ہوتی ہیں۔

کتابیں کہاں نہیں ہیں۔ کتب فروش کے پاس، کباڑی کی دکان میں، مصنف کے گھر میں لیکن کتب خانے میں جو کتابیں رہتی ہیں اُن کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ الماری کے خانوں میں جو سلیقے سے جمائی جاتی ہے وہ بھی کتاب ہے۔ کباڑی کی دکان میں ردّی کے طور پر جو فروخت کی جاتی ہے وہ بھی کتاب ہے اور مصنف کے خوابوں کی تعبیر، دل کی ازلی خواہش جو گھر کے ڈبوں میں بند دیمک کی غذا بنتی ہے وہ بھی کتاب ہے۔ پتہ نہیں کس نیکی کا اجر ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ہمارا رشتہ دنیا بھر کی کتابوں سے جوڑ دیا ہے۔ استاد کی ساکھ رکھنے کے لیے ہم کتابوں کی راکھ بھی سُرمہ کے مصداق آنکھوں میں لگاتے ہیں۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا صرف کتابیں ہیں۔ کتابوں سے اسی عشق کی بدولت ہم نے اپنے کالج میں مقابلوں کے انعامات کے لیے کتابیں خریدیں اور جب امیدواروں کو اس کی خبر لگ گئی تو سبھی چیونٹیوں کی طرح جمع ہو گئے ساتھ میں نعرے لگانے لگے کہ ہمیں پیسہ چاہیئے کتابیں نہیں۔ ان نعروں کا سُننا تھا کہ ہمارے قلب پر پہلا حملہ اُسی وقت ہوا ہم دل تھامے رہ گئے۔ اس کے علاوہ بھی ایک اور بار ہمیں ایسی ہی ذلت اٹھانی پڑی۔ مہینے کا آخری ہفتہ تھا۔ باورچی خانے کے سارے ڈبّے پریڈ کر رہے تھے۔ ہمیں نمک کی شدید ضرورت پڑی۔ ہمارے حکم کے مطابق ملازمہ نے پلک جھپکتے ہی خدمت میں نمک حاضر کر دیا۔ جیسے ہی لفافہ پر نظر پڑی غالبؔ کا مصرعہ منہ چڑھا رہا تھا۔ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' ہمیں ہمیں چکر سا آگیا۔ اس سے آگے ہم پڑھ نہ سکے۔ غالبؔ کے کلام کی اس عبرتناک حالت سے ہم ایسے متاثر ہوئے کہ دل میں مدتوں سے کتاب شائع کرنے کی جو خواہش کروٹ لے رہی تھی وہ اب چُپ چاپ سو گئی تھی۔

ایسے کئی جان لیوا واقعات کے باوجود بہت سارے زندہ دل بھی موجود ہیں جو کتاب کی اشاعت میں تین سال کے وقفے کا خیال کئے بغیر بفضلِ تعالیٰ اشاعت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کتاب صحیح ہاتھوں میں پہنچے گی یا نہیں بس اپنے نام کے ساتھ کتابوں کی فہرست شائع کرنے سے انہیں تسکین مل جاتی ہے۔ اس گروہ سے جو بھی مصنف تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے کتاب کے اجزائے ترکیبی بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ وہ صاحب کتاب ضرور ہوتے ہیں لیکن پیدائشی مصنف نہیں، کالیداس نے شکنتلا لکھی اور امر ہو گیا شیکسپیر کی ہیملٹ اُس کی جاودانی کی دلیل ہے۔ وجہی کی سب رس دکنی ادب کا شاہکار مانی گئی۔ یہ کتابیں مختلف دور میں مختلف لوگوں نے اپنے مقدموں کے ساتھ شائع کیں۔ لیکن مصنفوں نے مقدمے نہیں لکھوائے۔

کتاب کے اجزاء میں پانچ جُز انسانی ہاتھ کی پانچ انگلیوں کی طرح اہم ہوتے ہیں۔ اور یہ پانچوں جُز پانچ انگلیوں کی طرح برابر بھی نہیں ہوتے۔ پہلا جز کتاب کا خوبصورت سرورق اور اُس کے آخری حصے پر مصنف کی حسین تصویر حاشیہ پر ناقدین کی مختصر رائے۔ دوسرا جز حالاتِ زندگی، کتابوں کی فہرست، ملنے کے پتے، تیسرا جُز انتساب، چوتھا جُز مقدمہ اور پانچواں مواد ہے۔

کتاب کا سرورق اعلامیہ ہوتا ہے۔ یہ پہلی نظر میں قاری سے سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ جس قدر خوبصورت سرورق ہوگا کتاب کی نکاسی کا مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔ کتاب کی پشت پر مصنف کی حسین تصویر تو سونے پر سہاگے

سہ کام دیتی ہے۔ بعض مصنفین چھوٹی سی تصویر کے ساتھ کسی ناقد کی رائے شائع کرنے پر اکتفا کرتے ہیں یا پھر حاشیہ پر ناقدین کی زرین رائے کالی روشنائی سے لکھی جاتی ہے۔ کیوں کہ کتاب جیسی بھی ہو دوستی یا ملاقاتی ہونے کے ناطے دل توڑے بغیر رائے دینا ناقدین کی زندگی کا مقصدِ حیات بن گیا ہے۔

کتاب کے دوسرے جز میں حالاتِ زندگی مختصراً مگر بڑی چالاکی سے پیش کئے جاتے ہیں۔ تاریخ پیدائش اصل سے کچھ گھٹا کر ہی بتائی جاتی ہے۔ ملازمت جز وقتی ہو تو ہمہ وقتی لکھی جاتی ہے۔ کتابوں کی فہرست میں ذرہ برابر بھی سچائی کا شائبہ نہیں رہتا۔ جھوٹ کی پوری [illegible] ہوتا ہے۔ ادب کے سارے اصناف کے لیے خوبصورت نام منتخب کرکے سب کے آگے زیرِ ترتیب یا زیرِ اشاعت لکھ کر اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ چاہے آپ کے یہ سہانے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں کہ نہ ہوں ان کا غذی قلعوں پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ کتاب کے ملنے کے پتے کی فہرست میں مشہور کتاب گھروں کے نام کے علاوہ مائکہ اور سسرال کے گھروں کے پتے بھی درج کر سکتے ہیں۔ ایک تو آپ کے اس عمل سے عزیز و اقربا کا دل بھی خوش ہو جائے گا اور کتابیں بھی باسانی فروخت ہو جائیں گی اور آپ کے دل میں ایک اور کتاب شائع کرنے کی خواہش پھر سے جنم لے گی۔

انتساب کتاب کا ایک اہم جز ہے۔ مصنف کے باہمی رشتہ کا انحصار صرف انتساب پر ہی ہوتا ہے۔ اس کی عقیدت، محبت، شفقت سب کچھ انتساب کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ پہلی کتاب کے انتساب کا حق اس ذات کو کم کم ہی حاصل ہوا ہے جس کے قدموں تلے جنت ہے۔ اکثر پہلی کتاب محبوبہ یا نصف بہتر یا پھر مجازی خدا کے نام منسوب کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف انتساب کی باضابطہ فہرست بنا لیتا ہے پھر اسی منصوبہ کے تحت کتابیں شائع کرتا جاتا ہے۔ اگر کتابیں بے شمار شائع ہو چکی ہوں تو مصنف کتابوں سے زیادہ انتساب لکھنے سے ادب جاتا ہے۔ اس لیے بے تکے انتساب بھی کتابوں میں ملتے ہیں۔ کرشن چندر اور فکر تونسوی کے انتساب تو ان کی کتابوں سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ محققین سے یہ گزارش ہے کہ وہ اس تشنہ پہلو پر غور کریں۔ اور تاریخ وار اس کا جائزہ لیں تو بہت ساری حقیقتیں ہمارے سامنے آئیں گی

مقدمہ کتاب کے لیے ریڑھ کی ہڈی سے کم نہیں ہوتا۔ گویا یہ عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔ کوئی کتاب پڑھے یا نہ پڑھے مقدمہ ضرور پڑھتا ہے اور کئی کتابیں ایسی بھی ہیں جو صرف مقدمہ کے باعث مشہور ہو گئی ہیں۔ حالی نے اردو شاعری پر ایسا مقدمہ لکھا کہ سب مقدمہ نگار کے قلم تھک گئے۔ آج تک کئی مقدمے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔ یہ مقدمہ لکھے جبراً، مروتاً اور عادتاً لکھے جاتے ہیں۔ اس میں بس نقلی گھی کی بو آتی ہے۔ ان مقدموں میں مقدمہ نگار صرف قلم گھسیٹنے کا فرض بخوبی انجام دیتا ہے۔ ایسے مقدموں میں تہائی حصہ تو عام باتیں ہوتی ہیں اور مقدمہ ختم کرنے سے پہلے مقدمہ نگار [illegible]

ایک حکمران کسی درویش سے ملنے گیا، درویش نے حکمران کو اپنے در پر کھڑے دیکھا تو سجدے میں گر گیا۔ بادشاہ نے حیرت سے پوچھا -

"یہ تم سجدے میں کیوں گر گئے -؟"

درویش نے جواب دیا۔ "یہ سجدۂ شکرانہ ہے، میں نے خدا کا شکر اس لیے ادا کیا ہے کہ وہ حکمران کو میرے دروازے تک لے آیا، مجھے تیرے در تک نہیں لے گیا -"

دو چار جملوں میں مصنف کا فرض اور قرض دونوں اُتار دیتا ہے۔ آخر وہ ایسی کتابوں کے بارے میں لکھے بھی تو کیا جن میں دودھ کے دانتوں کی کچی بو آتی ہو۔

مقدمہ کے بعد کتاب سے پہلے ایک اور صفحے پر مصنف کی تحریر ملتی ہے۔ جسے پیش لفظ یا حرفِ اول کہا جاتا ہے۔ مصنف کی انکساری، خاکساری کے رنگ میں ہر لفظ ہر جملہ رنگا ہوا ہوتا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ پڑھنے میں خاص کر منچلے نوجوانوں کو بڑا مزا آتا ہے۔ پیش لفظ میں مصنف بڑے پس و پیش سے اُن دانائے مشوروں کا شکریہ ادا کرتا ہے جن کی بدولت کتاب کے حق میں چار چاند لگ گئے۔ ساتھ ہی ان صاحبین کا بھی ذکر کرتا ہے جن کے احسان تلے وہ دبا ہوا ہے۔ آخر میں اُن مشکلات کے ذکر کئے بنا وہ نہیں رہ سکتا جو اُسے ہفت خوان کے طے کرنے میں حائل ہوئے تھیں۔

کتاب کا آخری جُز مواد یعنی اصل کتاب ہے۔ گو کتاب میں مواد کیفیت کے اعتبار سے بھاری ہوتا ہے اس کتاب کی کیت میں مقدمہ یا پیش لفظ کے ذریعہ اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یعنی مواد ہی ان سارے اجزاء پر فوقیت رکھتا ہے۔ دورِ حاضر کی کتابوں میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ملے گی۔ اب تو یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ وہ کتاب ہی کیا جس میں یہ عناصرِ خمسہ نہ ہوں۔ ▬ ▭

پیروڈی

نظر برنی

... زیاں کیوں ہو؟

کسی کو دے کے ووٹ اپنا "نوا سنج فغاں کیوں ہو؟
جو سر خالی ہے بھیجے سے تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو؟

ہمارے "لیڈروں کی کامیابی کا یہ نکتہ ہے
جو کرنا ہے رکھو دل میں وہ پبلک میں بیاں کیوں ہو؟

کرپشن ان کا شیوہ ہے خوشامد ان کی کمزوری
بھلا ہو ایسے لوگوں کا، انہیں فکرِ زیاں کیوں ہو؟

کہا صیاد نے پر نوچ کر صحنِ گلستاں میں
تپش ہو لاکھ سینے میں مگر آہ و فغاں کیوں ہو؟

بڑھاپے میں بھی کر ڈالی ہے تو نے تیسری شادی
ذرا انصاف سے کہہ دے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

"قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم"
چلا ہے جس پہ بلڈوزر وہ میرا ہی مکاں کیوں ہو؟

سفارش سے نکالے ہیں بہت سے کام اے لیڈر
"ہوا تو دوست جس کا دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟"

کئی اچھے نمائندے فقط یوں ہو نہیں پاتے
فلاں جب ہو نہیں سکتا تو پھر وہ بھی فلاں کیوں ہو؟

قطب سے کود جاؤں گا، اگر مرنا ہی ٹھہرا ہے
"تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟"

وہ کہتا ہے کہ امریکہ کو لنکن نے بسایا تھا
ہو جب استاد ہی جاہل تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

نظر نے ان کو جب دیکھا تو ڈیڈی ساتھ تھے ان کے
ہمارے درمیاں ہر وقت وہ پیرِ مغاں کیوں ہو؟

دوست محمد
(دہلی)

ترقی پسند غزل

تم کو آدابِ سڑک سکھلائیں کیا؟
بائیں ہی چلنا ہمیشہ، دائیں کیا!

ماسکو جانے کا اب کے چانس ہے
کچھ بتاؤ واپسی پر لائیں کیا؟

لال، راشن میں ملا آٹا ہمیں
روٹیاں پکتی نہیں، اب کھائیں کیا؟

دستِ محنت کش ہی گر کمزور ہوں
پھر بتاؤ ہم اسے دلوائیں کیا؟

پوچھتے ہیں وہ کہ لینن کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ـ ظفر کمالی (پٹنہ)

غزل

رنگ لا کر ہی رہا آخر یہ فیشن آپ کا
دوست سمجھا آپ نے نکلا یہ دشمن آپ کا

آپ کے اب تک نہ سمجھا مغربی تہذیب کا؟
پھونک ہی ڈالے گی یہ بجلی نشیمن آپ کا

نوکری ــ اک پل میں مل جائیگی لیکن شرط ہے
ہو منسٹر سے کسی بھی گر کنکشن آپ کا

میں نے بیوی سے کہا بیٹھے نمازیں بھی پڑھو
وہ لگے کہنے "سنیں گے ہم نہ بھاشن آپ کا

شیخ، سید، خان، انصاری، ملک، اور میرزا
کتنے ٹکڑوں میں بٹے گا اور آنگن آپ کا

خونِ دل سے سینچتے رہیئے ظفرؔ صاحب اسے
ورنہ رسوا خود کرے گا آپ کو فن آپ کا

ـ ساغر شولاپوری

نوا سال مبارک

بِن داس کنواروں کو نوا سال مبارک ہو
شادی شدہ لوگوں کو جنجال مبارک ہو

میکے پہ رہو، جو بیگم کے بیکار ہے دلبند
اس گھر کے جوائی کو سسرال مبارک ہو

اب کے برس اُس کو پھر سردی میں ہے کام آئی
جو دہیز میں ملی ہے وہ شال مبارک ہو

شاعر کے عقد میں یہ لوگوں نے دعا مانگی
اللہ میاں دلہن کو کنگال مبارک ہو

ـ صغیر احمد سحرؔ سندیلوی

خطاب پدم شری

مجھ کو عطا ہوا ہے خطاب پدم شری
لاؤں کہاں سے طاقت و تاب پدم شری

اس کا نصیب کھل گیا قسمت سنور گئی
وا ہو گیا ہے جس پہ بھی باب پدم شری

پڑھتا ہوں میں قصیدہ حکومت کی شان میں
پی پی کے صبح و شام شراب پدم شری

لکھا تھا دن کو مرثیہ اردو کی موت پر
دیکھا تھا میں نے رات میں خواب پدم شری

فرمان تھا یہ اصل میں اردو کے قتل کا
سوغات تھی یہ پھر جناب پدم شری

اک ساز دے دیا ہے زباں میری کاٹ کر
گاؤں بجا بجا کے رباب پدم شری

ایک بار دیکھ لیتا وہ میری طرف کبھی
رخ سے اٹھا کے اپنے نقاب پدم شری

کیوں دل فریبیوں میں نہ کھو جائے اب سحرؔ
پڑھ پڑھ کے دل فریب کتاب پدم شری

بہ چیز ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی مجبوراً لینا پڑا۔ فلاں کے یہاں اس چیز پر نظر بھی تو لانا پڑا۔ چوری اور سینہ زوری شاید اسی کو کہتے ہیں۔

دوسروں کے لیے چیزوں کو چھپا لینا باعثِ زحمت ہوتا ہو لیکن قدرت عالم کے لیے یہ کمزوری باعثِ نعمت ثابت ہوئی۔ یوں کہ پیرس سے واپسی پر وہ حسبِ کمزوری بے شمار مالِ مسروقہ و متروکہ کے علاوہ ایک عدد میم بھی ساتھ لائے۔ واپسی پر بڑی دھوم دھام سے شادی کرلی کہ اب دھوم دھام سے شادی منانا ہمارے معاشرے کی کمزوری بن گئی ہے۔ خواتین کو اپنی ازلی کمزوریوں سے مجبور ہو کر شادی کی رسومات ادا کرنا پڑا۔ بیچاری فرانسیسی گڑیا کو نئی نئی رسمات سے گزرنا پڑا۔ بادلِ ناخواستہ ساڑی، زیورات پہننے پڑے۔ زبردستی مہندی لگوائی گئی،

شادی کے چند دنوں کے بعد بدیشی بیوی بھی اُن ہی کمزوریوں کا شکار ہو گئیں۔ جن سے ہماری خواتین دوچار ہیں یعنی شوہر کے آتے ہی ساس اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف شکایات کرنا شروع کردی۔ قدرت اپنی فطرت کی وجہ سے خاموش تھے۔ اس لیے کہ امپورٹیڈ بیوی ان کی کمزوری تھی۔ ماں باپ اس لیے چپ تھے کہ قدرت اُن کی کمزوری تھے۔ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی بیٹے سے دُور ہوگئے

ہائے رے انسان کی کمزوریاں ✦ پاس رہ کر بھی ہیں کتنی دُوریاں

بوم الدولہ کی کمزوری ریڈیو پر خبریں سُننا تھی۔ بس ہر وقت ریڈیو، کینگارو کے بچے کی طرح ان کی گود میں دُبکا رہتا تھا۔ اور بوم الدولہ سوئی گھما گھما کر دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے خبریں سنتے رہتے تھے۔ جیسے وہ اگر خبریں نہ سنیں تو بس قیامت آجائے گی۔

ان کا ریڈیو اتنا خبرزدہ ہوگیا تھا کہ ایک دن ہم جب بوم الدولہ کی غیر موجودگی میں بنا کا گیت مالا سُننے کے لیے سوئی کو سمجھا بجھا کر بمشکل سری لنکا تک لائے ہی تھے کہ ریڈیو چیخ پڑا۔

"آج کی تازہ خبر آج کی تازہ خبر"

بوم الدولہ کے خیال میں گھر، محلہ بلکہ شہر کی خبر خبر نہیں کہلاتی۔ وہ اس قدر بین الاقوامی خیال کے مالک ہوگئے تھے کہ غیر ملکی خبر کو ہی خبر سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا جسم تو گھر میں ہوتا لیکن ذہن مختلف ملکوں کی سیر کرتا رہتا۔ وہ ایتھوپیا کے قحط اور غذائی قلت سے بخوبی واقف ہیں لیکن اپنے گھر کی [illegible] حالت کا انھیں علم نہیں۔ فلسطینیوں اور کالوں پر ڈھائے جانے والے مظالم سے ان کا دل دہل جاتا ہے اور وہ دونوں آنکھوں سے چار چار (جملہ آٹھ آنسو) بہانے سے بھی نہیں ہچکچاتے مگر اپنے گھر میں بہوؤں اور نوکروں پر ہونے والے ظلم و ستم سے وہ ناواقف ہیں۔ ان کو تمام عالمی دہشت گردوں کے نام ازبر ہیں۔ اور ان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے بوم الدولہ کو از حد دلچسپی ہے۔ لیکن اپنے ہی فرزند کے کارناموں سے بے خبر۔ جب ہم نے جدید ادب کا سہارا لے کر استعاری اور علامتی انداز میں ان کے بیٹے کے کارناموں کا ذکر کیا تو وہ ہمیں بھلا بُرا کہتے ہوئے کہنے لگے! ؏

" بچوں کو بُرا ثابت کرنا دنیا کی پرانی عادت ہے"

جس دن سے وہ ریڈیو پر مانیا کے سربراہ کی گرفتاری کی خبر سُن کر خوشی سے ناچ رہے تھے ٹھیک اسی وقت ان کا فرزند افیم بیچنے کے جرم میں پکڑا گیا۔ بڑی مشکل سے ہماری کوششوں اور بوم الدولہ کے آنسوؤں سے فرزند نظر بند کر دیا گیا۔ اس دن سے وہ "خلافِ سند یش" ہوگئے۔

یہ تو اولاد سے بے خبر اور لاپرواہ دوست کی کمزوری کا ذکر تھا۔ ہمارے ایک اور دوست ان کی ضد ہیں یعنی وہ صرف اولاد ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ کثیر العیال مگر منتشر الخیال ہیں۔ مختلف شعبوں کے ماہروں کی شہرت اور کامیابی دیکھ کر اپنے بچوں کو جبراً ان شعبوں میں جھونکنا ان کی کمزوری ہے۔ بڑے فرزند کو دلیپ کمار کی شہرت سن کر دلیپ ثانی بنانا چاہا۔ برخوردار اداکار تو نہیں بن سکے سینما ہال کے گیٹ کیپر بن گئے۔ اپنی دختر نیک اختر کو بھی ہیروئن بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہم نے کہا کہ وہاں حیا بیچا جاتا ہے حیا پردہ نہیں تو انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اپنے دوسرے فرزند کو محمد علی کلے کی شہرت سن کر باکسر بنانے کی ٹھانی اور اس سے روز مکے کھا کھا کر اپنے کئی دانت شہید کروا لیے۔ آخر میں صاحبزادے باکسر نہ بن سکے پولیس کانسٹبل بن گئے اور مجرموں کے دانت پہلے کھٹے اور پھر توڑ کر اکھٹے کرتے رہتے ہیں۔

پرسوں ان صاحب کو گھر سے ٹفن (پہلے مرد کفن کے ساتھ نکلتے تھے) لیے سفید کپڑوں میں ملبوس اپنے سب سے چھوٹے صاحبزادے کے ہمراہ اسٹیڈیم جاتے دیکھا تو وجہ سفید پوشی پوچھی۔ کہنے لگے "میاں میں چھوٹے فرزند کو کرکٹ کھیلنے کی مشق کرا رہا ہوں۔ آخر ظہیر کو ایک نہ ایک دن ریٹائر ہونا ہے، یہ ان کی جگہ لے گا۔ دیکھنا اسے شہرت اور عزت، مجھے دولت اور راحت ملے گی۔"

ایک اور صاحب کی کمزوری گھوڑے ہیں۔ یہی ان کا محبوب موضوع ہے۔ ریس کھیلنے کے عادی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ریس رئیس ہی کھیلتے ہیں۔ اسپ شناس دوست جب ریس میدان پہنچتے ہیں تو گھوڑے ان کو مات کر دیتے ہیں۔ ہزاروں روپے ریس میں ہارنا "جیتنے والوں کو مارنا" ان کی کمزوری بن گئی ہے۔ یہ صاحب ریس میں تو ہارتے ہیں مگر رمی میں خوب جیتتے ہیں۔ اس تضاد کا مادیہ بتلاتے ہیں کہ یہ انسانوں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں، گھوڑوں کو نہیں۔"

محلے کے ایک صاحب امیر عالم اپنی کمزوری کی وجہ سے اسیر عالم کے نام سے مشہور ہیں۔ کیونکہ ان کا رخ ہمیشہ سے محبس رہتا ہے۔ جی ہاں، جہاں اس قدر بھی لوگ باہر جانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں، وہاں یہ صاحب اندر جانے کی کمزوری میں مبتلا ہیں۔ شاید جیل سے ان کو ھَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ کی آواز آتی ہے۔ پتہ نہیں آج کل جیلوں کی نعمتیں آرام دہ کیوں ہو گئی ہے۔ یا پھر باہر کی نام نہاد دنیا ان کے لیے اذیت ناک ہوتی جا رہی ہے۔ اسیر عالم باہر آتے ہی پھر اندر جانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے اندر ہو جاتے ہیں۔ اور صحن زنداں میں اپنے ہم اسیروں اور ہم جلیسوں سے خطاب کرکے فرماتے ہیں کہ "دنیا خود ایک بڑا جیل خانہ ہے آرام تو یہاں جیلوں میں ہی ملتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ

عینی شاہدوں یعنی آہنی قیدیوں کے بیان کے مطابق جیل میں اسیر عالم کے لیے کمرہ، بستر اور برتن مختص ہیں اور کیا مجال کہ ان کی غیر حاضری کی مدت (جو نہایت قلیل ہوتی ہے) میں کوئی دوسرا ان کے کمرے میں قدم رکھے بلکہ یہ صاحب

تو جیل کے حکام کو پیشگی اطلاع دلاتے ہیں کہ "میں ابھی گیا اور ابھی آیا" پھر وہ اپنے قول و فعل پر عمل کرتے ہوئے واردِ زنداں ہوجاتے ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ یہ بستی سے جیل کے مستقل نمائندے ہیں ـــ گھر میں ایک طرف تو ان کے نیچے "تحریکِ ترکِ حوالات" پر ہانکا تے ہیں لیکن "جیل بھرو جیل بھرو" کا نعرہ ان کے سامنے رہتا ہے اور سچائی سے اس نعرہ پر لبیک کہتے ہوئے اس پر عمل آور یعنی جیل آور د ہوتے ہیں۔ لوگ اور رشتہ داران کے اس حُبِّ اسیری کے سبب شادی بیاہ اور دیگر تقاریب کے دعوت نامے جیل کے پتے پر ہی بھیجتے ہیں۔ عیدا ور دوسری تقاریب کے موقعوں پر ان کے فرزندان حکامِ زنداں کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر بڑی مشکل سے ضمانت پر کچھ دیر کے لیے اپنے والد صاحب کو چھڑا لاتے ہیں اور بجا طور پر کہتے ہیں ؎

"کیا کیا نہ سہے ہم نے ستم باپ کی خاطر"

ان کی اس کمزوری کی وجہ سے ان کے مکان کے مکالمے ہی بدل گئے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی روپیوں کا تقاضا کرتا ہے تو مکان سے یہ جواب ملتا ہے کہ "آپ کا سارا قرض ادا کر دیا جائے گا ذرا ان کو اندر سے تو آنے دیجئے"۔ جبکہ دوسرے مکانوں سے یہ صدا نکلتی ہے کہ "ذرا ان کو باہر سے تو آنے دیجئے آپ کی پائی پائی ادا کی جائے گی"۔ جب کبھی یہ قید پرست، زنداں نواز، شوہر گرفتار جیل جانے لگتے ہیں تو ان کی بیگم زلفیں کھولے راگ الاپتی ہیں۔

اکیلے اکیلے کہاں جا رہے ہو مجھے ساتھ لے لو جہاں جا رہے ہو

انجام کار ان کی بیگم، بہوؤں کے طعنوں اور لوگوں کی گالیوں سے تنگ آکر اپنے شوہر کی "جیل بھرو" تحریک پر لبیک کہتی ہوئی کچھ ایسا کر بیٹھی کہ وہ شریکِ حیات کے ساتھ "شریکِ حوالات" ہوگئی۔ سنا ہے کہ اب وہ شوہر کے ساتھ فلم 'لاہور' کا گیت گنگناتی ہے۔

دنیا ہمارے پیار کی یوں ہی جواں رہے میں بھی وہیں رہوں میرا ساجن جہاں رہے

آپ نے پانی بہاتے روپیہ بہانے یا پھر خون بہانے کی کمزوریوں میں مبتلا لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ ہمارے ایک دوست کی کمزوری ہے آنسو بہانا۔ کوئی موقع ہو یا واقعہ وہ اشک افشانی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی گنگا جمنی آنکھوں کی وجہ سے گال "دوآبہ" نظر آتے ہیں۔

پتہ نہیں ان میں آنسوؤں کا اسٹاک کہاں سے آگیا ہے اور شاید حسن کی طرح اللہ میاں نے بھی آنسو کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ نصف آنسو ساری دنیا کے انسانوں میں بانٹ دیا اور نصف آنسو ان کے کھاتے میں لکھا۔ جبھی تو خوشی ہو یا غم آنسو چھلک پڑنے کو بیقرار رہتے ہیں۔ ہم نے بلدیہ کے حکام سے کہا کہ آپ ان آنسوؤں کو لے کر نلوں پر چھڑک دیں تاکہ وہ بھی بے اختیار آنسو بہاسکیں اور ہم پانی سے سیراب ہوں۔

ہمارے ایک دوسرے دوست کو ان کے اشکِ رواں پر بدگمانی ہوئی۔ ہم نے کہا کہ چلئے اور چل کر خود نظارہ چشمِ تر ملاحظہ فرمایئے۔ جب ہم وہاں پہنچے، تو ہمارے دوست، اچھے خاصے تھے۔ دورانِ گفتگو ان کے شریر صاحبزادے نے گیند سے بلب پھوڑ دیا۔ "بس ذرا چھیڑ کے دیکھئے پھر کیا ہوتا ہے؟" کے مصداق ہم نے اپنے دوست کو دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور دامن گیلا ہو رہا ہے۔ ہم نے اپنے دوسرے دوست کو دیکھا جو واقعی حیرت زدہ تھے کہ اچھی بھلی آنکھیں کس طرح ایک بلب کے ٹوٹنے پر آنسو بہا رہی ہیں۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا تمہارے دوست نہ صرف رفیق القلب ہیں بلکہ "رفیق البلب" بھی ہیں ـــ!

ہم ایک اور صاحب سے واقف ہیں جو تقریباً دس سال دوبئی میں رہ کر آئے ہیں اپنے ساتھ بے شمار دولت اور شیوخ کی کمزوریاں ساتھ لائے ہیں۔ ہر وقت کاریں اور بیویاں بدلتے رہتے ہیں۔ پولٹری فارم کھول رکھا ہے۔ لہٰذا [illegible] اور [illegible] کو ایک [illegible] سے دیکھتے ہیں۔

[illegible] طلاق دینا اور دوسری شادی کر لینا ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ بیویوں کے مرنے اور طلاق دینے کے بعد سالیوں سے شادی رچا لینا ان کی دوسری کمزوری ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں: "سانس ہے تو آس ہے"۔ ہم نے کہا جناب ایک بیوی کیا کم بلا اور آفت ہوتی ہے اور آپ . . ." کہنے لگے "اپنے اپنے پرس اور پسند کی بات ہے — میں خطراتِ ازدواج سے خوب واقف ہوں"۔ ان کے پولٹری فارم کی مرغیوں کی بڑھتی گھٹتی تعداد سے ہم ان کے درونِ خانہ کی رونق کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک سال موسم گرما میں پولٹری فارم کی مرغیاں تابڑ توڑ شہید ہو گئیں اور صرف ایک بوڑھی مرغی اپنے لاشریک ہونے پر ندامت اور مرغ دمرگ اندیشی سے گردن جھکائے کھڑی تھی۔ کچھ ایسا ہی اسکور درونِ خانہ کا بھی تھا۔ اس لیے پولٹری فارم اور ان کی حویلی میں عجب مشترک سناٹا تھا۔ ہم نے جب حویلی کے حرم کی صحیح تعداد جاننا چاہا تو نوکر نے آہ بھر کر حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ؏

"اک اماں رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے"۔

تو صاحبو! اس دنیا میں فرد ہو یا ملت ہر کوئی عجیب عجیب کمزوریوں میں مبتلا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ آدم اور ابن آدم کے قصے کو رنگین و سنگین بنانے میں انہی بشری کمزوریوں کا زبردست ہاتھ ہے۔

یہ دنیا قیامت تک یونہی رنگین و سنگین رہے گی کیوں کہ: ؏

ختم نہ ہوں گی کبھی کمزوریاں

ستم ایجاد [illegible]

ستم بھی کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں

یہ وائرلیس کا ٹیلی فون کیا دل میں لگایا ہے
کہ ہم کو ہچکیاں آتی ہیں جب وہ یاد کرتے ہیں

حسینو کیا تمہارے باپ کے ہیں ہم غلام آخر
جو کہتے ہو ظریف اب ہم تمہیں آزاد کرتے ہیں!

(ظریف لکھنوی)

تمنا مظفرپوری

پچھتانا — عرف شادی کرنا

پچھتانا ! یہ وہ لفظ ہے جسے انسان کبھی کام کرکے عمل میں لاتا ہے تو کبھی نہ کرکے۔
ایک کام انسان کرتا ہے اور نقصان میں رہتا ہے تو پچھتاتا ہے۔ اگر وہ صرف سوچ کر رہ جاتا ہے اور کوئی
دوسرا اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو نہ کرنے کا اسے پچھتاوا ہوتا ہے۔ بہت سا کام ایسا ہے جسے کرکے یا نہ کرکے
لوگ پچھتاتے ہیں، ان میں سے ایک مشہور کام شادی ہے۔
شادی ایک ایسا فعل ہے جسے کرکے ہر شادی شدہ پچھتاتا ہے اور جو کنوارے رہ گئے وہ بھی پچھتاتے ہیں
شادی شدہ پچھتاتے ہیں تو ایک بات ہوئی لیکن جو کنوارے رہ گئے وہ کیوں پچھتاتے ہیں یہ بات آج تک
کسی کی سمجھ میں نہیں آئی حالانکہ یہ کوئی بہت بڑا سوال نہیں لیکن اس کا جواب آج تک کسی کنوارے نے
تشفی بخش نہیں دیا۔
جس طرح مثل مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اسی طرح یہ بھی سمجھئے کہ شادی پچھتاوے کی ماں
ہے یعنی ایک شادی کرکے انسان طرح طرح کے پچھتاوے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
شادی سے اگر کوئی خوش ہوتا ہے (وقتی طور پر) تو صرف ماں باپ یا پھر دوست و احباب (اپنی شادی سے
پہلے اور وہ بیکاری میں یوتا پوتی کھلا کر دل بہلاتے ہیں۔ ساس کو بہو تگنی کا ناچ نچانے کو مل جاتی ہے اور
ایک فریق یعنی بیوی ضرور خوش ہوتی ہے) باپ کو اس لئے خوشی ہوتی ہے کہ ان کا خاندان آگے بڑھنے لگا
دوست و احباب کو شادی کے نام پر پارٹی کھانے کا موقع ملتا ہے۔

شادی کرنے والا فوراً نہیں پچھتاتا، کیونکہ نئی نئی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں وہ مگن رہتا ہے اور جیجا
سالا اور سالیوں میں اپنا [illegible] بھول جاتا ہے لیکن جیسے ہی بیوی کو متلی اور چکر کا دورہ پڑتا ہے اس کے [illegible] آنے لگتے
ہیں اور ان کی [illegible] ختم ہونے لگتی ہیں لیکن وہ نشہ ابھی ختم نہیں ہوتا جو شادی کرکے چڑھتا ہے کیونکہ جب بچہ پیدا
ہوتا ہے تو وہ [illegible] میں خوب دھوم دھام سے چھٹی کرتا ہے اور لوگوں میں مٹھائیاں تقسیم کرتا ہے۔
ایسی بات نہیں کہ شادی کرکے صرف مرد ذات ہی پچھتاتے ہیں بلکہ اس معاملے میں اکثر [illegible] کا یہ شعر سب
پر صادق آتا ہے۔ ؎

دل ہی کو غم نہیں کہ ہوا مبتلائے غم
غم بھی بلا میں ہے کہ ہوا مبتلائے دل

یعنی عورتیں بھی شادی کرکے پچھتاتی ہیں لیکن ان کے پچھتاوے کا پہلو کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی عورتیں آپ
کو شاذ ہی ملیں گی جو کنواری رہنا پسند کرتی ہوں۔ عورتیں تو اس لئے پچھتاتی ہیں کہ ان کی شادی فلاں صاحب سے ہوتی تو
اچھا تھا۔ موجودہ شوہر کسی صورت بھی ان کے لائق نہیں ــــ اگر شوہر گزیٹیڈ افسر ہیں تو وہ کہیں گی۔ اجی میری نسبت
ایک پر ایک آئی تھی، کوئی انجینئر تھا تو کوئی ڈاکٹر۔ اگر شوہر انجینئر یا ڈاکٹر ہو تو وہ فرمائیں گی۔ اجی فلاں صاحب مجھ سے
شادی کے لئے مرتے تھے آخر ناکام ہوکر لندن چلے گئے (حقیقت کیا ہے؟ یہ ان کے والد صاحب ہی جانتے ہیں) آئی اے
ایس شوہر نامدار کی بیگم محترمہ فرمائیں گی۔ مجھے تو ڈیڈی کے فلاں دوست اپنے لڑکے کے لئے زور کرکے رہ گئے جو ایک
بڑی فرم کا مالک ہے۔ آئے دن غیر ممالک کا سفر کرتا رہتا ہے۔ کچھ کہیں گی۔ دیکھئے فلاں بجیا کی شادی فلاں بھائی سے
ہوئی کیسی اچھی Happy Life ہے ان کی اور فلاں ایسا ان کا تو کہنا ہی کیا وہ تو دنیا میں جنت
کا لطف اٹھا رہی ہیں۔ پھر وہ خالا، پھوپا، سگی سہیلیوں کے متعلق فرماتی جائیں گی اور سبھوں کو خوش و خرم زندگی گزارنے
پر اور اپنی بدقسمتی پر روئیں گی۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح آپ کو قائل کر دیں گی کہ ان کا موجودہ شوہر ہر چند کہ سب کچھ ہے
پھر بھی ان کا شوہر بننے کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ یہ تو اپنی قسمت پھوٹی تھی، نہ جانے پاپا کو کیا ہو گیا تھا، کیا دیکھا
کس کے پلّے باندھ دیا۔

دیکھا آپ نے کسی عورت کو کنواری نہ رہنے کا پچھتاوا نہیں بلکہ سبھوں کو موجودہ شوہر کی جگہ دوسرے سے شادی
نہ ہونے کا پچھتاوا ہے لیکن مرد کے ساتھ یہ بات نہیں۔ اسے سرے سے اس بات کا پچھتاوا ہے کہ اس نے
شادی کیوں کی۔؟

شادی کے بعد مرد کا نہ صرف خرچ بڑھ جاتا ہے بلکہ وہ طرح طرح کی پابندیوں میں جکڑ جاتا ہے۔ [illegible]
[illegible]، چوڑی کی دکان سے لے کر اسپتال اور دواخانے کا چکر لگاتا رہتا ہے۔ دوستوں کے درمیان بیٹھ کر خوش گپیاں
کرنے اور وقت گزارنے کے دن ہوا ہو جاتے ہیں اور بیوی کے سرہانے بیٹھ کر سرہانے یا نسخہ لئے ڈاکٹر کے گھر اور
ہسپتال کے چکر لگانے یا پھر شیشی لئے دواخانے میں لائن لگانے کے دن دیکھنے پڑتے ہیں۔ اس پر بھی ان کی بیوی
کو شکایت رہتی ہے کہ مرد بڑا لاپرواہ ہوتا ہے گھر اور بچوں پر ذرا بھی دھیان نہیں دیتا۔

آزاد صاحب کی زندگی بھی شادی سے اجیرن تھی۔ وہ شادی کرنے والوں پر ترس کھاتے بلکہ ان کے نام زندگی ہی میں فاتحہ پڑھ ڈالتے۔ ان کے نام جب کبھی شادی کا کارڈ آتا تو وہ گھنٹوں لڑکے کے والد کو صلواۃ سناتے کہ یہ کیسا باپ ہے جو اپنے نور نظر، لخت جگر کو جہنم کی آگ میں دھکیل رہا ہے اور شادی خانہ آبادی پر ٹوٹ پڑتے کہ اس کا غلط اور بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل شادی خانہ آبادی نہیں بلکہ خانہ بربادی ہے۔ مجھ سے بھی آزاد صاحب کی ملاقات ہوتی تو وہ گفتگو کے درمیان شادی نہ کرنے کا مشورہ دیتے۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔

"آخر آپ نے شادی کیوں کی؟ کیا آپ کو علم نہیں تھا کہ شادی ایک لعنت ہے اور اگر انسان شادی نہ کرے تو پھر کون سلامتی اختیار کرے گا۔"

اس کا جواب فوراً حاضر تھا۔ "یہی تو انسان کی بھول ہے۔ دراصل قدرت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر ایک زبردست گھپلے میں ڈال دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

کہنے لگے۔ "تم نے کبھی ہرن کو دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

کہنے لگے۔ "مادہ ہرن اور نر ہرن، دونوں میں خوبصورت کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "نر ہرن۔"

وہ بولے۔ "مرغ، مور، گائے اور دوسرے جانوروں میں تم نے نر ہی خوبصورت اور دلکش دیکھا ہوگا۔ مگر انسان میں خوبصورت، دلکش، حسین اور نازک عورت کو بنایا گیا ہے۔ کیوں — ؟"

آزاد صاحب کی گفتگو سے میں مطمئن نہ ہو سکا۔ فوراً اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ میں تذبذب میں تھا کہ دنیا میں عجیب و غریب لوگ ہیں۔ سبھی کا الگ الگ حال ہے۔ آزاد صاحب بیوی سے بیزار ہیں۔ ادھر میرے ایک رشتہ دار یاد آگئے جو کنوارے پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی زندگی دیکھی نہیں جاتی۔ وہ کس قدر دوسروں پر منحصر ہیں۔ شادی نہ کرنے کا اب پچھتاوا کرتے ہیں۔ اکثر ان جوان لڑکوں کو دیکھ کر جن کی ماں سے کبھی ان کا رشتہ آیا تھا، اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کر کے افسوس کرتے اور سرد آہیں بھرتے ہیں۔ اکثر کہا کرتے کہ اگر شادی کر لیتا تو آج یہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض نہ ہوتا۔

کنوارے پیر کا واقعہ یاد آنے پر زور کی ہنسی آئی اور میں یہ بھی بھول گیا کہ روڈ پر چل رہا ہوں۔ لہٰذا سامنے سے آتے ہوئے ایک ضعیف شخص سے ٹکرا گیا۔ شرافت کا تقاضہ یہ تھا کہ میں اس سے معافی مانگتا مگر وہ ضعیف بھی عجیب نکلا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ اس طرح پکڑ لئے کہ میں سلام کے لئے ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکا، بلکہ اس نے فوراً سوال جڑ دیا۔

"کیوں بیٹے تم کس بات پر اس قدر خوشی سے اندھے بنے ہوئے ہو کہ راستے پر آنے جانے والوں کا خیال تک نہ رہا، اس طرح تو تم کسی حادثہ سے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔"

میں نے کہا: "چچا جان! بات ہی کچھ ایسی یاد آئی کہ میں بے ساختہ ہنس پڑا۔"

"اچھا! ضرور کوئی دلچسپ واقعہ ہے۔" اس بوڑھے نے کہا۔ "میں بھی سنوں کیا واقعہ ہے۔ مگر ٹھہرو یہاں نہیں

میں بہت تھک گیا ہوں، وہاں چلو سامنے والا مکان میرا ہی ہے ۔ وہیں چل کر تمہارا قصہ بھی سنوں گا اور چائے بھی پیئوں گا"
میں سخت گھبراہٹ میں مبتلا ہوا کہ اب یہ کس بلا میں گرفتار ہوا۔ ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن بوڑھے کی گرفت مضبوط تھی ۔ آخر اصلی گھی کی ہی ہڈی تھی ۔ مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑا اور آزاد صاحب سے لے کر کنوارے پیر تک کا قصہ سنانا پڑا ۔ آزاد صاحب کی بات وہ بغور سنتے رہے ۔ اس درمیان ان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے لیکن جیسے ہی میں نے کنوارے پیر کے شادی نہ کرنے کا قصہ بیان کیا، وہ ہنس پڑے ۔ پھر چائے پینے کے بعد انہوں نے فرمایا "بیٹے اب تم مجھ سے بھی ایک کہانی سنو ۔

کسی گاؤں میں دو بھائی رہا کرتے تھے۔ بڑے بھائی کی گھریلو زندگی ، بچوں اور بیوی کی بیماری سے پریشان کن تھی۔ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کی پریشانیاں دیکھ کر اپنی شادی نہیں کی. اور سادھو بن گیا۔ گاؤں، گھر چھوڑ کر وہ بھگوان کی عبادت اور ریاضت کے لئے کہیں دور نکل گیا۔ کچھ دنوں بعد بڑا مشہور اور کامل سادھو بن کر اپنے گاؤں لوٹا۔ اپنے بھائی سے بھی ملنے گیا ۔ بھائی کو اسی طرح خستہ حال دیکھ کر افسوس ظاہر کیا اور بولا۔ "بھیا آپ خواہ مخواہ اس مایا کے جال میں پھنس گئے، اپنی صحت خراب کرلی ۔ مجھ کو دیکھو میں کتنا تندرست ہوں۔ اب بھی وقت ہے ، ان سب کو چھوڑ دو اور بھگوان کی عبادت میں لگ جاؤ۔ اس مایا جال سے نکلو۔" بڑے بھائی نے جواب دیا ۔ ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اس عبادت اور ریاضت سے تم کو ملا کیا ؟" "بہت کچھ ، سادھو نے بتایا ۔ "اتنا کچھ کہ مجھے کسی چیز کی لالچ نہیں، کوئی فکر نہیں اور من کو شانتی ملی"۔ "اچھا !" بڑے بھائی نے اپنے ہاتھ کی چھڑی دور پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم اس چھڑی کو اپنی عبادت اور ریاضت کے بل پر منگوا دو۔" سادھو بھلا اس چھڑی کو کیسے منگوا سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے بھائی کا منہ دیکھنے لگا۔ بڑے بھائی نے اپنے ایک بیٹے کو پکارا اور اس سے کہا کہ وہ چھڑی اٹھا لائے۔ فوراً چھڑی اس کے ہاتھ میں آگئی اس نے اپنے بھائی سے کہا ۔"میں ان بیوی بچوں میں پریشان رہا۔ لیکن میری یہ ریاضت اس طرح کام آرہی ہے۔"

پھر بوڑھا شخص مجھ سے مخاطب ہوا ۔ "سنو میرے بیٹے ! ہر چند کہ میرے پاس دولت ہے ۔ کئی نوکر میرے آرام کے لئے میرے بیٹوں نے رکھے ہیں۔ خود بیٹا اور بہوئیں خدمت میں لگی رہتی ہیں لیکن وہ آرام، وہ سکون اب میسر نہیں جو مرحومہ کے ہاتھوں کے لمس سے میسر تھا۔ چار سال ہوئے وہ رفیقِ زندگی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ۔" کہتے کہتے بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے ۔ میں اس بوڑھے کو اسی طرح خیالوں میں غلطاں چھوڑ کر چل دیا۔

اور اب میں اس فکر میں مبتلا ہوں کہ آخر پچھتانے کے کس فعل پر عمل کروں ———— شادی کر کے یا کنوارہ رہ کر ———— !

— —

-٭- -٭٭- -٭-

معاون قلمکاروں سے التماس ہے کہ تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں

سلطان جمہوری

لاحول ولا قوۃ

"لاحول ولا قوۃ ! اب مجھے عینک لے ہی لینی چاہیئے!"

میں نے دل ہی دل میں اپنی کاہلی پر لاکھوں لاحول پڑھ کر ایک اٹل فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ کر کے دل کو بڑا اطمینان محسوس ہوا۔ اس سے قبل بھی سیکڑوں بار اس قسم کا فیصلہ کیا تھا، مگر کسی پر قائم نہ رہ سکا تھا۔ اس کی وجہ میری کاہلی نہ تھی بلکہ اصل سبب کچھ تو میرے نظریات تھے جو میری نظر کی کمزوری اور اس کی دوا دارو میں حائل ہو کر مجھے عینک خریدنے سے باز رکھتے تھے اور کچھ میری بینائی کے مزاج کا بھی قصور تھا جو گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہوتا تھا۔

ایک آئی اسپیشلسٹ نے پیشین گوئی کی تھی کہ اگر میں نے جلد ہی عینک نہ لیا تو وہ دن دور نہیں جب دوربین لگانے پر بھی قریب کی چیزیں نظر نہ آئیں گی۔ مگر مجھے فارمولا دواؤں اور میکانیکی انداز تشخیص پر یقین نہیں، کیوں کہ اس طریقۂ علاج میں مریض بیچارہ، ڈاکٹر اور مرض کے درمیان ایک غیر متعلق سینڈوچ بن جاتا ہے۔ جب تک اس کا ٹسٹ ہوتا رہتا ہے، اس کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر رہتا ہے!

میں نے بارہا کوشش کی کہ ڈاکٹروں کو یہ باور کرادوں کہ میری آنکھیں باری باری سے کمزور ہوتی ہیں، ٹھیک اُسی طرح جس طرح اکثر نزلاوی حالت میں دونوں نتھنے باری باری سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں —— اور کبھی کبھی تو ایک چیز دو دو نظر آنے لگتی ہے۔ مگر ان ڈاکٹروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اگر وہ اشارتاً بھی ہاں کہہ دیتے یعنی مجھے سینڈوچ کے بجائے منہ میں زبان رکھتا ہوا مریض سمجھتے تو میں ایک "چشم بیتی" واقعہ سُنا کر اپنے مرض کی سنگینی اور انفرادیت ثابت کر دیتا۔ یعنی یہ کہ اسکول کے زمانے میں مانا ہوا گول کیپر تھا اور اولمپک میں حصہ لینے کے تمام آثار مجھ میں پائے جاتے تھے۔ ایک اہم میچ میں اتفاق سے دو دو گیند نظر آنے لگے۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں۔ اسی اُدھیڑ بن میں جب دونوں گیندیں ایک ساتھ جال میں تیر کر متحد ہو گئیں تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور یہیں اپنی فٹبال کیریئر میں پہلی بار شاندار شکست ہوئی۔ اور چونکہ اس ٹورنامنٹ کا ہیرو میں تھا، اس لیے ہمارے جلالی ٹائپ کے گیمس ٹیچر نے بیچ میدان میں میری وہ مرمت کی کہ حتی

کا دودھ یاد آگیا!

اس واقعہ کو ایک زمانہ بیت گیا، یہاں تک کہ مولا بخش ٹیچر کے ہاتھ سے نکل کر طلبا کے ہاتھوں میں آگیا ہے مگر اس مار کی کسک آج بھی باقی ہے اور مرطوب آب و ہوا میں درد کچھ سوا ہی ہو جاتا ہے — اور مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اُس دن میں نے عینک لے لینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ مگر نظر اور نظارہ کے فلسفیانہ چکر میں پڑ کر عینک لگانا معیوب سمجھ بیٹھا۔ نظر کا فتور جو کسی وٹامن کی کمی کے سبب ہوتا ہے، وہ کسی نہ کسی صورت سے دور تو کیا جا سکتا ہے، مگر نظارے کے عیوب و محاسن یا اصل نقل کا پتہ تو نہیں لگایا جا سکتا۔ عینک تو محض دماغ کے پردے پر صحیح فوکسنگ کا آلہ ہے۔ اگر اس پردے سے پہلے قدامت اور روایت کے پردے حائل ہوں تو لاکھ عینک لگے، اصلیت تو سامنے نہیں آسکتی نا —!

غرض کہ اس فلسفے کی روشنی نے میری آنکھیں اس طرح چکا چوند کر دیں اور میرے خیالات و افکار کو اس طرح منور کر دیا کہ میں عینکی شریعت میں ملحد ہو گیا۔ اس الحاد نے مجھے بہت دھکے کھلوائے، مگر میں ڈٹا رہا۔ میں تا عمر ڈٹا رہتا مگر جب کوئی اپنی ہی آنکھ کو ایک آنکھ نہ بھائے تو کب راہ کے نشیب و فراز، نالیوں، گڑھوں اور کیچڑ سے بچ سکتا۔ ایک نہایت غیر سنجیدہ واقعہ نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں فلور کراسنگ پر مجبور ہو گیا!

میرے ایک دوست رفیق صاحب تھے۔ انہوں نے مجھے سرکس دکھانے کا وعدہ کیا تھا، اور ایک مقررہ وقت پر بس اسٹینڈ آنے کو کہا تھا تاکہ وہاں سے ایک ساتھ سرکس کے مقام تک جا سکیں۔ میں تو ٹھیک وقت پر پہنچ گیا مگر وہاں موجود نہ تھے۔ میں اُن کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دو، تین — جب پورے دس منٹ گزر گئے تو مجھے بڑی بیقراری ہوئی۔ میں بار بار گھڑی دیکھتا، اِدھر اُدھر دیکھتا۔ دُور دُور تک نہ تو بس کا پتہ تھا اور نہ رفیق صاحب کا۔

رفیق صاحب بھی بس ہیں کہ کوئی دیکھتا رہ جائے۔ گورے چٹے، خمار آلود آنکھیں، کھڑی ناک، بھرے گال، بپھری زلفیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ایران سے اسمگل ہو کر آئے ہیں۔ قدرت کے منوفیکچرنگ ڈیپارٹمنٹ نے ذرا فراخدلی برتی ہوتی تو رفیق بجائے رفیقہ ہوتے!

دس سے پندرہ منٹ ہو گئے۔ اس پانچ منٹ میں بس اسٹینڈ پر بھیڑ بھی اتنی ہو گئی تھی کہ ایک طرف اپنے صاف شفاف لباس پر نظر ڈالتا تھا اور دوسری طرف ٹکر بازی اور کشتی کے فن پر غور بھی کرتا جاتا تھا۔ میں ان بچوں کے متعلق سوچ میں پڑ گیا جو رنگ برنگے کپڑے پہنے اپنے والدین کے ساتھ آئے تھے اور سرکس دیکھنے کی خوشی میں پھدک رہے تھے ہوں ہے ان کے والدین کراٹے یا جوڈو سے واقف ہوں — مگر ہجوم کا بقیہ تین چوتھائی حصہ جو برقعوں، ساڑیوں اور بیل باٹم پر مشتمل تھا، بس کے اندر کس طرح داخل ہوگا — یہ منظر یقیناً قابل دید ہوگا!

گو کہ میں رفیق صاحب سے مایوس ہو چکا تھا، مگر واپس جا بھی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ دل قلابازیاں کھانے لگا تھا۔ یوں تو براہ راست نظر بازی کسی حال میں مستحسن نہیں، لیکن تنقیدی نگاہ سے جائزۂ حسن ناجائز بھی نہیں، کیوں کہ یہ عمل آرٹ کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ اہل نظر اپنے ذوق نظر کے پروان کے لیے اس لیے بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کہیں آرائش جمال میں کوئی نہ پڑ جائے جو آگے چل کر معیار حسن کی نگاہ کا شہتیر بن جائے — جیسا کہ بیل باٹم کی ایجاد سے ظاہر ہے!

معلوم نہیں بیل باٹم کے موجد کو کیا دشمنی تھی کہ اس نے اپنی اس ایجاد سے حسن کا جنازہ نکال دیا۔ تاریخ ملبوسات میں کسی لباس نے آرائش اور زیبائش کی اتنی توہین نہ کی ہوگی جتنا کہ بیل باٹم نے!

[illegible] معاشی اور سیاسی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ہی بیل باٹم کو باری باری سے میاں بیوی دونوں استعمال کر سکتے ہیں۔ سیاسی [illegible] بیل باٹم اور ہپّی زلفیں عام رواج پا گئیں تو عورت و مرد کے تمام حقوق آپ سے آپ برابر ہو جائیں گے۔ بہرحال بیل باٹم اور ہپّی زلفیں مساوی حقوق کا پیش خیمہ بھی نہ بنیں، مگر یہ طے ہے کہ مذکر مؤنث کا [illegible] اٹھ جائے گی!

افسوس ہے کہ ایسے [illegible] لباس کا، جس کا اثر ساری دنیا کی سیاست اور معاشرت پر پڑنے والا ہے، موجد کوئی غیر ہندوستانی ہے۔ ابھی سے [illegible] ہمارے محققین تحقیق کر کے یہ ثابت کر دیں کہ بیل باٹم دراصل غرارے کی دوسری شکل ہے تو اس کی ایجاد کا سہرا ہمارے سر ہو جائے گا!

پندرہ سے بیس منٹ ہو گئے۔ نہ بس آتی تھی اور نہ رفیق صاحب۔ بھیڑ بدستور بڑھتی جا رہی تھی، رنگوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ . . . انتظار کے مشکل گھڑی میں آدمی اگر اپنے گرد و پیش سے دل نہ بہلائے تو پاگل ہو جائے۔ پھر بھی جب بیس سے پچیس منٹ ہو گئے تو اکتا کر جمائیاں لینے لگا۔

بھیڑ میں اچانک جیسے اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ ایک گروپ بیل باٹموں کا تازہ تازہ وارد ہوا تھا۔ ان کا خلط ملط دیکھ کر میرے دیدے کا پانی مرنے لگا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ جدھر پھیرا تھا، اُدھر دیکھتا ہوں کہ ایک بیل باٹم (لڑکی)، بڑی پتلی چھریری، نیم کد و، نیم پہلوان، بے تحاشہ بس اسٹینڈ کی طرف چلی آ رہی ہے۔

زمانہ جب اپنی چال بدلتا ہے تو ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ کیا اصول، کیا نظریات، کیا معیار اور کیا انداز فکر ـــــ یہ سب بدل جاتے ہیں۔ پہلے حسینوں کی چال کو خرام ناز سے تشبیہ دیتے تھے، آج ان کی چال کو دیکھ کر بائی جمپ، لانگ جمپ اور گھوڑ دوڑ کا تصور ہوتا ہے۔

وہ بس اسٹینڈ کے قریب پہنچ کر رک گئی اور دیدے پھاڑ کر ہجوم کو گھورنے لگی، جیسا اُسے کسی ہم جنس یا شناسا کی تلاش تھی۔ ہجوم کا بھی ہر فرد اُسے گھورنے لگا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ بڑھتے بڑھتے اُس کا رُخ میری جانب ہو گیا۔ جب اُس کا اور میرا فاصلہ چند گز رہ گیا تو اچانک اُس نے ایک فلک شگاف نعرہ مار کر میرے اُوپر چھلانگ لگا دی ـــ "ارے جمہوری بھائی! معاف کرنا دیر ہو گئی ـــ!!" میں نے غور سے دیکھا تو وہ رفیق صاحب تھے۔

لاحول ولا قوۃ! اب مجھے عینک لے ہی لینی چاہیئے!

خودی

ہم نے اقبال کا کہا مانا — اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں — ہم خودی کو بلند کرتے رہے

(مرزا محمود سرحدی)

لطیفے

★ استاد نے طالب علم سے پوچھا "اچھا بتاؤ تم منجم کیوں بننا چاہتے ہو ؟"

طالب علم نے فوراً جواب دیا "جناب مجھے تو مستقبل اسی میں دکھائی دیتا ہے ۔"

-۰- -۰- -۰-

★ ایک نوجوان کے پیچھے تین کتوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر ایک کارنیشن پروفیسر نے سوچا کہ اس بے چارے نوجوان کی مدد کرنی چاہیئے ۔

بڑی دقت سے کار کو نوجوان کے قریب پارک کرکے دروازہ کھول کر پروفیسر نے کہا "نوجوان فوراً اندر آجاؤ !"

اس پر نوجوان نے پروفیسر سے کہا ۔" جناب آپ اس شہر میں اکیلے آدمی ہیں جنھوں نے مجھے اپنے پالتو کتوں کے باوجود ، لفٹ کا پیشکش کرنے کی جرأت کی ہے ۔"

★ کو پشتی (بھر شاچار) پر لطیفہ ۔

مُرغ نے مور سے کہا "ادھر دیکھو آج سے ہم اس ملک کے قومی پرندے شمار کئے جا رہے ہیں ۔"

-۰- -۰- -۰-

★ ایک پیشہ ور قسم کے امریکی سیاح سے ایک سُرخ ہندوستانی کی ملاقات ہوئی ، جو اپنے حافظے کے بارے میں ڈینگیں مار رہا تھا ۔ امریکی سیاح نے سرخ ہندوستانی سے پوچھا ۔ "اچھا بتاؤ ۴ر ڈسمبر ۱۹۴۷ء کو تم نے ناشتہ میں کیا کھایا تھا" سرخ ہندوستانی نے فوراً جواب دیا "انڈے" ۔ امریکی سیاح نے سوچا یہ تو بڑا فراڈ ہے ۔ ہر شخص ناشتے میں انڈے ہی تو کھاتا ہے — پھر آٹھ دس سال کے بعد اسی سیاح سے اسی سرخ ہندوستانی کی ملاقات ایک ریلوے پلیٹ فارم پر ہوئی ۔ سیاح نے پوچھا "کیا حال ہیں ؟" ۔ سرخ ہندوستانی نے جواب دیا "جی آج کل پھینٹ کر کھا رہا ہوں !"

-۰- -۰- -۰-

★ ڈاکٹر: "آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنے کام میں دلچسپی لیں ۔ بلکہ اس میں ہی جذب ہوجائیں ۔ ورنہ آپکی پریشانیاں برقرار رہیں گی ۔"

مریض : "ڈاکٹر صاحب ، معاف فرمائیں میں ایسا نہیں کرسکتا ، کیونکہ میں سمنٹ میں ریت ملانے کا کام کرتا ہوں ۔"

-۰- -۰- -۰-

گائیوں کے ایک بہت بڑے فارم میں محض روایتی طور پر ایک بیل بھی موجود تھا ۔ مگر کچھ دن پہلے فارم میں ایک اور نوجوان بیل کا اضافہ کیا گیا ۔ جس نے فارم میں اپنی نوجوانی کے بل بوتے گایوں کی صفوں کی صفیں الٹ کر رکھ دیں ۔ جس پر پرانا بیل بہت بے چین ہوکر چلتے ہوئے ناچنے لگا ۔ مالک نے پوچھا "یہ تم کیا کر رہے ہو ۔؟"

پرانے بیل نے جواب دیا ۔" جی میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں بھی ایک بیل ہوں ۔"

-۰- -۰- -۰-

★ اپنے معروف امریکی باپ کی بیماری اور اس کے دواخانے میں علاج پر تبصرہ کرتے ہوئے بیٹے نے اپنے دوست سے کہا ۔" وہ دواخانے میں بھی معروف ہیں ۔ دن میں ایک نرس ۔ رات میں ایک دوسری نرس ان کے ساتھ ہوتی ہے ۔ البتہ دوپہر میں وہ آرام کرتے ہیں ۔"

——

: ڈاکٹر یوسف کمال

* نریندر لوتھر

پہلے ہم تم میں سو آپ ہم میں

معاف کیجیے صاحب! غالباً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کثرتِ اولاد کی بیماری، ہمیں نہیں کسی اور کو ہوگی۔ ہمارے تو لے دے کے صرف دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ اُس کے بعد ہم نے بیگم سے نثری نظم کی صورت میں سوال پوچھا تھا۔

حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ کسی بھی کنبہ میں چار سے زیادہ لوگ نہ ہوں
ایک باپ جو باہر کا کام کرے
ایک ماں جو اندر کا کاج کرے
کام کاج تو پورا ہوگیا
اب اور کیا چاہیئے ؟
ایک لڑکا
جو بات بات پر شعلے کی طرح بھڑکا
اور ایک بیٹی
جو سدا رہتی ہے کتابوں میں لیٹی
اس کے بعد بھی ازراہِ انشورنس
ایک اور بچے کی مل سکتی ہے کلیرنس

اب بتائیے آپ کو کیا چاہیئے۔
"بیٹی یا بھڑکا" ؟

بیگم نے ابھی تک ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس لئے ہم نے بھی اس معاملے میں کوئی پیش قدمی نہیں کی اور نتیجتہً ہماری اولاد کی تعداد اُتنی کی اُتنی رہی ؛ یعنی دو!

لیکن ہم بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو کثرت اولاد کے معاملہ میں ستم زدہ ہیں۔ ایک بار ہمیں کسی دوست کے ہاں جانا تھا لیکن اُس کے گھر کے قریب پہنچ کر راستہ بھول گئے۔ ایک سات آٹھ سال کے بچے کو روک کر اُس سے پتہ پوچھا۔ اُس نے بڑی تفصیل سے پہلے پتہ اور پھر راستہ بتایا۔ چلتے چلتے ہم نے اُس کا نام پوچھا۔ کس کلاس میں پڑھتے ہو، بابا کا نام کیا ہے، کہاں رہتے ہو اور پھر یوں ہی پوچھ بیٹھے۔

"تم کتنے بھائی بہن ہو ؟"
اُس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "سترہ"۔
"کتنے ؟" ہمارا سوال ہمارے حلق میں اٹک گیا۔
اُس نے پھر دہرایا ــ "سترہ"۔
"سترہ ؟" ہم نے پھر توثیق چاہی۔
"جی ہاں۔ سترہ۔ دس پر سات"۔ اُس نے وضاحت کے ساتھ کہا۔
زندگی میں پہلی بار ہم ایسا بچہ دیکھ رہے تھے جس کے سولہ بھائی بہن تھے۔
"تم سے چھوٹا بچہ بھی ہے کوئی ؟"
"جی ہاں۔ تین بہنیں مجھ سے چھوٹی ہیں۔"
پھر ہمیں خیال آیا کہ یہ بھی پتہ کرلیں کہ پروردگار کے علاوہ اُن کی دال روٹی کا انتظام کون کرتا ہے۔
"تمہارے بابا کیا کام کرتے ہیں ؟"
"جی کچھ ! " بچے نے بڑی معصومیت سے جواب دے کر ہمیں لاجواب کردیا۔

ہمیں گمان ہوا کہ کہیں یہ بچہ ہمارے ایک مرحوم شاعر دوست کی اولادیں سے تو نہیں کیونکہ بقول خود اُنکے ایک دن وہ مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر جوں ہی مسجد سے نکلے انہیں ایک چھوٹا سا بچہ روتا ہوا ملا۔ انہوں نے اُس سے اُس کا اتہ پتہ پوچھنے کی بہت کوشش کی لیکن بچہ اُن کی شیروانی کو پکڑ کر روئے جارہا تھا۔ یہ دیکھ کر اُن کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے اُسے گود میں اٹھا لیا، اُسے پچکارا، بمشکل تمام اُسے چُپ کرایا اور پھر اُسے اپنے گھر لے آئے۔

گھر آکر انہوں نے بیگم سے کہا۔ یہ بے چارہ کسی کا بچہ کھو گیا ہے۔ اسے لے آیا ہوں۔ نہ جانے اس کے ماں باپ کہاں ہیں . . . . "

بیگم پہلے تو غصّہ میں آگئیں، پھر قہقہہ لگایا اور ٹوک کر بولیں ــ "ارے یہ تو ہمارا بچّہ ہے۔"
ہمیں یقین ہے کہ یہ کہانی سچی ہے کیونکہ ہمارے دوست نے خود ہمیں سنائی تھی۔

غالباً آپ نے محمد یونس صاحب کی خودنوشت میں درج یہ واقعہ بھی پڑھا ہوگا کہ جب پنڈت نہرو پہلی بار سعودی عرب گئے وہاں شاہ ابن سعود نے اپنے بتیس شہزادوں کا تعارف پنڈت نہرو سے کروایا۔ تعارف کے بعد یونس صاحب نے پنڈت نہرو سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ "کہاں بتیس شہزادے اور کہاں آپ کی صرف ایک بیٹی۔ آپ یقیناً احساس کمتری میں مبتلا ہوں گے"۔ یہ سنتے ہی پنڈت نہرو نے یونس صاحب کو بازو سے پکڑ کر اُن کا تعارف شاہ ابن سعود سے یوں کروایا کہ یہ اپنے باپ کی چھیالیسویں اولاد ہیں۔ دروغ یا مبالغہ برگردنِ راوی۔ لیکن سنا ہے کہ یہ اعداد و شمار علی گڑھ یونیورسٹی کے ریکارڈ میں موجود ہیں جہاں یونس صاحب کے بیشتر بھائیوں نے تعلیم حاصل کی۔

اولاد کے بارے میں کوئی کسی کو کیا کہہ سکتا ہے۔ یہ تو ایسی دین سمجھی جاتی ہے۔ جو ہر مذہب کا خدا اپنی مخلوق کو اپنے جوڑ اور اُن کی بساط کے مطابق دیتا ہے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ، کسی کو ہونہار، کسی کو نالائق، کسی کو نسواں، کسی کو نرینہ۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرح اس میں بھی انسان کسی غیبی ہستی کو خواہ مخواہ بیچ میں گھسیٹ لاتا ہے۔ زیادہ اولاد والے انسانوں کے تعلق سے بھی خدائے میرؔ کی معرفت یہ مصرعہ کہا تھا ؎

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

اب ہمارے سگے چچا کی سُنیے۔ اُن کی پہلی بیوی دو لڑکوں اور ایک لڑکی کو جنم دے کر دنیا سے فارغ ہو گئی۔ دوسری بیوی آئی تو اُس نے کہا یہ بچے تو میرے نہیں، مجھے تو اپنا ذاتی "سیٹ" چاہیئے۔ وہ ہر بار اولادِ نرینہ کے لئے کوشاں اور دعاگو رہتیں، لیکن ہر بار لڑکی ہی پیدا ہوتی۔ اس طرح یکے بعد دیگرے اُن کے ہاں نو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ہمیں یاد نہیں آتا کہ ہم نے اپنی چچی کو حمل یا زچگی کے علاوہ کسی اور حالت میں بھی دیکھا ہو۔ آخر ایک دن نسوانی اولاد کی کثرت اور اولادِ نرینہ کی حسرت لئے ہمارے چچا اپنی پہلی بیوی سے جا ملے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جو ملک، جو معاشرہ اور جو لوگ زیادہ بچے پیدا کر سکتے ہیں، اُن کی بہتر پرورش کر سکتے ہیں، وہ عموماً کم بچے پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اور ملک اس کے اہل نہیں ہوتے، وہ اولاد کی کثرت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پچھلے کئی دہوں سے یورپ کے ملکوں کی آبادی ساکت ہے۔ اُس کے برخلاف غریب اور پسماندہ ملکوں میں آبادی بڑھ رہی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر کئی ترقی یافتہ اور کم آبادی والے ملکوں نے کافی تعداد میں ہندوستانیوں کو برآمد کیا تاکہ وہاں کے باشندے زیادہ بچے پیدا کرنے کی تکنیکی جانکاری حاصل کر سکیں، لیکن جو ہندوستانی باہر جاتے ہیں اُن میں گویا وہ صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کئی ماہروں کا خیال ہے کہ یہ آب و ہوا کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک دوسرے فکر کا خیال ہے کہ جیسے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، ویسے ہی حمل کو نہ دیکھ کر حمل ٹھہرتا ہی نہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو ہندوستانی چند دنوں کے لئے ہی باہر جاتے ہیں وہ بھی اسی بیماری کے ساتھ واپس آتے ہیں۔ ہندوستان کے باشندوں میں بھی مقابلتاً خوشحال لوگوں کے بچے کم ہوتے ہیں۔ یہ تجویہ دیکھ کر بیشتر پسماندہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم خوشحال ہو جائیں گے تو خود بخود کم بچے پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے۔ وہ بیچارے یہ صریح بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ خوشحال لوگوں کی خوشحالی چھوٹے کنبہ کی وجہ سے ہے نہ کہ اُن کا چھوٹا کنبہ خوش حالی کا نتیجہ ہے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جہاں ہم ہندوستانی باہر کے ملکوں میں جاکر کم اولاد پیدا کرنے کی قومی رسم سے متاثر ہوکر اُسے اپنا لیتے ہیں، وہاں غیرملکی لوگ ہندوستان آکر بھی اپنی 'کم اولاد' والی عادت نہیں چھوڑتے۔ ہم نے کئی لوگ ایسے دیکھے ہیں جو برسوں یہاں رہ کر گئے لیکن جتنے بچوں کے ساتھ وہ آئے، اتنے ہی کے ساتھ واپس گئے۔ بلکہ کثرتِ اولاد یا کم اولاد والے لوگ ایک آدھ ہندوستانی بچہ اپنا کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی غیرملکی شخص نے ہمیں تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "میں آپ کے ملک کے لئے اور تو کچھ نہیں کرسکا۔ سوچا چلو آپ کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ ہلکا کرنے میں کچھ مدد کردوں۔"

ہم نے کہا ایک بچے کو لے جانے سے کیا ہوگا۔ اُس نے جواب دیا، "اسے چھوٹی سی بات نہ سمجھو۔ یہی بچہ پچیس برس میں چھ سات بچے اور بڑھائے گا اور اُن میں سے ہر بچہ اپنی جگہ چھ سات بچے اور پیدا کرے گا۔ اس طرح ذرا حساب کرکے دیکھو تو ....."

ہم نے مستقبل بعید کے نتائج کے بارے میں سوچ کر اُس شخص کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور پھر پوچھنے کی جسارت کی کہ اس بچے کو لے جانے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ اُس نے جواب دیا۔ یہ بچہ بڑا ذہین ہے۔ ہندوستان میں رہے گا تو رکشہ چلائے گا یا کسی کے جھوٹے برتن صاف کرے گا۔ ہمارے ملک میں جائے گا تو ہوسکتا ہے بڑا ہوکر نوبل پرائز حاصل کرے۔ ہم نے کہا اگر یہ بات ہے تو ہمیں بھی ساتھ لے چلئے کیونکہ ہمیں بھی نوبل پرائز حاصل کرنے کی بڑی شدید خواہش ہے لیکن اس نے ہماری درخواست رد کردی۔

جو حال انسان کے سماج کا ہے، ویسا ہی حیوانوں کا ہے۔ اُن کے ہاں بھی گھٹیا اور کمزور قسم کے جانوروں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں اور قوی اور بڑھیا جانوروں کے بچے کم۔ ایک بار ایک لومڑی، ایک شیرنی کے پاس گئی اور اُس سے بڑے نخرے سے بولی۔ "تم جنگل کی رانی بنی پھرتی ہو لیکن سال میں ایک ہی پلا پیدا کرتی ہو۔ مجھے دیکھو میں ہر چھ مہینے میں چار یا پانچ بچوں کو جنم دیتی ہوں۔" شیرنی نے ناک سکیڑ کر جواب دیا۔ "یہ صحیح ہے کہ میں سال میں ایک ہی بچہ پیدا کرتی ہوں لیکن وہ بچہ جنگل کا راجہ ہوتا ہے۔" یہ سُن کر لومڑی دُم دبا کر بھاگی اور سیدھی فیملی پلاننگ کلینک پہنچی۔ وہ دن اور آج کا دن اُس لومڑی کے اور کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ شیرنی اور لومڑی دونوں ایک ہی گھاٹ کا پانی پیتی ہیں۔ جو روایتی بکری انگریزوں کے زمانے میں اُس شیرنی کے ساتھ پانی پیا کرتی تھی، اُس کو ایک دن غصے میں آکر شیرنی نے کھا لیا کیونکہ اُس نے لومڑی کے اور بچے نہ جننے کے بارے میں کوئی ناشائستہ بات کہی تھی۔ لومڑی کے دو بچے اب جوان ہوگئے ہیں، انہوں نے اچھی تعلیم پائی اور اب وہ محکمۂ جنگلات میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ انہیں میں سے ایک بچے نے ہمیں بتایا کہ وہ جو کچھوے اور خرگوش کی دوڑ کے مقابلہ والی کہانی بچوں کو سنائی جاتی ہے۔ اُس میں خرگوش کے ہارنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ دوڑ کے دوران اُسے دو چار بار رستے میں اپنی بیوی کی زچگی کیلئے جانا پڑا۔ اُس اثناء میں کچھوا آگے بڑھتا گیا۔ آج کے خرگوشوں کو بھی لومڑی کو دیکھ کر احساس ہوگیا ہے اور انہوں نے بھی اب نس بندی کروانا شروع کی ہے۔ اس لئے آج کا نوجوان خرگوش ریس میں کچھوے سے نہیں ہارے گا۔ یقین نہ ہو تو اُسے دوڑا کے دیکھ لیجئے۔ یہ بات واقعی صحیح ہے کیونکہ ہم نے حال ہی میں دیکھا ہے کہ شکاری کتے بھی خرگوشوں کی رفتار سے دوڑ

نہیں پاتے۔ اسی لئے انگریز لوگ اپنے کتوں کو دوڑنا سکھانے کیلئے خرگوشوں کا پیچھا کرواتے ہیں۔

لومڑیوں اور خرگوشوں نے تو سبق سیکھ لیا۔ لیکن ہندوستان کا عام انسان اب بھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا۔ کہتے ہیں انسان اشرف المخلوقات ہے۔ بہترین پیداوار ہے لیکن ایسا کون کہتا ہے؟ خود انسان! کبھی کسی حیوان نے یہ بات مانی ہے؟ — ذرا سوچئے —!

کرشن پرویز
کھرار۔ پٹیالہ

مفت میں کھانے یہاں پان چلے آتے ہیں
جیسے ہو باپ کی دوکان چلے آتے ہیں

کوئی کھٹکا نہیں، آہٹ نہیں، آواز نہیں
منہ اٹھائے وہ بے ایمان چلے آتے ہیں

یہ مرا گھر ہی، سرکار کا دفتر تو نہیں
روز کھانے کو میری جان چلے آتے ہیں

جیب پرویز کی خالی ہے ادھر یہ عالم
گھر میں مہمان پہ مہمان چلے آتے ہیں

مختار یونس
(مالیگاؤں)

پان ہے تو جہان ہے....

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
پان خوروں کی زندگی بیٹا
زعفرانی قوام ہوتی ہے

پان خوری ایک خالص ویجی ٹیرین [VAGITARIAN] شغل ہے۔ اگر ذردہ شریک پان ہو تو پھر پیشہ بن جاتا ہے۔ بیڑہ سازی گھریلو صنعت ہے۔ مکان میں بھی گلوریاں بنتی ہیں اور دکان میں بھی۔ بیڑی بنانا جتنا دشوار فن ہے بیڑہ بنانا اتنا آسان ہے۔ پان کا پتّہ لیجئے اس کا ڈنٹھل نما کا سر قلم کیجئے اس کی چھاتی اور پیٹ پر چونا ملئے (وکس ویپورب کی طرح) پھر کتھے کا لیپ چڑھایئے۔ اب قوام کی ڈبیہ سے کان کی میل نکالیے اور پان پر رکھیے تمباکو کا چھڑکاؤ کیجئے اب قوام کو مرکز مان کر انگلی کے پرکار سے کتھے پر دائرہ در دائرہ بناتے جایئے۔ انگلی کی دائرہ نما گردش سے تمباکو کا نشہ پان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اب سروتے کی قتل گاہ میں سپاری کا مرڈر کیجئے۔ اس کی بوٹی بوٹی کر ڈالیے سپاری کے یہ قتلے پیپر ویٹ کا کام کرتے ہیں پان کو اڑنے سے منع کرتے ہیں۔ اب پان مثلث نما فولڈ کیجئے اور اسے لونگ سے لاک [LOCK] کر دیجئے۔ تاکہ نشہ پان سے فرار نہ ہو سکے لیجئے بیڑہ تیار ہے اب اس کو منہ میں رکھنے کا بیڑہ اٹھایئے۔ اس پان سے پہلے سر میں گردش پیدا ہوتی ہے۔ پھر جسم گردش کے موڈ میں آجاتا ہے اس کے بعد زمین گردش کرنے لگتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگتے ہیں پھر قسمت گردش میں آتی ہے اور ہر پان خور گردش کا کرحادثہ کا شکار بن جاتا ہے۔

بعض حضرات پان کی سرسبز زمین پر تمباکو کا نشیلا وجود برداشت نہیں کر سکتے ان کی نظر میں تمباکو دہشت پسند ہے جو اعصاب کا نظام درہم برہم کر دیتا ہے۔ دماغ کی راجدھانی میں سنسنی پھیل جاتی ہے اسی لیے کچھ لوگ پان میں رانگا رنگ کے مصالحے کی دکان سجاتے ہیں جب پان میوہ بازار بن جاتا ہے تو اس کی پیکنگ کر کے چاندی کے ورق سے آراستہ کر کے منہ کی حوالات میں قید کر دیتے ہیں پھر دانتوں کی چکی پیسنا پڑتی ہے تب جا کر پان سے لہو تیار ہوتا ہے۔ پان کی پچکاری سے سڑک لہولہان ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر لبنان کی سڑک یاد آجاتی ہے۔ پان خوروں کی یہ خوں ریزی وقفہ وقفہ سے جگہ جگہ برپا ہوتی رہتی ہے سڑکوں کے کنارے کئی سنگ میل پان خوروں کے

انھیں کافی سرخ رو دیکھے ہیں

بعض پان پرست سڑکوں پر پچکاری مارتے ہوئے گزرتے ہیں یا پان کے عشق میں پیک کو گلے لگائے پھرتے ہیں وہ عرقِ پان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے اس لئے منہ میں پیک کی ذخیرہ اندوزی کرتے رہتے ہیں جب کوولم درہن چھلکنے کو ہوتا ہے تو پان فیکٹری کا تیار کردہ سارا لہو معدہ میں انڈیل لیتے ہیں۔ شاید ان کی نظر میں اینیمیا [خون کی کی کا مرض] کا واحد علاج یہی ہے۔ بہرحال پان کے یہ پرستار معدہ کو اگالدان سمجھتے ہیں یا نگل دان آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

> — ایک فکر مند سے آدمی نے ایک خاتون کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہا " خاتون۔ ابھی میں نے اپنی گاڑی سے آپ کی بلی کو کچل ڈالا ہے۔ اور اس نقصان کی تلافی کے لئے حاضر ہوا ہوں "
>
> " اچھا " خاتون نے بے یقینی سے پوچھا۔ " کیا آپ چوہے پکڑ سکتے ہیں ؟ "

پان میں سپاری رکھنے کا عام رواج ہے کہتے ہیں سپاری کے ٹکڑے سے بیڑے کی عمر دراز ہو جاتی ہے۔ سپاری دانتوں کے درمیان فٹ بال بن جاتی ہے دانتوں کی ٹیم اسے گول کرتی ہے زبان بے ایمان ریفری کی طرح کبھی دانت کی اوپری ٹیم کا ساتھ دیتی ہے کبھی نچلی ٹیم کا بعض حالات میں حلق خود بال کو اچک لیتی ہے اور گول کر جاتی ہے۔

کسی پان فروش کا قول ہے " کمزور دندان والے براہ کرم سپاریوں سے پرہیز کریں اگر ان کے پان میں سپاری چاہیں ہوگی تو ان کے دانت واک آؤٹ ہو جائیں گے مسوڑے لہو روتے پھریں گے ایک مرتبہ کا ذکر ہے سپاری دانت کے لئے لوہے کا چنا بن گئی پان خور کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے منہ میں ایک سپاری زائد ہو گئی ہے اسے بڑی حیرت ہوئی مگر جب اس نے سڑک پر پچکاری ماری تو سڑک پر سپاریوں کے ہمراہ ایک دانت بھی دوڑ رہا تھا۔

پان سے ہونٹوں پر گلاب نہیں گل لالہ کھلتے ہیں۔ خواتین کا لپ اسٹک خرچ بچتا ہے۔ سرخی پان سے دانتوں پر بھی سرخ سویرا چھا جاتا ہے جس کو دیکھ کر کمیونزم باغ باغ ہو جاتا ہے وہ کہہ اٹھتا ہے " پان بظاہر سبز انقلاب کا پرچم ہے مگر جب چونے سے کتھے کا اشتراک ہوتا ہے تو سرخ اشتراکیت وجود میں آتی ہے لہٰذا پان بہ پردۂ انقلاب ہے جو کوئلہ سڑکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے پان چبانے والوں کے لباس پر بھی اکثر روس و چین کے نقشے پائے جاتے ہیں۔ جو پان کا ہی دان ہیں ؟

پان پسند حضرات اگر مطالعہ کے شوقین ہوں تو اخبار و رسائل پر جگہ جگہ سرخ تل آفسیٹ میں چھپے نظر آتے ہیں۔ پان خور حضرات شغل کے دوران کھل کر بات چیت نہیں کر سکتے ہونٹوں کے دریچے بھڑکتے رہتے ہیں گفتگو کے دوران وہ کوہ آتش فشاں بنے نظر آتے ہیں۔

پان کے کیا کیا روپ بتائیں۔ بنارسی پان۔ کلکتہ پان۔ مدراسی و چاند وڑی پان گلی اور بچا پھر دو پان ہر ایک کی لذت الگ، شکل و شباہت مختلف، رنگت میں اختلاف مگر پھر بھی سب پان ہی کہلاتے ہیں۔ کیا عظیم ہستی ہے یہ پان !!

ــــ

* اکمل افغانی ملتان،
پاکستان

حضرت طائرِ لاہوتی

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جان پرسوز ——— کشادہ پیشانی، مصفّا پشیمانی، آنکھیں روشن، چمن در چمن
قد بمشکل ساڑھے پانچ تک پہنچتا ہوا۔ محیطِ جسم و جاں، بظاہر ناتواں مگر ہردم رواں، ملتان میں کم کم، لاہور
میں بیش بیش۔ مسلک "وحدت الوجود" یعنی ہر شئے میں "مُرشد" جلوہ گر۔ سلسلۂ نقشیاتیہ سے بیعت،
مگر بعد میں "سلسلۂ صدیقیہ" کی پیروی کرنے لگے تھے۔ گو بعض لوگ اسے وفا داریاں بدلنا کہتے ہیں، لیکن آپ
اسے وفا داریوں میں وسعت قرار دیتے تھے اور "وحدت الوجود" کی نئی تفسیر کے مطابق ہمیشہ کسی نہ کسی کے ہو کے
رہتے تھے۔ اس سے قبل آپ نے "سلسلۂ قریشیہ اسلام آباد" سے بھی بیعت کی تھی مگر اُس آستانے پر کام بہت دیر
سے ہوتا تھا۔ سلسلۂ نقشیاتیہ میں کام جلدی ہو جاتا تھا۔ اُن ہی "مُرشدوں" کے اشارۂ ابرو نے آپ کو آستانۂ
ذکریا پر حاضر ہونے کا حکم دیا اور پھر یوں آپ کو ملتان کی "ولایت" عطا کر دی گئی۔

آپ کا تعلق قصبۂ لاہوت ضلع ڈیرہ غازی خاں سے تھا۔ قصبۂ مذکور سے ایک اور بزرگوار بھی ہو گزرے ہیں
جو بعد میں دہلی کے گل مہر پارک میں جا بسے تھے اور اُن کے روحانی فیض سے پورا ہندوستان مستفیض ہوتا رہا۔
وہ چونکہ اصلی تھے، اس لئے اُن کا ڈنکا ایسا بجا کہ قصبۂ لاہوت کو عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی۔ حضرت طائرِ لاہوتی
نے دہلی والے حضرت فکر لاہوتی کا لاحقہ نام کے ساتھ پیوست کر کے شہرت کے دروازے پر دستک دی۔ درِ شہرت
کھلا تو آگے مرشدِ ناقصاں، رہنمائے کاہلاں حضرت بلند اختر پسروری آنکھیں بند کئے، بازو پھیلائے، کھڑے
تھے۔ آپ نے مرشد کو پہچان لیا اور قدم بوسی کی۔ اعلیٰ حضرت نے اٹھ کر گلے لگایا اور حضرت لاہوتی کے دونوں
ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر بیعت کرائی، "کمر ٹھونکی اور طریقت" کے راستوں کا سبق دیا۔

تذکروں میں آتا ہے کہ آپ نے سات برس تک اپنے مرشد کی خدمت کی اور صحبت کا فیض اٹھایا۔ اس صحبت
میں آپ نے سات سال تک لنگر اندازی کی خدمت بھی سرانجام دی اور جو موٹا جھوٹا اُس آستانے سے میسّر
آیا۔ آپ نے برضا و رغبت نوشِ جاں کیا اور سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس کے صلے میں اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمتوں

کے در شہرت اور ناموری کی صورت، آپ پر کھول دیئے۔ اور جو نہ کھل سکتے انہیں آپ نے بزورِ بازو کھول لیا۔ یہ سب مُرشد کا فیضانِ نظر تھا اور جب آپ کی آنکھیں کھلیں تو مرشد نے عارفانہ مسکراہٹ کے ساتھ حکم دیا۔ "بچہ! اب شہرِ ملتان اس خوشبو کا مستقر ہے اور تیرا منتظر ہے۔ ہم تجھے ولایتِ بہاؤ الدین ذکریا عطا کرتے ہیں"۔ سو آپ نے بوریا بستر سمیٹ ملتان کی راہ لی۔

تاریخ نویسوں کا کہنا ہے کہ اُس دور میں، ملتان کے لئے کہیں سے بھی روانہ ہوں، راستے میں میانوالی ضرور آتا تھا۔ سو آپ نے پہلا پڑاؤ میانوالی ہی میں ڈالا۔ وہاں لگ بھگ سات آٹھ ماہ عوام الناس کو اپنے "روحانی فیض" اور عطائے مُرشد یعنی "کتب کی کرامت" سے نوازتے رہے۔ جب دل بھر گیا (عوام الناس کا) تو ملتان کا کوچ کیا۔ میانوالی کے عوام الناس کی آہیں ملتان تک پہنچیں اور بعد میں بھی کافی عرصے تک پہنچتی رہیں۔ یہاں آپ نے سب سے پہلے شہرِ ملتان سے زیادہ وہاڑی، عارف والا، بورے والا اور بہاولپور کے غریب الذہن خلقِ خدا کی خدمت کو اپنا ہدف بنایا اور ایک طویل عرصے تک مذکورہ علاقوں کو مستفید کرتے رہے اور بالآخر نوبت شہر میانوالی بلکہ زائد از میانوالی ہو گئی تو آپ نے پوری توجہ "تعلیماتِ مرشد" کو عام کرنے پر صرف کی۔ ایک رسالۂ تالیف در احوالِ مرشد بعنوان "مُرغ باد گرد نما" تحریر کیا، جس میں مُرشدِ کامل کے کرامات و معجزاتِ تمام بہ کمالِ تفصیل رقم کئے۔

آپ چونکہ نگہ بلند، سخن دلنواز، جان پرسوز رکھتے تھے۔ لہٰذا اسی بلند نگہی کے سبب اکثر کھلے "مین ہول" میں گر جاتے تھے اور خرابیٔ بسیار و بدقتِ ہزار باہر نکالے جاتے تھے کیونکہ آپ نکلنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ کچھ تذکروں میں یوں بھی آیا ہے کہ ایک "طریقت دشمن گروہ" آپ کے زمانے میں سرگرمِ عمل تھا کہ آپ کے ہر کلام پر سرقہ کا الزام لگا کر اور لوگوں کو ساتھ ملا کر ثابت بھی کر دیا کرتا تھا۔ مگر آپ بڑے اولوالعزم اور ثابت قدم بزرگ تھے کسی کی پروا نہ کرتے تھے اور اسی بے نیازی سے آپ نے دنیا جہاں کے درد و غم جمع کر کے بے شمار "دیوان" کر لئے۔ اس لئے اکثر لوگ آپ کو دیوانہ بھی کہا کرتے تھے۔ آپ اپنے ملفوظات کو ہمیشہ تلوار مار کہ (معرکۂ تیغ) کہا کرتے تھے۔ مگر زمانے کی نیت بُری، حاسدوں کا خانہ خراب، اکثر تذکرہ نگاروں نے قینچی مار کر لکھا ہے۔

ایک روایت اور بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ سے پہلے آپ کے قصبۂ لاہوت میں ایک ڈاکٹر طائرِ بسمل رہا کرتے تھے۔ جن کا تخلص بسمل لاہوتی تھا۔ آپ کی شہرت جب شہروں سے قصبوں تک پہنچنے لگی تو اُس نے فوراً آپ کے جلال سے لرز کر اپنا نام بدل لیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس نے قصبہ ہی چھوڑ دیا۔ حاسدوں کا خیال ہے کہ وہ اس نام سے شرمانے لگا تھا۔ لیکن اس میں کچھ حقیقت نہیں سمجھی جا ہیئے۔ البتہ اس روایت پر بیشتر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ آپ جب بخار کی حالت میں تھرمامیٹر منہ میں لیتے تھے تو ڈاکٹر کو آپ کا درجۂ حرارت معلوم کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ اکثر اوقات نارمل حالت میں بھی دو درجے حرارت زیادہ رہتی تھی البتہ جب تھرمامیٹر اُن کے منہ میں رکھ کر کوئی قریبی آدمی سرگودھا والوں کا نام لیتا تھا تو آپ کا درجۂ حرارت مزید دو درجے بڑھ جاتا تھا۔ لیکن اس روایت کے راوی خود بہت ضعیف ہیں، اس لئے روایت کو بھی ضعیف گردانا جائے۔

الغرض آپ سراپا فیض، مجسم ندیم، بلکہ مکمل سلیم تھے۔ آپ تمباکو نوشی نہیں کرتے تھے۔ اکثر کہتے تھے مجھے تمباکو پسند نہیں، البتہ نوشی کے بارے میں نہیں بتاتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کو ریاست کا سب سے بڑا "منظور نظر ایوارڈ" عطا کیا گیا۔ آپ کے ایسے ہی کارناموں کی بدولت تاریخ کے سنہری الفاظ ختم ہو چکے ہیں اور اب لوگ دوسرے رنگوں کو

سنہری کرکے استعمال میں لاتے ہیں۔ آپ کی ان ہی "کارستانیوں" کے طفیل آپ کے مرشد کو بھی صحیح طور پر پہچان لیا گیا۔ وگرنہ اُن کی شناخت لگ بھگ ختم ہو چکی تھی۔ آخر عمر میں آپ کا دل "خانوادۂ صدیقیہ" سے بھی کھٹا ہو گیا تھا۔ لہٰذا آپ نے اپنے عطا کردہ سارے القابات و خطابات بھی واپس لے لئے تھے۔ انجام کار آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی، انسانوں کو فانی سمجھنے لگے تھے، بلکہ انسانوں کو دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ کوئی قریب جاتا تو عجیب و غریب طرز کی زبان استعمال کرتے، جس سے ایک بار دیکھنے والا، دوسری بار دیکھنے کی خواہش نہ کرتا اور عبرت حاصل کرتا۔ آپ کی ساری زندگی عبرت کا نمونہ تھی۔ آنے والی کئی نسلوں نے اُن سے سبق سیکھا۔ ہمارے لئے بھی اُن کی تعلیمات اور تالیفات گہرا سبق رکھتی ہیں۔ خدا ہمیں اُن سے سیکھنے کی توفیق بخشے۔ شیخ سعدی سے کسی نے پوچھا تھا۔ آپ نے یہ دانائی کہاں سے حاصل کی۔ شیخ سعدیؔ نے فرمایا ـــــ خیر چھوڑیئے، شیخ سعدیؔ کو ....!

جاڑے میں

مجیب الرحمٰن بزمیؔ

کیا کہوں حال چال جاڑے میں ۔۔۔ ہے طبیعت نڈھال جاڑے میں

نزلہ، کھانسی، زکام کا چکر ۔۔۔ گھر بنا ہسپتال جاڑے میں

منجمد ہو گئی ہے ٹھنڈک سے ۔۔۔ آرزوئے وصال جاڑے میں

غسل اور وہ بھی باسی پانی سے ۔۔۔ ہے یہ امرِ محال جاڑے میں

بیدِ مجنوں سا کپکپائے گا ۔۔۔ "مت نہا میرے لال جاڑے میں"

شاعری برف بن گئی بزمیؔ
منجمد ہے خیال جاڑے میں

مولانا

کبھی جو پڑھتا ہے دل کی کتاب مولانا ۔۔۔ تو ڈھونڈتا ہے محبت کا باب مولانا

فریب و مکر ہی جن کا شعار ٹھہرا ہے ۔۔۔ وہی ہیں شہر کے عزت مآب مولانا

ہر ایک وعظ میں حوروں کا تذکرہ کیوں ہے ۔۔۔ خدا کا خوف، نہ شرم و حجاب مولانا

تیرے بھی قول و عمل میں تضاد پاتا ہوں ۔۔۔ تجھے بھی دینا ہے اک دن حساب مولانا

جہاں کو نانِ جویں کا تو درس دیتا ہے ۔۔۔ مگر ہے اس سے تجھے اجتناب مولانا

حسین چہرے پہ کیوں جاٹکی ہیں یہ نظریں ۔۔۔ میرے سوال کا کچھ تو جواب مولانا

ترے عمل کا اثر پڑ گیا دعاؤں پر ۔۔۔ تو کیوں ہو شہر پہ نازل عذاب مولانا

یہی خدا سے دعا ہے غریب بزمیؔ کی
کہ راہِ راست پہ آئیں جناب مولانا

بیاض کی کھال (تبصرہ)

* محمد منظور احمد

"بازیافت"

مجموعۂ کلام : محبوب راہی

قیمت : ۲۵ روپیہ

ملنے کا پتہ : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹۔ گولا مارکٹ۔ دریا گنج
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

ڈیمائی سائز۔ (۱۱۲) صفحات

"بازیافت" ڈاکٹر محبوب راہی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پیشتر ان کی غزلوں کے دو مجموعے "تردید" اور "ثبات" شائع ہو چکے ہیں، جنہیں مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی نے علی الترتیب پہلا اور دوسرا انعام عطا کیا تھا۔

ڈاکٹر محبوب راہی بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھتے رہے ہیں۔ بچوں کے لئے لکھی ہوئی ان کی نظموں کے دو مجموعے "رنگا رنگ" اور "گل بوٹے" زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ "بازیافت" کے آخری صفحہ پر انھوں نے اپنی سات زیرِ طبع کتابوں کی فہرست بھی شائع کی ہے۔

ان کے ڈاکٹریٹ کا موضوع "ڈاکٹر مظفر حنفی، حیات، شخصیت اور کارنامے" تھا۔ ان کا وطن "بلڈانہ (مہاراشٹرا) ہے۔ آج کل ضلع آکولہ (مہاراشٹرا) میں قیام پذیر ہیں۔

"بازیافت" کی غزلوں کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا، ظ۔ انصاری۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اور محمود سعیدی کے تاثرات، شاملِ اشاعت کئے گئے ہیں۔ محبوب راہی پچھلے کئی سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ فن پر انہیں دسترس ہے۔ ایمائیت و اشاریت ان کے کلام کا خاص وصف ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا خوبصورت سنگم ہے۔ انھیں شعری روایات کا خاصا علم ہے۔ اسی لئے شعر کہنے کے دوران ان روایات کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔

اچھی غزل کہنے کے لئے کائنات کا مطالعہ، غور و تامل، دل کی گداختگی اور تیز مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی میں یہ خصوصیات موجود ہیں، اس لئے ان کے مجموعہ میں اچھے اشعار موجود ہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

چند منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں :-

لبوں پر سب کے کیوں مہریں لگی ہیں
یہاں تو بے زباں کوئی نہیں ہے

ہر ایک دل میں رواں تھے خلوص کے جھرنے
وہ ایک دور جسے کہئے یہ خیال گیا

ہے میری ذات ہنگاموں کا مرکز
مرے چاروں طرف تنہائیاں سی

مسلسل درد کی یہ ٹیس کیسی
یہ پیہم کرب و غم کا سلسلہ کیا

آتی جاتی ہوئی ہر سانس خطا لگتی ہے
زیست، ناکردہ گناہوں کی سزا لگتی ہے

---

* ایک سیلزمین ایک گرہستن کو آگ بجھانے کا آلہ خریدنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا "یہ آلہ پچاس برس تک آپکی خدمت کرے گا" عمر رسیدہ گرہستن بولی "مگر اتنی مدت تک تو میں یہاں رہونگی بھی نہیں" سیلزمین نے اسکی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا "تو کیا ہوا؟ آپ جہاں بھی جائیں اسے ساتھ لے جائیں یہ وہاں بھی آپ کے کام آئے گا"

21 ویں صدی کی جانب
بلند پایہ تکنیکی مہارت کاری، کمپیوٹری کنٹرول،
فضائی سفر، بحری تہوں کی چھان بین،
جنوبی منطقہ باردہ کی کھوج۔
یہ عظیم کل ہر موڑ پر ہمارا منتظر ہے۔
ہمیں ابھی سے، اس کے لیے تیار ہونا چاہیئے۔
مبادا ہم اس ابھرتے انقلاب سے چوک جائیں
سائنس اور صنعت کی مدد سے
ہم غریبی کے مسائل پر قابو پالیں گے
اور مل کر آگے بڑھیں گے
davp 85/430

دے کے خط ... (مراسلے)

• جناب ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

" شگوفہ " باقاعدگی سے مل رہا ہے اور مسرت ہے کہ آپ اسے کمالِ محنت سے تسلسل کے ساتھ نکال رہے ہیں ع

" ایں سعادت بزورِ بازو نیست " ...

اس بار برق آشیانوی نے پطرس، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی پر قلم اٹھاکر ہتھوڑا اٹھانے کا حق ادا کیا ہے۔ میں انھیں متواتر پڑھ رہا ہوں مگر خدا معلوم، انھوں نے کہاں سے یہ جان لیا کہ پطرس کے مضمون بھونڈے ترجمے ہیں اور چند مضامین ہونے کی بنا پر کسی صورت قابلِ قدر تو کیا قابلِ ذکر بھی نہیں ہیں۔ مجھے ان کا رویّہ صدیقی صاحب اور پھر یوسفی کے بارے میں بھی یک طرفہ لگا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ یوسفی صاحب کے لیے محض ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔...

.... یہ ساری بحث یوں بھی پریشان کر رہی ہے کہ آپ نے ہمیں "ہندوستانی مزاح نمبر" سے محروم رکھا۔

طارق جامی (ملتان، پاکستان)

• محترم جناب ڈاکٹر مصطفیٰ کمال السلام علیکم :

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ بھارت سے بھی ایک مزاحیہ ادب کا ترجمان مجلّہ "شگوفہ" آپ کے زیرِ ادارت چھپ رہا ہے۔

نیاز سواتی (ایبٹ آباد پاکستان)

برادرم تسلیمات !

"شگوفہ" نومبر نظر سے گزرا۔ اس شمارے میں یوسف ناظم کا مضمون بہت پسند آیا! نظموں میں سمیع جلیل کی نظم اچھی ہے مولوی کلیم برق آشیانوی کا مضمون ایک تحقیقی مضمون ہے جس نے بہت سے رازہائے سربستہ کھول دیئے ہیں۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ شگوفہ میں شائع ہونے والے مضمون یا نظموں میں صاحبِ مضمون یا شاعر کا پتہ ضرور لکھا کریں۔ **اسرار جامعی، پٹنہ**

محترم مصطفیٰ کمال السلام علیکم :

زندہ دلانِ حیدرآباد کی کاوشوں نے طنز و مزاح کو عالمی حیثیت دے دی ہے۔ اس کا ثبوت عالمی مزاح کانفرنس ہے آج اردو ادب گروپ بندی اور تجریدی فیشن کے جال میں پھنس کر بلبلا رہا ہے۔ اِن حالات میں طنز و مزاح کی عالمی حیثیت منوانا صرف آپ لوگوں ہی کا کام ہے۔ تو صفحات کا خاص نمبر شائع کرنا، معیاری ادب کا دعویٰ کرنے والے مدیروں کے لیے لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے لیکن آپ نے ہندوستانی مزاح نمبر جیسا زبردست نمبر نکال کر ثابت کردیا کہ ارادہ میں اگر مضبوطی ہو تو پہاڑ کا سینہ چیر کر بھی دودھ کی نہریں بنائی جاسکتی ہیں۔ طنز و مزاح کی کامیابی اور "شگوفہ" کی ادبی اڑان کو دیکھ کر وہ تمام نام نہاد نقاد شرم سے گردن جھکانے پر مجبور ہوگئے ہیں جو بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ طنز و مزاح تیسرے درجے کا ادب ہے۔ طنز و مزاح کی عالمی کانفرنس کے بعد انہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ کون سا ادب کس درجے پر ہے۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

منظور وقار (گلبرگہ، کرناٹک)

• حالیہ شمارہ جلوہ افروز ہوا۔ نثری و شعری تخلیقات کا مرغوب سنگم ہے۔ میری تمنا و دعا ہے کہ "شگوفہ" کھلتا رہے نئی جہات ملتی رہیں۔

صابر بہاری

• دسمبر کا شگوفہ ملا۔ اس بار مالِ مفت خوب سے خوب تر ہے۔ یہ مال اتنا لذیذ نکلا کہ بنا بھوک کے بھی صفا چٹ کرگیا۔ **مرزا کھونچ، بتیا۔**

• گزشتہ دنوں "شگوفہ" میں جناب صغیر احمد سحر کا مضمون "ادب نواز مرغیاں" مطالعہ میں آیا۔ سحر سندیلوی صاحب داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کی چاشنی سے ثقیل مضمون کو دلچسپ بنایا۔

ضیاء الدین احمد صدیقی (بنارس) ■■

اِداریہ

شگوفہ کا سالنامہ قدرے تاخیر سے لیکن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ حاضرِ خدمت ہے۔ سالنامہ کی فہرست پر آپ نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ ملک کے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات اس شمارہ کی زینت ہیں۔ یہ شمارہ محض سالنامہ ہی نہیں بلکہ عصری طنز و مزاح کا حسین انتخاب بھی ہے۔ اس انتخاب میں طنز و مزاح کے قدیم لکھنے والوں کے ساتھ نو آموز مزاح نگاروں کی قوسِ قزح سجائی گئی ہے۔ ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو شگوفہ کے صفحات پر زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ نئے لکھنے والے توجہ، محنت، خلوص اور لگن کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔ مطالعہ کی کمی، شہرت کی خواہش اور معمولی سی شہرت حاصل ہونے پر، خود کو صفِ اول کا تخلیق کار سمجھ لینے کا رجحان فن میں ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے۔ خاص طور سے مزاحیہ شاعری میں جمود سا پیدا ہوگیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مزاحیہ شعرا موضوعات میں تنوع اور فن میں پختگی پیدا کریں۔ اور اس تاثر کو ختم کریں کہ مزاحیہ شاعری روبہ زوال ہے۔

۱۹۸۶ء کے آغاز کے ساتھ ہی نامور شاعر ہلالؔ رضوی رامپوری اور ممتاز مزاح نگار ارشد علی خاں کے انتقال کی اندوہناک خبریں ملیں۔ ہلالؔ رامپوری عرصۂ دراز سے مزاحیہ مشاعروں کی رونق بنے ہوئے تھے زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعروں کے بھی وہ کامیاب شاعر تھے۔ ارشد علی خاں کی عمر صرف ۴۶ سال تھی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔ ان کی طبیعت میں بڑی بذلہ سنجی تھی۔ فرضی نام سے دو ایک ناولیں بھی لکھے تھے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "شوشے" شائع ہوچکا ہے۔ "شگوفہ" سے ارشد علی خاں کو خاص دلچسپی تھی۔ ان کے انتقال سے دل پہ جو کیفیت گزری، اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔

R No. 15822/68 Vol. 19 Copy 1 Jan. 1986 Postal Regd No H/HD-6
SHUGOOFA Humorous Urdu Monthly
31, Bachelors Quarters, Mozamjahi Market, Hyderabad-500 001. Phone. 557716

FEBRUARY 1986 Rs. 4

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

ماہنامہ
حیدرآباد

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد [۱۹] فروری ۱۹۸۶ء شمارہ [۲]

فی پرچہ : ۴ روپے
زرِ سالانہ : چالیس روپے
بیرونِ ہند سے : ۱۲۵ روپے

کتابت : محمد عبدالرؤف خوشنویس

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان۔ حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ، ۳۱۔ چیمبرز کوارٹرز معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون آفس 557716 فون مکان : 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

مراشہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

عابد معز (حیدرآباد)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہرِ حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

قلتِ آب

سمجھ میں نہیں آتا ہم حیدرآباد کے شہریوں کو نئے سال کی مبارکباد پیش کریں یا پانی کی قلت کا پرسہ دیں۔
ایک صاحب کو ہم نے نئے سال کی مبارک باد دی "نیا سال مبارک ہو! نیا سال آپ کی زندگی میں خوشیاں لائے" یہ سن کر انھوں نے ہمیں نصیحت بلکہ وصیت کرتے ہوئے کہا "میاں لگتا ہے تم گھر کا کام کاج نہیں کرتے، پانی کی تلاش میں گھڑا لے کر گلی گلی بھٹکے ہوتے تو نئے سال کی مبارکباد نہیں دیتے اور اگر دینا ہی تھا تو کہتے نیا سال آپ کے لیے نل کو ہر روز ایک گلاس پانی پلائے۔" اس تجربے کی روشنی میں ہم نے دوسرے صاحب سے کہا "نئے سال کی ابتداء پانی کی قلت سے ہوئی ہے انتہا کیا ہوگی۔ سوچ کر اختلاج ہونے لگتا ہے۔" انہوں نے ہمیں ٹوکا "نئے سال کی ابتداء ہی میں کیوں بدشگونی کرتے ہو۔ چلو میں تمہیں دو گلاس پانی پلاتا ہوں۔" اس کے بعد سے ہم نے چپ سادھ لی کسی نے نئے سال کی مبارکباد دی تو "آپ کو بھی سلامت" کہا اور جب کسی نے پانی کی قلت کا تذکرہ کر کے اشک بہائے تو ہم نے اشک پی لیے مبادا پانی ضائع نہ ہو جائے۔

پٹرول، کیروسین اور بعض دوسری اشیاء بازار سے یکدم غائب ہو جاتی ہیں لیکن پانی کی قلت یوں ہی اچانک شروع نہیں ہوئی۔ شہر میں مانسونی بارش دغا دے گئی۔ دور دراز مقامات سے ندی اور تالوں کی بدولت جو پانی بہہ کر آتا تھا وہ بھی نہیں آیا۔ شہر کے نلوں سے دن میں دو مرتبہ کے بجائے صرف ایک وقت پانی آنے بلکہ رسنے لگا۔ قلتِ آب اور بڑھی تو دو دن میں ایک مرتبہ پانی رسنے لگا۔ ہمارے ایک دوست نے کہا کہ دو دن میں ایک مرتبہ نل سے پانی کشید رہے ہیں مستقبل میں اندازہ ہے کہ یہی کام ہفتہ میں دو مرتبہ اور پھر پندرہ دن میں ایک مرتبہ کرنا پڑے گا۔ دو دن قبل ہم اپنے ایک عزیز کے گھر گئے۔ انہوں نے بتلایا کہ ان کے نل سے کبھی ماضی بعید میں ONCE UPON A TIME پانی آیا تھا۔ اب نل تو صرف شہری آرائش کی زینت بنا اس طرح کھڑا ہے کہ اس کے سائے سے بھی استفادہ ممکن نہیں اور نل پکڑ کر ٹیک بھی نہیں سکتے کہ پانی کی آس میں اس کا قد گھٹتے گھٹتے ٹخنوں کے برابر ہو چکا ہے۔ ہمارے پڑوس کا نل تو "مدفون" بھی ہو چکا۔

اب تک شہری زندگی پانی کی فراہمی کے لیے جن مصیبتوں کا سامنا ہوتا، اس سے نا آشنا تھی۔ گھر بیٹھے نل کھولا کہ پانی آگیا۔ اب ہمیں پتہ چلے گا کہ پانی کیسے آتا ہے کنوئیں سے پانی کیسے سیندھا جاتا ہے۔ پھر پانی کو گھڑوں

میں بھر کر سر یا کمر پر اُٹھائے کیسے ڈھویا جاتا ہے۔ ایسے مناظر ہم نے فلموں میں دیکھے تھے۔ پنگھٹ سے گوری پانی کا گھڑا اٹھائے نزاکت سے اٹھلاتے پانی لا رہی ہے۔ شہری بابو ہیٹ پہنے عکڑی گھمائے مخالف سمت سے چلے آرہے ہیں۔ دونوں کی ٹکر ہوتی ہے۔ گھڑا ٹوٹتا اور دل جڑتے۔ کبھی کبھی دل بھی ٹوٹتے۔ اب ایسے ہی مناظر چند تبدیلیوں کے ساتھ شہر میں نظر آئیں گے۔ گاؤں کی ہری بھری پگڈنڈی کے بجائے شہر کی پکی سڑک ہوگی۔ کسی سے ٹکرانے کے بجائے گڈھے میں گر کر چاروں خانے چت ہوں گے گھڑے کے ساتھ ہڈی بھی ٹوٹے گی۔

آج شہر میں جسے دیکھئے پانی کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہے سڑکوں پر شہری بابو سوٹ بوٹ پہنے سیکل پر بکیٹ لٹکائے اور تھلیا اٹھائے پانی لا رہے ہیں۔ چند دن قبل ہم نے اپنے آفیسر کو بنین اور لنگی پہنے ایک ہاتھ میں بکیٹ اُٹھائے کن کھاتے ہوئے دیکھ کر سلام کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے انھوں نے کبھی دفتر دیر سے آنے کی وجہ نہیں پوچھی۔ وہ ہر ایک کی دیر ماضری کو پانی کی قلت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ گھر کے سارے افراد حسب استطاعت گھڑا، بکیٹ، تھلیا، لوٹا یا گلاس اُٹھائے پانی کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ ہماری بیوی کے جہیز میں جو دیگچوں کا "خاندان" دیا گیا تھا اس کا صحیح مصرف اب ہماری سمجھ میں آیا۔ ہمارے ذمہ پچاس سیر کا دیگ، ہماری بیوی کے حصہ میں تیس سیر کا دیگ اور سب سے چھوٹی لڑکی کا فرض پاؤ سیر کی دیگچی بھر کر پانی لانا ہے۔

پانی کی قلت ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ برسر اقتدار اور اپوزیشن پارٹیاں ایک دوسرے کو پانی کی قلت کا ذمہ دار گرداننے لگی ہیں۔ پانی مہیا کرنا انتخابی مہم کا وعدہ ٹھہرا۔ کسی امیدوار کا انتخابی نشان پانی کا خالی گھڑا ہے تو کسی اور کا بوردیل۔ پانی کی قلت کی طرف توجہ دلانے کے لیے خالی گھڑوں، خالی گلاسوں کے جلوس نکالے جانے لگے ہیں ہر پارٹی پانی مہیا کرنے کے لیے اپنی ایک اسکیم پیش کرتی دور کی کوڑی کی طرح کوئی اس ندی سے تو کوئی اس دریا کا پانی شہر میں بہالانے کا پروگرام بناتا ہے عوام ان کی تقاریر اور پروگرام سننے اور پھر اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی کی تلاش میں نکل پڑتے۔ متوقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سیاسی قائد دوست نے "پانی پارٹی" شروع کرنے کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ آئندہ مانسون تک انشاءاللہ پارٹی تشکیل پا جائے گی۔

سیاسی قائدین جہاں پانی کی قلت کو مسئلہ بنا کر اپنی دُکان چمکانے لگے وہیں دانشور حضرات پانی کا حساب کتاب کرنے لگے۔ ایک فرد کے لیے دن تمام میں تیس گیلن پانی چاہیئے۔ اگر وہ اپنی ضروریات میں کٹوتی کرے تو کم از کم بیس گیلن پانی درکار ہے۔ دانشور حضرات اس مقدار سے کم معین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہم نے کہا بھائی ہماری ضروریات بہت کم ہیں۔ ایک لیٹر پانی پینے کے لیے چاہیئے۔ آدھا لیٹر پانی ہاتھ دھونے کے لیے، پاؤ لیٹر پانی پکوان کے لیے اور ہفتہ میں پانچ تا چھ لیٹر نہانے کے لیے اور کچھ کم اتنی ہی مقدار کپڑے دھونے کے لیے بس اللہ اللہ خیر سلاّ۔ اس لحاظ سے ہمارا "تخمینہ" یومیہ ایک گیلن پانی ہے۔ اس پر دانشور صاحب نے فرمایا ترقی یافتہ ممالک کا ہر فرد یومیہ ہمارے پانی کی مقدار کا پٹرول جلا دیتا ہے۔ اُسے یومیہ چالیس گیلن پانی چاہیئے ہمیں آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی اگر ہم کسی بات کی اہمیت جتانا چاہتے ہیں تو اس کا مقابلہ ترقی یافتہ ممالک سے کیوں کریں؟ ہم اپنی ناسمجھی پر خاموش ہو رہے۔

پانی کی قلت ہو اور صحافت خاموش رہے۔ صحافت میں اتنی قوت ہے کہ وہ رائی کو پربت اور پربت کو رائی بنا سکتی ہے پانی کی قلت کے ساتھ شہر کے اخباروں میں سرخیاں لگیں "پانی کی قلت۔ لوگ خالی گھڑے اٹھائے پانی کی

تلاش میں نکل پڑے" "ہوٹلوں میں پانی سپلائی کرنے کے گلاس چھوٹے ہو گئے" "فلاں محلہ کے شہری پچھلے ماہ سے پانی کی بوند بوند سے محروم" "پانی کے لیے خون بہا" ہوٹلوں میں ہاتھ دھلانے کی بجائے کاغذ کے نیپکن کی فراہمی وغیرہ وغیرہ۔ ہر دن ایک نئی چونکا دینے والی سرخی۔ برسبیل تذکرہ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ اردو اخبارات میں اگر پڑھنے کی کوئی چیز ہوتی ہے تو وہ ہیں سرخیاں۔ ورنہ اردو اخبارات میں فلمی، جنسی قوت کو قوی کرنے، پوشیدہ امراض اور زردہ و قوام کے اشتہارات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اخبارات میں پانی کی قلت کی خبروں کے ساتھ تصاویر بھی شائع ہونے لگیں پانی حاصل کرنے کے لیے عوام اور خالی برتنوں کی قطار، عوام سوکھے ہوئے تالاب اور باؤلیاں کھود دیتے ہوئے، بور ویل سے پانی رستہ ہوا۔

پانی کی قلت سے جہاں ہر کوئی متاثر ہوا، وہیں ادیب اور شاعر اپنا دامن کیسے بچا سکتے تھے۔ پانی کی قلت پر شعر لکھے جانے لگے۔ افسانوں کے پلاٹ الم کے بلکہ تجسس آمیز ہو گئے۔ مزاحیہ ادیب پانی کی قلت کو طنز و مزاح کی عینک لگا کر دیکھنے لگے۔ یوں موضوعاتی ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب پر پھر سے بحث شروع ہو گئی۔ لیکن مباحث مختصر ہونے لگے کیوں کہ بحث میں ہونٹ، منہ اور حلق خشک ہوتے ہیں۔ جنھیں تر کرنے کے لیے پانی چاہیئے۔ اسی لیے ہم پانی کی قلت کے پیش نظر نقادوں کی تنقید کو پانی کا تلخ گھونٹ سمجھ کر پینے لگے ہیں۔

آج کی شہری زندگی "کیو لائف" یعنی قطار کی زندگی ہے۔ عمر عزیز کا ایک "ضخیم" حصہ مختلف قسم کی قطاروں میں ٹھہرتے گزرتا ہے۔ ہر دن راشن، کیروسین، دودھ، تیل اور دوسری چیزوں کے لیے قطار میں کھڑے ہونے کی فہرست میں اب پانی کی قطار کا اضافہ ہوا ہے۔ قطار میں کھڑے ہو کر پانی کی لاری کی آمد یا پھر نل کھلنے کا بے چینی سے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ قطار میں خود کھڑے ہونے کے بجائے برتن کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ برتن کھڑا کرنے سے دوسروں کو پھلانگ کر آگے جانے، ایک دوسرے کو آپس میں رگڑتے اور بحث و مباحثہ بلکہ لڑائی جھگڑا کرنے کی رحمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ پانی کے لیے بھی راشن کارڈ بنوانا پڑے گا۔ دودھ کی طرح پانی بھی لیٹر اور آدھا لیٹر کی پیکیٹوں میں دستیاب ہوگا۔ حکومت تیقن ہے کہ اس کے لیے بھی کوئی کارپوریشن تشکیل دے گی۔

پانی کی قلت زندگی کے ہر شعبہ پر اثرانداز ہوئی ہے۔ دعوت پر گذارش درج ہے" براہ کرم اپنا پانی ساتھ لائیں۔ ہم آپ کے لیے بریانی، بربانی، بگھارے ٹماٹے، مرغ مسلم، سیخ کباب، شیرمال، خوبانی کا میٹھا اور گل فردوس تیار رکھیں گے"۔ ہمارے ایک ساتھی کا اندیشہ ہے کہ پانی کی قلت کا فائدہ اٹھا کر ہوٹل والے پانی جو مفت سربراہ کرتے ہیں اس کی قیمت وصول کرنے لگیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہوٹل کے بل میں پانی کی قیمت بھی شامل ہوگی۔ اس پر بھی سیلس ٹیکس عاید ہوگا۔ جلسے اور میٹنگس میں اعلان کر دیا جائے گا کہ پانی پلانے کی ذمہ داری منتظمین پر عاید نہ ہوگی۔ اشتہارات میں لکھا ہوگا — پچاس روپے کی خریدی پر ایک گلاس، سو روپے کی خریدی پر تین گلاس پانی مفت پیش کیا جائے گا۔

ہمارے شہر میں گنڈی پیٹ کا پانی مشہور ہے جو بھی حیدرآباد آتا ہے اسے گنڈی پیٹ کا پانی راس آجاتا ہے۔ اس پانی سے ہاضمہ ٹھیک رہتا ہے۔ بھوک کھل کر لگتی ہے۔ طبیعت بحال رہتی ہے۔ اب گنڈی پیٹ کا پانی کم سے کم ہوتا جا رہا ہے ہر محلہ اور گلی کا اپنا ایک کنواں ہے۔ جس طرح لوگ مختلف چکیوں کا پسا آٹا کھاتے ہیں

اسی طرح لوگ اب مختلف باؤلیوں کا پانی پینے لگے ہیں۔ کسی محلہ کا پانی کھارا ہے کسی باؤلی کا میٹھا۔ کوئی پانی قبض کشا تو کوئی قبض آور۔ کہیں پانی سے رنگ ماند پڑ رہا ہے تو کہیں حسن میں چار چاند لگ رہے ہیں۔ قابلِ رشک صحت دیکھ کر پوچھا جائے گا، "آپ کہاں کا پانی پیتے اور کس چکی کا پسا آٹا کھاتے ہیں"۔ غرض اب ہمارے شہر میں گنڈی پیٹ کے پانی کے بجائے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا پڑ رہا ہے۔

پانی کی قلت کے کچھ فائدے بھی ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ شہر میں کیچڑ نہ ہوگا۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ ہمارے شہر میں بلدی سہولتیں صرف اور صرف کیچڑ پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ اب پانی کی قلت سے سڑکوں، گلی اور کوچوں میں کیچڑ پیدا نہ ہوگا۔ دھول اور گرد اڑتی رہے گی پانی کی قلت کے پیشِ نظر اب حیدرآبادی امید کرسکتے ہیں کہ گوالے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ گائے اور بھینس کا خالص دودھ بیچیں گے یہ بھی گمان غالب ہے کہ گوالے بہانہ بنائیں گے" صاحب۔ پانی کی قلت سے جانور خود ہی بہت پتلا دودھ دے رہے ہیں"! کبھی کبھار نہانے والے اب دھڑلے سے پانی کی قلت کا عذر کرسکتے ہیں۔ ایک ایسے ہی صاحب نے ہم پر طنز کیا "میاں اب ہر روز پانی کیسے نہاؤ گے۔ ڈرائی کلیننگ کروانی پڑے گی"۔ پانی کی قلت کی وجہ سے تعلیمی ادارے جلد بند کردیئے جائیں گے ہماری لڑکی نے کہا "پاپا ہمیں چھٹیاں مل گئیں۔ پانی پڑتے ہی اسکول پھر سے کھل جائے گا کاش بارش ہی نہ ہوتی!!"

پانی کی قلت کب تک رہے گی؟ اس سوال کا جواب ہم زمین والوں کے پاس نہیں ہے آسمان سے پانی ٹپکے تو ہی پانی کی افراط ہوگی پھر کیوں نہ ہم اوپر والے سے دعا کریں کہ وہ جلد از جلد مینہ برسائے۔
کہئے ـــــ آمین!

مانک ٹالا (بمبئی)

آنکھوں کا مرثیہ

کاش کہ ہمیں شباب کے بدلے موت ہی آگئی ہوتی کہ ہم نے جوانی کے موسم میں کسی ماہ رُخ کا فرادا حسینہ سے آنکھ لڑائی نہ آنکھ بھڑائی۔ گل کھلانا اور کھل کھیلنا تو بہت دُور کی بات تھی، ہم نے تو کبھی اپنی محترمہ کے رُخِ روشن کو بھی نہارنے کی کوشش کی تو نگاہوں کو ڈبل فلٹر سے گزار کر (کہ ہم دونوں ہی چار چشم گل تھے)۔ اس قدر احتیاط اور پیش بندی کے باوجود ہم اپنے خیر خواہوں کی چشمِ بد سے دُور نہ رہ سکے۔ اور ہونی ہو کر رہی۔

یہ بات بھی نہیں کہ ہم نعوذ باللہ جوانی میں زاہد خشک تھے۔ یا مُحرّم کی پیدائش تھے کہ ہمارے دل میں ارمان نہیں مچلتے تھے۔ حسینوں کو دیکھ کر آنکھیں سینکنے اور دل پھینکنے کی تمنا ہمارے بھی دل میں تھی لیکن کیا کریں جان و دل کے ساتھ ساتھ سر جیسی ناکارہ چیز کو بھی عزیز سمجھ بیٹھے تھے۔ دراصل وجہ یہ تھی کہ دھول دھپے اور لپاڈگی کے تصور ہی سے پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔

لیکن ہم اس قدر کاشر بھی نہیں تھے کہ بھری جوانی یوں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے۔ ہم نے تخیل کے سہارے تصور کی دنیا میں بڑی بڑی ماہ جبینوں، سیم تنوں اور شعلہ رخوں سے دھواں دھار عشق لڑائے۔ مرنے مارنے کی دھمکیاں دیں اور مر مٹنے کی قسمیں کھائیں۔ کئی مہربان ہستیاں تو سچ مچ شباب کے نشے میں لڑکھڑاتی، شربتِ دیدار چھلکاتی ہوئی سپنوں کی دنیا میں تشریف لے آتی تھیں۔ اور ہم وصل کی ان گھڑیوں میں وہ وہ ارمان نکالتے کہ توبہ ہی بھلی!

بہر حال یہ تو ہمارے ناکردہ گناہ تھے۔ اور ہم نے سُن رکھا تھا کہ اللہ میاں بڑا رحمٰن الرحیم ہے۔ اس کے ضابطہ فوجداری میں ناکردہ گناہوں کی سزا کی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔ پھر ہم پہ یہ قہر کیسا؟ جب یار باش پچپن ساٹھ کی اُٹھتی جوانی میں بال بچوں کی شادی سے پہلے یا بحالتِ مجبوری اُن کی شادی کے بعد اپنے سر پر ایک اور سہرا باندھنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں، ہمیں اس بھری جوانی میں آنکھوں کی بینائی سے محروم کرنا شروع کر دیا۔ کیا دیدہ وری ہے خدائے ذوالجلال کی!

موتیا کا نام ذہن میں آتے ہی چاروں طرف بھینی بھینی مہک پھیل جاتی ہے آنکھوں میں چمک اور دل میں رومان ہلکورے لینے لگتا ہے لیکن چند سال پہلے جب یہی جانِ بہار ہماری دائیں آنکھ میں نازل ہونا شروع ہوا تو

[illegible] کی روشنی ہی نے وداع لینی شروع کر دی۔

آخر آنکھوں کے ایک ماہر فن سرجن سے رجوع کیا۔ اس نے چیر پھاڑ کر کے ہماری آنکھ کے اندر سے اس ناہنجار کو نکال باہر پھینکا۔ ہماری آنکھ کی مرمت اور مرہم پٹی کر کے ہمیں ایک سیاہ چشمہ دے کر چھ ہفتے کے لیے گھر پہ آرام کرنے کے لیے بٹھادیا۔

سیاہ چشمہ اترا تو ہمارے چاروں طبق روشن ہو اُٹھے۔ ہمیں ایک ایک کے دو دو نظر آنے لگے۔

کون کہتا ہے کہ معجزوں کا زمانہ ختم ہو گیا ہے؟

ہم نے سُن رکھا تھا کہ انتہائی نشے کی حالت میں ایک کے دو دو نظر آتے ہیں۔ ہمارے ڈاکٹر کو بھی یہ گمان گزرا کہ ہم آدھی پونی بوتل چڑھا کر آئے ہیں لیکن جب ہم نے اس کے بنجر سر کی قسم کھائی کہ ہم نے جب سے آپریشن کرایا ہے اس نابکار چیز کو سونگھا تک نہیں تب کہیں جا کر اُسے یقین آیا۔

ڈاکٹر نے بہت جتن کیے لیکن دونوں آنکھیں اپنے اپنے جمہوری حقوق سے دست بردار ہونے کو تیار نہ ہوئیں۔ امپیریلزم اور کمیونزم کے آپسی ٹکراؤ کا تماشہ تو ہم مدت مدید سے دیکھتے چلے آرہے تھے بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتے رہتے تھے۔ لیکن دو متضاد نظریوں کی چپقلش کے معنی اور نتائج سے ہماری ان دو نگوڑی آنکھوں نے پلک جھپکنے میں بہرہ ور کرا دیا۔

ڈاکٹر بھی اپنی سی کر کے آخر تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا "فی الحال ایسے ہی کام چلاؤ۔"

ہم نے پوچھا "بعد میں کیا ہوگا؟"

فرمایا "عادت پڑ جائے گی۔"

عادت تو مجبوراً ڈالنی ہی پڑی لیکن دقت اس بات کی تھی کہ ہماری محترمہ پہلے ہی اکیلی ہمارے لیے بہت کافی تھیں لیکن جب سے اُن کا دو آتشہ دیدار ہونے لگا ہے ہماری ہیبت میں چار گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

آنکھوں کے بارے میں مشہور ہے کہ دونوں سچے معنی میں سگی بہنیں ہوتی ہیں۔ ایک آنکھ کسی تکلیف کے باعث آنسو رولتی ہے تو دوسری بھی یہی تکلیف محسوس کر کے آنسو بہانا شروع کر دیتی ہے۔ لیکن ہماری آنکھیں ایک دوسرے کو EYE TO EYE دیکھنے کو بھی تیار نہیں تھیں۔ بہنوں کی بجائے ایک دوسرے سے سوتنوں کا سا برتاؤ کرنے لگیں۔ لیکن اس ترکِ موالات کے باوجود ہماری بائیں آنکھ نے بھی اپنے آنگن میں موتیے کی سیج سجانی شروع کر دی۔

اب کے ہم نے سب سے بڑے ماہر چشم کی خدمات حاصل کیں۔ نتیجے میں اور بھی بڑے بڑے معجزے رُونما ہونے لگے۔ خیر ان کا ذکر خیر تو بعد میں کریں گے پہلے اپنی حالتِ غیر کی کتھا سناتے چلیں۔

ان نامور ماہر چشم کی خوبی یہ تھی کہ یہ موتیا زدہ لینز [LENSE] نکال کر اس کی جگہ خاص پلاسٹک کا بنا ہوا لینز اسی کی جگہ فٹ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر چھ ہفتے تک سیاہ چشمہ چڑھا کر ہمیں گھر پہ بٹھا دیا گیا۔

ماہرینِ چشم آپریشن کے فوری بعد کالا چشمہ غالباً اس لیے چڑھا دیتے ہیں کہ کم سے کم چھ ہفتے تک تو اُن کی کالی کرتوتوں پر پردہ پڑا رہے۔ اس کے بعد تو بڑے سے بڑے غصیل شخص کا [illegible] پریشر نارمل ہو جاتا ہے۔

چھ ہفتے تک پھر پڑھنے لکھنے کی ممانعت تھی۔ البتہ زبان اور کانوں کے استعمال کی اجازت تھی۔ لیکن زبان

کے استعمال کی اجارہ داری تو ہماری بیگم کے ہاتھوں میں تھی۔ ہم کبھی زبان کھولنے کی ہمت بھی کرتے تو قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی تھی۔ لیکن کانوں کو ان کی مدھر بانی سننے کی تاب ہی کہاں رہ گئی تھی۔؟

چنانچہ پھر سے ایک نیا ٹرانزسٹر خرید کیا گیا۔ کیوں کہ پچھلے آپریشن کے بعد مسلسل چھ ہفتے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام سنتے سنتے بلڈ پریشر اس قدر بڑھ چکا تھا کہ کالا چشمہ اُترتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ ریڈیو کو اُٹھا کر دس مالے کے نیچے پھینک دیا تھا۔

اب پھر سے وودھ بھارتی پر فلمی گانے اور دیگر پروگرام سُننا شروع کر دیئے۔ فلمی گانوں میں ایک پروگرام من چاہے گیتوں کا ہوتا ہے جس میں زیادہ تر ان چاہے گیت سنائے جاتے ہیں۔ ایک اور پروگرام بھی ہوتا ہے جسے کہتے ہیں "آپ کے انُّورودھ پر"۔ "انُّورودھ" کو کافی عرصہ تک نرودھ کی قسم کی کوئی چیز سمجھتے رہے جو کہ خاندانی منصوبہ بندی کے کام آتا ہے۔ سستا اور ٹکاؤ بھی ہوتا ہے۔

یہ لفظ پہلے پہل جب ہم نے سُنا تو اِسے جدید ادب کی طرح ترسیل اور ابلاغ کی سطح سے بہت اُونچا پایا! اس کا مفہوم "نتھ کا بوجھ" بن کر ہمارے ذہن کی نکیل بن کر رہ گیا۔ کافی عرصے کے بعد پتا چلا کہ اس کا مطلب "فرمائش" ہے چنانچہ "آپ کے انُّورودھ" پر کے پروگرام میں فلموں کے فرمائشی نغمے سنائے جاتے ہیں۔ اس پروگرام میں فرمائش کرنے والے حضرات اور محترماؤں کے نام اور شجرے بھی نشر کئے جاتے ہیں تاکہ سند کے طور پر کام آئیں! اکثر اوقات فرمائش کرنے والوں کی فہرست اِس قدر طویل ہوتی ہے کہ وقت ختم ہو جاتا ہے اور گانا اگلے روز سنانا پڑتا ہے۔

ریڈیو پر ایک پروگرام فوجی بھائیو! کا بھی ہوتا ہے جس میں اُن کے پسندیدہ نغمے نشر کئے جاتے ہیں۔ ہمیں اس پروگرام سے کوئی بیر نہیں لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے کہ ریڈیو پر فوجی بہنوں کے لیے پروگرام کیوں نہیں پیش کئے جاتے حالانکہ ہر عورت پیدائشی فیلڈ مارشل ہوتی ہے۔

ایک اور پروگرام ملے جلے گانوں کا ہوتا ہے جس میں فلمی اور غیر فلمی نغمے سنائے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک مشہور فلمی ہستی کا بھی ایک نغمہ سماعت نواز ہوا تھا۔ یہ صاحب نغمہ نگاری سے لیکر ہدایت کاری تک فلم کے ہر شعبے میں منہ مارتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا یہ گیت سُن کر ایسا محسوس ہوا کہ یہ حضرت گیت کار سے زیادہ بلات کار ہیں۔ الفاظ، معنی، موسیقیت، ہر چیز کا زنا بالجبر کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

دوپہر کے بعد جب لوگ آرام فرمانے کی نیت سے ریڈیو کا بٹن بند کر دیتے ہیں تو وودھ بھارتی پر پکے گانوں کا پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ یہ نام فی الواقع اسم بامسمّیٰ ہے۔ انہیں گلے سے نیچے یعنی کانوں کے پردوں کے اندر اتارنا ٹیڑھی کھیر سے کم نہیں تبھی تو پکے راگ سیکھنے والوں کو ایام طفلی ہی سے ان کا ریاض شروع کرا دیا جاتا ہے کہ ٹیڑھی کھیر حلق کے نیچے اترتے اترتے ہی اترتی ہے۔

ہاں تو صاحبو! ہم ذکر کر رہے تھے اِن طوطا چشم آنکھوں کا جو ہماری اِس بھری جوانی میں پر تول رہی ہیں نتیجے میں میری نیّا ڈول رہی ہے۔ لیکن ہمارے غم خوار یعنی ماہرینِ چشم ہماری غم خواری سے زیادہ ہماری خواری میں سعی فرما رہے ہیں۔ اور رگ گل سے بلبل کے پر باندھ رہے ہیں۔

لیجئے اب ہم اُن بڑے بڑے معجزوں کا ذکر فرماتے ہیں جن کے بارے میں ہم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا۔ جب وقت پورا ہوا (ہمارا نہیں بلکہ سیاہ چشمہ لگانے کی عدت کا) تو ہم نے دنیا کو رنگدار شیشوں کے بغیر دیکھنا شروع کر دیا

اور نئے نئے معجزوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔

پہلے آپریشن کے بعد تو ہم صرف دونوں آنکھوں سے الگ الگ دیکھتے تھے۔ لیکن اب صرف بائیں آنکھ سے ہی ہمیں ایک ساتھ تین تین نظر آنے لگے۔ دور سے کسی شخص کو اپنی طرف آتے دیکھتے تو ہمیں ایک ساتھ تین تین شخص ایک دوسرے میں گڈمڈ ایک ساتھ چلے آرہے نظر آتے۔ دور کی روشنیوں کو دیکھتے تو اُن کے پیچھے اُن کی ہمزاد ایک الگ روشنی نظر آتی۔ پورن ماشی کی رات میں اصل چاند کے نیچے ایک اور بجھا بجھا سا چاند نظر آتا۔ اور اصل چاند کی تینوں شخصیتیں" ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں اس طرح استراحت فرماتی نظر آتیں جیسے کسی کنجڑے کے بڑے سے چھابے میں ایک بڑی سی لمبوتری لوکی پڑی ہو۔ اسی چاند کو دوسری آنکھ سے دیکھتے ہیں تو آسمان کی وسعتوں میں ایک بڑا سا بیگن لٹکتا ہوا نظر آتا ہے۔ کاش کہ اس کمر توڑ مہنگائی میں یہ بھرتا بنانے کے کام آسکتا۔

پُورنما کے چاند کو دیکھ کر ہمارے فنکار ذہن میں جو رومانی خیالات جنم لیا کرتے تھے اب اِسے دیکھ کر مطعم اور طعام کا خیال آتا ہے اور ہم کام و دہن کی بھوک مٹانے کے لیے ریستوران کا رُخ کرتے ہیں اور لوکی بھاجی اور بیگن کے بھرتے کا آرڈر صادر فرماتے ہیں۔

ہمارے چارہ ساز نے ہمیں اس آنکھ کے اُوپر لگانے کے لیے ایک CORRECTIVE یعنی اصلاحی نمبر کا لینز LENSE دیا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ ہر گول مٹول چہرہ اب انڈے کی طرح بیضوی لگتا ہے۔ اگر کسی کے سر پہ بال نہ ہوں یعنی پوری طرح سے فارغ البال ہو تو کیا کہنے۔ تین منٹ کا اُبلا ہوا انڈا نظر آتا ہے۔ اُبلے ہوئے انڈے بھی ہماری کمزوری ہیں اس لیے طبیعت مچل مچل اُٹھتی ہے۔

ہماری مخدومہ کی بھدّی سوئی اور چھوٹی چھوٹی انگلیاں جنھیں ہم آج تک اللہ کا عذاب سمجھ کر برداشت کرتے چلے آرہے تھے۔ اب اس چشمے کی بدولت الف لیلوی داستانوں کی معشوقاؤں کی انگلیوں کی طرح مخروطی نظر آنے لگ گئی ہیں۔

ایک روز ہم نے اپنے بھی چہرے کو غور سے آئینے میں دیکھا تو ایسے لگا جیسے آٹھ نمبر کے جُوتے میں دس نمبر کا کلبوت چڑھا دیا گیا ہو۔ سبحان تری قدرت!

بس اب ایک ہی مسئلہ رہ گیا تھا۔ دونوں آنکھوں سے الگ الگ دیکھنے کا۔ اس کے لیے ہمارے ماہر چشم نے چشمے کے داہنی طرف ایک سفید شیشہ لگا دیا۔ کہ ہمیں اس آنکھ سے نظر ہی نہ آئے اور ہم صرف بائیں آنکھ سے دُنیا کی رنگی نیرنگی کو دیکھیں۔ ہم نے پوچھا کہ کیا اب ساری عمر ایک ہی آنکھ سے دیکھنا ہوگا؟ تو فرمایا کہ حرج ہی کیا ہے۔ اللہ میاں بھی تو ساری خدائی کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ تمہاری اس خرابی میں بھی خدائی کی ایک صفت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن خیال رکھنا خدائی کا دعویٰ مت کر بیٹھنا۔ آج کل ہندستان میں بھانت بھانت کے بھگوان پیدا ہونے لگے ہیں۔ لیکن کچھ ایک کو پابہ جولاں کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس لیے محتاط رہنا ورنہ ہم کو دوش نہ دینا کہ آگاہ نہیں کیا تھا۔ اس میں سنگسار ہونے کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

اعجاز وارثی (سنبھلی)

شیروانی کا چکر

بیس سالہ شیروانی جب بوسیدہ ہوگئی!
اس زمانے میں تھا بھرنا جائے مرحوم محال
سوچتا تھا کیوں کر اس ہیئت میں دفتر جاؤں گا
نوکری بے شک تھی سرکاری مگر رشوت نہ تھی
خط کا مضمون جو نہ کر پایا، لفافے نے کیا
شیروانی گرم اک فی الحال بننی چاہئے
کپڑا لے کر قصد سلوانے کا جب کر ہی لیا
قصبہ میں سیتے تو ہیں دو اک مگر اچھی نہیں
اک زمانہ ہو گیا رخصت دلا دے ہو گئے
ہاں مگر سید نگر میں اک بڑے استاد ہیں
آدمی بوڑھے ہیں سینا اب برائے نام ہے
شوق بیحد لے گیا آخر میاں جمن کے پاس
کپڑا رکھ کر سامنے میں نے کیا مطلب بیاں
ہائے کیا دن تھے کہ جمن کا تھا دنیا بھر میں نام
لارڈ بیٹن، ہیلی، پنلتھگو تھے اپنے قدر داں
پہلے پہلے کرتے تھے جب شیروانی زیب تن
بعض بعض انگریز اک پورا پیشارہ لے گئے
آبدیدہ ہو کے فرمایا کہ ماضی خواب تھا
بات کاٹی میں نے اور دہرایا اپنا مدعا
ناپ دیجئے اور اگلے ماہ دس کو آئیے
دیکھی جب استاد جمن کی عنایت کی نظر
مختصر یہ پہنچا دسویں کو جو بعد انتظار
میں نے دسویں کا حوالہ دے کے لوگوں سے کہا
غم زدہ ہمسائے بولے کیسے کرتے کام کاج
پاس ہی گھر تھا چنانچہ پہنچا میں بیوہ کے پاس

جیب، مہنگائی کے صدقے، آبدیدہ ہوگئی
آتا تھا دہ رہ کے لیکن وضعداری کا خیال
کرتہ، پاجامے میں کیسے گھر سے باہر جاؤں گا
کھیلتا لاکھوں میں گویا یہ میری قسمت نہ تھی
فیصلہ یہ جامہ زیبی کے تقاضے نے کیا
اور گھر میں سال بھر تک دال بننی چاہئے
اچھے درزی کا پتا لوگوں سے پوچھا تو کہا
شیروانی سینے والا اب کوئی درزی نہیں
پارسال اللہ دین اللہ کو پیارے ہو گئے
شیروانی کے مصور، بے نیاز داد ہیں
کہہ کے پھر بھی دیکھ لیجے، کیا ہے اپنا کام ہے
شہر کے آخر میں اک کیبن تھا گلی جن کی اساس
چونک کر بولے میاں اس عمر میں تالو کہاں
رہتا تھا خوش پوشوں کا اپنی دکاں پر اژدہام
اور بھی تھے سیکڑوں، کیا کیجئے ان کا بیاں
ہو کے خوش حکام فرماتے تھے جمن ویل ڈن
حد یہ ہے، ہٹلر تو چلتے وقت بارہ لے گئے
کیا خبر تھی وقت کروٹ لینے کو بیتاب تھا
بولے اچھا آپ کا تو کام ہو ہی جائے گا
ہاں مسالے کے لیے کچھ پیشگی دے جائیے
پیشگی دے کر میں خوش خوش واپس آیا اپنے گھر
دیکھتا کیا ہوں کہ کیبن بند ہے مثل مزار
شیروانی دینے کا وعدہ تھا آج استاد کا
آپ کی دسویں ہے اور مرحوم کا دسواں ہے آج
بے سہارا، غم کی ماری بڑھیا بیٹھی تھی اداس

شیروانی کا تقاضا جیسے ہی میں نے کیا
غیر تھے تم لیکن انجانے میں اپنے بن گئے
پیشگی جو دے گئے تھے، رکھ لی اس نے گھر کی لاج
ہائے ناداری نے دُونا کر دیا رنج و محن
بھولنا مت، آتے جاتے رہنا اے بیٹا! ادھر
سر جھکائے چل دیا میں سن کے روداد الم
راز اس افتاد کا جب میں نے افشا کر دیا

سیکڑوں دے کر دعائیں بڑھیا نے رو کر کہا
تم تو اس گھر کے لیے بیٹا فرشتے بن گئے
کر لیا مہنگائی میں بھی مرنے والے کا علاج
بیچ کر کپڑا تمہارا، دے دیا اُن کو کفن
تم نہ پوچھوگے تو کیسے ہوگی بیوہ کی گزر
شیروانی کا بھی غم اور سینے والے کا بھی غم
دوستوں نے ہنستے ہنستے حشر برپا کر دیا

اپنے سر یاروں کے اور الزام لینے پڑ گئے
شیروانی کے عوض لینے کے دینے پڑ گئے

○

اسرار جامعی (پٹنہ)

غلط فہمی

گانجے کا دَم لگا کے قلندر نے یہ کہا
حضرت ابو المزاح! سنیں ایک ماجرا
پوچھا جو ایک شخص کو دیکھا وہ نازنیں
کیا رنگ روپ ہے بھئی واللہ مرحبا
بولا وہ شخص طیش میں آ کر زباں سنبھال
لڑکا ہے وہ تو میرا تو اندھا ہوا ہے کیا
سُن کر یہ ڈانٹ میں نے کہا کیجئے معاف
"فادر" ہیں اس کے آپ یہ مجھ کو پتا نہ تھا
یہ سنتے ہی وہ بولا کہ او! بے حیا خموش!!
"فادر" نہیں "مدر" ہوں میں لڑکے کی سن لیا
فیشن کا حال کیا کہوں اسرار جامعی
اب فرق مرد و زن کا بھی باقی نہیں رہا

مظہر الزّماں خاں (حیدرآباد)

پورے صفر/ پروفیسر

پروفیسر پھوپٹ کی شخصیت کئی حصّوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہر حصّہ اپنی جگہ مکمل تھا۔ اس لیے وہ ہر میدان میں یکتا بلکہ نپختہ تھے جو کچھ وہ کہتے اور کرتے تھے بقول ان کے مکمل و منفرد تھا حالاں کہ چہرے مہرہ سے وہ بے پیر کے اُلّو بلکہ اُلّو کے پٹھے نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود وہ پروفیسر/ پورے صفر تھے۔ ایک ایسے پروفیسر جن کو پیچھے سے دیکھا جائے تو شتر اور آگے سے دیکھا جائے تو کبوتر دکھائی دیتے تھے ـــــ سر پر کیپ گردن کے نیچے سے جھولتی ہوئی شیروانی اور اس کے نیچے پائجامہ جو کبھی چوڑی دار ہوتا تو کبھی ڈھیلا ڈھالا۔ غرض کہ پروفیسر پھوپٹ مکمل، مفصل اور مدلل شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے ہماری ملاقات ہمارے ایک دوست کے توسط سے ہوئی تھی اور اس میں پہلی ہی ملاقات میں پروفیسر/ پورے صفر نے اپنا رنگ (جو پیدرنگ تھا) ہمیں دکھانا شروع کردیا۔ مثلاً وہ بڑے خاکسارانہ انداز میں بولے کہ خادم ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس سی۔ ایم۔ او۔ ایل اور پی ایچ ڈی وغیرہ وغیرہ ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کر چکے تھے یعنی کئی ڈربوں میں مرغیوں سے چونچ لڑا چکے تھے] سیاست، صحافت، اور ادب پر انھیں ملکہ حاصل تھا (بقول لنکے) جب ایک آدمی میں اتنی ساری خوبیاں یکجا ہو جاتی ہیں تو وہ چوں چوں کا مربّہ بن کر رہ جاتا ہے اور یہی حال پروفیسر پھوپٹ/ پورے صفر کا تھا۔ وہ بیک وقت حکیم، ڈاکٹر [وہ ڈاکٹر نہیں جو یونیورسٹی سے چھپکلیاں خرید کر اپنے گھروں کی زینت بناتے ہیں] نجومی، شاعر اور نقاد بلکہ سب کچھ تھے۔ سوائے کچھ بھی نہیں کے اور یہ کچھ بھی نہیں کا پتا ہمیں اسی وقت چلا جب ہم نے ان کا انٹرویو لیا۔ اور اس انٹرویو میں جو کچھ جوابات موصوف نے دیئے وہ اُن کی پوری شخصیت کا آئینہ ہیں ـــــ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ـــــ سب سے پہلا سوال ہم نے ادب سے متعلق کیا۔

جناب آپ کے خیال میں اچھے ادب کی کیا پہچان ہے ـــــ انھوں نے آنکھیں موند کر اپنی سپاٹ چندیا پر ہاتھ گھماتے ہوئے کہا کہ وہ صحت مند، تندرست اور توانا ہے یعنی ڈاہن اے ٹو زیڈ سے بھرپور ہے۔

بہت خوب۔ ہم نے پروفیسر کھوپٹ کا جواب سن کر باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔
آپ کے نزدیک اچھے شعر کی کیا پہچان ہے۔ وہ بولے شعر اتنا حسین ہو کہ پڑھنے کے بعد ہر قاری اُس کا مُنہ چوم لے تو اندر گدگد پیدا ہونے لگے۔ یعنی اُس کے ہونٹ مقطع ہوں اور سینہ مطلع اور پیٹ حاصل غزل شعر۔
سبحان اللہ کیا تعریف ہے ہم نے بے ساختہ داد دیتے ہوئے کہا۔ اچھا اب یہ بتایئے کہ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ بڑے سے مُراد قد سے نہیں بلکہ کلام سے ہے۔ ہم نے وضاحت کی۔
جانتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا۔ کیا آپ مجھے وہ نقاد سمجھ رہے ہیں جو محفلوں میں طوطے بن جاتے ہیں۔ ہم نے کہا بالکل نہیں صاحب۔ ہمیں آپ کی علمیت میں کسی بھی قسم کا شک نہیں ہے دیکھئے آپ نے کسی بھی قسم کے شک کا اظہار بہت غلط کیا ہے۔
وہ کیسے۔ ہم نے حیرت کا اظہار کیا تو وہ بولے۔ یہ جملہ شادی سے پہلے ہونے والا سُسر اِس لڑکے کے لیے تعلق سے کیا کرتا ہے کہ کسی بھی قسم کا شک۔ انہوں نے دوبارہ اس جملہ کو دہرایا اور پھر بولے ہم ہر میدان میں دوڑ چکے ہیں اور کرکٹ میں ہماری ۱۸ سنچریاں جو ہم نے بنائی ہیں۔ وہ ہمارے گھر میں موجود ہیں اور انیسویں سنچری کی تیاری ہے۔ خیر بڑے شاعر کے تعلق سے جواب حاضر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ویسے تو سبھی شاعر اپنی اپنی بولیوں میں اپنی اپنی شاخوں پہ پُھدک رہے ہیں۔ مگر مجھے فصاحت نرگسی بے حد پسند ہے۔
"یہ کون صاحب ہیں۔ ہمارے حیدرآباد کے ہیں یہ دلی، لکھنؤ، کانپور، بمبئی، کہاں کے ؟
پروفیسر لوہے صفر۔ نے حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ اتنے بڑے شاعر سے واقف نہیں ہیں اور پھر انٹرویو لینے چلے ہیں ــــ جناب آج کل فصاحت نرگسی کا طوطی بول رہا ہے۔
بول رہا ہوگا۔ لیکن اپنے دیوان خانے میں۔ ہم نے کہا۔ اس لیے اُن کی آواز ہم تک نہیں پہنچی ــــ وہ بولے جناب اس وقت آپ فصاحت نرگسی سے ہی ہمکلام ہیں۔
"اچھا تو آپ ہی فصاحت نرگسی ہیں جس کا طوطی بول رہا ہے۔ ہم نے موصوف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ہمارے دکن نے بھی کیسے کیسے سورجوں کو پیدا کیا ہے جو صرف رات میں نکلتے ہیں اور دن میں اُن کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔
ابھی آپ نے رات کے سورجوں کو ابھی دیکھا کہاں ہے۔ وہ تو جگہ جگہ سڑکوں پر گھومتے ہوئے آپ کو نظر آئیں گے محفلوں میں ڈاریں گے۔ اور لپٹ جائیں گے۔
ٹھیک کہتے ہیں آپ پروفیسر صاحب۔ ہم نے کہا آج معلوم ہوا کہ آپ لوہے شاعر بھی ہیں اور ہمسر شاعروں کے اس دور میں۔

ہر بانگ دہل۔ پروفیسر لوہے صفر نے کہا۔ ہم نہ صرف شاعر ہیں بلکہ بہترین افسانہ نگار اور اعلیٰ درجہ کے نقاد بھی ہیں۔

ہوں۔ ہم نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ جب افسانہ نگار ہیں تو آپ افسانہ نگار بھی یقیناً ہوں گے البتہ یہ اور بات ہے کہ محفلوں میں صرف اُوٹ پٹانگ اظہار کرتے ہوں گے۔

جی نہیں۔ وہ فوراً بولے فٹ پاتھ نہیں بلکہ قد آور گوئی میں ماہر ہیں۔

بہت خوب بہت خوب۔ آپ سچے بھی ہیں۔ یعنی سچ بھی کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔ بے شک وہ بولے۔

"کتنی خوبیوں کے مالک ہیں آپ۔ ہم نے تعریفی انداز میں کہا۔ اس بات پر اپنی کوئی تازہ اور غیر مطبوعہ نظم یا غزل یا دوہے سنائیے۔ ویسے آپ کا پورا کلام غیر مطبوعہ ہوگا۔ وہ بولے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کے ہم قائل نہیں ہیں کلام اچھا ہے۔ بس اور پھر ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہمارے فن پارے مٹھائیوں، پان وغیرہ کے لیے استعمال کریں یا پھر مائیں انھیں بچوں کے پوتڑوں کے طور پر استعمال کریں۔

صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ ہم نے کہا اب ایک آخری سوال کا جواب دیجیے گا اور شاعری پھر کبھی سنائیے۔

فرمائیے۔ پروفیسر نے کہا۔

جس یونیورسٹی میں آپ پروفیسر ہیں کیا وہاں کے شعر و ادب سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں؟ وہ بولے بہت سے شاعر اور ادیب ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے وہ سب کے سب اسی خاکسار کے شاگرد رشید ہیں کہ تصحیح کا کام یہی خادم کرتا ہے۔ اور انھیں نئے نئے موضوعات بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نیک مشورے بھی۔

مشورے تو آپ سبھوں کو دیتے ہیں۔ ہم نے کہا وہ بولے لیکن کم فہم عمل نہیں کرتے۔

"نادان ہیں۔ آہستہ آہستہ سمجھ جائیں گے۔ ہم نے پروفیسر لور ے صفر صاحب سے کہا آپ کے انٹرویو کا ایک حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ باقی پھر کبھی۔ یہ کہہ کر ہم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا لیکن پروفیسر صاحب نے ایک جھٹکے سے ہمیں دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا ہم نہیں چاہتے کہ آپ ہمارے زرین مشوروں سے محروم رہ جائیں چنانچہ پروفیسر نے جو شروع کیا تو سورج ڈوبا پھر طلوع ہوا۔ پھر ڈوبا پھر طلوع ہوا یعنی کئی بار ڈوبا اور کئی بار طلوع ہوا لیکن پروفیسر صاحب کے مشورے ختم نہ ہوئے۔

□□

منظر دکھائی دیتا ہے

اسمٰعیل ظریفؔ (حیدرآباد)

یہ شاعروں کا جو لشکر دکھائی دیتا ہے
مشاعرے ہی کا چکّر دکھائی دیتا ہے

پڑھا کے پٹی جو لاتا ہے ساتھ لوگوں کو
مشاعرے میں وہ چھت پر دکھائی دیتا ہے

اساتذہ ہیں نہ شاگرد ہے کوئی یارو
اب ہر گلی میں سخنور دکھائی دیتا ہے

جو بھاگ جاتا ہے محفل میں خود سنا کے غزل
وہ خود فریبی کا پیکر دکھائی دیتا ہے

ہمارے چشمہ کا نمبر اُتر گیا شاید
جو پستہ قد بھی تنآور دکھائی دیتا ہے

سکندرآباد کے کٹّہ پہ بیٹھ کر دیکھو
"عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے"

جو کالے دھندے کا ماہر ہے اس زمانے میں
نصیب کا وہ سکندر دکھائی دیتا ہے

جناب شیخ کا گدی نشین بیٹا بھی
شراب خانے میں اکثر دکھائی دیتا ہے

عجیب بال ہیں رنگین پھولدار لباس
پہن کے بیٹا بھی دختر دکھائی دیتا ہے

یہاں کی حوروں پہ دل آگیا ہے زاہد کا
جو اس کے دل میں بھی پکچر دکھائی دیتا ہے

کیا جو شیخ نے باہر سے آکے عقد یہاں
دلہن کے باپ کا نادر دکھائی دیتا ہے

وہ سینما میں کچھ اس طرح بیٹھتے ہیں حضور
کبھی تو پیر کبھی سر دکھائی دیتا ہے

یہ زن مریدی بھی کیا چیز ہے جو اک شوہر
بچارہ بیوی کا نوکر دکھائی دیتا ہے

جو شہر شیر و شکر تھا کسی زمانے میں
وہ شہر شہرِ ستمگر دکھائی دیتا ہے

خراشِ فکرِ سخن میں ہے مبتلا یہ ظریفؔ
مشاعروں میں جو اکثر دکھائی دیتا ہے

شکوہ

ظفرؔ چکدیئوی

ایک بار اک فلم آئی تھی ہمارے شہر میں
جس کا چرچا ہو رہا تھا خوب سارے شہر میں

جب مجھے موقع ملا اور میں گیا اس ہال میں
میری قسمت ہی تھی کھوٹی پڑ گیا جنجال میں

اک نیا شادی شدہ جوڑا تھا اگلی سیٹ پر
ہال کو بھی وہ اندھیرے میں سمجھ بیٹھے تھے گھر

فلم وہ کیا دیکھتے، تھے مست اپنے حال میں
پیار و اُلفت کی نمائش کر رہے تھے ہال میں

چل رہا تھا ان کی باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ
فلم کا اک بول بھی پلّے مرے پڑتا نہ تھا

ان کی ٹر ٹر سے مرا جب ناک میں دم آگیا
مارے جھلّاہٹ کے، میں نے تیز لہجے میں کہا

"اپنی ٹراہٹ سے کمبختوں نے عاجز کر دیا
اب خدا ہی ان سے سمجھے کان سارا پک گیا"

نوجواں نے مڑ کے پوچھا "ہم سے کچھ کہتے ہیں آپ؟"
جھٹ سے میں بولا "نہیں صاحب غلط سمجھے ہیں آپ

شکوہ مجھ کو پردۂ سیمیں کے کرداروں سے ہے
اُن اداکاراؤں سے ہے اُن اداکاروں سے ہے

بکتے جاتے ہیں مسلسل، دم یہ لیتے ہی نہیں
آپ کی دلچسپ باتیں سُننے دیتے ہی نہیں"

ایں ۔ پیدر (حیدرآباد)

ہندی سے ترجمہ: پرمیشور راؤ

ذرا سوچئے کچھ بولنے سے پہلے

واہ جناب کیا لا جواب محاورہ ہے۔ پر مجھے ہمیشہ سے محاورے بنانے والوں سے سخت نفرت رہی ہے۔ کیا سمجھ کر محاورے بناتے ہیں۔ اور کمال تو دیکھئے صاحب کہ سبھی محاورے ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر کوئی عمل نہیں کرتا پر جس کی مثال ہر کوئی دیتا ہے۔ محاوروں کو ہوا میں اچھالنا آدمی کی پرانی کمزوری رہی ہے اور اب تو یہ فیشن بھی ہو گیا ہے۔ یہ محاورہ بھی بہت پرانا ہے۔ "بولنے سے پہلے سوچئے"۔ اسی سے ملتا جلتا ایک اور محاورہ ہے "کودنے سے پہلے دیکھئے" اگر دیکھ کر کودنا چاہے تو آدمی کو دہی نہیں سکتا اور پیچھا کرنے والے اسے دبوچ لیں گے۔ خیر ہم تو صرف سوچنے اور بولنے پر ہی بات کریں گے۔ یہاں پر میں سوچ کر بول رہا ہوں، یا بغیر سوچے بول رہا ہوں، یا بول کر بعد میں سوچوں گا۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں بولوں گا اس کا اندازہ تو آپ ہی سوچ کر لگائیے خیر بات چل رہی ہے "بولنے سے پہلے سوچئے۔"

میرا ایک دوست ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بولنے سے پہلے کیوں سوچنا چاہیئے۔ بھگوان نے ہمیں زبان پہلے دی ہے اس لیے بولتے رہنا چاہیئے۔ اگر سبھی لوگ بولنے سے پہلے سوچنے لگیں گے تو پھر سب لوگ فلاسفر بن جائیں گے۔ اس کے علاوہ سوچنے کے لیے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھلا کرے بھگوان کا کہ اس نے سبھی لوگوں کو زبان تو دی ہے مگر دماغ نہیں دیا۔ بغیر دماغ والا بھی اگر سوچنے لگ جائے تو اسے سر کا درد ہو جائے گا۔ یا پھر اسے پاگل قرار دیا جائے گا کیوں کہ کبھی سوچ کر بھی اس کی زبان سے اوٹ پٹانگ باتیں ہی نکلیں گی۔

مثال کے طور پر۔ ایک بار میں سڑک سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں، میں نے دیکھا کہ بینڈ باجے کے ساتھ کسی شخص کی میت کا جلوس گزر رہا ہے۔ جنازہ کے جلوس میں ہزاروں لوگ شامل تھے۔ میری دلچسپی بڑھی۔ کون مرگیا ہوگا۔ اتنے لوگ اس جنازہ کے جلوس میں شریک ہیں میں نے دکان پر بیٹھے ایک شخص سے اس کے بارے میں پوچھا۔ وہ شخص گمبھیر ہوگیا۔ سوچنے لگا۔ ایک منٹ تک سوچنے کے بعد اس نے کہا کہ جس آدمی کو لوگ کندھوں پر اٹھا کر لے جا رہے ہیں، شاید وہی مرگیا ہوگا۔ کیا جواب ہے، صاحب! اس جواب کا تو جواب ہی نہیں اور یہاں صاحب

یہی تو سوچ کر بولنے کا اثر ہے۔

میرا دوست کہتا ہے کہ عام طور پر سوچ کر بولنے والا آدمی صاف گو نہیں ہوتا۔ آدمی اسی وقت سوچ کر بولتا ہے، جب وہ جواب نہیں جانتا یا اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا ہے، یا پھر وہ لوگوں کو گھمانا چاہتا ہے۔ سوچ کر بولنے والا ہمیشہ لفظوں کے جال میں لوگوں کو پھنسا کر رکھنا چاہتا ہے اسی لیے بڑے بڑے فلسفیوں کی تقاریر سننے کے بعد بھی یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان کی تقاریر کا لب لباب کیا ہے اور وہ سب بولنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں ایسا ہم سمجھتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔ بولنے سے پہلے سوچئے۔ ٹھیک ہے پر سوال یہ ہے کہ کتنا سوچنا چاہیئے۔ وقت کی پابندی نہیں ہے۔ آدمی کے سر میں دماغ ہے کوئی کمپیوٹر نہیں ہے کہ اس پر وقت کی حد مقرر کی جائے۔ ہر آدمی کا دماغ الگ الگ قسم کا ہوتا ہے اول تو یہ کہ کیا اکثر لوگوں کے سر میں دماغ ہے؟ اس کا جواب کوئی سوچ کر ہی دے گا۔ دوسرے جن کے سر میں دماغ ہے وہ کم سوچ کر ہی ٹھیک جواب دے گا اور جن کے سر میں دماغ نہیں، وہ زیادہ وقت تک سوچ کر بھی غلط جواب دے گا۔ جیسے ہمارے سماج میں کئی مسائل پر عرصہ دراز سے بڑی سوچا ہی جارہا ہے پر ان کا ٹھیک حل نہیں مل رہا ہے کیوں کہ سوچنے والے صرف سوچنے میں ہی مشغول ہیں اور ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمیشہ سوچتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ لوگ تو سوچنے کے لیے خاموشی اختیار کرلینے کا عہد ہی کرلیتے ہیں۔ کافی سوچنے کے بعد جب وہ بولتے ہیں تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا بول رہے ہیں مگر ان کے چیلے ان کے خیالات کی توضیح کرتے ہیں اور ان کے چیلے بھی بغیر سوچے ہی توضیح کرتے ہیں یعنی یہ کہ جو آدمی کبھی سوچ کر کچھ بولتا ہے اسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے بغیر سوچے بولنے والوں سے مدد لینی ہوتی ہے اسی طرح فلسفے بنائے گئے ہیں اور اسی طرح ازم کا جنم ہوا ہے۔

ایک اور بات ہے۔ بولنے سے پہلے سوچئے۔ ٹھیک ہے۔ مگر اس قسم کی بات کرنے سے پہلے سوچنا چاہیئے۔ آدمی دن میں کئی قسم کی باتیں کرتا ہے۔ اگر ہر بات کرنے سے پہلے وہ سوچے گا تو چوبیس گھنٹے بھی اس کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کس قسم کی باتیں اور کس سے باتیں کرنے سے پہلے اسے سوچنا چاہیئے اور آیا وہ دن بھر سوچتا ہی رہے گا۔

میرا دوست کہتا ہے کہ بغیر سوچے ہی باتیں کرنے سے طنز و مزاح کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ہماری زندگی میں حاضر جوابی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ آج بھی بیربل اور تنالی رام کرشنا اس لیے مشہور ہیں کہ کبھی وہ اپنے زمانے میں بغیر سوچے فوراً جواب دے دیا کرتے تھے۔ ان کے راجہ انھیں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔ بغیر سوچے بولنے والا آدمی اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی فوری لے سکتا ہے۔ اگر کوئی اس کی بے عزتی کرتا ہے تو وہ فوراً ایسا جواب دیتا ہے کہ بے عزتی کرنے والے کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ روم کا شہنشاہ سیزر ایک روز ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بھکاری سڑک پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے جس کی شکل ہو بہو سیزر جیسی ہے۔ سیزر کو مذاق سوجھا۔ اس نے بھکاری کے قریب جاکر پوچھا کہ "کیا تمہاری ماں تمہارے جنم سے پہلے راج محل میں کام کرتی تھیں" بھکاری نے سیزر کی طرف دیکھا اور فوراً کہا "نہیں مہاراج۔ میرے پتا جی راج محل میں کام کرتے تھے"

ہیرو کا منہ چھوٹا ہوگیا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ پورس نے سکندر کے سوال کا جواب سوچ کر دیا تھا، میرے دوست کا خیال ہے کہ اس نے سوچے بغیر ہی جواب دیا تھا۔ اگر سوچ کر جواب دیتا تو وہ سکندر کی چاپلوسی کرتا اور ایسے سنسار کا عظیم آدمی بتاتا تھا۔ ایسی حالت میں سکندر اس سے کیا برتاؤ کرتا اس کا کوئی پتہ نہیں۔ سکندر اس کے فوری جواب سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسے اس کا راجیہ واپس دے دیا۔

مگر ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں اور اسی کو THEORY OF RELATIVITY کا اصول کہا جاتا ہے میرا ایک اور دوست ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آدمی کو ہر بات کہنے سے پہلے سوچ لینا چاہیئے۔ خاص کر اس وقت جب کوئی اپنی بیوی یا خاوند سے بات کرتا ہے۔ اپنے افسر سے بات کرتا ہے یا پولیس والوں سے بات کرتا ہے۔ اگر یہاں ہم سوچے بغیر بات کریں گے تو اس کے خطرناک انجام ہوسکتے ہیں۔ عدالت میں تو آدمی کو بہت ہی سوچ سمجھ کر باتیں کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ وکیل لوگ ہر بات کا بتنگڑ بنا سکتے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنانا ان کا مہذب پیشہ ہے۔ میرے دوست کا خیال ہے کہ آدمی اشرف المخلوقات صرف اس لیے ہے کہ وہ سوچ سکتا ہے جانور سوچتے ہیں یا نہیں اس بات کا ثبوت نہیں ہے کیوں کہ جانور بولتے نہیں۔ آدمی کے بولنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ عقلمند ہے یا بے وقوف اور اسی لیے یہ محاورہ مقبول ہے کہ SILENCE IS GOLDEN مگر بیوقوت آدمی کو اس بات کا پتہ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بغیر سوچے بولتے ہی رہتا ہے اور اپنی لافانی بے وقوفی کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔

ایک پروفیسر کا کہنا ہے کہ پانچ منٹ تک بولنے کے لیے آدمی کو مسلسل ایک گھنٹہ تک سوچتے رہنا چاہیئے۔ مگر عام آدمی کے پاس سوچنے کے لیے اتنا وقت ہی کہاں ہے۔ البتہ بڑا آدمی بغیر سوچے کچھ بھی کہہ سکتا ہے اور اگر وہ اوٹ پٹانگ بھی بکے تو لوگ اس کی تعریف کے پل باندھتے ہیں۔ مگر چھوٹے آدمی کو تو ہر بات کہنے سے پہلے سوچنا چاہیئے اور پھر سوچ کر ایسی بات کہنی چاہیئے کہ وہ بڑوں کو پسند بھی آئے ورنہ اس کی شامت آجائے گی

بہرحال یہ دونوں حقیقتیں آپ کے سامنے ہیں۔ اس لیے آپ سوچ کر یا بغیر سوچے کہیئے کہ بولنے سے پہلے سوچنا چاہیئے یا نہیں!؟

غزلیں

راز سنتوکھ سری (چنڈی گڑھ)

ہے کیا رنگِ محفل؟ وغیرہ وغیرہ؟
وہی دانت کلکل، وغیرہ وغیرہ!
بگھارا ہے ان کی اداؤں پہ سب کچھ
یہ جانِ حزیں، دل وغیرہ وغیرہ
نہیں پاس کشتی بھی، اب کیا کروگے؟
تمنائے ساحل ..... وغیرہ وغیرہ
شغل ان دنوں کیا حضور آپ کا ہے
وہی کذب و باطل ..... وغیرہ وغیرہ
عبارت ہے کس شے سے یہ زندگانی؟
الم، رنج، مشکل ..... وغیرہ وغیرہ
مراحل بہت طے کئے زندگی میں
ملی پر نہ منزل ..... وغیرہ وغیرہ
ہے سرمایہ کیا آپ کا شیخ صاحب؟
یہ دینی مسائل ـــ وغیرہ وغیرہ!
طویل اتنی مشقِ سخن پہ بھی اے دل!
ہے کیا تیرا حاصل؟ ..."وغیرہ وغیرہ"؟
کہوں "راز" کا حال کیا کھول کر میں
ہے اک مردِ کاہل ..... وغیرہ وغیرہ

عشق ہے رنگین سپنا، عشق ہے اُجلی سی بھور
عشق وہ ساگر ہے جس کا اور ہے کوئی نہ چھور
کر نہیں سکتا ہمارا بال بیکا رقیب
زاغ کے کہنے سے مرتے ہیں کہیں اے یار ڈھور
عشق میں درکار ہے آخر تو فولادی بدن
سب اکھاڑے سے ہیں کیا کرتا ہوں میں دن رات زور
مے کدے میں شیخ جی پکڑے گئے پیتے ہوئے
جب سنا میں نے کہا ہنس کر "یہ ہے چوروں پہ مور"!
وہ مرے آغازِ عرضِ حال پر کہنے لگے
"سُن چکے بک بک کرو نہ اب زیادہ بور"
ان کو چوری کے لیے ظلمت کی حاجت ہے کہاں
روزِ روشن میں چرا لیتے ہیں دل معشوق چور
رابطہ قائم کیا ہے فون پہ از بہرِ دید
ریڈیو پر گا کے اس نے دل لیا میرا بٹور
میرے یہ کہنے پہ کہ "اے ڈارلنگ یو آر سویٹ"
منہ بنایا اور کہا یوں: "اوہ بٹ یو آر سور"!
اے دلِ ناداں! تو خوش تھا ابتدائے عشق میں
اب جو ہے مشکل پڑی کیا مچا رکھا ہے شور؟
"راز" صاحب زخم ہائے دل کو ہیں سہلا رہے
کر رہے ہیں دیکھئے سینے پہ ہلدی کی ٹکور!

غزل

ظفر کمالی (پٹنہ)

چار سو چھایا جہاں میں اب تعصب کا دھواں
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ہم جائیں کہاں!
بوم و کرگس ہو گئے ہیں قابض تو پھر حیرت ہے کیوں
کیا ہوا انجامِ چمن سو یار ہے جب باغباں
ہر برس ہوگی ولادت یہ خدا کی دین ہے
کر رہا ہے تو کرے ناقوں پہ ٹُلکے مہرباں
زندگی بھر دوسروں کے واسطے کھودو کنویں
چیختا کیوں ہے کھڑا ہے تیرے آگے جب کنواں
قوم جاتی ہے جہنم میں تو جائے [illegible]
فاتحہ پڑھ لے سے نکلیں گے وہ حضرت میاں
سنتے ہیں [illegible] نام [illegible] ظفر
[illegible] اگرچہ [illegible] ہے اب [illegible]

غافل انصاری (سنارپوری)

نام کی تبدیلی

نام کی تبدیلی کا سلسلہ روزِ ازل سے جاری ہے۔ تہذیبی اور تمدنی پس منظر میں تراش خراش ہوتی رہتی ہے۔ نام کے پرانے اجزاء ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے رہتے ہیں اور نئے نئے اجزا ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا بھر کے تمام ناموں کی ڈائرکٹری شاید ابھی تک تیار نہ ہوسکی یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کل ناموں کی صحیح تعداد کا علم کسی انسان کو نہیں ہوسکا۔ دنیا کی تمام چیزوں کے نام اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت آدمؑ کو سکھائے ولادِ آدم ان میں سے حصّہ بقدرِ جُثّہ کا مصداق بنتی چلی آرہی ہے۔ نئی نئی تہذیبوں نے سر ابھارا پرانی تہذیبیں تاریخ کے پردوں میں دفن ہوتی گئیں۔ ناموں کی تبدیلی اسی اُتھل پتھل کا نتیجہ ہے۔

بے جان اشیاء ہوں یا ذی روح، ناموں کا دُم چھلا ہر ایک کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی نام سے اس کی پہچان ہوتی ہے۔ ایک ایک چیز کے کئی کئی نام بھی ہوتے ہیں۔ علاقائی بولیوں اور ملک در ملک رائج زبانوں میں ایک ہی چیز کے الگ الگ نام بھی ہوتے ہیں جب کوئی شخص سو پچاس کلومیٹر کی مسافت طے کرتا ہے تو نئی جگہ پر اس کو از سرِ نو نئی چیزوں کے نام ازبر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً یوپی کے الگ الگ علاقوں میں امرود کو امرود، بہی، سپری، وغیرہ ناموں سے جانا جاتا ہے۔ ناموں پر صرف تہذیبی اور سماجی اثرات ہی مرتب نہیں ہوتے بلکہ جغرافیائی، تاریخی، اور علاقائی اثرات بھی نمایاں رہتے ہیں۔

ناموں کی تبدیلی کا سلسلہ یوں تو دبے پاؤں جاری رہتا ہے تاہم بنیادی تبدیلی صدیوں میں رونما ہوپاتی ہے۔ ہمارا یہ خیال ایک قاعدہ کلیہ کے تحت آتا ہے اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہر قاعدہ کلیہ کا استثنیٰ بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے راتوں رات نام بدلتے بھی دیکھتے ہیں۔ ۳۰ اپریل ۱۹۷۹ء کو ہمارے اسٹیشن کا نام نگرا تھا اور یکم مئی ۱۹۷۹ء کو صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو نگرا صفحۂ ہستی سے غائب ہوچکا تھا۔ اس کی جگہ بانکے گنج نمودار نظر آیا۔ ہر چند کہ نگرا اسٹیشن اس وقت کا نام تھا۔ جب ہماری ریلوے لائن روہیل کھنڈ ریلوے (R.K.R) تھی۔ جو ہمارے بچپن کے اوائل میں اودھ ترہٹ ریلوے (O.T.R) اور اب کوئی تیس پینتیس برس سے نارتھ ایسٹرن ریلوے (N.E.R) کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی، لیکن اسٹیشن [illegible] وقت مرتب ہوا جب نگرا اسٹیٹ زوال پذیر ہوگئی اور راجے مہاراجے بے دست و پا [illegible] کبھی طوطی بولتا تھا اب ان کا طوطا

بھی نہیں جھلکتا تھا۔ ٹکٹ کی فروخت کی مجبوری ہے جو اب بھی ٹکرا کے ٹکٹ بیچے جا رہے ہیں۔ ہم نے محض ایک مثال سے بات کی توضیح پیش کی ہے ورنہ ایسی کتنی ہی مثالیں ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں اور ہو سکتا ہے آپ کے بھی ذہن میں اس طرح کی باتیں موجود ہوں۔

کہتے ہیں ناموں کے پیچھے کچھ نہ کچھ وجہ تسمیہ بھی ہوتی ہے۔ ہمیں اس سے صرف چالیس بیالیس فیصدی اتفاق ہے۔ سینٹ پرسینٹ ہرگز نہیں۔ کیوں کہ تحقیق ایسی کتنی ہی وجوہات کو مسترد کرتی رہتی ہے۔ تاریخ کا محقق کبھی تاج محل کو کسی ہندو راجہ کا محل ثابت کر دیتا ہے کبھی قطب مینار کی اونچائی پر اس کی ذہنی پستی چڑھ دوڑتی ہے۔

دو ہی چار روز ہوئے ہوں گے ہمارے ایک بھائی صاحب نے ہم سے فاؤنٹین پین کے معنی دریافت کئے۔ دراصل پین کے لفظ سے وہ غیر انگریزی داں ہوتے ہوئے بھی واقف تھے، صرف فاؤنٹین کے معنی جاننے کا اشتیاق تھا انہیں۔ ہم نے بڑی سادگی سے فاؤنٹین کے معنی جھرنا بتا دیئے۔ بھائی صاحب نے کوئی لون سکنڈرا تسبہ فرمایا پھر بولے۔ ایں 'یہ کیا' جھرنا اور اس قلم میں کوئی بھی تو وجہ تسمیہ نہیں۔ جھرنا از خود بہتا ہے جب کہ ہمیں قلم میں ہر تیسرے چوتھے روشنائی بھرنے کی ضرورت در پیش آتی ہے اور بچوں کو تو ایک ہی دن میں کئی کئی بار پین بھرنے کی نوبت آتی ہے۔ اس لیے فاؤنٹین پین جھرنے سے مشابہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں حیرت سے ان کا منہ تکتا رہ گیا اس لیے کہ اتنی باریکی سے اس لفظ کے معنی پر کبھی غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ناموں کا تعلق اور ان کی تبدیلیٔ شکل کا انحصار تہذیب و تمدن کے سر ہے۔ کسی بھی نام کی تبدیلی اول اول کانوں کو نامانوس سی لگتی ہے۔ لیکن گھسنے گھسنے وہی نام جب کانوں سے مانوس ہونے لگتا ہے تو تبدیلی کا سلسلہ شروع ہو چکا ہوتا ہے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے یا ایجاد ضرورت کی خالہ۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہم تو اب تک یہی پڑھتے اور سنتے آئے ہیں کہ جسے آپ لکھنؤ کہتے ہیں۔ وہی اترپردیش کی راجدھانی والا لکھنؤ۔ جہاں کے وزیر اعلیٰ سیلاب میں بھر کر دلی پہنچ جایا کرتے ہیں، وہی نزاکت و نفاست کا گہوارہ 'پہلے آپ' 'پہلے آپ' کے تکلف والا لکھنؤ۔ بھئی جس کی لکھنؤیت نے اردو کا دبستان شاعری قائم کر کے لوگوں سے منوا لیا۔ یہی لکھنؤ کبھی لکشمن پوری ہوا کرتا تھا۔ ضرور رہا ہوگا صاحب۔ جدید تاریخ میں اس سے زیادہ تو کچھ ملتا نہیں کہ رام چندر جی کے بن باس کے وقت، اپنی بھابی سیتا جی کی ہمراہی میں لکشمن جی نے بھی محل کی آرام و آسائش کا تیاگ کر دیا اور کند مول بھوگ کرنے ایودھیا سے نکل کھڑے ہوئے۔ رام، لکشمن اور سیتا نے اس سرزمین کو روندا۔ جو جتنا انہیں ایودھیا سے سی آف کرنے نکلی تھی، اسے اس شہر میں آباد کر دیا۔ لکشمن جی کے نام پر اس کا نام لکشمن پوری رکھ دیا گیا۔ جب یہ سہ رکنی قافلہ ہمارے ضلع لکھیم پور کھیری کی طرف بڑھا تو لکھنؤ سے یعنی لکشمن پوری سے باون میل کی دوری پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں تک جو جنتا عقیدت کا اظہار کرنے آ گئی تھی، اس سے سیتا پور آباد کیا گیا۔ تیسرا پڑاؤ بریلی سے بھی آگے جس شہر میں ہوا، اسے رام چندر جی کے نام پر "رام پور" کا نام دیا گیا۔ لکشمن جی اور سیتا جی میں جو دیور بھابی کا ایک رشتہ قائم تھا، آج تک اس کے نشانات رام پور میں پائے جاتے ہیں، چاہیں تو آپ ۱۹۸۵ء کے پارلیامنٹری الیکشن کے امیدواروں کی فہرست ملاحظہ فرمائیں، رام پور میں دیور بھابی ایم پی کے ٹکٹ پر الیکشن میں کھڑے ہوئے نظر آئیں گے کچھ بھی سہی، اس سفر سے ایک بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ دشرتھ جی کے فرمانبردار ہو بیٹوں کا یہ سفر ایودھیا سے

دہلی کی طرف ہوا ۔ حالاں کہ اس دَور میں دہلی میں اُلّو ہی بول رہے ہوں گے خیر جو کچھ بھی ہو، کہاں تک کوئی قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔

نام کی تبدیلی کے بارے میں میرا یہ شک یقین کی حد تک پختہ ہو چلا ہے کہ تبدیلی ہمیشہ دُم کی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت ڈیارون کے بندر کی دُم ہی پہلے غائب ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اب کلجگ کے بندروں کی دُم غائب ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی گھسائی کا بھی ثبوت نہیں ملتا۔ ڈارون صاحب اگر دھوکے سے اس دَور میں پھر سے جنم لیں تو شاید انھیں خود اپنی تھیوری پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔

لکشمن پوری کے لام اور کاف ابھی تک اپنی پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ اگر تبدیلی کا سلسلہ دُم کی جانب سے شروع نہ ہوتا تو اشتراک الفاظ آج نمودار نہ ہوتا۔ یہ تو کوئی سر پھرا ہی بتا سکتا ہے کہ چھوٹی لے کو غائب ہونے میں کتنے برس لگے اور لے، واؤ، پے کو کنارہ کشی میں کتنی مدت تک مجاہدہ کرنا پڑا یا یہ کہ نون، میم، شین کو چولا بدلنے میں کتنے یگ بیتے ؟ ان ساری معلومات کا تعلق براہ راست ریاضی سے ہے اور جدید ریاضی میں راقم الحروف کی معلومات بالکل سطحی ہیں۔

ابھی گزشتہ ہفتہ گورکھپور جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک محلہ کی تلاش کا موضوع گرما گرم بحث سے چند قدم آگے بڑھ کر جھڑپ کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک صاحب رکشہ والے سے یہ فرما رہے تھے کہ چار گھنٹے سے چکر لگوا رہا ہے ابھی تک تجھے شیش پور ( ) نہ ملا۔ رکشہ والا بالکل بقول تقلم خود اعتراف کر رہا تھا کہ عمر کا تین چوتھائی اسی شہر میں گزارا سارا شہر متعدد بار قدموں کے نیچے سے نکال دیا۔ وہ پچیس تیس سال سے صرف اسی شہر اور اسی پیشے میں ہے لیکن کبھی شیش پور کا نام نہیں سُنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ صاحب اس شہر میں اس نام کا کوئی محلہ ہی نہیں ہے۔ صاحبزادے انٹرویو لیٹر ہاتھ میں تھامے دہاڑ رہے تھے ہم تیری زبانی بات کا اعتبار کریں یا اس نوکری نامہ کی تحریری عبارت کا۔ کچھ بے فکرے تماش بین مجمع لگائے اس گرما گرم بحث کا لطف اٹھا رہے تھے۔ سب حیرت و شش و پنج میں گھرے بالکل کاٹھ کا اُلّو بنے ہوئے تھے۔ انٹرویو شروع ہونے میں کوئی آدھا گھنٹہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ گھٹتے ہوئے وقت کے تناسب سے اُمیدوار کی سراسیمگی اور چیخ پکار بڑھ رہی تھی۔ گورکھپور آکر بغیر انٹرویو دیئے واپس ہونے کی خفت نے اس میں اور بھی اضافہ کر رکھا تھا۔ سردی کے موسم میں وہ پسینہ سے تربتر ہو رہا تھا۔ ہر آنے جانے والے سے اپنا دکھڑا روتا۔ "مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور" کا مصداق بنا ہوا تھا۔ اس حیرانی کے عالم میں اُمید کی ایک کرن پھوٹی۔ ایک پنڈت جی کا نزول ہوا۔ انھوں نے بھی اس مایوس مورت کو دیکھا۔ چاہا کہ آگے بڑھ جائیں۔ لیکن موصوف کے پیروں کو اخلاق کی بیڑیوں نے جکڑ لیا۔ امیدوار کی مترحم آواز سن کر ٹھٹھک گئے۔ سکوت ٹوٹا۔ گویائی مچلی۔ بولے "نہ جانے آپ لوگ کیا پڑھ کر آتے ہیں۔ بینک کی نوکری تلاش کرنے نکلے ہیں ایک محلہ تک تلاش نہ کر سکے"! برخوردار ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح سر جھکائے پنڈت جی کی کتھا سُن رہے تھے۔ بار بار کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے۔ معذرت کر کے محلہ پوچھ لینے کی طاقت ان میں نہ تھی۔ اتنی سے اُوب رہے تھے پر کر ہی کیا سکتے تھے اپنے آپ جو ٹوکا تھا۔ پنڈت جی بھی کئی دنوں سے ادھار کھائے بیٹھے تھے آج ہی تقریر پوری کر ڈالنا چاہتے تھے۔ فرمانے لگے "اگر کبھی پڑھ لکھ کر اتنی بھی تمیز نہ آئی کہ

شیش پور تلاش کرسکیں تو نوکری کیا خاک کریں گے۔ اگر شیش پور نہیں ملتا تھا تو اس سے ملتے جلتے نام کے محلہ شیخ پور میں دفتر تلاش کرتے۔" انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بھائی ہمارے "بدھی سدھار سنگھٹن" نے گورکھپور کے کئی محلوں کے ناموں میں کچھ ملتی جلتی تبدیلیاں کی ہیں۔ پہچان کے لیے نام کا پہلا حرف جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ تاکہ باہر سے آنے والے بھٹکنے نہ پائیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ آپ ایسے پڑھے لکھے پر بالکل زور ہی نہیں ڈالا ورنہ یہ معمہ حل ہوگیا ہوتا۔" فرمایا یہاں کوئی تنہا شیخ پور ہی شیش پور نہیں بنا۔ اگر آپ آریہ نگر جانے کا قصد فرمائیں تو اس کے مسلمانی نام علی نگر کے لیے رکشہ کہیں۔ میاں بازار کو ہم نے مایا بازار کردیا ہے۔ ہم تو گورکھپور کو بھی گئو رکھپور کرنا چاہتے تھے لیکن منشی پریم چند نے گودان کا خود اردو روپانتر گئو دان کردیا تھا۔ اس لیے ہم اس تبدیلی سے جھجک اٹھے کہ کہیں ہندی کرن کی دھن میں اردو کرن نہ ہوجائے۔

صاحبزادے نے قدم سرکانے کا ارادہ کیا کہ پنڈت جی کی گرجدار آواز نے ان کے پیروں میں بریک لگادیے۔ بولے "اپنے اسی شہر میں ایک اردو بازار ہوا کرتا تھا۔ اس کے نام میں مُول بھوت پری ورتن کرکے اسے اب ہندی بازار کردیا گیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس بازار میں اب بھی اردو کتب فروش ہی زیادہ ہیں لیکن میونسپل بورڈ میں اس کے ممبروں کی تعداد کم ہے۔ اردو بازار تو دہلی میں ایک ہے ہی۔ بے جا تکرار سے کیا حاصل۔ پھر راشٹر بھاشا کے نام ملک میں کسی بازار کا نہ ہونا بھی شرم کی بات تھی۔ کلنک کا ٹیکہ تھا۔ یہ ساری باتیں جان لینا اس شہر میں خاص طور سے ضروری ہے۔ ممکن ہے انٹرویو میں اس طرح کے سوالات آپ سے پوچھ لیے جائیں۔" پنڈت جی نے کہا، پچھلے برس میونسپل بورڈ کے الیکشن میں ہم نے ان بدلے ہوئے ناموں کو پاس کرانے کے لیے تجویز پیش کی تھی، لیکن وہ دس کے مقابلہ پندرہ سے پراجت ہوگئی۔ ہم لوگوں نے سنجے گاندھی کے پانچ سُوتری پروگرام میں پرلوار نیوجن پر عمل درآمد بالکل بند کردیا ہے تاکہ اگلے الیکشن میں ہمیں پراجے کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ جب ہمارا پرستاؤ سویکار ہوجائے گا تو سڑکوں پر نئے ناموں کے بورڈ لگیں گے۔ باہر سے آنے جانے والوں کو دشواری نہیں ہوگی اور رکشہ والوں کو مصیبت کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔

صاحبزادے موصوف کی حالت زار دیکھ کر مجھے اپنا بائیس (۲۲) برس پرانا واقعہ یاد آگیا جب میں لکھنؤ میں رانا پرتاپ مارگ کی تلاش میں چار مرتبہ اسی جگہ سے گزر گیا جہاں مجھے جانا تھا۔ پانچویں بار جب لوٹتے ہوئے اُلٹے بورڈ کی عبارت پر نظر پڑی اور رکشہ والے سے میں نے وہاں اتار دینے کے لیے کہا تو اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "چلے آتے ہیں بڑے دیہاتی نہ جانے کہاں سے؟ کلائیو روڈ کو رانا پرتاپ مارگ بتاتے شرم نہیں آتی۔ آدھے شہر کا چکر لگوا دیا اور کرایہ دیں گے بارہ آنے۔ اب آپ ہی سوچیے مجھے اس روز کتنی خفت اٹھانی پڑی ہوگی جس روز ناموں کے بھارتیہ کرن کی تحریک نے خود مجھے مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ؎

مجید جمال
(اورنگ آباد)

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

ہمارے دوست ماسٹر صاحب کا پیشۂ آباد و اجداد پشتوں سے معلمی ہے. طالب علم محبت سے انھیں مار صاحب کہتے ہیں. ہمارے دوستوں میں اس عہدہ اور عقیدت سے زیادہ ترقی کوئی نہیں کر سکا مار صاحب نے خود ایک مرتبہ اپنے آپ کو ہیڈ ماسٹر بننے سے صاف بچا لیا. وہ ایسے سایہ میں بیٹھنا قطعی پسند نہیں کرتے جہاں سے اُٹھا دیئے جانے کا ڈر ہو. معطل ہونے کے تمام امکانات پر مہر لگا کر عزیزوں اور انتظامیہ کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا. مسکرا کر کہتے. ماسٹری سے معطل کریں تو جانوں. میانہ روی اور رواداری کا سبق پڑھاتے پڑھاتے توکل پر عمل پیرا ہو گئے. اور ترقی سے منہ چھپائے پھرتے. ان کی خود فہمی اور ایثار کی بناء پر ان کا اسکول دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا.

بچپن ہی سے ہم دونوں کو سماج سیوا کا بہت شوق ہے. سچ کہتے ہیں کہ جھوٹ کی طاقت نہیں. ہمیں ہوسٹل میں اگر لائٹ چلی جاتی تو ہم لائٹ درست کرنے والوں کے ساتھ آخر تک رہتے روشنی بحال ہونے کے بعد بھی کتابوں کو ہاتھ نہ لگاتے. تمام طالب علم موم بتی کی روشنی میں آنکھیں خراب کرتے ہم خدمت خلق سے اپنا ضمیر روشن کرتے ہم نے کبھی اپنے منافع اور دوسروں کے گھاٹے کی پرواہ نہ کی. سماجی خدمات اور دُعاؤں کے سہارے ہم پاس بھی ہو گئے. مار صاحب تو خیر سے ماسٹر صاحب بن گئے ہم سے اتنا بھی نہ ہو سکا. ہماری مثال بیل گاڑی کے سایہ میں چلنے والے کتے کی سی تھی. جو بڑی خوش اسلوبی سے بیل گاڑی کا سارا بوجھ اپنے دماغ پر لے کر چلتا ہے. وقتاً فوقتاً رک کر دم لیتے بیل گاڑی کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر دھوپ کی شدت سے محفوظ رہنے کے لیے پھر بیل گاڑی کے سائے میں اپنے فرائض منصبی پر فائز ہو جاتے.

مار صاحب سماج سیوا کے بوجھ تلے دبے رہتے. جس کی وجہ سے اُن کا قد مختصر اور عادتیں مفصل ہو گئیں وہ ذہنی اور جسمانی طور پر صفر صفت کے مالک تھے اگر ایک کے ساتھ لگ جاتے تو دس بنا دیتے اور دو کے بیچ ایک سو ایک. اپنی صفر توانائی کو بڑی مستقل مزاجی اور احتیاط سے خرچ کرتے طرف داری کے الزام سے بچنے کے لیے دوستوں کو دور رکھتے دشمنوں کو گلے لگاتے نڈر آدمی تھے دوستوں کا نقصان کرتے دشمنوں سے نقصان اٹھا

مار صاحب عالی بے علم تھے سبھی سے میل ملاپ تھا مگر اسی احتیاط سے کہ ان ملاقاتوں کا فائدہ کسی کو نہیں ہوتا سوائے ان کے اپنے وقت کے، کسی کا نقصان بھی نہیں ہوتا سیٹھ آٹا ؤلاد والا کی دکان پر بیٹھتے اور رہنمائے تجارت مترجم پڑھ کر سناتے سیٹھ جی کے مشوروں سے طالب علموں کی شرارت کا سد باب کرتے۔ منسٹر صاحب کو جدید تعلیم اور طالب علموں کو علمی سیاست کے رموز سمجھاتے۔ مار صاحب کا مسئلہ تو ان لوگوں سے بھی ٹیڑھا تھا جن کے بارے میں حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ نے فرمایا تھا۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ ؛ رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

وہ قوم، حاکم، لیڈر کی تو چھوڑ یئے۔ ڈنر کی بھی پرواہ نہیں کرتے ہر وقت خود کا آرام حرام کئے رہتے۔ مار صاحب شریف آدمی ہیں لیکن دوسروں کی شرافت دیکھتے ہی شرارت پہ اتر آتے (ان لوگوں سے بہرحال اچھے ہیں جو اپنی غنڈہ گردی کے علاوہ کسی اور کی غنڈہ گردی کو ملک کے لیے مہلک سمجھتے ہیں) مار صاحب تو سارے جہاں کا درد خود پر طاری کئے رہتے لیکن اُن لوگوں سے یقیناً اچھے ہیں جو اپنے ذاتی غموں کو اس خوبصورتی سے سارے جہاں کا درد بنا دیتے ہیں کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے۔ رہا مار صاحب کا معاملہ تو وہ اصل اور نقل دونوں سے پرہیز کرتے ہیں

مار صاحب کی درد مندی کا ایک واقعہ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مار صاحب کے پڑوس میں ایک دوشیزہ کا انتقال ہو گیا۔ مار صاحب نے اس صدمہ کو دردِ جگر بنا لیا۔ بس یار لوگ لے اُڑے مار صاحب کا کردار تو مشکوک ہو ہی گیا بیچاری مرحومہ بھی لپیٹ میں آ گئی۔ درحقیقت دونوں ہی معصوم تھے مرحومہ اپنی عمر اور مار صاحب محبت طفلانہ کے طفیل۔

مار صاحب کو محبوبہ تو میسّر نہ ہوئی منکوحہ کے ساتھ اُنھوں نے وہی سلوک کیا جو فیض احمد فیض نے محبوبہ کے ساتھ روا رکھا۔ "راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا"

مار صاحب مذہب سے محبت اور مولویوں سے نفرت کرتے تھے انھیں سے مروی ہے کہ ایک مولانا خود کی دنیا اور لوگوں کی آخرت کی فکر میں اپنی ذات سے غافل ہو گئے نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا لوگ تو رند کے رند رہے مولانا کے ہاتھ جو جنت رضوان کی غلطی سے آنے والی تھی وہ بھی گئی۔ مار صاحب ایک دوست کے یہاں شادی میں بطور مدد ایک بہت بڑی کڑھائی کو منتقل کرنے لگے دیکھنے والوں نے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ مار صاحب بے صفر کڑھائی میں منتقل ہو گئے ان کا سر ہی نہیں سراپا کڑھائی میں تھا بڑی مشکل سے انھیں دوبارہ دریافت کرنا پڑا۔ ایک صاحب سڑک پر سگریٹ پی رہے تھے۔ مار صاحب نے شدومد سے پہنچ گئے انھیں مشورہ دینے۔ "جناب اگر آپ سگریٹ پینا چھوڑ دیں تو آپ کی صحت اور مالی حالت سدھر سکتی ہے آپ اس خوبصورت مکان کے مالک بن سکتے ہیں"۔ سگریٹ پینے والے نے مسکرا کر کہا "یہ مکان میرا ہی ہے"۔

"تو تو ٹھیک ہے ایک سگریٹ ہمیں بھی پلایئے" مار صاحب نے لقمہ دیا۔

ہماری طرح کے ایک صاحب گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا سماج کی برائیاں دور کرنا چاہتا ہوں کوئی راستہ بتایئے۔ گاندھی جی نے برجستہ جواب دیا "برخوردار پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کر لو۔ ملک میں ایک بدمعاش خود بخود کم ہو جائے گا"۔

سارے جہاں کے درد میں مار صاحب نے مقاماتِ آہ و فغاں کا تعین بھی کر رکھا تھا۔ ان ہی کی تماشش کے

دو تین آدمی روز ملتے ۔ عزیز و اقارب اور برادری کے سماجی کارکنوں کو ساری دنیا کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہراتے ۔ تمرتی کا سہرا البتہ اجنبی لوگوں کے سر باندھ دیتے ساتھ رہتے تو سماجیات پر بات کرتے الگ الگ ذاتیات پر ۔ ماسٹر صاحب تمام نائداد نصاب (انگریزی کا EXTRA CURRICULAR) مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد کبھی کبھار پڑھا بھی دیا کرتے تھے ۔ وہ زمانے کہ جب تعلیم کا مقصد امتحان پاس کرنا ہے تو ساری محنت امتحان کے زمانے ہی میں کرنی چاہیئے ۔ اس محنت میں طالب علموں کی بجائے ان کے سرپرستوں کو ذمہ داری عطا کرتے (والدین بھی تو کچھ بھگتیں) جو سرپرست نمبر بڑھوانے کے لیے آتے انھیں گھنٹوں گھر کے سامنے سجا کر رکھتے ۔ یہ موقع سال میں دو مرتبہ آتا اہلِ محلہ اندازہ لگا لیتے کہ امتحانات ختم ہو چکے ہیں چھٹیاں شروع ہو گئی ہیں ۔ اُن کے طالب علم انھیں پہ پڑے ہیں کہ کبھی کبھار پڑھ لیتے ہیں ۔

ہم اور ماسٹر صاحب تو سماج سیوا کا کام فرداً فرداً ہی کرتے رہے ۔ اب یہ کام با جماعت ہونے لگا ہے ۔ چندہ تک لوگ ٹیم اور ٹولی بنا کر مانگنے نکلتے ہیں ۔ (تاکہ کوئی بچنے نہ پائے) اس سلسلے میں ہمارے ایک دوست نے تو کمال ہی کر دیا ۔ یہ سب جگہ قسمت آزمائی کرنے کے بعد وکیل بن گئے ۔ وکالت میں مکمل ناکامی اور بے گناہوں کو سزا دلانے کے بعد چندہ مانگنے والی ٹیم کے ساتھ یوں آنے لگے جیسے عدالت کا بے لیف کارندوں کے ساتھ ڈگری کی تعمیل کرانے آتا ہے ۔ اگر کوئی چندہ دینے سے انکار کرتا تو اسے خدا کی شان میں گستاخی قرار دیتے ۔ عذابِ الٰہی کی بجائے حقہ پانی بند کرنے کی سزا تجویز فرماتے ۔ حق اللہ پر عمل کرنے حقوق العباد سے کتراتے ۔ اپنی دریا دلی کی داستان سُنا کر جب جس سے جو چیز چاہتے حاصل کر لیتے ۔ پڑوسیوں سے اپنے پورے حقوق ادا کرواتے اپنے غموں میں سب کو برابر کا شریک رکھتے ۔ پڑوسیوں کی خوشی میں برابر کے شریک رہتے اس طرح کا کارِ خیر اور سارے جہاں کا درد جگر میں رکھ کر وکیل صاحب نے اپنے لیے حل اور دوسروں کیلئے مسائل کھڑے کر دیئے تھے ۔ ہمیں تو لیجئے اُن کی آمدنی کے سامنے ہمیں ہمارا رزقِ حلال ہیچ معلوم ہونے لگا تھا ۔ (اس دور میں تجارت سے روپیہ کمانا بھی کوئی عزت کی بات ہے ؟) اس طرح کی آمدنی کو محکمہ انکم ٹیکس اور سماج بُری نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ (رزقِ حلال کو اللہ انکم ٹیکس اور نظر بد سے بچائے آمین)

روپیوں کی ریل پیل بڑھتے ہی وکیل صاحب نے ٹکسالی انداز گفتگو اختیار کر لیا ان کے مکالمات بعض بعض بولنے لگے ۔ کوئی وقت پوچھے تو فرماتے "پانچ بج کر پچاس روپے پچپن پیسے ۔ پوچھا دلی کتنی دور ہے ارشاد ہوا "سترہ سو روپے بذریعہ ہوائی جہاز"

وکیل صاحب کو کیوں الزام دیں ایک مرتبہ چندہ مانگنے والی ٹولی نے ہمیں اپنا سرغنہ بنا لیا ۔ ہم جہاں جہاں چندہ مانگنے گئے ۔ لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی اپنی اپنی رسیدیں پھاڑ کر ہاتھوں ہاتھ ہم سے حسبِ حیثیت چندہ وصول کر لیا (چندہ ہمارا حیثیت ان کی) اور ہمیں ثوابِ دارین حاصل کرنے کا موقع عطا فرمایا ۔ ہم نے لاکھ احتجاج کیا کہ ہم چندہ جمع کرنے آئے ہیں جمع کراتے نہیں ۔ کسی نے ہماری ایک نہ سُنی ۔ ہمارے بے حد اصرار پر کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ رعایتی سلوک کیا یعنی جتنا چندہ ہم سے لیا تھا اس سے کچھ کم ہمیں بھی مرحمت فرما دیا ۔ کچھ شرفا نے ہم سے چندہ بالکل نہیں لیا اور نہ ہی دیا جس کی معقول وجہ یہ بتائی کہ وہ خود خیراتی ادارے چلاتے ہیں اور گھر کی دلہار گھر ہی میں کرا لیتے ہیں ۔ اس کامیاب چندہ مہم کے بعد ماسٹر صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ جب کبھی چندہ جمع

کرنے کی خواہش ہو۔ تمام صاحب حیثیت لوگوں کے نام چندہ کی رسیدیں پھاڑ کر، اپنی جیب سے روپیہ جمع کر لیا کرو۔ پھر فون پر اُن سب کو مطلع کرو کہ وہ بھی اُن کی جیب سے روپیہ جمع کر کے تمہارے نام اُن کے اپنے اداروں میں مساوی رقم جمع کریں۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے اس طرح ہم مساوی چندہ لینے دینے میں کامیاب ہوئے آنے جانے کا خرچ اور وقت بھی بچا جو لوگ چندہ دینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے اپنے ادارے کھول چکے ہیں۔ ہمیں تو صرف اس بات کی خوشی ہے کہ مار صاحب کے بتائے ہوئے فارمولے کا فائدہ ان سبھی کو ہوا ہے۔ اب کوئی کسی سے چندہ نہیں مانگتا۔ البتہ جو لوگ صرف چندہ مانگنے پر معمور تھے اُن کی لیے روزگاری کا مسئلہ۔ ریزگاری سے بھی پیچیدہ ہوگیا ہے۔ مار صاحب کا مفت مشورہ ہے کہ جس طرح لوگوں نے اپنی اپنی ریزگاری کو سکۂ رائج الوقت بنا دیا ہے۔ یہ حضرات اپنے اپنے ادارے شروع کر دیں (اللہ مسبب الاسباب ہے) سماج سیوا کرنے والوں کی بھیڑ دیکھ کر مار صاحب کو یہ فکر لاحق ہوگئی ہے کہ اردو قاری کی طرح غریب اور مظلوم لوگوں کو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا۔ ؎

جو بھی ملتا ہے وہ مائل بہ کرم ملتا ہے

اب ہم نے طے کیا ہے کہ اپنا درد دوسروں کے قلب میں رکھیں گے کہ سارا زمانہ وسیع القلب ہوگیا ہے۔ مار صاحب نے سرگوشی کی "اگر سارا زمانہ وسیع القلب ہو جائے تو" شدت جذبات سے اُن کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ آج کل مار صاحب دکھی آدمی دیکھتے ہی اپنی دکھ بھری داستان چھیڑ دیتے ہیں۔ زیب داستان کے لیے ہم سے ہاں ہنکارا بھی بھروا لیتے ہیں۔ بڑے مردم شناس آدمی ہیں ماسٹر صاحب۔

اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھا کر ہم یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اردو اخبار و رسائل کے لیے قاری شعراء کے لیے سامعین، مبلغ مذہب کے لیے اُمت خیر خواہوں کے لیے غرباء۔ اور لیڈر قوم کے لیے ووٹر کے خوشگوار فرائض انجام دینے کے لیے ہم اپنی بیش بہا خدمات پیش کرتے ہیں۔

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

سماج سیوکوں اور سارے جہاں کا درد جگر میں رکھنے والوں سے التماس ہے کہ ہمارا نام و پتہ نوٹ کر لیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

مار صاحب نے تیز ابی تیر پھینکا "تم ہر جگہ اپنی خود نمائی کی صورت پیدا کر لیتے ہو" (لوگ مخدوم کو کبھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔

مار صاحب کا مذاق مناسب ہم نے بھی جوابی کاروائی کی۔

"اگر آپ کی ماسٹری چھن جائے تو جہالت کے سوا آپ کے پاس کیا بچے گا۔؟"

"سارے جہاں کا درد ہمی سننا چاہتے تھے نا؟"

مار صاحب نے گولہ ہماری طرف پھینک دیا۔

نظم

باقی خیریت

لاغر نرملی (نرمل)

(بیوی کا خط شوہر کے نام جو سعودی عرب میں مقیم ہے)

آپ کا خط مل گیا سرکار! باقی خیریت
گرم ہے مہنگائی کا بازار، باقی خیریت

آپ جو ہر ماہ ڈی، ڈی بھیجتے تھے وقت پر
ہو گئی ہے لیٹ کیوں اس بار، باقی خیریت

آپ کی بیٹی کی فرمائش ہے ٹی، وی چاہیئے
کار کے خواہاں ہیں برخوردار، باقی خیریت

جب سے میرے بھائی کے ذمہ ہوئے دکان کھیت
کے سب چوپٹ ہیں کاروبار، باقی خیریت

پھر مری دادی کو اک بیٹا ہوا ہے چاند سا
بن گئے ہیں نانا تھانیدار، باقی خیریت

آج سالن میں نمک کی زیادتی پر، ہو گئی
آپ کی اماں سے پھر تکرار، باقی خیریت

کیا کہوں کیا گل کھلائے اس برس برسات نے
گر گئی پچھواڑے کی دیوار، باقی خیریت

کر گئے رحلت جہاں سے آپ کے خالو حفت
چھ مہینے سے تھے جو بیمار، باقی خیریت

اُن کا دیکھا دیکھی خالہ جان بھی اب آ چکی
ہو گئی ہیں مرنے کو تیار، باقی خیریت

آپ کی فرقت نے مجھ کو "نیم پاگل" کر دیا
کہہ رہی ہوں میں بھی اب اشعار، باقی خیریت

ہے یہی اب آرزو دل میں کہ ہو مجھ کو نصیب
جلد سے جلد آپ کا دیدار، باقی خیریت

ختم کرتی ہوں یہاں اس خط کو جانِ من کہ اب
آگیا ہے آج کا اخبار، باقی خیریت

غزل

اَن پڑھ، بھونگیری

کھوٹا سکہ بھی چل گیا نا جی
لوٹا لیڈر نکل گیا نا جی

گھر کا نقشہ بدل گیا نا جی
اپنا مُردہ نکل گیا نا جی

اُن کے آتے وقت تو لائٹ گئی
آ کو بیٹھے تو نل گیا نا جی

کیا بتائیں فساد میں اب کے
گھر منسٹر کا جل گیا نا جی

گول، بچوں کی ہو گئی تعلیم
جب سے ٹی وی نکل گیا نا جی

بن بلائے وہ پہلے دستر پو
کھٹ کو ہلّو نکل گیا نا جی

حال یہ ہو گیا ہے واعظ کا
ہے دکھاوا عمل گیا نا جی

کر کے وہ مانگ گھوڑے جوڑے کی
مونگ سینے پہ دَل گیا نا جی

دیکھنا کیا تھا اُن کو میکسی میں
دل کا مینڈک اچھل گیا نا جی!

عمر ستر برس ہے نوشہ کی
ٹھنڈا پانی ابل گیا نا جی

مرشدوں کی جو مل گئی صحبت
اچھا خاصہ نکل گیا نا جی

جس کو اَن پڑھ سمجھ رہے تھے سب
پڑھ کے کیسی غزل گیا نا جی

حشر کے میدان میں

قمرالزماں قمر

سب کے حلئے وہی محشر میں پرانے ہوں گے — جیسے جو لوگ یہاں تھے وہاں ویسے ہوں گے
آستینوں میں چھپائے ہوئے اپنی بوتل ! — مرزا غالب کسی اک ٹیلہ پہ بیٹھے ہوں گے
میر صاحب کی تو پہچان بہت ہے آسان — ہاتھ پہ اپنے لیئے ڈھیر سے چھلے ہوں گے
جلد شاعر نظر آئیں گے بہ شکل مجنوں — اُن کے ذہنوں میں اُبھرتے ہوئے مصرعے ہوں گے
طنز گو ہاتھ میں قینچی لیے آئیں گے نظر — اور ہزل گو وہاں تھامے ہوئے جھولے ہوں گے
کتنے عشاق تبرک کا سمجھ کر بازار — گم شدہ جھمکوں کو سب ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے
سارے وکلاء کسی برگد تلے اس دن اکثر — بس مؤکل سے تقاضے ہی میں الجھے ہوں گے
کچھ شریف ایسے بھی معصوم صفت ہوں گے وہاں — جن کے دامن میں فقط بیوی کے طعنے ہوں گے

ہم بھی اس روز قمر بھیڑ سے ہٹ کر اک جا
اک نئی نظم کی تخلیق میں کھوئے ہوں گے

غزل

رشید عارف

یوں کوڑی کے مول اپنا ہنر بیچ رہے ہیں — بدذوقوں کو محنت کا ثمر بیچ رہے ہیں
کیا خوب انوکھی یہ تجارت ہے ہماری — ہم کاٹ کے معصوموں کا سر بیچ رہے ہیں
مانگا ہے جو داماد نے دینا ہی پڑے گا — آج اس لیے اجداد کا گھر بیچ رہے ہیں
کس طرح مریضوں کو شفا ہو یہ بتاؤ — خون اپنا تو بیمار بشر بیچ رہے ہیں
کہتے ہیں کہ ہم امن و امان کے ہیں پیمبر — بازار میں جو تیغ و تبر بیچ رہے ہیں

منہ مانگے ملا کرتی ہے قیمت انہیں عارف
یہ شیخ دعاؤں کا اثر بیچ رہے ہیں

بیگم صاحبہ

ڈاکٹر یوسف گوہر (شاہجہاں پوری)

عشق کرنے سے ہوں یوں لاچار بیگم صاحبہ — فکر کی ہے ذہن میں بھرمار بیگم صاحبہ
افسروں کی ڈانٹ سن سن کر میں دُبلا ہو گیا — راستہ چلنا بھی ہے دشوار بیگم صاحبہ
کل رنگے ہاتھوں جسے پکڑا گیا چوری میں وہ — ہے کسی تھانے کا تھانے دار بیگم صاحبہ
کیوں نہ انکم ٹیکس کی چوری کریں ہم رات دن — انسپکٹر ہے جب اپنا یار بیگم صاحبہ
شعر کہنا تو کجا شدبُد سے بھی واقف نہیں — اور شاعر بن گئے غفار بیگم صاحبہ
کیجیے کم خرچ اپنا ہے اسی میں عافیت — پے بڑھانے کی نہیں سرکار بیگم صاحبہ
باز آئے شہر جہاں پور شہر سے ہم آپ کے — مچھروں کی ہے یہاں بھرمار بیگم صاحبہ

ڈاکٹر طیب انصاری

سلیمان خطیب

۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ حیدرآباد کے اردو ہال میں اردو مجلس کا ادبی اجلاس تھا وارنڈے میں سجاد ظہیر، سردار جعفری اور مسعود حسین صاحب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اُدھر سے مجھے گزرتے مسعود صاحب نے دیکھ لیا۔ بڑی شفقت سے قریب بُلایا اور پہلی مرتبہ یہیں میں سردار جعفری اور سجاد ظہیر صاحبان سے ملا۔ اسی یادگار جلسہ میں سلیمان خطیب صاحب بھی شریک تھے۔ کچھ نکلتا اور کچھ دبتا قد، فربہ جسم اور اس پر چوڑی دار پائجامہ، اولن کی کالی شیروانی زیب تن کئے آنکھوں پر چشمہ چڑھائے اور مخصوص مسکراہٹ شرارت ذہنی کی چغلی کھاتے ہوئے۔ گردن پر بکھرے پھیلے بال اور سر پر ٹوپی اس طرح پہن رکھی تھی کہ اس سے ان کے گنجے پن کا کسی کو شبہ نہیں ہوتا تھا، لگتا تھا خطیب صاحب ٹوپی ضرور تو پہنتے ہیں۔ ویسے بھی وہ اپنی شخصیت کی کمی کو چھپانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ عیب کو چھپانے کی یہ عادت اپنی ذات کی حد تک ہی محدود نہیں تھی وہ اپنوں کے عیب اور اوروں کے ہنر بھی اسی تن دہی اور دلچسپی سے چھپایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو کبھی اپنی ذات سے الگ نہیں سمجھا تھا۔ مسعود صاحب نے ہنستے مسکراتے ہوئے خطیب صاحب کو آواز دی۔ وہ ہمارے قریب آئے مسعود صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

"خطیب صاحب! آپ انہیں جانتے ہیں؟! یہ آپ کے یہاں گلبرگہ آ رہے ہیں۔ ذرہ انہیں سنبھال لینا!!"

مسعود صاحب ماہر لسانیات ہیں اور لفظوں کے استعمال میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے پہلے تو یہی سمجھا کہ وہ چھیڑنے کے انداز میں میری شرارتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن گلبرگہ آنے پر پتہ چلا کہ اصل میں ان کا شعوری یا غیر شعوری اشارہ گلبرگہ کے ماحول کی طرف بھی تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ اس وقت خطیب صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے، دلجوئی اور دلداری کی باتیں، اسی طرز عمل کو انھوں نے دم واپسیں تک نبھایا۔ گلبرگہ میں میرا قیام ان کی ذات کی وجہ سے بڑی حد تک ہنگاموں کو جنم دیتا رہا۔ وہ خود چپکے بیٹھتے تھے اور نہ اوروں کو بیٹھنے دیتے۔ وہ میرے لیے تحریک تھے، حریف و عمل کا سرچشمہ تھے۔

اور ڈھال بھی تھے۔ وہ میرے ناقد بھی تھے، عیب جُو بھی! لیکن اس سے بڑھ کر وہ میری "مدلل مداحی" بھی کرتے تھے۔ جب بھی نظم ہوتی یا فرصت! وہ میرے گھر ایوانِ شاہی کالونی ضرور آتے۔ وہ دروازے میں داخل ہوتے ہی آواز دیتے۔ "پروفیسر، پروفیسر!!" پھر اُوپر آتے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے، سیڑھیاں چڑھتے ہوئے۔ ان کے چلنے، اور اسکوٹر چلانے میں بہت کم فرق ہوا کرتا تھا۔ وہ بہت دھیمے چلتے اور اسکوٹر کی رفتار بھی ایسی کہ چھوٹا سا بچہ دوڑ کر ان سے آگے نکل سکتا تھا۔ کمال تو یہ کہ وہ رات جب ایوان شاہی کالونی سے فلک نما جاتے تو ان کی اسکوٹر کی رفتار کو دیکھ کر ایسا لگتا کہ وہ محض آٹیپ پر اسکوٹر چلا رہے ہیں، اندھیرے میں، اس اندھیرے میں راہ کو دیکھنے کے لیے ان کے اسکوٹر کی لائٹ ان کے لیے کافی تھی۔ خطیب صاحب نے اپنی زندگی کے گزارنے اور شعر کے کہنے میں دوسروں سے کبھی روشنی مستعار نہیں لی تھی۔ وہ زندگی کی صلیب اپنے ہی کندھے پر اُٹھائے ہندوستان بھر گھومتے اور شاعری پڑھتے اور لوٹتے رہے۔ یوں بھی وہ بوجھ اُٹھانے کے بچپن ہی سے عادی تھے۔ ان کی یتیمی نے انہیں زندگی کا بڑا حوصلہ دیا تھا! وہ کسی یونی ورسٹی کی ڈگری تو نہ رکھتے تھے مگر شعر کچھ اس طرح کہتے کہ اچھے اچھے پڑھے لکھوں کے کان کاٹ لیتے تھے۔ ان کی زندگی میں جو بے تکلفی اور سادگی تھی وہی ان کے شعروں کی پہچان بھی تھی۔ وہ کوئی دانشور آدمی تو نہ تھے، عام آدمیوں کی طرح تھے لیکن ان کی یتیمی اور کثیر العیالی نے زندگی کے درد کو محسوس کر لیا تھا اس لیے دوسروں کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جب بھی وہ شعر کہتے سننے والے یہی سمجھ کر داد دیتے کہ یہ ان کے دل کا درد ہے۔ خطیب صاحب نے اپنی شاعری میں دیدہ وری کی کم اور دلداری کی باتیں زیادہ کہی ہیں اور عام انداز میں کہی ہیں اور پھر عوامی زبان نے تو ان کی شاعری کو کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک گھر گھر پہنچا دیا۔ وہ کہتے تو شعر دکنی زبان میں تھے لیکن یہ لہجہ سرینگر میں بھی مقبول ہوا اور مدراس میں بھی۔ جو لوگ خطیب صاحب کی زبان کو ادنیٰ اور حقیر جانتے تھے وہ بھی خطیب صاحب کی مقبولیت کے منکر نہ تھے بلکہ جلتے تھے۔ میں نے اکثر شاعروں کو خطیب صاحب کی زبان اور شاعری کا مذاق اُڑا کر اپنی اَنا کو تسکین دیتے دیکھا ہے مگر میرے نزدیک ان کی حالت ہمیشہ قابلِ رحم رہی ہے۔ اکثر اوقات ہم لوگ چڑھتے سورج کو دیکھنے کی بجائے اپنی آنکھیں موند کر سورج کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ چوں کہ خطیب صاحب کو اپنی شہرت اور مقبولیت کا پورا پورا احساس تھا اس لیے انہوں نے اپنے بعض معاصرین کی مخالفتوں کی پرواہ نہیں کی وہ ان سخت مرحلوں سے یوں ہی ہنس کر گزر گئے۔ گلبرگہ میں جب ان کا جشن منایا گیا تھا تو مجھے یاد ہے ہندوستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں نے عوام کی ہی طرح اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن یہیں مقامی چند شعراء ایسے تھے جن کی حالت پر ترس آتا تھا۔ وہ الزام دیتے تھے کہ محمد علی صاحب (مرحوم) کی مہربانی سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ حالاں کہ "مولوی صاحب" کا خود خیال تھا کہ وہ "جشن خطیب" منا کر خطیب صاحب پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ خطیب صاحب اردو کے ان خوش قسمت شعراء میں سے ہیں جن کی قدر افزائی ہوئی اور بہت ہوئی اور کمال یہ کہ جیتے جی ہوئی! خوبی کی بات کہ خود خطیب صاحب کو اپنے وجود کا پورا پورا احساس تھا اور یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں تھی جب انہوں نے کہا تھا۔

میں رستے کی بتی ہوں دیپک ہوں من کا ۞ یہ سارا اُجالا ہے میرے سخن کا

مجھے نیچ پہچانے لوگاں نکو رے ۞ میں انمول ہیرا ہوں دکھن کے کھن کا

سات برس بیت گئے رستے کی بتی بجھ گئی اور من کا دیپک گُل ہو گیا مگر سخن کا اُجالا اب بھی پھیلا ہوا ہے جشن کے

جانے کے بعد یقیناً خطیب صاحب کا یہ احساس جاتا رہا ہوگا کہ ان کے لوگوں نے انہیں نہیں پہچانا۔ وہ اپنی قدردانی پر مسرور تھے۔ اور مطمئن بھی۔ اب بھی ان سات سالوں میں گاہے گاہے ان کی یادوں کے چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں۔ لوگوں نے خطیب صاحب کو جیتا جیتا یاد تو رکھا ہے ورنہ اکثر لوگ اسی آرزو میں کہ ان کی بھی قدردانی ہو جیتے جی بجھ سے جاتے ہیں۔ ایسے بہت ہیں اور خطیب ایسے خوش قسمت بہت کم۔ جب وہ زندہ تھے انہوں نے اپنا لوہا منوالیا تھا اب خطیب صاحب ان ساری باتوں سے بے نیاز ہیں لیکن اگر خطیب صاحب کی ضرورت تھی تو سماج کو تھی جہاں آج بھی جہیز کی لعنت موجود ہے، جہاں گھروں میں آج بھی کنواریاں بیٹھی سسک رہی ہیں، جہاں آج بھی بھوک، افلاس اور تنگ دستی نے عوام کی کمر کو توڑ رکھا ہے۔ سماج کی آلودگیاں، کمزوریاں اور خرابیاں خطیب صاحب کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گی۔ ہم ان کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے کہ ایسا تیشہ زن اب ہم میں نہیں رہا ہے

سنا ہے اب وہ اندھیروں کی رہگزر میں ہے
اجالے بانٹتا پھرتا تھا کل تلک جو یہاں

ان کے ایک نہ ہونے سے محفلِ یاراں اداس ہے اور محفل شعر سونی سونی سی، شہر کی ادبی رونق ماند سی پڑ گئی ہے۔ فلٹر بیڈز کے سوتے جیسے سوکھ گئے ہیں۔ فلٹر بیڈز اہل گلبرگہ کے لیے ذخیرہ آب اور اہل قلم کے لیے ذخیرۂ آب و دانہ تھا۔ خطیب صاحب کا دستر خوان چنندہ اور ذائقہ دار کھانوں کے لیے مشہور تھا۔ وہ خود تو برائے نام ہی کھاتے مگر مہمان کو ٹھونس ٹھونس کر کھلاتے۔ شعر میں دردمندی، رکھ رکھاؤ میں وضعداری اور کھانے کھلانے میں مہمان داری اور عام معاملات میں دلداری خطیب صاحب کی شخصیت کے اوصاف حمیدہ میں شامل تھے۔ شاعری سے ہٹ کر عام گفتگو میں بھی وہ بڑے بذلہ سنج تھے، کھلتے، مہکتے اور ہنستے پھولوں کی طرح!! شگفتگی اور تازگی مزاج میں تھی اس لیے محفلوں میں بھی مشاعروں کی طرح روحِ رواں سمجھے جاتے تھے۔ کہنے کے لیے ہی نہیں واقعی خطیب دردکا درماں تھے وہ واقعی بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔

شخصی طور پر میں سلیمان خطیب صاحب ایسے مشفق بزرگ بے تکلف دوست اور مخلص ساتھی کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کرتا ہوں۔ اس وقت ان کی یاد بہت آئی تھی جبکہ "دشت کربلا" میں "حسین" تنہا تھا۔ اگر وہ ہوتے میرے لیے ڈھال بن جاتے، سینہ سپر ہوتے۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے آئے تھے۔ اُس وقت وہ چپ کیسے رہتے!؟ اب اِن دو برسوں کی خاموشی کے بعد حرکت میں آیا ہوں تو لگتا ہے اب بھی خطیب صاحب کا وہی ہاتھ میرے کندھے پر ہے۔ جو انہوں نے پہلی بار اندرا ہال کے برانڈے میں رکھا تھا۔ اُس ہاتھ کا لمس آج بھی میرے جسم میں گویا حرارت اور حرکت پیدا کر رہا ہے!!

غزل

جمال انصاری جملوا

کسی رئیس کے جیبا میں منجھلا تو نہیں — کسی حسین کو جی بھر کے گھورتا تو نہیں
تمہارے کہنے سے صحرا میں جا کے جھک مار دل — جناب قیس کے جیبا میں سر پھرا تو نہیں
تمہارے باپ پہ راز وفا کھلا کیوں کر — وہ اپنا ڈاکیہ کمبخت دو غلا تو نہیں
فقط مجھی پہ یہ نظر کرم ہے کیوں موقوف — ترے پتا کا کوئی اس میں ایسڈ پا تو نہیں
جناب واعظ مشفق اِدھر کدھر نکلے — یہ میکدے کا ہے مسجد کا راستہ تو نہیں
ابھی سے کرتے ہو کیوں اس کے عرس کی باتیں — مریض عشق ہے زندہ ابھی مرا تو نہیں
بڑا ہجوم ہے بیگم ہماری ساس کے گھر — تمہارے باپ کے گھر پہ مشاعرہ تو نہیں

جملوا جال میں تیری پھنسے ہے ناممکن
گر چہ جو بیٹ ہے انسان گوڑیا تو نہیں

غزل

قیصر علی قیصر

عشق کو آسرا نہیں دیتا — لفٹ وہ بے وفا نہیں دیتا
سب کو دیتا ہے چٹھیاں لاکر — مجھ کو کچھ ڈاکیہ نہیں دیتا
اُن کا بلڈ اگ عاشقوں کو کبھی — جانے کیوں راستہ نہیں دیتا
بال بچوں کے بوجھ کے ڈر سے — وصل بھی اب مزہ نہیں دیتا
کر کے وعدے وعید بھول گیا — کوئی ایسا ڈرامہ نہیں دیتا
سب کو گھر اپنے لے کے جاتا ہے — مجھ کو گھر کا پتہ نہیں دیتا
اس کی گرمی سے کوئی سازش ہے — میرا پنکھا ہوا نہیں دیتا
باپ کی جائداد سے حصہ — مجھ کو میرا چچا نہیں دیتا
غسل دیتے ہو شیخ کو مے سے — "کوئی ایسی سزا نہیں دیتا"

ظلم کرتا ہے رنج دیتا ہے
تم کو قیصر وہ کیا نہیں دیتا

دو شعر

افروز عالم

ہو بزم خرد منداں یا انجمن ناداں
یکساں ہوا کرتی ہے الّو کی پذیرائی

دیوان ہوا شائع جب شاعر اعظم کا
پڑھتے ہی مجھے اس کو آنے لگی ابکائی

حیدر بیابانی
(اچلپور)

مخالفت

انسان کی فطرت میں مخالفت کا بیج ازل ہی سے بو دیا گیا ہے۔ جو دورِ حاضر میں گھنے پیڑوں کی شکل
میں ہر میدان میں کھڑا نظر آتا ہے اور آئندہ نہ جانے مخالفت کا یہ سلسلہ بڑھ کر کیا سے کیا ہو جائے گا۔

آج کل گھروں سے لے کر حکومتوں کے ایوانوں تک مخالفت اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔ بچہ رو رو کر
مخالفت کا اعلان کرتا ہے اور ماں باپ آنکھیں نکال کر اسے رونے سے منع کرتے ہیں۔

بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو بزرگ بہت ساری باتوں میں اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کی آوارہ گردی کی
مخالفت اس کے لباس کی تراش خراش کی مخالفت، اس کے ہپی کٹ بالوں کی مخالفت یا پھر اس کے ترقی پسند
خیالات کی بھی مخالفت کی جاتی ہے۔

دوسری طرف لڑکا بھی بزرگ والدین کے تئیں مخالفانہ رویہ اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے زیادہ روکنے
ٹوکنے کی مخالفت کرتا ہے، ان کی بے جا دخل اندازی کی مخالفت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے قدامت پسند خیالات
تک کی مخالفت پر کمر باندھ لیتا ہے۔

کالج کی سرزمین مخالفت کے پودے کے اُگنے بڑھنے، پھلنے پھولنے کے لیے بڑی زرخیز ہوتی ہے یہاں
مخالفت کرنے کے طریقے سمجھائے جاتے ہیں اور مخالفت کے نئے نئے سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ ٹیچر پرنسپل کی مخالفت
امتحانات لینے کی مخالفت، امتحان نہ لینے کی مخالفت، نقل کئے جانے کی چھوٹ دیتے کی مخالفت یا پھر نقل پر
پابندی لگانے پر مخالفت۔ یہ مخالفت چاقو کے زور پر بھی کی جاتی ہے۔

ادب برائے ادب کی طرح مخالفت برائے مخالفت بھی ہوتی ہے اگر کوئی شخص شکل و صورت کے حساب
سے بدہیئت ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر لوگ نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں یا اگر کوئی شخص ایک آنکھ یا ایک ٹانگ
کی نعمت سے محروم ہوتا ہے تو اسے کانا یا لنگڑا کہہ کر اس سے مخالفت نما نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں عاشق کا سب سے بڑا مخالف رقیب ہوتا ہے۔ یہی وہ ناہنجار ہے جو سارے زمانے کو
عاشق کی مخالفت پر اکساتا ہے اس دوران ہوائیں تک عشق و محبت کی مخالف ہو جاتی ہیں۔ موسم مخالفت کرتا
ہے زمین مخالفت کے طوفان اٹھاتی ہے اور آسمان مخالفت کی بجلیاں گراتا ہے۔ قاضی خود عشق نامراد کے

خلاف ہوتا ہے، عدالتیں مخالفین کی صف میں کھڑی رہتی ہیں اور منصف مخالفت میں فیصلے صادر کرتا ہے۔

ایک بھرے پُرے خاندان میں ساس بہو کی مخالفت خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ اس مخالفت میں تو تو میں میں سے لے کر ہاتھا پائی اور آخر میں مارکٹائی کی نوبت آجاتی ہے۔ مرد اگر موقع پرست رہا تو ماں کے سامنے بیوی کی مخالفت میں بھاشن دیتا ہے اور بیوی کے سامنے ماں کی مخالفت میں باتیں کرتا ہے۔ اس طرح وہ دونوں مخالف پارٹیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کامیاب زندگی گزارتا ہے۔

شوہر بیوی کی مخالفت کا نقطۂ اول بک بک جھک جھک اور نقطۂ آخر طلاق طلاق طلاق ہوتا ہے۔ دورانِ گرہستی بیوی اپنے شوہر کی مخالفت پر اتر آئے تو اس کی ہر بات کی مخالفت کرتے ہوئے مین میخ نکالتی رہتی ہے۔ ایک ایسے ہی میاں بیوی کے قصّہ میں بیوی اپنے میاں کے ہر کام میں چاہے وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو خامیاں تلاش کر مخالفت کرتی رہتی تھی۔ بیوی کی عادت چھڑانے کی غرض سے شوہر نے سوچا کہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا جائے جسے دیکھ کر بیوی واہ واہ کہہ اٹھے اور اس کے لاکھ تلاشنے پر بھی اس کے کسی کام میں خامی نہ نکل سکے۔ اس سلسلے میں وہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی دن کی محنت و ریاضت کے بعد ہواؤں میں اڑنے کا کرشمہ کر دکھانے کا فن حاصل کر لیا اور جب وہ اپنے اس فن میں طاق ہو گیا تو ایک دن ہواؤں میں اڑتے اڑتے اپنے شہر پہنچا۔ ایک خلقت اس کا یہ کرشمہ دیکھنے امڈ پڑی۔ اس مجمع میں اس کی منہ پھٹ بیوی بھی شامل تھی! اس نے بھی بڑی عقیدت کے ساتھ اُسے دیکھا لیکن یہ نہ جان سکی کہ وہ اس کا اپنا شوہر ہے اس وقت سب کی زبان پر بشمولِ بیوی ایک ہی چرچا تھا کہ کوئی بزرگ ہے جو اپنی کرشماتی طاقت کے بل بوتے پر ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد جب شوہر پیدل چل کر اپنے گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ بیوی کی زبان پر اڑنے والے شخص کا ہی تذکرہ ہے۔ وہ شوہر کے سامنے بھی عقیدت و محبت کے ساتھ ان اڑنے والے بزرگ کی تعریفیں کرنے لگی۔ جب بیوی ذرا خاموش ہوئی تو شوہر نے اس کے سامنے حقیقت کھول دی۔ اور داد چاہی۔ اول تو بیوی کو یقین ہی نہ آیا کہ یہ ناکارہ شوہر خود اڑ رہا ہوگا لیکن جب اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا تو اس پر بیوی کی مخالفت کرنے والی رگ پھڑک اٹھی اور وہ فوراً کہہ اٹھی "اچھا تو وہ تم تھے تبھی تو ٹیڑھا ٹیڑھا اڑ رہے تھے کبھی تو کوئی کام ڈھنگ کا کیا کرو"

جمہوریت کی سب سے بڑی دین مخالفت ہے۔ بادشاہی دور میں اگر ظلِّ الٰہی کی کوئی مخالفت کرتا تو باغی گردانا جاتا اور لائقِ گردن زنی ٹھہرتا۔

دورِ جدید میں مخالفت کے نئے نئے طریقے اپنائے جا رہے ہیں ہڑتال سے لے کر بھوک ہڑتال تک اور مورچہ سے لے کر توڑ پھوڑ تک یہ سب مخالفت کے نئے نئے طریقے ہیں۔ چکّا جام، کام بند، گھیراؤ، اجتماعی چھٹیاں، خاموش جلوس، کالی جھنڈیاں، کالی پٹیاں، سڑے ٹماٹر، گندے انڈے یہ سب مخالفت کے طریقے اور مخالفت میں کام آنے والی چند چیزیں ہیں۔

مخالفت بڑی عجیب شئے ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ کاروبارِ دُنیا اسی کے دم سے چل رہا ہے۔ اگر مختلف ممالک ایک دوسرے کی مخالفت پر نہ اتر پڑتے تو ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی دوڑ میں دنیا اتنی ترقی نہ کر پاتی۔ اگر اپوزیشن حکومتِ وقت کی مخالفت نہ کرے تو تاناشاہی عام ہو جائے۔ اگر ساس اپنی بہو کی مخالفت

نہ کرے تو کل کی آئی چھوکری مالکن بن بیٹھے اور اس کے بیٹے کے دل اور اس کے اپنے گھر پر راج کرے۔

کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر مخالفت نہ ہوتی تو بہت کچھ اچھا ہوجاتا۔ یعنی اگر حکومتیں آپس میں مخالفتیں نہ پنپنے دیں تو سارے عالم پر بھائی چارگی کی فضاء چھا جائے سیاسی پارٹیاں آپسی مخالفت بھلا کر حکومت کے ہاتھ بٹائیں تو اس ملک میں رام راجیہ آجائے شوہر بیوی میں مخالفت نہ ہو تو گھر جنّت کا نمونہ بن جائے یا ساس بہو میں مخالفت نہ ہو تو بے چاری بہو خودکشی سے پرہیز کرتی رہے۔ پس ثابت ہوا کہ مخالفت کہیں رنگ جماتی ہے اور کہیں رنگ اُڑا بھی دیتی ہے !!

صغیر احمد سحرؔ سندیلوی

(مجازؔ لکھنوی مرحوم سے معذرت کیساتھ)

پیروڈی

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

شاردا کی یہ حسیں راتیں میں ناکارہ پھروں
پی کے دارو رات بھر سڑکوں پہ آوارہ پھروں
جگمگاتے دفتروں میں دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

زہر کھا کر سو رہوں یا شاردا میں گر پڑوں
کوئی بتلائے کہ آخر کب تلک بھوکوں مروں
دوڑوں سی۔ سی۔ ایل کو یا چک بک کا ایک شکوا کروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

سیکڑوں مزدور ہیں میری نظر کے سامنے
لاکھوں ٹھیکیدار ہیں انجینئر کے سامنے
کس قدر مجبوریاں ہیں ہر بشر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

فائیلوں کو پھونک ڈالوں یا رجسٹر پھونک دوں
چھین کر سارے کلرکوں سے میں پیپر پھونک دوں
الغرض دل چاہتا ہے سارا دفتر پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

دیکھتا ہوں افسروں کے گھر کی جب آرائشیں
یاد آتی ہیں مجھے بیگم کی کچھ فرمائشیں
جاگ اٹھتی ہیں دلِ مایوس میں کچھ خواہشیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جو مٹی میں میں نے کھودا تھا وہ نالا پاٹ دوں
باندھ جو میں نے بنایا تھا وہ جا کر کاٹ دوں
میں نے سپلائی اینٹیں کی تھیں ان کو گھر گھر بانٹ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہے بڑی مشکل کہ اب پے منٹ ہونا ہے محال
ایک میری جان کے ہیں ساتھ میں لاکھوں دیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

داغ ہائے دل دکھاؤں یا لکھوں دردِ جگر
میں نے دیکھا ہے تماشا اپنے گھر کو پھونک کر
دل پہ جو میرے گزرتی ہے کہوں کس سے سحرؔ
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

کرشن پرویز

(کھمرڈ)

عجب ہیں یہ لیڈر

عجب ہیں ہمارے وطن کے یہ لیڈر
کسی فعل پر بھی ندامت نہیں ہے
خریدیں گے ہر ووٹ کو نوٹ دیکر
تجارت ہے یہ کار خدمت نہیں ہے
پڑھائی لکھائی کا ہے شور لیکن
وزیروں کو اسکی ضرورت نہیں ہے
گئے جب بھی ووٹر تو چپراسی بولا
ابھی ان کو ملنے کی فرصت نہیں ہے
بھلا بات ووٹر کی سنتے وہ کیسے
انہیں کرسئ پرمٹ سے فرصت نہیں ہے
نہ بجلی نہ پانی نہ لاجھ نہ آرڈر
یہاں نام کو بھی حکومت نہیں ہے

وسیم احمد
(ظہیرآباد)

شمشو نواب کی واپسی

جناب شمس الدین جب تک اپنے دیس میں رہے ان کی حیثیت محض اک کھوٹے سکے کی سی رہی۔ یہاں تھے تو شمشو یا شمشو نواب کہلاتے تھے۔ اور اب دوبئی سے واپسی کے بعد ان ایک دم ہوگئے اور شمشو سے شمس الدین صاحب بھی ہوگئے۔ جب شمشو نواب تھے تو اسم بامسمیٰ تھے۔ یعنی پورے نواب زندگی بھر کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اگر کیا تو بس ان کی ایک آنے کی گنجی تھی۔ اور ایک دکان جسے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ موصوف نے ہضم کر ڈالا نے دے کے ایک گھر رہ گیا تھا۔ جن کو والد بزرگوار عاق کر دینے کی دھمکی کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے طرفہ یہ ہے کہ موصوف کی شادی بھی ہوئی تھی۔ گھر کے داماد ہونے کے ناطے ہم نے ہی مشورہ دیا تھا کہ شمشو نواب کی شادی کر دی جائے تاکہ اس عجیب الخلقت جانور کو لگام ہی لگ جائے۔ بھلا شادی انھیں کیا لگام دیتی شادی کے بعد یہ کچھ اور بھی بے لگام ہوگئے۔ خاندان میں بدنام اتنے کہ ہیں جب بھی اپنی بیگم پر غصہ آتا تو شمشو نواب کی بہن کہہ کر طعنہ دیتے۔ بچوں کو کھیل کود کی طرف زیادہ راغب دیکھتے تو کہتے۔

"کھیلو گے کودو گے تو ہوں گے شمشو نواب"

اور بچے فوراً پڑھائی کی جانب متوجہ ہوتے۔

اس سے پہلے کہ شمشو نواب کسی سنگین جرم کی پاداش میں جیل کی ہوا کھاتے سسرال والوں نے انھیں دوبئی بھیج دیا۔ ان کی رخصتی کے موقع پر ہم بھی گئے تھے "خدا حافظ" کہنے ان کی بہن (ہماری بیگم) نے تو امام ضامن باندھا اور توشہ ہاتھ پر رکھا اور ڈھیر ساری دعائیں بھی دی تھیں۔ اور ہم نے انھیں ایک کتاب نذر کی تھی۔ موضوع تھا "شرعی سزائیں اور ان کا حل" اس پر انھوں نے ہمیں اس طرح گھور کر دیکھا تھا جیسے ہم نے کوئی مغلظ گالی دی ہو۔ ان کے ردِ عمل سے متاثر نہ ہوتے ہوئے ہم نے لگے ہاتھوں یہ تلقین بھی کر ڈالی کہ "اس سے پہلے کہ تم سرزمین عرب پر قدم رکھو اس کا مطالعہ تمہارے حق میں ذاتی طور پر مفید ثابت ہوگا۔

القصہ مختصر شمشو نواب دو سال بعد جب دوبئی سے وطن لوٹے تو ان کی واپسی راکیش شرما کی خلاء سے واپسی تو نہ تھی کہ شہرت ہوتی البتہ ہی کرشن چندر کے گدھے کی واپسی تھی جو ایک ناول لکھا جاتا۔ بس معمولی واقعہ تھا لیکن معمولی واقعہ نے ہماری ازدواجی زندگی میں ایک غیر معمولی طوفان برپا کر دیا۔ طوفان کی شدت بات کچھ اس طرح ہوئی . . .

ایک دن ناگہاں ہماری بیگم کے نام ان کے ابا کی چھٹی آئی لکھا تھا۔ شمس الدین آئے ہیں۔ تم کو اور بچوں کو یاد کرتے ہیں۔ فوراً چلی آؤ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سسرال سے آنے والے خط میں ہمارا ذکرِ خیر نہیں تھا۔ بہرحال بیگم بچوں کو سمیٹے طوفانی انداز میں میکے روانہ ہوگئیں لیکن ہم قصداً نہیں گئے۔ اور طے کرلیا کہ جب تک خسر نواب بہ نفسِ نفیس ہمیں لینے نہ آئیں ہرگز نہیں جائیں گے۔ دو چار دن یوں ہی گزر گئے منجانب سسرال کوئی نامہ آیا نہ نامہ بر گویا ہماری عدم موجودگی کا سسرال میں کسی نے نوٹس نہیں لیا ـــ اس مرحلے پر دل نے سمجھایا "اس طرح نہیں چلے گی خود جاؤ اور اپنی اہمیت کا احساس دلاؤ"۔ ہم دل کی ہرگز نہ مانتے لیکن ہمارے ہاتھ میں اس بازی کا ابھی ایک ٹرمپ کارڈ موجود تھا (جس کا ذکر بعد میں کریں گے) ہم اس کارڈ کا استعمال مناسب موقع پر کریں گے۔ خیر صاحب ہم سسرال روانہ ہوئے جھک مار کر نہیں منصوبہ بند طریقے پر۔

تو ہم پہنچے سسرال دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اندر سے ٹیپ ریکارڈ کی آواز آرہی تھی۔ اونچی آواز میں گیت بج رہا تھا۔ "آئے گا آنے والا" مزید دستک دینے کو نقارخانے میں طوطی کی آواز پر محمول کرتے ہوئے۔ گلی میں کھیلتے ہوئے ایک چھوٹے بچے کو اندر بھیج کر اطلاع کروائی تاہم بڑی دیر بعد بازو والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ بیگم صاحبہ نمودار ہوئیں۔ ان کے چہرے پر ناگوار تاثرات تھے۔ ہمیں یہ سمجھ کر خوشی ہوئی کہ چلو ایک ہستی تو یہاں ایسی ہے جسے ہمارا چار روز تاخیر سے آنا کبیدہ خاطر ہوا ـــ دوسرے لمحے بیگم اسی ناگوار لہجے میں گویا ہوئیں "خالی ہاتھ ہی آگئے، پھول نہیں لائے" پھول۔۔۔؟ ہم الجھن میں پڑ گئے ـــ کہنے لگیں "ہاں پھول بھیا کو پہنانے کے لیے"۔

ہم نے فوراً سنبھالا لیا۔ "ہاں ہاں شام میں آجائیں گے آرڈر دے کر تو آیا ہوں ـــ گلدستہ ہار وغیرہ وغیرہ" اتنا سنتے ہی بیگم صاحبہ کھل اٹھیں اور اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرہ سمندر پار چیزوں کا میوزیم بن گیا۔ بیگم نے باہر سے لائی ہوئی چیزوں کو ایک ایک کر کے دکھانا شروع کیا۔ یہ ٹیپ ریکارڈ ہے۔ ٹو ان ون TWO IN ONE یہ ہیئر ہے اس سے بال سکھائے جاتے ہیں۔ اور کنگھی بھی کی جاسکتی ہے یعنی یہ بھی ٹو ان ون ہے ہم نے تبصرہ کیا۔ پھر ایک میکسی دکھائی۔ کہا یہ بھابی کیلیے ہے۔ ہم نے کہا اچھا یہ میکسی ہے اہلِ ذوق کیلیے یہ بھی ٹو ان ون ہے بیگم چونک کر بولیں کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ تمہارے بھیا دس سال کے عرصے میں یا تو اپنی بیگم کو مکمل طور پر بھول چکے ہیں۔ یا اپنی بیگم کی صحت کے بارے میں بہت ہی زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ بھلا اتنی ٹری میکسی پہن بھی سکیں گی تمہاری بھابی؟

"ہاں تھوڑا سا سائز کے لحاظ سے الٹر کروانی پڑے گی"۔ بیگم نے خفت کو مٹاتے ہوئے کہا۔

ارے سائز کی ضرورت کیا ہے ٹیلر سے بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا جہاں تنگ ہے ڈھیلا کر دے اور جہاں ڈھیلا ہے تنگ کر دے۔ چل جائے گا۔

اتنے میں خسر صاحب آگئے۔ ہم نے سلام عرض کیا ـــ وعلیکم السلام کہہ کر سیدھے اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئے۔ تم اندر جاؤ۔ وجہ پوچھے بغیر بیگم اندر چلی گئیں اور دوسرے لمحے ہمیں حکم دیا۔ تم باہر جاؤ سیلی شمس الدین کے کچھ دوست آئے ہیں انھیں اندر لے آؤ۔ خسر محترم کی اس عزت افزائی پر ہم کیا بپھر گئے۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا خیر بڑے میاں دیکھ لیں گے ہمارے ہاتھ میں ابھی ایک اور ٹرمپ کارڈ باقی ہے۔ جیسے تاپ نہ سکتا ہو تو کچھ کام نہ کیا۔

ٹرمپ کارڈ سے ہماری مراد یہ تھی کہ ہماری چھوٹی سالی کا رشتہ ایک جگہ طے ہورہا تھا۔ جس میں ہماری کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ لفظ کوشش ہم نے یوں ہی استعمال کیا ہے ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ لڑکے والوں کو علم تھا کہ لڑکی کا بھائی دوبئی میں ملازم ہے۔ تو انھوں نے لڑکی کو دیکھے بنا ہی ہاں کردی تھی ـــ اب ہم اسی معاملے کو بطور ہتھیار استعمال کرنے والے تھے۔

حسب وعدہ ہمیں شمشو نواب کے لیے پھول لانے پڑے۔ رسم گل پوشی اس وقت شروع ہوئی جب شمشو نواب کافی تاخیر کے بعد بن سنور کر رونما ہوئے۔ ہم نے انھیں کھڑے ہو کر سر جھکا کر سلام کیا۔ جس کے جواب میں انھوں نے کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ کو اس طرح جھٹکا دیا گویا چہرے سے مچھر اُڑا رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے ہم نے پھولوں کا ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔۔۔ وہ رسماً کرسی سے اُٹھے اور معانقہ کیا۔ اور پھر جھٹ سے اپنے استراحت کے کمرے میں چلے گئے۔ اس موقع پر ہمیں معاً ایک انگریزی کہاوت یاد آگئی۔ EVERY DOG HAS ITS OWN TIME

رات کے کھانے سے فراغت کے بعد خسر محترم سے ہم نے (بیوی سے نہیں) تنہائی میں ملاقات کی۔ اور گفتگو کا آغاز اس طرح کیا۔۔۔ "جی بات دراصل یہ ہے کہ رضیہ بیگم کا رشتہ میں نے۔ ۔ ۔" اتنا ہی سنا تھا کہ خسر نے تنک کر کہا۔۔۔ "اماں ہٹاؤ بھی اب ہمیں اس رشتے سے دلچسپی نہیں رہی۔ کل رات میاں شمس الدین سے بات ہوئی ہے۔ انھیں یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔ کہنے لگے ایک معمولی کلرک L.D.C کو اپنی بہن دینا تو ہتک کی بات ہے۔ رشتہ داری تو ہمیشہ اپنی حیثیت اور برابری کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ ۔ ۔" اس کے آگے ہم سن ہی نہ سکے۔ خسر صاحب نے گویا براہ راست ہمیں گالی دی ہے۔ ہم بھی تو کلرک ہی تھے۔ اس سے پہلے کہ ہماری مزید سُبکی کی صورت حال پیدا ہو ہم نے بیگم کو ذرا گھر واپس چلنے کا حکم دیا۔ بیگم نے حسب معمول نخرے دکھلائے تو ہم نے خلافِ معمول ہاتھ دکھایا۔۔۔ بیگم ہماری اس غیر معمولی تبدیلی پر بوکھلا اٹھیں۔ پھر بڑی سرعت کے ساتھ بچوں کو سمیٹا اور چل کھڑی ہوئیں۔

اب ہم اپنے گھر میں تھے جہاں سب کچھ ہمارا تھا گھر دار کرسیاں پلنگ کھاٹ بستر بیوی بچے اور ایک سالخوردہ سیکل۔ لیکن بچوں کو اپنا گھر پھیکا اور بے رنگ معلوم ہونے لگا ہے۔ ان کی نظر میں اب شمشو ماموں ہم سے زیادہ پرکشش شخصیت ہوگئے تھے۔ ہم انھیں بہلانے کی کوشش کرتے تو کوئی کہتا۔ ابو شمشو ماموں کے پاس بہت اچھا ٹیپ ریکارڈ ہے ہمیں بھی لادو نا۔۔۔ کوئی کہتا۔۔۔ ابو جی نہیں لگتا ہے ٹی وی لادو نا۔ بڑے صاحب زادے نے جینز اور جرسی کی فرمائش شروع کردی۔ ہم جھلائے ہوئے تھے ہی سب کو بیک وقت پیٹ کر رکھ دیا۔۔۔ دو چار روز گھر میں ہر فرد اپنی اپنی جگہ خاموش خاموش سا رہا۔ ہم خوش ہوگئے کہ چلو مسئلہ حل ہوگیا۔ میاں شمس الدین اپنی جگہ خوش اور ہم اپنی جگہ خوش۔۔۔ ایک دن دفتر سے شام گھر لوٹے تو ہمیں لگا جیسے کوئی زور زور سے چیخ پکار کررہا ہو۔ ہم دروازے کے باہر ٹک کر سننے لگے، بڑے صاحبزادے ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہے تھے۔ کہ

کھیلو گے کودو گے تو ہوں گے شمشو نواب
پڑھو گے لکھو گے تو ہوگے الّو خراب

ہمیں زندگی میں پہلی بار یوں محسوس ہوا کہ سماجی رُتبے کے ساتھ ساتھ اب ہمارا خاندانی مرتبہ بھی گھٹ گیا ہے۔ ◉

ممتاز مہدی

حکیم بلاقی اور پنڈت جھنجھوٹی کی گفتگو کا موضوع دور سے یوں لگا جیسے صحت و تندرستی کے تعلق سے ہے لیکن جب ہم بس اسٹاپ پہنچ گئے جس کے روبرو سڑک کے کیچڑ میں دونوں بلا لحاظ ذات پات و مذہب، کانٹے ڈالے مچھلی کا شکار کر رہے تھے اور ہمہ تن گوش ایک دوسرے کے شربتی الفاظ ایک دوسرے کے کانوں کے ذریعہ گلشن دماغ میں سجا رہے تھے۔ حکیم بلاقی کا خیال تھا کہ "یہ سیتا پھل کہنے کو نام سے ہندو لگتا ہے لیکن صورت شکل مزاج مزہ اور کالے بیج پر سفید چمڑی کو دیکھتے ہوئے ہم بلا شبہ اسے کمیونسٹ قرار دے سکتے ہیں"۔ پنڈت جھنجھوٹی نے فلاسفروں کی طرح پہلو بدل کر اظہارِ راز دا کیا کہ "سیب کو لاکھ ہندوستانی بیچے [APPLE] کہہ کر اچھلیں کودیں سیب ہر لحاظ سے "ہندو" ہے۔ حکیم بلاقی، پنڈت جھنجھوٹی کی تانِ سَم میں سَم ملا کر اپنا مدعا مدغم کر دیا کہ "آم اور موز بھی بلا شبہ شرع کے پابند اور "پکے مسلمان" نظر آتے ہیں۔ کیوں پنڈت! تم تو میری بات سے ضرور اتفاق کرو گے ہی لیکن پنڈت سیب کو "کرسچین" کہتے ہیں کیا برا ہے ہاں البتہ انگور اور انار مجھے "ہندو" لگتے ہیں"۔ پنڈت نے تائید کر دی جام اور پپیا دیر تک بحث مباحثہ کے بعد "لندنی" قرار دیئے گئے۔ سپوٹے اور جامن "بدھسٹ" قرار پائے گاجر اور لوٹ سکھ طبقہ میں شمار ہوئے۔ اس طرح موضوع پھلوں سے معمور تھا اور پھل کی کوئی قسم رتالو، کبیٹ، نارنگی، سنترہ، گینگول، ناشپاتی حتیٰ کہ جنگلی بادام بھی ان سے چھوٹنے نہ پائے۔ ذہن نے ایک عجیب کبیدہ خاطر کروٹ لی، مطلوبہ بس سامنے آکھڑی ہو گئی۔ بس اسٹاپ سے راست چھلانگ بلدیہ کی سجی سجائی سڑک کو نظرانداز کرتے ہوئے بس میں لگانی پڑی۔ بس پہ لٹکے ہوئے ہجوم کے خوشہ کی بنا عین ممکن تھا کہ نظرانداز شدہ کیچڑ ہمارا استقبال کر لے لیکن بس کے ٹوٹے ہوئے فٹ بورڈ میں پاؤں کی پنڈلی ایسی پھنسی کہ ہوا میں لہراتے ہوئے سامنے والی کمر مضبوطی سے تھام کر سفر کر رہے تھے کہ کمر کے مالک نے سوال کر ہی دیا "تو ہندو ہے کہ مسلمان"؟ ہم تو خدا کے شاکر تھے کہ جنھیں کیچڑ سے بچانا ہو وہ اوپر والا کسی نہ کسی بہانے بچا لیتا ہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں ہمارا گلشن دماغ بس کی رفتار کے ساتھ زمین سے بھی تیزی سے گھومنے گھمانے لگا اور پنڈت اور حکیم کے شربتی الفاظ کے اسٹاک سے وہ دھواں خارج ہونے لگا کہ ہم بس کے جھول، گزرتی ہوئی سیکلوں، رکشاؤں اسکوٹروں، موٹروں اور آٹو رکشا کو کسی نہ کسی طبقے سے منسوب کرنے لگے۔ بس میں کسی نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا ۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

یہ تقسیم کا عمل لا متناہی اور مسلسل ہے۔ سورج تقسیم ہوا تو اس چھوٹی سی کائنات میں سیارے ستارے چاروں طرف پھیل گئے۔ زمین تری اور خشکی میں تقسیم ہو گئی۔ خشکی پر کئی لکیریں ابھر آئیں تو یہ کئی ملکوں میں کٹ گئی۔ ایک ملک کی تقسیم کئی قوموں نے کر دی۔ قوموں کو قبیلوں نے تقسیم کر دیا۔ قبیلے خاندانوں میں بکھر گئے۔ خاندان فرد کو بھی بخش نہ سکا ایک فرد کی تقسیم بھی مزید قلب میں ہو گئی۔ ضمیر اور قلب بھی مختلف اقسام میں بٹے ہوئے ہیں جو ایک ہی انسان میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے انسانیت بھی تقسیم ہوتے ہوتے سورج کی طرف لوٹ گئی تاکہ سورج میں گرمی رہے اور گرم شعاعیں وقت پر سب میں تقسیم ہوتی رہیں ورنہ سورج انسانیت چھوڑ دے گا تو مزید تقسیم ہو جائے گا پھر وہ

جس کا ذکر بھی نہ ہوگا آفتابوں میں

انسان کی زندگی بھی مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔ بچپن۔ جوانی۔ ادھیڑپن اور بڑھاپا۔ بچپن اچھل کود میں جوانی "یہ کیا وہ کیا" جوانی میں اس کا اصرار اتنا ہوتا ہے کہ اس دور کو "جوانی دیوانی" کا نام دیا گیا ہے۔ ادھیڑپن بیوی بچوں کے لیے سودا سلف میں اور بڑھاپا صرف دوائیں کھانے اور دواخانوں کے مہمان رہنے میں تقسیم ہے۔ آدمی کی ایک اور تقسیم اعلیٰ ذات اور ادنیٰ ذات کی ہوتی ہے۔ گھوڑوں کی تقسیم بھی اسی بنیاد پر ہوتی ہے۔ گھوڑے ریس میں دوڑتے ہیں اور انسان موقع دیکھتے ہیں نہ محض بس دوڑتے رہتے ہیں۔ انسان کے خون کی بھی قسمیں ہیں کبھی کبھی باپ کے خون کا گروپ بیٹے کے خون کے گروپ سے علیحدہ نمودار ہو جاتا ہے۔ خون کے معاملہ میں یہ ایک معمہ نما بلکہ تشویشناک تقسیم ہے۔

اچھے کام کرنے والوں میں اور مقابلہ جیتنے والوں میں انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ بعض انعام بعد از مرگ بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔ نہیں معلوم جیوتشیوں کے نزدیک ایسی تقسیم کی کیا توضیح ہے کہ ایک غیر شادی شدہ مزدور کو بعد از مرگ انعام ایسی صورت میں ملا جب کہ ہولی کے موقع پر اس نے دوستوں کے ساتھ بھنگ اور گانجہ اس مقدار میں استعمال کر لیا کہ پرلوک سدھارا۔ دوستوں نے ہلڑ بازی جاری رکھی تھی۔ مردے کو کندھوں پر اچھالتے رقص کر رہے تھے کہ ایک وزن بتلانے والی مشین پر اس کو لٹا دیا۔ ایک مزدور نے اس مشین میں سکہ ڈال دیا اور وزن کے ساتھ ساتھ یہ تحریر بھی آئی کہ "آپ کی شادی عنقریب ہو گی"۔ بعد از مرگ کے اس انعام سے مرحوم مزدور بہت خوش ہوا ہوگا چونکہ اس کی کھلی ہوئی باچھیں مذکورہ خوشی کی گواہی دے رہی تھیں۔

ریاضی کی زبان میں تقسیم ہوتی ہے جو بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ بچہ مدرسہ پہنچا کہ اس کو یہ زبردستی سکھائی جاتی ہے۔ جس سے اس کا معصوم دماغ منتشر ہو جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے نمبرات دوسرے طلباء میں تقسیم کر دیتا ہے جس سے اس کے حق میں بہت بڑا بہت ہی تاریک "صفر" آ جاتا ہے جو مزید تقسیم نہیں ہوتا لیکن ریاضی کا ایسا علم ہے جس میں صفر کو بھی کئی بار تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ طلباء جو تقسیم میں ماہر ہوتے ہیں۔ آگے چل کر بہت اچھے آرکیٹکٹ ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے آج وہ گھر کے ایسے اچھے نمونے پیش کر رہے ہیں کہ ایک آدمی کا فلیٹ آدمی کی زندگی تک ... [illegible] خاندان میں تقسیم ہے "فلیٹ" ہی کہلاتا ہے۔ اس کے گزر جانے پر ابدی مسکن کے ... [illegible] تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن وارث ایسا نہیں کرتے بلکہ اس "قبرنما فلیٹ" کو بھی آپس میں تقسیم کر ... [illegible] وارث ... [illegible] میں تقسیم ہو کر عدالت کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں اور اپنی اپنی ... [illegible]

ریاضی کی طرح سائنس کی کرشمہ سازیوں یا سازشوں نے تا تقسیم ... [illegible]

جیسے پانی کو دو قسم کی گیسوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہوا کو کئی گیسوں میں تقسیم کیا ہے۔ دل کے چار ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ایک صاحب جدید ترین الٹرا ماڈرن دواخانے میں علاج کروا کے آئے حالاں کہ دواخانے میں شریک ہونے سے پہلے ان کے تمام اعضاء اصلی اور قدرتی طور پر سیدھے ہوئے تھے لیکن ایک ماہ بعد ڈسچارج ہو کر باہر نکلے تو سیدھی جانب اصلی اور بائیں جانب نقلی میں تقسیم ہو چکے تھے۔ بائیں جانب کے تمام ہی عضویات نقلی تھے۔ کیا آنکھ، دانت، ناک، کیا ہاتھ، کیا پھیپھڑا، کیا پاؤں اور جتنی نقلی چیزیں آویزاں کی گئی تھیں سب کی سب بھونڈی اور ترتیب میں بدذوقی جھلک رہی تھی۔

سیاسی پارٹیوں کی بھی تقسیم ہوتی ہے۔ ایک سیاسی پارٹی جب تقسیم ہوتی ہے تو اس کو براکیٹ کے دو قوس لگ جاتے ہیں۔ جہاں دُم چھلّہ لگ جاتا ہے وہیں قوسوں کے چاند لگنے سے خوبصورتی میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ پارٹی اگر خوش قسمت بھی ہو تو عمل تقسیم جاری رہتا ہے۔ ابتدائی "اے براکیٹ" اور "بی براکیٹ" رفتہ رفتہ "ایکس وائی زیڈ" تک تقسیم ہو جاتی ہیں ان میں بعض کا بازار فوری ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور بعض روز اول کی طرح گرم بازاری برسوں دکھاتی ہیں۔ خوش قسمتی پیچھا چھوڑتی ہی نہیں، گھی کے چراغ جلتے ہی رہتے ہیں، پانچوں میں مرادیں پتی ہی رہتی ہیں لیکن پڑھے لکھے سمجھ دار لوگوں کو ایسا لگتا ہے جیسے ملک کے چہرے پر ان تقسیم شدہ پارٹیوں کی شکل میں بدنما چیچک کے داغ اُبھر آئے ہوں اور لیڈروں کی خوش قسمتی پر سڑا پیپ بہا رہے ہوں۔

کالے کوٹ والے فقیروں کا ذکر اوپر کہیں آیا تھا لیکن فقیر حضرات بھی مختلف زمروں میں تقسیم ہیں جیسے "فقرو فاقہ" والے فقیر، بخشش لگانے اور "مانگ کاٹ" ڈالنے والے فقیر، ووٹ مانگنے والے فقیر، موٹر نشین بھیک مانگنے والے فقیر جو چار فیگر سے کم تر کی بھیک قبول نہیں کرتے، بتدریج جیسے جیسے سواری کا درجہ اترتا ہے اسی مقدار میں بھیک کی رقم بھی گھٹتی جاتی ہے اور پیدل فقیر ایک پیالی چائے کا سوال رکھتے ہیں لیکن روپے سے کم کی بھیک قبول نہیں کرتے۔

تقسیم کی کچھ وارداتیں بدنام بھی ہیں جیسے بندر بانٹ والی تقسیم یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں بندر کا کتنا فائدہ ہوا فقط بلیوں کی بدقسمتی پر حساب سے آٹھ آٹھ آنسو تقسیم کیے جاتے ہیں، کمزور پر رونا کیسا — ایک اور تقسیم ہے راشن کی تقسیم، یہ بھی بدنام ہے چوں کہ غلّہ کی پیداوار تو ضرورت سے زیادہ ہے لیکن راشن شاپ پر آدمی کی عمر، وزن، لمبائی چوڑائی سب کا نہ دیکھا کر مٹھیوں سے اناج تقسیم کیا جاتا ہے۔ بے چارے کارڈ ہولڈر بے ناک کا اناج گھر نہ لائیں تو حکومت کی اناج کی تقسیم کی پالیسی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ "فیملی پلاننگ" کی بجائے راشن کی "معقول ترین" تقسیم سے ملک کی آبادی میں کمی واقع ہو — ایک اور تقسیم ہے جو بدنام نہیں تو شکایتی ضرور ہے اور وہ ہے اس دو جہاں کے مالک کی تقسیم۔ پہلے تو اس نے جہان کو دو جہاں میں تقسیم کیا۔ آسمان کو سات آسمانوں میں تقسیم کیا۔ سائنس کے علماء بہت پریشان ہیں کیوں کہ ان کو ایک بھی آسمان نظر نہیں آتا اور وہ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ خدا ہے ہی نہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اس نے سب میں آنکھیں، کان، ناک، حلق وغیرہ حساب کتاب سے تقسیم کیا ہے لیکن اس تقسیم میں بھی شکایت اس لیے آجاتی ہے کہ کچھ کوتاہیوں کی بنا، کوئی سننے سے محروم ہو جاتا ہے، کوئی دیکھنے سے تو کوئی سونگھنے سے۔ ایسی صورت میں دو جہاں کے مالک کو کھری کھری جلی کٹی سنائی جاتی ہے حالاں کہ اچھی اور چالو حالت میں جنھیں یہ سارے اعضاء حاصل ہیں وہ کبھی اس کا شکریہ ادا نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہوتے ہیں، بھلا ایسا کرنے میں ان کا جاتا ہی کیا ہے ایک مستقل شکایت یہ ہے کہ دو جہاں کے مالک عقل کی تقسیم میں کبھی کبھی ہی نہیں بلکہ ہمیشہ بخالت سے کام لیتے ہیں اسی لیے اس سنسار کی زیادہ تر آبادی پنڈت، اور حکیم جیسی گروہ بندیوں میں تقسیم ہے حالاں کہ قدرت

کی نعمتیں خواہ وہ تقسیم شدہ حالت میں کیوں نہ ہوں دل کو راحت و سکون پہنچا سکتی ہیں۔ جیسے سال بارہ طویل اور مہمان مہینوں میں، مہینہ دوڑتے بھاگتے تیس دن میں، دن چوبیس سرسراتے گھنٹے میں گھنٹہ کھٹکتے ہوئے ساٹھ منٹ میں اور منٹ بجھتے ہوئے ساٹھ سکنڈ میں تقسیم ہے۔ تقسیم غیر مرئی بھی ہوتی ہے جو سادی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتی جیسے اچھائی اور برائی کی تمیز، انسان کی پسند ناپسند کالی لیلیٰ پر مجنوں کے قربان جانے کا واقعہ بہت سے لوگوں کے لیے تعجب خیز ہے تو بہت سے لوگ مزہ لے کر کہتے ہیں کہ لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھو۔ اسی طرح محبت اور دوستی، وفاداری اور بے ایمانی میں تقسیم ہے۔ مہربانی، خلوص اور مطلب پرستی میں تقسیم ہے۔ پرستش دکھاوے اور حقیقت میں تقسیم ہے۔ حقیقت کئی پردوں میں تقسیم ہے۔ ادا، حیا اور بے حیائی میں تقسیم ہے۔ بھائی چارگی سگے بھائیوں کے ماسوا غیروں میں تقسیم ہے۔ رشوت آفیسروں میں تقسیم ہے۔ آگ جنگلوں میں تقسیم ہے۔ چھکے کھلاڑیوں میں تقسیم ہیں۔ طاقت پہلوانوں میں تقسیم ہے کمزوری بیماروں میں تقسیم ہے۔ فیشن بازاروں میں تقسیم ہے۔ واہ واہ دانشوروں میں تقسیم ہے۔ شاعری شاعروں میں تقسیم ہے۔ رعایا بدحالی میں تقسیم ہے۔ افق صبح و شام میں تقسیم ہے۔ بے وقوفی سماج میں تقسیم ہے گھوڑا، جوڑا، جہیز دولہوں میں تقسیم ہے۔ چھوہارے براتیوں میں تقسیم ہیں۔ دشمنی بچے بچے میں تقسیم ہے۔ بچے ساری دنیا میں تقسیم ہیں۔ دنیا مالداروں میں تقسیم ہے۔ مال ارمانوں میں تقسیم ہے۔ ارمان مستقبل میں تقسیم ہے۔ مستقبل لاشعور میں تقسیم ہے۔ لاشعور فطرت میں تقسیم ہے۔ فطرت قدرت میں تقسیم ہے۔ قدرت اوپر گنائی گئی تقسیم میں تقسیم ہے اور یہ ساری تقسیم آپ سب پڑھنے اور سننے والوں میں تقسیم ہے گر یاد رہے۔!

کنھیا لال کپور
انگریزی سے ترجمہ
راد ستو گوسری

گرنام سنگھ تیر
مزاح نگار، صحافی اور سیاست داں

پنجاب کے مشہور سیاست داں (ان دنوں اکالی دل کے
مشیر خاص) وکیل صحافی اور مزاح نگار گرنام سنگھ تیر پر کنھیا لال کپور
نے انگریزی میں ایک تعارفی مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کا ترجمہ
شگوفہ کے قارئین کے لیے پیش ہے ! [ادارہ]

" حاضر جوابی اور برجستگی خالص تخیل کی پیداوار ہوسکتی ہے ۔ لیکن مزاح جذبے اور کردار پر مشتمل ہے۔ مزاح ایک ہمدردانہ وصف ہے ۔ جو ایک ہی کردار میں ہمدردی کے پہلو بہ پہلو موجود ہوتا ہے ۔ اور ہمیشہ سے بھرپور ہوتا ہے "

ہنری گالیبزنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مزاح کے لابدی خصائص کا مندرجہ بالا تجزیہ پیش کیا ہے لیکن اس کا یہ قول گرنام سنگھ تیر پر بطور انسان اور مزاح نگار کما حقہٗ صادق آتا ہے ۔ ان کی ذاتی زندگی ضابطہ غم واندوہ اور رنج والم کا مرقع ہے ۔ جو اس کی ادبی تخلیقات میں منعکس ہوتی ہے ۔ لیکن غم واندوہ اور یاس والم اُس کے ڈراموں اور کہانیوں کے کرداروں اور پلاٹوں میں اس ہنرمندی کے ساتھ سموئے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ کرداروں میں نہ صرف انسان دوستی کا جذبہ پیدا کردیتے ہیں بلکہ مزاح کے تاثرات کو بھی دوبالا کردیتے ہیں۔

"سنسان کالیاں راتاں وِچ میں رو ندار وندا ہتداں " اس کی ایک نظم کی ابتدائی اور آخری سطور ہیں۔ جو اس پس منظر کا دیا شتداداتہ اظہار ہے جس میں تیر اپنے مزاح کی تخلیق کرتا ہے ۔ توانائی اور صحت، دلکش خدوخال فراخ دلی اور بہترین فطرت بخشنے میں ارباب قضا و قدر کی تیر پر نظر عنایت رہی ہے ۔ لیکن تقدیر اُس پر ہمیشہ نامہربان رہی اور اس نے اس کی زندگی کو مایوسیوں اور ناکامیوں سے ہمکنار کرنا چاہا۔ اگرچہ اُسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی گو وہ جذباتی تحفظ مزاح اور ایسی امید اور بیرونی ناہمواریوں پر گفتگو کرنے کی صلاحیتوں سے مستفیض نہ ہوتا تو دیکھے غم بعد کا سہت وہ بیشتر اُسے اپنے ساتھ بہالے جاتا۔

لیکن اس نے ہمیشہ یہ حقیقت اپنے جملہ احباب، مداحوں، قارئین، سامعین اور بہی خواہوں سے مخفی رکھی ہے۔ اور انھیں وہ مزاح اور خوش گواری پیش کرتا ہے۔ لہٰذا یہ فطری ہے کہ عوام میں بے شمار لوگ اس کے مداحوں میں شامل ہیں۔ اور اکثر ادارے اور تنظیمیں اس کی شمولیت باعث افتخار سمجھتی ہیں۔

خندان و فرحاں اور چاق و چوبند گنام سنگھ تیر [illegible] کی سابقہ ریاست کے شاہی خاندان سے متعلق نظر آتا ہے۔ لیکن وہ ایک مسلّمہ ظریف ہے۔ جس کا دامنِ حیات مزاح اور ہنسی مذاق سے لبریز رہتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک دلچسپ مذاق خیال کرتا ہے۔ اور خواتین و حضرات کو پیدائشی حیلہ جو قرار دیتا ہے۔ وہ ان پردوں کو چاک کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہے جن کی اوٹ میں دورِ جدید کا انسان اپنی خامیوں اور فرد گذاشتوں کو تسلیم کرتا ہے۔

ابتدائی دورِ حیات: انسان نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز پنجابی میں مزاحیہ کہانیاں اور مضامین لکھنے سے اس زمانے میں کیا جب اس کی عمر ابھی دس گیارہ برس کی رہی ہوگی۔ ان میں اس نے پنجابی معاشرے کے کرداروں کو پیش کیا۔ رفتہ رفتہ وہ پختگی کی منزل پہ پہنچ گیا اور چند سال بعد وہ پنجابی اخبارات کے بے شمار قارئین میں بے حد مقبول ہوگیا۔ جن میں سے نصف درجن سے زائد اخبارات کا وہ خود مدیر رہا ہے۔ مغربی مزاح نگاروں لی کاک، وڈ ہاؤس اور لیمب سے وہ اپنی کہانیوں میں خاصا متاثر رہا ہے۔ بعد ازاں اس نے مزاحیہ ڈرامے اور پیروڈیاں تخلیق کیں۔ پنجابی کے معروف و مسلّم شعراء وارث شاہ اور بلھے شاہ کے کلام پر پیروڈیاں سب سے پہلے اس نے تصنیف کیں۔ چنانچہ ان دنوں وہ ایک معرکے کا ڈرامہ نویس مانا جاتا ہے۔ یہ ڈرامے اکثر ریڈیو سے نشر کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ تا امروز وہ ایک درجن سے زائد کتابوں کا مصنف ہے جو سب کی سب اعلیٰ درجے کے طنز و مزاح سے مملو ہیں۔ سو سے زائد ریڈیو ڈرامے اور فیچر اور سینکڑوں نظمیں اس پر مستزاد ہیں۔ یہ سب تصنیفات بہ زبان پنجابی پیش کی گئی ہیں۔

گنام سنگھ تیر پنجابی کا معروف ریڈیو نشر کنندہ ہے۔ وہ ایک دلکش آواز کا مالک ہے۔ اور ریڈیو سے تقریر نشر کرنے میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔ سامعین اس کی تقریریں ہمیشہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔

ادب سے بے پناہ شغف کے علاوہ تیر صحافت اور سیاست میں بھی خاصی دلچسپی لیتا ہے۔ جب وہ ہوگ میں مقیم تھا تو انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے درجنوں اخبارات کا نمائندہ تھا۔ گذشتہ چند سالوں سے اس نے کھادی پہننا شروع کردیا ہے جو اس کے نیشنلسٹ ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن اس سے اس کے جمالیاتی حسن کو خاصا نقصان پہنچا ہے کیوں کہ اس نے اپنے نرم و نازک جسم کو بھدے اور کھردرے کھدر کے حوالے کردیا ہے (اب اس نے کھادی کا لباس پہننا ترک کردیا ہے)

تیر بطور انسان اور ادیب ملنے والوں کو متاثر اور محظوظ کرتا ہے۔ بقول اس کے: "اگر میں عرصے تک ایک مقام پر رہوں یا ایک پیشے سے متعلق رہوں تو میرا جی اوبنے لگتا ہے۔ اس لیے یہ امر حیرت ناک نہیں کہ میں ہر چند سال کے بعد یہاں سے وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ میں ابھی منظر سے ابھرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور امید کہ مجھے جلد ہی اس میں کامیابی حاصل ہوگی۔" اس کے اشغال میں سیر و سیاحت، امکانی شکاریوں کی جستجو، مداح قارئین اور سامعین سے ملاقات، معروف ادیبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا، فنکاروں اور سیاسی لوگوں کے ساتھ میل جول بڑھانا اور سیاسی کانفرنسوں

اور اجتماعات کا انعقاد شامل ہے۔ اس قسم کے جلسے اور اجتماع منظم کرنے میں وہ اس قدر ماہر ہے کہ وہ راتوں رات اس طرح کے انتظامات کرکے ہاتھوں پر سرسوں جما دیتا ہے۔

گزشتہ تیس سالوں میں تیر مختلف تجربات سے گزرا ہے۔ وہ فوج اور ریلوے میں ملازم رہا ہے۔ تقریباً ایک درجن رسالوں اور اخبارات کا وہ مدیر رہا ہے جن کا مالک بھی وہ خود تھا۔ وہ فٹ بال کا بہت اچھا کھلاڑی رہا ہے۔ وہ پبلسٹی افسر (ڈپٹی ڈائرکٹر پی۔ آر) بھی رہا ہے اور ریاستی اسمبلی کا امیدوار بھی۔ انواع واقسام کے تجربات نے اُسے اپنی مزاحیہ تخلیقات کے لیے خام مواد فراہم کیا۔

اس کا مزاج بے حد سلجھا ہوا ہے جو اُس کے اکثر پیش روؤں کے معمولی مزاح سے بہت مختلف ہے۔ اس نے پنجابی مزاح میں عمدگی اور نفاست کے عناصر کا اضافہ کیا۔ اس کی تصانیف میں "گڑھتی"، "چھوہتر"، "ہسدی دنیا"، "بھلاں" اور "ادھی رات دیاں ہاکاں" زیادہ مقبول کتابیں ہیں۔ مزاحیہ ڈرامے لکھنے میں اُسے خاص طور پر عبور حاصل ہے چنانچہ اس نے دو سو ایسے ڈرامے تخلیق کئے ہیں۔ جب کبھی کوئی دربار کی نظامت کے فرائض اسے سونپے جائیں تو اس کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ وہ اپنے معاصر شعراء اور ادباء پر ایسی چوٹ کرتا ہے کہ حاضرین کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہو جاتا ہے۔

تعلیمی اعتبار سے وہ ایم اے، ایل، ایل، بی ہے۔ اردو اور ہندی میں بھی اُسے خاصی شدبد حاصل ہے۔ وہ موضع کوٹ سکھیا کا رہنے والا ہے اور ایک جانے پہچانے براڈ خاندان کا رکن ہے۔ پنجابی ادب میں مزاح نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اُس نے نام پیدا کیا ہے۔ اور لامحالہ عمر اور تجربے میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے لیے ایک مقام حاصل کرلے گا۔ ()

مظہر سلیم (بمبئی)

بھیونڈی ایس ٹی اسٹینڈ

کسی بھی ان پڑھ آدمی سے اگر دریافت کیجئے تو وہ بھی ایس ٹی اسٹینڈ کے لغوی معنی صاف اور سیدھے الفاظ میں اس طرح بتلائے گا کہ ایسی جگہ جہاں پر ایس ٹی بس آکر رکتی ہو اور جو ایک بہت بڑے احاطہ میں ایک منزلہ، دو منزلہ تین منزلہ عمارت پر منحصر ہو۔ کرکٹ اسٹیڈیم اور اس میدان میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ اسٹیڈیم میں ایک بال کے پیچھے کئی کھلاڑی دوڑتے ہیں اور یہاں پر ہر ایک بس کے پیچھے کئی مسافر۔

چٹیل میدان کو دیکھ کر بھی مسافر یہ اندازہ بحسن و خوبی لگاتے ہیں کہ یہ ایس ٹی اسٹینڈ ہی ہے۔ کیوں کہ جہاں اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بسیں کھڑی ہوتی ہیں بس وہی بس اسٹینڈ ہوتا ہے۔ بس اسٹینڈ کے لیے اس کے نام کی تختی کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔

ہمارے شہر (بھیونڈی) کے بس اسٹینڈ کی عمارت کتنے منزلہ ہے اس کا ہم کو بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں۔ مگر پھر بھی ہم نے عام طور پر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ بس اسٹینڈ کی عمارت ہے جس کی پیشانی پر ریاستی زبان (مراٹھی) میں کچھ لکھا ہے اور عموماً اس تحریر کو کوئی ذی روح پڑھتا نہیں ہے۔ شاید اس کے پڑھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ احاطہ کی دیواروں اور عمارت کے کچھ مخصوص حصوں پر مختلف قسم کے اشتہارات مسافروں کو منہ چڑاتے ہیں۔ وہ اس لیے بھی کہ مسافر جب بسوں کے انتظار میں بوریت محسوس کریں تو ان اشتہارات سے فائدہ اٹھائیں یا دل بہلائیں۔

اسٹینڈ پر ہر شہر، گاؤں، اور قصبے کے لیے الگ اور علیحدہ "کیو" ہوتی ہے اور اس جگہ شہر یا گاؤں کا نام بھی تحریر ہوتا ہے۔ جہاں ایس ٹی بس جانے والی ہو مگر پھر بھی مسافروں کو یہ پوچھتے ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ فلاں شہر کے لیے بس کی لائن کونسی ہے؟ اور یہ وہی لوگ پوچھتے ہیں جو UPTODATE اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ ان پڑھ اور جاہل قسم کے لوگ تو ڈائریکٹ بس میں سوار ہو جاتے ہیں۔ چاہے انہیں جہاں جانا ہو۔ مگر کنڈکٹر انہیں آدھے راستے میں بس سے اتار دیتا ہے۔ یہ ان کی دانشمندی کا ثبوت ہوتا ہے۔ کچھ لوگ روزانہ سفر کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ لائن تلاش کرتے ہیں۔

ہر شہر، ہر گاؤں کی الگ لائن ہوتی ہے اور ان "کیو" میں کھڑے ہو کر، بیٹھ کر یا سو کر بھی ایس ٹی کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ٹرانسپورٹ کے عملے پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی جا سکتی۔ مسافر "کیو" میں بڑی ہی پریشانی

اور تکلیف کے عالم میں کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں مگر ایسی بس "کیو" کے قریب پہنچنے تک یا کیو بس تک پہنچنے سے پہلے ہی بھر جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ بس میں سے مسافر اترے یا نہیں۔ اکثر و بیشتر بغیر "کیو" کے ہی لوگ بس میں سوار ہو جاتے ہیں۔ ہر آدمی اپنی الگ الگ "کیو" بنائے کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس طرح بس بھر جاتی ہے اور لائن میں کھڑے لوگ ایک انچ بھی آگے کی طرف نہیں سرکتے۔ کنڈکٹر اس معاملے میں بہرہ، اندھا اور گونگا ہوتا ہے۔ ڈرائیور کا تعلق مسافروں سے کسی قسم کا ہوتا ہی نہیں۔ وہ صرف مسافروں کو اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ کھڑکی سے باہر ہاتھ نہ نکالیں۔ "ٹاٹا" اگر کرنا ہی ہے تو بس سے نیچے اتر جائیں۔ چلتی ہوئی بس سے باہر نہ تھوکیں، بس کے اندر تھوکنے پر کسی طرح کی پابندی نہیں تھوک کے پر ہی نہیں بلکہ آپ اچھی خاصی سیٹ خراب بھی کر سکتے ہیں۔ بس میں سگریٹ پینا قانوناً جرم ہے۔ اس ہدایت پر بالکل عمل نہ کریں۔ سگریٹ پینے پر کوئی ممانعت نہیں کیوں کہ بس ڈرائیور خود مسافروں کو سگریٹ پینے پر اکساتا ہے۔ ڈرائیور کے متعلق مسافروں کو ہی نہیں بلکہ خود کنڈکٹر کو بھی شکایت ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ بس سے غائب ہوتا ہے کنڈکٹر گھنٹی بجا کر اس کی غیر موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔

ایس ٹی اسٹینڈ پر مسافروں کو پریشانی سے نجات دلانے اور ان کا سامان بس پر چڑھانے کے لیے حمال بھی ہوتے ہیں۔ جو اپنے مخصوص لباس میں احاطے میں گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم کنڈکٹر اور حمال میں فرق نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ وہ بھی سامان چڑھاتے وقت بس اسٹینڈ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسے تکلیف دہ وقت بے چارے مسافروں کو یہ بھی کام مشکل انجام دینا ہوتا ہے لیکن بس پر سامان چڑھانے کا بل حمالوں کو ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔

ٹرینوں کے ٹائم ٹیبل کی طرح بسوں کا صرف ٹیبل ہوتا ہے ٹائم کا دور دور تک پتہ نہیں ہوتا بسیں بھی ہندوستانی سیاست دانوں کی طرح خود مختار ہوتی ہیں۔ کبھی بھی اور کسی بھی وقت آتی ہیں اور جاتی ہیں مسافر اس ضمن میں منیجر سے شکایت کر سکتے ہیں مگر مسافروں کو یہ پتہ ہی نہیں ہوتا ہے کہ منیجر کا آفس کس طرف چھپا کہاں ہوتا ہے۔ جب بس اسٹینڈ پر مسافر بالکل نا کے برابر ہوتے ہیں تو اس وقت سارے بس اسٹینڈ کا احاطہ بسوں سے بھرا ہوتا ہے۔ مگر جب بھیڑ اپنے شباب پر ہوتی ہے تو بس کا کہیں بھی پتہ نہیں ہوتا ہے۔

بھیڑ کو چیر کر آپ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اگر بس میں گھس گئے تو یہ آپ کے لیے فالِ نیک ہے۔ مگر بس میں کنڈکٹر سے ریزگاری جو ٹکٹ لینے کے بعد بچتی ہے طلب مت کیجیے کیوں کہ وہ آپ کو ایک عدد ڈانٹ پلائے گا (پیسے کا کوئی ذکر نہیں) ریزگاری کی قلت کا ڈھنڈورا پیٹ کر مسافروں کے باقی بچے ہوئے پیسے واپس نہیں کرے گا اس طرح کل کنڈکٹروں کی دونوں ہاتھوں کی ساری انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے۔ مگر بے چارے ڈرائیوروں کی حالت قابلِ رحم ہے جو اگر بیڑی، سگریٹ بھی پیتے ہیں تو وہ بھی مسافروں سے [illegible] اور یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ [illegible] یوں بھی بہت پرانا اور پرکشش ہے۔ لیڈر، فضا سے ووٹ، [illegible] سرمایہ دار سے بونس، ملا، آگ [illegible] شوہر سے اپنا گھر لوٹ سکھ، اور بس ڈرائیور مسافروں سے ایک بیڑی وغیرہ۔

ہمارے دیش میں بسیں ہوائی جہاز کا نعم البدل ہیں۔ جس میں بیٹھنے کے بعد ہم اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لیے آسمان کی وسعتوں میں گھومتا ہوا محسوس کرتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ راکیش شرما بھی بس کے ذریعہ ہی آسمان کی طرف کوچ کیا ہوگا۔ اپنی اپنی سیٹ پر بڑی مضبوطی سے بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہاں کے راستے بڑے صاف اور چکنے ہوتے ہیں لیکن آپ پہلی بار سفر کی زحمت کر رہے ہیں تو ضرور یہ آپ کا آخری سفر ہوگا اور آپ کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

بسوں میں لیڈیز کے لیے ایک مخصوص سیٹ ہوتی ہے جس پر مرد حضرات بڑی بے باکی سے تشریف رکھتے ہیں۔ مردوں کے لیے کوئی سیٹ نہیں ہوتی۔ مگر مردوں کو ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے وہ کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں یا لٹکے ہوں وہ بس میں سب کچھ کرسکتے ہیں جو عام طور پر اپنے گھروں میں کرتے ہیں۔ بس میں ایک سیٹ کنڈکٹر کے لیے بھی خالی کی جاتی ہے۔ اور جس پر وہ ٹکٹ لیے بغیر بیٹھتا ہے۔ اگر کسی خوبصورت لڑکی کو پہلی بار دیکھ لے تو اس کے لیے وہ سیٹ چھوڑ دینے کو بلا معاوضہ تیار ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کسی مقام پر جانا چاہتے ہوں تو اپنے گھر سے ایک گھنٹہ پہلے نکلیں اور وہ بھی احتیاطاً۔ کیوں کہ وقت پر پہنچنے سے بس نہیں ملتی۔ جب تک آپ بسوں کا انتظار نہیں کریں گے آپ کا سفر کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھار بس اسٹینڈ پر بس ہوتی ہے اور ڈرائیور نہیں ہوتا ہے۔ اور کبھی صرف بس ہوتی ہے اور دونوں غائب ہوتے ہیں۔ یا کبھی کنڈکٹر اور ڈرائیور موجود ہوتے ہیں۔ مگر بس کا دور دور تک کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ مسافر نہ ہوں۔ بس ہو یا نہ ہو مسافر ضرور ہوں گے۔

اس ترقی یافتہ دور میں جب کہ انسانوں کو درجات میں تقسیم کیا جاتا ہے بسوں پر بھی اس کے اثرات پڑے ہیں۔ بسیں بھی اب تین قسم کی ہیں۔ لکژری، سوپر ایکسپریس، نان اسٹاپ بس، ایشیاڈ - ۸۲ اور آرڈینری بسیں۔ ان سب میں جو بسیں سب سے زیادہ سڑکوں پر گھومتی دکھائی دیتی ہیں وہ آرڈینری ہوتی ہیں۔ ان بسوں میں مسافر کھڑے ہوکر، بیٹھ کر یا باہر دروازے پر لٹک کر بھی سفر کرتے ہیں۔ سوپر ایکسپریس اور لکژری بسوں میں ہم نے صرف کنڈکٹر اور ڈرائیور کو ہی سفر کرتے دیکھا ہے۔ یہ شاید ان کی تفریح کے لیے حکومت نے اسپیشل طور پر شروع کی ہے۔

بس اسٹینڈ پر ایک عدد انکوائری آفس بھی ہوتا ہے۔ جہاں پر کوئی حاضر نہیں ہوتا۔ اگر آپ انکوائری کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے مسافروں ہی سے رابطہ قائم کریں کیوں کہ مسافروں کو ایس ٹی ڈپارٹمنٹ سے متعلق اتنی معلومات ہوتی ہیں کہ خود ایس ٹی کے عملے کو بھی نہیں ہوتی۔ بس اسٹینڈ پر پیشاب گھر کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ منیجر کے آفس کی موجودگی۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے پیشاب گھر علیحدہ ہوتے ہیں اور مسافروں کے لیے یہ پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے کہ عورتوں کا پیشاب گھر کس طرف ہے۔ اور مردوں کا کس طرف۔ لیکن محکمہ ٹرانسپورٹ نے اس کے لیے جو خاص اور اہم اقدامات کئے ہیں وہ اس طرح ہیں، مردوں کے پیشاب گھر پر ایسا بچہ جس کا فوٹو اور عورتوں کے پیشاب گھر پر چھوٹی بالا کی تصویر بڑی خوب صورتی سے چسپاں کر رکھی ہے۔ مسافروں کو تکلیف نہیں ہوتی۔

آخر میں چلتے چلتے یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ بس اسٹینڈ پر ایک عدد کینٹین بھی ہوتی ہے جو ایس ٹی کینٹین کہلاتی ہے۔ یہاں کی چائے پی کر آپ کے سفر کی ساری تھکان ہرن ہو جائے گی!!

تبصرہ: محمد منظور احمد

"سدا بہار"

شعری مجموعہ از الحاج مرزا شکور بیگ

اشاعت : اکتوبر ۱۹۸۵ء
پبلشر : بشیر وارثی پبلی کیشنز. چھتہ بازار حیدرآباد ۲
قیمت : آٹھ روپے

ملنے کے پتے

مرزا شکور بیگ ۱۱-۲-۱۰ احمد منزل سیف آباد حیدرآباد
ماہنامہ شگوفہ، بیچلرس کوارٹرس معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
حسامی بکڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۲

الحاج مرزا شکور بیگ اردو کے کہنہ مشق اور ممتاز مزاح نگار شاعر ہیں. وہ نعت گو شاعر کی حیثیت سے بھی بہت مقبول اور مشہور ہیں۔

"سدا بہار" ان کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے جس میں زرد سماج اور ملک کے سماجی مسائل، معاشرہ کی بیماریاں، اخلاقی پستی، حرص و ہوس اور ریاکاری، اس جہاندیدہ اور محترم بزرگ شاعر کے اہم موضوعاتِ فکر ہیں۔

"سدا بہار" کے مطالعہ سے، شاعر کی نظر کی وسعت، مشاہدہ کی گہرائی اور زبان و بیان پر کامل قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرزا شکور بیگ کے مزاح اور اسلوبِ اظہار میں شائستگی اور پاکیزگی ہے. بعض اشعار میں انسانیت کی بیداری، بنی نوع انسان سے پُر خلوص ہمدردی، خدمتِ خلق کے جذبہ کی اہمیت اور حق کے اظہار کی اخلاقی جرأت کی شدید ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، نفع خوری، خود غرضی، رشوت، جدید ترین فیشن سے متاثر اور مرعوب خواتین کی کم لباسی، نئی نسل کی والدین کی خدمت کے اہم فرض سے غفلت، جہل، فاقہ، اور تنگدستی جیسے مسائل "سدا بہار" کے اشعار کے موضوعات ہیں. انھوں نے اپنے پُر مزاح زندگی بخش اور حیات پرور کلام میں قاری کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے اور ہنسی ہنسی میں ایک کامیاب سرجن کی طرح چونکا دینے والے نشتر لگائے ہیں۔

الحاج مرزا شکور بیگ ایک مشہور وکیل بھی رہ چکے ہیں. پیشۂ وکالت سے ان کی دلچسپی کے اثرات "سدا بہار" میں اس طرح نمایاں ہوئے ہیں کہ جگہ جگہ انھوں نے بے تکلفی اور چابکدستی کے ساتھ قانون اور عدالت کی مخصوص اصطلاحوں کا استعمال کیا ہے جن سے مزاح کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

جناب مرزا شکور بیگ کی خصوصیاتِ کلام میں انگریزی الفاظ کا موزوں اور برمحل استعمال بھی قابلِ ذکر ہے. رزلٹ، تھینک یو، انسلٹ، پلیڈر، ڈپلومیسی، پریس (PRESS) کرفیو اس کی چند مثالیں ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ شاعر کو زندگی اور انسانیت سے پیار ہے، اس کے دل میں اخلاقی اور انسانی اقدار کے عام کرنے کی شدید خواہش موجزن ہے "سدا بہار" میں طنز و مزاح کے ذریعہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ——

سید محمد جعفری

لا اِلٰہ اِلّا اللہ

[روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ]

[منفرد و نامور مزاحیہ شاعر سید محمد جعفری جنوری ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ادبیات فارسی میں ایم اے اور ایم او ایل اور پھر انگریزی سے ایم اے کیا۔ محکمہ تعلیم و وزارت اطلاعات پاکستان سے منسلک رہے۔ ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا۔]

زباں سے کہتا ہوں ہاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ
نہیں عمل سے عیاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

سلالاٹ منٹ ہیں یاروں کی آستینوں میں
"نہ ہے زمیں نہ مکاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ"

خودی کو پال کے دُنبہ بنا دیا آخر
چھری ہو اس پہ رواں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

میں تجھ کو کہتا ہوں حاجی تو مجھ کو حاجی کہہ
"فریبِ سود و زیاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ"

مدیر و پیر و وزیر و سفیر و شیخ کبیر
"بتانِ وہم و گماں لا اِلٰہ اِلّا اللہ"

نمازی آئیں نہ آئیں اذان تو دے دوں میں
"مجھے ہے حکمِ اذاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ"

خودی جو خود کا مؤنث ہے گھر میں رہتی ہے
"صنم کدہ ہے جہاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ"

جو مولوی ہیں وہ کھاتے ہیں رات دن حلوے
"بہار ہو کہ خزاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ"

وہ لیڈری جو اُجڑ جائے چند لفظوں میں
دکانِ شیشہ گراں لا اِلٰہ اِلّا اللہ"

عجیب نصف غزل جعفری نے لکھی ہے
کہاں سے پہنچا کہاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ!

دیے کے خط ... (مراسلے)

برادرِ عزیز القدر !

جنوری ۱۹۸۶ء کا شمارہ ملا اور اس میں اپنا کارٹون نظر نواز ہوا "دادا" بننے کے بعد اردو کا ہر شاعر کم و بیش اسی شکل و صورت کا آئینہ دار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کارٹونسٹ کو دلی مبارکباد !

کارٹون کو مستقل رکھیئے کہ اب خدوخال کے مزید بگڑنے کے آثار کم ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا تباہی ممکن ہے تاہم دو سالہ پوتا کارٹون دیکھتے ہی فرطِ مسرت سے چلانے لگا "دادو ـــ دادو !"

آپکا ڈاکٹر راہی قریشی
(گلبرگہ)

پاسبانِ اردو !

سلام مسنون !

"شگوفہ" کا جنوری ۸۶ء شمارہ اچانک دور سے میرے مخصوص بک اسٹال پر نظر آیا۔ اگرچہ میرے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے لیکن "شگوفہ" کی شگفتگی نے اپنی جانب مجھے کھینچ ہی لیا۔ اور سب کچھ بھول کر میں اس کا سرسری مطالعہ میں لگ گیا۔ "شگوفہ" اردو زبان و ادب کے پاسبانوں میں ایک اضافہ ہے۔ خدا اسے دوام عطا کرے۔ چونکہ میری نظر میں پہلا شمارہ ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا پہلی ملاقات میں مناسب نہیں۔ پھر بھی اتنی بات ضرور ہے کہ شگوفہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور ہندوستان کے جرائد میں منفرد مقام قائم رکھتا ہے۔ تمام تخلیق ادبی و معیاری ہیں۔ امید ہے کہ شگوفہ ہر ماہ پابندی سے اردو زبان و ادب کے قارئین کے پژمردہ دلوں کو شگفتگی بخشتا رہے گا۔ آپ کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔ ایک گزارش ہے کہ آپ اس جریدہ میں اردو کی ترویج و ترقی کی خاطر جگہ مخصوص کر دیں اور ہند کے اردو دوستوں سے اپیل کریں کہ وہ اردو زبان کا استعمال ہند کے سبھی دفاتر میں کریں تاکہ ملک گیر زبان بن سکے۔

گر قبول افتد زہے نصیب۔ نیازمند

کوثر آفتاب، ایم۔ اے

مغربی چمپارن، بہار

محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب ! السلام علیکم !

شگوفہ کا سالنامہ ملا۔ بہت پسند آیا۔ خاص کر سرورق جسے دیکھ کر ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اندرونی صفحات میں مجتبیٰ حسین صاحب نے اشکباری پر مجبور کر دیا۔ فکر تونسوی صاحب کے بغیر ہندوستان کا یہ مایۂ ناز طنز و مزاح رسالہ یقیناً پھیکا ہوتا۔ آپکی کاوش و نظر قابلِ داد ہے۔ اس میگزین کی ادارت آپکی ذات سے تا دیر قائم رہے۔ آمین

آپکا سلطان جمہوری (بنگلور)

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب !

شگوفہ کا سالنامہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی بے شک آپکی مسلسل سعی اور کاوش اور مشاقِ نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یوسف ناظم کا انشائیہ بے حد عمدہ ہے اس کے بعد مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر صاحب نے خاصا متاثر کیا۔ پرویز مہدی بھی خوب ہیں البتہ مسیح انجم کا مضمون تھکے ہوئے حکیم کا تھکا ہوا نسخہ ہے۔ منظومات میں طالب خوندمیری، سمیع جلیل خوب ہیں۔ سمیع جلیل نے نئے انداز کی چیز پیش کی ہے۔ برق آشیانوی اور اسمٰعیل ظریف وہی پرانی سڑک کے مسافر لگتے ہیں۔ بہرحال یہ آپکا کمال ہے کہ آپ دورِ بلاخیز میں مزاح کا اتنا عمدہ رسالہ ملک سے نکال رہے ہیں جس کی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔ اور آپ کے اس کارنامہ کی ستائش بڑے پیمانے پہ ہونی چاہیئے۔ آپکا۔

شریف الدین نقوی (دہلی)

مکرمی تسلیم !

کل آپکا مرسلہ شگوفہ کا سالنامہ باصرہ نواز ہوا۔ ماشاءاللہ خوب ہے

یوسف گوہر شاہجہاں پوری۔

No 1... 2/68 **SHUGOOFA Hyderabad-1** Postal Regd. No. H. H...

Vol. 19 ... 2 February 1986 Phone : 6...

MARCH 1986 Rs. 4·00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ
حیدرآباد

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمالؔ

جلد (۱۹) ★ مارچ ۱۹۸۶ء ★ شمارہ (۳)

فی پرچہ: ۴ روپے ○ زرِ سالانہ: چالیس ۴۰ روپے
بیرونی ہند سے: ۱۲۵ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف ○ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۲.
خط وکتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱، بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱

فون آفس: 557716 ◎ فون مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

حق تو یہ ہے کہ . . . . (ترجمہ)

جلوہ روبرو (انٹرویو)

چورن (منظومات)

برقؔ آشیانوی

ایک اور غم پانی کا

کھانے کے بغیر انسان کئی دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے لیکن پانی کے بغیر زیادہ دنوں تک زندہ رہنا ممکن نہیں۔ کھانے کے بغیر زندہ رہنے کی "زندہ مثال" تو آپ ہم سب ہیں جو برسوں سے غذائی قلت کے باوجود نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ہر سال پابندی کے ساتھ زندہ دلانِ حیدرآباد کے مزاحیہ اجلاسوں اور مزاحیہ مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی زندہ دلی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ہماری یہ زندہ دلی (جو دراصل ہماری فاقہ مستی کا نتیجہ ہے) کا انجام یہ ہے کہ محکمہ اغذیہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ ہمارا ملک غذائی اعتبار سے خود مکتفی ہو گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم بھوکے رہنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ خوراک ہمارے لیے کافی ہونے کے بجائے ہم خوراک کے لیے کافی ہو گئے ہیں۔ بہرحال برسوں کی ریاضت کے بعد ہم نے بھوک اور بھوک نے ہم پر قابو پا لیا تھا کہ اچانک پیاسے رہنے کا سوال بھی ہمارے سامنے آگیا۔ پانی کی شدید قلت کے نتیجہ میں جو عجیب واقعات پیش آ رہے ہیں اُن میں سے چند واقعات ملاحظہ فرمایئے۔

اسکولوں میں بچے اپنے لیے پینے کا پانی واٹر باٹل میں لے جانے لگے ہیں۔ جو بچے اپنے ساتھ پانی نہیں لاتے اسکول کے سامنے ٹھیلے والے انہیں بیس یا پچیس پیسے میں ایک گلاس پانی دے کر "کالا پانی" کا دھندہ کر رہے ہیں۔ امتحان قریب آگیا تو ایک صاحب نے اپنے بچے کو ٹیوشن لگانا چاہا۔ چنانچہ ایک ٹیچر پڑھانے پر راضی ہو گئے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ وہ فیس کیا لیں گے تو انھوں نے جواب دیا کہ "روزانہ ایک گھڑا پانی لوں گا"۔ بچے کے والد نے کہا "یہ تو بہت زیادہ ہے"۔ ماسٹر نے کہا "خیر آدھا گھڑا پانی روزانہ دیجیے"۔ اس پر بھی بات نہ بنی تو آخر میں ماسٹر صاحب نے ایک لوٹا پانی روزانہ پر ٹیوشن کرنا قبول کر لیا۔

شادی کی دعوت کے رقعوں پر کچھ موزوں و مناسب اشعار دیکھنے میں آنے لگے۔ حال ہی میں ایک شادی کا دعوت کا رقعہ ہمیں وصول ہوا۔ تلاش کے اوپر کے دو گوشوں پر ذیل کے دو شعر درج تھے ؎

دعوت ہے خاکسار کے گھر آج عقد کی ٭ تکلیف آپ تھوڑی سی حسبِ منا اٹھایئے
بریانی اور مرغِ مسلّم تو ہے مگر ٭ پینے کا پانی اپنے لیے ساتھ لایئے

[illegible] سے ہمارے گھر میں جو دودھ آرہا ہے وہ نہایت خالص ہے۔ ہم نے گوالے سے دودھ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی تم بہت ایمان دار ہو گئے ہو۔ دودھ بالکل خالص دینے لگے ہو"! اس پر گوالے نے غصّے میں آکر کہا۔ "صاحب کون بے ایمان آپ کو خالص دودھ دینا چاہتا ہے۔ وہ تو پانی نہیں مل رہا ہے جو دودھ میں ملایا جا سکے"!

جمعرات کے روز فقیر نے دروازے پر آواز دی۔ "سرکار کا اقبال سلامت رہے آج جمعرات کا دن ہے۔ اللہ کے نام پر ایک قطرہ پانی خیرات کیجئے۔ اللہ آپ کو غریق رحمت کرے گا"!

محلّے میں چوری کی ایک واردات ہوئی۔ صاحب خانہ صبح صبح گھر کے سامنے رنجیدہ و ملول کھڑے تھے کسی نے پوچھا۔ "کیوں صاحب کیا واقعہ ہوا"؟ اتفاق سے صاحبِ خانہ شاعر تھے۔ چنانچہ انھوں نے درد انگیز اور رقّت آمیز لہجے میں ذیل کا قطعہ نہایت ہی رقت انگیز ترنم کے ساتھ سُنایا ؎

کل شب ہمارے گھر ہوئی سرقہ کی واردات ؛ ہم کو تو غم یہی ہے کہ سارق نے کیا لیا
نقدی و زیورات چراتا تو غم نہ تھا ؛ ظالم نے سارا پینے کا پانی چُرا لیا

دو دن کے بعد ہی چور پکڑا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ عادی پیشہ ور مجرم نہیں ہے بلکہ محلّے کا ایک شریف آدمی ہے۔ بیوی بچے دو دن سے پیاسے تھے تو اس نے پانی کی چوری کی تھی۔ جب وہ عدالت میں پیش ہوا اور اقبالِ جُرم کرلیا تو مجسٹریٹ نے فیصلہ صادر فرمایا: "ملزم پانچ سو روپے جُرمانہ ادا کرے۔ بصورت عدم ادائی جُرمانہ جن صاحب کے گھر اس نے چوری کی ہے۔ اُن کے گھر روزانہ دو گھڑے پانی بھرا کرے"۔ اس فیصلے کے بعد ملزم نے فوراً پانچ سو روپے جُرمانہ ادا کر دیا۔ اور مجسٹریٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "حضورِ والا میں آپ کا بیحد احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے بہت سستے میں چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ میں نے جتنا پانی چُرایا تھا وہ دو تین ہزار روپے خرچ کرنے پر بھی نہ ملتا تھا۔

ایک نوجوان کی شادی کی بات چیت ہو رہی تھی۔ لڑکے کے والد نے لڑکے کے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اچھے اخلاق و عادات اور شرافت کی تعریف کی تو لڑکی والوں نے سوال کیا۔ "وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتلائیے کہ وہ پانچ یا چھ میل کے فاصلہ سے دن بھر میں کتنے گھڑے پانی لا سکتا ہے"؟ یہ سُن کر لڑکے کے والد پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ (گھڑوں پانی پڑ گیا تو ہم نے محاورۃً استعمال کیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں تو ایک قطرہ بھی پانی کا ان پر نہیں پڑا اس لیے کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اُس وقت ملنا مشکل تھا) اور انھوں نے جواب دیا۔ "میرا لڑکا تو بالکل ہیچ ہے"، گھڑا بھر پانی تو وہ کیا لائے گا جبکہ ایک خالی صراحی اٹھاتا ہے تو اسکی ناف ٹل جاتی ہے"۔ یہ سن کر لڑکی والوں نے انکار کر دیا۔

بعض مقامات پر ایک روپیہ فی گلاس کے حساب سے پانی مل رہا ہے۔ لیکن وہ بھی خالص نہیں ملتا۔ کچھ بے ایمان لوگ اب پانی میں بھی ملاوٹ کرنے لگے ہیں اور آدھے لوٹے پانی میں آدھا لوٹا دودھ ملا کر بیچ رہے ہیں۔

یہ بات عام ہے کہ جب ملک میں کوئی ہنگامی حالات پیدا ہوتے ہیں تو سیاسی لیڈر، ملک کے دانشور اور سائنٹسٹ (SCIENTIST) بڑے دلچسپ انکشافات کرتے ہیں۔ اور نہایت "پُر خلوص" بیانات جاری کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک لیڈر نے یہ تجویز پیش کی کہ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ پانی کم پیا کریں۔ یعنی دن بھر میں ایک وقت اور وہ بھی قطرہ دو قطرے سے زیادہ نہ پیئں۔ اس کی جگہ دودھ زیادہ استعمال کریں۔ علاوہ ازیں ہفتے میں ایک دن پانی کا

"پیاس" کریں۔ یعنی دن بھر پانی نہ پیئں۔ ایک شاعر بادہ نوش نے کہا کہ اب پانی کی جگہ لوگوں کو چاہیئے کہ "شراب" پی لیا کریں۔ ایک ملا صاحب نے اس پر غم و غصّہ کا اظہار کیا تو شاعر نے کہا "ملا صاحب۔ آپ "شرابِ طہور" پی لیا کیجئے۔ اس طرح آپ کے تمام کردہ و ناکردہ گناہ بھی معاف ہو جائیں گے" ملا صاحب کو اس پر بہت غصّہ آگیا لیکن وہ "غصّہ" کو پی گئے" اس طرح تھوڑی سی پیاس اُن کی بجھ گئی۔

ایک ماہر طب نے رائے دی کہ روزانہ نہانا اور منہ ہاتھ دھونا چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس میں پانی کے غیر ضروری صرفہ کے علاوہ یہ عمل خلاف فطرت بھی ہے۔ اس کی بہترین مثال جانور جو عین فطری اصول پر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ یعنی وہ نہ کبھی نہاتے ہیں اور نہ کبھی منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کی صحت انسانوں کے مقابلہ میں بہت اچھی رہتی ہے۔

ایک دانشور نے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "ہم کو پانی کے لیے ابر و باراں کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ پانی حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں ایک ایسا درخت دریافت کر لیا گیا ہے جس کے پیڑ میں سوراخ کر دیا جائے تو اس میں سے پانی اس طرح سے نکلتا ہے جیسے کہ میونسپلٹی کے نل کی ٹونٹی سے۔ ون مہا اتسو کے موقع پر ایسے درخت ملک کے گوشے گوشے میں بہ کثرت لگائے جائیں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ ان درختوں کا بھی وہ حشر نہ ہو جو اب تک لگائے گئے درختوں کا ہوا۔ یعنی ہر سال اسی مقام پر درخت نہ لگایا جائے جہاں گزشتہ سال لگایا گیا تھا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے تحمل ہو کر کہا کہ "ہمارے پاس ایک پہاڑ ہمالہ تو موجود ہے اور اس سے پانی مل رہا ہے" اس پر مقرر صاحب نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا "یہی تو ہماری بدبختی ہے کہ صدیوں سے ہم صرف ایک پہاڑ پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ حالاں کہ وقت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ سارے ملک میں ہمالہ سے بھی اونچے پہاڑ تعمیر کیے جائیں تاکہ کسی ریاست یا ضلع میں بادو بہاراں کی محتاجی نہ رہے اور ہر موسم میں پانی ملتا رہے اور کسی وقت بھی پانی کی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑے"

میونسپلٹی کے نلوں کے پاس پانی کے لیے عوام کا ایک ہجوم رہتا ہے اور ہر آدمی کے پاس فی نفر دو دو گھڑوں کا ہجوم آدمیوں کے ہجوم سے دو گنا نظر آتا ہے۔ اس ہجوم میں عورتیں زیادہ رہتی ہیں جو پانی کے انتظار کی زحمت کو اپنے اپنے شوہروں کی شکایت کے غم میں گھول کر پانی کی طرح پیتی رہتی ہیں۔ بعض وقت بات بات میں کوئی جھگڑے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو عورتیں اپنے شوہروں کی شکایتوں کو چھوڑ کر مخالف عورتوں کے شوہروں کے نکمے پن کی شکایت پر اتر آتی ہیں اور ایک دوسرے کو طعنہ دیتی ہیں کہ "تمہارا شوہر اتنا نکما ہے کہ چار پانچ میل دور جا کر پانی تک نہیں لا سکتا جس کی وجہ سے تم کو خود پانی کے لیے یہاں آنا پڑا ہے۔ ایسے شوہر کو تو "چلو بھر پانی" میں ڈوب مرنا چاہیئے" اس پر کوئی صاحب بیچ بچاؤ کر کے کہتے ہیں کہ "مائی اگر ڈوب مرنے کے لیے چلو بھر پانی مل جاتا تو بے چارہ ڈوب مرنے کے بجائے دو ایک روز تک اسی پانی پر گزارہ نہ کر لیتا"

غرض پانی کی قلت نے سالِ حال کئی مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ خود ہم پر جو گزر رہی ہے اس پر "پانی کا مرثیہ" کے نام سے ہم نے ایک نظم کہہ ڈالی ہے جو آئندہ اشاعت کیلئے روانہ کریں گے۔ کیوں کہ ابھی پانی کے غم میں کم از کم تین مہینے تک تو غوطے کھانا ہے!

مثنوی [اخترؔ اورینوی کے نام]

مجتبیٰ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، خوش رہیے۔

کل شام میرے ایک بہت پرانے دوست، عرصۂ دراز کے بعد ملنے کو آئے تو میرے لیے ایک SURPRISE بھی لائے۔ ۱۹۴۹.۵۰ء میں میرے بہت ہی عزیز دوست، ڈاکٹر اخترؔ اورینوی مرحوم، پٹنہ یونیورسٹی کے مسلم ہوسٹل (جو اب اقبال ہوسٹل کے نام سے موسوم ہے) کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اس ہوسٹل میں طالب علمی کے زمانے میں ہم دونوں بورڈر بھی رہ چکے تھے۔ ہمارے کمرے بالکل متصل تھے۔ جہاں مختلف قسم کی مشترکہ شرارتیں کی جاتی تھیں۔ اسٹڈی پیریڈ میں بجائے پڑھنے کے، فی البدیہہ مشاعرے منعقد ہوتے، جن میں اس وقت کے ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ یا دوسرے لڑکوں پر اشعار چست کیے جاتے۔ اخترؔ مرحوم فارسی میں، اور میں اردو میں نظمیں لکھتا، کوئی صاحب ان نظموں کو بھیرویں یا کسی اور راگ میں گایا کرتے۔ بہرحال جب اخترؔ صاحب اس ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے تو میرا قیام سکریٹریٹ کے علاقے میں جو یونیورسٹی ایریا سے آٹھ دس کیلومیٹر کی دوری پر ہے، ایک سرکاری مکان میں تھا ہر دوسرے تیسرے دن یا تو میں سائیکل سے اخترؔ صاحب سے ملنے کے لیے مسلم ہوسٹل چلا جاتا تھا، یا وہ خود کبھی تنہا اور کبھی اپنی بیگم شکیلہ اخترؔ کے ہمراہ رکشے پر میرے یہاں گردنی باغ آجاتے تھے۔ ایک دن اخترؔ مرحوم نے مجھے دن کے کھانے پر مدعو کیا۔ وقتِ مقررہ پر جب میں ان کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ صبح سے وہ گھر سے غائب ہیں۔ شکیلہ بھی موجود نہیں تھیں۔ بڑا غصہ آیا۔ گھر واپس آکر، میں نے ایک طویل نظم "تنبیہ الغافلین" کے نام سے لکھی جسے دوسرے دن ان کے نام ... پوسٹ کر دیا۔ اخترؔ صاحب کو جب نظم ملی تو اپنی عدم موجودگی کی تلافی کے لیے شکیلہ کے ساتھ میرے یہاں آئے۔ ہم لوگوں نے مزہ لے لے کر کئی بار اس نظم کو پڑھا، اور گھنٹوں پرانی باتوں کو یاد کر کے خوش ہوتے رہے۔ ایک طویل عرصہ گزر گیا، وہ بات اور وہ نظم طاقِ نسیاں کی نذر ہو گئی۔ مگر اتفاق سے اس نظم کی نقل کسی پرانے رسالے میں پڑی رہ گئی تھی۔ اب معلوم نہیں وہ رسالہ کس طرح اور کب میرے دوست کے ہاتھ لگ گیا، جو کل شام کو آئے تھے۔ اسے دینے کے لیے۔

اخترؔ صاحب کو انتقال کیے ہوئے نو سال گزر گئے، شکیلہ اخترؔ بھی بیمار اور ضعیف ہو کر خانہ نشین ہو گئی ہیں۔ دیگر احباب بھی ایک ایک کر کے چل بسے۔ اب بڑی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے میں ۳۷-۳۶ برس پرانی یہ نظم جب دفعتاً مل گئی تو خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات دل میں امنڈ آئے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شگوفہ میں اسے شائع فرما دیں، تاکہ اس کی یاد آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائے۔ — رضا نقوی واہی، پٹنہ۔

مرحبا اے پروفیسر صاحب — آدمی ہو کہ حبالوز صاحب
مجھ کو بلوا کے گھر سے اتنی دور — کل تھے غائب کہاں یہ خود ہی حضور
یاد تو کیجیے ذرا حضرت — آپ نے کی ہے کیا بُری حرکت
انجمن میں مشاعرے کی شام — آپ نے مجھ کو یہ دیا تھا پیام
بھئی اتوار کو ضرور آنا — اور مرے ساتھ ماحضر کھانا
میں نے وعدہ کیا کہ آؤں گا — آپ کے ساتھ دن گنواؤں گا
حسبِ وعدہ چنانچہ حضرت — آپ کے گھر کو میں نے دی زینت
لیکن افسوس آپ کا وعدا — ایک دھوکہ تھا سر بسر دھوکا
میں جو پہنچا غریب خانے پر — مرثیہ پڑھ رہے تھے بام و در
دیر تک میں پکارتا بھی رہا — ہاتھ کھڑکی پہ مارتا بھی رہا
نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد — آپ کا گھر تھا خانۂ برباد
دفعتاً ایک خشخشی داڑھی — ایک کھڑکی پہ سامنے آئی

میں نے پوچھا کہ اے فرشتہ سیر گھر کے مالک کی آپ کو ہے خبر؟
بولے نکلے ہیں وہ سویرے سے واپس آئیں گے گھر پہ رات گئے
سن کے ناخوشگوار سی یہ خبر چوٹ اک زور کی لگی دل پر
اور کیا اُس نے یاد لعنت سے اور وہ بھی بڑی فصاحت سے

(۲)

آپ کا ڈھنگ تو نرالا ہے دال میں کچھ ضرور کالا ہے
جب سے بیگم گئیں مظفر پور آپ کو سوتو مل گیا بھرپور
دل کہیں اور پھر لگا بیٹھے فتنۂ عشق پھر جگا بیٹھے
پھر خرد کو کیا جنوں آشام پھر جنوں سے ہوا پیام و کلام
عقل پر پھر بٹھا دیئے پہرے ہوش پر پھر لگا دیئے پہرے
مذہبیت کو کر دیا رخصت آدمیت کے منہ پہ ماری چپت
باؤلا بن گئے محبت میں رہے باقی نہ اپنی حالت میں
اس بڑھاپے میں ناک کٹوادی اور کٹی ناک سب کو دکھلا دی
گر نہ ہوتی یہ بات اے اختر آپ غائب نہ رہتے یوں دن بھر
آپ کی حرکتیں ہیں خود ہی گواہ آپ کو لگ گئی کسی کی چاہ
ورنہ ہوتا جو ٹھیک چال چلن آپ بنتے نہ آج وعدہ شکن

(۳)

کاش اسکی خبر اُدھر ہو جائے عشق کی بات مشتہر ہو جائے
کاش لکھدے کوئی مظفر پور کوئی پہنچا دے کاش ان کے حضور
آپ کے عشق کے فسانے کو اس نئے دل کے شاخسانے کو
اور چلکے سے وہ چلی آئیں گھر کو خالی جناب سے پائیں
ہو کے مجبور عشق کے ہاتھوں حسبِ معمول آپ غائب ہوں
ساری باتوں کو تاڑ جائیں وہ غیظ سے ہونٹ کو چبائیں وہ
اُن کے غصے کا ہو اثر سب پر مارے دہشت کے کانپ جائے گھر
نتھنے پھولے ہوں سانس چڑھتی ہو آگ غصے کی تیز بڑھتی ہو
کبھی دائی پہ ڈالیں تیکھی نظر کبھی برسیں غریب نوکر پر
الغرض یوں ہی دوپہر گزرے وقت تیزی سے بھاگ کر گزرے
شام ہو جائے رات آجائے ہر طرف تیرگی سما جائے

(۴)

اس طرف ہو یہ حال اور اُدھر زلزلے یار پر ہو آپ کا سر
عشق بازی کی گھات چلتی ہو جیت چلتی ہو مات چلتی ہو
دفعتاً جب گھڑی پہ جائے نظر رات نے طے کیا ہو نصف سفر
وقت آجائے شب کے کھانے کا دھیان پیدا ہو گھر پہ جانے کا
الغرض گاتے گنگناتے ہوئے آپ گھر آئیں مسکراتے ہوئے
جوں ہی کمرے میں آپ رکھیں قدم ہو شکیلہ سے آنکھ چار اُس دم
آپ کو دیکھیں وہ اور اُنکو آپ اک قیامت ہی آئے باپ رے باپ
چور دل کا عیاں ہو صورت سے آپ بس چپ کھڑے ہوں مورت سے
وہ یہ پوچھیں کہاں گئے تھے جناب چپ ہیں کیوں دیجئے زباں سے جواب
دوپہر سے کہاں بسیرا تھا نصف شب تک کہاں کا پھیرا تھا
آپ سمجھیں انہیں خبر ہی نہیں عشق کی بات مشتہر ہی نہیں
اور پھر جھوٹ سے بنائیں کام اپنے کالج کا کچھ دکھائیں کام
جھوٹ کی چال چل سکے نہ مگر ڈر کے مارے جھکا لیں آپ نظر
پھر تو اُن کی زبان کھل جائے وہ سنائیں کہ کان کھل جائے
بولیں، میں جانتی ہوں سب احوال پھر بگڑنے لگی ہے آپ کی چال
شاہ بیچو نے خط لکھا تھا مجھے اور پتہ آپ کا دیا تھا مجھے
میں سمجھتی تھی جھوٹ باتیں ہیں آپ کے دوست کی وہ گھاتیں ہیں
لیکن اللہ آج دیکھ لیا آپ کا بھی مزاج دیکھ لیا
میری غیبت کا یہ مآل اللہ دو ہی دن میں یہ گھر کا حال اللہ
میں بھی جانوں تو اُس کلو لی کو آپ کی کلموہی چھبیلی کو
کوٹھے والی ہے خاندانی ہے! کس کی خالہ ہے کس کی نانی ہے
کیا بدیسی کوئی فرنگن ہے یا کوئی لکھنؤ کی ناگن ہے
اب تو اور دل میں بھی رہا نہ کوئی عشق کے واسطے بچا نہ کوئی
اب بچاری سکھی بھی بھول گئیں نوجوانی کا خواب بھول گئیں
پھر ہے یہ کون سی موئی مُردار جسکا جادو چلا ہے اے سرکار
مانگ میں اُسکی آگ لگ جائے اسکو میرا سہاگ لگ جائے
مجھ کو مل جائے تو چبا جاؤں اُس نگوڑی کو زندہ کھا جاؤں
اب میں سمجھی کہ "اجتناب" کی نظم واقعی مجھ پہ تھی جناب کی نظم
کاش پہلے مجھے خبر ہوتی آپ کی چال پر نظر ہوتی

(سلسلہ صفحہ ۱۲ پر)

جانتی میں کہ آپ ایسے ہیں　ہونے والے کے باپ ایسے ہیں
ہوتی واقف جو اس طبیعت سے　آپکے دل کی اِس بری لت سے
پھر میں کاہیکو آپ کی ہوتی　اور قسمت کو آج یوں روتی

میں بھی یوں ہی لگاتی پھرتی دل　رہ گزر پر لٹاتی پھرتی دل
میں بھی کرتی کہیں زلیخائی　ہیں بہت سے مرے تمنائی
میں بھی آفاق گیر ہو جاتی　اور شرف یاب بِ میر ہو جاتی
کیا میں نک سک میں ہوں کسی سے کم　چھینہ لیتا زمانہ میرے قدم
خیر سے دل میں ہے اُمنگ ابھی　اُس میں بجتی ہے جلترنگ ابھی

(۵)

الغرض گھر میں وہ تماشا ہو　خواب میں بھی نہ جسکو دیکھا ہو
سُنکے بیگم کی یہ کھری گفتار　آپ غش کھا کے گر پڑیں اکبار
پھر تو اک دوسری قیامت ہو　ڈاکٹر کی شدید حاجت ہو
دفعتاً میں کہیں سے آجاؤں　دوڑ کر ڈاکٹر کو لے آؤں
ڈاکٹر پھر بڑی ریاضت سے　ہوش میں لائے تمکو دقت سے
آنکھ کھلتے ہی تم مجھے دیکھو　اپنے بالیں پہ سامنے دیکھو
یاد آجائے وعدۂ دعوت　اور شیکھے نگاہ سے خِفّت
پھر معافی کے خواستگار ہو　دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر یہ کہو
غلطی ہو گئی خدا کی قسم　اب نہ ہو گی کبھی خدا کی قسم
تم سے کرتا ہوں آج عہد نیا　حشر تک جو کبھی نہ ٹوٹے گا!
کسی اتوار کو خدا کی قسم
اب نہ جائیں گے گھر سے باہر ہم

رضا نقوی واہی (پٹنہ)

قطعات

دعوتوں کے رقعوں پر یہ بھی اب لکھا ہو گا
گھر سے پانی لا لیجے اپنے ہی گلاسوں میں!
اب کسی بھی حاجت کو پانی بل نہیں سکتا
ہو رہی ہے قوالی آبدار خانوں میں

○

روڈ پر ٹھیرا ہوا چوری اک اِسکوٹر گیا
ایک محفل میں ہمارا کل نیا مفلر گیا
شہر سے پانی گیا بازار سے چلّر گیا
جانے والا سال تو سب کی حجامت کر گیا

○

جدیدیت کی نہ عہدِ کہن کی بات کرو
جس انجمن میں ہو اُس انجمن کی بات کرو
کسی پہ تبصرہ کرنے سے کچھ نہیں حاصل
سنو مشاعرے اور تاڑ بن کی بات کرو

○

کسی دن ایٹمی ٹکّر سے ڈبّہ گُل نہ ہو جائے
اگر مر جائیں سب انسان تو شیطانوں کا کیا ہو گا
وہ بیڈم کچھ بھی لیکر چاند پر اب جانیوالے ہیں
نہ ہوگی چاندنی راتیں تو ارمانوں کا کیا ہو گا

○

اسمٰعیل ظریف (پٹنہ)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

عابد معز

ڈسکو الکشن

جمہوری ملک کی پہچان ہے کہ وہاں سال کے بارہ مہینے
کوئی نہ کوئی چناؤ ہوتا رہتا ہے۔ پارلیمنٹ، اسمبلی، بلدیہ، پنچایت،
مختلف یونین کے انتخابات حتیٰ کہ جہاں دو سے تین اشخاص یکجا ہوئے وہاں بھی
الکشن ہونا ضروری ہے۔ ہر چناؤ میں ہوتا وہی ہے، اُمیدوار ووٹ مانگتے ہیں اور رائے دہندے
(ہمارے ایک دوست کے خیال میں رائے دینے والے اندھے) ووٹ ڈالتے ہیں۔ لیکن جس طرح اُردو شاعری
میں ایک ہی خیال کو مختلف شعرائے کرام اپنا اپنا انداز بیاں دیتے ہیں۔ اُسی طرح ووٹ مانگنے اور ڈالنے کے باوجود ہر
الکشن کا ایک جداگانہ انداز ہوتا ہے۔ پچھلے مہینے ہمارے شہر میں مجلس بلدیہ کے لئے الکشن ہوئے۔ یہ الکشن دلچسپ، میوزیکل
اور فلمی انداز سے ہوئے۔ اس الکشن سے پہلے ہمارے شہر میں جو الکشن ہوئے تھے ان کے ساتھ فسادات اور کرفیو کا لامتناہی
سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اسی لئے ہم "الکشن بے زار" تھے لیکن اس مرتبہ چناؤ میں ہم جیسے الکشن بے زار لوگوں کو بھی دلچسپی
پیدا ہوئی۔ اس تبدیلی کے لئے سیاست میں وارد فلمی ستارے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے ملک کی سیاست میں فلمی ستاروں اور
کھلاڑیوں کی بدولت چناؤ کے تیور بدل چکے ہیں۔

جس طرح فلم کی کامیابی کے لئے گانے ضروری ہیں اسی طرح الکشن کی مہم کے لئے گانوں کا ہونا ضروری قرار پایا۔
ہر پارٹی گانے تیار کرنے لگی۔ گیت کاروں، موسیقاروں اور گلوکاروں کی بن آئی۔ سیاست داں مختلف گیت کاروں سے
گیت لکھوانے لگے۔ موسیقاروں نے ان کے گیتوں کو دھن سے سجایا اور گلوکاروں نے انھیں گایا۔ ہر پارٹی کا اپنا ایک
گیت کار، موسیقار اور گلوکار مقرر ہوا۔ ادب میں فلمی شاعری کی طرح سیاسی شاعری بلکہ انتخابی شاعری کا باب کھلا۔ گیت کار
موسیقار اور گلوکار فخریہ طور پر اپنا تعارف کروانے لگے "میں فلاں پارٹی کا گیت کار ہوں، میرے گیتوں کے بل بوتے پر

پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے۔ سیاسی قائدین کی طرح گیت کار، موسیقار اور گلوکار دَل بدلنے لگے۔ مختلف قسم کے فلمی گانے فلم کی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ ایسے ہی مختلف قسم کے انتخابی گانے تیار ہونے لگے۔ دوگانے، کورس، بھجن، قوالی، پیروڈی، ڈسکو گانے وغیرہ۔

گانے تیار ہونے کے بعد انتخابی جلسوں میں انھیں ریلیز کیا گیا۔ ریکارڈ اور کیسٹ ریلیز ہوکر گلی گلی انتخابی دفاتر پہنچے۔ بس صاحب شہریوں کا دم نکل گیا۔ حسبِ مقدور جیپ، آٹو رکشہ، رکشہ اور سیکل لاوڈ اسپیکر اٹھائے گانے بجاتے ہوئے شہر کی سڑکوں پر دوڑنے لگے۔ انتخابی دفاتر سے چوبیس گھنٹے گانے نشر ہونے لگے۔ کارکن اپنی اپنی پارٹی کے گانے گنگنانے لگے۔ ہمارا خیال ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی پر فلمی گانوں کے مختلف پروگرام کی طرح انتخابی اور سیاسی گانوں کے پروگرام شروع کئے جا سکتے ہیں۔ جیسے آپ ہی کے گیت، اپوزیشن کے گیت، دائیں بازو کے گیت، فرقہ بند گیت، بھارت بند گیت، احتجاجی گیت، ہڑتالی گیت، دھرنا گیت وغیرہ۔ اب وقت آگیا ہے کہ ادب میں فلمی، سیاسی اور انتخابی شاعری کا مقام بھی متعین کردیا جائے ورنہ سیاسی اثرات کے تحت اُردو شاعری میں پھوٹ بھی پڑ سکتی ہے۔

شاعر جب انتخابی گانے دھوم سے لکھنے لگے تو نثر نگار کہاں نچلے بیٹھنے والے تھے۔ شعرا سے زیادہ سیاسی قائدین میں اُن کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ تقاریر جو لکھ کر دیتے تھے اب نثر نگار بھی نئے انداز سے تقاریر لکھنے لگے۔ تقاریر کے کیسٹ تیار کرکے انتخابی مہم میں شدت پیدا کی گئی۔ تقاریر پر فلمی ڈائیلاگ کا شبہ ہونے لگا۔ اتفاق سے ہمیں ایک سیاسی قائد کے لئے لکھی ہوئی تقریر کا پرچہ ہاتھ لگا۔ تقریر کیا تھی بس یوں سمجھئے کہ منظر نامہ تھا۔ "بہنو اور بھائیو (سامعین پر نظر ڈالئے۔ ہاتھ جوڑئیے اور جُھک کر سلام کیجئے) آپ سبھی جانتے ہیں کہ ہم کیوں جمع ہیں۔ میں یہ بتانے کے لئے آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا کہ ووٹ کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ ووٹ (ہوا میں ہاتھ لہرائیے) ووٹ ایک طاقت ہے جو ہماری ترقی کی راہیں کھول اور بند کرسکتی ہے (حواریوں کی جانب سے تالیاں) ...... پچھلی حکومت نے کیا کیا (وقفہ) کچھ نہیں کیا۔ (حقارت سے) اپنا اور اپنوں کا بھلا کرتے رہے (افسوس کے ساتھ) میں آپ لوگوں کی خاموش خدمت کرتا رہا (جُھک کر سینے پر ہاتھ رکھیں) لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ (اونچی آواز سے) سیاسی افق پر دمدار ستارے کی طرح نمودار ہوجاؤں (آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے تارا بنائیں۔ حواریوں کی تالیاں)۔ میں بلند بانگ وعدے نہیں کروں گا۔ غریبی ہٹانے کا دعویٰ نہیں کروں گا لیکن (وقفہ) میں ہر غریب کی زندگی میں امیری لے آؤں گا (حواریوں کی جانب سے زندہ باد کے نعرے) ہر غریب خود غریبی کو چھوڑ کر امیری کی اُور بڑھتا چلا جائے گا (ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ) ...... منظر نامہ کافی طویل تھا جس میں لاوڈ اسپیکر کو مکّہ مارنے، اپنا گریبان پھاڑنے، ہنسنے، رونے کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اُترنا اور پھر چڑھنا بھی شامل تھا۔

آج زمانہ لکھنے پڑھنے سے زیادہ دیکھنے اور سننے کا ہے۔ لوگ پڑھنے اور لکھنے کی محنت کرنے کی بجائے آرام سے بیٹھے دیکھنا اور سننا پسند کرتے ہیں۔ ہر میدان میں AUDIO - VISION کا سہارا لیا جارہا ہے۔ سو ہمارے شہر میں الکشن مہم کے لئے فلمیں بنائی گئیں۔ فلمیں بلاٹکٹ دکھائی گئیں بلکہ فلم دیکھنے والوں کو مونگ پھلی، چنے، پٹانے، چڑوا اور چائے مفت پیش کی گئی۔ ہم نے کوئی فلم نہیں دیکھی لیکن فلمیں دیکھنے کے شوقین

ہمارے ایک دوست نے بتلایا :- میں روایتی فلموں سے بیزار ہوکر انتخابی فلمیں دیکھنے گیا لیکن انتخابی فلمیں بھی روایتی فلموں کی طرح ثابت ہوئیں۔ حقیقت سے کوسوں دور، گلیمر اور تخیل سے بھرپور۔ فوٹوگرافی کے جادو سے کنوؤں میں پانی آرہا ہے۔ ہرے بھرے کھیت لہرا رہے ہیں۔ لوگ خوشی کے گیت گا رہے ہیں، ہر جگہ امن و امان ہے۔ فلم دیکھ کر محسوس ہوا کہ ہم سے زیادہ فوٹوگرافی ترقی کرتی جارہی ہے۔

انتخابی مہم کا دارومدار پدیاترا پر ہوتا ہے۔ یہی ایک موقع ہوتا ہے جب قائدین پیدل چلتے اور عوام سے ملاقات کرتے ہیں۔ انتخابات ختم ہونے کے بعد انھیں شائد ہی کبھی پیدل چلنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ بعض امیدواروں نے گلی گلی پدیاترا کی۔ بینڈ باجہ کے ساتھ۔ بینڈ باجہ والوں کو ایک نیا بزنس ہاتھ آیا ہے ورنہ شہر میں وقفہ وقفہ سے ہونے والے فسادات نے بے چاروں کا دھندہ ہی چوپٹ کردیا تھا۔ بینڈ باجے کے پیچھے امیدوار پھول کا ہار پہنے ہاتھ جوڑے سلام کرتے ہوئے ووٹ کا دان مانگتا پھر رہا تھا۔ ساتھ میں کارکن ورقیے تقسیم کرتے چل رہے تھے اس پدیاترا پہ ہمیں شادی کی بارات کا گمان ہوا بلکہ ہماری لڑکی نے ایک لیڈر کی بارات نما پدیاترا پر ہم سے پوچھا "پپا دیکھئے دولھا کتنا بوڑھا ہے اس کی دلہن کیسی ہوگی۔" ہم نے جواب دیا "اس کی دلہن ایک کرسی ہے"

پدیاترا کے دوران امیدوار جس محلہ اور گلی میں جاتے وہیں کا بھیس اور انداز اختیار کرتے۔ کبھی پتلون شرٹ پہنے ہیں تو کبھی کرتا پاجامہ، شیروانی تو پہننا ضروری ہے۔ کئی ووٹ شیروانی کے جیب میں پڑتے ہیں۔ سر پر کبھی کشتی ٹوپی تو کبھی ہیٹ ہے۔ کبھی نمسکار تو کبھی سلام کیا جارہا ہے۔ کبھی تلگو میں تو کبھی ہندی میں تقریر ہورہی ہے۔ اُردو تو خیر سے ووٹ کا بلینک چیک ہے جسے جھوٹے وعدوں پر بھنایا جاسکتا ہے۔ اکثر ہمیں پدیاترا پر شوٹنگ کا گمان بھی ہوا، بھیس بدلنے کیلئے میک اپ مین ساتھ ہے۔ مختلف کپڑے اور وگ الگ سے ہیں۔ قدم قدم پر اداکاری ہورہی ہے۔ ہمارے ایک قومی قائد نے چند دن قبل کہا ہے کہ اداکاری اور سیاست میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی ایک سکہ کے دو رخ ہیں۔ فلمی اداکاری کا کینوس ۳۵ تا ۷۰ ایم ایم تک محدود ہے جب کہ سیاست کا کینوس کشمیر سے کنیاکماری تک کئی ہزار میل پر پھیلا ہوا ہے۔ آج لیڈر بننے کیلئے اداکاری کی سخت ضرورت ہے۔ ہر کوئی پیدائشی اداکار تو ہوتا نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قائدین کو تربیت دی گئی۔ ان کے لئے ایک اسکول قائم کیا گیا ہے۔ اسکول میں منتخب عوامی نمائندوں کو شریک کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر نونہالوں کو اس اسکول میں داخلہ دلایا جائے تو وہ مستقبل کے بہتر لیڈر ثابت ہوں گے۔

پدیاترا کے دوران قائدین انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی کو سڑک پار کرا دیتے ہیں۔ گلی میں کوڑا کرکٹ ہو تو اُسے صاف کروا دیتے ہیں۔ نل کی ٹونٹیاں لگوا دیتے ہیں۔ کرنٹ بند ہو تو اُسے بحال کر دیتے ہیں۔ لوگوں کی فرمائش سن کر پورا کرنے کا کبھی نہ پورا ہونے والا وعدہ کر لیتے ہیں اور تو اور کھانے کا وقت ہونے پر پدیاترا کا قافلہ سڑک کے کنارے جھاڑ کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا راہگیروں کو بغیر لیمو نچوڑے کھانے کی دعوت دی جاتی۔ قائدین، امیدوار اور ووٹر سب ایک ساتھ تناول طعام کرتے۔

انتخابی مہم چلانے کیلئے انتخابی دفاتر کھولے گئے۔ قدم قدم پر انتخابی دفاتر قائم ہوئے۔ دفاتر کو برقی

قمقموں سے منور کیا گیا۔ بیٹھنے کے لئے کرسیاں بچھائی گئیں۔ دفاتر آنے والوں کی خاطر تواضع کی جاتی۔ چائے پان سے لے کر کھانا کھلایا جاتا۔ بچوں کو کھیل تماشوں میں مصروف رکھا جاتا تاکہ امیدوار کی زیادہ سے زیادہ بچے بچے کارکریں۔ انتخابات میں چند پہلوان بھی انتخابی دنگل میں تھے۔ ان کے انتخابی دفاتر کے سامنے اکھاڑا بنایا گیا تھا جہاں ہر شام جسمانی مقابلے ہوتے تھے۔ اداکار کے انتخابی دفتر میں ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے۔ ان تفریحات کے علاوہ گانوں کے ریکارڈ، تقاریر کے کیسٹ چوبیس گھنٹے بجتے رہتے تھے۔ انتخابی دفتر میں عوام کو کم یہ محسوس ہونے کا موقع نہیں دیا گیا کہ ان کے مسائل کیا ہیں اور انہیں امیدوار صاحب کیسے حل کریں گے۔ ویسے ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ آج کل ووٹ مانگنے کیلئے ان تکلفات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

انتخابی جلسوں میں وہی گھسی پٹی تقاریر ہوتی ہیں لیکن جلسوں میں عوام کو جمع کرنے کیلئے جو طریقے استعمال کئے گئے وہ قابل دید تھے۔ جلسہ گاہ کو ایک دن پہلے ہی سجا دیا گیا تھا۔ گانے اور تقاریر نشر کئے جا رہے تھے۔ وقفہ وقفہ سے اعلان کیا جاتا کہ کچھ ہی دیر میں جلسہ شروع ہوگا۔ دیر ہونے لگی تو مختلف کھیل تماشے پیش کئے گئے۔ یہ ہمیں بالکل ایسے لگتا تھا جیسے مداری ڈگڈگی بجاکر لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہے۔ لوگوں کے اکٹھا ہونے کے بعد اپنے بچوں کی مدد سے تماشہ دکھائے گا۔ لوگ تماشہ دیکھیں گے محظوظ ہوں گے اور تالیاں بجائیں گے تماشہ ختم ہوگا لوگ بکھر جائیں گے۔ ان کے اختیار میں ہوگا چاہیں پیسہ دیں یا نہ دیں۔ جلسہ گاہ میں بھی مداری تماشہ بتاتا ہے۔ مستقبل کے سنہرے خواب دکھلاتا ہے۔ امیدوار کے حامی بیچ بیچ تالیاں بجاتے، گلپوشی کرتے اور نعرے لگاتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ووٹر کے اختیار میں رہتا ہے کہ جسے چاہے وہ ووٹ دے۔ ہمارے ایک تجربہ کار دوست کا خیال ہے کہ اچھے مداری کے تماشہ کا دار و مدار اس کے لڑکوں پر ہوتا ہے۔ ایسے ہی امیدوار کے جیتنے کا دار و مدار اس کے کارکنوں پر منحصر ہے کہ وہ کتنی محنت کرتے ہیں اور خود شعبدے دکھانے میں کتنے ماہر ہیں۔

انتخابات میں جو لوگ امیدواروں کیلئے کام کئے ان کے مزے ہی مزے تھے۔ امیدوار کی تصویر سینے پر سجائے۔ سے

کھانا ملے گا پینا ملے گا
الکشن ہے سب کچھ ملے گا

کی صورت صبح سے شام "ووٹ دو" "ووٹ فار" کرتے رہتے تھے۔ کارکنوں کو کپڑے سلوائے گئے جن پر امیدوار کو ووٹ دینے کی اپیل تھی۔ بیروزگاروں کو عارضی روزگار ہاتھ آگیا تھا۔ ہم نے ایک امیدوار کے کارکن سے پوچھا "بھائی ہم انھیں ہی ووٹ کیوں دیں؟" جواب ملا "اس لئے کہ میں کہہ رہا ہوں اور میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں ان کے لئے کام کر رہا ہوں"۔ ہم نے جواب سن کر کہا "یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی"۔ اس پر کارکن نے زچ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے صاحب اگر آپ مجھے زائد معاوضہ دیں تو میں لوگوں کو آپ کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے کہوں گا"۔ ہم الکشن میں ٹھہرنا تو دور، ووٹ ڈالنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ اسی لئے موضوع بدلتے ہوئے ہم نے کہا "تم کسے ووٹ ڈالو گے؟" کارکن نے جواب دیا "ابھی فیصلہ نہیں کیا"۔ ہم نے حیرت سے پوچھا "کیا تم

اپنے امیدوار جس کے لئے کام کر رہے ہو اسے ووٹ نہیں ڈالو گے "۔ "یہی سمجھ لیجئے" ہم نے کارکن کی غیرت کو للکارتے ہوئے کہا "یہ اچھی بات نہیں ہے"۔ جواب ملا۔ "جب امیدوار حسبِ منشا پارٹی بدل سکتے ہیں تو کیا ہم اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ نہ دیں۔ یہ کام تو پیٹ کے لئے کر رہے ہیں۔"

سنتے ہیں پچھلے زمانے میں ایک وقت ٹڈی دل آسمان پر بادل کی طرح چھا گئے تھے۔ کچھ کم یہی حال اس مرتبہ ہمارے شہر میں ہوا۔ جا بجا انتخابی بیانرس لہراتے لگے تھے۔ آسمان رنگ برنگے کپڑوں سے ڈھک گیا تھا۔ لگتا تھا بیانرس لگانے کا مقابلہ بھی ہو رہا ہے۔ ایک سے بڑا ایک بیانر۔ ہمارے ایک بزرگ نے ایک بڑے سے بیانر کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر کہا۔ "میاں اتنے بیانرس سے ہمارے ملک کے غریبوں کے تن ڈھاکے جا سکتے ہیں۔"

فلمی پوسٹرس خوبصورت ہوتے ہیں۔ راستہ چلتے راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ انتخابات کیلئے ہر پارٹی نے ایسے ہی خوبصورت پوسٹرس، کٹ آوٹ بنوائے، انھیں شہر کی ہر دیوار اور ہر کھمبے پر چسپاں کیا گیا۔ قائدین فلمی ہیرو کی طرح مختلف پوز دیتے ہوئے پوسٹرس میں موجود ہیں۔ کوئی مسکرا رہا ہے تو کوئی مٹھی بند کئے اتحاد اور اکھنڈتا کا درس دے رہا ہے، کوئی ہاتھ سے جیت کا نشان بنا رہا ہے تو کوئی ہاتھ جوڑے سلام کر رہا ہے۔ کسی پوسٹر پر بڑے لیڈر کے بغل میں چھوٹے لیڈر کھڑے ہیں تو کسی اور میں دو بڑے لیڈر مصافحہ کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ہینڈ بلس اپیل اور ووٹروں کی پرچیاں چھپیں۔ انھیں گھر گھر تقسیم کیا گیا۔ الکشن کے دوران ہمارے گھر میں اتنی ردی جمع ہوئی ہے کہ انھیں بیچ کر اردو زبان کے دو پرچوں کا سالانہ خریدار بننے کا ارادہ ہے۔ انتخابات سے اردو کو کچھ تو فائدہ ہو، ہر مرتبہ امیدوار ہی اردو سے فائدہ اٹھاتے آئے ہیں۔

غرض صاحب ہمارے شہر میں الکشن کے آٹھ دس دن بہت رنگین، میوزیکل اور دلچسپ رہے جس کے لئے ہم نے "ڈسکو الکشن" کا نام دیا ہے۔ ان دنوں ہمارا یہ معمول تھا کہ صبح نیند سے جلد بیدار ہوتے، کسی امیدوار کے ساتھ پد یاترا کے لئے نکلتے، صبح چہل قدمی ہو جاتی بعد دن بھر طبیعت صاف رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ناشتہ کرتے اور ناشتہ کے بعد گروپ میٹنگس ہوتیں، انتخابی دفاتر گھومتے جہاں ہماری تواضع مختلف کھانے اور پینے کی اشیاء سے کی جاتی تھی۔ دوپہر کچھ دیر قیلولہ کرتے اور شام تیسرا پہر مل کر محلوں کا چکر لگاتے، پوسٹرس دیکھ کر لطف اٹھاتے اور پھر مختلف جلسے سنتے تھے۔ کسی امیدوار کے ساتھ اس کی تعریف کرتے اور اسکی حمایت کا یقین اور جیت کی قسم کھاتے ہوئے اس کے ساتھ رات کا کھانا نوش کرتے تھے۔ ہم "نوش کرتے" اس لئے لکھ رہے ہیں کہ جو غذا امیدوار کے دسترخوان پر ملتی تھی وہ ہم صرف کبھی کبھار مخصوص دعوتوں ہی میں کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد کارکنوں کے ہمراہ محنتانہ اور بخشش وصول کر کے خوشی خوشی گھر واپس لوٹتے اور بستر پر دراز ہو کر ربّ العزت کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس الکشن سے ہماری جمہوریت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ "انتخابات" کو سبھی دیش واسی مل جل کر قومی تہوار کی طرح منانے لگے ہیں۔

— —

-٥-　　-٥-　　-٥-

برق آشیانوی

بن گئے ہیں صاحبِ دیوان اب کیا کیجیے
بک گیا ہے گھر کا سب سامان اب کیا کیجیے

نام تھا سلطان جس کا وہ تو سلطانہ بنی
اور سلطانہ بنی سلطان اب کیا کیجیے

عورتوں کا سال جب آیا تھا بس اُس وقت سے
بڑھ گئی ہے عورتوں کی شان اب کیا کیجیے

ہاتھ میں بیگم کے ہے اب گھر کا سارا کاروبار
اُن کی مُٹھی میں ہے اپنی جان اب کیا کیجیے

کہہ رہی ہیں وہ ہمیں پکوان کرنے کے لیے
اور ہمیں آتا نہیں پکوان اب کیا کیجیے

پہلے ہم کو دیکھ کر جو جُھک کے کرتے تھے سلام
دیکھ کر ہوتے ہیں وہ انجان اب کیا کیجیے

دل تو بھر سکتا ہے لیکن پیٹ بھر سکتا نہیں
شاعری میں ہے فقط نقصان اب کیا کیجیے

جلتے جاتے رُک گئے ہیں اک مہینے کے لیے
دو مہینے سے جو تھے مہمان اب کیا کیجیے

شور و غُل سے شہر کے گھبرا کے گھر آتا ہوں برقؔ
گھر کی آبادی بھی ہے گنجان اب کیا کیجیے

غزلیں

(روحِ جگر سے معذرت کے ساتھ)

نیاز سواتی (پاکستان)

مشکل ہے ایک بیوی کا اب کے سنبھالنا
اور تین سے نباہ کیے جا رہا ہوں میں

واقف نہیں ہوں شعر کے مفہوم سے مگر
اور پھر بھی واہ واہ کیے جا رہا ہوں میں

تائب میں جس گناہ سے ہُوا تھا گزشتہ روز
پھر آج وہ گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مرگِ عدو پہ شاد ہے گو اپنا دل نیازؔ
اور منہ سے آہ آہ کیے جا رہا ہوں میں

نیاز سواتی (پاکستان)

سرجن سے تب میڈیکل کا بوگس بل بنوایا ہے
ہم نے اُس کے ہاتھ میں پورے سو کا نوٹ تھمایا ہے

یہ مت سمجھو پاس ہمارے دولت اور سرمایہ ہے
لنڈے کی پوشاک نے ہم کو جنٹلمین بنایا ہے

کپڑ دل میں اک بھڑ نے گھس کر ناک میں دم کر رکھا تھا
یہ مت سمجھو ہم نے تم کو ڈسکو ناچ دکھایا ہے

ہم سے زیادہ اہلِ محلہ اس سے فیض اٹھاتے ہیں
ہم نے اپنے گھر میں ٹیلی فون عبث لگوایا ہے

چور ہوئے جب گھر میں داخل ہم نے شور مچایا تھا
اور ہمسایہ سمجھا ہم نے انگلش گانا گایا ہے

ہم نے جب نذرانہ دے کر اس کے دل کو موم کیا
دفتر کے چپڑاسی نے تب صاحب سے ملوایا ہے

میڈم نے بازار کو شاید شاپنگ کرنے جانا ہے
اسی لیے میک اپ سے اس نے چہرے کو چمکایا ہے

رؤف خوشتر (بیدر)

آئینہ دیکھ

وہ کونسی شئے ہے جس کے مقابل شریر بچے سنجیدہ، خوبصورت خواتین نادیدہ، بدصورت عورتیں رنجیدہ، سفید بالوں والے شرمندہ اور تنے ہوئے مرد خمیدہ ہو جاتے ہیں؟
جواب ہوگا آئینہ۔

آئینہ کے موجد کو اگر علم ہوتا کہ اُس کی ایجاد کے آگے ابن آدم یوں گھنٹوں گھٹنے ٹیک کر عجیب عجیب کرتب کرتے ہوئے اپنا وقتِ عزیز صرف کرے گا تو وہ کبھی آئینہ نہیں بناتا۔ آخر اسے بھی تو روزِ محشر میں ایک بہت بڑے آئینہ کے روبرو منہ دکھانا ہے۔

آئینہ خلوت میں آپ سے یہ تصدیق کرواتا ہے کہ آپ ڈارون کی تھیوری سے ذرا بھی اتفاق نہ کریں لیکن آپ کے حرکات آپ کو بندر سے قریب لے جاتے ہیں۔

خودستائی کے اس دور میں گھر گھر بلکہ فرد فرد آئینہ زدہ ہے آئینہ چوں کہ شیشہ کی حسّاس دیوار ہے۔ اور کہیں عمل ردّ عمل کے طور پر شکل ردّ شکل کی صورت نمودار نہ ہو اِس لیے بعض لوگ آئینہ کے سامنے آنے سے ڈرتے ہیں۔ یہاں آپ کے اندر کا تنکہ خود آپ کو نظر آتا ہے۔

اِس کے برخلاف وہ جو خود اَنا کے حصار میں مقید ہیں اُن کو اگر اس دنیا میں کسی ایک چیز کا انتخاب کرنے کو کہیں تو وہ جھٹ آئینہ لیں گے۔

خلوت ہو یا جلوت اب لوگ آئینہ دیکھ دیکھ کر اپنی شخصیت (ظاہری سہی) سنوارتے رہتے ہیں۔ اور یوں شخصیت بنانے اور سنوارنے کے لیے ٹیلر TAILOR اور مرّر MIRROR کے مرہونِ منت ہوتے جا رہے ہیں۔

کہتے ہیں آئینہ بعض افراد کے لیے تاریخ کے دھارے کو نہ موڑنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ مصر کی بے حد خوبصورت ملکہ قلوپطرہ روزانہ آئینہ کے روبرو پہروں بیٹھتی اور اپنی "ناک پلک" سنوارتی۔ ورنہ کہتے ہیں کہ قلوپطرہ کی ناک کے ساتھ تاریخ بھی بدل جاتی۔ قلوپطرہ کے دو محبوب مشغلے مرد اور آئینہ

بدلتا تھے۔ یہ تو مورخ ہی بتا سکیں گے کہ اس نے کتنے مردوں کے دل اور کتنے آئینہ توڑ ڈالے۔

اور آئینہ ہی ہمارے دوست کے لیے جدائی کا باعث ہوا۔ یہ دوست اپنے حسنِ بشرے کی وجہ سے زندہ طلسمات کے مثالی ٹریڈ مارک لگتے ہیں۔ دلہن کے رشتہ داروں نے جب انھیں دیکھ کر انکار کرنا چاہا تو یہ اپنے افریقی فدو قال کو سعودی ریال میں چھپا گئے۔ یوں انھوں نے رشتہ داروں کو رام کرلیا۔ غرض وہ چیکوں اور ڈرافٹوں کی بارات لیے دلہن کے پاس پہنچے۔ اپنے چہرے کو گھنے سہرے میں چھپادیا۔ شام میں رسم مصحف کے وقت جب دلہن نے دولہے کا چہرہ دیکھا تو چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی ناشاد نوشا آئینہ پھینک اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہم نے یہ واقعہ دیکھا تو چونک گئے اور کانوں میں ہماری شادی کی شہنائی سے پہلے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس لیے کہ بنانے والے نے ہماری شکل کو بنانے میں کچھ زیادہ ہی فیاضی سے کام لیا (سالنامہ شگوفہ میں ہمارا کارٹون مظہر ہے) کہیں دلہن سے محروم نہ ہوجائیں اس خیال سے اعلان کردیا کہ معاشرے کی اصلاح اور اچھی مثال کے طور پر ہم اپنی شادی گھوڑے جوڑے کی رقم اور فضول رسم سے پاک رکھیں گے۔ اور جناب یوں ہم آرسی مصحف کی رسم سے بچتے ہوئے ایک عدد دلہن گھر لائے۔ یہ اور بات ہے کہ بیگم (جو شادی تک بے غم تھیں) نے ہم کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لینے پر ہی اکتفا کرلیا اور بے ہوش ہونے کا پروگرام ملتوی کردیا۔

آئینہ ہمارے چھپے ہوئے جذبات اور خیالات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ مشاعرے میں جانے سے پہلے جب ہم اپنے شاعر دوست کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ بند کمرے سے آواز آرہی ہے۔ جھانک کر دیکھا کہ شاعر آئینہ کے روبرو بیاض تھامے کہہ رہے ہیں۔

"شکریہ، عزت افزائی کا۔ یہ شعر صدرِ جلسہ کے لیے پیش ہے حسبِ حال ہے۔ اس شعر میں ذات کا اور اُس شعر میں کائنات کا غم شامل ہے۔ اس شعر پر خصوصی توجہ چاہتا ہوں"۔

پھر وہ خود کو سنوارتے ہوئے کہہ رہے تھے " غالب نادان تھا جسے ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ نہ تھی۔ ارے ہم تو ادب کی خدمت اور اردو کی سیوا اس لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں تو ہے ؏

ہاں ستائش کی تمنا ہاں صلہ کی پرواہ

اب ہم سے رہا نہ گیا اور جواب دیا ؏

گر نہیں ہیں ترے اشعار میں معنی نہ سہی

بعض لوگ آئینہ کے طول و عرض کے مطابق اپنی شخصیت بناتے رہتے ہیں ہمارے ایک پروفیسر دوست جو ہوٹل میں مقیم تھے ایک دن ہمارے ساتھ ہوٹل سے ٹائی کوٹ اور بغیر پتلون کے نکلے۔ ہم نے آدھا چاند تو دیکھا تھا لیکن شخص نصف لباس نہیں۔ جب ہم نے پروفیسر کو اس ففٹی ففٹی طور پر مہذب اور غیر مہذب ہونے کی طرف اشارہ کیا تو وہ خود حیران ہوگئے اور ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

"میں غائب دماغ پروفیسر ہوں۔ چوں کہ کمرہ میں چھوٹا آئینہ ہے اس لیے قمیص کوٹ اور ٹائی تو پہن لیتا ہوں۔ پتلون پہنا بھول جاتا ہوں"۔

یہ سن کر ہم نے ہوٹل والوں سے کہہ کر پروفیسر کے کمرے میں قدِآدم آئینہ لگوایا اور یوں اُن کی شخصیت کی تکمیل کا سامان مہیا ہوگیا۔

آئینہ کے بغیر اب زندگی ادھوری سی لگتی ہے۔ شب و روز میں اس کا دخل رہتا ہے۔ لیکن یہ حالت مجبوری ہم آئینہ کے بغیر بھی دن گزارتے ہیں۔ تعطیلوں کے سال کے آخری مہینہ کے آخری ہفتہ میں خسر جی کا دیا ہوا شاندار آئینہ داغِ مفارقت دے گیا۔ اور ہم خسر جی کا دیا ہوا دائمی تحفہ یعنی بیگم صاحبہ کی جھیل سی آنکھوں سے آئینہ کا کام لیتے رہے ان کی آنکھوں کے جھروکوں میں ہم اپنی شخصیت سنوارتے رہے۔

اُدھر بیگم بھی ہمیں دیدۂ حیراں لیے مجسمہ بن کر کھڑے ہونے کو کہتیں اور اپنے آرائشِ خم کاکل سنوارنے میں مصروف ہوتیں اور ہم اندیشۂ دید و روزگار ہیں۔

یوں ہم نے من و تو کی آنکھوں آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر ازدواجی ہفتہ گزارا۔

یکم جنوری کو جب ہم اُٹھ کر بیگم صاحبہ کو بیڈ ٹی کے موقع پر رٹا رٹایا جملہ HAPPY NEW YEAR TO YOU کہا تو بیگم نے انگریزی ہی میں انگریزی جواب دیا HAPPY NEW MIRROR TO YOU بیگم کے ہاتھ میں نیا آئینہ ہمارا منہ چڑا رہا تھا اور ہم آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی
(رانچی)

اُس نے کیوں بیلن سے مارا یہ کہانی پھر کبھی
وار تھا کیسا کرارا یہ کہانی پھر کبھی

شب میں تارے دیکھنا تو کوئی انہونی نہیں
دن میں دیکھا میں نے تارا یہ کہانی پھر کبھی

سُرخ آنکھیں، گال سوجے اور دامن تار تار
کیوں ہے دل زخمی بیچارا یہ کہانی پھر کبھی

امتحاں میں نقل کی طاقت پہ بی۔ اے کر لیا
پھرتا ہوں کیوں مارا مارا یہ کہانی پھر کبھی

احتجاجی سنگ باری پہ ہوئے تیّار جب
پہلا پتھر کس نے مارا یہ کہانی پھر کبھی

اس کی چاہت میں ہمیں کیا کچھ ملا ہے دوستو!
زخم تازہ ہے ہمارا یہ کہانی پھر کبھی

گُل رُخوں کی بھیڑ میں رہ کر بھی یارو آج تک
کیوں رہا بزمی کنوارا یہ کہانی پھر کبھی

روشن لال روشن بنارسی
(وارانسی)

ظُلم کیسا ہوا قہر کیا ہو گیا
ایک لیڈر سے وعدہ وفا ہو گیا

زخم دل کا مرے پھر ہرا ہو گیا
پھر منسٹر کوئی دوسرا ہو گیا

ہارتا میں الکشن یہ ممکن نہ تھا
فلمی ہیرو مقابل کھڑا ہو گیا

ہو سکے گا نہ روشن تو لیڈر کبھی
گالیاں کھا کے جو بد مزا ہو گیا

مدیرِ شگوفہ کا نیا ٹیبل

شگوفہ کے دفتر کو کیا ہو گیا ہے
کہ منظر کا منظر ہی بدلا ہوا ہے

ڈکولم زدہ ایک ٹیبل یہاں پر
نئے سال کے ساتھ نازل ہوا ہے

بڑی طاقتوں کی طرح اس کا رقبہ
زمینِ شگوفہ پہ پھیلا ہوا ہے

شگوفہ تو اُردو جریدہ ہے لیکن!
یہ ٹیبل تو کچھ اور ہی کہہ رہا ہے

ہے اُردو جریدہ چلانا ہی مشکل
یہ تزئین کیسی ؟ یہ کیا ماجرا ہے

یہاں پر نیا شخص آتا ہے جو بھی!
وہ اس کی رعونیت سے سہما ہوا ہے

مدیرِ شگوفہ کے مدِّ مقابل
جزیروں کا اک سلسلہ چل پڑا ہے

یہ ٹیبل ہے تازہ شگوفوں کا مرکز
کہ ہنس بولنے کا یہی آسرا ہے

یہاں چائے بندی ہے سختی سے نافذ
مدیرِ شگوفہ کو دھڑکا لگا ہے

کہ بے داغ اب تک ہے ٹیبل کا دامن
مگر عاشقوں کا بھروسہ ہی کیا ہے

یہاں ہاشمی چائے بندی بھی ٹوٹی
یہ یوسف* کا جادو نہیں ہے تو کیا ہے

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

---

* یوسف ناظم

مظہر الزماں خاں (حیدرآباد)

گاؤتکیہ

گاؤتکیہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی جمہوریت کی۔ کیوں کہ گاؤتکیہ اور جمہوریت ایک ہی وجود کے دو نام ہیں دونوں سے ٹیک لگائے بیٹھنے والے پچھلی صدیوں میں بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں اُن کی پیٹھ سے گاؤتکیے کچھ اس قدر چمٹے ہوئے ہیں کہ نہ وہ گاؤتکیوں کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ گاؤتکیے اُن کو چھوڑ سکتے ہیں گویا دونوں میں میاں بیوی کا رشتہ ہے البتہ یہ الگ بات ہے کہ رات میں گاؤتکیے پیٹھ سے نکل کر دونوں رانوں کے درمیان پہنچ جاتے ہیں اور کچھ اس طرح بھینچے جاتے ہیں کہ جمہوریت خطرے میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن پھر صبح ہوتے ہی وہ اپنے اصلی مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ بہرحال گاؤتکیہ ایک تاریخ ہے جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔ اب آئیے ہم یہاں ان کے اندر بسنے والے عوام کو پیش کریں کیوں کہ اوپر سے وہ اتنے اُجلے اُجلے صاف اور سفید سفید دکھائی دیتے ہیں جتنے ہمارے سیاست داں۔ چنانچہ ہم یہاں اُن کے باطن کو پیش کرتے ہیں کہ باطن ہی سب سے اہم ہوتا ہے۔ لیجئے اب محترم عزت مآب گاؤتکیہ صاحب کا باطن پیشِ خدمت ہے۔ سب سے پہلے ہم اُن کے اُوپر اوڑھی ہوئی سفیدی کو اُتارتے ہیں تو ہمارے ہاتھ جو چیز لگتی ہے وہ ایک چمکدار مخملی کنٹوپ ہے۔ جسے ہم اپنی دادی اماں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو ایک مورخ کا کام انجام دینے کے لیے ہمارے سامنے چھالیہ کترتی ہوئی بیٹھی ہیں۔ چنانچہ ہم اُن کے سامنے کنٹوپ پیش کر دیتے ہیں تو وہ مُسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر کہتی ہیں۔ "یہ تمہارے سکڑ دادا کے سر کا تاج ہے جو آج سے کئی برس پہلے اس گاؤتکیہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا کہ سند رہے کہ تاج اسی طرح محفوظ کر دیئے جاتے ہیں کیوں کہ خواب جب جب کروٹیں لیتے ہیں تو تاج گاؤتکیوں کی زینت بن جاتے ہیں اور اُن کی جگہ دکھائی نہ دینے والے تاج حاصل کر لیتے ہیں۔ اور آج کا دَور دکھائی نہ دینے والے تاج کا دَور ہے کہ وہ تمام تاج آج گاؤتکیوں کے اندر اُتر گئے ہیں اور تاج کا اندر اُتر جانا زیادہ خطرناک ہے بہرحال جو چیز سب سے پہلے ہمارے ہاتھ لگی وہ ہمارے سکڑ دادا کا تاج تھا۔ اب دیکھیں کہ دوسری مرتبہ ہمارے ہاتھ کیا چیز لگتی ہے۔ لیجئے دوسری

بار جو چیز ہمارے ہاتھ لگی بقول دادی اماں کے ہماری پڑدادی کا لہنگا ہے۔ اس تعلق سے دادی اماں خاموش ہیں تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ویسے ہم لہنگے کی تاریخ لکھ سکتے ہیں لیکن یہ ادب میں بڑی بُری بات ہوگی حالاں کہ ادب میں لہنگوں سے بھی زیادہ بڑی بڑی باتیں پیش کی جا چکی ہیں مگر وہ ادب کے پائجاموں میں شمار کی جاسکتی ہیں کہ وہ دانشوروں کی باتیں ہیں اور دانشوں کی بعض باتیں آخروٹ میں لڑکی تلاش کرنے کے مصداق ہوتی ہیں بہرحال اب ہم تیسری بار گاؤ تکیہ میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو ہمارے ہاتھ جو چیز لگتی ہے وہ بڑی عجیب و غریب ہے جیسے بس ہم کھینچے چلے جارہے ہیں۔ سُرخ سُرخ لواڑ کی طرح لمبی لسس باہر نکلتی ہی چلی جارہی ہے اور اب جبکہ وہ پوری طرح باہر آچکی ہے تو ہمارے قریب بیٹھی ہوئی دادی اماں اس کی تاریخ ہمیں بتارہی ہیں۔ بیٹے یہ تمہارے پڑدادا کا ازار بند ہے کہ وہ ہمیشہ سُرخ ازار بند ہی استعمال کرتے تھے انھیں سُرخ چیزوں سے بڑی محبت تھی چنانچہ وہ سُرخ قمیض، سُرخ لنگی، سُرخ ٹوپی، سُرخ چپل اور سُرخ عورت ــ وہ سُرخی سے بڑی محبت کرتے تھے ایک دن بے چارے سُرخ ہو کر ہی مر گئے یعنی کسی "سُرخ" نے انھیں گولی ماردی ــ یہ کہہ کر دادی اماں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور پھر ہمارے ہاتھ کو دیکھنے لگیں۔ اس مرتبہ جو نادر موتی ہمارے ہاتھ لگا وہ ہماری پڑپھوپی کا چھوٹا سا پائجامہ تھا ہلکے گلابی رنگ کا۔ اور بقول دادی اماں ہماری یہ پڑپھوپی آج بھی زندہ ہیں اور کئی جگہ سے دن میں کئی بار ہلتی رہتی ہیں اور ہل ہل کر انھوں نے اپنے پیٹ سے پوری ایک بستی آباد کردی ہے۔ اب ہمارا ہاتھ پھر گاؤ تکیہ میں گھومنے لگا کہ شاید کوئی نایاب چیز ہمارے ہاتھ لگ جائے لیکن اس بار جو چیز ہمارے ہاتھ لگی۔ ہم نے اسے فوراً چھپا لیا کہ کہیں دادی اماں کی نظر نہ پڑ جائے اور پھر انتہائی سرعت سے گاؤ تکیہ میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگے اور اب کی بار جو قیمتی شئے برآمد ہوئی وہ مثلث تھی اور ہم حیرت سے اس مثلث کو دیکھنے لگے۔ دادی اماں نے کہا۔ یہ تمہارے چچا کا لنگوٹ ہے اپنی جوانی میں وہ کثرت سے ورزش کیا کرتے تھے۔ اور ہم نے اس میلے کچیلے لنگوٹ کو دور رکھتے ہوئے پھر گاؤ تکیہ میں ہاتھ ڈال دیا اور دوسری چیز نکال کر دادی اماں کے سامنے پیش کردی تو انھوں نے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا بقول تمہارے دادا کے یہ بڑے ابا کے عقیقہ کی شیروانی ہے اور یہ شیروانی تمہارے پڑدادا نے تمہارے دادا کے لیے بنوائی تھی اور اس پر ٹنکے ہوئے چمکدار بٹن تمہارے سکڑ دادا کے باپ کی نشانی ہیں کہ نسل در نسل یہ بٹن چلتے رہے لیکن اب ان کا سلسلہ ختم ہوچکا ہے کیوں کہ اب رشتوں میں دراڑیں پیدا ہوگئی ہیں ایسی دراڑیں جنھیں پاٹا نہیں جاسکتا کہ دراڑوں کو پاٹنے والے ہاتھ آج ہم میں باقی نہیں رہے اس لیے اب رشتے گاؤ تکیوں میں محفوظ کردیئے گئے ہیں کہ گاؤ تکیے ہمارے ملک کی تاریخ ہیں یہ کہہ کر دادی اماں نے ایک پلپلے پان کو اپنے پوپلے منہ میں رکھا اور پھر ہمارے ہاتھ میں ایک جھولتی ہوئی چیز کو دیکھ کر کہا یہ تمہاری ممی کی گڑگی ہے۔

"گڑگی کیا دادی اماں؟ ہم نے حیرت سے کہا۔ وہ بولیں بیٹا دکنی زبان میں دونوں طرف سے پِسلے ہوئے پائجامہ کو گڑگی کہتے ہیں اور ہم لوگ تو گڑگی کے دور کے لوگ ہیں لیکن آج گڑگی کی جگہ ساڑی پیدا ہوگئی ہے پہلے ایک تھان میں کئی گڑگیاں بنتی تھیں لیکن آج تھان اس قدر سکڑ گئے ہیں کہ سینکڑوں تھان لپیٹنے کے باوجود عریانی جوں کا توں قائم رہتی ہے۔ ہم نے اپنی ممی کی گڑگی کو نہایت احترام سے رکھ دیا اور پھر ایک

ساڑی کھینچ کر نکالی تو دادی اماں نے شرماتے ہوئے کہا یہ میری شادی کی ساڑی ہے جو تمہارے دادا نے شادی کی پہلی عید کو تحفہ کے طور پر مجھے دی تھی کہ اس وقت ساڑی کا نیا نیا دور شروع ہوا تھا؟ اس کے بعد ہمارا ہاتھ پھر گاؤ تکیہ میں داخل ہو کر جب برآمد ہوا تو دادی اماں بولیں یہ تمہارے تائی کی چولی ہے اور یہ یادگار چولی ــــ اُن کی شادی میں دی گئی تھی چنانچہ تمہارے تایا نے اس کی خاطر ہمارا گھر ہی چھوڑ دیا اور آج وہ اپنی اسی چولی کے ساتھ الگ رہتے ہیں لیکن بیٹے ہمارے سماج میں آج بھی بہت سارے چولی کے مُرید ہیں اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس چولی ہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں کہ چولی دامن کا ساتھ شاید اسی کو کہتے ہیں. اور پھر اس کے ساتھ ہی ہم نے دادی اماں کے سامنے گاؤ تکیہ سے برآمد ہونے والی چیز جو ہماری مُٹھی میں آ گئی تھی پیش کردی اور دادی اماں نے بڑے غور سے دیکھ کر کہا یہ تمہارے ابا جان کا نپّل ہے وہ تقریباً دس سال کی عمر تک نپل چوستے رہے حالاں کہ آج کی نسل ۸ سال کی عمر میں بھی نپّل کی عادی ہے کہ نپّل کا دوسرا نام سیاست ہے ــ یہ کہہ کر دادی اماں مُسکرائیں اور ہمارا ہاتھ پھر گاؤ تکیہ میں پہنچ گیا لیکن اب گاؤ تکیہ خالی ہو چکا تھا اور ایک ہارے ہوئے سیاست داں کی طرح لگ رہا تھا۔ خالی خالی۔ اداس اداس. ہم نے دادی اماں سے کہا لیجئے ایک تاریخ ختم ہوئی ایک نسل غروب ہوئی تو دادی اماں نے دوسرے گاؤ تکیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں ایک اور تاریخ رکھی ہوئی ہے۔ اُسے کھول کر پڑھو کہ اُس میں بھی ایک مایوس نسل پوشیدہ ہے۔

ہم نے کہا بس اب رہنے دیجئے دادی اماں ایک تاریخ کا یہ حال ہے تو پھر دوسری تاریخ کا کیا ہوگا ــــ !!؟

●●

ضیاء الحق قاسمی
(پاکستان)

قطعات

عریاں بدن یہ کشتیاں ٹی وی پہ روز و شب
پہنیں وہ پینٹ بھی نہیں شلوار بھی نہیں
کرتے ہیں ایک دوسرے کو وہ لہو لہان
"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

O

تحفے بہت دیئے ہیں عزیزوں کو ہم نے بھی
ہم کو بھی اب جواب میں سوغات چاہیئے
ہم بھی منائیں اب کبھی بننے کا برتھ ڈے
"تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے"

O

مفت ملتی تھی ہمیں جتنی وہ پی لیتے تھے
یہ کفایت کا طریقہ بڑا آسان نکلا!
تو نے مقروض بنایا ہے سبھی کو ساقی
"جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا"

O

ان طبیبوں نے ہی لوٹا ہے مجھے اے یارو
میرے ظاہر سے وہ سمجھے ہیں کہ حال اچھا ہے
دوسرے روز دوا لینے میں جاتا کیوں کر
"وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"

O

سُرخ فیتا کس لیے حائل ہے آپ
نہ تو خود واقف ہو ہم جتلائیں کیا
ہم سے ہی پوچھا ہے رشوت کتنی دیں
"کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!"

میرے اخراجات، بڑھتے جا رہے ہیں دن بدن
میری ذمّہ داریاں بھی کچھ سوایاں ہو گئیں
اس پہ بیوی کا جھگڑنا بھی مری قسمت بنی
"مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"

O

بیوی نے پہلے روز سے جھگڑے بپا کیے
مجھ کو خبر جو ہوتی بساتا نہ گھر کو میں
سسرال نے تو چاٹ کے کنگال کر دیا
"یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں"

O

سب سے پہلے جوش لیا تم کو
تم کہو گے مشاعرہ نہ ہوا
تم ہی چھوٹی سی ایک غزل کہو!
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

O

ساسیں اک جیسی ہی دنیا میں سبھی ہوتی ہیں
دل میں آئے جو کرو ساتھ ہی طعنے بھی سہو
گھر بسانے کا طریقہ تمہیں بتلایا ہے
"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"

O

معمول کے جھگڑے ہیں کیا تجھ کو بتاؤں
بیوی کبھی آ گئے کبھی سالا مرے آ گئے
ہو بات مہینوں کی تو میں ذکر کروں بھی
"ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے"

O

ووٹ جتنے مل سکے بوگس ہی تھے
ان کے بیلٹ بکس کا نمبر کھلا
پھر بھی دعوے ہے کہ ہیں وہ پاپولر
"دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا"

جہانگیر انس
(رانی پور، سیوان)

ایک ناک والے کی فریاد

آ آ آچھیں ــــ آ آ آچھیں ــــ آچھیں ــــ!

غضب خدا کا! کبھی چھینک، کبھی سوں سوں، کبھی سرسر، کبھی نزلہ، کبھی زکام۔ اس پر آفت یہ کہ سر بھاری ذہن ماؤف۔ ناک نہ ہوئی آفتِ جان ہوئی۔ اے خدا! اے ناک بنانے والے خدا!! تیرے کارخانے میں کس چیز کی کمی تھی جو تو نے ناک بنا کر اس کی تلافی کی؟ ــــ انسان کے چہرے پر ناک نہ ہوتی تو زیادہ سے زیادہ یہی نہ ہوتا کہ تیری یہ اشرف مخلوق جدید آرٹ کا نمونہ ہوتی۔ سو تو تو یہ جانتا ہی ہے کہ جدید آرٹ کتنا پرکشش ہوتا ہے۔ کس قدر عزت اور چاہت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر تو نے ناک نہ بنائی ہوتی تو جدید آرٹسٹ کی طرح تجھے بھی تیری یہ اشرف مخلوق سر آنکھوں پر بٹھاتی تیری آرتی اُتارتی، تیری گن گان کرتی ــــ لیکن انسان کے چہرے پر ناک بنا کر تو نے اپنی صناعی کی ناک کاٹ دی۔ ایک ناک بنانے کے سبب تیری بھی وہ قدر و منزلت نہ رہی جس کا تو حق دار ہے اور تیری اشرف مخلوق بھی کوڑی کے تین ہو کر رہ گئی۔ کوئی قدر نہیں کوئی عزت نہیں ــــ سفر میں، حضر میں، خلوت میں، جلوت میں، مسجد میں، مندر میں، گھر میں، بازار میں ــــ غرض کہ کہیں بھی ناک کی فتنہ پردازیوں سے انسان کو مفر نہیں ــــ ذرا سی ناک کٹی کہ لوگوں نے جینا حرام کر دیا۔ جگ ہنسائی کا سبب بن گئی۔ اپنے پرائے سبھی منہ موڑ اور رشتہ توڑ بیٹھے۔ جیسے رشتہ بھی دو ملکوں کا معاہدہ ہو جسے جب اور جس وقت چاہا جوڑ لیا اور جب دل چاہا توڑ دیا۔ ساری اخلاقی اور انسانی قدریں دھری کی دھری رہ گئیں۔ معمولی ٹھنڈک لگی اور میونسپلٹی کے گدلے نالے کی طرح بہنے لگی۔ اب لوگوں کی نظریں بچا کر منٹ منٹ پر صاف کرتے رہیئے۔ آدھے آدھے گھنٹے پر رومال بدلتے رہیئے۔ چھینک کا آنا گویا روح کا ناک میں سمٹ آنا ہے۔ سینے کی دھڑکن بڑھ گئی، جان سولی پر لٹک گئی، چہرہ چقندر کی طرح سرخ ہو گیا اور اچھا بھلا شریف انسان مداری کا بندر نظر آنے لگا۔ اس پر مصیبت یہ کہ "شکر اللہ" بھی کہیئے۔ سرکاری ٹیکس کی طرح اللہ تعالیٰ کو چھینک کا ٹیکس ادا کرنا لازم ہے، اب اگر سننے والوں نے "یرحمک اللہ" نہیں کہا تو آدابِ تہذیب کا مجرم بن گیا اس کو کہتے ہیں طویلے کی بلا بندر کے سر۔ ایک کی چھینک کئی ایک کی حجامت بنا دیتی ہے

جس طرح کسی کو املی یا کوئی کھٹی چیز کھاتا دیکھ کر اکثر لوگوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اسی طرح ایک شخص کو چھینکتے دیکھ کر اکثر لوگوں کی ناکوں میں سرسراہٹ ہونے لگتی ہے پھر جو آچھیں آچھیں کا سلسلہ کورس میں شروع ہوتا ہے تو عاشق کی شب فرقت سے بھی دراز ہو جاتا ہے۔ اے خدا! اے ناک بنانے والے خدا!! چھینک کے سبب اکثر مجھے اپنا سفر ملتوی کر دینا پڑتا ہے جب بھی سفر پر جانے کے ارادے سے گھر سے نکلتا ہوں کسی کی چھینک راستہ کاٹ دیتی ہے۔ کوئی نیا کام شروع کرنا چاہتا ہوں تو کوئی چھینک دیتا ہے مجبوراً مجھے آج کا کام کل پر ٹال دینا پڑتا ہے اور تو تو جانتا ہی ہے کہ کل کبھی نہیں آتا۔

اپنی صفائی میں تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ناک سانس لینے کے لیے اور سونگھنے کے لیے بنائی گئی ہے ویسے میرے ایک واقف کار علامہ اکس۔ وائی۔ زیڈ کے بقول ایک دن دونوں آنکھوں نے ناک کو دھتکارتے ہوئے کہا "دوسگی بہنوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو، شرم نہیں آتی تمہیں ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کر کے تم بھی خوش نہیں رہ سکو گی، ڈوب مرو اپنی اس کمینی حرکت پر، اگر باز نہیں آ سکتی ہو تو خودکشی کر لو"۔

ناک کچھ دیر تو آنکھ کی بکواس سنتی رہی پھر اس سے بھی خاموش نہیں رہا گیا "تم ڈوب مرو، مر جاؤ، اپنے جھوٹ کے لیے دنیا بھر میں بدنام، دو جھوٹ کہیں آپس میں نہ مل جائیں اسی لیے تو مجھے محافظ بنا کر تم لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کھڑا کر دیا ہے بےشرم تو تمہیں آنا چاہیئے"۔

لیکن میرے نزدیک ناک کی حمایت میں علامہ اکس۔ وائی۔ زیڈ کی یہ دلیل محض خوش فہمی ہے بقول غالبؔ

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ناک سانس لینے اور سونگھنے کے لیے بنائی گئی۔ تو کیا یہ ضروری تھا کہ سانس لینے کے لیے اور سونگھنے کے لیے ٹیلہ نما ناک ہی ہوتی۔ انسان منہ سے بھی تو سانس لے سکتا ہے۔ ناک نہ ہوتی تو انسان منہ سے ہی سانس لیتا اس سے فائدہ یہ ہوتا کہ انسان کو بیکار کی باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا اور انسانیت بہت سے فتنوں اور فسادوں سے محفوظ رہتی۔ منہ سے ہی سونگھنا بھی سکھا دیا ہوتا جب تو قادرِ مطلق ہے تو تیرے لیے یہ کون سی بڑی بات تھی تو تو انسان کو بغیر سانس کے بھی زندہ رکھ سکتا تھا۔ اگر ناک بنانی ضروری ہی تھی کہ اس کے نہ بنانے سے تیری صناعی ادھوری رہ جاتی تو اسے ٹیلہ نما بنانے کے بجائے جھیل نما بنایا ہوتا کہ انسان کے اچھے بھلے چہرے کا یوں ستیاناس تو نہ ہوتا آنکھیں بھی تو تیری ہی بنائی ہوئی ہیں مگر اس میں کیا مصلحت ہے کہ آنکھیں جھیل نما اور ٹیلہ نما بنایا یا تو آنکھوں کو بھی ٹیلہ نما بنا دیا ہوتا یا ناک کو بھی جھیل نما بنایا ہوتا کہ اس سے اونچ نیچ کا بھید بھاؤ تو پیدا نہیں ہوتا۔ ناک کو اپنی بلندی پر ناز نہ ہوتا اور وہ آنکھوں کو نیچ اور ذلیل نہ سمجھتی۔ ناک کی بلندی اور آنکھوں کی پستی نے کتنے فتنے پیدا کیے ہیں تجھے کیا پتہ؟ تو تو مزے میں آسمان پر براجمان ہے اور تیرے کارندے فرشتے زمین والوں کی غلط سلط رپورٹ پیش کرتے رہتے ہیں کہ انسان زمین پر بہت ہی امن و چین سے ہیں جس طرح ہندوستانی پولس عوام کی غلط سلط رپورٹ اپنے اعلیٰ افسروں کو پیش کرتی ہے اور اعلیٰ افسر اپنے محکمے کے وزراء کو کہ "سب ٹھیک ہے" وزراء "سب ٹھیک ہے" کی خوشی میں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں موج مستی مناتے رہتے ہیں اور ادھر عوام آپس میں کٹتے رہتے ہیں مرتے

رہتے ہیں تھے تیغ ہوتے رہتے ہیں۔ اے خدا! اے ناک بنانے والے خدا!! ناک کا فتنہ ہی کیا کم تھا کہ تونے اس میں بال بھی اُگا دیا۔ ناک کا بال تو ناک سے بھی زیادہ آفت کا پرکالہ نکلا۔ کچھ چالاک لوگ اس کی اتباع کرتے ہوئے "خاص" لوگوں کی ناک کا بال بن جاتے ہیں اور عام لوگوں کو ناکوں پانی پلا دیتے ہیں کبھی کبھی تو ناکوں چنا بھی چبوا دیتے ہیں۔ اگر ناک نہ ہوتی تو تیرے چہیتے شیخ جی کا بھرم بھی نہ جاتا یاروں کی کیا مجال تھی جو اُن کی خبر لیتے ؎

شیخ صاحب تھے ناک والے بہت خوب یاروں نے لی خبر ان کی

ناک نہ ہوتی تو تخریبی اسلحوں خصوصاً نت نئے بموں کی ایجاد نہ ہوتی اور یوں اولادِ آدم اولادِ آدم کا ناک میں دَم نہ کرتی لیکن اب تو یہ عالم ہے کہ ؎

پوچھئے کیا ہو جو ہری بم کا ناک میں دَم کیا ہے عالم کا

لوگ بات بات پر ناک بھوں چڑھانا بھی نہ جانتے اور حالیؔ کو ہرگز یہ نہیں کہنا پڑتا کہ ؎

نہیں راہ پر گو ترقی کے آتے نئی بات ہے ناک بھوں ہیں چڑھاتے

ناک پر مکھی بیٹھنے دینے یا نہ دینے کا معاملہ آپسی تنازعہ کا باعث نہ بنتا اور دنیا کشت و خون سے محفوظ رہتی۔ دانشوروں، عالموں اور رہنماؤں کو قیامِ امن کے لیے جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔ قیامِ امن کے سلسلے میں ہونے والی دعوتوں میں مرغن غذائیں کھا کھا کر ان کا معدہ خراب ہو جاتا ہے اور تو تو جانتا ہی ہے کہ جس کا معدہ خراب ہو جاتا ہے اس کو رات بھر نیند نہیں آتی اور جو سوتا نہیں وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً قیامِ امن کا نعرہ لگاتے لگاتے یہ دانشور، عالم اور رہنما پاگل ہو کر بدامنی پھیلانے لگتے ہیں ؏

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اے خدا! اے ناک بنانے والے خدا!! کہاں تک ناک کی فتنہ پردازیوں کو گنواؤں اگر ایک دو ہوں تو کوئی بات بھی تھی لیکن یہاں تو عالم یہ ہے کہ اس کی فتنہ پردازیوں کا کوئی شمار نہیں۔ اس کے سبب دن کا چین ہی نہیں رات کی نیند بھی حرام ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد رات کو ابھی آنکھ لگی ہی کہ دل پر ہتھوڑے سے چلنے لگے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بغل میں دس ہارس پاور کا ڈیزل انجن اسٹارٹ کر دیا ہے۔ گھبرا کر جو اُٹھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ قریب ہی سوئے ہوئے "مہمان صاحب" کی ناک کا یہ کرشمہ سازی ہے اور ایک کل ہی پر کیا منحصر ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ہی آنکھ بند ہوئی بیوی کی ناک ڈسکو میوزک کی طرح بجنے لگی۔ کبھی کسی بچے کی ناک پکا راگ الاپنے لگی کبھی کسی پڑوسی کی ناک دیوار قید و بند سے آزاد ہو کر ریڈیو سیلون کا پروگرام فل والیوم میں پیش کرنے لگی۔ کبھی کسی کی ناک پاگل کتے کی طرح غرانے لگی۔ کبھی کسی کی ناک بادل کی طرح گرجنے لگی۔ اب ایسے میں کوئی کیا سوئے۔

تیری اس بیش بہا صناعی نے تو صنفِ نازک کو صنفِ قوی سے بھی زیادہ پریشانی میں مُبتلا کر دیا ہے۔ اگر ناک نہ ہوتی تو نتھ اُترائی کی رسم بھی رواج نہ پاتی۔ تُو تو جانتا ہی ہے کہ نتھ اُترائی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اور پھر نتھ کا بوجھ کتنا بھاری ہوتا ہے کہ اس بوجھ کے نیچے دَب کر صنفِ نازک کا کچومر نکل جاتا ہے اور جو عورتیں اس بوجھ سے گھبرا کر اِسے اتار پھینکتی ہیں انھیں زندگی بھر نتھ کا زخم سہنا پڑتا ہے۔

اگر ناک نہ ہوتی تو زن دشویں نتھ، کیل اور نتھنی کا مسئلہ لے کر دھینگا مستی بھی نہ ہوتی۔ کم از کم گھر کے اندر تو امن چین قائم رہتا۔ لیکن اس ناک کے طفیل نہ گھر کے اندر امن و چین ہے اور نہ گھر کے باہر ــــ اے خدا! اے ناک بنانے والے خدا!! تیرے کارخانے میں کس چیز کی کمی تھی جو تو نے ناک بنا کر اس کی تلافی کی؟ ناک نے انسان کا جینا حرام کر دیا ہے ــــ! □□

مصنف: سی راج گوپال اچاری
مترجم: آفاق احمد (بھوپال)

کہانی کی کہانی

یہ کہانی گوپال کرشن آئر کی ہے!
گوپال کرشن آئر! جو اَب صرف مسٹر کوشک رہ گئے ہیں۔
وہ مسٹر کوشک کیسے بنے؟ یہ بات بڑی دل چسپ ہے۔ دراصل وہ جب آکسفورڈ پہنچے تو انھیں اپنا لمبا چوڑا نام بڑا بے ہنگم معلوم ہوا اور انھوں نے اس کے بجائے خود کو صرف مسٹر کوشک کہلانا پسند کیا۔ یہ نیا نام اگرچہ انگلش نہیں پر انگریزوں کے ناموں سے ملتا جلتا ضرور تھا۔

گوپال کرشن آئر جب ہندوستان واپس لوٹے تو وہ مسٹر کوشک آئی سی ایس تھے۔ پربتی پور تعلقہ کی ڈپٹی کلکٹری نے ان کا سواگت کیا اور دھیرے دھیرے سارے ہندوستانی رسوم سے انھیں لاتعلق بنا دیا۔
انھوں نے دیدہ و دانستہ ہندوؤں کے تمام اعتقادات کو غلط ٹھہرا کر اپنے گھر سے چلتا کیا۔ اُن کا بس چلتا تو شاید وہ اپنی بوڑھی ماں کو بھی کہنہ روایات کی طرح راستہ بتا دیتے۔ مگر لوک لاج کے مارے "صاحب بہادر" اتنی جسارت نہ کر سکے۔

گزشتہ کئی دنوں سے مسٹر کوشک کی ماں مُصر تھیں کہ ان کے سورگ باسی پتی کا شرادھ ضرور ہونا چاہیئے۔ پربتی پور کے برہمنوں کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ جانتے تھے کہ مسٹر کوشک ان "فضولیات" میں خود نہ پڑیں گے اور برہمنوں کے سہارے ماں کی ضد کی تکمیل کرائیں گے۔

یہی ہوا بھی ——!
لیکن جس دن شرادھ ہونا تھا اُسی دن ضلع کے کلکٹر مسٹر موربلی نے ایک گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا۔ مسٹر اور مسز کوشک کی شرکت وہاں بے حد ضروری تھی۔
مگر یہ شرادھ ——؟
مسٹر کوشک نے برہمنوں کو بُلایا اور اُن کے منہ مانگے دام منظور کر کے فوراً شرادھ کی رسم ادا کرنے کا حکم دیا۔ مسٹر کوشک کی جھنجھلاہٹ کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کلکٹر کی دعوت میں شرکت کا موقع نصیب والوں کو ملتا ہے۔ وہ بخت

غصے میں تھے کہ اس شرادھ کو بھی آج ہی نازل ہونا تھا۔ انھوں نے اپنا غصّہ برہمنوں پر اُتارا ۔۔!
اُن سے بولے ۔۔ "دوپہر سے پہلے پہلے اس شرادھ کو نپٹا دو۔ مجھے کلکٹر صاحب کے یہاں بڑے ضروری کام سے جانا ہے۔"

برہمنوں کو اس شرادھ سے کہاں دلچسپی تھی ۔۔ اُن کی منہ مانگی رقم طے ہو چکی تھی۔ اُنھوں نے فرنٹیر میل کی سی تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا۔

اُدھر سے اطمینان پاکر مسٹر کوشک اپنی مسز سے مخاطب ہوئے۔

"او مائی سوئٹ ہارٹ! ڈونٹ بی سو لیزی ۔۔ ۲ بجے سے پہلے پہلے تیار ہو جاؤ۔ ۵ بجے پارٹی ہے اور ہمیں ۵۲ میل کا راستہ طے کرنا ہے۔"

ماں اپنے پتی کے شرادھ میں بیٹے کی یہ عدم دلچسپی اور اکتاہٹ دیکھ کر بہت اُداس ہوئی۔۔ اس نے اپنی توجہ ہٹانے کے لیے بہو کے سنگھار میں ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ لیکن وہ بہت کوشش کرنے پر بھی بیٹے کی اِس لاپرواہی کو اپنے ذہن سے نہ جھٹک سکی۔ اُس نے اپنی بہو کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔۔

"بہو! آج میں زندہ ہوں۔ کل مری، پرسوں دوسرا دن ۔۔ پر تم بتاؤ کہ میں مرگئی تو گوپال کرشن شاید شرادھ ہی نہ کرے گا۔۔"

بہو ماں بیٹے کے جھگڑے میں پڑ کر کسی سے بُرا بننا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے خاموشی سے گردن ہلائی۔ ساس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ کسی نے اس کے جذبات کی قدر تو کی۔۔ اُس نے بڑی پیار بھری نظروں سے اپنی بہو کو دیکھا۔۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرا۔ جوڑے میں پھولوں کی مالا جمائی من ہی من بہو کی بلائیں لی اور بولی۔

"بھگوان بُری نظر سے بچائیں۔ جاؤ بیٹی۔"

جب مسز کوشک بن سنور کر اپنے شوہر کے سامنے آئیں تو مسٹر کوشک تابِ حُسن نہ لا سکے۔ اس وقت سُرخ رنگ کی بنگلوری ساڑی میں مسز کوشک کسی اپسرا کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ مسٹر کوشک کا دل چاہا کہ اپنی مسز کو چوم لیں۔ مگر بوڑھی ماں کے سامنے یہ ممکن نہ تھا۔

پھر بھی وہ بے اختیار پکار اُٹھے۔

"او ڈارلنگ! ہاؤ بیوٹی فل یو آر"

مسٹر کوشک عموماً بیوی سے انگریزی ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ وہ اکثر سوچتے تھے کہ ان فضول ہندوستانی زبانوں میں وہ لوچ اور وہ رس کہاں جو کسی حسینہ کا دل موہ لے۔ محبت اور رعب کے لیے اگر کوئی زبان ہو سکتی ہے تو وہ صرف انگریزی ہے۔۔ "ڈیم ویرنا کیولرز" وہ اکثر حقارت سے کہتے۔

آج مسٹر کوشک نے خود اپنے بناؤ سنگھار میں بھی کافی محنت کی تھی۔ وہ وضع قطع سے اچھے خاصے "صاحب بہادر" نظر آ رہے تھے۔ طرحدار بیوی کا ساتھ گویا "قیامت ہمرکاب" کا مترادف تھا۔

مسٹر کوشک نے خالص صاحب بہادرانہ انداز میں بیوی کو سہارا دے کر موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھایا۔ ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور مطمئن لہجہ میں بولے۔

"ڈیئر آل رائٹ ۔۔ بس ذرا گجراتیوں کے سے انداز میں ساڑی اوڑھ لو۔ تمہارے بال دھول سے محفوظ رہیں گے۔"

اپنے سر پہ ہیٹ پہن کر انھوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور پھر دھول کے بادل اڑاتا یہ جوڑا فراٹے بھرتی موٹر سائیکل پر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

ویران سڑک پہ موٹر سائیکل کی آواز دور افتادہ لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ یہ تعلقہ کافی پچھڑا ہوا تھا اور نئی تہذیب کی اکثر نعمتیں یہاں کے باسیوں کے لیے قطعاً اجنبی تھیں۔ بیل، موٹر سائیکل کی آواز سے بدکتے تھے اِدھر آس پاس کے دیہاتی اس بے لگام سواری کو دیکھنے کے لیے اپنا کھیتوں کا کام چھوڑ کر سڑک پر اکٹھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مسٹر کوشک لگاتار ہارن بجا کر ان "گندے" دیہاتیوں سے سڑک کو صاف کرتے آگے بڑھتے۔ دیہاتی، صاحب اور میم صاحب کو دیکھ کر متعجب ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ جب تیزی سے دھول کا کارواں اپنے پیچھے چھوڑتی موٹر سائیکل نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو ان کی آنکھوں کی معنی خیز چمک بہت سے پوشیدہ رازوں کو منکشف کرتی محسوس ہوتی!

۵۲ میل کی مسافت کوئی ہنسی کھیل نہیں تھی۔ جب مسٹر کوشک کلکٹر کے بنگلے پر پہنچے تو کسلمندی ان ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ مگر وہ خود کو بے حد سنبھالے ہوئے تھے۔ مسز کلکٹر اپنے ہندوستانی مہمانوں کی پذیرائی میں مصروف تھیں۔ مسز کوشک کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ وہ کبھی مسز کوشک کی ساڑی اس کے ملائم ریشم اور سرخ رنگ کی تعریف کرتیں تو کبھی اس کے ناگن جیسے لہراتے سیاہ بالوں کی سراہنا کرتیں۔

کافی دیر تک یہ پُر لطف صحبت جاری رہی اس پارٹی کو ہر لحاظ سے دل چسپ بنانے کے لیے قصہ کہانیوں کا پروگرام بھی رکھا گیا تھا۔ ہر ایک مجبور تھا وہ کوئی نہ کوئی کہانی حاضرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرے۔ خواہ اس کی یہ کہانی کتنی ہی بے ہنگم اور فضول ہو مگر قہقہوں کا طوفان ضرور جاگنا چاہیے۔

اس دعوت میں مسٹر ساکیت رام بھی شریک تھے۔ کہنے کو تو وہ بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر وہ شان اور طمطراق نہ دکھاتے تھے جو مسٹر کوشک کی فطرت ثانی بن چکا تھا۔ کہانیوں کا دور چلتا رہا۔ قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں۔ جب مسٹر ساکیت رام کی باری آئی تو سب بیک وقت چیخے ـــــ

"کوئی اچھی سی کہانی ہونا چاہیے"

ساکیت رام کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بلا کے ذہین افسانہ طراز ہیں۔ پوری محفل میں ان کی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری کا چرچا تھا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کنکھیوں سے مسٹر کوشک کی طرف دیکھا اور بولے ـــ

"کہانی تو اس وقت مجھے بہت بڑھیا یاد آرہی ہے لیکن یہ محفل اس کے لیے شاید مناسب نہ رہے گی"۔

کئی آوازیں آئیں۔ "نہیں صاحب! بہانہ نہیں چلے گا۔ آپ کو کہانی سُنانا ہوگی۔ اور وہی کہانی۔!"

ان آوازوں میں مسٹر کوشک کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ انھیں اپنی کہانی پر کافی داد ملی تھی اور وہ بہت خوش تھے

"دیکھئے مسٹر رام! آپ نے سب کی کہانیاں سُن لیں۔ اب خود دامن نہ بچا سکیں گے"،

مسٹر کوشک نے فاتحانہ انداز میں حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے کہانی تو میں سُنا دوں گا۔ لیکن مسٹر کوشک! آپ وعدہ کیجئے کہ مجھے کسی بات کے لیے مورد الزام قرار نہ دیں گے"، ساکیت رام بدستور مسکرا رہے تھے۔

"آپ جو وعدہ چاہیں لیں۔ لیکن زیادہ نہ تڑپائیے۔ بس ہو جائے وہی کہانی!" مسٹر کوشک نے خوش خلقی کا مظاہرہ کیا

"اچھا آپ سب کا اصرار ہے تو وہی کہانی حاضر ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی بالکل نئی ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ اس کا جنم اس پارٹی سے کچھ دیر پہلے ہی ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر ساکیت رام نے بھنے ہوئے کاجوؤں کی پلیٹ مسٹر کوشک کی طرف بڑھائی۔ مسٹر کوشک نے کچھ دانے اپنی پلیٹ میں ڈالے۔ ساکیت رام کچھ لمحہ کے لیے خاموش ہوئے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔ ساکیت رام نے معنی خیز نظروں سے مسٹر کوشک کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کہانی سنانے لگے۔

"آج میں اپنے ٹانگے پر سوار ہو کر یہاں آ رہا تھا کہ مجھے راستہ میں کچھ بھیڑ نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ ذرا دیکھوں تو ماجرا کیا ہے؟ پھر یہ تو فرض کا تقاضا بھی تھا کہ ڈپٹی کلکٹر کو اپنی رعایا کے بارے میں پوری جان کاری ہونی چاہیئے۔ البتہ ایک آئی۔سی۔ایس افسر کے لیے یہ ضروری نہیں۔"

مسٹر محمد علی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر کوشک! سنبھل کر بیٹھیے۔ کہیں یہ اشارہ آپ کی طرف تو نہیں!"

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں" ساکیت رام نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"خیر۔۔! جب میں بھیڑ کے نزدیک پہنچا۔ تو ان سب کو کافی گمبھیر پایا۔ میں نے پوچھا: 'کہو بھئی اس بار بارش تو اچھی ہوئی؟' کئی کسان چیخے 'نہیں سرکار'! وہ میری طرف عام کسانوں کی طرح بڑے استفہامیہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ آخر انھیں ہو کیا گیا ہے۔ اتنے میں ایک بوڑھا کسان اپنی سفید پلکیں اوپر نیچے کرتا دھیمی آواز میں بولا "سرکار! بارش ہو تو کیسے؟ ذرا ہمارے کرم تو دیکھئے۔ جب قابلِ احترام برہمن گھرانوں کی مہیلا میں گوروں کے ساتھ بھاگنے لگیں تو پھر سوکھا نہ پڑے گا تو کیا ہوگا؟"

میری حیرانی اور بڑھی اور میں نے بڑے میاں کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ دراصل مجھے یہ خطرہ تھا کہ کہیں اس علاقہ میں کوئی ایسا ویسا شرمناک واقعہ تو نہیں ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس واقعہ کی بھنک اخبار والوں کے کانوں میں نہ پڑ جائے اور وہ ایک کی چار لگا کر اسے نہ چھاپ دیں۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔ تمہیں کیا خبر؟

وہ عاجزی سے بولا "سرکار! میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

مجھے اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہیں یہ ناہنجار بوڑھا ہم برہمنوں کا مذاق تو نہیں اڑا رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے کڑک کر پوچھا: "اگر یہ بات غلط نکلی تو؟" وہ بوڑھا بولا۔ غلط نکلے تو حضور گردن اڑا دیں۔ ہائے رام کیسا کلجگ آ گیا ہے۔ سرکار کانوں سنی نہیں آنکھوں دیکھی کہتا ہوں۔

ابھی آدھا گھنٹہ گزرا میں نے اپنی ان آنکھوں سے یہ دیکھا کہ ایک پھٹ پھٹ کرتی جادو کی گاڑی فراٹے بھرتی یہاں سے گزری۔ اس میں ہیٹ لگائے وہ بدمعاش گورا آگے بیٹھا تھا اور اس کے پیچھے ایک کامنی سی معصوم برہمن لڑکی سرخ ریشم کی ساڑی پہنے بیٹھی تھی اور وہ گورا اسے بھگائے لئے جا رہا تھا اور سرکار ذرا بے شرمی کی انتہا تو دیکھو وہ اس گورے کے ساتھ اس طرح مٹک مٹک کر گا رہی تھی۔ جیسے اپنے بھگائے جانے پر بڑی خوشی ہو۔

'سرکار دن کے اجیالے میں ایسا گھور پاپ۔ اس کلجگ میں بھگوان بارش نہ کرے تو شکایت کیسی۔ کرنی کا پھل تو ملے گا ہی۔ پر سرکار کرے کوئی اور بھرے کوئی یہ کہاں کا انصاف ہے؟'

اتنا کہنے کے بعد مسٹر ساکیت رام نے اپنی سانس درست کی اور مسٹر کوشک سے پوچھنے لگے۔
آپ کی موٹر سائیکل کا رنگ سبز تو نہیں ؟
"جی ہاں سبز ہے"۔ روانی میں مسٹر کوشک کے منہ سے نکلا۔
فرمائشی قہقہوں سے محفل گونج اٹھی۔ مسٹر کوشک کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نظر آنے لگے۔
مسز موربلی نے اپنے قہقہے کو روکتے ہوئے پوچھا " اور مسٹر کوشک کیا آپ ہیٹ بھی لگائے ہوئے تھے ؟"
گھبراہٹ میں مسٹر کوشک نے دودھ کا جگ الٹ دیا۔
مسٹر موربلی نے معاملہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے مسٹر کوشک کی دلجوئی کے لیے ساکیت رام سے کہا — "نہیں مسٹر ساکیت رام! تم بہت خراب آدمی ہو۔ تمہیں جھوٹے قصّے گھڑنے میں بدطولیٰ حاصل ہے نہیں! نہیں جھوٹی سچی کہانیاں نہیں سُنانا چاہیئے"۔
ساکیت رام نے میز پر اُلٹا ہوا جگ سیدھا کیا۔ اور اپنی پرانی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بولے :-
قسم لے لیجئے جو ایک حرف غلط ہو۔ آخر بھلا مجھے جھوٹے قصّے سُنانے سے کیا ملے گا ؟"
پھر وہ محفل سے مخاطب ہوکر کہنے لگے :" اچھا آپ ہی فیصلہ کیجئے۔ کیا آپ میں سے کوئی یہ بھی تصوّر کرسکتا ہے کہ محض سر پر ہیٹ لگانے سے اس قسم کے گھوڑا باپ ہوسکتے ہیں — ؟
بہرحال مسٹر ساکیت رام کی کہانی تو اپنی جگہ رہی۔ اس دن سے مسٹر گوپال کرشن آئر سالق اور مسٹر شک حال میں دو نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں — ایک تو یہ کہ وہ کبھی ہیٹ لگاکر اپنی منیر کے ساتھ ہر جاتے نہ دیکھے گئے۔ اور دوسری یہ کہ پھر کسی نے انھیں ساکیت رام کے ساتھ گھُل مل کر دوستانہ باتیں کرتے نہ دیکھا — !

□□

گدھا نامہ ـــــ مفلس قارونی

ہر الیکشن میں برابر جیت کے آتے ہیں گدھے
مسندوں پر بیٹھ کر موجیں اُڑاتے ہیں گدھے

ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں رینگتے ہیں آدمی
اونچی اونچی بلڈنگوں میں دندناتے ہیں گدھے

بار برداری کے کام آتے تھے وہ دن اور تھے
بیٹھ کر کاروں میں اب آتے جاتے ہیں گدھے

اچھے اچھے امتحاں میں فیل ہوتے ہیں مگر
فرسٹ پوزیشن میں یا میرٹ میں آتے ہیں گدھے

دال روٹی وقت پر ہوتی نہیں مجھ کو نصیب
سامنے میرے مزے سے کھیر کھاتے ہیں گدھے

میں خود اپنے آپ کو محسوس کرتا ہوں گدھا
سوانگ جب جب آدمیت کا رچاتے ہیں گدھے

یوں پھڑک اٹھتے ہیں لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر
دیکھ کر ہریالی جیسے جھوم جاتے ہیں گدھے

نام اپنا اب ڈبوتا جا رہا ہے آدمی!
اِن دنوں تو نام دنیا میں کماتے ہیں گدھے

شہرتوں کے آسماں پر کتنی آب و تاب سے
چاند تارے بن کے ہر دم جگمگاتے ہیں گدھے

بول بالا اِن دنوں ان کا ہے ہر میدان میں
ہر جگہ اعزاز اور انعام پاتے ہیں گدھے

جب نظر آتی ہے کوئی خوبصورت سی گدھی
گیت بیجو باورہ کی دھن میں گاتے ہیں گدھے

آدمی کے کوئی کام آتا نہیں ہے آدمی!
ہاں! گدھوں کے تو برابر کام آتے ہیں گدھے

اب گدھے پن کی سند مجھ کو بھی حاصل ہوگئی
دیکھتا ہوں کیسے میرے آگے جاتے ہیں گدھے

کیا جواباً عرض کردوں میں انھیں دولتیاں
کیوں مسلسل ظرف میرا آزماتے ہیں گدھے

خارزاروں سے مسایل کے ہے اُلجھا آدمی
گیت ایسے میں گل و بلبل کے گاتے ہیں گدھے

مضحکہ مفلسؔ اڑاتے ہیں مرے افلاس کا
ڈگریوں پر میری میرا منہ چڑاتے ہیں گدھے

غزل ـــــ افتخار احمد کریک بتیاوی

ظلم پر ظلم ہوئے اہلِ نظر پر کتنے
شعر کہنے لگے اس شہر کے بندر کتنے

چاک دل چاک جگر سب لیے بیٹھے ہیں یہاں
لاؤں میں ڈھونڈ کے محفل میں رفوگر کتنے

میں بھی کہتا ہوں سنو، جاہلِ مطلق ہوں میں
لیکن اس بزم میں ہیں مجھ سے بھی کمتر کتنے

وہ بہت خوش ہیں کلام ان کا رسالے میں چھپا
تھوکتے ہیں مگر ان شعروں کو پڑھ کر کتنے

زندگی تھی تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا
اور مرنے پہ ہیں اب اس کے رپورٹر کتنے

ہنس ہنسا کے ہی سہی داد سخن تو لے لی
ٹرٹراتے رہے مینڈک یہاں ٹرٹر کتنے

آج محفل میں پڑھا رسے [illegible] نظم نئی
دوستو! دیکھنا چلتے ہیں یہاں شاٹر کتنے

محمد خورشید نادر (کامٹی)

ایجاداتِ جدیدہ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ تحریر میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

علامہ اقبال خلد آشیانی نے تقریباً چھ دہائی قبل عالمِ تحیّر میں کہا تھا ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

تحیّر خیز امر یہ ہے کہ علامہ موصوف نے جس وقت یہ شعر کہا تھا اس وقت کی ترقی آج کی ترقی کا عشر عشیر بھی نہ تھی۔ غالباً اس نابغۂ عصر کی چشمِ بینا نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا تھا اور غالب کے الفاظ میں، اس دیدہ ور نے پارۂ سنگِ ناتراشیدہ میں بُتانِ آذری کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شعرِ مذکور دقتِ تخلیق جتنا تر و تازہ تھا آج بھی اس کی تازگی کا وہی عالم ہے بلکہ عصرِ حاضر کے پس منظر میں وہ تازہ تر محسوس ہوتا ہے کیوں کہ دنیا اِتنی سُرعت و عجلت سے ترقی کر رہی ہے کہ خامہ انگشت بدنداں ہے کہ ایسے کیا لکھئے اور ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

بیشتر ایجادات تو ایسی ہیں جو ابھی پردۂ خفا اور صیغۂ راز میں ہیں اور جن کی نمائش و رونمائی غالباً تیسری عالمگیر جنگ کے آغاز تک ملتوی رکھی گئی ہے۔ ذیل میں جن ایجاداتِ جدیدہ کی تفصیلات مجملاً پیش کی جا رہی ہیں وہ ابھی برصغیر میں درآمد نہیں کی گئی ہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی بوجوہ ابھی عام نہیں ہوئی ہیں۔ تاہم جو تفصیلات باوثوق ذرائع سے معلوم ہوئی ہیں، بلا کم و کاست حوالۂ قلم کی جا رہی ہیں۔

قارئینِ باتمکین اس حقیقت سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ دورِ حاضر میں علم القرض نے ہوشربا ترقی کر لی ہے اور پیشہ ور افراد نے اسے ایک لطیف و نفیس آرٹ بنا دیا ہے۔ لوگ عربی محاورہ اَلقرضُ مقراضُ المحبّت کا اردو ترجمہ جاننے کے باوجود عادتاً یا روایتاً قرض دیتے اور لیتے رہتے ہیں۔ بے شک کچھ لوگ ضرورتاً قرض لیتے ہیں لیکن ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ بعض لوگ تفریحاً یا اسراِفاً قرض لیتے ہیں اور قرض خواہ کو زِچ کر کے اس

کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ قرض لینے کے عادی حضرات کی مشکلاتِ گوناگوں کو رفع کرنے اور حسبِ دلخواہ رقم بہ آسانی حاصل کرنے کے لیے ایک بیرونی کمپنی نے دو مخصوص ساخت کے کمپیوٹرز ایجاد کئے ہیں۔

پہلا کمپیوٹر بظاہر ایک بے ضرر سگریٹ کیس نظر آتا ہے جس شخص کو روپئے کی سخت اور فوری ضرورت ہو اس کمپیوٹر کو جیب میں رکھ کر پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اپنے احباب اور عزیز و اقارب کے پاس جاتا ہے اور اس کا سوئچ آن کر دیتا ہے۔ کمپیوٹر سے غیر مرئی شعاعیں خارج ہوتی ہیں اور فریقِ مخالف کی جامہ تلاشی لے کر واپس کمپیوٹر میں آجاتی ہیں پھر کمپیوٹر جیب میں موجود رقم شمار کر کے حامل کمپیوٹر کو بتا دیتا ہے کہ جیب میں زر نقد کتنا ہے نیز یہ کہ ترکیب نمبر فلاں پر عمل کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے کمپیوٹر جملہ معلومات چند سیکنڈ میں فراہم کر کے اپنے ڈائیل پر منعکس کر دیتا ہے اور ضرورت مند حسب دلخواہ رقم بہ آسانی حاصل کر سکتا ہے۔ کیوں کہ قوی الاثر شعاعیں فریقِ مخالف کے اعصاب کو مفلوج و ماؤف کر دیتی ہیں۔ اس کی حیلہ سازی اور عذر تراشی کی تمام صلاحیتیں مسلوب ہو جاتی ہیں اور وہ انتہائی خوشدلی کے ساتھ جملہ رقم بغیر گنے اس کے حوالہ کر دیتا ہے اور انتہائی عاجزی سے کہتا ہے ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را ۔ تو دانی حساب کم و بیش را

یہ ایجاد ان چندہ خوروں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے، جنھیں چندہ وصولی کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ مثلاً ایک چندہ خور ایک صاحب کے یہاں پہنچے اور ابتدائی کلمات رقت آمیز لہجہ میں ادا کرنے کے بعد باقاعدہ گریہ و زاری شروع کر دی۔ ان صاحب نے کچھ دیر تک تو برداشت کیا اور پھر پھٹ پڑے،

"بڑے میاں! رونے دھونے اور سینہ کوبی کے لیے بھی موقع محل دیکھنا ضروری ہے۔ یہ بول و براز سے فراغت کا معاملہ نہیں ہے کہ جہاں جی چاہا بیٹھ گئے۔ آپ ماشاءاللہ عقیل و فہیم ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بقولِ فانی رونے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں، یہ میرا ڈرائنگ روم ہے، آپ کا غم خانہ نہیں ہے۔ قوم کے زوالِ اقبال کا ماتم ہی مقصود ہے تو اس کے لیے مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں مثلاً مسجد، مدرسہ، خانقاہ اور قبرستان وغیرہ۔ یہ قومی شغل کچھ وہیں زیب دیتا ہے، اور آخری اور فیصلہ کن بات یہ کہ میں خود چندے، چندہ خوری یا بالفاظِ دیگر حرام خوری کر چکا ہوں، اس لیے ع

من خوب می شناسم پیرانِ پارسا را

یہاں آپ کی دال نہیں گلے گی، کوئی دوسرا دروازہ دیکھئے۔"

لیکن اس ایجاد کے باعث اب ایسے سرکش نادہندگان کو رام کر کے شیشہ میں اتارنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

دوسرا کمپیوٹر اپنی نوعیت و افادیت کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی ایجاد ان مقروض افراد کے لیے مژدۂ جانفزا ہے، جو اپنے قرض خواہوں کے مسلسل تقاضوں اور دھمکیوں سے پریشان رہتے ہیں۔ وہ اب اس کمپیوٹر کو جیب میں رکھ کر بلا خوف و خطر گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ پہلے وہ قرض خواہوں کے غیض و غضب اور ممکنہ دست درازی کے خوف کے باعث شارع عام سے ہٹ کر کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو، چلا کرتے تھے لیکن اب اس ایجاد نے نہ صرف یہ کہ ان کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں بلکہ ان کے اندر غضب کی خود اعتمادی بھی پیدا کر دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی مزید قرض لینے کی استعداد (BORROWING CAPACITY) میں بھی

غیر معمولی اضافہ کردیا ہے۔ اگر خدانخواستہ سرِ راہ کوئی دیرینہ قرض خواہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوکر راستہ روک لے اور آمادۂ فساد ہو تو قرض دار فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر کمپیوٹر کا سوئچ آن کر دیتا ہے۔ اس کمپیوٹر سے جو شعاعیں خارج ہوتی ہیں، وہ انتہائی مغضوب الغضب آدمی کو بھی آنِ واحد میں ڈھیلا کردیتی ہیں۔ یہ شعاعیں قرض خواہ کے اعصاب کو سُن کردیتی ہیں۔ وہ حواس باختہ اور ہکا بکا دکھائی دیتا ہے، اور خود کو چور محسوس کرتا ہے۔ قرض وصول کرنے کی بات اس کے ذہن سے یکسر محو ہو جاتی ہے اور وہ قطعی غیر متعلقہ باتیں انتہائی دوستانہ انداز میں کرنے لگتا ہے۔ مثلاً موسم کی ناسازگاری، اشیائے ضروریہ کی نایابی، بڑھاپے میں عقدِ ثانی سے پیدا شدہ مسائل اور اس سے منسلک اندیشہ ہائے دور دراز وغیرہ اور پھر انتہائی رقت آمیز لہجہ میں اپنا کہا سنا معاف کروا کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

ایک معجزہ نما ایجاد ان دنوں عوامی حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنی ہوئی ہے اور وہ ہے ایک الکٹرانک آلہ جس کی ایک ناقابلِ یقین خصوصیت یہ ہے کہ اسے استعمال کرکے حسبِ منشاء خواب دیکھے جا سکتے ہیں۔ انسان نیم مختار مخلوق ہے۔ یعنی بعض معاملات میں مختارِ مطلق اور بعض معاملات میں مجبور و بے بس۔ مثلاً اگر وہ کھڑا ہے اور اس سے کہا جائے کہ ایک پاؤں اوپر اٹھالو تو بے تکلف اُٹھالے گا مگر دوسرا پاؤں بھی اُٹھانے کے لیے کہا جائے تو نہیں اٹھا سکے گا اور ضد میں آکر اٹھانے کی کوشش کرے گا تو منہ کے بل گر پڑے گا۔ بس انسان اتنا ہی مختار اور اتنا ہی بے بس ہے۔ مگر خواب کے معاملے میں مجبورِ محض و بے دست و پا ہے اور از آدم تا ایں دم خواب ہائے پریشاں لاشعوری طور پر دیکھتا چلا آرہا ہے۔ یہ خواب خواہ اعصابی تشنج کی وجہ سے ہوں یا بخاراتِ معدہ کے باعث اسے ان خوابوں سے کوئی مفر نہیں۔ نہ تو ناپسندیدہ خوابوں سے نجات پا سکتا ہے اور نہ خوش آئند خوابوں کو حسبِ خواہش طول دے سکتا ہے۔ یہ خواب جس طرح غیر ارادی طور پر شروع ہوتے ہیں اسی طرح بغیر کسی نوٹس کے جہاں ان کے جی میں آئے ختم ہو جاتے ہیں، اور انسان آنکھ اور دستِ تاسف ملتا رہ جاتا ہے۔ مگر اب اس تازہ ایجاد نے انسان کی اس پیدائشی بے بسی اور بے بضاعتی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا ہے کیونکہ اب وہ حسبِ دلخواہ خواب دیکھ سکتا ہے۔

یہ ایک ذوالمقاصد آلہ ہے۔ اور صحیح معنوں میں "خواب آور" ہے۔ یہاں لفظ خواب آور بھی ذو معنی ہے۔ یعنی یہ آلہ نیند بھی لاتا ہے اور خواب بھی دکھاتا ہے۔ اس آلہ کا استعمال کنندہ ایک تیر سے دو شکار کرسکتا ہے اول مغز سر میں آماس پیدا کرنے والے اور روح کو جھلسا دینے والے خانگی نکچروں سے نجات بھی پا سکتا ہے اور دوم یہ کہ من چاہے خواب بھی دیکھ سکتا ہے۔

یہ کم خرچ بالانشیں قسم کا آلہ ہے جسے مظلومین اور شوقین دونوں قسم کے حضرات استعمال کرسکتے ہیں۔ پرچہ ترکیبِ استعمال آلہ سے منسلک ہے۔ اس کے مطابق اس آلہ کو کنٹوپ کی طرح پہن کر کے لیٹ جائیے اور جس قسم کے خواب پسندِ خاطر ہوں انتہائی خشوع و خضوع سے ان کی نیت باندھ لیجئے۔ پانچ منٹ میں آپ خواب خرگوش کے مزے لینے لگیں گے۔ نہ تار بستر خار بستر معلوم ہوگا نہ اختر شماری کی کوفت برداشت کرنی پڑے گی۔ چند لمحوں بعد وہ روح پرور مناظر آپ کی نظروں کے سامنے ہوں گے جنھیں آپ نے اس سے قبل کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔

ہم اس نادرۂ روزگار آلہ کی تفصیل لکھ ہی رہے تھے اور ابھی پہلی سطر کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ اس ضمن میں مزید پیش رفت کی خبر ملی۔ اس آلہ کے موجد نے یہ خبر شائع کرکے سنسنی پھیلادی کہ وہ بالآخر ایک ایسا ذیلی آلہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے جس کی مدد سے خودساختہ خوابوں کی ویڈیو فلمیں بھی تیار کی جاسکتی ہیں۔ یہ لازاییدہ آلہ مذکورہ آلہ کا تکملہ ہے جسے اول الذکر آلہ کے ساتھ منسلک کردیا جائے تو وہ خوابوں کی ویڈیو فلمیں کیسیٹ میں ریکارڈ کرلے گا اور آپ ضروری سمجھیں تو ان خوابوں کی ویڈیو فلمیں اس آلہ کی اسکرین پر میٹنی شو کی طرح دن میں بھی دیکھ سکیں گے اور فرط استعجاب و مسرت سے بے ساختہ کہہ اٹھیں گے ؎

ایں کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب

خوابِ بیداری (DAY DREAMING) ہمیشہ سے ہم ہندوستانیوں کا قومی مشغلہ رہا ہے اب اس ایجاد نے اس خواب کو بھی شرمندۂ تعبیر کردیا ہے، یعنی ہم اب دن میں خواب دیکھ سکیں گے، محاورۃً نہیں بلکہ واقعتہً۔

اس ایجاد کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ شبِ ہجراں بخیر و عافیت گزار دینے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ یہ شبِ ہجراں المعروف بہ شبِ فراق کس قیامت کی چیز ہوتی ہے، اس کا کچھ اندازہ سوداؔ کے اس شعر سے ہوسکتا ہے ؎

ہوتی نہ تھی صبح نہ آتی تھی مجھ کو نیند
جس کو پکارتا تھا، وہ کہتا تھا مر کہیں

اور اس کی طوالت کی صحیح پیمائش آج تک نہ ہوسکی۔ صرف ایک غیر معروف شاعر المتخلص بہ غریبؔ نے اسے ناپنے کی جرات کی تھی؛ انہیں علم ریاضی پر عبور حاصل تھا۔ کسی شاگرد نے ان سے فرمائش کی ؎

دعویٰ بہت ہے علم ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجئے۔

ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے ؎

طولِ شبِ فراق جو ناپا گیا غریبؔ
لیلیٰ کی زلف سے ہوا دو چار ہاتھ کم

لیکن اب شبِ ہجراں اور اس سے متعلق دلدوز حکایتیں قصۂ پارینہ بن کر رہ جائیں گی۔ اب کسی عاشقِ مہجور کو شبِ ہجراں گزارنے کا مسئلہ درپیش ہوگا تو وہ بازار سے یہ آلہ خرید لائے گا یا کسی سے مستعار لے کر اس عذابِ الیم سے نجات حاصل کرلے گا اور علی الصبح بیدار ہوکر فخر و مسرت سے کہے گا ؎

شبِ ہجراں گزار دی میں نے
روزِ محشر تو کس شمار میں ہے

لیکن مذکورہ بالا خوبیوں کے باوجود اس کی تعمیر میں ایک خرابی مضمر ہے۔ اس نقص کو دور کرنے میں موجد نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیں مگر یہ خامی دور نہ ہوسکی اور بالآخر عاجز آکر اس نے اپنی یہ سعیٔ لاحاصل ترک کردی۔ نقص یہ ہے کہ اسے صرف کامل العقل افراد ہی استعمال کرسکتے ہیں، ناقص العقل طبقہ اس سے مستفید

نہ ہو سکے گا۔ اور یہ امر غالباً محتاجِ صراحت نہیں کہ ناقص العقل کون ہے؟

ناقص العقل طبقہ اس ایجاد پر چراغ پا ہے، اور اس نے موجد پر الزام لگایا ہے کہ اس نے قصداً ایک خاص طبقہ کی تحقیر و تذلیل کا سامان فراہم کیا ہے، لیکن موجد کا استدلال یہ ہے کہ ناقص العقل ازلی و خلقی نقص ہے، جسے دور کرنے پر وہ قادر نہیں۔ اس توجیہہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور طبقۂ اناث نے مشتعل ہو کر اس معاملہ کو عدالت کے روبرو پیش کر دیا ہے۔ جہاں، تادمِ تحریر، بحث جاری ہے۔ ویسے عام خیال یہ ہے کہ اس معاملہ کو عدالت کے روبرو پیش کرنا بجائے خود ناقص العقلی کی دلیل ہے۔

مخفی نہ رہے کہ جدید میڈیکل سائنس نے طویل ریسرچ اور تجربات کے بعد اس رازِ سربستہ کو منکشف کیا ہے کہ اس تودۂ خاک پر پائی جانے والی ہر جاندار مخلوق بہ اعتبارِ ساخت فی الواقع ٹھوس نہیں بلکہ کھربوں خلیوں کا مجموعہ ہے جو مخصوص عناصر میں ظہور ترتیب سے عبارت ہے۔ یہ خلیات باہم اس طرح پیوست ہیں کہ بظاہر ٹھوس معلوم ہوتے ہیں۔ ایک خاص سائنسی عمل کے ذریعہ ان خلیوں کو علیٰحدہ کر کے ذرات کی شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور پھر ان اجزائے پریشاں کی ازسرِ نو شیرازہ بندی کر کے متشکل کیا جا سکتا ہے۔

یہ تحقیق و انکشاف اگرچہ عقلِ انسانی کی معراج ہے مگر انسان وہ مخلوق ہے جو ہر چیز میں شر کا پہلو تلاش کر لیتی ہے۔ چنانچہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے چند سائنس دانوں نے ایک دستی آلہ ایجاد کیا ہے جسے بہ آسانی ساتھ لے کر چلا جا سکتا ہے اور کبھی کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ فلاں شخص کے ہاتھ میں فلمی نغموں کا کیسیٹ نہیں ایک شعاع ریز آلہ ہے، جس کا سوئچ آن کر دیا جائے تو اس سے خارج ہونے والی شعاعیں چشم زدن میں انسان کو ذرات میں تبدیل کر دیتی ہیں اور پھر یہ آلہ ان ذرات کو کھینچ کر اپنے اندر مقید کر لیتا ہے۔ اس طرح آنِ واحد میں ایک انسان کیسیٹ میں بند ہو جاتا ہے۔ بعد میں یہ کیسیٹ مخصوص مقامات پر بھیج دیئے جاتے ہیں جہاں انھیں دوبارہ انسان میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔

مغربی ممالک میں اس تیکنک نے ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے، اور انسان بردار کیسیٹ لائبریریاں تک وجود میں آ گئی ہیں، جن میں ہر قسم کے ماہرین مقید ہیں۔ یہ لائبریریاں شہر خموشاں کی مانند ہیں اور منتخب روزگار افراد ان کیسیٹوں میں زندہ درگور ہیں۔ اگرچہ ان اسیرانِ کیسیٹ کی طبعی موت واقع نہیں ہوئی ہے مگر عملاً "انتقالِ پُر ملال" ہو چکا ہے، سائنس دانوں کی مہربانی سے یہ جیتے جی آنجہانی سے ہو گئے ہیں اور اب کیسیٹوں میں نظر بند ایک کے اوپر ایک رکھے منتظرِ فردا ہیں۔ ان میں سے بعض کی نمازِ جنازہ غائبانہ ادا کی جا چکی ہے۔ اور ان کے اعزہ ایصالِ ثواب میں مصروف ہیں لیکن بعض گم شدہ افراد کے کیس میں ماندگان ناامید نہیں ہوئے ہیں اور ان کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ یہ سادہ لوح کیا جانیں کہ جن کے وہ منتظر ہیں وہ ناکردہ گناہوں کی پاداش میں سزائے حبس دوام بھگت رہے ہیں۔ اور اس قیدِ تنہائی اور حبسِ بیجا میں رہتے ہوئے زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

در جستجوئے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

بعض حکومتیں اور مفسد ادارے ایسے افراد کو جو فردِ وحید سمجھے جاتے ہیں اور جن کی ذاتِ واحد

پوری انجمن پر بھاری ہوتی ہے، اغواء کرکے ان کی ذہن شوئی (BRAIN WASHING) کے مرتکب ہوتے ہیں۔ خاص سائنسی آلات کی مدد سے ان غریب الدیار اور بے دست و پا افراد کے ذہنوں کو صاف کرکے اپنے خانہ ساز اور رسوائے زمانہ نظریات وافکار ان کے ذہنوں پر دائمی طور پر مرتقسم کر دیتے ہیں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ بعض افراد جو اپنی سابقہ زندگی میں غیر سیاسی یا اعتدال پسند تھے، اپنی عارضی روپوشی کے بعد حیات نو پاکر نمودار ہوتے ہیں تو اچانک "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگانا شروع کر دیتے ہیں اور ضرورت داعی ہو تو سنگ باری بھی کرتے ہیں۔

یہ وہ انکشافات ہیں جو منظر عام پر آچکے ہیں۔ مگر وہ تازہ ترین اطلاعات جو آہنی پردے سے کسی طرح چھن کر یا رس کر آرہی ہیں وہ انتہائی تشویش ناک اور ہوش رُبا ہیں۔ مثلاً سائنس دانوں کا ایک گروہ اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ ایک ماہر ریاضی داں اور ایک ممتاز و منفرد شاعر کے ذرہ نما خلیات کو آپس میں مخلوط و مدغم کرکے ایک ایسی نئی ہستی وجود میں لائے جو بیک وقت ریاضی داں بھی ہو اور اعلیٰ پایہ کا شاعر بھی۔ یہ ایک مسلم الثبوت اور آفاقی حقیقت ہے کہ ریاضی اور شاعری میں بُعد المشرقین ہے۔ یہ گروہ اس عوامی عقیدہ کو مفروضہ قرار دے کر اس کی تکذیب کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ان سائنس دانوں نے بطور تجربہ ایک کیسیٹ سے ریاضی داں اور دوسرے کیسیٹ سے شاعر کے نصف نصف خلیات لے کر اور آپس میں ملا کر اور چرخ دے کر ایک مخلوط الفنون شخصیت کو مجسم کیا مگر جو مخلوق وجود میں آئی اس کی ہیئت کذائی اور حرکات دے کر سائنس داں انگشت بدنداں رہ گئے۔ کیوں کہ اس نئے شخص کے سر کے بال خشک، منتشر اور بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے، مگر چہرہ کلین شیوڈ تھا۔ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں برائے نام فاصلہ رہ گیا تھا لیکن پتلون بہترین تراش کی اور عمدہ طریقہ سے پریس کی ہوئی تھی۔ وہ کبھی اپنی انگلیوں کے پوروں پر حساب کر کے کاغذ پر کچھ نوٹ کرتا اور پھر کبھی قلم کے سرے کو دانتوں میں دبائے غور و فکر میں ڈوب جاتا اور پھر گنگنانے لگتا۔ سائنس دانوں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر پڑھا تو اس پر یہ عبارت "۔۔۔۔ = ۵۰۰ روپے کا سود در سود ۔۔ = ۵۰ روپے فی صد سالانہ کے حساب سے ۲۵ سال کا ـــــ خاک ہو جائیں گے ہم اس کے ادا ہونے تک"۔

ظاہر ہے شخص مذکور یک قالب دو جان کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر کی دونوں شخصیتیں اپنے اپنے ظہور کے لیے کوشاں تھیں۔ کبھی ریاضی داں والی شخصیت غالب ہو جاتی کبھی شاعر صاحب اسے مغلوب کرکے خود اُبھر آتے اور اپنی اوقات دکھانے لگتے۔ سائنس داں اس سچویشن سے بوکھلا گئے۔ اسے فوراً چمبر میں دھکیل دیا اور الٹا چرخ دے کر دونوں شخصیتوں کے ذرات کو علیٰحدہ کرکے متعلقہ کیسیٹوں میں بند کر دیا اور پھر سر جوڑ کر از سرِ نو غور و فکر میں ڈوب گئے یہ بھی ابتدائے مشق ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

دورِ حاضر کمپیوٹر، روبوٹ، خلائی شٹل، لیزر شعاعیں، نیوٹرن بم اور دیگر الکٹرانک آلات کا دور ہے۔ یہ پیچیدہ مشینیں اور آلات خود کار ہوتے ہیں، جن کی تکمیل کے بعد انسان محض ایک چوکیدار کی طرح ان کی نگرانی کرتا ہے۔ محیّر العقول ایجاداتِ جدیدہ میں فی الوقت روبوٹ اپنی افادیت اور کارکردگی کے باعث سرِ فہرست ہے۔ کیوں کہ یہ انسان کا نعم البدل یا متبادل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے انسان کو بطرز احسن تخلیق فرما کر اس ارضِ بسیط پر، بقول خود اپنا خلیفہ نامزد کیا ہے، اور اس میں بے پناہ تخلیقی قوت بھی ودیعت

ذیادی ہے۔ اور حضرتِ انسان نے اپنی اسی تخلیقی قوت کے بل بوتہ پر اپنا ایک ذاتی خلیفہ تخلیق کر لیا ہے اور اپنی تمام ذہانت و صلاحیت اس کے ذہن میں منتقل کردی ہے۔ یہی آہنی خلیفہ روبوٹ کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن یہ ڈپلی کیٹ خلیفہ بھی اپنے خالق کے روبرو اتنا ہی محتاج و بے بس ہے، جتنا کہ اس کا خالق اپنے خالق ارض و سماء کے روبرو۔

یہ روبوٹ مختلف النوع اور مختلف الاشکال ہیں اور مختلف فرائض انجام دیتے ہیں۔ مثلاً ٹریفک کنٹرولنگ، چوکیداری، دوکانداری، خانگی ملازمین کے فرائض، بحرِ ذخار میں غوطہ زنی وغیرہ لیکن روبوٹ کی یہ وہ اقسام ہیں جن کی کارکردگی سے عام آدمی بھی واقف ہے۔ لیکن وہ انتہائی جدید قسم کے روبوٹ جو ابھی پردۂ خفا میں ہیں، اور جن کی تفصیلات کسی طرح منظرِ عام پر آگئی ہیں، انتہائی سنسنی خیز اور دور رس نتائج کی حامل ہیں۔ مثلاً ایک روبوٹ 'نقاد' کے نام سے موسوم ہے۔

یہ ایک پورٹیبل، فولڈنگ روبوٹ ہے، جسے بہ آسانی ایک سوٹ کیس میں رکھ کر لے جا سکتے ہیں۔ یہ ادبیاتی تنقید کے لیے مخصوص ہے، اور فی الوقت تجربات کے آخری مراحل میں ہے۔ طریقِ استعمال یہ ہے کہ اسے کسی لائبریری میں لے جا کر سوٹ کیس کا ڈھکنا کھول دیا جاتا ہے۔ اپنے خودکار نظام کے تحت یہ فوراً اچھل کر باہر آجاتا ہے اور چشم زدن میں سرو قد روبوٹ بن جاتا ہے، اور سر کو خفیف سا خم کر کے حکم کا منتظر رہتا ہے بعینہٖ الہ دین کے طلسمی چراغ کے جن کی طرح جو مجسم ہو کر کہتا تھا "فرمایئے میرے آقا! کیا حکم ہے"؟ جس قسم کی تنقید مقصود ہو اس کی تفصیلات ایک مخصوص ساخت کے کارڈ پر درج کر کے اس کارڈ کو اس کے اندر واقع ایک خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ چند منٹ کے بعد روبوٹ اپنے فرائض منصبی بجالانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ بڑی پھرتی سے الماریوں تک جاتا ہے اور متعلقہ کتب منتخب کر کے میز پر سلیقہ سے جما دیتا ہے، علاوہ پھر یکے بعد دیگرے ان کا باریک بینی سے مطالعہ کرتا ہے، اقتباسات کی زیروکس کاپی بناتا ہے، مندرجات کے حسن و قبح کو اپنی یادداشت (MEMORY) میں محفوظ کرتا ہے اور مفصل اور جامع تنقیدی رپورٹ ٹائپ کر کے اپنے آقا کے سپرد کر دیتا ہے۔

یہ روبوٹ بے لاگ و بے باک اور خدا لگتی قسم کی تنقید نگاری میں عجوبۂ روزگار ہے۔ حتیٰ کہ حکومتِ وقت کی کارگردگی پر بھی منصفانہ تنقید کر سکتا ہے، اور اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو اُجاگر کر سکتا ہے۔ مغربی ممالک چونکہ آزادیٔ رائے، آزادیٔ تحریر و تقریر اور آزادیٔ ضمیر کے مؤید و مبلغ ہیں اس لیے انھوں نے اس کی تنقید نگاری پر کوئی قدغن نہیں لگایا ہے۔

اس کے برعکس ان کے حریف ممالک میں جو روبوٹ ڈیزائن کیا گیا ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے! اس میں صرف ایک سوئچ ہے جس کا رنگ خونِ کبوتر کی طرح سُرخ ہے، بظاہر دو آنکھیں نظر آتی ہیں مگر صرف بائیں آنکھ مصروفِ عمل رہتی ہے، دائیں آنکھ محض خانہ پُری کے لیے ہے۔ اسی لیے حریف ممالک اسے یک چشم گل اور واحدالعین (ONE EYED) کہتے ہیں۔ وہ محض چند مخصوص موضوعات پر تنقید کر سکتا ہے۔ بقیہ موضوعات اس کے حق میں شجرِ ممنوعہ اور اس کے حیطۂ عمل سے باہر ہیں۔ تنقیدی لب و لہجہ بھی جارحانہ اور اشتعال انگیز ہے۔ تنقیدی شعور اگرچہ پختہ ہے مگر تیز و تند، یک طرفہ، غیر معتدل اور غیر متوازن ہے۔ یہ روبوٹ بھی ادبیاتی

تنقید کے لیے مخصوص ہے مگر اس کی تنقید میں ادبیت کم اور سیاست جزو غالب کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس مو. خرالذکر روبوٹ کے متعلق بعض مبصرین کا خیال ہے کہ اس کی تعمیر و تخلیق تضیع اوقات اور اسراف بے جا کے سوا کچھ نہیں کیوں کہ آج کل معاشرہ میں ایسے روبوٹ نما دانش مند بآسانی دستیاب ہیں جن کے نان و نفقہ کا بندوبست کر دیا جائے تو بندۂ بے دام کی طرح ہر خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ نہ ان کی اپنی کوئی آواز ہے نہ اصول و نظریہ۔ بالکل روبوٹ کی طرح حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور گراموفون کے ریکارڈ کی طرح بجتے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ بخوف طوالت ہم مزید ایجادات کی تفصیل سے گریز کر رہے ہیں۔ اور زندگی وہی اور غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملی تو ہم ان ایجادات کے بارے میں لکھیں گے جو ابھی زیر تکمیل ہیں اور تجربات کے مختلف مراحل میں ہیں۔

□-□

سلمان کرہانی
(نئی دہلی)

معذرت

میں نے جیسے ہی سنِ بلوغ میں قدم رکھا میرے اندر کچھ کچھ ہونے لگا۔ عجیب طرح کی تکلیف سے دو چار ہوگیا میں نے اپنے دل سے ہی چند دوائیں کھالیں لیکن آرام نہ ہوتا تھا۔ کئی دنوں کی سخت پریشانی کے بعد ایک دن اچانک ایک شعر موزوں ہوگیا اور میری وہ تکلیف کم ہوگئی۔ تب جاکر مجھے خیال آیا یہ میرے اندر کا فنکار مروڑ لے رہا ہے۔

پھر کیا تھا۔ ہر روز ایک غزل ہونے لگی۔ اور میرے اندر کا کچھ کچھ بہت کچھ میں تبدیل ہوگیا۔ پھر تو مشغلہ ہی شعر و شاعری کا بن گیا۔ نہار ہے ہیں تو مطلع ہوگیا، جسم پونچھ کر ابھی تولیہ الگنی پر ڈالا بھی نہیں تھا کہ حسنِ مطلع اس سے بھی زیادہ خوبصورت کلبلانے لگا۔ سوتے جاگتے بس یہی گھماگھمی رہتی۔ اکثر لوگوں کے پورے کے پورے سہرے تو بیت الخلاء میں ہوگئے۔

لیکن چند برسوں بعد جب عقل داڑھ نکلی تو سمجھ میں آیا یہ کوئی اچھا مشغلہ نہیں۔ ارے شاعری میں کیا ہے جس کو دیکھو اس شغل میں مبتلا ہے۔ چاہے وہ اسٹیشن پر ہو یا اسپتال میں، چاہے بینک کے کاؤنٹر پر بیٹھا نوٹ گن رہا ہو یا پکچر ہال کے کاؤنٹر پر بیٹھا ٹکٹ پھاڑ رہا ہو، چاہے وہ بس میں سفر کرتا ہو یا اپنی ذاتی ماروتی کار میں فراٹے بھر رہا ہو۔ ہر جگہ غزل ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے بس کنڈکٹر کی طرح جو کہ آخری اسٹاپ آنے سے پہلے آخری ٹکٹ پھاڑ کر چین کی سانس لیتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اپنی غیر تکمیل شدہ غزل کو پورا کر کے نئی منزل کا انتظار شروع کر دیا۔

میرے بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں افسانے لکھنا شروع کر دوں۔ چنانچہ میں نے ایک دو افسانے لکھ ڈالے پہلے تو گھر میں سب کو بہت پسند آئے پھر ان کا اصرار ہوا کہ میں انھیں رسائل میں شائع کرانے کے لیے بھیجوں۔ چنانچہ میں نے اپنا پہلا افسانہ ملک کے مقبول ترین رسالے میں بغرض اشاعت روانہ کر دیا۔ اور افسانے کے ساتھ ساتھ چند روایتی جملے اپنے پیڈ پر لکھ ڈالے۔ مثلاً میں ایک نوجوان لکھنے والا ہوں۔ آپ کا رسالہ نہ صرف یہ کہ میں پڑھتا آرہا ہوں بلکہ میرے باپ دادا بھی اسی کو پڑھتے آرہے ہیں۔ زیرِ نظر افسانہ میری ایک اعلیٰ تخلیق ہے یقیناً آپ

پسند آئے گا۔ میں آپ کی گراں قدر رائے کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔ اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے' وغیرہ وغیرہ
پھر کئی مہینے تک میرے افسانے کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ میں ہر مہینے اس رسالے کو خریدتا کو اب کی میرا افسانہ ضرور شامل ہوگا لیکن ہر بار مایوسی ہوتی۔ چنانچہ تنگ آکر میں نے ایک یاد دہانی کا خط ایڈیٹر۔ صاحب کو لکھ ڈالا، جس کا جواب واقعی بہت جلدی آگیا۔ ڈاکیے نے جیسے ہی مجھے لفافہ تھمایا مجھے یقین ہوگیا، میرا افسانہ منظور ہوگیا کیوں کہ لفافے کا وزن بہت ہلکا تھا۔ میں نے سڑک پر لفافہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ اکثر پرندے ناشائستہ حرکت کر ڈالتے ہیں۔ میں سیدھا گھر آگیا اور اپنے ہاتھ دھوکر لفافے کو اس طرح کھولا جیسے یہ کوئی مقدس صحیفہ ہو۔ کاغذ کی تہوں کو کھول کر جیسے ہی پہلا جملہ پڑھا سارے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ محترم ایڈیٹر صاحب کا خط کچھ یوں تھا۔

صاحب زادے!

آپ کا بے وجہ افسانہ ملا۔ ہمارے رسالے کی چند شرائط ہیں جو شاید آپ نہیں جانتے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱. یہ کوئی گورنمنٹ کا ادارہ نہیں جس کو جوابی لفافہ نہ بھیجا جائے۔ اگر آپ جوابی لفافہ بھیجتے تو نہ جانے کتنے دنوں پہلے آپ کا افسانہ آپ کے ہاتھوں میں ہوتا۔
۲. آپ ایک نئے لکھنے والے ہیں اور ہمارے یہاں کم از کم دو سال کا تجربہ ضرور چاہیئے۔
۳. سرکاری رسائل میں اگر آپ چھپتے ہوں تو اس کا کم از کم پانچ سال کا تجربہ ہو۔ کیوں کہ ان رسائل میں تو کوئی بھی مواد چند نکاتی پروگرام پر لکھ کر بھیج دیا جائے تو چھپ جاتا ہے۔
۴. فلمی رسائل کا صرف ایک سال کا تجربہ کافی ہے۔ کیوں کہ آپ کا افسانہ چھپنے کے ایک سال کے اندر اندر اگر وہ بند نہیں ہوا تو یقیناً آپ کے افسانے میں کچھ خاص بات ہے۔
۵. اگر آپ ہمارے یہاں پھر کبھی افسانہ بھیجنے کی زحمت کریں تو تا عمر خریداری کا چندہ پہلے بھیج دیں۔

اُمید کہ مزاج درست ہوگا۔

معذرت خواہ۔ آپ کا لایف۔ ب۔ ت)

محترم ایڈیٹر صاحب کا خط پڑھ کر میرے حوصلے پست ہوگئے۔ لیکن میرے دوستوں اور عزیزوں نے مجھے دلاسہ دیا یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ تو ادبی جنگ ہے۔ اگر تم چھپ جاؤ تو ایڈیٹر ہار گیا اور اگر نہ چھپ سکو تو ایڈیٹر کی جیت۔ چنانچہ بات میری بھی سمجھ میں آ ہی گئی۔ میں نے اپنا ایک اور افسانہ ایک دوسرے رسالے میں بھیج دیا اور اب کی لفافہ رکھنا نہ بھولا چند ہی روز میں جواب بھی آ گیا۔ لفافہ کھولنے پر معذرت کا خط نظر آیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنا اگلا افسانہ ایک اور رسالے کو بھیج دیا۔ لیکن وہاں سے بھی معذرت ہی نصیب ہوئی۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے مشغلے کو جاری رکھا۔ اور اب تو مجھے "معذرت" نامے پڑھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار تو جواب اتنی جلدی آجاتا جیسے میرا افسانہ پہنچنے سے پہلے ہی ایڈیٹر نے معذرت لکھ دی ہو۔ چند برس اور گزر جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اب رسائل بہت نکل آئے ہیں اور میرے پاس افسانے کم ہیں اس لیے میں نے ایک چارٹ بنا لیا کہ کون سا افسانہ کس رسالے کو کس مہینے میں بھیجا ہے۔ اکثر تو ایسا بھی ہوا کہ اگلا ایڈیٹر کی طرف سے معذرت کے خط میں تاخیر بھی ہوگئی تو میں برا نہ مانا اور اس افسانے کو دوسرے رسالے کیلئے

اور وہاں سے جو افسانہ واپس آتا تھا اس کو پہلے والے رسالے میں بھیج دیا. چوں کہ میں افسانہ نگار تھا اور اس طرح کا حساب کتاب رکھنا کسی اکاؤنٹنٹ کا کام ہوتا ہے اس لیے کبھی کبھار شرمندگی بھی اٹھانی پڑتی. کیوں کہ ایک ہی افسانہ جو ایک بار ایک رسالے سے واپس آچکا ہے حساب کی غلطی کی وجہ سے دوبارہ پھر وہیں چلا گیا. جس پر ایڈیٹر نے مجھے تنبیہ کی کہ "آپ اپنا افسانہ بھیجنا بند کریں گے یا میں پولیس کو خبر کردوں؟"

غرض کہ پھر مسئلہ یہ نہیں رہ گیا تھا کہ افسانہ چھپنا ہے بلکہ مسئلہ یہاں آکر اٹک گیا تھا کہ کون ایڈیٹر کس کس طرح معذرت کے خطوط لکھتا ہے میں نے ایک الگ فائل بنائی تھی جس پر جلی حروف میں لکھ دیا تھا "معذرتی خطوط فائل" بالکل اسی قسم کی فائل جس طرح "تعزیتی خطوط کی فائل" بنا کرتی ہے. پھر میں نے اپنے افسانوں سے زیادہ احتیاط اس فائل کی شروع کردی. کیوں کہ اب میرا ارادہ تھا کہ ادب کے اس پہلو پر پی ایچ ڈی کر ڈالوں. لیکن پھر یہ سوچ کر ترک کردیا کہ میرا یہ تحقیقی مقالہ میرے ہونے والے بچوں کی رسوائی کا باعث بنے گا اور ان کی گردنیں "معذرت" سے جھک جائیں گی. چنانچہ میں نے تمام تعزیتی..... معاف کیجئے گا معذرتی خطوط اٹھا کر "گنیز بک آف ریکارڈز" (GUINEA'S BOOK OF RECORDS) کے مولفوں کو بھیج دیئے.

OO

غزل ــــ بجلی گھونسلاوی

آپ سے اک سوال ہے بھائی　　حل کریں تو کمال ہے بھائی
غیر کھاتے ہیں مرغ کا قورمہ　　اپنے حقے میں دال ہے بھائی
اس گرانی نے توڑ ڈالی کمر　　زندگی اک وبال ہے بھائی
پیٹ خالی ہے جیب بھی خالی　　چہرے پر کیوں جلال ہے بھائی
وہ سناتے ہیں یوں غزل اپنی　　جس میں سُر ہے نہ تال ہے بھائی
یہ غزل ہم بھی کہہ گئے بجلی
آپ کو کیوں ملال ہے بھائی

انگلش کا بھوت ــــ قدیر لکھم پوری

ہوگیا جب بھوت انگلش کا مرے سر پر سوار
پائجامہ اور کرتے کو دیا میں نے اتار
ایک لایا کیپ عمدہ اور لایا سوٹ میں
خوبصورت ٹائی لے لی اور لایا بوٹ میں
صبح کو اُٹھ کر کہا بیگم سے میں نے مارننگ
دے کے بیڈ ٹی بولیں بیگم ہائے ڈیئر ڈارلنگ
ہو کے خوش میں نے کہا تم کو کلب لے جاؤں گا
تم مری وائف ہو تم کو ڈانس بھی سکھلاؤں گا
چائے پی کر سب سے پہلے کام یہ میں نے کیا
لمبی چوڑی میں نے داڑھی کا صفایا کر دیا
اب نئی تہذیب والے ہنس نہ مجھ پر پائیں گے
ہنسنے والے دیکھ لینا اپنے منہ کی کھائیں گے
اب نہیں اسلامیہ اسکول بچہ جائے گا
مجھ کو ڈر ہے میرا لڑکا مولوی بن جائے گا
حیف اس[1] کا وقت میں نے کر دیا کتنا خراب
آج سے انگلش پڑھے گا صرف انگلش ہی جناب
اب کوئی اخبار اردو کا نہیں گھر لاؤں گا!
نام دقیہ نوس لوگوں میں نہیں لکھواؤں گا
اب کروں گا دوستوں کی اس طرح دعوت جناب
ساتھ کھانے کے ملے گی سب کو انگریزی شراب
لان میں میرے نظر آئیں گے اونچے لوگ سب
منتری اور سیٹھ ہوں گے کلکٹر اور عرب
شکر کرتا ہوں بہت ہی میں ترا پروردگار
میری بیگم نے دیا برقع بہت پہلے اتار
اب یہ ٹھانی ہے کہ جتنے مفلس و نادار ہیں
ان سے کہہ دوں گا نہیں وہ میرے رشتہ دار ہیں
اب جو انگلش کا ہے رسیا وہ مرا محبوب ہے
وہ نہ چاہے باپ ہو مجھ کو نہیں مرغوب ہے
گھر میں دسترخوان کا رکھنا بھی ہوگا بار اب
میز کرسی کے زمانے میں ہے یہ بیکار اب
کانٹے چمچوں کا زمانہ ہے بس اتنا سوچ کر
میں نے بھی یہ ڈھول تاشا لا کے رکھا اپنے گھر
سوچتا تھا لیٹے لیٹے ایک جھٹکا سا لگا
آگیا حکم خدا سے چار جانب زلزلہ
اینٹ اک ایسی گری آکر مرا سر پھٹ گیا
لے چلا تھا سمتِ دوزخ بھوت جو وہ ہٹ گیا

---

[1] حضرت برق آشیانوی سے [illegible]

رضا نقوی واہی سے ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کی دُو دُو باتیں!

سوال : آپ کی پیدائش کی تاریخیں ؟ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ تاریخ پیدائش اسکول کے رجسٹر میں کچھ اور ہوتی ہے اور حقیقتاً کچھ اور ؟

واہی صاحب :۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق میں یکم فروری ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوا۔ میرے پاس کوئی ایسی دستاویز موجود نہیں جس کی بناء پر اسے رَدّ کیا جا سکے۔ سوال کے دوسرے حصّے کے تعلق سے یہ عرض کروں گا کہ کسی نو مولود کی تاریخ پیدائش کا علم اس کے والدین کو ہی ہوتا ہے جس کی پُرسش تحقیق کے کٹہرے میں کھڑے کسی فنکار سے نہیں کی جانی چاہیئے۔ مزید تحقیق کے لیے میری نظم محقق پڑھ لیجئے، جو بے مقصد تحقیق پر ایک طنز ہے۔ دُو اشعار بطور ٹریلر سن لیجئے۔

زیرِ تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے ✦ کس قدر چوہے پلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بجکر پانچ پر یا پانچ بجکر سات پر ✦ داغ نے توڑا تھا دم زالو پہ منّی جان کے

سوال :۔ آپ کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشو و نما کن حالات میں ہوئی ؟

واہی صاحب : میری ابتدائی تعلیم بستی کے مڈل اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد پٹنہ کے کالیجیٹ اسکول میں میٹرک تک اور پٹنہ کالج میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی اور آخر میں صوفی کمرشیل کالج کلکتہ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے کامرس میں ڈپلوما لے کر ۱۹۳۷ء میں بہار لیجسلیٹو اسمبلی میں بہ حیثیت اردو رپورٹر ملازمت شروع کی اور ۱۹۷۴ء میں بہار لیجسلیٹو کاؤنسل کی سکریٹریٹ سے بہ حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری ریٹائر ہوا۔
میں ریاست بہار کے ضلع سیوان کی جس بستی کا رہنے والا ہوں یا کبھی تھا۔ وہ بستی اب مرحوم ہو چکی ہے۔ تعلیم کے زمانے ہی سے میں مستقل طور سے پٹنہ میں ہی رہنے لگا ہوں۔ میری بستی کا نام کجھوا KUJHWA ہے۔ وہ عرصۂ دراز تک علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اور میری ذہنی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی۔

ایک زمانہ تھا کہ سادات کی یہ بستی علم و فضل کی وجہ سے بہار بلکہ پورے مشرقی یو.پی کے اضلاع میں مشہور و معروف رہی۔ وہاں ایّام محرم میں مجلسیں ہوا کرتی تھیں. جن میں انیس کے مرثیے پڑھے جاتے تھے. جن سے میرا ذہن متاثر ہوتا تھا. ابتداء میں انیس کی شاعری نے ہی مجھے شاعری کی جانب متوجہ کیا. انیس کے بعد جوش کی شاعری نے جس کی میری نو جوانی کے عالم میں دھوم تھی میرے ذہن کو متاثر کیا. میری بہت ساری سنجیدہ نظمیں مثلاً ماکھی، بھوک، مشعل آج کچھ کھایا نہیں، اچھوت وغیرہ اسی دور میں تخلیق ہوئیں، جو اس زمانے کے رسائل ساقی، ادب لطیف، ایشیا، اور ندیم وغیرہ میں شائع ہوئیں۔

سوال: لکھنے کی ابتداء کب اور کن حالات میں ہوئی ؟

راہی صاحب: پہلی مزاحیہ نظم ڈسمبر ۱۹۴۸ء میں لکھی جس کی تخلیق کا محرک ایک دل چسپ واقعہ ہے ۱۹۴۸ء میں ڈسمبر کی کوئی تاریخ تھی. میں کرسمس کی تعطیل میں والدین سے ملنے وطن گیا ہوا تھا صبح کے وقت گھر سے باہر بیٹھک کے چبوترے پر منہ ہاتھ دھورہا تھا کہ دیکھا ایک بزرگ رشتہ دار جو دماغی امراض میں مبتلا ہوکر کئی سال رانچی کے اسپتال میں زیر علاج رہ چکے تھے اور اس وقت تک نارمل نہیں ہوئے تھے. میری جانب تیز تیز قدموں سے چلے آرہے ہیں. ٹوپی شیروانی چوڑی مہری کا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں. سفید داڑھی چہرے پر بکھری ہوئی ہے. سرخ سرخ آنکھیں ایک ہاتھ میں موٹا ڈنڈا لیے ہوئے ہیں. میرے قریب آئے. زمین پر ڈنڈا مار کر کرخت آواز میں بولے۔

"رضا میاں کیا کر رہے ہو ؟ بڑے شاعر بنتے ہو ؟ ادھر آؤ میرے پاس" یہ بے ربط گفتگو سن کر میرے اوسان خطا ہوگئے. فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے ڈنڈے کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے چند قدم پیچھے ہٹ گیا. میرے عزیز نے مجھے خونخوار آنکھوں سے گھورتے ہوئے پھر کہا" ادھر آؤ۔ پھر مردانہ بیٹھک سے گزرتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے" اندر کئی بڑی بڑی چوکیوں کا فرش تھا. کچھ کرسیاں اور میز ادھر اُدھر پڑے تھے. چوکیوں کے فرش پر ڈنڈا رکھنے کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے۔ کہنے لگے" بڑے شاعر بنتے ہو ؟ سنو یہ نظم اور صلاحیت ہو تو لکھو ایسی نظم پھر جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر تھرک تھرک کر ترنم سے پڑھنے لگے۔

"ایکے لے او مے لے. لوھا میں لے چھوا میں لے" وغیرہ وغیرہ، میں دور کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا. جب یہ بے تُکا کلام ختم ہوا تو کچھ کہے بغیر ڈنڈا اُٹھا کر اسی تیزی سے واپس چلے گئے جس تیز رفتاری سے آئے تھے. یہ تُک بندی ہندی کے ایک شاعر پرنسپل منورنجن سنہا کے زور قلم کا نتیجہ تھی. منورنجن سنہا اُس زمانہ میں راجندر کالج چھپرا کے پرنسپل تھے. انھوں نے اس نظم میں ایم. ایل. اے حضرات کو ہدف بنایا تھا. اس کے بعد معاً ذہن میں یہ بات آئی کہ جب میں خود اسمبلی میں ملازم ہوں اور روزانہ ہی ارباب سیاست کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل کرتا رہتا ہوں تو کیوں نہ میں بھی ایم. ایل. اے حضرات کی خبر لوں. چنانچہ دوپہر تک دس بارہ اشعار لکھ ڈالے. یہ وہ زمانہ تھا جب سہیل عظیم آبادی مرحوم پٹنہ سے روزنامہ 'ساتھی' نکالا کرتے تھے اور اس اخبار میں ایک مزاحیہ کالم" راہی کے قلم سے" کے مستقل عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ میں نے اپنے وہ اشعار اسی دن ان کے نام اس تاکید کے ساتھ پوسٹ کردیئے کہ میرا نام ظاہر کئے بغیر کبھی

فرضی نام سے "ساقی" میں شائع کردیں۔ سہیل نے مذاق یہ کیا کہ "راہی" کے ہم قافیہ لفظ "واہی" کے نام سے ایم۔ایل۔اے کی سُرخی لگاکر وہ اشعار شائع کردیئے۔ یوں میرے اچھے بھلے نام کی مٹی پلید ہوئی۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے میرا اصل نام ظاہر کرنا بہت سی مشکلات کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اِس مذاق کو خندہ پیشانی سے برداشت کرلیا۔ تعطیل کے بعد جنوری ۱۹۴۹ء میں جب وطن سے پٹنہ واپس آیا تو یہاں میری نظم کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ ایک دن سہیل مرحوم میرے دفتر پہنچے اور مُصر ہوئے کہ "ساقی" کے لیے برابر مزاحیہ نظمیں لکھوں تاکہ ان کے اخبار کے قارئین کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہے۔ چنانچہ میں نے ہر ہفتے ایک نظم لکھنی شروع کردی۔ موضوعات کی کمی نہیں تھی۔ ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ قومی حکومت برسرِ اقتدار آئی تھی۔ چند ہی سال قبل دوسری جنگ عظیم ختم ہوکر اپنے پیچھے عوام کے لیے نئے نئے مسائل چھوڑ گئی تھی۔ ایسے میں طنزیہ اور ظریفانہ شاعری کے لیے مواد بکھرا پڑا تھا۔ لہٰذا نظمیں ڈھلنے لگیں اور "ساقی" کے ہفتہ وار ایڈیشن میں شائع ہوتی رہیں۔ جب ان نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہوگئی تو مرحوم عبدالقیوم انصاری نے جو اس زمانے میں ریاست بہار کے ایک وزیر تھے، ان نظموں کی اشاعت کے لیے مالی امداد دی اور اس طرح میرے ظریفانہ کلام کا پہلا مجموعہ "واہیات" کے نام سے ۱۹۵۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

سوال: اپنے خیالات کے اظہار کے لیے آپ نے صنفِ طنز و مزاح کا انتخاب کیوں کیا؟

واہی صاحب: اس لیے کہ صنفِ طنز و مزاح میری پسندیدہ صنف ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے غیر ضروری سوالات سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اگر کسی سے یہ پوچھا جائے کہ غذا میں تمہیں روٹی ہی کیوں مرغوب ہے، چاول کیوں نہیں؟ تو ایسے سوال کا آخر مطلب کیا ہوگا۔ جس طرح پیٹ بھرنے کے لیے کوئی بھی مرغوب غذا استعمال کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اپنی پسندیدہ صنف اختیار کی جاسکتی ہے۔

سوال: موضوع کا انتخاب آپ کس طرح کرتے ہیں؟

واہی صاحب: موضوع کا انتخاب آپ ہی ہو جاتا ہے۔ معاشرے کے کسی بدنما پہلو پر نظر جاتی ہے۔ دماغ میں مواد پکنے لگتا ہے جو بعد میں نظم کی صورت میں اُبل پڑتا ہے۔

سوال: کسی موضوع کو برتنے کے لیے آپ کن باتوں کا خصوصیت سے خیال رکھتے ہیں؟

واہی صاحب: موضوع کو برتنے کے لیے میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ خیالات کی ترسیل عام فہم زبان میں بہ آسانی ہوجائے اور اشعار ایک دوسرے سے مربوط رہنے کے علاوہ فنّی تقاضوں کو پورا کرتے رہیں۔

سوال: کیا مزاح نگاری تخلیقی فن ہے؟

واہی صاحب: جی ہاں۔ اگر اعلیٰ تنقید کو بھی تخلیقی ادب میں شامل کیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ طنز و مزاح فن تنقید کا ایک شوگر کوٹیڈ اسلوب ہے۔ ورنہ جس طرح شاعری، افسانہ نگاری، ڈراما نگاری اسالیبِ ادب ہیں، اسی طرح طنز و مزاح نگاری بھی تخلیقی فن ہے۔

سوال: خالص مزاح کی تعریف؟

واہی صاحب: خالص مزاح کی تعریف ارسطو سے لیکر پروفیسر کلیم الدین احمد کے زمانے تک ہر چھوٹے بڑے ناقد نے اپنے اپنے طور پر اتنے متضاد طریقوں سے کی ہے، کہ اس کنفیوژن میں مزید اضافہ کرنا لاحاصل ہے

سوال : کیا ہر ادیب کو صاحبِ کتاب ہونا چاہیئے ؟

واہی صاحب : صاحبِ کتاب یا صاحبِ موٹر کار ہونے کے لیے جیب کی استطاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ادبی نہیں خالص معاشیاتی مسئلہ ہے۔

سوال : آج کے معاشرے کو طنز کی زیادہ ضرورت ہے یا مزاح کی ؟

واہی صاحب : دونوں کی۔ طنز سے معاشرے کا فاسد مادّہ نکالا جاتا ہے اور مزاح سے مرہم پٹّی کی جاتی ہے۔

سوال : آپ کن کن غیر ملکی مزاح نگاروں سے متاثر ہیں ؟

واہی صاحب : میں نے غیر ملکی کیا خود اپنے ملک کی مختلف زبانوں کے طنز و مزاح نگار حضرات کی تخلیقات پڑھی ہی نہیں اس لیے کسی سے متاثر نہیں ہوں۔

سوال : کیا آپ اپنی کسی ادبی تخلیق پر نادم بھی ہیں ؟

واہی صاحب : نہیں۔

سوال :- آپ ذہنی آسودگی کے لیے لکھتے ہیں یا بطور شوق ؟ کیا آپ کے پاس لکھنے کا مقصد اتنا ہی ہے کہ وقت اچھا گزر جائے ؟

واہی صاحب : اس سوال کا جواب پانے کے لیے آپ میرا کلام پڑھیئے۔ پڑھنے کے بعد آپ خود سمجھ جائیں گے کہ آیا میں اپنی ذہنی آسودگی کے لیے یا بطور شوق نظمیں لکھتا ہوں یا سماج میں جو برائیاں ہیں ان کی نشاندہی کے لیے لکھتا ہوں۔

سوال : مشتاق احمد یوسفی کا قول ہے کہ "تحریر و تقریر سے انقلابات رونما ہوتے تو گولہ بارود اور اسلحہ جات ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ؟ آپ ان کے اس خیال سے متفق ہیں ؟

واہی صاحب : انبیاء و مصلحین نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ ہی قوموں میں ذہنی انقلابات برپا کیے۔ گولہ بارود کے استعمال نے کمزوروں کا استحصال ضرور کیا لیکن اس زبردستی سے پیدا شدہ حالات کو انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔

سوال :- اردو طنز و مزاح نگاروں میں اچھے شعراء کا فقدان ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں ؟

واہی صاحب : طنز و مزاح مشکل ترین صنفِ ادب ہے۔ اور اسے برتنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے عام شعراء کی کم علمی سستی شہرت کے لیے انہیں بجائے مزاح نگار کے سرکس کا مسخرا بنا دیتی ہے! اسی لیے سنجیدہ ظرافت نگار شعراء خال خال نظر آتے ہیں۔

سوال : کیا اردو طنز و مزاح کا ذخیرہ اس قابل ہے کہ اسے دوسری زبانوں کے مقابل پیش کیا جا سکے ؟

واہی صاحب : اس سوال کا جواب دوسری زبانوں سے کلی طور پر واقف علماء ہی دے سکتے ہیں۔ دنیا میں سیکڑوں زبانیں ہیں۔ آپ کے سوال کا بھرپور جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو دنیا کی دوسری زبانیں پوری طرح سے جانتا ہو اور تقابلی مطالعہ و تجزیہ کرنے کا اہل ہو۔ مجھ جیسے کم مایہ لوگوں سے ایسے سوالات پوچھنا تضیعِ اوقات ہے۔

سوال : صنفِ اردو طنز و مزاح کو ناقدین میسّر نہیں، اس کے کیا اسباب ہیں ؟

داعی صاحب: اگر آپ وسعتِ نظر سے کام لیں تو آپ کو قائل ہونا پڑے گا کہ فنِ طنز و مزاح پر ابتداء سے اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ معیاری تخلیقات کی مقدار کے لحاظ سے اس صنف پر لکھنے والے ناقدوں کی کمی نہیں ہے۔

سوال: کیا بعض لوگوں کی طرح آپ بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو کی بقاء کے لیے دیوناگری رسم الخط کو اپنانا چاہیئے؟

داعی صاحب: یہ سوال آپ کے دائرۂ سوالات سے باہر چلا گیا۔ پھر بھی میں یہ عرض کروں گا کہ میں یہ نہیں مانتا کہ موجودہ رسم الخط کی وجہ سے اردو زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گی۔

سوال: عموماً طنز و مزاح نگار ایک دو کتابوں کے بعد اپنا فنی معیار قائم نہیں رکھ پاتا، اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟

داعی صاحب: جب طنز و مزاح نگار کے پاس موضوعات کی کمی ہوتی ہے تو وہ یا تو کہی ہوئی باتوں کو دہرانے لگتا ہے یا کمتر درجے کی چیزیں لکھنے لگتا ہے۔ لیکن میں پھکڑپن کو طنز و مزاح کی صنف میں نہیں رکھتا۔ اب تک میرے سات مجموعے اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر آپ ان کو پڑھیں گے تو سیکڑوں نظموں میں کسی ایک نظم کے اندر بھی کوئی مبتذل یا پھکڑ قسم کا لفظ نہیں پائیں گے۔ غیر تربیت یافتہ ذہن کا شاعر ہی غیر مہذب شاعری کرتا ہے اور میں ایسے لوگوں کو ظرافت نگار نہیں سمجھتا۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں اردو پر جمود طاری ہے؟

داعی صاحب: میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ اردو پر جمود طاری ہے۔

سوال: سماج کی نظروں میں ایک لیڈر کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے یا ادیب کی؟

داعی صاحب: دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ مثلاً سماج کی نظروں میں لیڈر کی حیثیت سے اگر گاندھی جی جواہر لال نہرو، لینن اور اسی قبیل کے دوسرے لوگ اہمیت کے حامل ہیں تو دوسری طرف بہ حیثیت ادیب غالب، اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور بھی ان کی نظروں میں اہمیت کے حامل ہیں۔

سوال: کیا نئی نسل میں ایسا کوئی فنکار ہے۔ جسے آپ کے بعد آپ کا جانشین کہا جا سکے؟

داعی صاحب: شاعری میں، میں نہ تو خود کسی کا جانشین ہوں، اور نہ اپنے بعد کسی کو جانشین نامزد کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ میرے انتقال کے بعد، یہ آپ لوگوں کا کام ہوگا کہ میری گدی پر کسے بٹھائیں گے۔

سوال: اردو طنز و مزاح کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

داعی صاحب: یہ حالات پر منحصر ہے۔

سوال: ہندوستان میں اردو کا مستقبل؟

داعی صاحب: میں علم نجوم کا ماہر نہیں ہوں۔ اس لیے کوئی پیشن گوئی کرنے سے قاصر ہوں۔

سوال: اردو زبان و ادب کی صحیح خدمت آپ کے نزدیک کیا ہے؟

داعی صاحب: ایمانداری سے اردو کے فروغ کے سلسلے میں کام کرتے جائیے۔
اس سوال کا جواب چند الفاظ میں نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے طویل مضمون درکار ہے۔

سوال: کیا آپ اپنے فن سے مطمئن ہیں؟

داعی صاحب، کوئی بھی فنکار اپنے فن سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اگر وہ مطمئن ہو جائے تو اس کی ادبی موت واقع ہو جاتی

میں ابھی زندہ ہوں۔

سوال: آج کل آپ کس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں؟

واہی صاحب: میں شاعری کرتا ہوں، جب کوئی موضوع ہاتھ آجاتا ہے تو اسے نظم کر دیتا ہوں۔ اور شاعری کسی پروجیکٹ پر کام کرنے کا نام نہیں۔

سوال: آپ کی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ؟

واہی صاحب: اس عمر میں یادداشت بے حد کمزور ہوگئی ہے اس لیے ناقابلِ فراموش کوئی واقعہ یاد نہیں۔

سوال: آپ کی آخری خواہش؟

واہی صاحب: میں نے اب تک وصیت نامہ نہیں لکھا ہے۔ اس لیے فی الحال کوئی آخری خواہش نہیں، اور آپ تو غالب کا وہ مصرع پڑھتے ہی ہوں گے ـــــ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ ایسے میں آخری خواہش کیا ـــــ؟

■■

تفصیلات ملکیت بابت ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد

بموجب قانون رجسٹریشن آف نیوز پیپر آف انڈیا سال ۱۹۵۶ء

تحت دفعہ ۸ ـــــ فارم نمبر ۴

مقام اشاعت :	۳۱ بیچلرز کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱
وقفہ اشاعت :	ماہنامہ
مدیر طابع وناشر :	سید مصطفےٰ کمال
قومیت وپتہ :	ہندوستانی، ۷۶۸-۶-۱۷ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۳
نام حصہ دار جن کا ایک فی صدم سے زائد حصہ ہے۔	مسز قیصر کمال ۷۶۸-۶-۱۷ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۳

میں سید مصطفےٰ کمال مدیر، طابع وناشر شگوفہ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کی حد تک صحیح ہیں۔

مورخہ ۱۰ر مارچ ۸۶ء

دستخط: سید مصطفےٰ کمال

دے کے خط ...

(مراسلے)

-: منظوم خط :-

(ماہنامہ شگوفہ کا سالنامہ ۱۹۸۶ء دیکھ کر)

میرے اچھے سے مصطفےٰ صاحب
رحمتیں آپ پر سدا صاحب
سالنامہ مجھے ملا صاحب
غنچۂ دل مرا کھلا صاحب
سب مضامین اس کے ہیں اچھے
اور ہے خوب اداریہ صاحب
پڑھ کے مضمون فکرؔ صاحب کا
ہنستے ہنستے میں رو گیا صاحب
"میرے گھر کا پتا" پڑھا اس میں
بھول اپنا گیا پتا صاحب
بات پرویزؔ کی پڑھی جس دم
خوب پھڑکی رگِ حیا صاحب
سرور ڈنڈاؔ کی یاد کو بے شک
مجتبیٰ نے دیا جلا صاحب
"واہ حیدرآباد" میں عابدؔ
خوب جچتے ہیں برملا صاحب
فاعلاتن مفاعلن فعلن
جی میں آیا ہے سو لکھا صاحب
بات ہے اور اس شمارے میں
کر رہا ہوں مطالعہ صاحب
دیجیئے اب مجھے اجازت جی
رب کرے آپ کا بھلا صاحب

صابر بہاری۔ رانچی

* کمال صاحب!

شگوفہ، فروری ۱۹۸۶ء میں شریف الدین نقوی (دہلی) کا خط پڑھا جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ برقی آشیانوی پرانی سڑک کے مسافر لگتے ہیں۔ ایسی رائے تفصیلی مطالعہ کے بغیر دینا درست نہیں۔ اگر صرف نظم "نیا سال" کے بارے میں لکھتے کہ وہ نظم پسند نہیں آئی یا قدامت کی جھلک ہے تو میں خاموش ہو جاتا۔ لیکن یہ فیصلہ کر "پرانی سڑک کے مسافر لگتے ہیں" اُن کے مطالعہ اور حالات سے ناواقفیت اور مطالعہ کی کمی کا اظہار ہے۔ میں ۱۹۷۳ء (مارچ) میں خود ان کے شہر دہلی کے مزاحیہ مشاعرہ میں شریک ہوا تھا اور "ایسی نئی سڑک پر چلا تھا" کہ اطراف واکناف کے تمام شعراء سے سبقت لے گیا۔ میری تیس شعر کی نظم کو سلام مچھلی شہری مرحوم، رفعت سروش، مخمور سعیدی وغیرہ نے بے حد پسند کیا تھا۔ یہ تیس شعر کی نظم پوری کی پوری بلا کم و کاست آل انڈیا ریڈیو دلی سے نشر ہوئی جب کہ دوسرے شعراء کے منتخب اشعار تین یا چار کی حد تک منتخب ہوئے۔ اور جب دلی کے ایک ماہنامے میں مشاعرہ کی روداد شائع ہوئی تو پورے تیس شعر شائع کئے گئے۔ اگر وہ میری کتاب "مکرر ارشاد" کا مطالعہ کرتے تو یہ جملہ نہ لکھتے۔ کوئی رائے دی جائے تو تحقیق کے ساتھ دینی چاہیئے۔

آپ سے بھی یہ کہنا ہے کہ کسی تحریر میں سقم پایا جائے تو بحیثیت ایڈیٹر یا تو اسکو حذف کر دیا جائے یا پھر اُن کی غلط فہمی کو اپنی جانب سے دور کیا جائے۔

موسیٰ کلیم (برقؔ آشیانوی) حیدرآباد

* جناب مصطفےٰ کمال پاشا ہو!

مبارکباد سالنامہ!

سالنامہ تھا یا فال نامہ جس میں طنز و مزاح کے سبھی قوی ہیکل ستارے پورے فارم میں تھے: نثر کے سورماؤں کو شاباشیاں دیجئے۔ اور نظم کے تورماؤں کو واہ واہیاں دیجئے۔

آپ کو آپ کے آرٹسٹ، کاتب و معاون اسٹاف
کو مبارکباد دینا میرا قلمی فرض ہے۔
وہی زندہ دل جو زندہ دلان حیدرآباد کے کارٹونوں
کا درشن کرتا رہا ہے۔

مختار یونس۔ مالیگاؤں

* شگوفہ کا تازہ ترین شمارہ نظر افروز ہوا۔ اسکے ہر
نئے شمارے کا انتظار میں اُسی طرح کرتا ہوں جس طرح پہلی بار
باپ بننے والا اپنی پہلی اولاد کا۔ (یوں بھی اسکے نسوانی نام "شگوفہ"
میں کسی محبوبہ جیسی ہی کشش ہے!
میں بہت کم عرصے سے شگوفہ کا مطالعہ کر رہا ہوں، اور
یقین جانئے مجھے اس بات کا آج تک شدت سے افسوس ہے کہ
"شگوفہ" سے میری آشنائی اور پہلے کیوں نہیں ہوئی۔
زیر نظر شمارے میں فکر تونسوی، نریندر لوتھر، وجاہت علی
سندیلوی اور پرویز یداللہ مہدی صاحبان کی نثری کاوشوں
نے بہت متاثر کیا۔
"جاڑے میں" بزمی صاحب نے ہنسا ہنسا کے گرم کر دیا
اور بے چارے "مولانا" شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ اسرار جامعی صاحب
کی "فخر جاہلاں" بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ کئی شعراء بھی اپنے
مخصوص خول سے باہر نظر آتے ہیں۔ آخر میں یہ کہ اداریہ بھی
قابل غور و ستائش ہے۔ اور اب اجازت، اس دعا کے ساتھ
کہ "خدا کرے آپ ہمیشہ پریشان رہیں"۔ (شگوفہ کو خوب سے
خوب تر بنانے میں)

اختر سعیدی۔ رانچی

* ماہنامہ "شگوفہ" کا سالنامہ زیر نظر ہے۔ اس شمارے
کی تمام تخلیقات کافی معیاری ہیں۔ رسالہ بھی پہلے کے شماروں
سے کافی جدا ہے۔ اس شمارے کی کامیابی کا واحد راز میری نظر
میں تمام تخلیق کاروں کی تصویروں سے اخذ کئے گئے کارٹون میں
مضمر ہے۔ آپ کی ذہانت کی داد جتنی بھی دی جائے کم ہے۔

دعا گو ہوں کہ آئندہ سال بھی اسی طرح معیاری سالنامہ
نکالنے کیلئے اللہ آپ کو توفیق عطا کرے۔

افتخار احمد کریک بیتیاوی

سالنامہ شگوفہ پر ترچھی نظر

ماہنامہ شگوفہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ہے۔
"زندہ دلانِ حیدرآباد" "مردہ دلانِ ہندوپاک" میں زندہ دلی
کی لہر دوڑانے والے ایک بہت بڑے اسپتال کا نام ہے۔
آج کل اس اسپتال کے چرچے ہندوپاک کی سرحدوں کو پار کر کے
دنیا کے گوشے گوشے میں ہونے لگے ہیں۔ اس اسپتال سے
یوں تو کئی مشہور و معروف ڈاکٹر وابستہ ہیں جنہیں مزاح نگار
کہا جاتا ہے۔ مگر جو سب سے زیادہ محنتی ڈاکٹر صاحب موجود ہیں
ان کا نام ہے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال۔ ڈاکٹر صاحب کا سب سے
اہم کمال یہ ہے کہ وہ خود کبھی کسی کو نہیں ہنساتے بلکہ وہ شگوفہ
کے ذریعہ ہر ماہ ہنسنے ہنسانے کا معقول انتظام کر دیتے ہیں۔
وہ اس طرح کا انتظام اس لئے نہیں کرتے کہ لوگ انہیں
واہ ... واہ کے نعروں میں گھیر لیں یا ان کی شخصیت و شہرت
میں چار چاند لگیں ... بلکہ ---- اور وہ ایک مدیر کے
فرائض سے اچھی طرح واقف ہیں۔
دیگر ادبی رسائل کی طرح شگوفہ کی مجلسِ ادارت اور
مجلس مشاورت میں ایسے نام شامل نہیں جن کا ادب سے کوئی
تعلق ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تو مجلس ادارت اور مجلس مشاورت
میں جو بھی نام شامل ہیں وہ سب کے سب چوٹی کے مزاح نگار
ہیں۔ ہمیں تو یہاں تک شک ہے کہ شگوفہ کی کتابت اور
طباعت کا کام کرنے والے افراد بھی مزاح نگار ہی ہوں گے
اگر نہیں ہیں تو بہت جلد ہو جائیں گے۔
سالنامہ میں جناب فکر تونسوی کا پاکستانی اخبار کے
مدیر کے نام لکھا ہوا ایک خط ہے۔ خط میں بے شمار انسانی کمزوریوں
پر طنز کے علاوہ فکر صاحب نے اپنی بیوی کی حرکات بید بھی دل

کھول کر طنز کیا ہے (ویسے بھی فکر تونسوی صاحب کے اکثر مضامین ان کی بیوی کے ذکر کے بغیر مشکل سے ہی مکمل ہوتے ہیں) کارٹون میں فکر تونسوی صاحب واقعی فکر مند لگ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے اب رو ہی پڑیں گے۔

برق آشیانوی صاحب اپنی غزل کے ذریعہ ہم سب کو نئے سال کی مبارکباد دے رہے ہیں۔ (اس قدر بدترین حالات کے باوجود ہم نئے سال کا استقبال کرتے ہیں)۔ یہ خود ایک بہت بڑا مزاح ہے۔ سال نو کی اس دلچسپ مبارکباد کے لئے برق آشیانوی صاحب کو مبارکباد۔ برق صاحب کا کارٹون دیکھ کر ہمیں راج نارائن کا چہرہ یاد آتا ہے۔ شاید اسطرح کا چہرہ ہوتا ہی ہے ہنسنے ہنسانے کیلئے۔

طالب خوندمیری صاحب کی طنزیہ نظم بھی خوب ہے۔ دورِ حاضر کے مرزا غالب آئی۔ اے۔ ایس آفیسر بن گئے تو اُردو زبان سے دور بھاگنے لگے۔ طالب صاحب کا کارٹون بھی خوب ہے۔ سر کیا ہے، گلوب ہے بس گھمائیے اور پوری دنیا دیکھئے۔

یوسف ناظم صاحب "وہ آرہی ہے" کے ذریعہ اکیسویں صدی کی ہیبت اور دہشت قارئینِ شگوفہ کے دل و دماغ میں بٹھا رہے ہیں۔ یوسف ناظم صاحب کے چہرے پر جھریاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پڑ گئی ہیں۔ شائد اکیسویں صدی میں ہونے والی ہولناک جنگیں اور پیش آنے والے عبرتناک واقعات کے خوف سے یہ حال ہوا ہے۔

نیاز سواتی صاحب کا مزاحیہ کلام بھی خوب ہے۔ نیاز صاحب کا کارٹون نہیں بنا۔ نیاز صاحب پاکستانی شاعر ہیں شاید ضیاء الحق صاحب نے انہیں ہندوستانی رسالے میں کارٹون بنوانے کی اجازت نہیں دی۔

احمد جمال پاشاہ صاحب نے "تصویر کا المیہ" میں تصویر کھنچوانے کی ہوس میں ڈوبے ہوئے جس علامہ کا خاکہ کھینچا ہے آج کل ہر گلی کوچے میں اسطرح کے علامہ نظر آئیں گے۔ (آجکل ہر آدمی کو روٹی کی بھوک سے زیادہ شہرت کی بھوک ستانے لگی ہے) احمد جمال پاشاہ صاحب کے کارٹون میں جو چشمہ نظر آتا ہے اس طرح کے چشمے اکثر نابینا افراد لگایا کرتے ہیں۔

اسمٰعیل ظریف صاحب کی نظم "کٹ تک" میں اسمٰعیل ظریف صاحب کی پوری ظرافت صاف نظر آرہی ہے۔ البتہ ان کا کارٹون دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اچانک کسی نے تیسری جنگ عظیم پھوٹ پڑنے کی اطلاع دی ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے سرور ڈنڈا کی یاد کو تازہ کرنے کیلئے کئی باسی واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ باسی واقعات قارئین کے مزاح کو تازہ کر رہے ہیں۔ کارٹون میں مجتبیٰ حسین صاحب ایک مزاح نگار کے بجائے جانوروں پر ریسرچ کرنے والے پروفیسر لگ رہے ہیں۔

وجاہت علی سندیلوی نے "میرے گھر کا پتا" کے عنوان سے اپنے گھر کا پتہ جس انداز میں تلایا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اس قدر گنجلک، بھیانک اور پُر مزاح پتہ شاید ہی دنیا میں کسی کے گھر کا ہوگا۔ جہاں تک ان کے کارٹون کا تعلق ہے وہ شکل سے الکشن ہارے ہوئے لیڈر معلوم ہو رہے ہیں۔

مفلس قادری صاحب نے اپنی نظم "میں عظیم شاعر ہوں" کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی عظیم شاعر ہیں چاہے مزاحیہ انداز ہو یا سنجیدہ میدان۔

سر ہٹ حیدرآبادی صاحب نے فیملی پلاننگ پر ایک خوبصورت نظم لکھی ہے۔ کارٹون دیکھ کر لگتا ہے کسی نے سر ہٹ صاحب کو پکڑ کر زبردستی فیملی پلاننگ کا آپریشن کر دیا ہے۔

مسیح انجم صاحب نے "اُلّی کی مدح" میں جس انداز کی مدح سرائی کی ہے اس سے یقیناً قارئین کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔ مسیح انجم صاحب کی تصویر بچوں کو ڈرانے کے کام آرہی ہے۔

پروفیسر یداللہ مہدی صاحب نے اپنے مضمون میں فیشن ایبل کپڑوں کی قسموں پر بڑی اچھی (مگر ترچھی) نظر

ڈالی ہے۔ پرویز صاحب کا کارٹون دیکھ کر ہمیں پتہ نہیں
کیوں کنپٹی مار، پلہ رنگا ـــــــــ جیسے اونچے لوگوں
کی یاد آتی ہے۔ عاتق شاہ صاحب کا "شیر آیا شیر" ٹھیک
ہے۔ کارٹون سے وہ ہندی ماسٹر لگتے ہیں۔

ڈاکٹر راہی قریشی صاحب اور اسرار جامعی صاحب
ایک ہی صفحہ پر اپنی ایک ایک عدد نظم لے کر نمودار ہوئے
ہیں۔ یہ دونوں حضرات کارٹون سے غائب دماغ پروفیسر معلوم
ہوتے ہیں (حالانکہ راہی صاحب کافی پھرتیلے انسان ہیں)
پاگل عادل آبادی کی غزلیں قارئین کو ہنساتے ہنساتے پاگل
بنا دیتی ہیں۔ پاگل صاحب کے کارٹون میں نسوانیت کی جھلک
موجود ہے۔ سرور جمال صاحبہ کا مضمون "مرحوم بجلی کی یاد
میں" اور فیاض احمد فیضی کا مضمون "کچھ آداب اسکوٹر چلانے
کے" گوارا ہیں۔ رشید عبدالسمیع جلیل صاحب کی نظم کے
ساتھ ساتھ ان کا کارٹون بھی خوبصورت ہے۔

عابد معز صاحب کا "واہ حیدرآباد" واقعی
واہ واہ کے قابل ہے۔ عابد معز صاحب کا کارٹون ہندی فلم
"اسپرش" کے مشہور اداکار انوپم کھیر کے چہرے سے کافی
ملتا جلتا ہے۔

محترمہ بانو سرتاج اور محترمہ حلیمہ فردوس، دونوں
خواتین کے مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

رؤف خوشتر صاحب کی "کمزوریاں" دور حاضر
کے اکثر انسانوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ اس طرح
کی کمزوریاں نہ ہوتیں تو ہمیں بھانت بھانت کے انسانوں
سے لطف اٹھانے کا موقع ہی کہاں ملتا۔ رؤف خوشتر صاحب
کے کارٹون کو دیکھ کر ان کی گردن پر بڑا رحم آرہا ہے
بیچاری گردن ٹوٹ گئی ہے یا اس پر کچھ ابھر آیا ہے۔

تمنا مظفر پوری، سلطان جمہوری، مختار یونس
اور اکمل افغانی صاحبان کے مضامین بھی بہتر ہیں۔ اس
کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ شگوفہ میں شائع
ہوئے ہیں۔

شمارے کے آخر میں "دسے کے خط" کے تحت
صرف وہی خطوط شائع ہوئے ہیں جن خطوط میں شگوفہ
کی تعریف موجود ہے (شاید تنقیدی خطوط دبا دیئے گئے
ہیں یا ہوسکتا ہے شگوفہ پر تنقید ہی نہیں ہوتی)۔ اس بار
اداریہ بڑا سخت ہے، نئے قلمکاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے
والی باتیں موجود ہیں۔ ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہیں نئے
قلمکار ان باتوں کو بھی مزاح نہ سمجھ بیٹھیں۔ کتابت و طباعت
کی تعریف کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں ہیں
ہی تعریف کے قابل۔ سرورق کی داد تو خود سرورق پر
موجود چہرے ہی دے رہے ہیں، ہمیں سرورق کی داد
دینے کی گنجائش ہی کہاں ہے؟؟

منظور وقار۔ گلبرگہ

-۲- -۲- -۲-

* ماننے کو جی چاہتا ہے کہ شگوفہ مزاحیہ ادب کا معیاری
جریدہ ہے۔ اور برابر خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں
ہے۔ نظم اور نثر دونوں حصے آپ کے حسن انتخاب کی غمازی
کر رہے ہیں۔ بالخصوص محترم غافل انصاری کا مضمون "نام کی
تبدیلی" اچھا لگا۔ موصوف نے روزمرہ کی چھوٹی سی حقیقت
کو ہنستے کھیلتے کس چابکدستی سے اپنے ظالم قلم کے سپرد کر دیا۔

محمد عمر خان۔ شاہجہاں پور

* شگوفہ فروری ۸۶ء موصول ہوا۔ جناب مانک ٹالا
کا آنکھوں کا مرثیہ بڑا پُر لطف لگا۔ اس میں جوانی کی حسرتوں
اور بڑھاپے کی کلفتوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ہماری
طرف سے مبارکباد پہنچائیے۔ مشکور ہونگا۔

غافل انصاری سنساپوری

-۲- -۲- -۲-

No. 15822/68 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd No. H. HD 6
Vol. 19 Copy 3 March 1986 Phone : 57716

اقبال
نمبر
اپریل ۸۶ء
28 APR 1986
شگوفہ
اقبال

NAWAB SHAH ALAM KHAN
Vice-Chairman
International Iqbal Seminar

Syed. KHALEELULLAM HUSSAINI
President
Iqbal Academy

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

اقبال نمبر

اکبر

۱۹۸۶

جلد ۱۹ — اپریل ۱۹۸۶ء — شمارہ ۴

مہمان مُدیر

مُضطر مجاز

مدیر

مُصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت

حمایت اللہ ÷ محمد منظور احمد ÷ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت

بھارت چند کھنّہ ÷ نریندر لوتھر ÷ یوسف ناظم ÷ مُجتبیٰ حسین

سرورق: شعیب کارٹونسٹ ○ کارٹون: شعیب ÷ طالب خوندمیری ○ جنرل مینجر: سمیع جلیل ○ مینجر اعزازی (دہلی): فیاض احمد فیضی

○ کتابت: محمد عبدالرؤف ÷ مسعود انور ○ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

قیمت فی پرچہ ۶ روپے ○ زرِ سالانہ: چالیس روپے ○ بیرونِ ہند سے: ایک سو پچیس روپے

○ خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (اے پی) انڈیا

فون آفس: 557716 ÷ رہائش: 521064

بیا بہ مجلسِ "اکبال*" و یک دو ساغر کش

---

* اکبر + اقبال

(فہرست)

لڑادے ممولے کو شہباز سے (پیروڈی)

"دوسروں پر ہنسنے سے پہلے خود پر ہنسے جانے کا حوصلہ پیدا کرو ۔"

—— آلڈوس ہکسلے

تری دُنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دُنیا میں تیری بادشاہی
تنخواہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

اقبال اکیڈمی حیدرآباد ۔ ایک تعارف

مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد ۲۹

اقبال کی زندگی ہی سے حیدرآباد اقبال شناسوں کا گہوارہ رہا ہے حیاتِ اقبال اور پیامِ اقبال پر جو کام حیدرآباد میں انجام پایا، اس کی تاریخی اور اسنادی اہمیت ہے۔ علاوہ ازیں اقبال اور اقبالیات کی پذیرائی میں حیدرآباد کو کئی اعتبارات سے اولیت حاصل ہے۔ کلامِ اقبال کا پہلا اردو مجموعہ یہیں سے شائع ہوا۔ اقبال کے مختلف مضامین کتابی شکل میں پہلی مرتبہ یہیں سے شائع ہوئے۔ خطوط کے پہلے مجموعہ کے علاوہ "فلسفۂ عجم" "مرقعِ اقبال" عربی اور فارسی میں اولین کتابوں کی اشاعت کا سہرا حیدرآباد کے اربابِ علم کے سر ہے۔ حیدرآباد ہی کی سرزمین سے وہ نامور اقبال شناس پیدا ہوئے جن کی بلند پایہ تصانیف مطالعہ اقبال میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ علمی سطح پر مطالعہ اقبال کے ساتھ ساتھ اقبال فہمی کی ایسی فضا تیار ہوئی کہ اس کے ذوق کا اثر عوام کی زندگی پر بھی پڑا۔ فکرِ اقبال اور پیامِ اقبال کو عام کرنے کے لیے نواب بہادر یار جنگ نے اپنی پُر زور خطابت کو استعمال کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد اقبال فہمی کی راہ میں کچھ رکاوٹیں حائل ہوگئیں اور اقبال سے وابستگی کو رجعت پسندی اور فرقہ پرستی قرار دیا جانے لگا، لیکن رفتہ رفتہ یہ دھندلکے چھٹنے لگے۔ ابتدائی نامساعد حالات میں بھی جناب سید خلیل اللہ حسینی، بانی و صدر اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے اس شمع کو روشن رکھا۔ انھوں نے نوجوانوں میں مطالعہ اقبال کا ذوق پیدا کیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۹ء تک اس انداز میں کام ہوتا رہا کہ اقبال دوستوں کی ایک ایسی تعداد پیدا ہوگئی جس نے محسوس کیا کہ مطالعہ اقبال کو منظم اور وسیع پیمانہ پر جاری رکھا جائے۔

اقبال اکیڈمی کا قیام اور مقاصد: اس پس منظر میں ۲۸ جون ۱۹۵۹ء کو اقبال اکیڈمی حیدرآباد کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ مارچ ۱۹۷۴ء کو دستور کی تدوین کے بعد پبلک سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ ۱۳۵۰ ف کے تحت اس ادارے کو رجسٹرڈ کروایا گیا (R.NO. 243/1974) اکیڈمی کے اولین صدر پروفیسر ڈاکٹر عالم خوندمیری مرحوم منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں جناب سید خلیل اللہ حسینی کا انتخاب عمل میں آیا، جن کی رہنمائی میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد مصروفِ عمل ہے۔ اقبال اکیڈمی کی کوشش ہے کہ جہاں نئی نسل کو اقبال سے آگاہ کیا جائے وہیں ایسے افراد تیار ہوں جو دورِ جدید کے تقاضوں کے چوکھٹے میں اقبال کو سمجھ سکیں اور اس کی دانشِ نورانی کے امین بن سکیں۔ خود اقبال کی شاعری کے بیشتر پہلو ایسے ہیں جن پر گہرے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ خصوصاً جدید ہندوستان کے چوکھٹے میں فکرِ اقبال بڑی معنویت اور اہمیت رکھتی ہے جو مطالعہ کے ایک نئے انداز کی طلب گار ہے۔ ان امور پر اقبال اکیڈمی اپنے محدود وسائل کے ساتھ توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔

سید خلیل اللہ حسینی	محمد ظہیر الدین احمد	کریم رضا	خواجہ ناصر الدین	مظہر لطیفی
صدر	نائب صدر	معتمد	شریک معتمد	خازن

جناب عابد علی خاں، صدر نشین استقبالیہ عالمی اقبال سمینار

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو

عالمی اقبال سمینار ——— زیرِ اہتمام، اقبال اکیڈمی حیدرآباد ۱۸ تا ۲۱ اپریل ۱۹۸۶ء

افتتاح نمائش اقبالیات ۔ ۶ بجے شام

افتتاحی اجلاس: (۷ بجے شام)
صدارت: جناب پی شیو شنکر، مرکزی وزیر کانگریس

افتتاحی تقریر: جناب ارجن سنگھ
نائب صدر کانگریس

کلیدی خطبہ: جناب مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ
تہنیتی خطاب: مہمانِ خصوصی جناب ین ٹی راما راؤ،
چیف منسٹر آندھرا پردیش۔

۱۹ اپریل۔ شنبہ: سمینار پہلی نشست (۹½ بجے صبح)
عصری ہندوستان میں اقبال کی معنویت۔
صدارت: آئی کے گجرال سابق سفیر سوویٹ یونین،
مہمانِ خصوصی: پروفیسر عبدالقادر کرہان (ترکی)
مقالہ نگار: ڈاکٹر صابری تبریزی (برطانیہ)، [illegible] (جموں)
پروفیسر تارا چرن رستوگی (گوہاٹی)، پروفیسر جگن ناتھ آزاد
جناب محمد ظہیرالدین احمد۔

دوسری نشست (۲½ بجے سہپہر)
اقبال کی شعری شخصیت اور اسلوبیاتی مطالعہ۔
صدارت:- پروفیسر اسلوب احمد انصاری (علیگڑھ)
مقالہ نگار: پروفیسر ایس یم جمال الدین (مصر)،
پروفیسر انتظار حسین (پاکستان)، پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی)
ڈاکٹر عبدالحق (دہلی)، جناب علی سردار جعفری (بمبئی)
مشاعرہ - ۹ بجے شب صدارت: جناب پی شیو شنکر

۲۰ اپریل۔ یکشنبہ: تیسری نشست صبح ۹½ بجے
اقبال کا تصورِ تہذیب اور مذہبی شعور
مہمانِ خصوصی: پروفیسر ممنون حسن خاں (بھوپال)،
مقالہ نگار: جناب یوسف اعظمی، ڈاکٹر انور معظم،
ڈاکٹر مغنی تبسم

تیسری نشست ۲½ بجے سہپہر
مقالہ نگار:- پروفیسر سید عبدالحی، (بنگلہ دیش)
ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، ڈاکٹر معین الدین عقیل (پاکستان)
ڈاکٹر عبدالقادر عمادی۔

چوتھی نشست (۴½ بجے شام)
بیسویں صدی کے ادب میں اقبال کا مقام
صدارت: ڈاکٹر جی۔ آر۔ صابری تبریزی۔
مہمانِ خصوصی: ڈاکٹر تارا چرن رستوگی۔
مقالہ نگار: پروفیسر عبدالقادر کرہانی، پروفیسر آل احمد سرور (کشمیر)
مسز ارینا میکسی منکوف (سوویت یونین)

شب اقبال: ۹ بجے شب
فن کار: صاحب سنگھ، وٹھل راؤ،
مہندر پال اور پورنیما پال

۲۱ اپریل۔ دوشنبہ، پانچویں نشست (۹½ بجے صبح)
اقبال کا فن۔ استعارہ اور علامت
صدارت: پروفیسر آل احمد سرور،
مہمانِ خصوصی: پروفیسر سید عبدالحئی۔
مقالہ نگار: پروفیسر شکیل الرحمٰن (کشمیر) پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی
(دہلی) پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر سید سراج الدین

چھٹی نشست ۲½ بجے سہپہر — مطالعاتِ اقبال
صدارت: پروفیسر جمیل جالبی (پاکستان)
مہمانِ خصوصی: پروفیسر ایس یم جمال الدین۔
مقالہ نگار: پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (پاکستان)
پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر عبدالستار دلوی (بمبئی)
جناب عبدالرؤف عروج (پاکستان) جناب ممنون حسن خان

استقبالیہ کمیٹی "عالمی اقبال سمینار"

صدر : جناب عابد علی خاں
نائب صدور : جناب شاہ عالم خاں، جناب اقبال علاء الدین، جناب رحیم قریشی، جناب شاہد حسین
معتمد : جناب کریم رضا
شریک معتمدین : جناب خورشید سلیم، جناب خواجہ ناصر الدین
خازن : جناب مظہر رطیفی
معاونین : جناب ظہیر الدین احمد، جناب یوسف اعظمی۔

علامہ سر شیخ محمد اقبال

سوانح و تصانیف

(بہ یک نظر)

ولادت : ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء سیالکوٹ
ابتدائی تعلیم : مکتب مولانا غلام حسن و سید میر حسن
مشن ہائی اسکول، سیالکوٹ
شعر گوئی و تلمذ : ۱۸۹۲ / داغ دہلوی سے
پہلی شادی : اپریل ۱۸۹۳ء
گریجویشن : ۱۸۹۷ء / گورنمنٹ کالج لاہور
ایم۔ اے (فلسفہ) ۱۸۹۹ء
ملازمت : ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء / عربک ریڈر
اورنٹیل کالج لاہور
ملازمت : انگریزی کے استاد / اسلامیہ کالج لاہور،
یکم جنوری ۱۹۰۱ء
اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن کو روانگی : یکم ستمبر ۱۹۰۵ء
کیمبرج سے بی۔ اے : ۱۹۰۷ء
پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری "ایران میں مابعد الطبعیات کا
ارتقاء" / میونخ یونیورسٹی / جرمنی
حیدرآباد دکن کا پہلا سفر : ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء
دوسری شادی : ۱۹۱۴ء / سردار بیگم، والدۂ جاوید
تیسری شادی : ۱۹۱۴ء مختار بیگم (لدھیانہ)
مثنوی اسرار خودی کی اشاعت : ۱۹۱۵ء
" رموز بے خودی کی اشاعت : ۱۹۱۸ء
اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کی اشاعت :
ڈاکٹر نکلسن / لندن سے

سر کا خطاب : یکم جنوری ۱۹۲۳ء
پیام مشرق کی اشاعت : ۱۹۲۳ء
بانگ درا کی اشاعت : ۱۹۲۴ء
زبور عجم کی اشاعت : جون ۱۹۲۷ء
حیدرآباد دکن میں آمد : ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء
اسلامی الہیات کی تشکیل جدید کی اشاعت : ۱۹۳۰ء
دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت : ۱۹۳۱ء
اٹلی میں مسولینی سے ملاقات، ۲۷ر نومبر ۱۹۳۱ء
جاوید نامہ کی اشاعت : ۱۹۳۲ء
پیرس میں برگساں سے ملاقات : ۱۹۳۳ء
مسجد قرطبہ کی زیارت : جنوری ۱۹۳۳ء
بال جبریل کی اشاعت : جنوری ۱۹۳۵ء
والدۂ جاوید کا انتقال : ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء
پہلا یوم اقبال : ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء
ارمغان حجاز کی اشاعت : نومبر ۱۹۳۸ء
وفات : ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء
صبح سوا پانچ بجے
مزار کی تعمیر : فروری ۱۹۵۰ء
(حیدرآباد کا انجینئر زین یار جنگ کے
نقشے کے مطابق)

شریکِ زمرۂ لایحزنوں ــ اقبال

مہمان اداریہ

مظفر مجاز

مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی!

میرؔ کے اس شعر میں شاید پوری قوم کا اجتماعی لاشعور بول رہا ہے جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ زندگی، اور حرکت سے بیزاری اور عمل سے فرار ہے ہماری شاعری کا ایک بڑا حصّہ اسی یاس و حرماں اور بے عملی سے عبارت ہے جسے اقبالؔ نے چمن کو افسردہ کرنے والی بادِ سحر سے تعبیر کیا ہے شاعروں کے اس ہجوم میں اقبالؔ کی وہ واحد پیغمبرانہ فنکار ہے جو اس سحر کا پردہ چاک کرتی ہے لیکن حُزن و حرماں سے یہ احتراز انھیں اس تفریط کی طرف نہیں لے جاتا جسے فلسفۂ نشاط انگیزی (EPICURIANISM) کہتے ہیں بلکہ انھوں نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف اپنی پہلی تصنیف "اسرارِ خودی (۱۹۱[illegible]ء)" ہی سے جہاد شروع کر دیا تھا جب انھوں نے حافظ پر بڑے کڑے انداز میں یہ کہہ کر تنقید کی ــ

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

بالِ جبریل میں وہ بڑی خشیتِ قلب سے دعا کرتے ہیں۔

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر

جہاں ایک طرف وہ سوزِ دروں اور گدازِ قلب کے شاعر ہیں وہیں لا تحزن (قرآن) اور الہم نصف الھرم (حدیث) یعنی "غمگین نہ ہو" اور "غم نصف بڑھاپا ہے" کی تفسیر و تلقین جگہ جگہ اپنے کلام میں کرتے چلے جاتے ہیں اس طرح نفیٔ غم سے خود بہ خود اثباتِ مسرت و حیات کا پہلو نکل آتا ہے اسی سوزِ دروں اور لا یحزنوں کے امتزاج نے ان کی شاعری میں ایک حیرت ناک توازن پیدا کردیا ہے ان کی شاعری کا یہ بڑا دل چسپ قولِ محال PARADOX ہے جسے سطحی بیں نظریں تضاد سمجھ بیٹھتی ہیں یا ایں ہمہ وہ صرف ایسے پیرانہ غم کی نشاندہی کرتے ہیں جو روح میں بالیدگی اور اہتزاز پیدا کرتا ہے وہ غم نہیں جو حقیر دنیوی خواہشات کی دین ہیں وہ صرف اس غمِ شیریں کی بات کرتے ہیں جن کی اصل افکارِ بلند ہیں "جاوید نامہ" میں نئی نسل سے یوں مخاطب ہوئے ہیں۔

ضعفِ ایمان است و دلگیری ست غم
نوجوانا! نیمۂ پیری ست غم

جس میں انہوں نے غم کو ضعفِ ایمان، دلگیری اور بڑھاپے کا لباس پنہایا ہے ان صفحات میں کوشش کی گئی ہے کہ فلسفۂ اقبال کے اسی پہلو کو اجاگر کیا جائے۔ اقبال نے داغ کے تعلق سے جو کہا تھا کہ ؎

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

وہ خود اقبال کے کلام پر کہیں زیادہ منطبق ہوتا ہے اقبالیات کے ہزارہا گوشوں پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن شاید اقبال کے فلسفۂ حیات کا یہ زندگی آمیز اور زندگی آموز پہلو کسی قدر نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ شاید پہلی مرتبہ اقبال کے سارے لطائف و ظرائف اور دلچسپ و دل پذیر احوال و کوائف ایک جگہ جمع کرنے کی ہم نے کوشش کی ہے۔ طنز اور مزاح میں اہلِ حیدرآباد کی خصوصی دلچسپی کے اسباب پر ماہرین نفسیات ہی بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے دو ایک دہوں سے ہم اہلِ حیدرآباد جس کرب و کراہ سے دوچار ہیں اسی کے نتیجے میں ہنسنا اور ہنسانا مجبوراً ہماری بنیادی ضروریات میں شامل ہو چکا ہے چنانچہ اس کی تلافی ہم نے پہلی عالمی مزاح کانفرنس کے ذریعہ کی اور اب اقبال کے عالمی سمینار کے موقع پر اقبالِ ظریف کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ہم ممتاز کارٹونسٹ شعیب اور ممتاز شاعر و مزاح نگار و نقاش و آرکیٹکٹ طالب خوندمیری کے ممنونِ کرم ہیں کہ کم سے کم وقت میں باوصف ہزار گونہ مصروفیات انہوں نے اپنے موقلم کو اس بزم کی تزئین کے لیے جنبش دی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

علامہ اقبال کے لیے ایک رشتہ؟

[حکیم الامت کے دست راست چوہدری محمد حسین (ایم اے) اقبال کے خاص دوست تھے۔ اقبال نے انھیں جاوید اور منیرہ کی جائیداد اور ذات کا ولی مقرر کیا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے ایک مضمون سے یہ دلچسپ اقتباس لیا گیا ہے۔ ادارہ]

چوہدری محمد حسین نے اکبر الٰہ آبادی کے ظریفانہ رنگ کو اپنے اشعار میں اپنایا تھا۔ ایک روز مغرب کی اذان ہو چکی تھی جماعت ہونے کو تھی مگر ریواز ہوسٹل (اسلامیہ کالج لاہور کا ہاسٹل جہاں چوہدری محمد حسین زمانۂ طالب علمی میں مقیم تھے) کے اس کمرہ میں جہاں نماز ادا کی جاتی تھی کوئی چراغ روشن نہ تھا۔ (بجلی ان دنوں ریواز ہوسٹل میں نہ تھی) آپ نے فرمایا:-

روشنی مسجد میں ہونی چاہیئے۔

نماز کے بعد احباب میں سے کسی نے شکوہ کیا مصرع ادھورا ہے وضاحت کیجئے۔ تو برجستہ بولے:

وقت مغرب قبل تکبیر و صلوٰۃ   روشنی مسجد میں ہونی چاہیئے

چودھری صاحب نے علامہ کے ساتھ ملاقاتوں کی ایک یادداشت بھی لکھنی شروع کی، اس یادداشت میں دینی، علمی اور ادبی باتوں کے علاوہ بعض باتیں خاصی دلچسپ ہیں مثلاً لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ پر ایک خاتون فریفتہ ہوگئیں۔ ان سے خط و کتابت کرنے لگیں اور انھیں لکھا کہ میرے ساتھ شادی کرلو۔ علامہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو اس نے اپنی طرف سے کسی شخص کو علامہ سے رشتہ طے کرنے کی غرض سے بھیج دیا۔ جب وہ شخص آیا تو چودھری صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ (یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب چودھری صاحب کے سارے احباب انھیں غیر شادی شدہ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ نواب صاحب مرحوم اور علامہ کو بھی معلوم نہ تھا کہ چودھری صاحب شادی شدہ ہیں اور صاحب اولاد ہیں) علامہ نے اس شخص کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اور آنے کی وجہ پوچھی۔ اس وقت چودھری صاحب دور کھڑے کتابوں کی الماری میں کسی کتاب کی تلاش کر رہے تھے وہ شخص کہنے لگا "میں ڈاکٹر اقبال سے ملنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے بتلائیے کہ آپ دونوں میں سے کون سے ہیں"۔ علامہ نے کہہ دیا کہ میں ڈاکٹر اقبال ہوں اس کے بعد اس شخص نے بتایا کہ وہ ان کے رشتہ کی غرض سے آیا ہے علامہ نے معذرت کی کہ وہ شادی شدہ ہیں اور انھیں مزید شادی کی فی الحال ضرورت نہیں جب وہ شخص جا چکا تو علامہ نے سارا قصہ چودھری صاحب کو کہہ سنایا۔ چودھری صاحب بولے "واہ آپ کو چاہیئے تھا کہ میری طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ ڈاکٹر اقبال میں ہوں۔ اگر آپ کو خود شادی نہ کرنی تھی تو کم از کم میرا بندوبست کر دیتے"۔

مرتبہ : مظفر مجاہد

مطائباتِ اقبال

پنجاب زندگی اور زندہ دلی کی سرزمین، شوخی اور شگفتگی کا منبع و مرجع، اسی سرزمین سے اقبال
بے سنجیدہ مفکر اور فلسفی کا پیدا ہونا اور خوش دلی اور خوش گفتاری سے دور رہنا ممکن ہی نہ تھا چنانچہ جب
اُن کی زندگی پر جس کو اُن کے مداحوں اور پرستاروں نے بڑے چاؤ اور لگاؤ کے ساتھ اپنی پلکوں
لے لمحہ لمحہ اٹھا اٹھا کر جمع کیا ہے نظر ڈالتے ہیں تو ان کی خوش طبعی خوش گفتاری، شگفتگی، زندہ دلی اور
اضر جوابی کی پھلجھڑیاں رنگ دلنواز بکھیرتی نظر آتی ہیں۔

ان صفحات میں ان سب کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ کی شگفتگی اور حاضر جوابی
اب سے پہلی مثال اس دور کی ہے جب وہ صرف دس گیارہ سال کے تھے اور آٹھویں جماعت
یں پڑھتے تھے۔ اتنی کم عمری میں ذہن کی ایسی رسائی کی عجیب و غریب مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے
لامہ کی خورد سالی کا یہ واقعہ علامہ ہی کی طرح مشہور ہے اس گفتگو کا آغاز ہم اسی سے کرتے ہیں۔

ایک دن اقبال جب اپنی جماعت میں ذرا دیر سے پہنچے تو استاد نے ٹوکا
بال دیر سے آتا ہے“:- کہ اقبال تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو؟ اقبال نے ترت سے جواب دیا جی! اقبال
یری سے آتا ہے: فرد ہو یا قوم اقبال مندی کا حصول اس قدر جلد اور آسان نہیں تعجب ہے کہ یہ نکتہ اقبال
اتنی کم عمری میں کھل چکا تھا اور اسی عمر سے

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

یا کہ اُسی وقت سے ”ملّتِ مرحوم کی مشکلیں آسان کرنا اور مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کرنے کا جذبہ
ند اُن کا مقدر ہو چکا تھا۔!

مزاحیہ مشاعرے کی صدارت :- ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک مزاحیہ مشاعرہ ہوا، ڈاکٹر محمد اقبال صدر تھے، اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ سنجیدہ اور فکر آمیز شاعری کی بجائے بے تکلفانہ انداز میں ظرافت آمیز شاعری سے سامعین کی تواضع کی جائے۔ راقم الحروف* کے دوست ریاض قریشی جو اب سیشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں اُس وقت ایف، اے کے طالب علم تھے، وہ ہری چند اختر کی ایک نظم پر پیروڈی کہہ کر لائے۔ انھوں نے اسٹیج پر اس انداز کے اشعار پڑھے۔

کہا تھوڑی سی مے پی لوں، کہا تھوڑی سی مے پی لو　　کہا قرآن کا ڈر ہے، کہا قرآن تو ہوگا
کہا میں جھوٹ بھی بولوں، کہا تم جھوٹ بھی بولو　　کہا ایمان کا ڈر ہے، کہا ایمان تو ہوگا

ان اشعار نے مشاعرہ گاہ کو دیوارِ قہقہہ بنا دیا۔ لوگ ہنسی کے مارے لوٹے جا رہے تھے، ڈاکٹر صاحب بھی کرسیٔ صدارت پر مسکرا رہے تھے، جب تقسیم انعام کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب نے ریاض قریشی کو "BAD POETRY" کا پہلا انعام مرحمت فرمایا ریاض قریشی آج بھی اپنی اس جسارت کو یاد کر کے حیران رہ جاتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی "حقیقت شناسی" اور "معاملہ فہمی" کا اعتراف کرتے ہیں -!

ہونہار بروا :- ڈاکٹر صاحب زمانہ طالب علمی میں ہی بڑے ہونہار تھے، دوسرے والدین اپنے بچوں کو ان کی مثال دیا کرتے، اور کم سنی کے باوجود شعر و شاعری کی محفلوں میں ان کے پُر لطف اشعار کو بڑی دلچسپی سے سُنا جاتا اُن دنوں سیالکوٹ کے دو خوش طبع میاں جھنڈے خاں اور ماسٹر جگن ناتھ میں خوب نوک جھونک رہتی تھی، میاں جھنڈے خاں نے خوب قد آور ہونے کی وجہ سے یہ لقب پایا تھا اور ماسٹر جگن ناتھ تھے پستہ قامت اور بلا کے عاشق مزاج، چنانچہ ایک محفل میں ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں کے متعلق ایک شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ "ماسٹر جگن ناتھ کا محبوب ماسٹر صاحب سے کہہ رہا ہے کہ تم جو مجھ سے بار بار مطالبہ کرتے ہو کہ "میرا دل واپس دو میرا دل واپس دو" تو میں نے تمہارا دل میاں جھنڈے خاں کے سر پر رکھ دیا ہے اگر تم وہاں سے اُٹھا سکتے ہو تو اُٹھا لو" یہ شعر کافی عرصے تک سیالکوٹ کی مجلسی زندگی کو گرماتا رہا۔*

ولایتی نسخہ :- ان دنوں لوگ انگلستان کے سفر کو عجب رشک اور استعجاب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوانوں کو تو دن رات انگلستان ہی کے خواب آیا کرتے۔ میری بھی بہت دنوں سے یہی کیفیت تھی۔ علامہ مرحوم کے فکر و کلام کی عظمت کا تو کس کا فکر کو اندازہ تھا۔ کوئی تجسس تھا تو یہی کہ ان سے انگلستان کے قصّے سنیں۔ پے در پے جانے کتنے سوال کر ڈالے وہ ہر ایک کا مسکرا کر جواب دیتے رہے۔ ضبط نہ ہو سکا تو میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ " انگلستان پہنچ کر لوگ اپنے نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں۔ آپ کو بھی چاہیئے تھا کہ اپنا نام A.K. BALL رکھ لیتے۔" ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل جواب دیا "بھئی ہم نے تو نہیں کیا۔ لیکن تم ولایت جاؤ گے تو اس نسخہ پر عمل کرنا اور اپنا نام W.A. HEED رکھ لینا۔" میں اس جواب سے کچھ لاجواب سا ہو گیا۔*

کتّے آئے ہیں :- میرے ایک قریبی رشتہ دار سیّد واحد علی کو کتّے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ میں اِن کے

---

* نقش: سید وحیدالدین مؤلف "روزگار فقیر" جلد اوّل ص ۱۸۹

تو موٹر میں بیٹھ کے ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ موٹر میں ان کے کُتّے بھی تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اور بگی۔ "ابا جان موٹر میں کتّے آئے ہیں"؟

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "نہیں بیٹا یہ تو آدمی ہیں۔"

کچنر کا تیل: "لارڈ کچنر جو ایک زمانے میں ہند کا کمانڈر انچیف بھی رہ چکا تھا۔ بڑے مشہور برطانوی جرنیلوں میں سے تھا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے زمانے میں وہ غرقاب ہوا۔ تو جس طرح آج ہٹلر متعلق کہا جا رہا ہے۔ کہ وہ زندہ ہے۔ اور دنیا کے سامنے آنے کے لیے مناسب موقع کا منتظر ہے۔ اسی ح کچنر کے متعلق بھی یہ افسانہ تراش لیا گیا کہ وہ ڈوبا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ علامہ اقبال ایک روز والد بزرگوار سے ں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک خوش فکر بزرگوار نے کہا۔ "سنا ہے کچنر زندہ ہو گیا ہے"؟

علامہ مرحوم نے جواب دیا۔ "ہاں ممکن ہے۔ کاڈلیور آئل[1] کی صورت میں آگیا ہو۔" (روزگار فقیر اول ص ۲)

ولایت کے سائے میں: شیخ حبیب اللہ جب ۱۹۳۸ء میں وہ مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے لاہور آئے۔ اور ڈاکٹر اقبال سے بطور خاص ملاقات کی؛ تو ڈاکٹر صاحب نے ان سے دریافت کیا۔

"کبھی بھئی ولایت ہو آئے"

ا کے جواب میں وہ فخریہ انداز میں بولے۔

"جی ہاں! میں تو آٹھ سال کی عمر ہی میں، انگلینڈ چلا گیا تھا۔"

، جواب کو سن کر ڈاکٹر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی، اُن سے نہ رہا گیا، مسکرا کر کہا۔

"پھر تو آپ کو یوں کہنا چاہیئے۔

"میموں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں"

علی بہادر حبیب اللہ ڈاکٹر صاحب کی اس بذلہ سنجی پر لاجواب ہو کر رہ گئے۔! (روزگار فقیر اول ص ۸۶)

لی مل جائے: جب ہندوستان میں صوبائی کونسلوں اور مرکزی اسمبلی کے عام انتخابات کا کام شروع ہوا تو اسی زمانے میں کسی شوخ طبع اور من چلے کو شوخی سوجھی تو اس نے ایک مصرع زدِ زبان کر دیا۔

ووٹ حاضر ہے اگر چائے کی پیالی مل جائے

یہ مصرع آناً فاناً لاہور میں زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے بھی کسی نے ازرہِ تفنن یہ مصرع ہرا دیا، ڈاکٹر صاحب نے اس مصرع کو سنتے ہی برجستہ فرمایا۔

چلبلی، شوخ، طرحدار، نرالی مل جائے

نوجواں مرتے ہیں جس پہ وہی "بالی" مل جائے

، وہ زمانہ تھا جب لاہور کے رؤسا خصوصاً نوجوانوں میں شہر کی مشہور مغنیہ اقبال بیگم عرف "بالی" کی بڑی عوم تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کس شوخی اور ندرت کے ساتھ اس نام (بالی) کو منظوم کیا اور حصولِ ووٹ کو حصولِ

---

[1] COD LIVER OIL

طوائف کے برابر سمجھا ان کے اس انداز بیان میں اس وقت کے معاشرہ پر کس قدر بھرپور طنز ہے۔

وطن کی بہنیں : اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان ڈاکٹر صاحب کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب انار کلی میں رہتے تھے۔ انار کلی میں کشمیری طوائفیں بھی رہتی تھیں۔ میونسپلٹی نے ان کے لیے دوسری جگہ تجویز کی۔ چنانچہ انھیں وہاں سے اٹھوا دیا گیا۔ اس زمانے میں مولوی انشاء اللہ خان کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن جو گئے تو ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود تھے۔ مولوی صاحب نے کہا ڈاکٹر صاحب جب سے طوائفیں انار کلی سے اٹھوا دی گئی ہیں۔ آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ مولوی صاحب آخر وہ بھی تو "وطن کی بہنیں" ہیں۔ *

"اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی"

اقبال ہر چند کہ فلسفیانہ ذہن کے مالک تھے اور ان کی ساری زندگی فکر و تدبر اور سنجیدہ مشاغل میں بسر ہوئی تھی، بایں ہمہ ان کے مزاج میں شوخی و ظرافت کے جو طبعی عناصر تھے وہ انھیں بذلہ سنجی اور ظرافت نگاری پر مجبور رکھتے تھے، چنانچہ جیسا کہ بانگ درا کے آخری حصے سے ظاہر ہے، بہت دنوں تک اکبر الہ آبادی کے رنگ میں ظریفانہ اشعار کہہ کر وہ اپنی طبع ظریفانہ کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے۔ پھر اسے قصداً ترک کر دیا تو روز مرہ کی زندگی اور تقریر و تحریر میں ان کی ظرافت و بذلہ سنجی کے جوہر نمایاں ہونے لگے۔

بیرسٹر مرزا جلال الدین نے ایک ... دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں لکھنؤ گئے۔ اجلاس کے ایام میں ایک شام خالی تھی۔ بیکاری سے طبیعت گھبرانے لگی تو فرمایا چلو دو گھڑی کہیں گانا ہی سن آئیں۔ میں اچانک کسی کام کی وجہ سے نہ جا سکا وہ چل کھڑے ہوئے۔ واپس لوٹے تو مسکرا رہے تھے۔ پوچھا تو فرمانے لگے ایک مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا جس طوائف کے یہاں گانا سننے ہم گئے تھے، وہیں اس کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک مولوی صاحب بھی، ہمارے جانے سے قبل دل بہلا رہے تھے لیکن وہاں سے چمپت ہوئے تو بوکھلاہٹ میں کانفرنس کا دعوت نامہ وہیں بھول آئے۔ ہم پہنچے تو طوائف نے ہم سے کہا کہ جس طرح ہو مولوی صاحب کو تلاش کر کے یہ دعوت نامہ ان تک پہنچا دیں۔ مگر ہم نے سوچا کہ یہ دعوت نامہ نواب ذوالفقار الملک بہادر صدر ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی معرفت کیوں نہ دیا جائے تاکہ ضابطے کی پابندی بھی ملحوظ رہے اور نواب صاحب کو بھی معلوم ہو جائے کہ دنیا بھلی ہے بھلی ہے۔ اس واقعہ کی خبر مولوی صاحب کو ہوئی تو ہانپتے کانپتے علامہ کے پاس آئے اور منت خوشامد کرنے لگے۔ اقبال تو اسی وقت کے انتظار میں تھے، ایسا رگیدا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ بڑی مشکل سے ان کی جان چھوٹی"۔ (ڈاکٹر فرمان فتح پوری "اقبال سب کے لیے" ص ۳۲، ۳۳)

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا ؟ نانا جان (اقبال) جب بھی کسی کی دعوت کرتے تو خاص اہتمام کیا جاتا۔ ان کی چھوٹی بیگم صاحبہ (والدۂ جاوید) کھانے پکانے کی بڑی ماہر تھیں۔ ان کے پکائے ہوئے کھانے اس قدر اعلیٰ اور لذیذ ہوتے کہ مہمان چٹخارے لے لے کر کھاتے۔ ایک دفعہ کسی صاحب کی دعوت تھی، نواب ذوالفقار علی خاں بھی مدعوین میں شامل تھے۔ سب لوگوں نے کھانوں کی بہت تعریف کی۔ ... کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ پکائے ہوئے کس کے ہیں۔ نہ کسی نے پوچھا اور نہ ہی علامہ صاحب نے بتایا۔ سب

* * ایضاً ص ۶۲

سمجھا۔ سو اتفاق چند روز بعد نواب ذوالفقار صاحب کے ہاں کسی تقریب کا اہتمام تھا۔ انھوں نے حضرت علامہ کو پیغام بھیجا کہ اس دن جس قدر مہمان آپ کے ہاں کھانا وغیرہ تیار کیا تھا براہ نوازش اس کا پتا بتائیں۔
آپ اس پیغام سے بڑے محظوظ ہوئے اور جواب بھجوایا:
"بھائی! میں تو غریب آدمی ہوں، کھانا وغیرہ میری بیگم خود ہی پکاتی ہیں"۔ پھر والدۂ جاوید کو سارا واقعہ سنایا اور مسکراتے ہوئے کہا:
"کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟" (خالد نظیر صوفی، "اقبال درون خانہ" ص ۶۹)

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی: والدہ محترمہ ایک واقعہ اس طرح بیان فرماتی ہیں کہ "ایک دفعہ چچی جان (والدۂ جاوید) اور مجھے انگریزی سیکھنے کا شوق چرایا اور CAT_RAT والے قاعدے منگوا کر مختار بھائی سے سبق لینا شروع کیا۔ ایک روز چچی جان اور میں آموختہ یاد کر رہی تھیں۔ چچی جان بلند آواز سے اور ہل ہل کر C . A . T اور R . A . T کا ورد کر رہی تھیں کہ چچا جان تشریف لے آئے۔ ہم دونوں پڑھنے میں اس قدر محو تھیں کہ معلوم ہی نہ ہوا اور وہ پاس آکر بولے: اوہوں! آج تو یہاں انگریزی مدرسہ لگا ہوا ہے؛ پھر مسکرا کر فرمایا:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ　　(خالد نظیر صوفی ص ۷۱)

ڈاکٹر اقبال: میرے* والد فقیر سید نجم الدین جن دنوں شرقپور میں متعین تھے، ایک شادی میں شریک ہونے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ علامہ اقبال بھی اس تقریب میں موجود تھے، والد صاحب کے ہمراہ اُن کا ان پڑھ چپراسی بھی تھا۔ چپراسی سے والد صاحب نے کہا "دیکھو! یہی وہ ڈاکٹر اقبال ہیں، جن کا میں اکثر ذکر کیا کرتا ہوں"۔ والد صاحب اپنی نشست سے اُٹھ کر کہیں گئے تو چپراسی بڑے ادب کے ساتھ علامہ سے کہنے لگا "میرے پیٹ میں اکثر درد رہتا ہے، آپ کوئی دوا بتا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"۔
ڈاکٹر صاحب اس کی اس سادگی پر مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ میں ایک خاص لطف اور خوش ذوقی بھی شامل تھی۔ ایک شخص جو علامہ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے چپراسی سے کہا کہ یہ جسم کے نہیں علم کے ڈاکٹر ہیں۔
لطیفے کے طور پر یہ واقعہ بھی بعض محفلوں میں سنا گیا ہے کہ کسی مقام پر "یوم اقبال" منایا جا رہا تھا۔ وہاں ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اقبال نے قوم کے لیے بہت بڑی قربانی دی، ولایت سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے آئے، مگر ایک دن بھی ڈاکٹری کا پیشہ نہیں کیا اور ساری عمر قوم کی خدمت میں گزار دی۔

بذلہ سنجی: جناب عبداللہ چغتائی سے علامہ کو بڑا لگاؤ تھا۔ ان کی ملاقات کے منتظر رہتے تھے، اُن کی باتیں سنتے اور محظوظ ہوتے۔ اگر ان سے ملاقات ہوئے زیادہ مدت ہو جاتی تو خود انھیں بلاتے۔ ایک بار چغتائی صاحب عرصے کے بعد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ نے اُنھیں دیکھتے ہی فرمایا—
"عبداللہ! اتنے دنوں سے کہاں تھے۔؟"

(* فقیر سید وحید الدین، "روزگار فقیر" جلد دوم ص ۱۵)

چغتائی صاحب نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! کیا عرض کروں، آج کل اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی اور فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں ملتا۔"
علامہ نے اس جواب پر بے اختیار قہقہہ لگایا اور فرمایا ـــــ
"عبداللہ! تم نے آج وہ بات کہی ہے جو آئن اسٹائن کے باپ کو بھی نہیں سوجھی ہوگی۔" (نقوش صفحہ ۹۶)

شیطان کے پیغمبر: جن دنوں علامہ مرحوم کیمبرج یونیورسٹی لندن میں زیر تعلیم تھے چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب نے دریافت کیا :۔
"مسٹر اقبال، یہ کیا بات ہے دنیا میں جتنے پیغمبر اور بانیان مذاہب آئے وہ ایشیا ہی میں مبعوث ہوئے یورپ میں ایک بھی پیغمبر پیدا نہیں ہوا؟"
علامہ نے جواب دیا "بھئی! اللہ میاں اور شیطان نے شروع ہی میں اپنا اپنا علاقہ مخصوص کر لیا تھا۔ اللہ نے ایشیاء کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اس لیے خدا کی طرف سے جتنے بھی پیغمبر آئے ایشیا میں مبعوث ہوئے۔" وہ صاحب فوراً بول اٹھے "تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟" علامہ نے بے ساختہ جواب دیا۔
"یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہل سیاست اسی کے رسول ہیں۔"
اس فقرے پر محفل کشت زعفران بن گئی اور قہقہے بکھرتے رہے۔ (مصباح الحق صدیقی: علامہ اقبال اپنوں کی نظر میں ص۱۴۲)

سانپوں کا ماجرا: یورپ اور انگلستان میں آج بھی ہزاروں ایسے لوگ موجود ہیں جو برصغیر پاک و ہند کو بڑے بڑے دریاؤں، پہاڑوں، بیابانوں، شیروں، ہاتھیوں، سانپوں، بچھوؤں، سپیروں اور جنگلی آدمیوں کی سرزمین سمجھتے ہیں۔ یہ خیال شروع شروع میں دراصل عیسائی مشنریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی افسانہ طرازیوں کی پیداوار تھا تاکہ ان لوگوں کو اپنی بہادری اور دلیری کا سکہ جمانے کا موقع مل سکے وہ عجیب و غریب افسانے بیان کر کے یورپ کی محفلوں کو گرماتے تھے۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے تو انہیں بھی اس قسم کی حکایات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مجلس میں ایک محترمہ پوچھنے لگیں :۔
"کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا ہے؟"
علامہ نہایت سنجیدگی سے بولے "نہیں بی بی جان ہر روز نہیں۔ ہر تیسرے دن۔" (مصباح الحق ص۱۴۳)

بدھ مذہب: علامہ مرحوم خود بیان کرتے ہیں کہ انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی پر سفر کرنا پڑتا تھا یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا :۔

"ALL CHANGE" (سب بدل جاؤ)

ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے ارد گرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا :۔
"یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیئے۔"
چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا "میں نے کہا ابھی جواب دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر چپ ہو رہا۔ چند منٹ کے بعد انھوں نے دوبارہ پوچھا۔ میں نے پھر کہا "ابھی جواب دیتا ہوں"۔
وہ کہنے لگے — "شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں"۔
میں نے کہا — "ہاں"۔
اس دوران میں اسٹیشن آگیا اور گارڈ پکارنے لگا "ALL CHANGE" (سب بدل جاؤ)
میں نے کہا — "بس یہی بدھ مذہب ہے"۔ (مصباح الحق صدیقی ص۱۴۴)

دلی کی زبان : ایک دفعہ میں اور خواجہ حسن نظامی علامہ اقبال کو ریلوے اسٹیشن لینے گئے۔ اس دفعہ انھیں میرے ہی ہاں قیام کرنا تھا۔ ریلوے قلیوں کی گفتگو سن کر علامہ اقبال جھوم اٹھے۔ اس زمانے میں دلی کے اسٹیشن پر دلی سے باہر کے قلی نہیں تھے۔ علامہ اقبال نے ہنس کر کہا۔ واحدی صاحب! آپ میری یہاں شادی کرا دیجئے۔ دلی کے قلیوں کی زبان یہ ہے تو دلی کی شریف زادیوں کی زبان کے تو کیا کہنے ہیں۔

ترکی بہ ترکی : نادر شاہ کابل جاتے وقت لاہور پہنچا تو اقبال اس سے ملنے کے لئے اسٹیشن پر گئے۔ وہ اقبال کی شکل وصورت کو دیکھ کر بہت حیران ہوا اور کہنے لگا "تو آپ اقبال ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ لمبی داڑھی والے بزرگ صورت ہوں گے"۔
اقبال نے کہا "آپ سے زیادہ مجھے حیرانی ہوئی، آپ جرنیل ہیں۔ میں سمجھتا تھا آپ دیوہیکل ہوں گے مگر آپ تو بہت دُبلے پتلے ہیں اور آپ میں بظاہر جرنیلی کی کوئی شان نہیں پائی جاتی"۔ (خالد عامدی، تلاش اقبال ص۴)

بھینس کا کٹڑا : ایک دفعہ چودھری شہاب الدین نے ازسرتاپا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ علامہ نے بے اختیار پنجابی میں کہا "او دیکھو کیاہ ورچ کٹ وڑ گیا"۔ (یعنی دیکھنا کپاس میں بھینس کا کٹڑا گھس گیا ہے)۔

دیو محل : انہی چودھری صاحب نے ایک عظیم الشان کوٹھی تعمیر کی جو اپنی وسعت اور بلندی میں لاجواب تھی علامہ سے اس بات کی فرمائش کی گئی کہ وہ اس کوٹھی کا نام تجویز کریں۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے "دیو محل" رکھ دو"۔ (یاد رہے کہ چودھری شہاب الدین مرحوم کا رنگ کچھ زیادہ ہی کالا تھا)۔

بالٹی میں پانی : ایک اور موقع پر چودھری صاحب کی اسی کوٹھی میں افطار پارٹی ہو رہی تھی چودھری صاحب نے پانی مانگا۔ علامہ نے آدمی کو پکار کر کہا: "دیکھنا بھائی چودھری صاحب کے لیے بالٹی میں پانی لانا"۔ (خالد عامدی، "تلاش اقبال ص۴")

طہارت کا پانی :- ایک روز طہارت کے اسلامی قواعد کا ذکر اتفاقاً چھڑ گیا اس سلسلہ میں غیر مسلم قوموں کی طہارت بھی معرض بحث میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے "جب میں طالب علمی کے سلسلہ میں انگلستان گیا تو میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا۔ چند روز اسی طرح گزرے۔ آخر میری میزبان یعنی مالکہ مکان LANDLADY سے رہا نہ گیا۔ یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ ہوں گی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتیں۔ مجھے پوچھنے لگیں یہ چیز تم غسل خانے میں کیوں لے جاتے ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں۔ بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں (یعنی ڈاکٹر صاحب) نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کئے۔ مثلاً غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت

* واحدی "علامہ اقبال چند یادیں" مشمولہ علامہ اقبال اپنوں کی نظر میں ص۱۴۹ ** یہ صاحب بے انتہا کالے تھے۔

پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طہر کا غسل۔ میں نے کہا "بڑی بی! کسی خاص غسل کی آپ کو حاجت نہ ہوگی۔ البتہ طہارت کا پانی ضرور استعمال کیا کیجئے۔" (خواجہ عبدالحمید، یاد اقبال ص۸)

لندن کی سیر: طالب علمی کے سلسلہ میں جب ڈاکٹر صاحب لندن میں تھے تو سر سید علیہ الرحمۃ کے ایک رفیق جن کا اسم مبارک مولوی ۔ ۔ ۔ صاحب تھا (غالباً آپ ایڈوکیٹ تھے) سیاحت کے سلسلے میں یورپ کی سیر کرتے ہوئے انگلستان پہنچے۔ چونکہ پروفیسر آرنلڈ سر سید مرحوم کے حلقہ اثر بلکہ خود علی گڑھ کالج میں رہ چکے تھے اس لیے مولوی صاحب ان کے پاس گئے انھوں نے اقبال کو حکم دیا کہ بھائی مولوی صاحب کو لندن کی تمام قابل دید جگہیں اور چیزیں دکھادو ۔ ۔ ۔ اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا اور شام کے قریب کسی قہوہ خانے میں جا بٹھایا۔ وہاں چائے اور قہوہ کے علاوہ چند ستم پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اور خدا جانے اقبال کے اشارے یا خود اپنی جولانئ طبع سے وہ مولوی صاحب قبلہ کے گرد جمع ہوگئیں۔ کوئی مولوی صاحب کو قہوہ پینے کی تلقین کرتی۔ کوئی ان کی نورانی داڑھی پر شیدائی تھی۔ ایک دو نے تو شاید مولوی صاحب کے رخساروں پر عقیدت کی ایک دو مہریں بھی جڑ دیں۔ اس مصیبت سے جب ان کو نجات ملی تو وہ غصے سے بھرے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کی خدمت میں پہنچے اور اقبال کی شکایت کی۔ دوسرے روز جب اقبال پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بہت خفا ہوئے فرمانے لگے "اقبال تم لندن میں آکر بے حد شریر ہوگئے ہو۔ تمھیں شرم نہ آئی۔ مولوی صاحب ایسے بزرگ کو قہوہ خانے میں لے گئے" اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ قبلہ آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ لندن کی تمام قابل دید جگہیں مولوی صاحب کو دکھلاؤں۔ اگر میں مولوی صاحب کو صرف لندن کا عجائب خانہ۔ چڑیا گھر، محلات۔ تاریخی عمارتیں وغیرہ ہی دکھا دیتا تو وہ لندن کے متعلق نہایت غلط فہمی میں مُبتلا رہتے اور ہندوستان جاتے ہوئے لندن کے متعلق نہایت غلط اور یک طرفہ خیالات لے کر جاتے لندن کی زندگی میں قہوہ خانوں کا رُخ خواہ بُرا ہو یا بھلا بہت اہم ہے۔ اسی لیے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو یہ تاریک پہلو بھی دکھا دوں۔ میں انھیں جان بوجھ کر وہاں لے گیا تھا۔ (خواجہ عبدالحمید، یاد اقبال ص۱۳)

ملّتِ بیضا: کشمیری خاندان کا کوئی شخص کسی دوسرے خاندان میں شادی کرنا چاہتا تھا ڈاکٹر صاحب اسے ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے۔ ایک طالب علم نے جو اس وقت ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ تو ہمیشہ ذات پات کی تمیز کو مٹانے کی نصیحت کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر جواب دیا "یہ بالکل درست ہے۔ لیکن اگر یہ صاحب وہاں شادی کریں گے تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہوگی۔ میری خواہش ہے کہ مسلمانوں کے بچے بھی خوبصورت اور سرخ و سفید ہوں تاکہ ہم لوگ صحیح معنوں میں ملّتِ بیضا بن جائیں۔" (خالد حامدی، تلاش اقبال ص۲۶۹)

ابلیس کی بیکاری: ایک اجلاس میں سامعین پر امید تھے کہ اقبال کوئی فصیح و بلیغ تقریر کریں گے لیکن انہوں نے صرف چند منٹ تقریر کی اور یہ لطیفہ سنا کر بیٹھ گئے:

"جنگِ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مُرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ فارغ بیٹھا ہوا سگار پی رہا ہے۔ جب انکی سے اس بیکاری کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا:

"آج کل میں فارغ ہوں۔ اس لیے کہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے۔" (ایضاً ص۲۷۰)

آفیشیل فیونرل (لازمی جنازہ) ۱۹۲۶ء میں میں نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا۔ ممبران اسٹاف نے کمال مہربانی سے چائے کی ضیافت دی۔ ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی۔ اس لیے انھیں بھی مدعو کیا گیا۔ (یعنی اساتذہ کے علاوہ صرف وہی مہمان تھے) وہ از راہ ذرہ نوازی شامل ہوئے۔ باتیں ہوتی رہیں دوران گفتگو میں منتظم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا۔ فرمانے لگے۔ پروفیسر میرا دوست ہے۔ اس کے لازمی جنازہ کے لیے مجھے ضرور وقت نکالنا تھا۔

(THE PROF_ESSOR IS MY FRIEND I HAD TO FINDTIME FOR HIS_ OFFICIAL FUNERAL) اس پر قہقہہ پڑا۔ فرمانے لگے کہ میں نے ان الوداعی پارٹیوں کے لیے "لازمی جنازے" کی اصطلاح وضع کی ہے۔

تبسم برلبِ اوست

وفات سے چند روز پیشتر بڑے نانا جان (شیخ عطا محمد صاحب) سیالکوٹ سے ان کی عیادت کو گئے اور انھیں دلاسا دیا تو انھوں نے فرمایا:

بھائی صاحب! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ انشاء اللہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کروں گا۔

اور پھر شعر پڑھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ❊ چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

(خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ*)

* خواجہ عبدالمجید [illegible]

"بڑی مشکل سے یہ شاہین آخر زیرِ دام آیا"
(اقبال)

ڈاکٹر گیان چند
پروفیسر یونیورسٹی آف حیدرآباد

رگڑا
یا
اکبری اقبال

بانگِ درا کے آخر میں اقبال کا جس قدر ظریفانہ کلام ملتا ہے کم از کم اسی قدر منسوخ کلام باقیات کے مجموعوں میں ہے۔ حیدرآباد میں ایک صاحب عبدالصمد خاں تھے جو ایک ڈیڑھ سال قبل اپنے اردو ریسرچ سنٹر سمیت کلکتے سدھار گئے۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں یہاں آئے تو مجھے کلامِ اقبال کا ایک مخطوطہ دیا۔ انھوں نے عماد الملک سید حسن بلگرامی کے ذخیرے سے کچھ مال خریدا تھا، اسی میں یہ رجسٹر نما بیاض تھی۔ صمد صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ مفصل بیاض خود عماد الملک کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا تین چوتھائی حصہ بانگ درا کی اشاعت سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔ مختلف رسالوں سے نظمیں اور غزلیں نقل کی ہیں۔

اقبال انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں خاص طور سے لکھی ہوئی طویل نظمیں سنایا کرتے تھے۔ اکثر اس نظم کو پہلے سے چھپوا کر لے آتے تھے۔ انتیسویں سالانہ جلسے میں کوئی سنجیدہ نظم نہ سنائی بلکہ ظریفانہ کلام سنایا۔ میرے حساب سے ۲۹ واں سالانہ جلسہ ۱۹۱۴ء میں ہوا ہوگا۔ اس جلسے کے تعلق سے مندرجہ بالا بیاض میں دو تحریریں ہیں۔ پہلی خواجہ حسن نظامی کی طرف سے ہے اور دوسری اس کے بعد منشی مرغوب رقم کی طرف سے۔ مفہوم کے لحاظ سے مرغوب رقم کی تحریر مقدم ہے اور خواجہ کی موخر۔ مرتب بیاض نے یہ تحریریں کہاں سے لیں، یہ واضح نہیں چوں کہ یہ غیر مطبوعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

اکبری اقبال: انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے انتیسویں سالانہ جلسے میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے ایچ۔ ڈی[1] بیرسٹر ایٹ لا، لاہور نے لسان العصر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج الہ آبادی کے رنگ میں

---

[1] مخطوطے میں 'پی' چھوٹا ہوا ہے۔ محض 'ایچ ڈی' لکھا ہے (گیان چند)

(بصدارت نواب ذوالفقار علی خاں صاحب) ذیل کی نظم پڑھی اور اس نظم کا عنوان مذاقاً "رگڑا" رکھا تھا۔ پریذیڈنٹ جلسہ جناب نواب ذوالفقار علی خاں صاحب نے اپنی پُر معنی ابتدائی تقریر میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو شیکسپیر اور سعدی سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ

"اگر یہی اقبال ولایت میں ہوتا تو اس کی قدر و منزلت شیکسپیر سے بھی بڑی ہوتی مگر افسوس کہ ہمارے اہلِ ملک اس کی قابلیتِ تامّہ سے کم آشنا ہیں۔ اس کی دنیوی زندگی کے بعد معلوم ہوگا کہ اقبال کیا چیز تھا۔"

ڈاکٹر صاحب اس دفعہ بوجہ مصروفیتِ کاروبار (انجمن کے لیے) کوئی نظم پیشتر تیار نہ کر سکے لیکن اراکینِ انجمن کے بار بار اصرار سے صرف دو دن پہلے جلدی میں اپنے چند خیالات کو منظوم کرنا شروع کیا۔ اس لیے آپ نے جلسہ میں نظم پڑھنے سے پہلے تمہید آ فرمایا کہ

"یہ چند کوڑے ہیں جو پبلک کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرتا ہوں۔ بعض تازے اور بعض تو ان میں ۲۴ گھنٹے کے تلے ہوئے ہیں مگر بعد ان پکوڑوں کے، ایک تر لقمہ بھی ہوگا۔"

اس اکبری رنگ کے کلام کو قوم کے اکثر افراد نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور قبولیت کے کانوں سے سُنا اور تحسین کی زبان کو حرکت دی۔ اس نظم کے اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اکبری رنگ کی جھلک دکھلانے پر بھی کس قدر قادر ہیں۔ آپ کے اس نئے رنگ پر حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے ذیل کی تمہید تسطیر فرمائی اور خواجہ صاحب نے ہی اس نظم کا عنوان "اکبری اقبال" موزوں فرمایا۔ (فضل الٰہی مرغوب رقم)

خواجہ حسن نظامی کی تمہید پر کوئی عنوان نہیں۔ یہ حسبِ ذیل ہے۔

لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں جن کا نام محمد اقبال ہے اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی ایچ۔ ڈی ہے۔ وہ شعر گاتے ہیں، شعر بجاتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا کر لیتے ہیں۔ [آدمی] میں نے ان کو اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کا عینک لگائے ہوئے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں، ورنہ میں اقبال کو پیکرِ خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر ان کی بشریت فقط ان کے بیوی بچوں یا ان کے لیے مبارک ہو جو ان کو گورا، چٹّا، مونچھوں والا، عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں۔

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی، سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی۔ یورپین اقبال کو بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو بھی مگر کبھی آدمی نہیں پایا۔ وہ ازل سے جوان ہیں اور حیاتِ ابدی کے نشان ہیں۔ ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں۔ برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں۔ مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مگسِ بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رُلاتا ہے۔ اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو ان دیکھی شمع کا

---

[1] نسخے میں یہ لفظ موجود نہیں۔ باہری حاشیے پر رہا ہوگا جو جلد بندی میں کٹ گیا۔ میں نے قیاساً بڑھا دیا ہے۔ (گیان چند)

دیوانہ ہے۔ مکھیاں اس کے اشعار کو میٹھا سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہوتے آتے ہیں۔ اقبالؔ ہمیشہ آسمان پر اڑتے ہیں۔ زمین پر کبھی آنا ہوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے۔ اس لیے وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں

ایک دن سبھری سبھا میں اقبالؔ زمین پر آئے اور چند جملے اُن کی زبان میں سُنائے جو زمانے کی زبان کہلاتے ہیں،[1] جن کا نام اکبرؔ ہے جو الٰہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آبادیاں بساتے ہیں۔ اکبرؔ کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے، اکبر اشارات ربانی کے حامل ہیں۔ اکبر کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے پھر قلم سے لکھواتا ہے۔ اکبر کی ہر بات ذہن آسمان کو ایک کر دیتی ہے۔ ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں۔ اکبر نے اس دھوپ میں بال سفید کیے ہیں جس نے اسلامی سلطنت کا باغ خشک کر دیا۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ "اکبری اقبال" ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک اکبری روش کو نباہا ہے، اور اکبر کی طرح کیوں کر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھیے ان حروف کے پردہ سے کیا نکلنے والا ہے۔ ہندو استھان کی بے قراری میں کلام کی باتیں درکار ہیں جن میں نتائج ہوں اور چلنے کے لیے راستہ ہو۔ عبرت کے لیے دل خوش کُن آگاہی و تنبیہ ہو۔ اکبر و اقبال کا ابتداء سے یہی شیوہ رہا ہے۔ مگر اقبال نے اور طریق سے کیا اور اکبر نے اور پیرایہ سے اس نظم میں جو منشی مرغوب رقم صاحب کے ذریعہ شائع ہوتی ہے اقبال نے اکبری نقشِ قدم پہ پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں، مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لکچر دے۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ لکھنا کہ "کشتیاں چکرائیں گی، سواریوں کو چکرائیں گے اور زمین پہ مینہ برسائیں گے" فضول ہے۔ جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کس موسم کی خبر دیا کرتا ہے۔ اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے۔ (حسن نظامی)

مندرجہ بالا دونوں تحریریں منشی مرغوب رقم نے نظم کے ساتھ چھپوائی ہوں گی لیکن میرے علم کی حد تک کسی مجموعے میں نہیں چھپیں۔ بیاض میں ان تحریروں کے بعد کوئی مزاحیہ نظم نہیں دی جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بیاض میں پیچھے کے اوراق میں کئی جگہ اقبال کا ظریفانہ کلام دیا ہے اور متعلقہ نظم اسی ضمن میں پہلے سے درج ہو چکی ہوگی۔ تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ محض ایک نظم کے بارے میں ہیں لیکن اقبال کی کوئی بھی مزاحیہ نظم یا مسلسل اشعار سے زیادہ کی نہیں۔ ظنِ غالب یہ ہے کہ تمہید کے بعد کئی مزاحیہ قطعات رہے ہوں گے۔ مرغوب رقم کے نوٹ میں ڈاکٹر اقبال کے منہ سے کئی پکوڑوں اور ایک ترلقمے کا ذکر کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ چند مزاحیہ قطعوں کے بعد ایک نسبتاً طویل نظم بھی پڑھی ہوگی۔ بیاض میں یوں تو مزاحیہ نظمیں کئی جگہ ہیں لیکن ص ۲۹ تا ۳۰ پر جو مزاحیہ نظمیں ہیں ان پر عنوان دیا ہے ـــــ اقبالؔ اکبرؔ کے رنگ میں۔

---

[1] اشارہ ہے اکبر الٰہ آبادی کے لقب لسان العصر کی طرف جس کے معنی ہیں عصری زبان۔　　　　(گیان چند)

یہ جملہ ۱۲ نظمیں ہیں جن میں سے آٹھ بانگِ درا میں شامل ہیں، چار باقیات کی دوسری کتابوں مثلاً کلیاتِ اقبال مرتبۂ عبدالرزاق میں ہیں۔ مجھے ان ۱۲ نظموں میں سے دس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ رسالہ زمانہ کانپور بابت جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئیں۔ انجمن حمایتِ اسلام کا جلسہ فروری کے آخر یا مارچ کے اوائل میں ہوتا تھا۔ ظنِ غالب یہ ہے کہ متعلقہ تحریک کے ساتھ یہی نظمیں رہی ہوں گی۔ نظموں کا پہلا مصرع اور بانگِ درا یا کلیاتِ اقبال مرتبۂ عبدالرزاق میں ان کا صفحہ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں	بانگِ درا ص	۳۲۵
۲۔ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی	"	۳۲۵
۳۔ شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں	"	۳۲۶
۴۔ یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوش مند	"	۳۲۶
۵۔ انساں ہوئے مہذب لیکن مزا تو جب ہے	کلیاتِ اقبال ص	۲۸
۶۔ ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر	" "	۲۸
۷۔ تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں	بانگِ درا ص	۳۲۷
۸۔ کہی اچھی نقیبِ انجمن نے	کلیاتِ اقبال ص	۲۹
۹۔ جناب شیخ کو بلواؤ خاص لندن کی	" " "	۲۹
۱۰۔ تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ	بانگِ درا ص	۳۲۷
۱۱۔ انتہا بھی ہے کوئی، آخر خریدیں کب تلک	" "	۳۲۷
۱۲۔ ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے	" "	۳۲۸

ان میں سے نمبر ۵، ۶ کو چھوڑ کر بقیہ سب زمانہ جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئیں۔ اقبال نے ان میں سے پہلے ۱۱ قطعات کو ٹکڑا کہا ہوگا اور آخری یعنی نمبر ۱۲ کو تر لقمہ، کیوں کہ یہ غزل ہے ہی ایسی پُر لطف۔

بانگِ درا اور باقیات کی کتابوں میں ظریفانہ نظموں پر کوئی عنوان نہیں موجود ہوتا ہے۔ میرے پیشِ نظر کتب خانۂ عماد الملک کی بیاض کے علاوہ ایک اور قدیم مخطوطہ ہے۔ ان دونوں میں متعدد مزاحیہ نظموں پر عنوان دیئے ہیں۔ معلوم نہیں وہ شاعر کے دیئے ہوئے ہیں یا رسالے کے ایڈیٹر نے اپنی طرف سے چپکا دیئے۔ بہر حال "رگڑا" عنوان کسی مجموعے میں نہیں ملتا جو بالیقین اقبال کا دیا ہوا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس کو بدل کر "اکبری اقبال" کر دیا۔ عماد الملک کی بیاض نیز کلیاتِ اقبال مرتبۂ عبدالرزاق میں ان نظموں کو "نکتے" کہا گیا ہے۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر ؛ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

پروفیسر عبدالقوی دسنوی
(بھوپال)

اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری

انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے خالص طنز و مزاح کا ایک اہم شاعر اپنے آپ کو اکبر الٰہ آبادی کے نام سے متعارف کرواتا ہے جس کی لَے نئی تھی جس کے موضوعات نئے تھے اور جو ہر اعتبار سے اپنے گزشتہ طنز و مزاح نگاروں میں منفرد آواز کے ساتھ ابھرا تھا۔ اس کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری ایک خاص مقصد کو احاطہ کرتی ہے اور ایک دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے اس کی شاعری کے پیچھے اس کی اپنی ذات نہیں تھی اور نہ اس نے اپنی ذات کو تسکین پہنچانے کے لیے اس طرح کی شاعری کی، بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی شکست اور ہندوستان کی پہلے سیاسی غلامی پھر تہذیبی، تعلیمی اور معاشی غلامی کے رد عمل سے مضطرب اور قومی جذبے سے مجبور ہو کر اس کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک اہم مقصد کے لیے طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی شاعری کی ابتداء کی یہ وہ وقت تھا جب اکبر الٰہ آبادی کی شہرت اور مقبولیت اپنی معراج کو پہنچ چکی تھی اور اقبال مخزن کے اوراق کے ذریعہ اور انجمن حمایتِ اسلام کے اسٹیج سے ابھی ابھی مملکتِ شہرت میں داخل ہوئے تھے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اقبال نہ صرف اکبر کے کلام سے متاثر تھے بلکہ ان کی شخصیت بھی ان کے لیے محبوب بن چکی تھی۔ اس کا اندازہ اقبال کے اس انگریزی خطبہ سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے ۱۹۱۰ء میں اسٹریچی ہال علی گڑھ میں دیا تھا۔

اقبال کو اکبر سے جو عقیدت اور محبت تھی اس کا اظہار تقریباً اسی زمانے میں انھوں نے اکبر کے نام ایک خط مورخہ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اس طرح کیا تھا:

"میں آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت اور عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔"[1]

ظاہر ہے اقبال کو اکبر سے جو کچھ تعلق تھا اور ان کے دل میں اکبر کے لیے جس قسم کی عقیدت کے جذبات

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ص ۳۴

موجزن پاتے تھے ان کی وجہ اکبر کا کلام اور ان کی اپنی شخصیت تھی۔ اکبر قوم کے ہمدرد تھے اس لیے چاہتے تھے کہ اس دور میں جب وہ احساس کمتری اور گمراہی کی بدترین خرابی میں مبتلا تھی رہنمائی کریں تاکہ وہ اس دلدل سے نکل کر زندہ قوموں کی طرح جینے کا حوصلہ کرے چنانچہ ان کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے انھوں نے ظریفانہ اسلوب اختیار کیا تھا اور ہنستے ہنساتے ان کی بے راہ رویوں سے انھیں بار بار آگاہ کرنے کی اس امید پر کوشش کی کہ ان میں ترقی یافتہ قوموں کی طرح جینے اور دوسروں کے لیے جینے کا سامان بہم پہنچاتے کا رفتہ رفتہ حوصلہ پیدا ہو۔ اکبر کے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے اقبال نے بھی طنز و مزاح کا راستہ اختیار کیا اور اردو شاعری میں ایسے کلام کا اضافہ کیا جسے اکبری اقبال کا نام دیا گیا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہوئی کہ بعض حضرات نے اقبال کی اس رنگ کی شاعری کے خلاف آواز بلند کی اور اکبر کی شاعری سے اقبال کی شاعری کا موازنہ شروع کیا جس کا مقصد اقبال کی شاعری کی قیمت کو کم کرنا تھا۔ مخالفت کی آواز اکبر الٰہ آبادی کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے اقبال کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک خط ان کے نام تحریر کیا جس کا جواب اقبال نے ۱۶ رجولائی ۱۹۱۴ء کو ان الفاظ میں دیا:

"حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مداح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھ پر اس کا مطلق اثر نہ ہوگا کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصول دولت و جاہ نہیں محض اظہار عقیدت ہے"[1]

اسی خط میں علامہ اقبال نہایت صاف لفظوں میں اکبر کا رنگ سخن اختیار کرنے کی وجہ اس طرح بتاتے ہیں:

عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کی داد دینا مقصود ہو اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بہ الفاظ دیگر اس کا تتبع کرے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان و بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے"

اکبر سے عقیدت اور محبت کی بنیادیں مضبوط تھیں اس لیے کہ اس میں سچائی تھی، چنانچہ بعض لوگوں کی رکیک حرکتوں کے باوجود انھوں نے اکبری اسلوب سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ اس کا سلسلہ کئی برسوں تک چلتا رہا یہاں تک ۱۹۱۸ء میں ایسے کلام کو جو اکبر کے رنگ میں اقبال نے کہے تھے سولہ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ "اکبری اقبال" کے نام سے خواجہ حسن نظامی نے مرتب کر کے شائع کیا۔

دراصل اکبر اور اقبال کی قربت کی وجہ ذہنی اور فکری ہم آہنگی تھی اکبر جن مقاصد کے حصول کے لیے شاعری کر رہے تھے تقریباً وہی مقاصد اقبال کے تھے۔ دونوں وطن دوست اور اپنی قوم اور تہذیب کے شیدائی اور فدائی تھے۔ دونوں کو فرنگیوں کی بالادستی اور ہندوستانیوں کی محکومی کا تلخ احساس تھا جس کی وجہ سے دونوں ایک۔۔۔

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص۔۔

اٹھاتے ہیں. اور ان پر کبھی ہلکی کبھی تیز اور کبھی مضطرب کر دینے والی ضربیں لگاتی ہیں اور اپنے طنز کو موثر بنانے کے لیے کبھی فارسی اشعار کبھی ہندی الفاظ اور کبھی قرآن کی آیتوں کے برجستہ اور برمحل استعمال کیے ہیں اور کبھی جمن اور نصیبن جیسے خیالی کردار کے ذریعہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں کبھی اکبر کا رنگ جھلکتا ہے. کبھی ان کا اپنا سنجیدہ طنز کا تیر چبھتا محسوس ہوتا ہے. لیکن یہاں سے وہاں تک بڑی دردمندی ملتی ہے۔ وطن سے، قوم سے، انسانوں سے محبت کا بے پناہ رشتہ ملتا ہے، ان میں رہبری کی تڑپ محسوس ہوتی ہے اس سلسلہ کی پہلی نظم "دنیا اور دین" ۵۴ اشعار پر مشتمل ہے. جو نہایت سادہ زبان میں لکھی گئی ہے جس میں مولوی صاحبان کی کج فہمیوں اور کج ادائیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

اس طویل نظم کے علاوہ اور بھی حذف شدہ ظریفانہ کلام ملتا ہے جن میں اقبال کے درد دل کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں، ناانصافیوں کے خلاف احتجاج قوم کی بے راہ رویوں کے خلاف شیخ، مولوی، نیکی، برائی ملک کی خراب حالت، اتحاد کا خواب اور دوسری ایسی باتیں ہیں جنھوں نے بڑی گرماگرمی پیدا کر رکھی تھی جن کے لیے یا جن کی وجہ سے اقبال مضطرب رہا کرتے تھے اور جن خرابیوں کو دور کرنے کے وہ ہمیشہ آرزومند رہے تھے. اقبال اس حد تک مغربی تہذیب کو ہندوستانیوں کے لیے بڑا متصور کرتے تھے اس کے خلاف ان کے دل میں کس قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اس کا بہت حد تک اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے. کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس تہذیب سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کے لیے تیار نہیں تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ مغرب کے حکمران نہایت چالاک ہیں وہ مختلف طریقوں سے ہندوستانیوں کے ذہن صیقل کرکے نہ صرف اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں بلکہ سرزمین ہند کو اپنی تہذیب، تعلیم، مزاج اور حکومت کی محافظت کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ — نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

لیکن اقبال نے صرف مغربی تعلیم، تہذیب، معاشرت اور سیاست ہی کو اپنی اس طرح کی شاعری کا نشانہ نہیں بنایا ہے بلکہ اہل ہند کی خرابیوں اور برائیوں کی طرف بھی تیکھے اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ صنعت و حرفت میں ہندوستان دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے اس قدر پیچھے کہ معمولی معمولی چیزوں کے لیے بھی اسے دوسروں کا محتاج رہنا پڑتا ہے. اقبال چونکہ علم معاشیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اس لیے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس کمزوری کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو یہ ملک تباہی کے دہانے پر بہت جلد پہنچ جائے گا. چنانچہ وہ ہمیں اس خرابی اور کمزوری کی طرف متوجہ کرتے ہیں. اور ہماری کم مائیگی کا احساس دلاتے ہیں:

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک — چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی — آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط — آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

ہندوستانیوں کی زندگی کے اس پہلو کو جس نے دوسروں کی محتاجی سکھائی ہے اقبال نے اس طرح بھی مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے کہ ہنسی بھی آتی ہے لیکن ہنسنے کو جی نہیں چاہتا، دوسرے ہی لمحہ بے چین کر دینے والی چبھن محسوس ہونے لگتی ہے:

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق! قدم باہر نہ دھر حد سے

نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصدِ خودکشی کیسا!
یہ مانا دردِ ناکامی گیا تیرا گزر حد سے

کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرایہ پر منگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

اقبال نے سرمایہ دار، بسوادار، مزدور، مزارع وغیرہ کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی ہے انسان کی برائیوں پر مختلف زاویوں سے بھرپور طنز کے تیر چلائے ہیں اور وہ مقاصد جو پرجوش تقریروں اور لمبی چوڑی تحریروں سے حاصل نہیں کیے جا سکتے محض ہنستے ہنساتے حاصل کر لیے گئے ہیں:

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانہ دستکاروں کا

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے
ماجرا اپنی ناتمامی کا

مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو
صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا

اور یہ بسوادار بے زحمت
پی گیا سب لہو اسامی کا

بانگِ درا کے ظریفانہ کلام کے اس حصے کے علاوہ تین مزید نظمیں "زہد اور رندی"، "نصیحت" اور "دو روزِ خلافت" اگرچہ اس رنگ کی نہیں ہیں لیکن سادہ طنز کی وجہ سے وہی کام کرتی ہیں جو اقبال کے ظریفانہ کلام نے کیا ہے۔

ان کے علاوہ اقبال کی غزلوں میں بھی طنزیہ اشعار ملتے ہیں جن میں اقبال خاص طور سے واعظوں کو اپنی ملامت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اقبال نے اُن کے خلاف تقریباً وہی الزامات لگائے ہیں جن کے لیے اردو شعرا انہیں بدنام کرتے رہے ہیں ان میں اقبال کی کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی البتہ ان کی نظم شکوہ اور جوابِ شکوہ میں تیکھے طنز کی اچھی مثالیں ملتی ہیں جن کی چبھن دیر تک محسوس کی جاتی ہے ان نظموں میں طنز کی آمیزش نے حصولِ مقصد میں اقبال کی بڑی مدد کی ہے ان کے بند کے بند آج بھی اسی تیکھے لہجے کے ساتھ مختلف موقعوں پر استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ شاعر کے مقاصد حاصل کیے جا سکیں۔

یہ بات بھی بہت حد تک صاف ہے کہ طنزیہ اور مزاحیہ کلام جو بانگِ درا میں شائع ہوا ہے اس کا بیشتر حصہ اکبری رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اقبال نے پوری کوشش کی تھی کہ اکبری رنگ کی تقلید کریں اور انھیں کے سے لب و لہجہ، مزاج اور آہنگ کو اختیار کریں لیکن وہ اپنے فلسفیانہ مزاج، سنجیدہ افکار اور عالمانہ لہجے کی وجہ سے اسے نباہنے میں بہت کامیاب نہیں ہوئے جس کا احساس خود انھیں بھی تھا چنانچہ ایک خط بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد (۲۰ مارچ ۱۹۱۲ء) میں انھوں نے تحریر کیا تھا:

"مولانا اکبر کا خط آیا تھا، خیریت سے ہیں ان کا دم بھی غنیمت ہے خدا انھیں خوش رکھے۔ میں نے ان کے رنگ میں چند اشعار لکھے تھے مگر وہ بات کہاں۔"

اس خط سے یہ خیال ابھر کر پیدا ہوتا چلا جاتا ہے کہ ۱۹۱۲ء سے پہلے ہی علامہ اقبال نے اکبری رنگ سے لکھنا

اقبال کی پوری شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آخری عہد کی شاعری اس لیے بہت اہم ہے کہ قاری یا سامع اسے پڑھنے یا سننے کے بعد محض واہ واہ نہیں کرتا بلکہ آہ آہ کی منزل سے بھی گزرتا ہے۔ لیکن یہ آہیں محض وقتی نہیں ہوتیں بلکہ دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اس لیے آج یہ کہنا بجا ہے کہ اقبال کی وہ ظریفانہ شاعری جو ۱۹۰۲ء میں "دین و دنیا" کی صورت میں شروع ہوتی ہے جس میں ہلکی سی تمسخر کی کیفیت بھی ہے۔ دس بارہ سال کے بعد اکبری رنگ اختیار کرتے ہوئے خالص طنز میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا سلسلہ ان کی زندگی کے تقریباً آخری دم تک رہتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا جائے کہ آخری زمانے کی شاعری کا خالص طنزیہ حصہ ان کے ابتدائی ظریفانہ کلام کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہے تو یہ بات اور زیادہ صحیح ہوگی۔

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

اقبالؔ اور اکبرؔ

سودا جب تک دماغ میں بند رہتا ہے قانونی گرفت سے باہر ہوتا ہے لیکن جب زبان پر آتا ہے تو
مائشیں بھی لنگر لنگوٹ کس کر تیار ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مقصد تو اپنا
بیان کیا جائے لیکن اسے ایسے رمز و کنایہ میں لپیٹ کر ادا کیا جائے کہ سمجھنے والے تو اچھی طرح سمجھ لیں لیکن
لونی دار و گیر کی وہاں تک رسائی نہ ہو سکے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں ادب، شاعری اور طنز و مزاح کے
بے کام آتے ہیں۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ کہیں تو یہ دایہام ہوتا ہے، کہیں رمز و کنایہ۔ کہیں طنز و مزاح ہوتا
ے اور کہیں ذو معنین اشارہ۔ قید و بند کی سختیوں کا ذکر کرنا ہو تو بلبل و صیاد کا رمزیہ پیش کیا جاتا ہے:

پروں کو کھول دے ظالم جو قید کرنا ہے
قفس کھلے کہیں اُڑ جاؤں گا کہاں صیاد

کچھ زبان سے نکالنا جرم قرار دیا جائے تو اُسے یوں ادا کیا جاتا ہے:

لبوں تک نام آیا تھا کہ بجلی کوند کر آئی
قفس میں یہ بھی مشکل ہے کہ ذکر آشیاں کر لیں

جو لوگ محض اس لیے غلامی کو پسند کرتے ہیں کہ آزمائشوں میں کون پڑے، ان کے بارے میں یوں کہا جاتا ہے:

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

جب اپنے بیگانے غیروں کا ساتھ دینے لگیں تو اس کا گلہ یوں کیا جاتا ہے:

کس رہے ہیں اپنی منقاروں سے حلقہ جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

اس قسم کے مضامین کے اظہار میں دو چیزیں بڑی کام آتی ہیں۔ ایک شعر۔ دوسرے مزاح۔ شعر کو یہ خصوصی
ایت حاصل ہے کہ جو کچھ چاہیے کہہ ڈالیے۔ سننے والے جھوم جھوم کر داد دیں گے اور اگر وہی نثر میں کہیے تو اچھی
ی مرمت ہو جائے گی۔ خسروؔ نے کہا:

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

ذرا کسی خطیب سے کہیے کہ یہی مضمون نثر کر کے ذرا خطبۂ جمعہ میں تو کہہ کر دیکھ لے۔ اگر اسے مسجد سے

باہر نہ نکال دیا جائے تو میرا نام نہیں۔

دوسری خصوصی رعایت شعر کو یہ حاصل ہے کہ اس کے وزن، ردیف وقافیہ کی لطافت، ردم اور موسیقیت کی وجہ سے شعر ہر خاص وعام کی نوک زبان پر محفوظ ہو جاتا ہے اور خود بخود پھیلتا جاتا ہے۔ بہت سے غیر شاعر لوگوں کو بھی سیکڑوں اشعار یاد ہوتے ہیں لیکن کسی نثر کا آدھا صفحہ بھی زبانی یاد نہیں رہتا۔

شعر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ کئی صفحوں کا مفہوم ایک شعر میں سمٹ کر آجاتا ہے۔

شعر کی ایک چوتھی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو مفہوم شعر میں ادا ہو جاتا ہے اسے اگر نثر میں ادا کیا جائے تو سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر کسی دوسری زبان میں اس کا نثری ترجمہ کیا جائے تو ذوقِ سلیم کے لیے اس بارِ گراں کو برداشت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

غرض ایسی کئی خصوصیات ہیں جو شعر کو نثر سے زیادہ مقبول بنا دیتی ہیں اور قومی انقلاب کے ابتدائی مرحلے میں یہ ایک ایسے خنک مرہم کا کام دیتا ہے جس میں بے قرار کر دینے والی سوزش نہیں ہوتی۔ اس مرحلے پر جب شعری لطافتوں میں مزاح و ظرافت کی بھی آمیزش ہو جائے تو لطف دوبالا، سونے پہ سہاگا اور مقبولیت میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بات تو جلد ہی سیل کر دلوں تک پہنچ جاتی ہے مگر شعری لطائف میں کھپ جانے کی وجہ سے قانونِ دار وگیر اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے اور حرکت میں آنے سے کتراتا ہے۔ جوں جوں اس انداز کلام کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے توں توں صاف گوئی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسے لوگ کھلی بغاوت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مناسب وقت آنے تک حاکم قوم سے ان کی ظاہری لفظی وابستگی قائم رہتی ہے اور یہی وابستگی انھیں قانونی گرفت سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ اسی حالت میں آہستہ آہستہ اپنا پیغام پہنچا کر دلوں کو گرماتے برماتے رہتے ہیں اور ان کی شاعری آنے والے تیسرے مرحلے یعنی مکمل انقلاب کے لیے کھاد اور پانی کا کام کرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے لطیفے اور چٹکلے اور طنزیہ تمثیلات وہ کام کر جاتے ہیں جو لمبی لمبی فلسفیانہ تقریریں نہیں کرتیں۔

حضرت اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال دونوں اسی دوسرے مرحلے کے آغاز کی پیداوار ہیں۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ ایک ہی حقیقت کو محسوس کیا۔ دونوں کے دل ایک ہی چوٹ کھا کر تڑپے۔ دونوں کے دماغ کا سودا ایک ہی تھا۔ دونوں کے قلبی احساسات نے شعر کا پیکر اختیار کیا اور دونوں نے حاکم قوم کے ایک ایک جوڑ، بند پر بھرپور وار کیے۔ دونوں کی اساسِ فکر اسلام اور صرف اسلام تھا۔ دونوں کے تصورات کا مرکزی نقطہ ذاتِ رسالت مآب تھی اور اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان دونوں نے محسوس کیا کہ اسلامی قدریں، اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی ثقافت مغلوب ہوتی جا رہی ہے اور انگریزی کلچر چھاتا جا رہا ہے۔ دونوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب کی چمک دمک مسلمان قوم کے دل و دماغ پر اس طرح مسلط ہوتی جا رہی ہے کہ ان کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں اور اسلامی اصول کو واشگاف لفظوں میں پیش کرتے ہوئے مسلمان شرماتے ہیں اور اگر پیش بھی کرتے ہیں تو معذرت خواہانہ انداز میں ——

یہ دیکھ کر دونوں کے دل بے چین ہو گئے۔ دونوں نے مقابلے کے لیے اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیے۔ کہیں انگریزی تہذیب پر حملے کیے کہیں انگریزی نظام تعلیم پر، کہیں غیر اسلامی تصورات کی دھجیاں بکھیریں، کہیں مغربی

بہ شیطاں آں چناں رمزی رساند — کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اکبر نے کہا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نیز کہا ؎

یہ اپنے جی میں تو ٹھان لی تھی کہ مرضیٔ یادِ خدا کریں گے — مگر سمٹا یہ خیال آیا، ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

قرآن پاک کے متعلق اقبال اور اکبر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ امت نے قرآن کو وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا۔ امت نے قرآن سے بے اعتنائی برتی اور دوسری کم درجے کی چیزوں پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے امت میں افتراق پیدا ہو کر اتحادِ امت پارہ پارہ ہوگیا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی

اسی مضمون کو اکبر نے دو شعروں میں یوں ادا کیا ہے ؎

سر رشتۂ توحید جو ہم سے چھوٹا — آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا
قرآن کی عظمت کو مٹانے کے لیے — ہر سمت سے راویوں کا لشکر ٹوٹا

اپنے زمانے کے پُرفتن دَور میں دونوں شاعروں نے یہ محسوس کیا کہ اسلام سے بیگانگی، خدا اور اس کے رسولؐ سے بے تعلقی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا گلہ اقبال نے یوں کیا ؎

عصرِ ما مارا ز ما بیگانہ کرد — از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ کرد

اکبر یہ رونا یوں روتے ہیں ؎

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یہ چند نمونے محض ایک ابتدائی قدم ہے ورنہ دونوں کی مماثلتِ افکار کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ یہاں ایک ضروری الجھن کو صاف کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اکبر نے سرسید جیسے دردمند مصلح پر کئی جگہ طنز کی ہے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ اکبر جدید تعلیم کے مخالف تھے اور سرسید کی تعلیمی تحریک اور حریتِ فکر میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہماری دانست میں یہ الزام درست نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اکبر اور اقبال دونوں جس بات کو اپنے خیال میں یا اپنے تصور کے مطابق اسلام کے لیے غیر مفید یا مضر سمجھتے تھے اس کے کہنے لینے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔ کبھی نام لے کر اور کہیں نام لیے بغیر اس معاملے میں انھوں نے کسی کو نہ بخشا، نہ صوفی کو، نہ حکام کو نہ لیڈر کو، نہ عوام کو نہ خواص کو۔ اگر اکبر نے یہ کہا ؎

نکلے سیّد جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتا رہا چندہ نہ ملا

تو اقبال نے بھی کہا ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

اگر اکبر کی طنز پر یہی اعتراض ہے تو سید جمال الدین افغانی پر بھی اعتراض ہونا چاہیے۔ انھوں نے بھی سرسید کی نیچریت پر کچھ کم ملامتیں نہیں کی ہیں۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی پر بھی یہی اعتراض ہونا چاہیے جو سرسید کی تعلیمی تحریک کے سرگرم حامی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی روح رواں اور علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹی ہونے کے باوجود سرسید کے بعض مذہبی رجحانات کے سخت مخالف تھے اور خود سرسید نے بھی ان کی ایک تقریر شائع کرتے ہوئے ان پر یوں طنز کی تھی کہ :

" اس تقریر میں انھوں نے نیچریوں کا بھی نام لیا ہے مگر جو تقریر انھوں نے کی ہے اس سے تو وہ خود بھی نیچری ہی معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم عصروں میں اس قسم کی طنزیہ چشمکیں تو بڑے بڑے ائمہ میں بھی ہوتی رہی ہیں اور رجال کی کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں۔ ان نکتہ چینیوں کے ناموں ہی میں مخلص نہیں ہوتا اپنی باتوں اور اعتراضوں میں بھی مخلص ہوسکتا ہے اور اس کی طنزیہ اداؤں میں جذبۂ خیر اور نیک نیتی ہوسکتی ہے۔ بات کہنے والا بھی مخلص ہوسکتا ہے۔ اس پر اعتراض کرنے والا بھی مخلص ہوسکتا ہے اور اس اعتراض کا جواب دینے والا بھی مخلص ہوسکتا ہے۔ ان سبھوں کا نصب العین میں اتفاق ہی ہوتا ہے۔ صرف بعض فروع یا طریق کار میں اختلاف ہوتا ہے جو بعض اوقات شدت بھی اختیار کرلیتا ہے۔ بالاتر از تنقید اور معصوم نہ سرسید تھے نہ ان پر اعتراض کرنے والے۔

دراصل بات یہ ہے کہ کوئی شئے ہمہ تن سو فی صد خیر نہیں ہوتی۔ سرسید کی تحریک ایک بڑی ضروری تحریک تھی اور اس دور کے تقاضوں کے مطابق تھی لیکن غیر شعوری طور پر انگریزی الحاد کے خس و خاشاک بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ اکبر کی نظر جس بات پر گئی اسے انھوں نے یوں ادا کیا ؎

رہی اُن کی نظر کالج کے بس علمی فوائد پر گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

ان تمام باتوں کے علاوہ اکبر کے وہ شعر جو انھوں نے سرسید کی وفات پر لکھے ہیں سارے شبہات کو دور کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی ہم تو یہ کہتے ہیں اے اکبر خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

؎ یہ تقریر ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں ہوئی تھی اور سرسید نے "تہذیب الاخلاق" مجریہ محرم ۱۳۱۲ھ میں ایک فٹ نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا

اقبال

یا "چراغِ راہ کی" حیثیت رکھتا ہے "منزل" کی نہیں ہماری اس گفتگو کا مقصد اس "چراغِ راہ" سے بحث کرنا نہیں بلکہ اس "منزل" سے آگاہی حاصل کرنا ہے جو طنز کے تیکھے نشتروں کی شکل میں جا بجا ان کے زندگی آمیز اور زندگی آموز کلام میں ملتے ہیں۔ بانگِ درا سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر ہم "بالِ جبریل" پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ نقوش گہرے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں "جو ضربِ کلیم" تک پہنچتے پہنچتے بڑے تیکھے اور راست دل کو چھو لینے والی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کی تلخی "کام و دہن کی آزمائش" کرتی ہوئی رگ و پے میں اتر کر ہی دم لیتی ہے۔ بالِ جبریل میں جہاں ان کا ہدفِ تنقید مغرب کا عفریتی نظام ہے تو دوسری طرف جامد اور سومیاتی مذہب کے نمائندے صوفی اور ملا ہیں اس کی سب سے خوبصورت مثال ان کی نظم "ملا اور بہشت" ہے جس میں اللہ سے یوں عرض پرداز ہوئے ہیں کہ اس اللہ کے بندے کا مقام بہشت کسی طرح مناسب نہیں کہ بہشت میں نہ مسجد ہے نہ کلیسا نہ کنشت سو اس جھگڑالو شخص کی یہاں گزر کیسے ممکن نہیں۔ اسی تیکھے طنز کے نشتر انھوں نے بے عمل مذہب پرستوں پر اپنی نظم "جبریل و ابلیس" (بالِ جبریل) میں طنز کے زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ ابلیس کے منہ میں رکھ کر چلا دیئے ہیں:

"میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو

عمل کا پیام اور ابلیس کے ذریعہ پہنچانا یہ صرف اقبال جیسے عظیم فن کار ہی سے ممکن تھا۔ اس انوکھی اور اچھوتی کردار نگاری سے "جاوید نامہ" میں بڑے پُر اثر انداز میں فائدہ اٹھایا گیا ہے جہاں فلک مشتری پر خواجۂ اہلِ فراق " (ابلیس) نمودار ہوتا ہے اور یہ کہہ کر اپنی سخت عمل کوشی کا اظہار کرتا ہے کہ "میں اپنے کام پر اس شدت سے لگا ہوا ہوں کہ تعطیل نام کا کوئی دن میری تقویم میں نہیں ؎

آں چناں بر کارِ خود پیچیدہ ام فرصتِ آدینہ را کم دیدہ ام

اسی ابلیس کے کردار کو اپنی ایک اور نظم "ابلیس کی عرض داشت" (بالِ جبریل) میں استعمال کرتے ہوئے خداوند جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ اب اس کی ضرورت تہہِ افلاک باقی نہیں رہی کہ اربابِ سیاست وہ سارے امور انجام دے رہے ہیں جو اس کے فرائض میں شامل تھے اقبال کے کلام میں ابلیس کا کردار ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ فی الوقت یہی بتلانا مقصود ہے کہ اس کردار سے کس طرح طنز و تشنیع کے ذریعہ اپنے پیام کو پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کردار نگاری، ڈرامہ نگاری کا ایک اہم جز ہے اور ڈرامہ شاعری کا ایک ASPECT عصرِ حاضر کے جدید نقاد ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازیں دریافت کی ہیں، خود کلامی، خطابت اور ڈرامہ، شیکسپیر اور دوسرے عظیم فنکاروں کی طرح یہ تینوں آوازیں اقبال کے کلام میں بہت نمایاں طور پر سنائی دیتی ہیں بالِ جبریل اور زبورِ عجم کی غزلیں ضربِ کلیم اور بانگِ درا کے آخری حصے کی نظمیں خود کلامی، خطابت اور ڈرامہ کی بہترین مثالیں ہیں جب کہ جاوید نامہ ایک مکمل اور مبسوط ڈرامہ ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز) میں یہ ڈرامائی عناصر بڑی خوبصورتی سے ظاہر ہوئے ہیں اور یہاں بھی انہوں نے اپنے اسلحہ خانے سے طنز کے تیر نشتروں سے سجا یا ہے اور فکا ... کا عمل یہاں بھی ہمیں ملتا ہے لیکن دوسرے پیرائے میں جب ابلیس اپنے مشیروں کی باتیں سن کر انہیں تلقین کرتا ہے کہ ابلیسی نظام کو ڈر اس ملت بیضا سے ہے جس کا کار آزما اور کار آفریں مکمل نظامِ حیات اس

کی تباہی کا باعث نہ بنے۔ اشتراکی نظام کے کھوکھلے پن کو وہ یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ؎

کیا ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ مو

اور آخر میں یہ تلقین کہ بندۂ مومن کے "شر" سے محفوظ رہنا ہے تو : ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

بے عملی کے وہ شدید مخالف ہیں اور دہرا دہرا کر مختلف طریقوں سے پیام عمل دیتے جاتے ہیں۔

اقبال کے اردو کلام میں "ضرب کلیم" وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے عہدِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور اپنے سارے اسلحہ جات اس جنگ میں انھوں نے کام میں لائے ہیں جن میں سب سے زیادہ موثر اور کارگر اسلحہ طنز و تشنیع کے نشتر اور چرکے ہیں۔ اقبال کا یہ فن سب سے زیادہ "ضرب کلیم" کے اس باب میں کھل کھیلتا ہے جو "سیاسیات مشرق و مغرب" کے نام سے شامل ہے جہاں وہ خوشامد خوروں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد کر اور اُلو کو رات کے شہباز کا خطاب دے (نظم خوشامد) کبھی اسی ابلیس کے استعارے کو کام میں لاتے ہوئے اللہ میاں سے بھی ٹھٹھول کرنے لگتے ہیں کہ سیاستِ افرنگ تو اب چشم بددور تیری حریف بن چکی ہے تو نے تو آگ سے ایک ہی ابلیس بنایا جب کہ اس نے خاک سے دو صد ہزار ابلیس بنائے (نظم: سیاستِ افرنگ) پھر اہلِ سجادہ اور اہلِ تقویٰ کا پول یہ کہہ کر کھولتے ہیں (نظم: خواجگی) کہ صدیوں کے استعمار کی بدولت عوام ہوئے غلامی میں نسلاً بعد نسل اس قدر پختہ ہو چکے ہیں کہ اب نہ پیرانِ کرام کی کرامتوں کی ضرورت ہے نہ میر و وزیر کی حکمتِ عملی درکار ہے۔ اب تو اہلِ سجادہ اور اہلِ سیاست کے مزے ہی مزے ہیں ــــ اسی باب میں ان کی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" طنز کی بہترین مثال ہے جس میں ابلیس اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے کہ برہمنوں کو سیاست کے داؤ پیچ سکھا دو اور عربوں کو فرنگی تخیلات میں الجھائے رکھو اور افغانیوں کی غیرتِ دینی کا یہی علاج ہے کہ ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال کر انھیں دین سے بیزاری کا سبق دیئے جاؤ۔ چنانچہ افغانستان میں ان دنوں شاید اس ابلیسی سبق پر عمل بھی کیا جا رہا ہے!

تقریباً ایسا ہی چبھتا ہوا طنز ان کی نظم "مسولینی" میں بھی ملتا ہے جہاں وہ معصومانِ یورپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ؎

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اور یوں یورپی اقوام کی مکاریوں اور عیاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ پھر اپنی نظم "دامِ تہذیب" میں انھیں اقوامِ یورپ کو یہ کہہ کر آڑے ہاتھوں لیتے ہیں کہ ان کی شرافت پر بھلا کس کو شک ہو سکتا ہے پر ملتِ مظلوم کی خریداری ان کا شیوۂ قدیم ہے۔ ان کے پیرانِ کلیسا کی یہ بھی ایک کرامت ہے کہ وہ جولاہوں کے افکار کو بجلی کے چراغوں سے روشن کرتے ہیں! اپنی ایک اور نظم "نصیحت" میں ایک فرنگی لارڈ سے اس کے بیٹے کو یہ نصیحت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ محکوم کو تابع میں رکھنے کا ایک آسان نسخہ یہ ہے کہ

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

اس طرح سونے کا ہمالہ بھی ہو تو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا! ایک اور نظم "ایک بحری قزاق اور سکندر"

بتا
تیری
رضا کیا ہے

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

(ظریفانہ کلام)

مشرق میں اصولِ دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

٭

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغرب ہے مدِّ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اُٹھنے کی مُنتظر ہے نگاہ

٭

شیخ صاحب تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مُفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرمادیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

٭

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند!
غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض!
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

٭

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لیکے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پہ نہ رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

٭

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگ دست — تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا — تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

٭

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ؟ — دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے "بِل پیش کیجیے"

٭

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے
ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلّوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں؟
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

٭

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا
کیوں اے جنابِ شیخ سنا آپ نے بھی کچھ — کہتے تھے کعبہ والوں سے کل اہلِ دیر کیا
ہم پوچھتے ہیں مسلمِ عاشق مزاج سے — الفت بتوں سے ہے تو برہمن سے بیر کیا!
ہاتھوں سے اپنے دامنِ دنیا نکل گیا — رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی
قانونِ وقف کیلئے لڑتے تھے شیخ جی — پوچھو تو وقف کے لیے ہے جائداد بھی

٭

وہ … اپنی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
… ہے تجربہ تو تقسیمِ خودکشی کیا؟
کہا میں نے کہ … جہاں کچھ …

مقتضا ہے تو اے عاشق اقدام ہو تو حسرت سے
یہ مانا دو دنیا کا ہی گیا تیر اگر قد سے
کرائے پر نگاہوں کا … افغان سرحد سے

٭

نادان تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر
مغرب میں ہے جہانِ بیاباں شتر کا نام

حاصل ہوا یہ، نہ بچے مار پیٹ سے
ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

٭

ہندوستان میں جزوِ حکومت ہیں کونسلیں
ہم تو فقیر تھے ہی، ہمارا تو کام تھا
ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
میرزا غالب خدا بخشے، بجا فرما گئے

آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
سیکھیں سلیقہ اب امرا بھی "سوال" کا
ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا
"ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا"

٭

دلیلِ مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہوگی
نہ حضرتِ لفٹیننٹ میں کچھ کہیں ہم بھی
نہ دو … لڑکوں کے کام آئے گی
زمیں پر تو نہیں ہندیوں کو جا ملتی

نہ ہو حضور سے الفت تو یہ ستم نہ سہیں
مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
وہ مہرباں ہیں اب پھر رہیں رہیں نہ رہیں
مگر جہاں میں ہیں خالی سمندروں کی تہیں

مثالِ کشتیِ بے حس مطیعِ فرماں ہیں
کہو تو بستۂ ساحل رہیں، کہو تو بہیں!

٭

فرما رہے تھے شیخ طریقِ عمل پہ وعظ
مشرک ہیں وہ جو رکھتے ہیں مشرک سے لین دین
ناپاک چیز ہوتی ہے کافر کے ہاتھ کی
اک بادہ کش بھی وعظ کی محفل میں تھا شریک
کہنے لگا ستم ہے کہ ایسے قیود کی

کفارِ ہند کے ہیں تجارت میں سخت کوش
لیکن ہماری قوم ہے محرومِ عقل و ہوش
سن لے اگر ہے گوش مسلماں کا حق نیوش!
جس کے لیے نصیحتِ واعظ تھی بارِ گوش!
پابند ہو تجارتِ سامانِ خورد و نوش!

میں نے کہا کہ "آپ کو مشکل نہیں کوئی"
"ہندوستاں میں ہیں کلمہ گو بھی مے فروش"

٭

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت
چٹّے بٹّے ایک ہی تھیلی کے ہیں ساہوکاری، بسوہ داری، سلطنت
محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز ٹل نہیں سکتا وقد کنتم بہ تستعجلون
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ "ینسلون"

٭

شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رندِ لم یزل رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ عبرت کا مقام رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی تتق
حضرتِ کرزن کو اب فکرِ مداوا ہے ضرور حکم برداری کے معدے میں ہے دردِ لایطاق
وفد ہندوستان سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب
کیا یہ چورن ہے پئے ہضمِ فلسطین و عراق

٭

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

٭

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

٭

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار
سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا

تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں

جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

حکیم محمد یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال (جنھوں نے رسائل و اخبارات میں پہلا "اقبال نمبر" شائع کیا تھا) نے اقبال سے کوئی نظم مانگی۔ اقبال نے کہا نئی چیز کوئی نہیں۔ حکیم صاحب نے یاد دلایا کہ جب پچھلی مرتبہ حاضر ہوا تھا تو آپ نے حاضرین کو ایک نیا شعر سنایا تھا۔

یہ پنڈت یہ بنیئے یہ مُلا یہ لالے — یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے

اس کے بعد کچھ شعر اور ہوئے ہوں گے؟ اقبال نے کہا" اور کوئی شعر نہیں ہوا وہی ایک ہے" پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا اچھا لکھو۔

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے	وطن کیا ہے اک نوع سرمایہ کاری
یہ تکیئے یہ مندر یہ گرجے شوالے	بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
یہ پنڈت یہ بنیئے یہ مُلا یہ لالے	یہ دیکھو چلی آرہی ہے سواری
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے	نئے جال لائے پرانے شکاری
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی	غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

جب فی البدیہہ یہ اشعار لکھوا چکے تو فرمانے لگے۔ اگر یہ شعر کام آسکیں تو چھاپ دیجئے۔

یونیورسٹی کا تعارف: ایک دفعہ مسلمانوں کا ایک وفد سر آغا خاں کی قیادت میں لاہور آیا۔ اُن دنوں اخبارات میں علی گڑھ یونیورسٹی کا شور اُٹھا ہوا تھا۔ سر آغا خاں کی صدا[رت] میں برکت علی محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا۔ اسلم صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ جلسہ میں حضرت ع[لامہ] نے ایک رُباعی پڑھی۔ وہ رُباعی یہ ہے ـــ

باہر ہوئے جاتے ہو کیوں جامے سے
پوچھو کسی پنڈت سے نہ علامے سے
میں تم کو بتاتا ہوں یونیورسٹی کیا ہے
پتلون کی تکرار ہے پاجامے سے

مشترک کلام:

"اقبال کے مزاج میں ظریفانہ رنگ بہت تھا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں وہ خوب کھل ک[ر] [باتیں کرتے] تھے۔ اور ایک ایک نشست میں کئی کئی لطیفے کہہ ڈالتے تھے۔ وہ اکبر الہ آبادی کے مزاحیہ کلام کو بہت پ[سند] کرتے تھے۔ اور اکثر ان کے رنگ میں لکھا بھی کرتے تھے۔ مجھے اس قسم کے کلام کا صرف ایک مصرع [یاد ہے]
" الہ باد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا"
کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اقبال بیٹھے بیٹھے ایک آدھ مصرعہ کہہ دیتے اور پھر مجھ سے کہتے کہ [میں] باقی نظم مکمل کردوں۔ اسی طرح ایک مرتبہ ہم دونوں نے ایک مشترک نظم کہی جس میں آدھے شعر اقبال کے ا[ور] آدھے میرے تھے۔ یہ واقعہ غالباً جولائی ۱۹۱۱ء کا ہے۔ نظم کا موضوع اس دور کے غدار اور ضمیر فروش [لوگ] تھے۔ پوری نظم یہ تھی ــــ

ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے
کہ اس کی ذات پر نازاں بساطِ کہنہ و نو ہے
اگر اس کی سلامی کے لیے نواب جھکتے ہیں
تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لو ہے
کئی مسلک کئے ہیں لازمی تعلیم نے پیدا
احدرشٔ کا کوئی پٹھو کوئی آغا کا پیرو ہے
عجب ہے کھیل قسمت کا کہ پچیسی الیکشن کی !
بچھائی شیخ بیچارے نے لالہ کو پڑی لو ہے
نہیں ہے بہر اظہارِ وفا لازم نمود اصلا
کہ بحرِ شعر میں پانی نہیں مطلق مگر رو ہے

مولانا ظفر علی خاں۔
ملیحہ تعزیل ۲۱ اپریل ۱۹۵۰ء

اقبال کے چند شوخ اور طنزیہ اشعار

بانگِ درا

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا　　　خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا　　　تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی　　　بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں　　　اقبالؔ کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبالؔ　　　بُلا کے دیر سے مجھکو امام کرتے ہیں

تو نے اے اقبالؔ یورپ میں اُسے ڈھونڈا عبث　　　بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم　　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما　　　لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

بالِ جبریل

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ　　　دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مے گلگوں　　　مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظ و پند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر　　　تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا　　　افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم　　　کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند
چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ　　　کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب　　　خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق

عشق میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اول، دیتے ہیں شراب آخر

دل ہے مسلماں نہ تیرا نہ میرا — تو بھی نمازی میں بھی نمازی

قُم باذنِ اللہ جو کہتے تھے رخصت ہو گئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

(ابلیس کی عرضداشت)

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بدآموزیِ اقوام و ملل کام اُس کا — اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال — کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

ضربِ کلیم

خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر و لیکن — خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر — خطوطِ خمدار کی نمائش، مریز و کجدار کی نمائش

ہے نزع کے عالم میں یہ تہذیب جواں مرگ — شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں — ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج (مسولینی)

اقبال کو شک اس کی شرافت پہ نہیں ہے — ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار

یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اُس نے — بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق — ہسپانیہ پہ حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے — ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن — پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ — ابلیس کے تعویذ سے اک روز سنبھل جائے

(مجلسِ اقوام)

شوکت تھانوی

اقبالیئے

آغا کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ بھلے آدمی دنیا میں ہزار قسم کی باتیں ہیں۔ سیاسی مباحث ہیں، دوستوں کی غیبت ہے ذاتی عشق و محبت کے فسانے ہیں حسن کی داستانیں ہیں۔ موسم کا حال ہے۔ مختصر یہ کہ احباب کے سر کھپانے کے لیے بے شمار بہانے ہیں۔ یہ کوئی فرض ی تو نہیں کہ آپ اپنے ادبی و میدان کا سکہ جمانے کے لیے خواہ مخواہ شعر و ادب میں بھی دخل در معقولات فرما کر دوسروں کی زندگی عذاب کر دیں مگر وہ بندۂ خدا نہ مانتا تھا نہ مانا اور جس طرح ایک زمانے میں اپنی غالب پرستی کے بدولت غالب کے نام سے بیزار کر چکا تھا کچھ وہی طریقہ اقبال کے سلسلہ میں اختیار کر لیا کہ جب دیکھئے نہایت بھونڈے طریقہ پر اقبال کا ذکر اور کلام اقبال کے چرچے، بیٹھے ہوئے خواہ مخواہ جھوم رہے ہیں اور محض اپنا شعری بھرم قائم کرنے کے اقبال اور اس کے کلام سے اختلاج پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ آخر کار اس بدتمیز انسان نے یہ حال کر کے چھوڑا کہ ادھر اس نے اقبال کا نام لیا اور معلوم ہوا کہ جیسے جنون کا دورہ پڑ گیا ہے اس قسم کے موقعوں پر جی چاہتا ہے کہ سر منزلہ سے پھاند کر جان دے دیں یا ریل کی پڑی پر سر رکھ کر کسی ٹرین کا انتظار کریں یا خودکشی کے بجائے ان ہی حضرت پر قاتلانہ حملہ کر دیں۔ موت تو برحق ہے ہی۔ پھانسی کے سلسلہ میں سہی۔ یعنی . . . ملاحظہ ہو گو آپ کی طبیعت کو شعر و شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں، سخت نامعقول واقع ہوئے ہیں آپ اس سلسلہ میں کسی قوالی کی محفل میں چلے جائیں تو وہی شعر آپ کو یاد رہ جاتا ہے جو سب سے زیادہ مہمل ہو مگر چونکہ آپ کو معلوم ہے اقبال سنجیدہ اور سمجھدار طبقہ کا شاعر ہے اس لیے آپ بھی اپنے کو سنجیدہ اور سمجھدار ثابت کرنے کے لیے جب دیکھئے کلام اقبال پر سر دھنا کرتے ہیں۔

نہایت بدتمیزی کے ساتھ جھومتے ہوئے باہر سے تشریف لائیں گے، ٹوپی ایک طرف اچھال کر پہلے تو کچھ سیٹی بجا بجا کر گاتے رہیں گے اس کے بعد ایک لمبا سانس لے کر زانو پر ہاتھ ماریں گے اور پھر فرمائیں گے۔ کیا کہتا تھا ظالم، کہتا ہے۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ   ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے

دیکھا آپ نے "کیا بات کہہ دی" ہے؟

عرض کیا۔ کہی ہو گی کوئی بات۔ تم تو وہ چیز سناؤ ؎

یہی تھا۔ یہ بھی لوگ غالب کا ذکر زیادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ بھی کچھ وقت دے کر غالب کے دو چار
شعر یاد کر لیے تھے اور جب دیکھئے بات بات پر غالب کا حوالہ دے کر اس سلسلہ کا تسلسل ختم کرتے رہے
یہاں تک کہ غالب سے طبیعت ایسی مکدر ہوئی کہ ادھر ان حضرت نے غالب کا نام لیا اور یہاں طبیعت مشتعل
ہوئی کہ کر دو اس شخص پر حملہ یا حملہ آگریبان سے گریبان پھاڑ کر غالب کے کلام سے جی متلانے لگا تھا اور ایک وحشت
سی ہوتی تھی اسم غالب سن کر۔ ایک آدھ مرتبہ پیار سے سمجھایا کہ دیکھو بھائی آغا تم جانتے ہو کہ ہم تمہارے
دوست ہیں اور تم ٹیکس انسپکٹر ہو مگر اس نامراد دوستی کا اتنا تو ٹیکس لے لو کہ ہمارے ذوقِ سلیم کو اپنی عنایت
سے قابل توجہ محکمہ حفظانِ صحت بنا دو۔ غالب کو تمہارے فرشتے بھی سمجھ نہیں سکتے تم تو ذرا کسی اور کی سیدھی سی
ہوئی غزلیں گانے اور گنگنانے کے لیے یاد کر لو، تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے کوئی حکیم نے تو نسخہ نہیں لکھا
نہیں ہے کہ آپ غالب کے مناقض بن کر اپنے کو نمایاں کریں اس طرح غالب تو نمایاں ہوتا نہیں اور نہ خود آپ
نمایاں ہوتے ہیں البتہ آپ کی حماقت ضرور اُجاگر ہو جاتی ہے اور اس سلسلہ میں آپ کی بدتمیزی اس قدر اشتعال
انگیز ہوتی ہے کہ کسی دن فوجداری کی نوبت آ جائے گی مگر اس سمجھانے کے باوجود جب وہ نہ مانے تو ایک مرتبہ فیصلہ کن سختی
سے ان کو ٹوکنا پڑا اپنے خاندانی جلال کے حوالے دیئے کہ ہم لوگ کس طرح آدمی کو مُرغا بنا دیا کرتے ہیں اور فلاں بزرگ
نے کس طرح ایک شخص کو قتل کر کے پھانسی پر لٹک جانا گوارا کر لیا تھا مگر ایک سید ذوق اور کور ذوق کی ناشائستگی
برداشت نہ کی تھی اور جب اس دھمکی سے بھی کام نہ چلا تو تعلقات ختم کر دیئے دور کی صاحب سلامت باقی رہ گئی۔
روز کے بجائے ہفتہ وار ملنے لگے پھر مہینہ میں ایک بار اور آخر کار اس دن ہمارے یہاں ایک بہت بڑی دعوت
تھی جب ان حضرت کو میونسپل کارپوریشن سے نکالا گیا ہے تو ان کو راولپنڈی میں محکمہ جنگلات میں کوئی جگہ ملی
ہے دل نے کہا خس کم جہاں پاک۔ کم از کم اب یہ غالب سے دھمکاتے تو نہ آیا کریں گے مگر اب جو دو سال کے بعد
آپ راولپنڈی سے پھر خدا جانے کن بلا عالیوں کا عذاب بن کر نازل ہوئے ہیں تو غالب کے بجائے آپ کو
اقبال کا خبط ہے ہائے یہ دو شاعر تھے جن سے ہماری تنہائیاں آباد تھیں جن میں کھو کر خدا جانے ہم کیا کیا
ڈھونڈا کرتے تھے جن کو اپنا مخاطب اس وقت بنا لیتے تھے جب کوئی اور مقابل نہ ہوتا تھا جن کو کبھی بحث میں
اسی ڈر سے نہ لاتے تھے کہ خدا جانے کسی ناشناس کی بدولت ہم کو کونسی احساسی تکلیف پہنچ جائے غالب اور
اقبال سے کیف حاصل کرنے کا مزہ کچھ چوری چھپے ہی آتا تھا مگر قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہی دو شاعر ہم سے
اس لیے چھین لیے جائیں۔

مصیبت بالائے مصیبت یہ تھی کہ اس مرتبہ آغا صاحب راولپنڈی سے آ کر غریب خانہ ہی پر ٹھہرے ہوئے
تھے اور اب صرف آپ ہی نہیں بلکہ آپ کے احباب بھی ہر وقت ہمارے لیے عذاب جان بنے ہوئے تھے ایک
سے ایک عقل کا پیر دیکھئے جب دیکھئے دھرا ہوا ہے اور یہی چرچے ہو رہے ہیں کہتے تھے ایک دن آغا صاحب
اپنے حلقۂ احباب میں:

"میرا خیال تو یہ ہے کہ اقبال کو دنیا ابھی اور سمجھے گی۔ ہر روز اس کے کلام پر ایک نئے زاویئے سے روشنی
پڑتی ہے لہٰذا کوئی نہ کوئی نیا گوشہ نکل آتا ہے۔

ایک صاحب جو پاس ہی بیٹھے ہوئے بڑے بانگ درا لیے بیٹھے تھے کھنکھار کر بولے :۔

"اقبال وقت کا زندہ شاعر ہے اور اس کا کلام وقت کی آواز ہے، دیکھئے وہ کہتا ہے ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے

آغا صاحب نے جھوم کر کہا۔
بھئی ذرا پھر پڑھنا کیا بات کہی ہے کیا زبان ہے، کیا واقعاتی شاعری ہے" ہاں کیا ہے۔ سچ کہہ دوں۔
ان حضرت نے پھر اس شعر کو پڑھ کر بڑی شاہین نما آنکھیں نکال کر فرمایا۔
"جناب من ذرا دیکھئے تو سہی بات کتنی بڑی کہی ہے بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ہندوستان سے مخاطب ہے حالانکہ جس وقت یہ شعر کہا گیا ہے اس وقت پاکستان کا تخیل بھی عالم خواب میں نہ تھا مگر شعر کا اعجاز تو یہی ہے کہ وہ زمانے کی قید سے آزاد ہو۔ قطعاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر آج کا ہے اور اس کا ایک ایک لفظ آج کے حالات کے مطابق ہے۔ . . . .

. . . . وہ صاحب اٹک کر بولے:
میں عرض کیا کروں گا کوئی بات شاعر مشرق نے دراصل یہی بات کہی تھی۔ ان کے کلام میں بے شمار شعر اسی قسم کے ہیں جن کا مطلب کل کچھ اور تھا اور آج کچھ اور ہے اور پھر کل کچھ اور ہوگا۔ ہر زمانہ اس کلام کو اپنے حالات کے عین مطابق پائے گا۔"

آغا نے کہا: "یار ایک کام کرو تم۔ اقبال پر ایک آدھ کتاب لکھ ڈالو نا۔ مقدمہ میں بھی ڈالوں گا" اور ہم سے کہا کیا خیال ہے آپ کا؟
عرض کیا: "مقدمہ بازی تو انشاءاللہ ضرور ہوگی۔"
کہنے لگے: "کیا مطلب"؟
عرض کیا: "بھائی میرے آخر انسان کب تک ضبط کر سکتا ہے کسی نہ کسی دن اس قسم کی باتوں پر سر پھٹول ہو جائے گی۔ پکڑ دھکڑ۔ چوکی تھانہ اور کچہری عدالت تک نوبت پہنچے گی۔"
آغا صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم تو مسخرے ہو میں کہہ رہا ہوں کہ واقعی اقبال پر کام کرنے کی ضرورت ہے؟"
ہم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ یہ کام کیجئے میں ذرا سر میں تیل ڈلوا کر غسل کر لوں تو کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں کہ مجھ کو آپ کے لیے مکان ڈھونڈنا چاہئیے یا خود کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہئیے جہاں کوئی نہ ہو۔
وہ تینوں حیرت سے دیکھتے رہ گئے غالباً پاگل سمجھے ہوں گے اور اگر یہ سمجھے تو سچ سمجھے۔ ▬
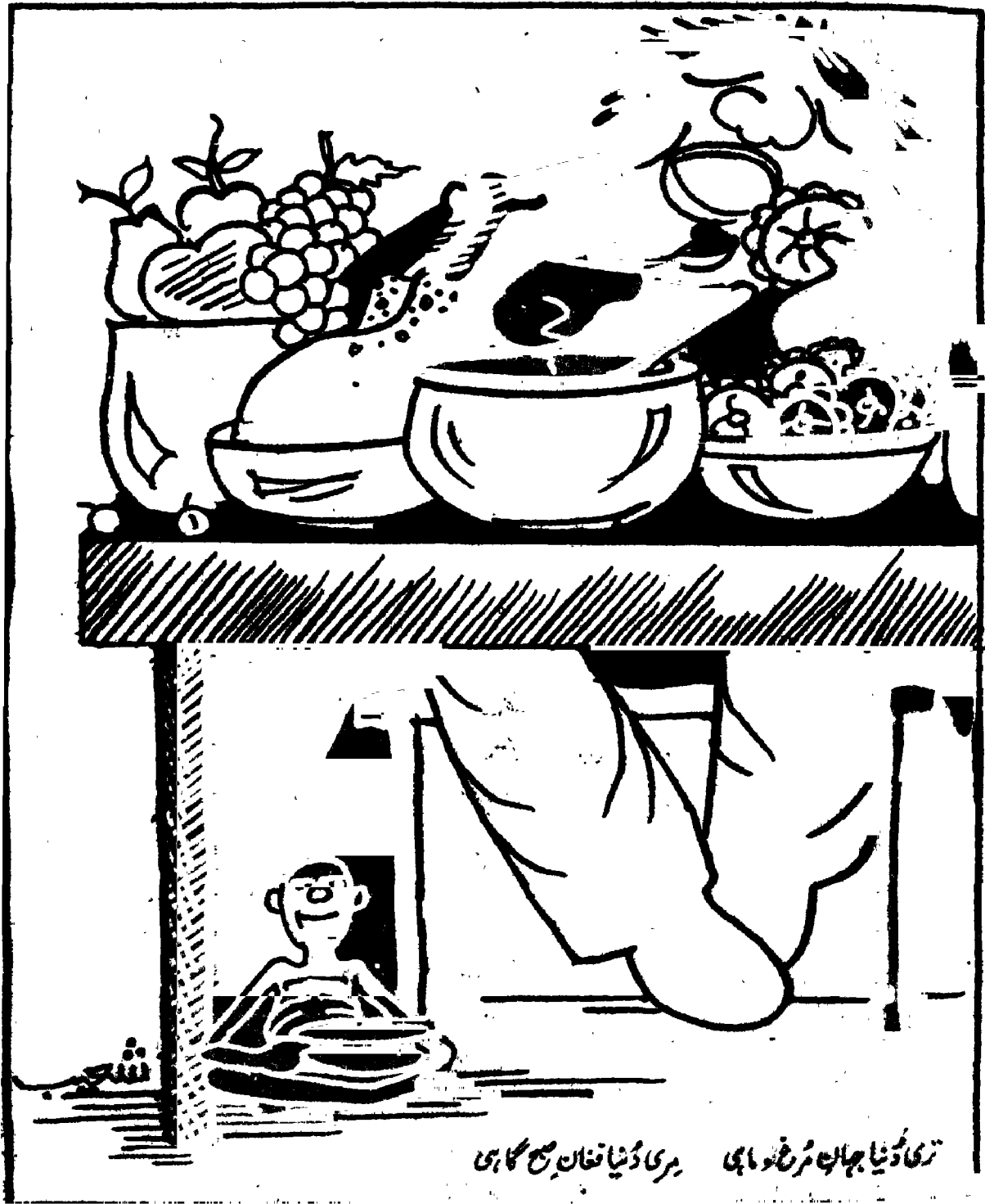
تری دُنیا جہانِ مرغ و ماہی   مری دُنیا فغانِ صبح گاہی

یوسف ناظم

صاحبِ اقبال شاعر

ہر وہ شخص جس کا نام اقبال ہو، اقبال صاحب تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا صاحبِ اقبال ہونا مشکل ہے۔ ڈاکٹر اقبال کو البتہ صاحبِ اقبال بننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ علم سفر ملنے سے پہلے ہی اس کا بندوبست کر چکے تھے۔ پیدا ہو جانے کے بعد جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے ان کا اقبال میں بھی اتنی ہی تیزی سے ترقی ہونے لگی، جتنی تیزی سے ہمارے ہاں چیزوں کی قیمتیں بڑھتی ہیں۔ جہاں تک قیمتوں کا تعلق ہے، یہ کشش ثقل کی نہیں، کشش فلک کی پابند ہیں۔ قیمتوں کا نیوٹن کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہے تو بس اتنا کہ جو بھی قیمتوں کے بارے میں زیادہ غور و فکر کرے گا، ذہن لوس ہو جائے گا۔

ڈاکٹر اقبال جب پیدا ہوئے تو ایک عام ہندوستانی کی طرح پیدا ہوئے۔ ایک عام ہندوستانی کے پیدا ہونے پر پہلا کام جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی جاتی۔ یعنی ہمارے ہاں بچے کی زندگی کورے پن سے شروع ہوتی ہے، کیوں کہ یہی آئین قدرت ہے۔ یہی اسلوب فطرت ہے۔

تاریخ پیدائش لکھنا ہمارے ہاں اتنا ہی زبردست کارنامہ ہے، جتنا کسی ملک کی تاریخ لکھنا۔ معلوم نہیں وہ لوگ کس دل گردے کے ہوتے ہیں جو ہنستے کھیلتے بچے کی تاریخ پیدائش لکھ لیتے ہیں۔ تاریخ پیدائش لکھنے میں ایک تو وقت بہت صرف ہوتا ہے، دوسرے آگے چل کر غیر ضروری مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ (صحیح تاریخ پیدائش عام طور پر نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور کتنے ہی لوگوں کو اس کی وجہ سے وقت مقررہ پر ملازمت سے سبکدوش ہو کر شریفانہ مشاغل اختیار کرنے پڑے ہیں)۔ آج بھی جب کہ جگہ جگہ برتھ رجسٹر کھلے ہوئے ہیں اور ان میں نامناسب اندراجات کیے بغیر کسی بھی بچے کو پیدا ہونے نہیں دیا جاتا، کسی بچے کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم کرنا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا پیدائش سے پہلے اس کی صنف معلوم کرنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب ولادت میں تصور وار والدین کا نام تو درج ہوتا ہے اور واقعہ پیدائش کا بھی اندراج ہوتا ہے لیکن بچے کا نام درج نہیں ہوتا۔ بچے کا نام تو ہم اس وقت رکھتے ہیں جب تک کم سے کم ڈیڑھ سو ناموں پر غور کر چکتے ہیں۔ جو لوگ اس معاملے میں عجلت سے کام لیتے ہیں، زندگی کی ایک بڑی دلچسپی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اقبال کے ہاں بھی "گردشِ افلاک" کا ایک دو جگہ ذکر ملتا ہے لیکن انھوں نے اسے خیمۂ افلاک بھی کہا ہے اور خیمہ متحرک نہیں ہوتا۔ اقبال کے ہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ کم سے کم انھوں نے آسمان کو زمین کے باشندوں کا دشمن نہیں بنایا ہے، ورنہ غالب تو آسمان سے اتنے بدظن ہیں کہ کہتے ہیں:

ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

فارسی کے کسی شاعر نے یہاں تک کہا تھا کہ آسمان سے جو بھی بلا چلتی ہے، میرے گھر کا پتا پوچھتی آتی ہے۔ آسمان کے بارے میں بہرحال ڈاکٹر اقبال کے خیالات اتنے خراب نہیں ہیں، اور ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ آسمان تو ہمارے سر پر ایک چھت کی طرح ہے۔ ہمارا ہاتھ چھت تک نہیں پہنچتا، تو کوئی حرج نہیں۔ آدمی کو تو چھت چاہیئے ہی۔ جب ہم معمولی سا مکان بناتے ہیں، تو چاہے اس میں کچھ بنائیں یا نہ بنائیں، چھت تو ضرور ہی ڈال لیتے ہیں اور اب تو صرف سیلنگ ہی فالس سیلنگ کا بھی رواج ہے۔ چھت پہلے بھی ضروری تھی اور اب بھی ضروری ہے، عاشقی کے لیے بھی اور پتنگ اڑانے کے لیے بھی۔

یہ کوئی موقع نہیں ہے کہ چھت کے فوائد اور اس کی غرض و غایت کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ اس بیان سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ جب معمولی اور مصنوعی مکانوں کے لیے چھت ضروری ہے، تو کیا اتنی بڑی زمین یونہی کھلی چھوڑ دی جاتی۔ اگر ہمارے سر پہ آسمان نہ ہوتا تو آپ ہی، آج نہ سہی دو چار دن بعد سوچ کر بتلائیے کہ اس کی جگہ کیا ہوتا۔ اقبال نے آسمان کی مخالفت میں کچھ نہیں کہا ہے۔ ان کا تو خیال ہے کہ وہاں سے ادھر بلائیں نہیں، دعائیں آتی ہیں۔ ؎

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے ہیں
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

اقبال تو آدمی کو طائرِ لاہوتی کہتے ہیں اور اسے آسمانوں میں پرواز کرنے کی تحریری دعوت دیتے رہیں بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرواز میں کسی بھی وجہ سے کوتاہی نہیں آنی چاہیئے۔ اقبال بذاتِ خود اتنا اونچا اڑے کہ آسمان پر چھا گئے اور چوں کہ اردو شاعری میں آسمان دشمنی کی روایت ہے، اس لیے اردو کے کچھ شاعر ان کے آسمان بن جانے کی وجہ سے ان پر بھی دھول پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے دھول پھینکنا نہیں خاک چھانکنا سمجھنا چاہیئے۔ جو لوگ دنیا کے گورکھ دھندے میں پوری طرح پھنسے رہتے ہیں، ان کی عمر اقبال منزل کے فراق ہی میں گزر جاتی ہے۔ ایسے لوگ صاحبو اقبال تو خیر کیا، مصاحبِ اقبال بھی بن جائیں تو بہت ہے۔

(یہ مضمون اقبال صدی کے سلسلے میں بھیونڈی کے ایک سیمنار میں پڑھا گیا اور شاید سنا بھی گیا)۔

مشفق خواجہ (پاکستان)

علامہ اقبال سے ضرور کوئی غلطی ہوئی تھی ورنہ اُن پر اتنی کتابیں نہ لکھی جاتیں

علامہ اقبال کا انتقال تو ایک ہی مرتبہ ۲۱ اپریل کو ہوا تھا، مگر ان کے ہم جیسے عقیدت مندوں کو ہر سال کئی کئی مرتبہ اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ سانحہ بار بار اس لیے پیش آتا ہے کہ سارا سال علامہ کے بارے میں ایسے ایسے مضامین اور کتابیں چھپتی رہتی ہیں کہ جنھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ آخر علامہ سے ایسی کونسی غلطی ہو گئی تھی جس کی انھیں سزا مل رہی ہے۔ ان مضامین اور کتابوں سے ان کے لکھنے والوں کو شہرت ملتی ہے، لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ علامہ کی شہرت اور ان کے عقیدت مندوں کی صحت خراب ہو رہی ہے۔

اب تک علامہ اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا وزن بلا مبالغہ کئی ہزار من ہوگا۔ اور اگر اس میں لکھنے والوں کی غلطیوں اور غلط کاریوں کا وزن بھی شامل کر لیا جائے تو صورت حال خاصی تشویش ناک ہو جاتی ہے۔

اس طومار نویسی اور بسیار نگاری کا سبب یہ ہے کہ اقبال پر مضمون لکھنے اور کتاب بنانے کے ایسے سانچے ایجاد ہو گئے ہیں کہ بغیر کسی زحمت کے، حتیٰ کہ سوچے سمجھے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔ ایک طرف سے ان سانچوں میں علامہ اقبال کے شعر ڈالے جاتے ہیں، اور دوسری طرف سے مطلوبہ ضخامت کا مضمون یا کتاب برآمد ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو "اقبال اور شاہین" کے موضوع پر مضمون لکھنا ہے تو کلیات اقبال کا اشاریہ دیکھ کر ان تمام شعروں کو یکجا کر لیجیے جن میں شاہین کا ذکر آیا ہے۔ شعروں کے درمیان نثر کے ایک ایک دو دو جملے (جو اقبال ہی کے شعروں کا سلیس اردو میں ترجمہ ہوں) درج کرتے چلے جائیے، مضمون تیار ہو جائے گا۔ اگر مضمون کو طویل کرنا مقصود ہو تو شاہین نظامی بدایونی، شاہین مفتی، اور امیر اللہ شاہین جیسے شاعروں کی غزلوں کے متعلق بھی مضمون میں شامل کر لیجیے۔ جب یہ شعرا علامہ اقبال کے شاہین سے تخلص مستعار لے سکتے ہیں تو علامہ کے شاہین کو بھی حق حاصل ہے کہ ان کے متعلقین کو بخشکب فرمایہ سمجھ کر ان پر ہاتھ صاف کرے۔

یہ مشہور واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ جب "اقبال اور بھوپال" اور "اقبال اور حیدرآباد" جیسی کتابوں کی شہرت ہوئی تو ایک صاحب نے "اقبال اور ٹنڈو آدم" کے موضوع پر کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ جب ان صاحب سے یہ کہا گیا کہ علامہ اقبال تو کبھی ٹنڈو آدم گئے ہی نہیں تھے تو پھر آپ اس موضوع پر کتاب کیسے لکھ سکتے ہیں، انھوں نے جواب دیا "میں اپنی مجوزہ کتاب میں یہی تو ثابت کروں گا کہ علامہ اقبال کبھی ٹنڈو آدم گئے ہی نہیں تھے۔"

یہ تو خیر پرانا لطیفہ تھا، نیا لطیفہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے حقیقی بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے "مظلوم اقبال" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اقبال مظلوم تو پہلے بھی تھے، اب مظلوم تر، بلکہ مظلوم ترین ہو گئے ہیں۔ اس کتاب میں بظاہر تو معلومات پیش کی گئی ہیں، لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اقبال قادیانی تھے یا کم از کم قادیانیوں کے خلاف نہیں تھے۔ بقول مصنف اقبال نے ۱۹۳۵ء میں بعض مخصوص حالات کے تحت قادیانیوں کی مخالفت شروع کی اور انھیں مسلمانوں سے الگ تصور قرار دیا۔

شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں: "ان دنوں تو تعصب کا دور دورہ ہے، لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت .... ۳۵ء میں یکایک کیوں علامہ کی رائے میں دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہو گئی۔ ایسی تحقیق کے نتیجے میں انھیں معلوم ہوگا کہ احمدیت کے متعلق علامہ کی رٹ میں تبدیلی ... کی وجہ کانگریس احرار سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انہیں دنوں ایک ذاتی معاملے میں علامہ کا احساس محرومی بھی شامل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی در آئی جو عام طور پر ان کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔" (ص ۱۹۹)

شیخ اعجاز احمد نے اقبال کے جس احساس محرومی کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل انہوں نے یہ بتائی ہے کہ اقبال وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ وزیر ہند نے چوہدری سر ظفر اللہ کا تقرر کردیا۔ اقبال کو بہت غصہ آیا۔ وزیر ہند پر تو وہ اپنا غصہ اتار نہیں سکتے تھے، للہٰذا چوہدری سر ظفر اللہ کے قادیانی ہونے کی بنا پر قادیانیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ، شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں شیخ اعجاز احمد یہ فرما رہے ہیں کہ اقبال قادیانیوں کے عقائد کی وجہ سے ان کے خلاف نہیں ہوئے بلکہ اپنی ایک ذاتی محرومی کا انتقام لینے کے لیے یہ موقف اختیار کیا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مجلس احرار نے اقبال کو بلیک میل کر کے قادیانیوں کے خلاف لب کشائی پر آمادہ کیا۔ گویا شیخ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اقبال راسخ العقیدہ نہیں تھے لیکن دوسروں کے بلیک میل کرنے سے راسخ العقیدہ ہو گئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب "زندہ رود" کی تیسری جلد میں ان باتوں کی بہت عمدگی سے تردید کی ہے، حالانکہ فضولیات کی تردید کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شیخ اعجاز احمد نے اقبال کو قادیانی یا قادیانیت کا ہمدرد ثابت کرنے کے لیے ان کے بعض مصرعوں اور شعروں سے بھی فائدہ اٹھانے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں: "ان (اقبال) کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی روحانی مصلح (مراد بانی "تحریک قادیانیت") کی آمد کے منتظر نہ سہی، لیکن اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔" (ص ۱۹۱) اس دعوے کے ثبوت میں شیخ صاحب نے اقبال کا یہ مصرع پیش کیا ہے۔ اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا مصرع شیخ صاحب کی نظر سے نہیں گزرا، ورنہ وہ اقبال کے ساتھ ساتھ رومی و رازی کو بھی اپنا ہم عقیدہ ثابت کر سکتے تھے۔

شیخ صاحب نے کتاب میں اپنے مذہب کی جو تبلیغ کی ہے، اس کا ایک آدھ نمونہ بھی دیکھ لیجیے

اور داد دیجیے کہ انھوں نے اقبال کے شعروں سے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا ✽ سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

علامہ کی وفات کے بعد ایک نہیں کئی "صحرائی شیر" ہوشیار ہوئے ہیں لیکن اس "زمانے" کی سلطنت روما (امریکہ اور روس) کو الٹنے کے بجائے فی الحال تو ایک دوسرے کی سلطنت کو الٹنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ احیائے اسلام کا علم [illegible] نے شاید شیروں کی بجائے اب کسی "مورِ ناتواں" سے لینے کا منصوبہ بنایا ہو جسے آج کل ہر طرف سے کچلنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن خود علامہ نے فرمایا ہے۔

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا ✽ ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا۔ (ص ۱۵۶)

اس کتاب کا ایک باب "شکوہ جور و جفا" بہت دل چسپ ہے اس باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ اپنوں اور غیروں نے علامہ اقبال پر کیا کیا مظالم کیے۔ سب سے پہلا ظلم تو اقبال کے والدین نے کیا کہ کم عمری میں ان کی شادی کر دی جس کے نتیجے میں وہ عمر بھر پریشان رہے۔ دوسرا ظلم حالات نے کیا کہ لندن کے دوران قیام میں اقبال اس "گل" کو حاصل نہ کر سکے جس کی یاد انہیں زندگی بھر تڑپاتی رہی۔ اس سلسلے میں مصنف نے دو خواتین کے نام بھی لیے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے لیے علامہ اقبال بے قرار تھے۔ شیخ اعجاز احمد کی سعادت مندی سے توقع تھی کہ وہ اپنے "عم محترم" کی بے قراریوں کی داستان اسی تفصیل سے لکھیں گے جس تفصیل سے انھوں نے "قادیانیت والے مسئلہ" پر لکھا تھا! لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کوئی "تبلیغی" مقصد حاصل ہونے کی اُمید نہ تھی، اس لیے اس لذیذ داستان کو مختصر کر دیا۔

شیخ اعجاز احمد نے اقبال پر ظلم کرنے والوں میں اپنے آپ کو شامل کیا ہے، فرماتے ہیں "جولائی ۱۹۳۱ء کا آخری سہ ماہی میں علامہ نے راقم الحروف کے پنجاب کی جوڈیشل سروس میں لیے جانے کے سلسلے میں جو کوشش کی اس میں سر شادی لال سے سفارش بھی شامل تھی۔ ان کی کوشش کامیاب رہی ان دنوں تو نہیں لیکن جلد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بھی شادی لال کی ایک چال تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ اگلے سال ہائیکورٹ میں ایک مسلم جج کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔ انھوں نے علامہ کو اس سے محروم رکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا اس لیے علامہ کی سفارش پر ان کے ایک عزیز کو سب جج مقرر کر کے یہ ظاہر کیا کہ انھیں علامہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں۔ راقم الحروف کے لیے ابھی تک یہ احساس ندامت سوہانِ روح ہے کہ اس کے لیے انھیں شادی لال ایسے شخص سے "مومیائی" مانگی پڑی۔ راقم الحروف کو بھی علامہ پر ظلم کرنے والوں کی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیئے۔" (ص ۲۲۶)

شیخ صاحب نے یہ واقعہ بیان کر کے ذرا تکلف سے کام لیا ہے حالانکہ علامہ اقبال پر ظلم کرنے والوں میں شامل ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ شیخ صاحب نے "مظلومِ اقبال" جیسی کتاب لکھی ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
شعیب

برقؔ آشیانوی

"ہم پہ احساں جو نہ کرتے..."

(علامہ اقبالؔ کا شکوہ)

غالبؔ صدی تقاریب جس دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئیں اس کی چکاچوند ابھی ماند نہیں پڑی تھی اور لذت جو ابھی کام و دہن پر رقصاں تھی مدھم نہیں پڑی تھی کہ پھر ہمارے سر پر رات دن ایک فکر سوار تھی کہ اب کس کی صدی تقاریب منائیں۔ کیوں کہ کسی نہ کسی کی صدی تقاریب منانا کئی لحاظ سے فائدہ مند ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو صرف "فائدے" کی خاطر مناتے ہیں اور اتنا فائدہ کماتے ہیں کہ بر بسیل غم د آلام روزگار سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کسی نہ کسی شخصیت کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان سب میں غالبؔ کی سیڑھی سب سے سستی ہے بلکہ مفت ہاتھ آجاتی ہے۔ بس ذرا دیوار سے لگایا اور چڑھ کر بولنے لگے کہ لو ہم نے "غالبیات" میں ایک اور اضافہ کر دیا۔ بعض شیر دل انسان تو شہرت اور دولت کے علاوہ عزت بھی کما لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے جو کچھ غالبؔ صدی میں کمایا تھا اس میں سے شہرت اور عزت میں تو کمی نہیں ہوئی تھی البتہ دولت ختم ہونے کو آرہی تھی۔ اسی غم میں دن رات گھل گھل کر کانٹا ہوتے گئے تھے کہ اب کونسی صدی منائیں تاکہ روزگار کا نیا دروازہ کھل سکے۔

"کرنا خدا کا کیا ہوا" کہ ہم "کلیاتِ اقبالؔ" پڑھ رہے تھے کہ اچانک ہمارے دوست نے آکر اطلاع دی کہ ملک میں اب اقبالؔ صدی منائی جانے والی ہے کیوں کہ علامہ اقبالؔ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور اب ۱۹۷۷ء چل رہا ہے یہ خوش خبری سن کر ہم اٹھے اور بغلیں بجا بجا کر ڈسکو ڈانس کرنے لگے کیوں کہ یہ ڈانس اس قدر آسان ہے کہ گھوڑے بیل یا گدھے بھی آسانی سے کر لیتے ہیں۔ پھر ہم تو انسان ہیں۔ غرض ہم نے دل بھر کر ڈانس کر لیا تو ہمارے دوست نے ہمیں پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور کہا کہ برادر اب ذرا آدمیوں کی طرح بیٹھو۔ جب ہم آدمی کی طرح کرسی پر بیٹھ گئے تو انہوں نے کہا کہ اقبالؔ کی پیدائش کو پورے ایک سو سال کا عرصہ گزر گیا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو خیر سے ایک سو سال کی عمر پاتے ملک کے گوشے گوشے سے سالگرہ کے تہنیتی جلسے ہوتے اور پیامات وصول ہوتے پریس رپورٹرس گھیر لیتے اور ایک عام سوال یہ کرتے کہ "اقبالؔ صاحب آپ کے سو برس تک زندہ رہنے کا راز کیا ہے؟" تو وہ جواب دیتے کہ "میرے سو سال تک زندہ رہنے کا راز یہ ہے کہ میں ٹھیک ایک سو سال پہلے پیدا ہوا تھا" پھر کسی تنظیم کی جانب سے اقبالؔ کی خدمت میں کیشہ زر پیش کیا جاتا جو اس غرض سے وصول شدہ رقم کا زیادہ سے زیادہ دسواں حصہ ہوتا

بعد اقبال اس قول کی صداقت پر ایمان لاکر خاموش ہو جاتے کہ "دہ در دنیا صد در آخرت" (یعنی دنیا میں دس اور آخرت میں سو)

ایک لحاظ سے اُن کا زندہ نہ رہنا ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا۔ کیوں کہ جمع شدہ رقم کا دسواں حصہ جو انھیں کیسٹ زر کی شکل میں دینا پڑتا وہ بھی بچ گیا۔ غرض ہم نے طے کر لیا کہ اب ڈاکٹر اقبال کا صد سالہ یوم پیدائش منائیں گے۔ لیکن یہ بات ہم نے دل ہی دل میں طے کر لی اور اپنے دوست سے ذکر نہ کیا۔ کچھ دیر بعد ان کو ایک پیالی چائے پلا کر رخصت کر دیا۔ ہم نے کہیں یہ پڑھ لیا تھا کہ اقبال صاحب نے جرمنی سے "ڈاکٹر" کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اسی کو بنیاد بنا کر ہم نے "ڈاکٹر اقبال صدی" منانے کا بیڑہ اٹھا لیا۔ اس کی خبر بھی نمایاں طور پر اخباروں میں شائع ہو گئی۔

جب مکمل تشہیر ہو گئی تو فراہمی چندہ کا کام شروع کیا گیا۔ یہ کام جتنا کٹھن اور صبر آزما ہے اتنا ہی فائدہ مند بھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی کے لیے تو تمام پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ غرض ہم نے پاپڑ بیلنا شروع کر دیا۔ ہم نے شہر کی تمام سربرآوردہ ہستیوں اور مخیر افراد اور اداروں سے ربط قائم کر کے اپنی مساعی تیز کر دی۔ دن اور تاریخ مقرر کر کے ہم نے پورے زور و شور سے "ڈاکٹر اقبال صدی" کی تیاریاں شروع کر دیں۔

دن رات کی محنت شاقہ کی وجہ سے ہمیں وقت پر کھانا اور سونا بھی مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر اقبال صدی کو صرف دو دن باقی رہ گئے تھے کہ ذرا آنکھ جھپکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ خود ڈاکٹر اقبال ہمارے غریب خانہ پر تشریف فرما ہیں۔ ہم انھیں دیکھتے ہی پہلے تو گھبرائے کہ یہ حضرت کیوں چلے آئے۔ اب تو جمع شدہ رقم میں سے انھیں کیسٹ زر بھی پیش کرنا پڑے گا۔ کچھ دیر کے لیے ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ڈاکٹر اقبال ہمارا حق مارنے کے لیے آدھمکے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ "اپنا حق" وصول کرنے کے لیے چلے آئے ہیں۔ لیکن فوراً ہی ہم نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے پیشانی پر سے پسینہ پونچھ لیا۔ گرمی کا موسم تھا اس لیے ہم نے فوراً ٹھنڈا کوکا کولا منگوا لیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ عذر پیش کیا کہ ان کی آواز بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ کولڈ ڈرنک سے پرہیز کر رہے ہیں۔ البتہ چائے پینے سے اتفاق کر لیا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے سامنے پورے ادب و احترام بلکہ عقیدت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب نہایت افسردہ و رنجیدہ تشریف فرما تھے۔ ان کی صورت سے رنج و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ اور بے چین نظر آ رہے تھے۔ ہم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کو اس بات کا تو علم ہوگا کہ ہم اقبال صدی منا رہے ہیں یا یوں کہیے کہ ہم آپ کا صد سالہ جشن منا رہے ہیں چنانچہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے چہرہ پر رنج و محن کے آثار نمایاں ہیں"۔ اس سوال پر ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ اور اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بہ مشکل گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔ "بھائی صاحب آپ سے میری صرف ایک درخواست ہے۔ وہ یہ کہ آپ مجھ ناتواں کے حال پر کرم بلکہ رحم فرمائیے"۔ ہم نے حیرانی کے ساتھ عرض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ یہ کیا فرماتے ہیں ہم تو آپ کے نام کو ساری دنیا میں اونچا کرنا چاہتے ہیں"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "برادر اب تک کئی لوگوں نے میرے نام کو اونچا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں مجھے اتنی اوپر اٹھا کر پٹکا ہے کہ میری ہڈی پسلی ٹوٹ گئی"۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا لمبا سا فراک کوٹ اور اس کے نیچے سے کرتا اٹھا کر اپنی پسلیاں بتائیں جن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پھر اپنی شلوار اونچی کر کے ٹانگیں بتلائیں جو جگہ جگہ سے زخمی تھیں۔ پھر سر سے ترکی ٹوپی

اتار کر کھوپڑی کے زخم بتلائے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ حالت زار دیکھ کر ہمیں بے حد صدمہ پہنچا۔ ہم نے بے تابانہ ان سے سوال کیا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کی یہ حالت کیسے ہو گئی۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "بھائی صاحب۔ یہ کسی ایک صاحب کی عنایت نہیں ہے۔ آپ جیسے مختلف کرم فرماؤں نے مجھ پر علحدہ علحدہ "یہ کرم" فرمایا ہے۔ کسی نے "سر اقبال کا یوم منایا تو میری کھوپڑی کا یہ حشر ہو گیا ہے۔ کسی نے "یادِ علامہ اقبال" کا جلسہ منعقد کیا تو میری ہڈیوں اور پسلیوں پر یہ آفت آگئی ہے۔ کسی نے "اقبال ڈے" کے نام سے ایک محفلِ رقص و سرود منعقد کی تو میری ٹانگیں توڑ ڈالیں۔ غرض مختلف کرم فرماؤں نے مجھ پر جو کرم کیا اس کا یہ نتیجہ ہے۔ ہر ایسے جلسے کے بعد میں نے لرز لرز کر یہ کہا ہے کہ ؎

ہم پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا۔

بامِ شہرت پر چڑھانے کے بجائے ہڈیاں پسلیاں توڑ کر تو نہ رکھ دیتے۔" ڈاکٹر صاحب کی یہ تباہ حالی دیکھ کر ہم دل ہی دل میں افسوس کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے پھر فرمایا۔ "اب میری آپ سے ایک التجا ہے۔" ہم نے دست بستہ عرض کیا۔ "فرمائیے۔ آپ کے لیے تو جان حاضر ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "میاں جان لینے کی بات تو بہت بڑی ہے۔ مجھ پر صرف اتنا کرم فرمائیے کہ یہ جو آپ اقبال صدی منانے چلے ہیں اس کو منسوخ فرما دیجئے۔ ورنہ ہڈیاں تو جسم کی ساری پہلے ہی ٹوٹ چکی ہیں۔ اب جو گوشت پوست رہ گیا ہے کہیں آپ کے کرم کرنے سے وہ بھی ادھڑ کر نہ رہ جائے۔" ہم نے پوری عقیدت کے ساتھ عرض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پورے ملک میں شہرت ہو چکی ہے کہ اقبال صدی منائی جائے گی۔ کیوں کہ آپ کے سنہ پیدائش کو پورے ایک سو سال گزر چکے ہیں۔ اگر ہم عقیدت مند لوگ آپ کے نام کو اونچا کریں گے۔ تو بیرونِ ملک کے لوگ آپ کو کیسے پہچانیں گے۔ دیکھئے دنیا کے گوشے گوشے سے اقبال شتابدی کے تہنیتی پیامات وصول ہو چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مملکت کے صدر نے کتنا اچھا پیام روانہ فرمایا ہے۔ لکھا ہے۔ "ڈاکٹر اقبال صدی منا کر آپ نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے جو سائنسی تحقیقات میں اضافہ کیا ہے۔ وہ سائنس کی دنیا میں تاقیامت یادگار رہے گا۔" یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب نے ایک دلدوز آہ بلند کی اور دل تھام کے بیٹھ گئے۔ ہم نے ایک اور مملکت کے وزیرِ اعظم کا پیام پڑھ کر سنایا۔ "ڈاکٹر اقبال نے فنِ طب پر جو ورک کیا ہے ہمارے ملک میں اس سے بے حد استفادہ کیا جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے جسم کے تمام اعضائے رئیسہ کے امراض مثلاً دل، دماغ، جگر، گردے، پھیپھڑے وغیرہ وغیرہ کے امراض کا پتہ چلا کر ان امراض کی ایسی دوائیں بھی تجویز فرمائی ہیں کہ آج تمام ڈاکٹر وہی دوائیں استعمال کروا رہے ہیں۔ ہم نے اپنے ملک کی جانب سے انھیں ارسطوئے وقت اور جالینوسِ زماں کا لقب دے دیا ہے۔ ایسی عظیم شخصیت کی صدی منانے پر میں اپنے ملک اور قوم کی جانب سے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔" یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے "ہائے" کہا اور کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر جھک گئے۔ ہم نے فوراً تیسرا پیام پڑھ کر سنایا۔ جو ایک اور ملک کے سربراہ کی جانب سے وصول ہوا تھا۔ "ہم نے سر اقبال کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان کے ناول "ضربِ کلیم" پر انہیں نوبل پرائز ملنا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ انہیں اس حق سے محروم کر دیا گیا۔ ایک نوبل پرائز یافتہ ناول نگار کے ناول پر ساری دنیا میں یہ آواز سنائی دے رہی تھی کہ وہ سر اقبال کے ناولٹ کا چربہ ہے۔ اقبال شتابدی کی تقاریب مبارک ہوں۔" ایک کمیونسٹ ملک کے کتا و صدر نے لکھا تھا کہ

نکرِ محمود سے دیکھا جائے تو کمیونسٹ تحریک ڈاکٹر اقبال کی ہی رہینِ منت ہے۔ انھوں نے جو شعر لکھا تھا وہ ہمارے ملک کا قومی ترانہ بن گیا ہے

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی ✽ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

چنانچہ ملک کے ان تمام کھیتوں کو جن سے دہقانوں کو روزی نہیں مل رہی تھی ہم نے چن چن کر جلا دیا ہے۔ اب ہمارے پاس صرف وہی کھیت باقی رہ گئے ہیں جن سے بڑے بڑے شہر کے معزز باشندوں کو روٹی ملتی ہے۔ ہم آپ کو ایسے عظیم رہنما کے صد سالہ جشن منانے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں"۔ ادھر ہم نے پیام مکمل کیا اُدھر ڈاکٹر صاحب پر غشی طاری ہوگئی۔ ہم نے فوراً فریج میں سے ٹھنڈا پانی لاکر اُن کے چہرہ پر چھڑکا تو انھوں نے آنکھیں کھولیں اور مدھم آواز میں فرمایا۔ "بھائی صاحب میں پھر آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ ہم پر یہ کرم نہ کرتے تو بڑا احسان ہوتا۔ صرف پیامات پڑھ کر میرا یہ حال ہوگیا ہے۔ نہ معلوم آپ کے اقبال صدی منانے تک مجھ پر کیا گزرے گی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ایک مقام پر اقبال ڈے منایا گیا۔ ایک سیاسی رہنما نے اپنی تقریر میں فرمایا۔ "ڈاکٹر اقبال سرجری کے بہت بڑے ماہر تھے۔ جرمنی سے انھوں نے ڈاکٹری کی ڈگری لینے کے بعد اپنے ملک میں آکر بڑے بڑے آپریشن کر دیئے۔ دماغ کے آپریشن میں تو اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ افسوس کہ وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔ ورنہ نہ صرف میں بلکہ میرے ساتھ جتنے سیاسی رہنما ہیں اپنے اپنے دماغ کے آپریشن کروالیتے جس سے ہمارے دماغوں میں ایسی روشنی آجاتی جس سے سارا ملک جگمگا اٹھتا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑے لیڈر کا دماغ نکال کر انھوں نے دوسرا دماغ لگا دیا جو ایک شخص نے مرتے وقت عطیہ کے طور پر دیا تھا۔ اس کے بعد جو آنکھوں کا عطیہ دینے کا سلسلہ چل پڑا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں"۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ "میاں کیا عرض کروں۔ ایک خودساختہ عالم جن کو لوگ "علامہ تحتانیہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنے والد کی مار پیٹ اور ظلم و زیادتی کی وجہ سے پندرہ سال کی عمر میں ایک تحتانوی مدرسے میں درجہ دوم تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ تو ان کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ورنہ وہ چوتھی جماعت بھی ضرور کامیاب کر لیتے۔ اُن علامہ نے اسی اقبال ڈے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ "ویسے تو ملک میں میرے سوائے کوئی ایسا علامہ نہیں، جو میری برابری کرسکے مگر مجھے بھی یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ علامہ اقبال مجھ سے بڑے علامہ تھے۔ بالِ جبریل اُن کی علمی تحقیق اور محنتِ شاقہ کا کارنامہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جبریل کے پر اتنے بڑے ہیں کہ ایک پر آسمان کے ایک اُفق کو چھوتا ہے تو دوسرا پر دوسرے اُفق کو چھوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی ساری زندگی اِسی کوشش میں گزار دی کہ جبریل کے پر کا کوئی حصہ حاصل کریں اور اِس کوشش میں جبریل کے بال و پر میں سے اُن کے ہاتھ ایک بال آگیا۔ اس بال کے متعلق انھوں نے اپنی کتاب "بالِ جبریل" میں اپنی جدوجہد کے علاوہ جبریل کے اس "بال" کے بارے میں ایسے روحانی کمالات کا ذکر کیا ہے جن کو پڑھنے اور سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ خصوصیات انداز کی اس کتاب کو پڑھ کر اس میں جو روحانی خزانے پوشیدہ ہیں اُن کو آپ کے سامنے رکھوں۔ یہ کام محمد اسمٰعیل میرٹھی کی چوتھی کتاب جو ابھی میرے زیرِ مطالعہ ہے پڑھ لینے کے بعد ضرور کروں گا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ علامہ اقبال کی

اس کتاب کو سمجھنے والا میرے سوائے ملک میں کوئی اور علامہ نہیں ہے" اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر نبانی نے ارشاد فرمایا کہ "اب آپ ہی بتائیے کہ میں کونسا بڑا سرجن تھا اور کو لنسے آپریشن کئے۔ اور جبریل کا پر کہاں سے حاصل کیا" اتنا کہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے ہم نے اتنا سن کر بے اختیار کہا "ڈاکٹر صاحب واقعی آپ کے ساتھ بڑا ظلم ہوا۔ علامہ تحتانیہ کی بات تو چھوڑ دیجئے البتہ دوسرے لوگوں کی جہالت اور لاعلمی سے آپ کو بڑا دکھ پہنچا۔ ان نا ہنجاروں کو اتنا نہیں معلوم کہ آپ سرجری کے ڈاکٹر نہیں بلکہ بہت بڑے فزیشین (PHYSICIAN) تھے۔ ڈاکٹر صاحب میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی مریض کا آپ نے آپریشن نہیں کیا۔ آپ تو صرف انجکشنوں اور دواؤں سے ایسے ایسے کامیاب علاج کئے ہیں کہ وہ امراض بھی جو بغیر آپریشن کے دفع نہ ہوسکتے تھے آپ نے صرف ٹیابلیٹ اور کیپسول استعمال کروا کر دور کر دیئے" یہ کہہ کر جب ہم نے فاتحانہ انداز میں ڈاکٹر صاحب پر نظر ڈالی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ہم نے جان لیا کہ حقیقت میں ہم نے اُن کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ جس سے وہ بیحد متاثر ہوگئے ہیں۔ جب ہم نے داد طلب نظروں سے اُن پر نظر ڈالی تو انہوں نے آنسو صاف کئے اور فرمایا۔ "بھائی صاحب میں نہ تو سرجن تھا نہ فزیشین اور نہ کوئی روحانی علامہ بلکہ میں تو صرف "شاعر" تھا"۔ ہم نے حیرت کے ساتھ کہا۔ "اوہو تو آپ شاعر تھے؟ قبلہ معاف فرمائیے اچھا کیا جو آپ نے یہ بتلا دیا۔ اب میں آپ کو دنیا کے سامنے شاعر کے روپ میں روشناس کراؤں گا۔ اور ثابت کر کے دکھا دوں گا کہ آپ "میراجی" سے بھی بڑے شاعر تھے۔ "میراجی" نے تو آپ کی نقالی کی ہے ورنہ کہاں آپ اور کہاں میراجی۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک"۔ یہ سن کر تو ڈاکٹر صاحب بے ہوش ہوکر کرسی پر سے گرنے کے قریب تھے کہ ہم نے سنبھال لیا! کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو شاعر مشرق نے آخری بار ارشاد فرمایا۔ "بھائی صاحب۔ اب تک لوگوں نے ہم پر جو احسان کیا ہے اس سے ہمارا یہ حال ہوگیا ہے۔ اب آپ سے آخری التجا ہے کہ آپ بھی "ہم پر احسان جو نہ کرتے" تو یہ آپ کا احسان ہوتا۔" اتنا کہنے کے بعد علامہ اقبال رفتہ رفتہ ہوا میں تحلیل ہوگئے اور ہم جیسے کسی خواب سے جاگے۔ اِدھر ہم نے آنکھ کھولی اور ادھر مرغ سحر نے بانگ دی تو لوگوں سے سنی ہوئی یہ بات بھی یاد آگئی کہ علامہ اقبال کی "بانگ درا" کی رسم اجرا بھی انجام نہیں دی گئی تھی۔ ہمیں اس بات پر بہت افسوس ہوا کہ جس "بانگ درا" سے علامہ اقبال نے لوگوں کو خواب غفلت سے جگایا تھا۔ اب ہم اقبال صدی کے موقع پر اس کی رسم اجراء بھی انجام دے دیں گے!!

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا چلنا مدام چلنا

کیونکہ یہی ڈھنا ہوا ہے کہ ؎
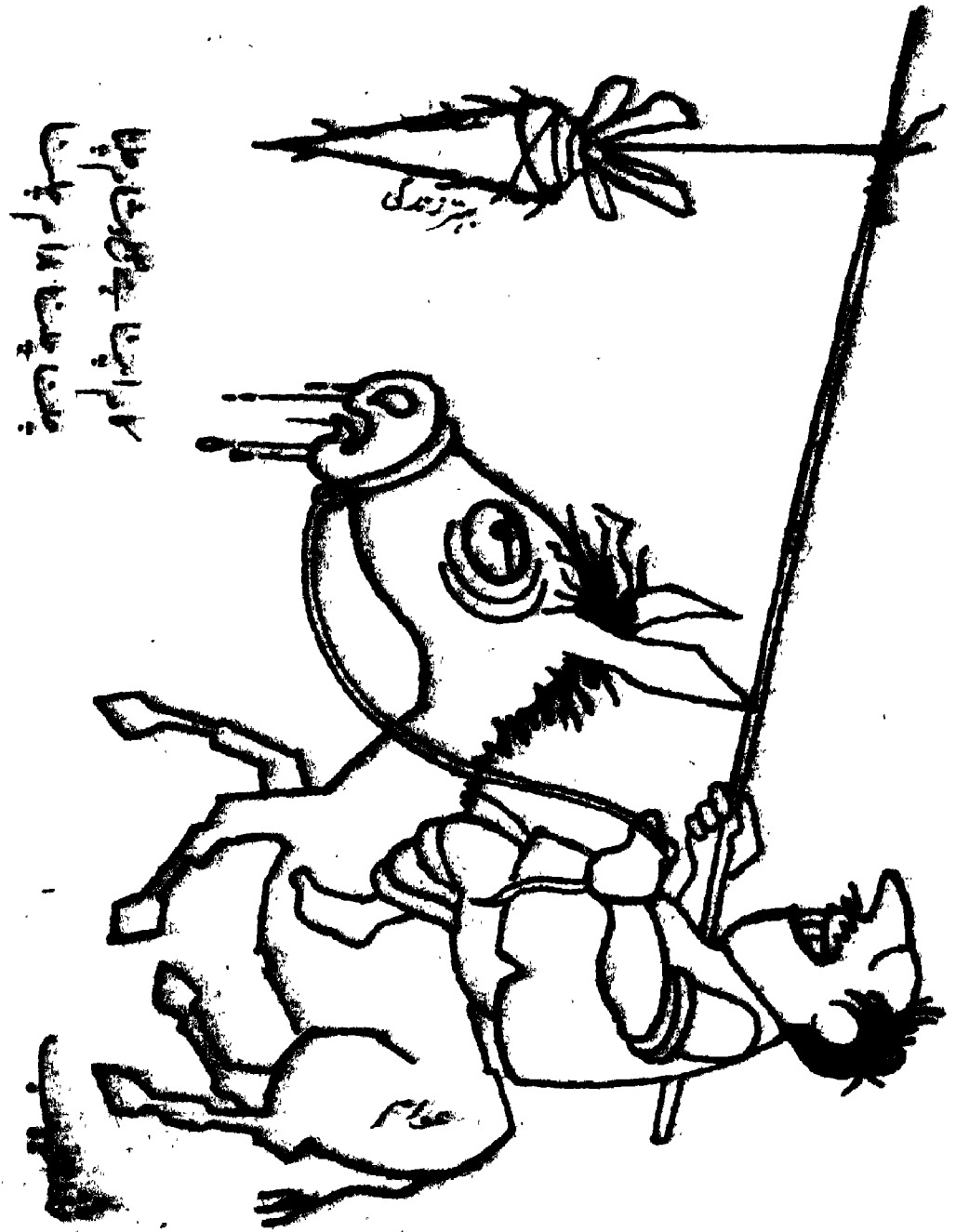
آج "یہ" کل ہماری باری ہے !!

یہاں ہمیں ایک لطیفہ نما واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک مرتبہ ایک خودساختہ جشن کمیٹی کے ممبران چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک صاحب حیثیت شخص کے در دولت پر پہنچے، جو اتفاق سے طنز نگار بھی تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مطلب کی بات پر آئے اور حرف مدعا بیان کرنا شروع کیا۔ "دراصل ہم لوگ شاعر اعظم حضرت فاختہ چڑیا کوٹی کے دوسو سالہ جشن کے سلسلے میں آپ کو تکلیف دینے حاضر ہوئے ہیں۔"

طنز نگار نے فوراً جملہ ایک کر فرمایا۔ "کیا آپ کے فاختہ صاحب پچھلے دوسو برس سے بدستور زندہ ہیں۔" اس عجیب غریب سوال پر ممبران جشن کمیٹی کا سٹپٹانا لازمی تھا تاہم ایک عدد ممبر کہ جو صدی تقاریب منانے میں ماہر تھا، طنز نگار کے راست طنز کو بھانپتے ہوئے بولا۔ "حضور کا مذاق سر آنکھوں پر۔ فاختہ صاحب آپ کی ہماری طرح یقیناً زندہ نہیں ہیں لیکن "ادب" میں بدستور زندہ ہیں !"

طنز نگار نے فوراً چوٹ کی۔ "اور اب آپ حضرات جشن مناکر ان کی "ادبی موت" کا اہتمام کرتے جارہے ہیں۔!!"

اس سے پہلے کہ "تقریب پسند" حضرات ہم پر اس بے ضرر تمہید پر تنقید کا الزام عائد کریں خدا کو حاضر وناظر جان کر لطیفہ کہتے ہیں کہ صدی تقاریب کے ہنگاموں سے ہمیں قطعی کوئی بغض نہیں، حالانکہ اس صدی میں پیدا ہونے کی پاداش میں صدی تقاریب کی سرکاری و نیم سرکاری "چکی" میں ہم بھی اسی طرح پس رہے ہیں جس طرح گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتا ہے۔ اس کے باوجود پورے خشوع و خضوع کے ساتھ صدی تقاریب کے خشک اجلاسوں اور سیمیناروں عجیب الخلقت مشاعروں میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ حسب استطاعت خوش بھی ہوتے ہیں صدی تقاریب کے ہنگاموں میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان میں حصہ لینے والے مقررین، مندوبین حتیٰ کہ منتظمین کی پوزیشن بھی جس قدر محفوظ ہوتی ہے بے چارے سامعین اور "متعلقہ شخصیت صدی" کی پوزیشن اسی قدر غیر محفوظ ہوتی ہے۔

صدی تقاریب کے بانس پر عموماً انہی ادبی شخصیتوں کو چڑھایا جاتا ہے جن کا جسد خاکی یقیناً فانی ہوتا ہے لیکن ان کے کارہائے نمایاں لافانی ہوتے ہیں اور اردو ادب کی تاریخ میں کم از کم دو عدد شاعر ایسے ضرور ہیں جنھیں یہ رتبۂ بلند حاصل ہے، ایک مرزا غالب دوسرے علامہ اقبال ــــ چنانچہ غالب صدی کا غلغلہ جیسے ہی ماند پڑا "تقریبی کارروائیوں" کے دلدادہ حضرات نے علامہ اقبال کا "گھیراؤ" شروع کردیا۔ ایک روزہ، دو روزہ، سہ روزہ پروگرام تشکیل دیئے گئے نتیجتاً علامہ اقبال کے ساتھ وہ مقالہ نگار حضرات بھی گردش میں آگئے جو فکر اقبال، ذکر اقبال، فلسفۂ اقبال، کلام اقبال، پیغام اقبال کی روح تک اپنے عمیق مطالعہ، مشاہدے خلوص اور لگن کی سیڑھیوں کی مدد سے پہنچنے میں کامیاب ہوچکے ہیں، ان حضرات کی شمولیت نے یقیناً اقبال صدی تقاریب میں چار چاند لگا دیئے لیکن بدقسمتی سے ان "ماہر اقبالیات" کے شانہ بہ شانہ ایسے "اقبالی مجرم" بھی "چھاپہ مار" دستوں کی طرح ان تقاریب میں در آئے جو کلام اقبال کی تفسیر تو دور، علامہ کے نام کے ہجے بھی برابر نہیں کرسکتے بلکہ اقبال کو "اکبال" کہتے ہیں ــ اقبالیات کے چمن میں شاہین کے دوش بدوش زاغ و زغن کو یوں کھلے عام اٹکھیلیاں کرتے دیکھ کر ہر اقبال پسند، "تصویر حیرت" بن کر رہ گیا ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے ملک کے طول و عرض میں منائی جانے والی صدی تقاریب، کے پروگراموں میں ہم نے اپنی چشم گنہگار سے علامہ اقبالؔ سے زیادہ خود ساختہ اقبال شناسوں، اقبال فہموں اور اقبالیچیوں، کو "سرکولیشن" میں دیکھا اور کمال یہ کہ ہر مقالہ نگار، ہر مقرر کو ان تعریفی کلمات کے ساتھ سامعین کے روبرو پیش کیا جاتا کہ ڈاکٹر، پروفیسر فلاں ابن فلاں کی علامہ اقبالؔ پر گہری نظر ہے' آپ نے اپنے دن کا چین' رات کی نیند' تفہیم اقبال کے لیے وقف کر دی ہے ___ گویا جو بھی مقرر، مقالہ نگار، دانشور پڑتا اسی دعوی کے ساتھ آتا کوئی بھی خدا کا بندہ بے چارے علامہ اقبال پر "اچٹتی" سی نظر ڈالنے کو تیار نظر نہیں آتا ___ ہم ایک ایسے پروگرام کے چشم دید گواہ ہیں جو مقامی اردو اکادمی کے زیر اہتمام نہایت ہی اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا تھا' اعلیٰ پیمانے" کا دم چھلہ ہم نے اس لیے لگایا کہ اس کا افتتاح اردو اور اقبالؔ دونوں سے نابلد مقامی وزیر اعلیٰ نے فرمایا تھا اسی پروگرام میں ایک مقالہ نگار نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ علامہ اقبالؔ چائے کے بڑے شوقین تھے' بالخصوص "بڈٹی" (bed-tea) ان کی کمزوری تھی، اور جس روز "بڈٹی" کے ساتھ نمکین بسکٹ بھی مل جاتے اس روز وہ شرطیہ ایک شاہکار نظم قلم بند کر لیتے تھے ___ اس انکشاف کے ساتھ فاضل مقالہ نگار نے پتہ نہیں بے خیالی میں یا پھر جان بوجھ کر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک عدد بسکٹ کا پیکٹ نکالا جو موصوف نے یقیناً عصرانہ کے موقع پر ٹیبل سے غائب کیا تھا' پھر بڑے دھڑلے سے پیکٹ پھاڑ کر "کُرمُر کُرمُر" کرارے اور نمکین بسکٹ چبانے لگے' موصوف کی اس غیر شائستہ حرکت پر سامعین میں سے کسی دل جلے نے ان کی طرف جملہ اچھالا ___ " جناب عالی' اپنے مقالے کا جو عنوان آپ نے سنایا "علامہ اقبالؔ کی شاہکار نظمیں" اس میں اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ علامہ اقبال کی شاہکار نظموں میں نمکین بسکٹوں کا عمل دخل"۔

اگلا مضحکہ خیز واقعہ بھی' اسی اعلیٰ پیمانے والے پروگرام میں پیش آیا' غالباً اجلاس دوم یا سوم شروع ہوا ہی تھا کہ ایک عجیب و غریب سامع تشریف لائے اور ہمارے پہلو میں گھس کر اسٹیج پر جلوہ افروز شخصیتوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "بھائی صاحب ان میں' اکبال' صاحب کون ہیں ___ ؟

ہم نے حیرت سے پوچھا ___ "کون اکبالؔ صاحب ؟

" الامہ اکبال۔ اور کون"، موصوف نے بڑی حقارت سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر مزید فرمایا "کمال ہے آپ اکبالؔ صاحب کو نہیں جانتے' اپنے آنجہانی سنگیت کار مدن موہن جی نے اکبال صاحب کو فلموں میں انٹروڈیوس (introduce) کروایا تھا' کیا آپ نے وہ "پریسدھ" قوالی نہیں سنی نظم "دلہن ایک رات کی" والی "کبھی اے حکیکت منتجر نجر آ لباس مزاج میں " ___ اکبال صاحب ہی نے تو لکھی تھی یہ قوالی ___ مگر اس کے بعد پتہ نہیں کیوں اکبال صاحب نے اور گیت نہیں لکھے۔ موصوف کے اس نامعقول انکشاف پر ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا' پھر بھی ہم نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا ___ "آپ علامہ اقبالؔ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں ___ ؟ وہ الفاظ چبا چبا کر بولے۔ " دراصل میں جھمن جھجھو آرٹ پروڈکشنز کا پروڈکشن منیجر ہوں ہمارے سیٹھ جی اپنی اگلی فلم کے گانے اکبال صاحب سے لکھوانا چاہتے ہیں آپ کی بڑی کرپا ہوگی مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ ان لوگوں میں اکبال صاحب کون ہیں" ؟

ہم نے سنجیدگی سے کہا۔ ان میں آپ کے اکبال صاحب کوئی نہیں ___ ؟

حیرت سے بولے ___ "کمال ہے اکبال صاحب کے پروگرام میں خود اکبال صاحب ندارد' خیر آپ مجھے ان کا اتا پتا ہی بتا دیجیے ___ ؟ اب چونکہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اس لیے اکبال صاحب کے موجود ہونے کے سلسلے

میں ہم نے جھمن جھمن آرٹ پروڈکشن کے "جھمن جھمنے" عرف پروڈکشن منیجر کو اکادمی ہذا کے سکریٹری ڈائرکٹر سے رجوع کر دیا ورنہ جی تو یہ چاہتا تھا کہ ہم خود ان کی اقبال سے ملاقات کا انتظام کرتے۔ بہرحال اس روز پہلی بار ہمیں علامہ اقبال کی شاعری میں چھپے گیت کاری کے جوہر کا اندازا ہوا خدانخواستہ اگر علامہ موصوف آج کے دور میں ہوتے تو طرز تیاگ اہل دنیا، دیکھ کر پتہ نہیں ان پر کیا گزرتی ——!

علامہ اقبال کے تعلق سے رونما ہونے والے نت نئے انکشافات کی بھول بھلیوں میں الجھ کر ہم آپ کو ایک نہایت ہی ضروری بات بتانا بھول گئے، صدی تقاریب کے سیمیناروں میں منتظمین حضرات کم از کم ایک عدد نقاد ایسا ضرور بلاتے ہیں جو تقابلی مطالعے کا ڈبل رول بخوبی نباہ سکتا ہو۔ ایسے ہی دہرے کردار کے ایک نقاد کے تقابلی مطالعے کا نچوڑ آپ کی معلومات عامہ کی خاطر پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں، جو موصوف نے علامہ اقبال اور منشی پریم چند کے مابین کیا، کیوں کہ انہی دنوں پریم چند صدی تقاریب، بھی اسٹارٹ لے چکی تھیں، ملاحظہ فرمائیے تقابلی مطالعہ کی ایک جھلک

محمد اقبال علامہ تھے —— پریم چند منشی۔

علامہ اقبال شاعر تھے —— منشی پریم چند ادیب۔

علامہ اقبال پکے مسلم لیگی تھے —— منشی پریم چند کٹر آریہ سماجی۔

علامہ اقبال کی شاعری فکری شاعری ہے جو انھیں مفکر ثابت کرتی ہے —— منشی پریم چند کے افسانے مفلس و قلاش متفکر ذی روحوں کے گرد گھومتے ہیں جو پریم چند کے مفکر سے زیادہ متفکر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اردو کے شاعر علامہ اقبال شروع شروع میں فارسی کی طرف مائل رہے —— اردو کے ادیب منشی پریم چند آخر آخر میں "ہندی" کے قائل بلکہ گھائل ہو گئے تھے۔

علامہ اقبال نے فارسی آمیز اردو میں شاعری کر کے اردو شاعری کا اقبال بلند کیا —— منشی پریم چند جیسے چند ہی ادیب ہوں گے جنھوں نے بڑے پریم سے اردو آمیز افسانوں کے انبار لگا کر ہندی ساہتیہ، کو مالا مال کیا۔

علامہ اقبال آخر آخر میں "سر" ہو گئے تھے —— منشی پریم چند آخر آخر میں خود "سر" ہو گئے تھے۔

جیسے ہی یہ تقابلی مطالعہ ختم ہوا سامعین میں سے کسی نے جملہ پھینکا "حضور یہ تقابلی مطالعہ تھا یا تعصبی مطالعہ!!"

قصہ مختصر یہ کہ اقبال صدی تقاریب کے مختلف النوع پروگراموں اجلاسوں اور سیمیناروں میں شرکت کے نتیجے میں کئی بار شہادت کی سعادت سے بال بال بچنے کے بعد ہم جیسے کم علم لوگوں کو یہ عرفان ہوا کہ علامہ اقبال کی شاعری جتنی اعلیٰ ارفع اور مستند ہے ان کی "ذہنیت" اتنی ہی مشکوک ہے، ہند و پاک کے دانشوروں شاعروں ادیبوں اور ادب نوازوں نے اپنی اپنی جگہ یہ بلند بانگ دعوے کئے کہ اقبال صدی تقاریب کا جو زور و شور اِدھر ہوا، اُدھر نہیں ہوا، گویا اِدھر والوں نے اُدھر والوں کا اور اُدھر والوں نے اِدھر والوں کا خوب منہ چڑایا البتہ دونوں جانب کے "جانب داروں" نے اپنے اپنے دانشوروں کی خوب ٹانگ کھینچی، اُدھر والے غیر جانب داروں نے فرمایا اقبال کے نام پر اس قدر شور و غل کیوں مچاتے ہو ان پر تو سرحد پار والوں کا زیادہ حق ہے کیا بھول گئے، خود علامہ نے اپنی زبان میں کہا تھا — "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

جبکہ ادھر والے غیر جانبداروں نے اعتراض کیا۔ علامہ اکبال کے نام کی اس قدر مالائیں جپتے ہو وہ تو تحریکِ پاکستان کے بانیوں میں سے تھے۔ الغرض صدی تقاریب کے بہانے علامہ اقبال کے تعلق سے کافی تنازعے کھڑے ہوئے بلکہ کھڑے کئے گئے۔ (یوں بھی برصغیر ہند و پاک کے فتنہ گر اربابِ حل و عقد اپنی کمزوریوں کی طرف سے عوام الناس کی توجہ کو ہٹانے کے لیے یا تو تنازعے بپا کرتے ہیں یا پھر الکیشن)۔

صدی تقاریب کے بہانے جہاں چھوٹے بڑے اداروں، انجمنوں اور اکادمیوں نے تفہیمِ اقبال، تشہیرِ اقبال، ترویجِ اقبال اور ترسیلِ اقبال میں اپنے اپنے وسائل کو بروئے کار لاکر اپنے "بجٹ" کو ٹھکانے لگانے کی بھرپور سعی کی، وہیں اقبال کے مستقل اور عارضی دونوں طرح کے مداحوں نے انفرادی سطح پر اپنے اپنے شوق، اپنی اپنی پسند اور دلچسپیوں کے مطابق کلامِ اقبال کو نئے نئے معنی پہنائے، نئے نئے گوشے تلاش کئے مثلاً ہمارے ایک پڑوسی جو اپنی کرکٹ شناسی کی وجہ سے محلے بھر میں "مسٹر گگلی" کے نام سے مشہور ہیں، صدی تقاریب کی "جھپٹ" میں آکر "اقبال شناسی" کے کرب میں مبتلا ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرکٹ شناسی اور اکبال شناسی، دونوں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے۔ چنانچہ ایک دن علامہ اقبال کے تعلق سے بہ بانگِ دہل یہ انکشاف فرمایا کہ علامہ کرکٹ کے زبردست شیدائی تھے، اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے ولایت جانا تو محض بہانہ تھا اصل میں "کاؤنٹی کرکٹ میاچ" علامہ کی کمزوری تھے چنانچہ شاعرِ مشرق نے مغرب کے اس مقبول ترین "اسپورٹ" عرف کرکٹ سے متاثر ہو کر ہی یہ شعر موزوں فرمایا تھا ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　　لہو گرم رکھنے کا ہے یہ بہانہ

یہ تو خیر علامہ کے ایک عارضی مداح کے "وقتی دورے" کا ذکر ہوا آئیے اب ایک ایسے شناسا کی اقبال شناسی کا احوال بیان کرتے چلیں، جو خیر سے اردو کے استاد بھی ہیں، یہ اور بات کہ تقرر کی تاریخ سے لے کر تادمِ تحریر "لیکچرر" کے عہدے پر بڑے ہی استقلال سے فائز ہیں جبکہ موصوف کے بیشتر شاگرد ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے 'ریڈر' (Reader) بھی ہو چکے چنانچہ قریبی احباب انہیں یہ کہہ کر چھیڑنے لگے — کتنی شرم کی بات ہے، تمہارے شاگرد تک پی۔ ایچ۔ ڈی کرکے 'ریڈر' ہو چکے اور ایک تم ہو کہ یونیورسٹی کے اربابِ مجاز تمہیں اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ "پروف ریڈر" ہی بنا دیں۔ ان چھیڑ کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ موصوف نے بالآخر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی ٹھانی اور اس کے لیے ظاہر ہے، علامہ اقبال کو اپنے نام الاٹ کروالیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن ہے، خود کو اقبال پر "اتھارٹی" سمجھنے لگے ہر چیز کو اقبالیات کی عینک سے انکا شروع کر دیا، ہر بات میں اقبال شناسی کے دریا بہانے لگے، جب نیا مکان تعمیر کے مراحل سے گزر کر جناب کی تحویل میں آیا، اس کا نام علامہ اقبال کے مجموعہ کلام کے نام پر "بانگِ درا" رکھا، انتہا یہ کہ حالیہ عرصے میں محلے کی پرانی مسجد کے ٹرسٹیوں کا از سرِ نو انتخاب ہوا، اور غلطی سے آپ کو چن لیا گیا تو پہلا کام یہ کیا کہ مذکورہ مسجد کو "مسجد قرطبہ" کے نام سے موسوم کرکے اقبال شناسی کا ایک اور ثبوت فراہم کیا۔ ایک طرف تو اقبالیات کے باب میں اسراف کا یہ عالم تھا کہ ہر سماں شما کا اقبال بلند کرتے جا رہے تھے جبکہ دوسری طرف پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں کفایت شعاری بلکہ کنجوسی کا یہ حال تھا کہ برسوں بیت جانے پر بھی، بات عنوان سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی جب اس سلسلے میں کوئی شامت کا مارا استفسار کرتا تو یہ کہہ کر معترض کا منہ بند کر دیتے کہ دنیا کی کسی یونیورسٹی کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری علامہ اقبال کے حکیمانہ کلام پر قفل بند کیے جانے والے انمول مقالے کے آگے ہیچ ہے — پھر ثبوت کے

طور پر مزید فرماتے "دنیا کی تمام زبانوں کے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں فلاسفروں اور مفکروں کی تحریروں تقریروں اور تخلیقوں کا جائزہ لے لیجئے ان کا دائرہ فکر محض ایک یا زیادہ سے زیادہ دو عدد محوروں کے گرد چکر لگاتا نظر آئے گا جب کہ علامہ اقبال کے دائرہ فکر کے کم از کم تین مرکزی محور ہیں، خودی کی آن، مردِ مومن کی شان اور شاہین کی اڑان"۔ مزید برآں اپنی اس منہ زبانی تحقیق میں وزن پیدا کرنے کے لیے مذکورہ محوروں کے اطراف گھومنے والے اشعار کا حوالہ دے کر کلام اقبال اور سننے والے کا تیاّ دونوں کو شرطیہ پانی کر دیتے ــ!

آخر میں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے ان "برساتی" دعویداروں سے ہم اتنا ہی پوچھتے ہیں کیا واقعی کلامِ اقبال بازیچۂ اطفال ہے؟ کیا سچ مچ حکیم الامت علامہ اقبال کو سمجھنا ان کے کلام کے توسط سے ان کے فلسفہ ان کی فکر، ان کی روح کی گہرائیوں تک پہنچنا اتنا آسان ہے جبکہ خود علامہ اقبال اپنے تعلق سے بڑی ہی عاجزی اور انکساری کے ساتھ یہ فرما گئے ہیں۔ ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں   کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ
خون
قتل
دہشت گردی
فریب
ایجی ٹیشن
تشدد
شعیب
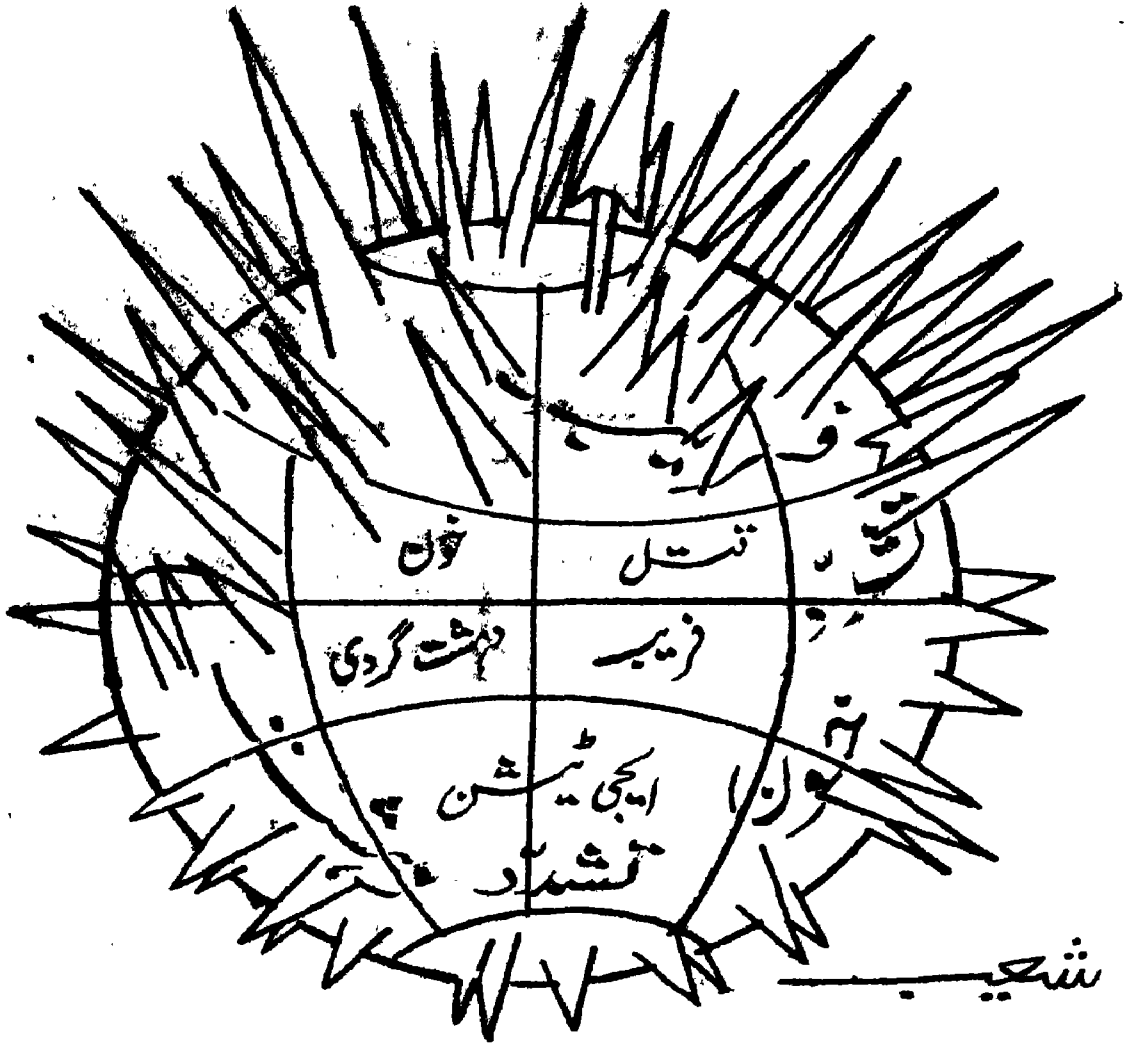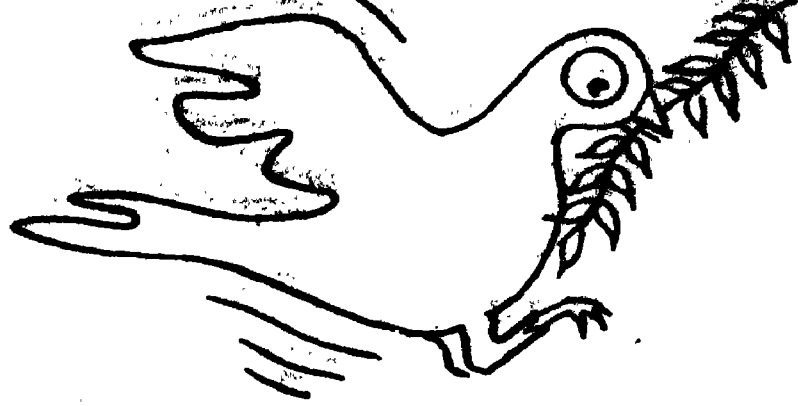
عابد معز
(حیدرآباد)

اقبالؔ ہماری سمجھ میں

بچپن میں ہم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری"۔ نظم شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت ہمیں بتلایا گیا تھا کہ اس "بچوں کی دعا" کو اردو کے ممتاز شاعر اقبالؔ نے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ اس وقت سے ہی ہمارے ذہن نشین یہ بات رہی ہے کہ اقبالؔ بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کا کلام آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسی لیے اقبالؔ کے اشعار کو سمجھنے سے زیادہ انھیں یاد رکھنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ کبھی سمجھنے کی کوشش کرتے بھی تو ناکام رہتے تھے ہمارے استاد محترم کچھ دیر سمجھانے کی کوشش کرتے اور تھک کر کہتے "آگے چل کر تم خود انھیں سمجھنے کی کوشش کرنا"۔ سیانے ہونے کے بعد جب ہم نے اقبالؔ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا، ایک ایک شعر کو سمجھنے کے لیے تاریخ، مذہب، فلسفہ، سیاست، سماجیات اور شاعری کے رموز کا مطالعہ درکار ہے۔ ہم ٹھہرے کم حوصلہ ہمیں وہی شاعری راس آئی جو سننے یا پڑھنے کے بعد سیدھے دل میں اتر جائے جب کہ اقبالؔ کا کلام پڑھنے اور سننے کے بعد دماغ کی راہ سے دل میں اترتا ہے۔ یہ راستہ دشوار کن اور محنت طلب ہے گا ہے ماہے ہم نے یہ راستہ بھی اپنایا ہے منزل ملنے کے بعد ایک نشہ طاری ہو جاتا ہے اس نشہ کا سرور دھری جانے جس نے اقبالؔ کے کلام کو سمجھنے کی محنت بلکہ ورزش کی ہے۔ غرض بچپن میں لاشعوری طور پہ اقبالؔ کے بڑے شاعر ہونے کی حقیقت کو شعور نے ثابت کر دیا۔

ہمارے نزدیک اقبالؔ کی شاعری اردو کی لاج ہے۔ اس تعلق سے ہم ایک واقعہ سناتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست گو کہ ہندوستانی ہیں لیکن انھیں انگریزی زبان سے زیادہ محبت ہے۔ بات بات میں شیکسپیئر، ورڈس ورتھ، ملٹن، کیٹس اور ایلیٹ کا حوالہ بلکہ ان کی نظمیں اور پھر ان نظموں کی تشریح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ خوبی انھیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کی مادری زبان اردو ہے گھر میں بات چیت بھی اردو ہی میں کرتے ہیں لیکن اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ ان کے والد کا خیال تھا کہ اگر بچہ اردو پڑھنے لکھے گا تو اس کا مستقبل تو خراب ہوگا ہی لیکن ساتھ ہی مزاج عاشقانہ ہو جائے گا۔ وہ عشق کرے گا اور زلف گرہ گیر کا شکار ہو کر نکما اور ناکارہ ہو جائے گا۔ اسی لیے ان کے والد نے اردو پڑھنے سے باز رہنے کی نصیحت بلکہ وصیت کی تھی۔ صاحب موصوف اس وصیت پہ

ایک عرصے تک سختی سے عمل کرتے رہے۔ چند دن قبل ہم سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے انگریزی میں انکشاف
کیا "میں سمجھتا تھا اردو شاعری صرف عشق و عاشقی، ملن و جدائی، شراب و کباب اور دغا و بے وفائی کے قصّوں
سے بھری ہے جس میں آنکھ نرگسی پھول جیسی، ناک ستوان جیسی سیدھی، ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے، گردن
صراحی دار کے قصّے ہیں اور تو اور اردو میں صنف نازک اتنی خوبصورت کہ بیان کرنے والے پر ہی دل آجائے بہ

وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے

یعنی کہ تفصیلِ عشق! اتفاق سے مجھے ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا انگریزی ترجمہ ہاتھ لگا۔ میں نے اسے شروع سے
آخر تک پڑھ ڈالا۔ بہت حیرت ہوئی ایسی شاعری جو زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے ان کی شاعری میں ایک فلسفہ بھی ہے
"KHUDI PHILOSOPHY"۔ خودی کو انھوں نے انگریزی میں کھوڈی ادا کیا تھا۔ ہم نے انھیں بتلایا کہ ڈاکٹر
اقبال کا فلسفہ کھوڈی نہیں فلسفہ خودی ہے۔ انھوں نے پھر کھوڈی کہا۔ ہمیں جناب کے فلسفہ کھوڈی کو اقبال کے
فلسفہ خودی کو بنانے کیلئے ڈاکٹر کی طرح ٹارچ اور زبان دبانے کے آلے کی مدد لے کر انھیں "غ" اور "د" کے مخارج بتلانا
پڑے۔ چند منٹوں کی ریاضت کے بعد وہ فلسفۂ خودی کہنے کے قابل ہوئے اور ہانپتے ہوئے کہا "ویل اردو
ہیز بہت STUFF ہے" ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اردو زبان کو اقبال جیسا عظیم شاعر دیا ہے۔

اردو ادب کے خیال کے ساتھ ہی "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث چھڑ جاتی
ہے۔ اردو ادب کا ایک صحیح حصّہ ادب برائے ادب پر مبنی ہے۔ شعراء کا کلام تو بس پوچھئے نہیں ایسی افسانہ
طرازی کہ عقل دنگ رہ جائے۔ مثال کے طور پر ایک مشہور شعر میں صاحب شعر پروانوں کے ناحق خون خرابہ
کو روکنے کے لیے باغ میں مگس کا داخلہ ممنوع قرار دینا چاہتے ہیں۔ ایک اور شاعر صاحب کے خیال میں گلاب
کے پھول کانٹوں کا خون پی کر نکھرتے ہیں۔ ادب برائے ادب کے برخلاف اقبال نے ادب برائے زندگی کو شعار
بنایا اور زندگی کے اہم مسائل سیاست، قومیت، معاشرت حتیٰ کہ مذہب جیسے مشکل موضوع کو اپنے کلام میں اس
کامیابی سے پیش کیا کہ مبلغ مانے جانے لگے۔ ایک مولوی صاحب کو اقبال کے اشعار سناتے ہوئے دیکھ کر ہم
نے شاعری کے حلال ہونے کے تعلق سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا تھا "صرف اقبال کی شاعری جائز ہے"۔

ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ اردو زبان کے بہت کم شاعر انسان ہوتے ہیں۔ اقبال ایک کامیاب
اور مکمل انسان تھے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر تو ہیں ہی، فلسفہ پر عبور حاصل کیا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور ڈاکٹر اقبال
ہوئے، بیرسٹری مکمل کرنے تا قانون داں کہلائے، طالب علموں کی پیاس پروفیسر بن کر بجھائی، حکومت وقت نے
ان کی ہمہ وقت کی ہمہ رنگی خدمات کا صلہ "سر" کا خطاب دے کر دیا اور وہ سر اقبال کہلائے گئے، قومی اور
سیاسی مسائل پر نظمیں لکھیں تو قومی شاعر کہلائے گئے، مغربی شعراء کا جواب دیا تو شاعر مشرق بنے اور مذہبی خیالات
اور کلام کی بدولت علامہ اقبال کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اپنی اپنی دوڑ کے مطابق لوگ انھیں مختلف القاب
سے یاد کرتے ہیں۔ کسی کے لیے وہ علامہ اقبال ہیں تو کسی کے لیے شاعر مشرق ہیں۔ کوئی انھیں ڈاکٹر اقبال کہتا ہے تو
کوئی سر محمد اقبال۔ موکلین کے لیے بیرسٹر اقبال تو طالب علموں کے لیے پروفیسر اقبال، پنجابیوں کے لیے پنجابی
اقبال تو لاہور والوں کے لیے لاہوری اقبال بہرحال جس کی جیسی سمجھ اس کی ویسی بات۔ جس طرح اقبال کی شخصیت
ہمہ رنگی تھی ویسی ہی شاعری کا بھی ہمہ رنگی ہے۔ جن کی جیسی سمجھ اور مطلب اُسے وہ کلام پسند آیا اور جنھیں کچھ

پتے نہ پڑا انھوں نے کہا کہ اقبالؔ کی شاعری اور شخصیت میں تضاد ہے۔ ہمارے ایک ڈاکٹر دوست نے اقبالؔ کے ایک مصرعہ پہ اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ اقبالؔ کا مصرعہ ہے "عمل سے زندگی بنتی ہے . ." ڈاکٹر دوست عمل کے بجائے "عمل سے زندگی بنتی ہے . ." پڑھتے ہیں۔

ہمارے ملک کی سیاسی و سماجی زندگی میں اقبالؔ کے ترانہ ہندی کو مختلف طرح سے سمجھا جاتا ہے۔ پہلا شعر "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا . ." کی تشریح سیدھی سادی ہے۔ یہ شعر ہر کسی کے سمجھ میں آسانی سے آجاتا ہے لیکن اس شعر کو ہمارے ملک میں شیروانی اور اردو کی طرح برتا جاتا ہے۔ جب کبھی اردو والوں کو پھسلانا ہو، ان سے ووٹ مانگنا ہو یا پھر اقبال کی مداح کرنا ہو تو یہ شعر پڑھا جاتا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے کبھی تحت اللفظ تو کبھی ترنم سے پڑھا جاتا ہے۔ ہم نے مختلف لوگوں کو مختلف تلفظ اور شعر کو غلط پڑھتے ہوئے اتنی مرتبہ سُنا ہے کہ اب جب بھی کسی کی گفتگو پر "ہندوستان ہمارا" کا گماں ہوتا ہے تو غرض مدعا خود بخود ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسی معرکۃ الآرا نظم کا ایک مصرعہ ہے "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" اس مصرعہ کو بھی لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے برتا ہے۔ ایک قائد کا خیال ہے کہ ہندی سے مُراد ہندی زبان ہے۔ انھوں نے بہت دور کی کوڑی لائی۔ وہ کہتے ہیں ہندی کا وطن ہندوستان ہے یعنی ہندوستان میں جو زبان بولی جاتی تھی اور ہے وہ ہندی ہے۔ اُردو زبان کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ اور تو اور اقبالؔ بھی ہندی زبان میں شاعری کیا کرتے تھے بعد میں فرقہ پرست لوگوں نے ہندی میں تصرف کرکے اس سے ایک اردو زبان کی شاخ پیدا کرلی ہے!

شاہین اپنی خصوصیات کی وجہ سے اقبالؔ کا محبوب پرندہ رہا ہے۔ انھوں نے بارہا اپنی شاعری میں شاہین کی تشبیہ دی ہے۔ اقبالؔ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک کھمبے پر شاہین بناکر شہر بھوپال (وہی بھوپال جس پر گیس کا عذاب نازل ہوا تھا) میں نصب کیا گیا۔ اقبال شناس لوگوں کو اعتراض ہوا ؎

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر　　　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

یہ تو شاہین ہے اس کا بسیرا تو پہاڑوں اور چٹانوں میں ہونا چاہیئے۔ اقبالؔ خود فرما گئے ہیں۔ اس کا آبادی میں کیا مقام اور کام ہے۔ اگر آپ کو اقبال کی یاد میں شاہین نصب کرنا ہی ہے تو شاہین کو بلند چٹانوں اور پہاڑوں پر لے جائیے جہاں اقبالؔ اپنی خودی کو بھی تقدیر سے پہلے بلند کرنا چاہتے تھے۔ اس قسم کا حشر ہمارے دانشوروں کے ساتھ ہوتا ہی ہے۔ غالبؔ کی مثال لیجئے جن کے گھر میں آج کل لکڑی کی ٹال ہے سنتے ہیں دیوان غالب میں لکڑیوں کو لپیٹ کر بیچا جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ہمارے شعرا اور دانشوروں کی خودی اتنی بلند نہیں ہوئی ہے کہ ان کے اثاثہ کو قومی اثاثہ تسلیم کیا جائے۔

ہمارے درمیان بعض ایسے حضرات بھی ہیں جو اقبالؔ کے کلام کی بدولت اپنی قابلیت کی دھونس جماتے ہیں۔ ان حضرات کا پسندیدہ شاعر اقبالؔ ہے۔ موقع بے موقع اقبال کے شعر پڑھتے ہیں۔ اردو اشعار سے زائد فارسی اشعار سنانا ان حضرات کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ اقبالؔ کی زندگی کی اہم تواریخ یاد رکھتے ہیں ان موقعوں پر کچھ نہ کچھ کرکے اقبالؔ کی یاد دلاتے ہیں۔ ایسے لوگ اٹھتے بیٹھتے اقبال کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اقبالؔ، اردو زبان [illegible] سے زیادہ خود فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے ایسے حضرات کے لیے "اقبالچی" کا

اصطلاح بنائی ہے۔ ایک اقبالچی نے اقبال کا مشہور شعر ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ؛ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کی تشریح کچھ اس طرح کی تھی ہر انسان کی تقدیر لکھی جا چکی ہے۔ لیکن اللہ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں جن کی تقدیر کورے کاغذ کی طرح ہوتی ہے اور یہی لوگ کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ یہ لوگ جب زندگی میں کامیاب ہو جاتے ہیں تب خدا ان سے پوچھ کر ان کی تقدیر لکھتا ہے۔

یہ تو جناب اپنے اپنے مطلب کی عام سمجھ تھی۔ اقبال کی ذات وصفات اور شاعری کو سمجھنے کے لیے جن دانشوروں نے کوشش کی ہے انھیں ماہر اقبالیات کہا جاتا ہے۔ بڑے بڑے معرکۃ الآرا مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ماہر اقبالیات دوسرے نقادوں سے اپنے آپ کو بہتر وبرتر سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اقبال صرف ان کی سمجھ میں آتا ہے۔ دوسرے لوگ بس انھیں سمجھ لیں یہ کافی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اقبال بہ آسانی سمجھ میں آگئے لیکن ماہر اقبال ہماری سمجھ سے باہر ہو گئے۔ ماہر اقبالیات نے اقبال پر مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کے کلام پر دوسرے شعراء کا اثر ڈھونڈا گیا۔ گو حضرت داغ اقبال کے استاد تھے لیکن ان کا اثر صرف چند ابتدائی غزلوں تک محدود رہا۔ جب پوری طرح سے استاد کا اثر ثابت کرنے میں ناکام ہوئے تو اقبال کے کلام کے شایانِ شان اثر کے لیے غالب اور میر کے کلام سے ناطہ جوڑا گیا۔ آخر طے پایا کہ اقبال نے اپنے پیش رو شعراء کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اپنا ایک منفرد طرز اختیار کیا جو انھیں اردو کے صفِ اول کے شعراء غالب اور میر کے ساتھ لا کھڑا کرتا ہے۔

جب یہ طے پایا کہ اقبال صفِ اول کے شاعر ہیں تو ماہر اقبالیات کی دوسری سوچ شروع ہوئی! اقبال کا کلام زیادہ تر فلسفیانہ، صوفیانہ، مذہبی، سیاسی، قومی اور ملی مسائل پر مبنی ہے ان کی کونسی حیثیت کو مقدم مانا جائے بہ حیثیت شاعر، فلسفی، مبلغ، صوفی یا محبِ وطن اقبال۔ کسی نے اقبال کے فلسفہ کو سراہا تو کوئی شاعری کا مداح ہے کسی کو مذہبی کلام پسند ہے تو کسی کو وطن کی شان میں لکھی گئی نظمیں بھلی لگیں۔ غرض مختلف حیثیتوں سے اقبال کو منفرد اور ممتاز شاعر تسلیم کرنے کے بعد ماہر اقبالیات، اقبال کا تقابل مغربی شعرائے سے کرتے ہیں۔ ایک ماہر اقبالیات کہتے ہیں۔ اقبال خود ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس کو نظر انداز کرتے ہوئے

کہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

خود مغرب کے شعراء کے مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے تھے۔ انھوں نے گوئٹے کے سلام مغرب کا جواب پیام مشرق لکھ کر دیا۔

ماہر اقبالیات کہتے ہیں ہم اردو والوں کو اقبال کو سمجھنے میں دشواری اس لیے بھی پیش آتی ہے کہ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ اقبال نے شاعری کی ابتداء اردو میں اور انتہا فارسی میں کی ہے۔ اردو سے زائد فارسی زبان کا کلام ہے۔ ماہرینِ اقبالیات اس نکتہ پر بھی غور کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں شاعری کیوں کی؟ کسی کا خیال ہے کہ وہ اپنے خیالات ہندوستان کے باہر پہنچانا چاہتے تھے لیکن بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال شاعر سے زیادہ فلسفی تھے۔ انھیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اردو زبان ناکافی محسوس ہوئی تو انہوں نے فارسی زبان کا سہارا لیا۔

ماہرینِ اقبالیات مختلف گوشوں سے اقبال کے کلام کا احاطہ کرتے ہیں کوئی ماہر فلسفہ خودی ہے تو

کوئی شکوہ اور جواب شکوہ پر اتھارٹی ہے۔ کوئی اقبال کی اردو شاعری میں یکتا ہے تو کوئی فارسی شاعری پر عبور رکھتا ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے کئی ماہرین درکار ہیں اس لیے کہ ماہرین اقبالیات بہت کچھ پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کے باوجود اعتراف کرتے ہیں کہ اقبال اب بھی ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک ماہر اقبالیات کہتے ہیں "ہم نے خیر اقبال کو نہ سمجھا نہ سہی خود اقبال بھی کہتے ہیں"

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا　　گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی!

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے　　کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

شگوفہ۔ حیدرآباد

سید محمد جعفری

گوشت کا مرثیہ

(روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

گوشت خوری کے لیے ہند میں مشہور ہیں ہم
جب سے ہڑتال ہے قصابوں کی مجبور ہیں ہم
چار ہفتہ ہوئے قلیے سے بھی مہجور ہیں ہم
"نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم"
"اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ گوشت" سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے"

آ گیا عین ضیافت میں اگر ذکر بٹیر
اٹھ گئے سیر سے ہوتے بھی نہیں پائے تھے سیر
گھاس کھا کر کبھی جیتے ہیں نیستاں میں بھی شیر؟
تو ہی بتلا ترے بندوں میں ہے کون ایسا دلیر
تھی جو ہمسائے کی مرغی وہ چرائی ہم نے
نام پر تیرے چھری اس پہ چلائی ہم نے

سرِ محفل مجھے کہتے ہوئے آتا ہے حجاب
قطع گردن سے پرے ہوتی ہے تیغ قصاب
گوشت ملتا نہ تھا آلو کے بنائے ہیں کباب
مرغ و ماہی ہوئے منڈی میں بھی اتنے کمیاب
جلد پہنچا جو وہاں چل دیا مرغا لے کر
"آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر"

شہر میں گوشت کی خاطر صفت جام پھرے
ہم پھرے جملہ اعزا پھرے خدام پھرے
جس جگہ پہنچے اسی کوچے سے ناکام پھرے
"محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے"
شب میں چڑیوں کے بسیرے بھی نہ چھوڑے ہم نے
"بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

ہو گئی قورمے اور قلیے سے خالی دنیا
رہ گئی مرغ پلاؤ کی خیالی دنیا
گوشت رخصت ہوا دالوں نے سنبھالی دنیا
آج کل گھاس کی کرتی ہے جگالی دنیا
"طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
کیا تری دلی میں رہنے کا عوض خواری ہے"

بہادر یار جنگ کا تعارف علامہ سے

مارچ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال نے دہلی کا دورہ کیا۔ خواجہ حسن نظامی نے علامہ کی بعض مصروفیات کا ہفتہ وار روزنامچہ، دہلی، مورخہ ۱۹؍ مارچ ۳۳ء میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۳؍ مارچ ۳۳ء کو بارہ بجے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا۔ جو ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔

نواب بہادر یار جنگ ان کے بہت ہی مداح اور معتقد ہیں میں نے نواب صاحب کا ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ان الفاظ میں تعارف کرایا۔

"اگر آپ بادشاہ ہیں تو یہ آپکے سپہ سالار ہیں اور اگر آپ شمع ہیں تو یہ آپ کے پروانے ہیں۔ اور اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو یہ آپ کے دلوانے ہیں!"

رحیم بخش شاہین

"اوراقِ گم گشتہ" ص ۲۶

نماز

(اقبالؔ کی نظم شکوہ کی پیروڈی)

سید محمد جعفری

عیدِ اضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہِ کثیر   جب کہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر
وہ مصلّوں پہ مسلّط تھے بحُسنِ تقدیر   تھے "ریزرو" ان کے مصلّے یہ مساواتِ کبیر

آج کل یہ ہے نماز اور کبھی وہ تھی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز

صفِ اوّل میں کھڑے تھے جو فدایانِ نماز   یہ امیر اور یہ غریب اور یہ نشیب اور یہ فراز
تجھ سے اے خالقِ کل چھپ نہیں سکتا یہ راز   تو حقیقی، وہ مجازی مجھے دونوں سے نیاز

"آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں"
کبھی رکھتے ہی نہیں اور کبھی رکھتے ہیں

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے   ساتھ لائے تھے مصلّا وہ بچھایا ہم نے
دور سے چہرہ وزیروں کو دکھایا ہم نے   ہر بڑے شخص کو سینے سے لگایا ہم نے

"پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں"
کون کہتا ہے کہ ہم لائقِ دربار نہیں

ذکر خطبے میں وزیروں کا جو پایا ہم نے   آسمانوں کو زمینوں سے ملایا ہم نے
کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا ہم نے   سامری کی طرح بچھڑوں کو سجایا ہم نے

"خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انساں کی نظر"
"مان لیتا کوئی اَن دیکھے خدا کو کیوں کر"

***

سید محمد جعفری

لا اِلٰہ الا اللہ

(روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کہا ہے منہ سے تو ہاں لا اِلٰہ الا اللہ
نہیں عمل سے عیاں لا اِلٰہ الا اللہ

خودی کو پال کے دُنبہ بنا دیا آخر
چھری ہو اس پہ رواں لا اِلٰہ الا اللہ
جو مولوی ہیں وہ کھاتے ہیں رات دن حلوے
بہار ہو کہ خزاں لا اِلٰہ الا اللہ
میں تجھ کو کہتا ہوں حاجی تو مجھ کو حاجی کہہ
فریب سود و زیاں لا اِلٰہ الا اللہ

نمازی آئیں نہ آئیں اذان تو دیدوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا اِلٰہ الا اللہ
وہ لیڈری جو اُجڑ جائے چند لفظوں سے
دوکانِ شیشہ گراں لا اِلٰہ الا اللہ
نہ ضبط و نظم نہ ایماں نہ اتحادِ عمل
یہ منزلوں کا نشاں لا اِلٰہ الا اللہ
خودی جو خود کا مونث ہے گھر میں رہتی ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا اِلٰہ الا اللہ
عجیب نصف غزل جعفری نے لکھی ہے
کہاں سے پہنچا کہاں لا اِلٰہ الا اللہ

(اقبال کی نظم "ہمدردی" کی پیروڈی)

عاشق محمد غوری

گوشے میں کسی کھنڈر کے تنہا
مُلّا تھا کوئی اُداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
جوئیں چُننے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح اب مکاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سُن کے مُلّا کی آہ و زاری
اُلّو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
احمق ہوں اگرچہ میں تھمی سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں پیش یہ گھونسلہ کروں گا

اللہ نے مجھ کو دی ہے منزل
اک رات یہیں کرو بسیرا

اُلّو ہیں وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(اقبال کے مومن کی پیروڈی)

شوکت تھانوی

مومن دنیا میں

کمزور مقابل ہے تو فولاد ہے مومن
انگریز ہے سرکار تو اولاد ہے مومن
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت
اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
ہے جنگ کا میدان تو اک طفلِ دبستان
کالج میں اگر ہے تو پری زاد ہے مومن

مومن جنت میں

شکوہ ہے فرشتوں کو کم آمیز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے بہت تیز ہے مومن

گوپی ناتھ امن

(روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

بارش سے دب گیا ہے ٹوٹا مکاں ہمارا — آندھی کا منتظر ہے اب سائباں ہمارا
سیلاب نے کچھ ایسی رنگت ہمیں دکھائی — ہر اک سے پوچھتے ہیں گھر ہے کہاں ہمارا
یہ دور ہے مشینی سب گھر تبتر بتر ہے — بیٹا یہاں ہمارا بھائی... وہاں ہمارا
اک فالِ نیک ہے یہ دیوار بھی ہے نیچی — خراٹے لے رہا ہے اب پاسباں ہمارا
شغلِ شراب بھی ہے تنخواہ بھی ہے تھوڑی — معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا
پرنالہ نظم اپنی، ان کا کلام دریا
اقبال سے جدا ہے طرزِ بیاں ہمارا

* ماچس لکھنوی

"پیروڈی" (بر شکوۂ اقبال)

کیوں نمک خوار بنوں زود فراموش رہوں
فکر زردہ نہ کروں محوِ غم دوش رہوں
گڑ کے طعنے بھی سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنشیں میں کوئی مردہ ہوں کہ خاموش رہوں

نفع اندوزوں سے اُلفت کی جلن ہے مجھ کو
شکوہ شکر سے یہ خاکم بہ دہن ہے مجھ کو

خاص درجہ کی مٹھاسوں میں تو مشہور ہیں ہم
اب کہ پیٹنی سے مرنے سے بھی مجبور ہیں ہم
مرتباں کہتے ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے شکر شکوۂ اربابِ غذا بھی سن لے
تلخ کاموں سے ذرا اپنا گلا بھی سن لے

ہم نے مانا کہ تری نسل ہے اتنی ہی قدیم
جتنے یہ غنچۂ گُل جتنی پرانی ہے شمیم
شہد کی مکھیاں تھیں صاحب الطاف عمیم
تجھ کو لے کر جو پھریں چار طرف مثلِ نسیم

کس کو جمیعت خاطر یہ پریشانی ہے
بس کہ تھی ہی ترے نام کی دیوانی ہے

یاد تو ہوگا تجھے اپنا وہ پہلا منظر
گہہ تلکتی تھی پہاڑوں میں کبھی پیڑوں پر
خوگرِ پیکرِ محسوس جو تھی اپنی نظر
دوسری شکل میں لائے ہیں تجھے ہم کیوں کر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
کس کی قوت سے ہوا بول سرانجام ترا

تجھ سے بیگانہ تھے سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں ایران میں ایرانی بھی
تھے بڑے شہرۂ آفاق تو یونانی بھی
ایک سے ایک یہودی بھی تھے نصرانی بھی

کی ہے ہل بیلوں سے کھیتوں پہ چڑھائی کس نے
بھو کے گنّے کو تری بات بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
ناؤ پر لاد کے بھیجا تجھے دریاؤں میں
کیک میں ڈھال کے پہنچایا کلیساؤں میں
گاڑے جھنڈے ترے ہر شہر میں ہر گاؤں میں

کہیں فہرست میں ہوتے جو جہاں داروں کی
تیرا دم بھرتے یوں ہی چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو کیا صرف اسی درگت کیلئے
کیا نہ مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لئے
کھیت گوڑے تھے کوئی اپنی حکومت کے لئے
صرف مل والے تجھے لیتے ہیں دولت کے لئے

یہ سمجھتے تو نہ یوں اُن کو غنی کر دیتے
رل بنانے کے عوض مِل شکنی کر دیتے

ٹل نہ سکتے تھے جو ہم کھیت میں اڑ جاتے تھے
پاؤں سب چوروں کے مینڈوں سے اکھڑ جاتے تھے
پاس آئے جو ترے کوئی بگڑ جاتے تھے
لاٹھیاں تان لیا کرتے تھے لڑ جاتے تھے

نقش اس طرح ہر اک مل پہ بٹھائے ہم نے
جان دے دے کے ترے کھیت بچائے ہم نے

صاف اُدھر کئے کوڑے ہیں وہ بنجر کس نے
ہل سے توڑے ہیں زمیں دوز وہ پتھر کس نے
یہ شکر قند یہ بوئے ہیں چقندر کس نے
کاٹ کے رکھ دیئے گنّوں کے یہ لشکر کس نے

کس نے بیگانہ کیا ذائقے سے ہر انساں کو
کس نے ٹھنڈا کیا گڑ والوں کی ہر دوکاں کو

رضا نقوی واہی

نئے لیڈر کی دُعا

بھگوان مرے دل کو وہ زندہ تمنا دے
جو حرص کو بھڑکا دے اور جیب کو گرما دے

وادیِ سیاست کے اس ذرّے کو چمکا دے
اس خادمِ ادنیٰ کو اک کُرسیِ اعلیٰ دے

اوروں کا جو حصہ ہے مجھ کو ہی داتا دے
محرومِ تماشہ ہوں تو پوری وصلوا دے

ہاں مُرغِ مسلّم دے ہاں گرم پراٹھا دے
سوکھی ہوئی آنتوں کو فوراً ہی جو چکنا دے

تحریریں حسیتا دے تقریریں گرما دے
جنتا کو جو پھسلا لے اور قوم کو بہکا دے

کُرسیِ وزارت پر اک جست میں چڑھ جاؤں
تدبیر کو پھرتی دے تقدیر کو جھٹکا دے

سکھلا دے مجھے داتا وہ رازِ جہاں بانی
قطرے سے جو دریا لے دریا کو جو قطرہ دے

مفلس کی لنگوٹی تک باتوں میں اُتروا لوں
احسان کے پردے میں چوری کا سلیقہ دے

قاتل کی طبیعت کو بسمل کی ادا سکھلا
خونریزی کے جذبے کو ہمدردی کا پردا دے

تھوڑی سی جو غیرت ہے وہ بھی نہ رہے باقی
احساسِ حمیت کو اس دل سے نکلوا دے

القصہ مرے مالک تجھ سے یہ گزارش ہے
مُرغی وہ عنایت ہو سونے کا جو انڈا دے

دلاور فگار

"شکوہ"

[امدادی کالجوں میں عموماً ٹیچرس کو تنخواہ ہر وقت نہیں
ملتی اور ان کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
علامہ اقبالؔ کی مشہور نظم 'شکوہ' کی اس پیروڈی میں
ٹیچرس کی ہی مشکلات بیان کی گئی ہیں۔ علامہ اقبالؔ کا تخاطب
اللہ تعالیٰ سے تھا اور اس پیروڈی میں ٹیچرس کا تخاطب
اپنے ہیڈ سے ہے -! فگارؔ]

کیوں خطا کار بنوں فرض فراموش رہوں
طعنے بیگم کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
کیوں نہ تنخواہ طلب کر کے سبکدوش رہوں
ہم نوا میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز میری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ تنخواہ کا خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا جذبۂ ایثار میں مشہور ہیں ہم
حقِ محنت نہ ملے جس کو وہ مزدور ہیں ہم
ہو گئے پانچ مہینے کہ بدستور ہیں ہم
فقر و فاقہ کی قسم سرمدؔ و منصور ہیں ہم

حاکما! شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ مدح سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

یوں تو مدت سے ہے کالج میں میری ذات قدیم
شرطِ انصاف ہے اے والیِ اولاد یتیم
ہم نے بویا ہے تیرے کھیت میں تخمِ تعلیم
ہم نے ہر دور میں پیدا کئے نادان حکیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ کھانے کا تو مسجد میں بھی آسانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب درس گھروں کا منظر
کوئی ایم اے تھا نہ بی اے تھا نہ کوئی انٹر
ملتی علم سے محدود تھی لڑکوں کی نظر
سیکھتا پھر کوئی سائنس و ادب کو کیوں کر

طالبِ علم کو ہم نے دیا پیغام تیرا
قوتِ بازوئے احقر نے کیا کام تیرا

ہم تو جیتے ہیں فقط علم کی دولت کیلئے
اور مرتے ہیں تو تعلیم کی عظمت کے لئے
ٹیوشنس کرتے ہیں کچھ وہ بھی ضرورت کیلئے
ورنہ کیا اور ذرائع نہ تھے دولت کے لئے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پہ مرتی
تیری "سروس" کے عوض پیری مریدی کرتی

ٹل نہیں سکتے اگر درجہ میں اڑ جاتے ہیں
پاؤں لڑکی کے بھی درجوں سے اکھڑ جاتے ہیں
غیر حاضر ہوا کوئی تو بگڑ جاتے ہیں
دوست کیا چیز ہیں شاگرد سے لڑ جاتے ہیں

نقشِ تعلیم کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
بوڑھے طوطوں کو سبق یاد کرایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ کیا پوسٹ رجسٹر کس نے
معرکہ ایجوکیشن کا کیا سر کس نے
امتحانوں میں بنا کر دیئے پیپر کس نے
دیئے شاگردوں کو انصاف سے نمبر کس نے

کس کے ڈر سے طلباء سہمے ہوئے رہتے ہیں
درجے میں آتے ہی منہ سے آئی کم اِن کہتے ہیں

آگیا عین پڑھائی میں جو قرضہ کا خیال
ماسٹر بھول گیا ماضی و مستقبل و حال
آگیا یاد کہ بھوکے ہیں مرے اہل و عیال
کیسے ٹیگور و اس کیسے کبیر و اقبال

گیٹے و شیلے و خیام و لی ایک ہوئے
ذہنِ افلاس میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مختلف درجوں میں ٹیچر سحر و شام پھرے
مئے تعلیم کو لے کر صفت جام پھرے
سِکستھ سیونتھ میں لے کر ترا پیغام پھرے
پہنچے جس درجہ میں اس درجہ سے ناکام پھرے

رُوم تو روم ہیں میداں بھی نہ چھوڑے ہم نے
نیاز میں چھوڑ دیئے علم کے گھوڑے ہم نے

نفسِ امارہ کو ہر طرح سے مارا ہم نے
خواب میں بھی نہ کیا پے کا نظارا ہم نے
کرلیا دودھ شکر گھی سے کنارا ہم نے
کھا کے گڑ اور چنے وقت گزارا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار تو ہیں مرنے کو تیار نہیں

محکمے اور کئی بھی ہیں جو خوشحال بھی ہیں
ان میں شاعر بھی ہیں نسخے بھی ہیں قوال بھی ہیں
ان میں ننگے بھی ہیں بھوکے بھی ہیں کنگال بھی ہیں
آنکھ والے بھی ہیں اندھے بھی ہیں دجال بھی ہیں

رحمتیں عام ہیں ہر کہتر و بہتر کے لئے
ڈیڑھ سو دن کا مہینہ ہے تو ٹیچر کے لئے

یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں تختی پہ جنہیں نام بھی لکھنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ جاہل کو ملیں حور و قصور
اور ہم بی ٹی و سی ٹی کو فقط وعدۂ حور

اب وہ پہلی سی کوئی رسم نہیں راہ نہیں
بات کیا ہے کہ کئی ماہ سے تنخواہ نہیں

کوئی ڈی اے میں مساوات کا قائل نہ رہا
انکریمنٹ بھی تنخواہ میں شامل نہ رہا
ایریئر وہ نہ رہا پے نہ رہی، بل نہ رہا
جس میں تھے فنڈ کے کاغذ وہی فائل نہ رہا

ہم کہ میدانِ عمل کے عملی غازی ہیں
ہیں تو کالج میں ملازم مگر اعزازی ہیں

کوئی دہلی گیا کالج سے تو کوئی مدراس
کوئی کہتا ہے کہ اب بندہ تو لے گا بن باس
کوئی ناٹک میں ملازم ہوا باحسرت و یاس
لے اڑی سب کو غرض موجِ ہوائے افلاس

لوگ بے تاب ہیں کالج سے نکلنے کے لئے
اور کالج ہے کہ بے تاب ہے چلنے کے لئے

لڑکے درجوں میں یہ کہتے ہیں کہ اُستاد گئے
وہ جو کہتے تھے کہ کرلینا سبق یاد گئے
وقت ہم لوگوں کا کرتے تھے جو برباد گئے
اب نہ آئیں گے کہ سوئے عدم آباد گئے

طعنہ زن لڑکے ہیں احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنے اسٹاف کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

یہی حالت ہے تو ہوجائے گا ویرانہ چمن
بوم و کرگس نظر آئیں گے یہاں سایہ فگن
تھا جو شاہین و کبوتر کا پرانا مسکن
گھونسلے اپنے بنالیں گے وہاں زاغ و زغن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے پوٹے میں ہے دلسوز کا تلاطم اب تک

جاگ اٹھے کاش کہ بلبل کی نوا سے کالج
زندگی پائے نئی طرز و ادا سے کالج
پھر شفایاب ہو، تاثیرِ دعا سے کالج
رہے محفوظ ہر ایک موجِ بلا سے کالج

ہے ہنسی لب پہ تو کیا دل تو ہے رنجیدہ مرا
لے ظریفانہ سہی نغمہ ہے سنجیدہ مرا

(شامتِ اعمال)

* حلاوی فگار

اِسٹوڈنٹ کی دُعا

(روحِ اقبالؔ سے معذرت کے ساتھ آٹھویں کلاس سے ایم اے تک کے بچوں کیلئے)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی کھیل میں غارت ہو خدایا میری

فلم میں میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
متوجہ میری جانب مدھوبالا ہو جائے

زندگی ہو مری نوشاد کی صورت یارب
فلم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو مرا کام بزرگوں کو نصیحت کرنا
سٹھ گئے ہوں جو بزرگ انکی مرمت کرنا

میرے اللہ پڑھائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس پہ نہ چلانا مجھ کو

"مغل اعظم" و "برسات" دکھانا مجھ کو
"پرتھوی راج" و "دیو آنند" بنانا مجھ کو

عمر بھر مست رہوں، کھاؤں پیوں عیش کروں
چیک تو مجھ کو دلا دے میں انھیں کیش کروں

شوق کی تشنہ لبی کچھ تو بجھا دے مالک
کم سے کم جلوۂ حسن ہی دکھا دے مالک

کیا کروں گا میں یہ تعلیم کی دولت پاکر
میرے اللہ بنا دے مجھے جانی واکر

علم کی دولت ارزاں مرے قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو "عالم" کی یہ وہ گل ہی نہیں

مجھ سے انگلش نہیں چلتی اسے ایزی کر دے
بلکہ ممکن ہو تو اردو کو بھی ہندی کر دے

مجھ سے بالجبر کہا جاتا ہے "پڑھ الجبرا"
اس پہ تاکید کہ فریاد نہ کر، مت گھبرا

کیوں سبق یاد کروں، کیوں یہ مصیبت جھیلوں
کیوں نہ تفریح کروں، کیوں نہ کرکٹ کھیلوں

اب کے نیا کو مری پار لگا دے مولیٰ
امتحان میں پہ ڈویژن ہی دلا دے مولیٰ

مجھے آسان ہوں یہ دشوار سے مضمون بتا
پاس ہو جاؤں جسے کھا کے وہ معجون بتا

کم سے کم اتنی خوشی میرے مقدر میں ہو
میں جو کنجی سے رٹوں بس وہی پیپر میں ہو

پارک میں سیر کروں، سوت کی موجوں میں بہوں
اور اٹینڈینس رجسٹر میں پریزنٹ رہوں

میری بگڑی ہوئی تقدیر بنا دے مالک
نقل کرنے کی تو تدبیر بتا دے مالک

ید بیضا کو کبھی میں نے پیمبر لکھا
لن ترانی کو کبھی چیف منسٹر لکھا

میں زلیخا کو کبھی شاہد کمسن سمجھا
"شب ہجراں" کو کبھی زوجۂ مومن سمجھا

نقشہ بھرنے کا نیا ڈھنگ نکالا میں نے
بھر دیا پیسفک اوشن میں ہمالیہ میں نے

کیا ہوا ذہن اگر کند و غبی رکھتا ہوں
آگ "سلمان" کی سینہ میں دبی رکھتا ہوں

کیا ہوا لوگ اگر مجھ کو گدھا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

(شامتِ اعمال)

* جوہر سیوانی

تصویرِ طرب

(پیروڈی "تصویرِ درد" — علامہ اقبال)

کہاں بھاگو گے سننا ہی پڑے گی داستاں میری
میں منہ پھٹ ہوں نہیں رُکتی یہ قینچی سی زباں میری
بھلا سسرال میں کیسے نہ ہوں دلداریاں میری
خدا کے فضل سے ہیں ایک درجن سالیاں میری
کوئی صورت ہو میرے منہ میں تالے لگ نہیں سکتے
بکے جاؤں گا کوئی روک کر دیکھے زباں میری
نہ پیتے پڑ سکا کچھ لالے کے نرگس کے اور گل کے
بہ اندازِ جدیدیت لکھی تھی داستاں میری
مزا آجائے یا رب سچ سے جب میں لوٹ کر آؤں
نہ دیکھے چشم رستم مال سے پُر پیٹیاں میری
گلستاں پر مساوی حق ہے دونوں کا مگر یارو
عجب تقسیم ہے یہ، آم اُن کا گٹھلیاں میری
کرایہ دار اچھے آگئے اپنے محلے میں
چُرا کر کھا گئے اک ایک کر کے مرغیاں میری
گرانی کا بھلا ہو، اُڑ گئے ہیں ہوش کے پرزے
اُڑیں گی جلد ہی عقل و خرد کی دھجیاں میری
ہوا ہے گم جو بٹوا، شک ہے اُن کو گھر کے لوگوں پہ
چبا ڈالیں گی شاید آج بیگم، ہڈیاں میری
پہنتا آرہا ہوں پائجامہ ایک مدت سے
پہن لیتی ہیں وہ ساری کے بدلے لنگیاں میری
یہ بدلا رُخ، چڑھے تیور عجب ہے حال بیگم کا
کُڑک بیٹھی ہیں جب سے گھر کی ساری مرغیاں میری
"زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم ؟
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری"
یہ ہیں وہ لوگ جو مارے گئے راشن کے چکر میں
پسند آئیں گی جوہر کیا انھیں تک بندیاں میری

* این - بی سین - ناشاد

(ڈاکٹر اقبال سے معذرت کے ساتھ)

جنت کی آرزو

مجنوں نے شہر چھوڑا، تو صحرا بھی چھوڑ دے
جنت کی آرزو ہے تو دنیا بھی چھوڑ دے
اخباروں کے مدیروں سے جو دوستی نہیں
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے
ہر اک رقیب کے لئے تو خضرِ راہ بن
اُسے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
احباب کو جو قرض دیا ہے وہ بھول جا
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے
واقف ہیں تیرے عشق سے بلبل بھی پھول بھی
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے
رقصاں ہے تیرے ساتھ جو بیگم رقیب کی
بے گانہ تجھ پہ نازشِ بے جا بھی چھوڑ دے
بے شک میاں کے ساتھ رہے بیوی رات دن
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

مجید لاہوری

اگر ہوتی رہیں اقبال پر انگلش میں تقریریں
بدل جائیں گی اک دن دیکھنا ملت کی تقدیریں
چھری اک ہاتھ میں ہے اور ہے اک ہاتھ میں سگریٹ
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

* * *

مظفر مجاز کے تراجم اقبال

○ **طلوعِ مشرق** ـــ ۱۹۷۵ء "پس چہ باید کرد..." کا منظوم ترجمہ (۸ روپے)
(یوپی اور لکھنؤ اردو اکیڈمی کی انعام یافتہ)

○ **ارمغانِ مجاز** ـــ ۱۹۷۷ء (پندرہ روپے)
(یوپی اردو اکیڈمی کی انعام یافتہ)

○ **جاویدنامہ** ـــ ۱۹۸۱ (بیس روپے)
(مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی انعام یافتہ)

• ادارۂ **شگوفہ** سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند

برخوردار جمشید کے نام

(علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کسی رئیس کے گھر میں قیام پیدا کر دیارِ عشق میں اُونچا مقام پیدا کر

عمائدین کے مَل صبح و شام روغنِ تازہ جو کوئی کام نہ ہو تو یہ کام پیدا کر

شجر کے نیچے ترنم سے شعر پڑھ کر جا جنابِ مجنوں میں اپنا مقام پیدا کر

کسی وزیر کی لڑکی جو ہم سبق ہو تری تو اس سے راہِ سلام و پیام پیدا کر

جہاں سے جھانک سکے گرلز ہوسٹل کے بیچ بلند اور بلند ایسا بام پیدا کر

ترے طمنچے سے لڑکے بھی ماسٹر بھی ڈریں اسمبلی کے الیکشن میں نام پیدا کر

یقیں ہو جیسے کہ اب وارڈن نہ آئے گا پسِ کتب سے تو مینا و جام[1] پیدا کر

بہ شغلِ ویڈیو[3]، راتوں کو جاگ، دن کو سو نئی صدی میں[2] نئے صبح و شام پیدا کر

چرس میں ڈال دے تھوڑا سا آبِ ہیروئن چلم کے واسطے تازہ قوام پیدا کر

شیواز[4] گر نہ ملے، گُڑ میں نیلا تھوتھا گھول کشید کر کے مئے[5] نیلی فام پیدا کر

---

[1] اقبال: سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
[2] اقبال: نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
[3] VIDEO
[4] شیواز ریگل ایک نہایت اعلیٰ بیرونی شراب ہے
[5] اقبال: مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

برق آشیانوی

شوہر کا شکوہ

ننگا بھوکا بھی نہیں مفلس و نادار نہیں
دوست احباب سے کچھ اس کو سروکار نہیں
یعنی بیوی کے سوا کوئی شے درکار نہیں
ساری دنیا میں کسی شے سے اسے پیار نہیں
بدمزاجی سے کبھی بیوی کی بیزار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

سائلوں کی طرح تسلیم میں مشہور ہے وہ
قصۂ زیست سناتا ہے کہ مجبور ہے وہ
یوں تو شکوے سے شکایت سے بہت دور ہے وہ
لب پہ آجاتی ہے فریاد تو مجبور ہے وہ
نالۂ درد نہیں شکوۂ آزار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

پہلی تاریخ کو تنخواہ جھپٹا لیتی ہے
کبھی کنگن، کبھی نکلیس بنا لیتی ہے
میکے والوں کو کبھی اپنے بلا لیتی ہے
جی میں جو آتا ہے من مانی چلا لیتی ہے
اور ان باتوں سے شوہر کو سروکار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

دوست اپنا کوئی آئے تو بڑھا دیتا ہے
نقش گزرے ہوئے لمحوں کا مٹا دیتا ہے
اپنے ارمانوں کو بیوی پہ لٹا دیتا ہے
اس کو ہر ماہ نئی ساڑیاں لا دیتا ہے
خود پھٹے کپڑے پہننے میں اسے عار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

چائے کی پان کی سگریٹ کی عادت بھی نہیں
کھانا کھانے کے سوا اور کوئی لت بھی نہیں
نوکری کے سوا اس کو کوئی علت بھی نہیں
سودے پانی سے گھڑی بھر کی فرصت بھی نہیں
ایک لمحے کے لیے بیٹھا ہے بیکار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

راہ چلتے ہوئے بچوں کو اٹھا لیتا ہے
سینما جاتی ہے تو ان کو سلا لیتا ہے
صبح کو اٹھتے ہی چولھا وہ جلا لیتا ہے
کپڑے دھوتا ہے وہ کھانا بھی پکا لیتا ہے
اس کو بیوی کے کسی حکم سے انکار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

بیوی بچوں کو کھلاتا ہے تو وہ کھاتا ہے
روز آفس کو بہت دیر سے وہ جاتا ہے
آفیسر ڈانٹ پلائے تو وہ پی جاتا ہے
سیدھے آفس سے نکلتے ہی وہ گھر آتا ہے
ایک پل کے لیے رکتا سرِ بازار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

جب وہ کہتا ہے کہ دیکھو مری حالت کیا ہے
ایک نوکر تو رکھو پیسے کی قلت کیا ہے
بیوی کہتی ہے کہ "بیکار کی حاجت کیا ہے
آپ زندہ ہیں تو نوکر کی ضرورت کیا ہے"
سن کے چپ ہو جاتا ہے بیچارے کو اصرار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

بیوی کو آتی ہے ہر سال نئی بیماری
سال کے بارہ مہینے ہیں دوائیں جاری
لاکھ بیماریوں کی ایک یہ ہے بیماری
پاؤں ہر سال ہوا جاتا ہے اس کا بھاری
بارہویں بار ہے شوہر کو مگر بار نہیں
پھر بھی بیوی کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں

سامنے کس کے بیاں اپنی حکایت وہ کرے
کس سے "شکوہ" وہ کرے کس سے شکایت وہ کرے
لوگ بولیں گے ذرا صبر کی عادت وہ کرے
کئی مردوں کا ہے یہ حال قناعت وہ کرے
شوہروں کا کوئی دنیا میں طرفدار نہیں
بیویوں کو یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

○

کو ووٹ دیجئے
الیکشن کے وعدے
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

طالب خوندمیری

شکوہ

(اردو کا اپنے وطن سے)

کیوں زیاں کار بنوں، نطق فراموش رہوں
فکرِ فردانہ کروں، غافل و بے ہوش رہوں
طعنے اپنوں کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
کوئی پیدائشی گونگی ہوں کہ خاموش رہوں

"جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو"
شکوہ تجھ سے ہی بہت خاکِ دکن ہے مجھ کو

ہے بجا شعبۂ تعلیم میں مشہور ہوں میں
پھر بھی اسکول سے کالج سے بہت دور ہوں میں
اب مکانوں سے دکانوں سے بھی کافور ہوں میں
ایک زندانِ سیاست ہی میں محصور ہوں میں

اے وطن میری تباہی کی کتھا بھی سن لے
ایک مجبور سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

تیری تہذیب و تمدن ہیں زمانے میں عظیم
تیری دھرتی پہ ہیں کب سے کئی اقوام، مقیم
یوں تو موجود یہاں کتنی زبانیں تھیں قدیم
مجھ سے پیدا ہوا لوگوں میں مگر ذوقِ سلیم

مجھ سے پہلے اہلِ تعصب کو پریشانی تھی
ورنہ دنیا مرے اسلوب کی دیوانی تھی

مجھ سے پہلے تھا عجب تیری زبانوں کا اثر
کہیں اظہار کے پتھر، کہیں لہجہ کنکر
کہیں الفاظ پہ رک جاتی تھی لنگڑا کے نظر
سیکھتا پھر کوئی معذور زبانیں کیوں کر

آ کے میں نے ہی تغزل سے بھرا جام تیرا
میں نے پھولوں کی زبانوں سے لیا نام تیرا

محفلِ خورد و کلاں میں صفتِ جام پھری
لے کے آسان قواعد سحر و شام پھری
لکھنؤ، دلی و پنجاب، تا آسام پھری
کیا کبھی کام سے اپنے کہیں ناکام پھری؟!

شہر تو شہر ہیں، قریے بھی نہ چھوڑے میں نے
دور دیہات میں دوڑا دیئے گھوڑے میں نے

فتنہ پرداز یہ کہتے ہیں غزل خواں گئے
طنز کرتے ہیں کہ اردو کے [illegible]
میر و غالب سے تخنوَر [illegible] پریشان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے دیوان گئے

ان کے طعنوں کا بھی احساس مجھے ہے کہ نہیں
ان بزرگوں کا بھی کچھ پاس مجھے ہے کہ نہیں

وہ تخیلِ میر کی اور فیض کی اُردو بھی وہی
میرے تیور بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی
اے مرے پیارے وطن میں بھی وہی تو بھی وہی
تیری مٹی کی مری روح میں خوشبو بھی وہی

پھر یہ بیزارگی یہ چشمِ غضب کیا معنی :
مجھ سے غیروں کا سا برتاؤ یہ اب کیا معنی ؟

میں تو پیدا ہوئی بھارت میں محبت کے لیے
سب برتتے ہیں مگر اپنی ضرورت کے لیے
مُہرۂ خاص ہوں اربابِ سیاست کے لیے
نعرۂ زود اثر ہوں میں حکومت کے لیے

جب بھی آتا ہے الکشن تو میں یاد آتی ہوں
ورنہ پھر سب کے دماغوں سے نکل جاتی ہوں

سرپرستی رہی نیتاؤں کی مانندِ سراب
مجھ پہ ٹوٹا ہے بہت اُن کی عنایت کا عذاب
اُن کے حیلوں کی کوئی حد نہ بہانوں کا حساب
میں نے دیکھے ہیں بہت اُن کے دکھائے ہوئے خواب

فطرتاً ان کی طبیعت میں اداکاری ہے
ان کے وعدوں سے بہلنا مری بیماری ہے

اک زمانے سے جنھیں گھاس نہ ڈالی دُنیا
کر رہی ہے انھیں لہجوں کی جُگالی دُنیا
ہر طرف اور زبانوں نے سنبھالی دُنیا
رہ گئی میرے لیے صرف خیالی دُنیا

اے وطن میرا ٹھکانہ بھی کہیں ہے کہ نہیں ؟
تیری وسعت میں کوئی میری زمیں ہے کہ نہیں ؟

ذکی بلگرامی

"بن گئے زاغ و زغن بھی اقرباشاہین کے"

آ گئے ایسے بھی دن اقبال کی تحسین کے
بن گئے زاغ و زغن بھی اقربا شاہین کے

ہم وہ مومن ہیں کہ جو با صد خشوع و صد خضوع
سورۂ الحمد پڑھتے ہیں بغیر آمین کے !

حکمتِ اقبالِ لاہوری سے ہم کو کیا غرض
ہم تو سادہ لوح باشندے ہیں ملکِ چین کے

ورد کرتے ہیں گو اے الامان والحفیظ
رقص میں مصروف ہیں بھینسیں مقابل بین کے

آن پہونچا ہے سروں پر موسمِ اقبالیات
داغ دھبّے دھو دیئے اب ملگجی قالین کے

آ گیا نام آوری کا جن ہمارے ہاتھ بھی
حاشیہ بردار ہیں اب ہم بھی الہ دین کے[1]

جان دیں گے ہم بھی شمعِ محفلِ اقبال پر
گرچہ ہیں ہم لوگ پروانے چراغِ چین کے

پڑ نہ جائے گھر کسی کے پائے نازک پر کہیں
باندھئے گا پاؤں اپنے لاٹن پہ زین کے !

پہلے ویسا سر تو پیدا کیجئے میرے حضور!
پہنئے گا کب تلک اور دل کی ٹوپی چین کے

رو رہے ہیں سر پٹک کر چنگ و طاؤس و رباب
بج رہے ہیں ہر طرف خالی کنستر ٹین کے

بات میں جس کی نہ تلخی تھی نہ طفلانہ مٹھاس
ہم تو عاشق ہیں ذکی اس لہجۂ تسکین کے

---

[1] اقبال مراد ہیں (ذ۔ب)

علامہ زج زمہریری

نام نہاد اقبال فہموں کے نام

اقبال کا ہے راگ تو اقبال کا الاپ
اقبال کے الف سے بھی واقف نہیں ہیں آپ

لہرا کے چل پڑے ہیں ہمالہ کو ناپنے
لیتے نہیں ہیں بھول کے بھی اپنے قد کا ناپ

ہر بوالہوس لپکتا ہے منہ مارتا ہوا
اقبال کی خودی کو سمجھ کر مٹن کا چاپ

الفاظ چاب چاب کے کرتے ہیں شرحِ شعر
اپنی گلی میں جن کو لگانی تھی پان شاپ

شکوے کا ایک شعر نہ پڑھ پائیں جو صحیح
اقبالیات میں وہ سمجھتے ہیں خود کو ٹاپ

سینوں میں ہیں "زبورِ عجم" کی نہ ٹھنڈکیں
نے "حرفِ نیش دار"[1] کی پہنچی ہے سر میں بھاپ

کچھ فارسی سے کام نہ انگلش سے واسطہ
شعلوں پہ اپنے جہل کے لیتے ہیں ہاتھ تاپ

کیجے سوال فلسفۂ وقت پر اگر
منہ سے اناپ ان کے نکلتا ہے یا شناپ

ہوتی ہے ان کی گرمیِ گفتار دیدنی
دانش وری کا اُن پہ مسلط ہو جب شراپ

گیتا میں ڈھونڈ لیتے ہیں قرآں کا پیام
[illegible] سے کراتے ہیں جبریل کا ملاپ

نوشنگ لے کے چلتے ہیں اقبالیات کی
دانش وری کے شوز جو ہونے لگیں فلاپ

پڑھتے ہیں "ساقی نامہ" بہت جھوم جھوم کر!
تا پی سکیں سکون سے وہسکی کے دو ڈراپ

کتنے وہ باندھ لیتے ہیں اقبالیات سے
جب بھی پتنگ کھاتی ہے دانش وری کی تھا

نقاد کیا کرے گا اُڑا لے گا ٹھوک وڈک
شاعر خود اتفاق سے نقاد کا ہے باپ

کچھ لوگ سبز رنگ کا بھرتے ہیں اُس پہ لیپ
کچھ اشتراکیت کی لگاتے ہیں سرخ چھاپ

ان کو دکھائی دیتا ہے "خنجر ہلال کا"
آتی ہے "انقلاب" کی کانوں میں ان کے چاپ

اٹھتا ہے کوئی خوشۂ گندم جلانے کو
کرتا ہے کوئی بیٹھ کے لاتقنطو کا جاپ

شاعر کھڑا ہے بیچ میں حیران و مضطرب
طاری ہے ان پہ ان کے عقائد کا [illegible]

ہاتھی بنا ہوا ہے اک اندھوں کی بھیڑ میں
ہاتھی کا ہے گناہ کہ اندھوں کا ہے یہ پاپ

کوشش ہے اس کے ساتھ بنا لیں اپنا نام
اقبال کا الاپ ہے اقبال کا ہے جاپ

زج زمہریریوں کی بن آئی ہے آج کل
کب تک مگر ملیں گے یہ انجن بغیر بھاپ؟

---

[1] خطبات اقبال "اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید"۔
[illegible]

رشید عبدالسمیع جلیل

آفریدم

(نذرِ اقبال)

○

دماغ آفریدن، خلل آفریدم — کروں جلد شادی یہ حل آفریدم

جہاں را زیک آب و گل آفریدی — اسی آب و گل سے محل آفریدم

تو از خاک فولادِ ناب آفریدی — میں دھو لے دُھلا لے کنول آفریدم

تو دنیا میں لاکھوں حسیں آفریدی — میں دل میں ہزاروں کنول آفریدم

خطوطِ بدن دل نشیں آفریدی — تری صنعتوں پر تبدّل آفریدم

تو فردوس و خلدِ بریں آفریدی — زمیں پر میں نعم البدل آفریدم

تو ہر شئے بہ یک حرفِ کُن آفریدی — میں برجستہ و برمحل آفریدم

تری حکمتیں بے نہایت الٰہی — میں از روئے حکمت کھرل آفریدم

شجرہائے ممنوعہ کہتے ہیں جس کو — بہ اندازہ صبحِ ازل آفریدم

میں بے چارہ شاعر مجھے کام کیا ہے — رباعی، قصیدہ، غزل آفریدم

میں اک مبتدی ہوں یہ شہکار میرا — بہ امکانِ ردّ و بدل آفریدم

میں کھاتا ہوں، پیتا ہوں، سوتا ہوں شب بھر — سبھی عادتیں نیچرل آفریدم

سرِ شام ہیلم "گرامر"[1] "تتا"[2] کو تجھی نے — یہی اک نظام العمل آفریدم

نہ کھینچیں نہ پکڑیں کبھی کوئی مچھلی — بصد آرزو گرچہ گل آفریدم

نشستم اسکوں سے اسمبلی کے اندر — ریاست میں جنگ و جدل آفریدم

مجھے رات دن چاہیے بے خودی سی — اسی واسطے الکحل آفریدم

تجھا شکوہ کروں بھی تو کس منہ سے یارب — وہی کھا رہا ہوں جو پھل آفریدم

ہوا اس کی سالوں کو لگنے نہ دوں گا — جو منصوبہ میں آج کل آفریدم

یہاں آج کالونیاں بن گئی ہیں — کبھی اس جگہ اصطبل آفریدم

---

[1] گرامر اسکول عابد روڈ ۔ [2] ہیڈ مسٹرس تیلی باؤلی۔

یہ تنکا ہے فقط اک سے کیا جھڑے گا
یہی سوچ کر تو ڈبن آفریدم

نئے چاند سورج اگاؤں گا اک دن
ابھی تو ذرا در بغل آفریدم

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
وہاں زون سے بھی نیوٹل آفریدم

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اگرچہ ستمگر محل آفریدم

بسیرا کرے اب کہیں دوستانہ
چٹانوں میں خفیہ محل آفریدم

عرب، چین، ہندوستاں سب ہمارا
مجھے ایسی ہی ضرب المثل آفریدم

خودی ہو گئی ہے بلند اے جلیلم
مجھے لگ رہا ہے جبل آفریدم

○

اقبال ہاشمی

لیڈر کا فرمان (حواریوں کے نام)

روحِ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ

اٹھو سبھی سوئے ہوئے بندوں کو جگا دو
مسلک کی زمیں زورِ خطابت سے ہلا دو
گرماؤ مسلماں کا لہو سوزبیاں سے
ہر بات پہ ہندو کو مسلماں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا ہے گو یہ زمانہ
جو نقش گراں مایہ نظر آئے مٹا دو
جس کھیت میں اگتا ہو فراوانی سے گندم
اس کھیت میں بیلوں کے لیے گھاس اگا دو
کیوں عاشق و معشوق میں حائل رہیں پردے
پردے کا چلن ہر گلی کوچے سے اٹھا دو
شاخِ امرا خوب منور کرو لیکن
بوسیدہ مکانوں کے چراغوں کو بجھا دو
بیزار ہوں میں دامدید رنگ مکاں سے
میرے لیے خوش رنگ مکانات بنا دو
تہذیبِ نوی ہاشمی تنہا نہیں ممکن
ہر فرد کو تخریب کے آداب سکھا دو

رحمت یوسف زئی

شکوہ

(شوہر کا)

کیوں زیاں کار بنوں زوجِ فراموش رہوں
نالے بچوں کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
سن کے دشنام میں دشنام فراموش رہوں
مجھ پہ لازم ہے کہ شوہر ہوں تو خاموش رہوں

ضبط کی تاب مگر اے ستم ایجاد نہیں
شکوہ کرتا ہوں میں تجھ سے کوئی فریاد نہیں

"ترا نوکر، ترا دھوبی، ترا مزدور ہوں میں"
"کس قدر حلقۂ احباب میں مشہور ہوں میں"
"زن مریدی کا شرف پا کے بھی رنجور ہوں میں"
قصۂ درد سناتا ہوں کہ مجبور ہوں میں

میری مخدومہ! مرے غم کی حکایت سن لے
ناز بردار کی تھوڑی سی شکایت سن لے

عقد میں ہی کہ ترے ناز اٹھاتا ہی رہا
تیری ہر ضد پہ میں سر اپنا جھکاتا ہی رہا
واسطے تیرے نئی ساڑیاں لاتا ہی رہا
اور گہنوں سے سراپا کو سجاتا ہی رہا

پھر بھی قسمت میں مرے طعنۂ ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

کی ہمیشہ ہی ترے ساتھ بھلائی کس نے؟
پہلی تاریخ کو دی ساری کمائی کس نے؟
آگ چولہے میں ہر اک صبح جلائی کس نے؟
"لا کے بستر پہ تجھے چائے پلائی کس نے؟"

پاؤں کو پہیہ بنایا تری دلداری میں
کلمہ پڑھتا تھا ترا، نیند میں، بیداری میں

تیرا میک اپ بھی وہی ناز و نزاکت بھی وہی
زلف کا خم بھی وہی، لب کی لطافت بھی وہی
مجھ سے ہر بات پہ لڑنے کی عادت بھی وہی
اور حمق میرا وہی، ذوقِ حماقت بھی وہی

تیوری تیری چڑھے غیر سبب کیا معنی
چاہنے والے پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی

تو کہ اک تنگ رسوئی میں پڑی رہتی تھی!
ہاتھ میں ماں کے تری ایک چھڑی رہتی تھی!
بھابی چپل بھی لئے سر پہ کھڑی رہتی تھی!
اور اک تو کہ سدا ضد پہ اڑی رہتی تھی!

مجھ کو بس تیری ہی غلطی پہ پریشانی تھی
ورنہ ہر لڑکی گلی کی مری دیوانی تھی

(واوین میں لکھے ہوئے مصرعے کسی شاعر کے ہیں جس کا نام مجھے معلوم نہیں ـــ رحمت)

تو بتا تجھ کو جہنم سے نکالا کس نے
تیری اماں کو ترے بھائی کو پالا کس نے
تیرے گھٹنے کو دیا گھی کا لونڈا کس نے
تیرے جوڑے میں لگایا گلِ لالہ کس نے
کشتیاں لا کے چھواروں کی لٹائیں کس نے
باتیں جو بگڑی ہوئی تھیں وہ بنائیں کس نے

تجھ سے ٹیڑھی ہو نگہ کوئی تو اڑ جاتا تھا
میں ترے واسطے ہنستے سے اکھڑ جاتا تھا
میری اماں بھی کہے کچھ تو بگڑ جاتا تھا
بھائی کیا چیز ہے میں باپ سے لڑ جاتا تھا
کس کی ہیبت سے سبھی سہمے ہوئے رہتے تھے
میں جو کہتا تھا مرے لوگ وہی کہتے تھے

ہر نئے سال بجٹ میرا بڑھایا تو نے
ہر نئے سال نیا پھول کھلایا تو نے
ایک شوروم مرے گھر کو بنایا تو نے
اس میں ہر رنگ کے ماڈل کو سجایا تو نے
کوئی [illegible] میں کوئی بچہ سوتا ہے
ناک بہتی ہے کسی کی تو کوئی روتا ہے

قیدِ جذبات سے آزاد طبیعت تیری
جیب پہ میری رہی خوب عنایت تیری
میرا رنگ اڑتا ہے کھل جاتی ہے رنگت تیری
پک گئے کان مرے سن کے بلاغت تیری
تیرا سب لطف و کرم ہے تری ماں کے گھر پر
برق گرتی ہے تو بس ایک اسی کم تر پر

قرض لینے کے لیے میں سحر و شام پھرا
اپنے احباب کے گھر سے بھی تہی جام پھرا
لے کے رشوت مرے دفتر میں بھی بدنام پھرا
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرا
آئے جتنے بھی غرض مند نچوڑے میں نے
رشوتوں کے کئی دوڑا دیئے گھوڑے میں نے

میں جو جیتا ہوں تو بچوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتا ہوں فقط تیری محبت کے لیے
میں نے چھوڑا نہیں کچھ اپنی مسرت کے لیے
سر بکف پھرتا ہوں دفتر میں تو رشوت کے لیے
جھڑکیاں، گالیاں اغیار کی کھائیں میں نے
جوتیاں اہلِ غرض کی بھی اٹھائیں میں نے

مجھ کو احباب مرے دیکھ ہنسا کرتے ہیں
مجھ پہ آوازے سرِ راہ کسا کرتے ہیں
تیرا بندہ مجھے کہہ کہہ کے ہنسا کرتے ہیں
ایسا لگتا ہے کئی ناگ ڈسا کرتے ہیں
خندہ زن لوگ ہیں احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنے شوہر کا ذرا پاس تجھے ہے کہ نہیں

لطف کھچڑی میں ہے باقی نہ مزہ قیمے میں
زندگی میری گزرتی ہے تو چاء پینے میں
اپنی صورت جو کبھی دیکھوں ہوں آئینے میں
خون کے چشمے ابلتے ہیں مرے سینے میں
بیویاں اور بھی ہیں ان کو ذرا دیکھ تو لے
ان سے اندازِ پرستاریِ شو سیکھ تو لے

جوابِ شکوہ

(بیوی کا)

ہنس کے بیوی نے کہا خوب ہے افسانہ ترا
کتنا غمّاز ہوا ہے دلِ دیوانہ ترا
مجھ پہ الزام دھرے نعرۂ مستانہ ترا
ہاں مگر یاد نہیں ہے تجھے تڑپانا ترا
میں ہوں سفاک و ستم گر یہ اشارا دیکھو
شکوہ اور مجھ سے خدا ان کا تماشا دیکھو

میرے میکے کو تو بدنام کئے جاتے ہو
باپ سے بھائی سے اماں سے جلے جاتے ہو
منہ پہ آتا ہے تمہارے جو، کہے جاتے ہو
مجھ پہ بیکار کے الزام دھرے جاتے ہو

اپنے اعمال قبیحہ کو ذرا یاد کرو
تجزیہ اپنا کرو تب کوئی فریاد کرو

میں تو آرام سے گھر اپنے رہا کرتی تھی
گھر میں ماما تھی وہی کام کیا کرتی تھی
کام سے کاج سے میں دور رہا کرتی تھی
مجھ پہ بھابی تو مری جان فدا کرتی تھی

تم نے شادی جو کی مجھ سے کوئی احسان کیا؟
اپنے گھر لا کے مجھے کتنا پریشان کیا

کیا کہا میں نے بہت آپ کا بڑھوایا ہے؟
ہر نئے سال نئے بھول کو مہکایا ہے؟
سر میں سودا ہے؟ کوئی آپ پہ کیا سایہ ہے؟
اور کیا عرض کروں؟ میں نے تو بھر پایا ہے!

آپ ہی گر یونہی جذبات کے کچے ہونگے
یاد رکھیئے کہ ابھی اور بھی بچے ہونگے

آپ سے تو مجھے کو گلہ ہے کہ کماتے کم ہو
اور شاپنگ کو بھی جاتے ہو تو جاتے کم ہو
اور باہر کی مجھے سیر کراتے کم ہو
اور یہ بھی کہ مجھے فلم دکھاتے کم ہو

اک ولیمہ جو ہوا طور کو بدلا تم نے
جانے کس جنم کا مجھ سے لیا بدلا تم نے

عشق کی آہ وہ پہلی سی ادا بھی نہ رہی
آپ کے دل میں مرے واسطے جا بھی نہ رہی
والہانہ وہ محبت تو ذرا بھی نہ رہی
اور پابندی آئین وفا بھی نہ رہی

گانے والی ہے کوئی اس سے شناسائی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ شوہر مرا ہرجائی ہے

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
جا کے بازار سے کچھ لانا تمہیں بھاری ہے
گھر میں لکڑی ہے دبے گوشت نہ ترکاری ہے
گھر سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

روز ہے چال نئی روز نئی گھاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

رشتے داروں سے مری جان پہ بن آئی ہے
فوج کی فوج مرے گھر میں چلی آتی ہے
کوئی ماموں کوئی خالو تو کوئی بھائی ہے
آپ کی پھوپھی ہے کوئی تو کوئی تائی ہے

اور احساس ذرا بھی نہیں نادانوں کو
اپنے بچوں کو سنبھالوں میں کہ مہمانوں کو

رات دن آپ کے احباب چلے آتے ہیں
دوست سے ملنے کو بے تاب چلے آتے ہیں
صفت ماہی بے آب چلے آتے ہیں
اور بجاتے ہوئے آداب چلے آتے ہیں

چائے اور پان میں سر اپنا کھپاتی ہوں میں
چولہے ہانڈی میں فقط جان جلاتی ہوں میں

رات کو دیر سے آنا ہے پرانا دستور
جھوٹے بازاروں میں رہا نام تمہارا مشہور
اور پھر خود کو سمجھتے ہو، بچارا مجبور
آپ کے بھید سبھی جانتی ہوں میرے حضور

جانتی ہوں مگر انجان ہوئی جاتی ہوں
آپ کے عیش پہ قربان ہوئی جاتی ہوں

بات کچھ اب کی نہیں یہ تو روش ہے قدیم
گھر کو یوں آتے ہو جیسے کہ ہو کوٹھے پہ مقیم
میری تنہائی ہے ساتھی مرا سناٹا ندیم
پہلے پیدا تو کرے مجھ سا کوئی قلب سلیم

حلقوں نے تمہیں ہر بند سے آزاد کیا
ان بری عادتوں ہی نے تمہیں برباد کیا

جس کو آتا نہیں دنیا میں کوئی کام ہو
جس کو بالکل نہیں پروائے تعلیمی تم ہو
گھر کے جو بیچ گئے کھا جاتے ہیں ہر قسم ہو
سوکھے باسی ٹکڑے اخبار کا مدفن تم ہو

شاعری دوست تمہاری تو ہے دشمن میری
موئی کلموکا ہے بد ذات یہ سوکن میری

قرض خواہوں کے وہ تیور ہیں کہ شرمندہ ہوں
آپ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ سارے مردود
میں یہ کہتی ہوں کہ ہوں گے وہ کہیں پر موجود
ایسی مشکل سے بچانا مجھے میرے معبودا

تم تو شاعر بھی ہو شرابی بھی ہو جواری بھی
یہ بتاؤ کہ ذرا تم میں ہے خودداری بھی

وقت ہے اب بھی ذرا بدلو طریقہ اپنا
مرد کا شیوہ ہے تکلیف و مصائب سہنا
نصف بہتر جو سمجھتے ہو تو مانو کہنا
یعنی جو بیت گئی اس کو سمجھ لو سپنا

میں جفا کار و ستم گر یہ گماں آپ کا ہے
ہوں کنیز آپ کی میں سارا جہاں آپ کا ہے

○

ستار صدیقی

تین شعر

جو فرق نہ جانے ہیں نارنجی و ناسی میں
استاد وہ بن بیٹھے "اقبال شناسی" میں

واقف نہیں رومی سے "اقبال نجومی" سے
رہتے ہیں ہراول وہ ہر پیش قیاسی میں

"چھ نظمیں" ہیں معیاری اقبال کی کہتے ہیں
دس نمبری ایسے بھی ہیں لوگ "چھیاسی" میں

○

اداریہ

بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں؟

اقبال عالمی سمینار کے موقع پر شگوفہ کی جانب سے اکبری اقبال نمبر کی صورت میں یہ سوغات قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے ——

" اقبال نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ مارچ میں کیا گیا۔ اس کا اعلان پڑھ کر کئی حضرات چونک پڑے۔ بعضوں کو اعتراض تھا کہ اچھے بھلے اقبال کو ہم ظریف ثابت کرنے اور مزاح نگاروں کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا کہ فکر و فلسفہ اور سوز و گداز کے شاعر علامہ اقبال کا مزاح سے کیا تعلق؟ ایک بزعم خود نقاد نے ناک بھوں چڑھا کر الزام لگایا کہ طنز و مزاح کی وبا تو پھیلا چکے اب حضرت اقبال سے گستاخی کی سوجھی ہے —— حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی فکر و فن، اور مطالعۂ اقبال کے نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کے ظریفانہ پہلوؤں پر اس موضوع کو اقبال کے مرتبہ کے منافی سمجھ کر بہت کم گفتگو ہوئی ہے۔ زیر نظر شمارہ کے ذریعہ اقبال کے اکبری رنگ کو اجاگر کر کے اس کمی کی تلافی کی گئی ہے۔ اس اہم کام میں ہمیں کسی قدر کامیابی ہوئی ہے تو اس کا باعث مترجم اقبال اور نامور شاعر مظفر مجاز ہیں جنھیں اقبال سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ اسی عشق نے انھیں طنز و مزاح کی آگ میں کود نے پر مجبور کیا۔ اس آگ کے گلزار بننے یا نہ بننے کا فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے ورنہ مظفر صاحب کو گوشہ میں تفس کے آرام بہت ہے" وہ اس نوعیت کے کاموں سے بہت دور بھاگتے ہیں۔

شگوفہ نے اپنے مزاج اور معیار کو ہمیشہ قائم رکھا۔ غالب صدی تقاریب کے موقع پر" غالب نمبر" شائع کر کے غالب کے خوب" پرخچے اڑائے"۔ غالب اپنے طرفداروں کے اس سلوک کے متمنی بھی تھے۔ لیکن اقبال کے اطراف فکر اور فلسفہ کا ایک ایسا حصار ہے کہ طنز و مزاح نگار ان سے غالب کی سی بے تکلفی نہیں برت سکتے۔ اکثر مزاح نگار شاعروں نے اقبال کی زمین، تخیلات کی دنیا اور تاثرات کے ہیولوں پر اپنے شیش محل تعمیر کئے ہیں۔ تاہم اقبال کی شخصیت اور شاعری کا رعب انھیں کھل کھیلنے نہیں دیتا۔ چنانچہ اس شمارہ کی صورت گری میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑا ہمیں امید ہے کہ قارئین شگوفہ اور خاص طور سے اقبالیات سے شغف رکھنے والے ہماری اس کوشش کو پسند کی نگاہ دیکھیں گے۔

ممتاز کارٹونسٹ شعیب ربانی نے "اقبال نمبر" کے لیے شب و روز کام کر کے خصوصی کارٹون بنائے۔ نامور مزاح نگار طالب خوندمیری نے بھی کیری کیچر اور کارٹون سے نوازا۔ شعیب اور طالب کے کارٹونوں سے اس نمبر کے حسن میں اضافہ ہوا۔ میں مہمان مدیر مظفر مجاز، شعیب، طالب اور رکن ادارت محمد منظور احمد کے پر خلوص تعاون کے لیے سراپا سپاس ہوں ——!

ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

H. No. 15822/68 Vol 19 Copy 4 April 1986 Postal Regd No. H/HD-

SHUGOOFA Humorous Urdu Monthly

31, Bachelors Quarters, Mozamjahi Market Hyderabad-500 001. Phone : 557716

May 1986 Rs. 4-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد (۱۹) — مئی ۱۹۸۶ء — شمارہ (۵)

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت
حمایت اللہ ؛ محمد منظور احمد ؛ مسیح انجم

○

مجلسِ مشاورت
بھارت چند کھنہ ؛ نریندر لوتھر ؛ یوسف ناظم ؛ مجتبیٰ حسین

○

جنرل منیجر: سمیع ملیل ؛ منیجر اعزازی (دہلی) نیاض احمد فیضی

○ کتابت: محمد عبدالرؤف ؛ ○ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲..

فی پرچہ [illegible] ○ زرسالانہ [illegible] روپے ○ بیرونِ ہند سے ایک سو پچیس روپے

خط وکتابت کا پتہ: شگوفہ ، اے چیمبرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱۰۰۰ ۵ اے پی

فون آفس: 57716 ؛ مکان: 52106

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

نہیں آتی تو یاد ان کی (یادرفتگاں)

مالِ مفت (انشائیے)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر (اقبالیات)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

رفتارِ ادب

چوٹ (منظومات)

ـــــ × ـــــ

بیورو کی چند اہم مطبوعات

۱۔ دکن میں اردو

نصیر الدین ہاشمی

صفحات ۹۴۵ قیمت ۴۲/= روپے

اردو زبان و ادب کے ارتقا میں دکن کی خدمات کی ایک اہم دستاویز ہے۔ ایک عرصہ سے یہ کتاب عدم دستیاب تھی جامعات کے طلبہ اور اساتذہ پریشان تھے، نقاد اس کی تلاش میں تھے ترقی اردو بیورو نے دکن میں اردو شائع کر کے ان سب کی مشکل کا حل نکال لیا ہے۔

۲۔ فرہنگ ادبی اصطلاحات

پروفیسر کلیم الدین احمد

صفحات ۲۰۶ قیمت ۲۷/= روپے

پروفیسر کلیم الدین احمد کا آخری اور یادگار علمی کارنامہ اردو انگریزی ادب کا احاطہ کرنے والی تقریباً تمام اہم علمی اصطلاحات، اور ان کی تشریح اور وضاحت مع امثال نہایت عالمانہ انداز میں ایسی باتیں بھی ہیں جو معلومات سے بھرپور ہیں [illegible]

۳۔ فرہنگ اصطلاحات نباتیات

ترقی اردو بیورو

صفحات ۱۷۱ قیمت ۱۵/= روپے

ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے وابستہ علم نباتیات کے ماہرین کی مدد سے طالب علموں اور عام قاری کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نباتیات سے متعلق تقریباً تمام اہم اصطلاحوں کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے معیاری اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ یہ نباتیات کی درس و تدریس اور اس سے متعلق مضامین اور کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجموں کے کام کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔

۴۔ قبالیات۔ ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی۔

صفحات ۳۲۵ ۔ قیمت ۳۵/= روپے

طب یونانی سے متعلق مختلف موضوعات پر ترقی اردو بیورو نے جدید معلومات پر مبنی کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ قبالیات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی اور [illegible] اہم کتاب ہے جس میں ۲۰ ابواب میں اناٹومی اور فزیالوجی، حمل اور قبالیات کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ طالب علموں کے ساتھ ساتھ حکیموں اور ڈاکٹروں کے لیے بھی اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

۵۔ منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ

شجاع الدین فاروقی

صفحات ۳۴۷ قیمت ۶۵/= روپے

دنیا کے اہم ممالک کے دستوروں کے مطالعہ کے لیے پڑھیے ترقی اردو بیورو کی اہم کتاب منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ جس میں قوموں اور ملکوں کے سیاسی نظاموں اور ان کے دساتیر کا بھرپور جائزہ آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ حوالوں سے مزین اور معلومات کا خزانہ لیے ہوئے۔

۶۔ عام لسانیات

پروفیسر گیان چند جین

صفحات ۶۹۱ قیمت ۷۵/= روپے

لسانیات ایک جدید علم ہے جو دن بدن مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کا تازہ ترین علمی کارنامہ "عام لسانیات" اس شعبہ میں ایک اضافہ ہے جس میں ۲۴ ابواب میں لسانیات کے مختلف پہلوؤں کا ماہرانہ انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب زبان اور علم زبان کی درس و تدریس میں ایک نیا اضافہ ہے۔

۷۔ حیات جاوید (دوسرا ایڈیشن)

مولانا الطاف حسین حالی۔

صفحات ۹۰۴ قیمت ۳۰/= روپے

مولانا الطاف حسین حالی کا ایک عظیم الشان کارنامہ جو اردو زبان و ادب میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔ اس میں سر سید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی سرکاری، قومی، علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کا مفصل بیان ہے جو بذات خود ایک تہذیبی [illegible] ہے۔

ملنے کا پتہ: شعبۂ فروخت و نمائش

ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم۔ نئی دہلی ۶۶

کنھیا لال کپور

تجربہ بڑی چیز ہے

منشی مانا دین کا تکیہ کلام ہے۔ "تجربہ بڑی چیز ہے" انھیں زندگی میں کئی عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور قریب قریب ہر واقعہ نے ان کے تجربہ میں اضافہ کیا۔ ایک دفعہ انھوں نے روپے پتلون کی جیب میں ڈالے۔ جیب میں سوراخ تھا۔ جس میں سے وہ گر گئے چنانچہ اس دن سے وہ ہر نوجوان کو نصیحت کرتے ہیں۔ "برخوردار نقدی ہمیشہ کوٹ کی جیب میں رکھنی چاہیئے۔ پتلون کی جیب میں سوراخ ہوا کرتا ہے جس میں سے وہ نیچے گر جاتی ہے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ ریل گاڑی میں سوار ہونے کے لیے وہ اس وقت اسٹیشن پر پہنچے جب گاڑی کے چھوٹنے میں صرف دو منٹ باقی تھے انہیں یکلخت یاد آیا وہ اپنی عینک گھر پر بھول آئے ہیں۔ بھلا گر گاڑی چلنے والی تھی۔ اس لیے گھر جا کر عینک نہ لا سکے۔ اس تجربہ سے انھوں نے یہ اصول اخذ کیا۔ گاڑی کے آنے سے کم از کم دو گھنٹے پہلے اسٹیشن پر پہنچ جانا چاہیئے۔ کیوں کہ اگر آدمی عینک گھر پر بھول جائے تو وہ اسے گھر جا کر لا سکتا ہے۔

منشی مانا دین دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ ہمیشہ ناتجربہ کار شخص ہی نقصان اٹھاتا ہے۔ ایک دن فرمانے لگے:۔
اردو شاعروں کو اس لیے ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ بھلے مانس اپنے تلخ تجربوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے ہیں"

ہم نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"
انھوں نے جواب دیا۔ دیکھئے ذوق کہتے ہیں۔

پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو   دلِ خانہ خراب کی باتیں!

اور غالب فرماتے ہیں

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

ظاہر ہے یہ دونوں شاعر اگر اپنے پچھلے تجربوں کو نظر انداز نہ کرتے تو بار بار کوئے جاناں کا رخ کرکے اپنی

بے حرمتی نہ کراتے "

قرض دینے کے معاملہ میں ان کا تجربہ ہے کسی دوست کو قرض نہیں دینا چاہیئے۔ اور چار و ناچار دینا ہی پڑے تو کسی اور دوست سے قرض لے کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اگر قرضدار قرض واپس نہ کرے تو افسوس نہ ہو ان کا ایک اور تجربہ ہے جونہی کوئی دوست آپ سے قرض کا مطالبہ کرے۔ آپ مسکرا کر کہیں۔

" عجیب اتفاق ہے۔ میں آپ سے قرض لینے کے لیے آپ کے ہاں جانے والا ہی تھا۔ کہ اتنے میں آپ قرض لینے کے لیے میرے ہاں آگئے!"

کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ان کا تجربہ اتنا وسیع ہے کہ بڑے بڑے ماہر بھی ان کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ وہ پورے وثوق کے ساتھ کہا کرتے ہیں " ایشیا میں ہم تیسرے آدمی ہیں۔ جو جانتے ہیں۔ کہ کونسی چیز کو کونسی چیز کے ساتھ نہیں کھانی چاہیئے "

اکثر اپنی علمیت اور قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ امرود کھانے کے بعد دودھ نہیں پینا چاہیئے۔ دودھ پینے کے بعد پنیر نہیں کھانا چاہیئے۔ مولی کھانے کے بعد شربت نہیں پینا چاہیئے۔ شربت پینے کے بعد کیلا نہیں کھانا چاہیئے۔

ایک بار انہیں پتہ چلا کسی شخص نے ٹماٹر کھانے کے بعد لسی پی لی ہے۔ انھوں نے فوراً پیشگوئی کی۔ یہ شخص اگر ہیضہ سے بچ گیا تو قولنج کے درد میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور شام سے پہلے اس کی موت ہو جائے گی جب وہ نہ مرا تو اس کے بچ جانے کی یہ وجہ بتائی کہ اس شخص کے جسمانی نظام میں کوئی نقص ہے۔ ورنہ اسے ضرور مر جانا چاہیئے تھا۔

کچھ چیزوں کو وہ زہر سے بھی زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہے۔ نمک انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ نمک کے بعد جو چیز ان کے جسم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے وہ کھانڈ ہے ان کا خیال ہے اگر کوئی شخص پچیس سال تک نمک اور کھانڈ نہ کھائے۔ وہ پچیس سال زندہ رہ سکتا ہے۔

شادی کے بارے میں ان کا تجربہ ہے اگر شادی اور چودہ سال قید بامشقت میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہو۔ تو موخر الذکر کو ترجیح دینی چاہیئے۔ وہ اس لیے کہ چودہ سال کے بعد قیدی رہا تو ہو جاتا ہے۔ ان کی رائے میں ہر شخص شادی کرنے کے بعد ایک ایسے جال میں پھنس جاتا ہے۔ جس سے کبھی رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس ضمن میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک شعر کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔ وہ شعر ہے ؎

لے اسیر دل میں تیرے آزاد شامل ہو گیا وہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمندِ زلف کا

ان کا ایک اور تجربہ یہ ہے۔ اگر مجبوراً شادی کرنی ہی پڑے۔ اپنی ہونے والی بیوی کی زبان کا معائنہ کر لینا چاہیئے۔ اگر وہ گز بھر لمبی ہے اس سے کبھی شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ چاہے وہ زلیخا سے زیادہ خوبصورت اور قلوپطرہ سے زیادہ نازک اندام ہو۔

جہاں تک چیزیں خریدنے کا تعلق ہے ان کا تجربہ ہے۔ کچھ چیزیں خود خریدنے کی بجائے اپنے ہمسایوں کو مشورہ دینا چاہیئے۔ کہ وہ انہیں خریدیں۔ مثلاً سائیکل، اسکوٹر، ٹیلیویژن۔ اور جب وہ انہیں خرید لیں۔ ان کو اس طرح استعمال کرنا چاہیئے۔ جیسے وہ انہوں نے نہیں آپ نے خریدی ہیں۔ یا جیسے وہ اصل میں آپ کے لیے خریدی گئی ہیں۔

جوانی میں ماتا دین کو ایک دفعہ ایک نہایت خوشگوار تجربہ ہوا تھا۔ ایک کتے نے جس کے متعلق مشہور تھا،

...صرف بھونکتا ہے۔ انھیں کاٹ کھایا تھا۔ اور اس طرح اس کہاوت کو جھٹلا دیا تھا کہ جو بھونکتے ہیں وہ ...تے نہیں۔ ایسے ماتا دین کو تمام کہاوتیں مشکوک نظر آنے لگیں۔ چنانچہ اب وہ بڑی خود اعتمادی کے ...ۃ کہتے ہیں۔

"کسی بھی کہاوت میں کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ ہم نے کئی بار سر منڈوایا لیکن اولے نہیں پڑے۔ ہمارا ...ر دبار ایسے بادلوں سے پالا پڑا۔ جو گرجتے بھی تھے اور برستے بھی تھے۔ ہم نے بے شمار ایسے چور ...ے جن کی ڈاڑھی میں تنکا نہیں تھا۔ ہم ایک بار لنکا گئے تھے۔ وہاں ہمیں کوئی شخص نظر نہ آیا جو باون گز کا تھا۔"

ماتا دین کا یہ بھی خیال ہے کہ کچھ کہاوتوں میں غلط قسم کے مشورے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک کہاوت ...: "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔ اس کہاوت کے خالق کو اتنا بھی معلوم نہیں۔ کہ ...صل کے برباد ہونے کے بعد پچھتایا نہ جائے۔ تو چڑیاں ہر بار کھیت چگ جایا کریں گی۔ اور کسان ہاتھ ملتا جائے گا......!! [روزنامہ "ہند سماچار" سے]

ضمیر جعفری (پاکستان)

جھونپڑوں میں بھی ہیں شکلیں پیاریاں

باسیاں، بے سُرخیاں، بے چاریاں — عورتیں مہنگائیوں کی ماریاں
حسن کچھ میراث محلوں کی نہیں — جھونپڑوں میں بھی ہیں شکلیں پیاریاں
ملک ہو یا فرد، چل سکتی نہیں — مفلسی کے بیچ نمبرداریاں
زندگی کی ہر پرت میں دیکھئے — نارضامندی کی ناہمواریاں
بھوک سے لاچار تھے جو، اب انہیں — لگ گئیں خوراک کی بیماریاں
کالجوں میں عام بچوں کو نہ ڈھونڈھ — لوگ ہلکے اور فیسیں بھاریاں
ناروے کی برف میں یاد آگئیں — جھنگ اور جہلم کی کیسر کیاریاں

ڈھونڈھتا ہوں اس مشینی ملک میں
گاؤں - گائیں - گاگریں - پنہاریاں

محمد عبدالکریم ماہر

غزل

جمع ہیں کالج میں لڑکے لڑکیاں — ہو رہی ہے عاشقی بھی ہول سیل
کی نہیں ایم اے سے شادی کس لئے — تھا مقدر میں لکھا کہ مڈل فیل
کھانے دے بیگم کو دفتر کی ہوا — گھر میں بیٹھے بیٹھے پاپڑ بیل
اس کے سایے میں پنپتا کون ہے — زلفِ جاناں ہے کوئی آکاش بیل
ٹوٹ کر جل کر گرے [illegible] — دور تک آتی نہ تھی میری فصیل
مر رہے ہیں بھوک سے اہلِ وطن — ہو گئی بیماری کی گھر گھر ریل پیل
روٹی کپڑا اور مکاں ملتا ہے مفت — قتل کرتے کیوں نہیں آباد جیل

شفیقہ فرحت (بھوپال)

پانی پانی

شہر حیدرآباد میں تالابوں اور نلوں سے لے کر آنکھوں تک کا پانی غائب ہو چکا ہے (یہاں آئینوں اور تلواروں کی خبر نہیں۔!) اسی لیے اب وہاں پانی پلایا نہیں دکھایا جاتا ہے۔ اور کھچڑی بن پانی کی پکتی ہے۔ جو اکثر جل کے خاک ہو جاتی [?] "تلگو دیشم" سے لے کر مہاناڈو تک اس کی مثالیں ہیں۔

ریل میں جب ہم سوئے دکن رواں دواں تھے تو ہمیں مسافروں کے "توشے" میں سوٹ کیس، بستر بند اور توشہ دان کے بجائے چھلکتی لڑھکتی صراحیاں، بالٹیاں، گگریاں نظر آئیں۔ بتایا گیا کہ میزبانوں نے جو خصوصی ہدایت نامہ برائے مہمان مہمان نوازی بھیجا ہے۔ اس میں بخط جلی (موٹے حروف و سیاہ روشنائی سے) لکھ دیا گیا ہے کہ کھانا کھلانا تو آدابِ میزبانی میں شامل ہے ہی۔ مگر آپ پہننے اوڑھنے کی بھی فکر نہ کیجیے۔ وہ سب ہمارے ذمے۔ بس ہمارا ایک گھڑا پانی لے آئیے۔ ایک چلو ہم سب کے لیے۔ بقیہ آپ کے لیے۔

ایک صاحب سے ہم نے یونہی راہ میں ازراہِ گفتگو دریافت کیا: "آپ کا قیام کب تک رہے گا؟"

فرمایا۔ "جب تک موسی ندی میں پانی ہے۔"

کہا "مگر موسی ندی خود کہاں ہے"؟

بولے "اسی کی تلاش میں تو یہ ہمدردان و محبانِ سرزمینِ دکن کا قافلہ سوئے دکن جا رہا ہے۔"

محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی (کہ بار بار کی RECOUNTING اور ہر قسم کی دھاندلی کے باوجود POPULARITY VOTE دونوں کے ہر بار برابر برابر ہی آ رہے ہیں!) کے اس دیس میں اب دودھ والوں نے دودھ کی مقدار کم کر دی ہے اور قیمت بڑھا دی ہے گوالے جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ پانی کی تلاش میں دور دور تک جانا پڑتا ہے۔ اکثر پانی امپورٹ کیا جاتا ہے اس لیے دام تو بڑھ ہی گئے ہیں۔ اور چونکہ اتنی کوششوں کے باوجود ملانے کے لیے مناسب مقدار میں پانی نہیں ملتا اس لیے پاؤ کلو کو ایک کلو مان کے لینا ہوگا۔ اور صاحب یہ تو دودھ کا دام ہے۔ اگر پانی کے مول بیچا جائے تو انمول ہوگا۔

پھر دیکھا کہ ہر شخص فرہاد بنا نہر کھودنے پہ آمادہ ہے۔ تو حکومت کو ہوش آیا کہ رہا سہا شہر اور بچا کھچا پانی دونوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ تو اس نے دنوں [?] کی میٹنگ، ایٹنگ، چیٹنگ کے بعد واٹر سپلائی کا نیا پلان اور پروگرام بنایا گیا ہر سرکاری پلان کی طرح وہ چار گام کے بعد لڑکھڑا گیا۔

شہر کے ہر حصے میں پانی صرف ایک گھنٹہ جس میں نل کھولنے والے کی مرضی و موڈ کے مطابق کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ جن علاقوں میں الارم کی گھڑیوں کے پائے جانے کے امکانات اور دیکھے جانے کی صلاحیتیں نظر آئیں وہاں سکوتِ شب کو بارانِ رحمت نے لیے چنا۔ ہماری میزبان نے اسی مخصوص درجے یا شعبۂ خواص میں جگہ پائی الارم لگا کے وہ آدھی رات کو اٹھیں۔ بہ قدرِ اشکِ بلبل پانی جمع کیا۔ دوسرے دن پانی کا تو خیر کہیں پتہ نہ تھا مگر بیگم صاحبہ کے چہرے پہ ملکوتی و آفاقی سکون تھا۔ آسمانی مسرت تھی۔ کہ آج کی رات چین سے سونا نصیب ہوگا۔ کہ WATER NIGHT نہ تھی۔ بلکہ ناغہ کا دن تھا۔ اس سے اگلی رات جو قتل کی راتوں کی طرح ہوا کرتی تھی۔ قتل سے بھی المناک رات ثابت ہوئی۔ کہ جن چند قطروں پہ قناعت کی جاتی تھی وہ بھی غائب۔ واٹر ورکس کے علاقہ متعلقہ کے بار بار پھیرے لگانے کے بعد ایک صاحب نے جو اب سے پہلے محض چوکیدار ہوا کرتے تھے۔ مگر اب ان کا عہدہ جو کنٹرولر اور ڈائرکٹر جنرل تک پہنچ چکا تھا انکشاف فرمایا کہ "اونچ نیچ میں ایسا بھی ہو جاتا" "ارے بھئی کیسی اونچ نیچ ؟"

"اجی اب کیا بولنا۔ تم کا کو بھی ڈاؤن لین کو ہوتی۔ چار بجے صبو نل کھولا تو وہ ڈاؤن کو دوڑ گیا۔ اور پانچ بجے اپلو گیا۔ ایسا ہو تیچ جاتا صاب۔ اب پانی کو کیا روکنا۔ کیا سمجھا نا؟"

پھر دیکھا کہ میاں بیوی بچے۔ نوکر گاڑی میں بیٹھے ایک ایک مٹکا پانی سنبھالے چلے آرہے ہیں۔ (خاندانی یکجہتی دوستی۔ محبت۔ میل ملاپ اور طبقاتی مساوات کی یہ انوکھی مثال ایک عرصہ دراز بعد منظر نواز ہوئی!)

ایک فلم دیکھنے بلکہ دکھلائے جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسی 'دیشم' کی تھی۔ اس میں ہیروئن صاحبہ دس ہزار اسٹیل کے گھڑوں کے ارد گرد آگے پیچھے۔ اوپر نیچے عجیب و غریب رقص کرتی ہیں۔ اس وقت تو ڈائرکٹر پروڈیوسر کی فضول خرچی اور کم عقلی پہ ماتم کیا تھا مگر اب ان کی الہامی قوتوں اور دور اندیشیوں کے قائل ہو گئے۔ انھیں پہلے سے ہی ملک کی حالتِ زار کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا حسین نازک اندام ہیروئن اور اس کی ان گنت سکھیوں کی کمر پہ گھڑے رکھوا دیئے تاکہ چلک مٹک لچک کے مٹکا برداری فیشن میں داخل ہو جائے اور لوگ پانی بھرنے پہ شرم سے پانی پانی نہ ہوں۔

یوں بھی 'دیشم' نے اچھے اچھوں کو پانی بھروا دیا۔

یہ بھی سنا ہے کہ ادھر کی سرکار عوام کو گیارہویں صدی میں ڈھکیل کے خود اکیسویں صدی کی طرف لپک رہی ہے۔ جانتی ہے کہ مع اہل و عیال داخلہ ممکن نہیں۔

سارا تلگو دیشم پراچین بھارتیہ سنسکرتی کو اپنا رہا ہے۔

کچے پھل۔ کچی ترکاری۔ کچے گوشت اور تیل دونوں کے استعمال پہ خصوصی انعام ساں ہے۔ کہ اس طرح نہ پکانے پہ پانی خرچ ہوگا نہ برتن دھونے پر۔

اب غالباً پیرہن بھی کاغذی ہوگا۔ یا اس مشہور زمانہ تصویر کا سا جس کا عنوان تھا "THE SPRING"

مضامین صاف، خوش خط، صفحہ کے ایک جانب لکھے جائیں۔ تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

(ادارہ)

مانک ٹالا (بمبئی)

متفرقات

سیر کرنا سلطنت روما کے کھنڈروں کی:- ہم نے زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ یہ غلطی فرما ڈالی تھی کہ ہم بھری جوانی میں ایک مرتبہ اپنی مخدومہ کو ممالک غیر کی سیر کرانے لے گئے تھے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ تھا روم۔

روم کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے چور اُچکے ہوتے ہیں۔ اس لیے سیاحوں کو جیب کھیسے سے ہوشیار رہنے کی تلقین اور تاکید کی جاتی ہے۔ روم میں مسجدیں نہیں ہوتیں اور چرچ میں لوگ جوتوں سمیت جاتے ہیں۔ اس لیے خضر کی صورت والے بزرگوں کو پہچاننے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔

جیب، کھیسے اور مال اسباب کی تو خیر کافی حفاظت کی گئی لیکن روم کی حسیناؤں کا کیا کیا جائے۔ نظر ملتے ہی دل اڑا لے جاتی ہیں۔ اور کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ دل پھینک تو خیر ہم لڑکپن ہی سے تھے۔ لیکن بیس سال کی شادی نے ہمارے لگ بھگ سبھی پر کتر دیئے تھے۔ اور ہم کافی حد تک نستعلیق قسم کے جانور بن چکے تھے۔ پھر بھی ان نامراد اکھیوں کا کیا کیا جائے۔ نظر بازی اور تاک جھانک سے باز نہیں آتی تھیں۔ بس اسی ذرا سی بات پر محترمہ ہم سے جُوت بیزار کرتی رہتی تھیں۔ اور ہم پر اور ہماری آنکھوں پہ بلکہ عینک پر بھی کڑی نگرانی رکھتی تھیں۔ اِس ذرا سی بات پر ہماری اُن کی ایک اور جنگِ عظیم ہوگئی تھی۔ خیر اِس مورچہ بازی کی تفصیل بعد میں بیان کریں گے پہلے سلطنتِ روما کے کھنڈروں کی روداد بیان کرتے ہیں کہ جنھیں دیکھنے اور عبرت حاصل کرنے کے لیے دور دراز سے سیاح تشریف لاتے ہیں۔

سلطنتِ روما کے شہنشاہوں نے اپنے اپنے عہدِ حکومت میں اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہاں کی سبھی بڑی چھوٹی عمارتوں، محلوں ماڑیوں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیں۔ بلکہ کئی جگہوں کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں عمارتوں کی جگہ کھنڈر ہی تعمیر کئے گئے تھے کیوں کہ پرانے وقتوں کے شہنشاہ بڑے دور اندیش ہوا کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ بعد میں یہ ملک اکثر و بیشتر زرِ مبادلہ کے بحران میں مبتلا رہے گا۔ اس لیے ان کھنڈروں کو آثارِ قدیمہ جیسا دلفریب اور پُر اثر نام دے کر غیر ملکی لوگوں خاص کر دولت مند امریکنوں کو اچھا خاصا بے وقوف بنایا جا سکے گا۔ اور ان سے ہوٹلوں، جوئے خانوں، ناچ گھروں اور سیر و تفریح کے نام

پر اچھی خاصی دولت بٹوری جا سکے گی۔

ہمارے ملک میں کھنڈرات کی اس قدر بہتات نہیں ہے۔ اسی لیے یہاں ٹورسٹ انڈسٹری کو اس قدر فروغ حاصل نہیں ہوا ہے۔ لیکن اب ہماری مرکزی اور ریاستی سرکاریں اس جانب دل و جان سے متوجہ ہیں۔ چنانچہ آباد کاری کے نام پر جو مختلف عمارتیں بن چکی ہیں یا زیرِ تعمیر ہیں وہ جلد ہی محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں آنے والی ہیں۔ ہمارے پرائیویٹ بلڈرز بھی اس کارِ خیر میں حکومتوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اس سر دھڑ کی بازی کے باوجود بھارت کی ٹورسٹ انڈسٹری کامیاب ہونے والی نہیں ہے۔ خود ہماری مثال آپ کے سامنے ہے۔ ہم کب سے ہیئت اور مواد۔ ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے کھنڈر میں تبدیل ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک بھی محکمہ آثارِ قدیمہ نے ہمیں اپنے زیرِ سایہ نہیں لیا۔ حتیٰ کہ اردو زبان و ادب کے پریمی بھی کبھی ہماری زیارت کے لیے نہیں آتے۔

روم کے بس ڈرائیور بمبئی کے بس ڈرائیوروں کو بھی ہر بات میں مات کرتے ہیں۔ بمبئی کے بس ڈرائیور تو کبھی کبھار بریک پر پاؤں دبا دیتے ہیں لیکن روم کے بس ڈرائیوروں کو غالباً بریک کے استعمال کی قانوناً ممانعت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ روم کی بسوں میں بریکیں لگائی ہی نہ گئی ہوں۔ اس طرح کی ایک بس میں ہم بھی ایڈم کے کھنڈرات کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ کبھی آپ نے مٹی کے کوزے میں جامنوں میں نمک ڈال کر جامن فروشوں کو جامن ہلاتے دیکھا ہے؟ بس کچھ اس طرح کی حالت ہوتی ہے روم کی بسوں میں۔ اسی سفر میں ہم ایک حسینہ سے ٹکرا کر اس کے ساتھ نمک کی طرح چپک گئے تھے۔ اور یہی وجہ تھی ہماری بیگم کے اعلانِ جنگ کی۔ انہوں نے ایسی ایسی صلواتیں سنائیں کہ کانوں سے دھواں نکل آیا۔ اتنی دیر میں ایک کھنڈراتی مقام آگیا اور انہیں طوعاً و کرہاً التوائے جنگ کا اعلان کرنا پڑا۔

چنانچہ ہم بھی باقی جوڑوں کی طرح چہروں پر مسکراہٹیں چپکا کر باہوں میں باہیں ڈال کر کھنڈر گھومنے کو نکلے۔ کھنڈرات کی سیر کرنے والے جوڑوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو خود بھی ماہ و سال کے تغیرات کے باعث کھنڈر کھنڈر ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے چہروں پر ایک خوشگوار طمانیت سی جھلکتی تھی جیسے نو سو چوہے کھانے کے بعد بلی کے چہرے سے جھلکا کرتی ہے۔

پرانے زمانے کے ایک فوارے کے پاس بس رکی تو لوگ باگ اس میں سے اتر اتر کر اس فوارے کے حوض میں سکے ڈالنے لگے۔ کہتے ہیں کہ اس میں سکے پھینک کر منت مانیں تو مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ کوئی ایک سکہ ڈال رہا تھا، کوئی دو اور اکٹھے تین تین۔ ایک صاحب سے ہم نے سکے ڈالنے کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ پتا چلا کہ ایک سکہ ڈالنے والے ربّ العالمین کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ ہمیں صحیح سلامت واپس روم پہنچا دے۔ زیادہ تعداد ایک سکہ ڈالنے والوں ہی کی تھی۔ ہم نے اللہ میاں کو زیادہ رشوت پیش کرنے کے خیال سے دو سکے ڈال دیئے اور ہماری محترمہ نے تین ـــــ ہماری اس حرکت پر ایک امریکن محترمہ کہ جن کے چہرے پر ایک ایسا سکون مترشح تھا کہ جو کئی مُردوں سے [illegible] پر ہی آسکتا ہے، ہم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگیں "دو سکے ڈالنے کا مطلب ہے دوسری شادی کی خواہش۔ یعنی کہ تم طلاق یافتہ ہو اور اپنی محبوبہ (ہماری مخدومہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اور انہوں نے تین سکے ڈالے کہ وہ اپنے پہلے خصم سے نجات حاصل کر کے تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میری اور میرے [illegible] تمہارے ساتھ ہیں۔"

ہم نے عرض کیا کہ محترمہ یہ بات نہیں۔ ہم میاں بیوی ہیں۔ اور زندگی بھر شادی کی اس فرسودہ گاڑی کے پہیوں کی طرح ایک دوسرے کے متوازی گھومتے رہیں گے اور ان متوازی پہیوں کی طرح ہمارا ذہنی ملن ناممکن ہے۔ حتیٰ کہ ایک پہیہ ٹوٹ کر ہم توڑ دے گا۔ ہماری اس طرح کی دقیانوسی باتیں سن کر وہ ناک بھوں چڑھانے لگیں غالباً اس لیے کہ مغربی ممالک میں THROW AWAY کا رواج عام ہے۔ بیئر پیو خالی ڈبہ پھینک دو۔ مشروب پیو خالی بوتل پھینک دو۔ ریستوران میں کھانا کھاؤ پلاسٹک کی خالی پلیٹیں اور چھری کانٹے کچرے کے ڈبے میں پھینک دو۔ پھر مرد عورت کیوں ایک دوسرے سے چپکے رہیں؟ عورت نے مرد کو استعمال کیا اسے کھورے پر پھینک کر ہاتھ جھاڑے اور دوسرے مرد کی تلاش شروع کر دی۔ علیٰ ہذا القیاس۔

مردوں کا سال!

کئی سال پہلے یو۔ این۔ او نے عورتوں کا سال منایا تھا۔ حالاں کہ عورتیں پیدائشی ستم پیشہ ہوتی ہیں لیکن اس ایک سال میں عورتوں نے جو ستم ڈھائے اُن کی یاد آتے ہی آج بھی رونگٹیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم مردوں کو کیا کیا تگنی کا ناچ نہ نچایا گیا۔ کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ رحم و کرم اور حیا عورتوں کا گہنا ہیں۔ حیا کو تو خیر انہوں نے اسی روز تلانجلی دے دی تھی جس روز میکس فیکٹر نے بلش آن (BLUSH ON) کی ایجاد کی تھی۔ لیکن رحم کا تھوڑا سا مادہ جو عورتوں میں بچ رہا تھا یو۔ این۔ او کی مہربانی سے عورتوں نے اُسے بھی پتیلی کے گندے پانی کی طرح کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور مردوں کے اشک سرخ سے رنگ حنا کا کام لیا۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ طویل شب فراق سے بھی طویل سال ختم ہوا۔ تو یو۔ این۔ او۔ والوں نے بچوں کے سال کا اعلان کر دیا۔ وہ بچے جو ہماری آنکھ کا اشارہ پا کر سہم جاتے تھے اب ہمیں آنکھیں دکھانے لگے۔ بات بے بات ممی سے ہماری شکائتیں کر کے ہمیں پھٹکاریں کھلانے لگے۔ حالانکہ پہلے بھی کھانے کے بدلے یہی بہشتی میوہ میسر ہوتا تھا۔ آئس کریموں اور ٹافیوں کی مانگ بڑھ گئی۔ بڑھیا کپڑوں اور جوتوں کے تقاضے بھی بڑھ گئے۔ حتیٰ کہ "ہیپی برتھ ڈے" جو پہلے دوسرے تیسرے سال منایا جاتا تھا اب ہر دوسرے تیسرے مہینے منایا جانے لگا۔ اسکول سے ملا ہوا ہوم ورک جو پہلے بھی ہم ہی اُن کے لیے کرتے تھے۔ لیکن اُن غلط سلط جوابوں پر ٹیچروں کی جو پھٹکار پڑتی تھی پہلے اس پھٹکار کو شیر مادر سمجھ کر پی جایا کرتے تھے۔ اب وہ سارا غصہ ہم پر نکلنے لگا۔

اللہ اللہ کرتے یہ سال بھی گزر گیا۔ اس کے بعد اندھوں۔ اپنگوں۔ (بھیک منگوں۔ ننگے لفنگوں) اور نجانے کن کن کے سال منائے گئے لیکن نہ منایا گیا تو ہم مردوں کا سال۔ حالاں کہ ہم اللہ میاں کی سب سے بے زبان اور مظلوم مخلوق ہیں۔ بار برداری کے گدھوں کی طرح بیوی بچوں اور افسرانِ بالا کا بوجھ ڈھوتے ہیں۔ گدھا بھی کبھی کبھی غصے میں آکر دولتی جھاڑ دیتا ہے لیکن ہم ہیں کہ دم کبھی نہیں مار سکتے دم بھی نہیں مار سکتے۔ کبھی بھولے بھٹکے ایسی ویسی حرکت کرنے کی جسارت بھی کر بیٹھیں تو منہ کی کھاتے ہیں

اسکول میں بچوں سے پالتو جانوروں کے نام پوچھتے ہیں تو بھیڑ بکری کتے، بلی، گھوڑے گدھے کے ساتھ ڈیڈی کا نام بھی نتھی کر دیتے ہیں لیکن جب وحشی جانوروں کا نام پوچھا جاتا ہے تو شیر، چیتے۔ لگڑ بگھے وغیرہ کے ساتھ کبھی ممی کا نام نہیں جوڑتے۔

تنگ آمد بجنگ آمد ـــ ایک مرتبہ ہم نے ان ناانصافیوں اور بے رحمیوں سے تنگ آکر محکمۂ انسدادِ

بے رحمی جانوراں کے محکمے میں رپٹ لکھانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ادھر سے بھی ہمیں ٹکا سا جواب ملا کہ یہ محکمہ چار ٹانگوں والے جانوروں کی مدد کے لیے ہے۔ آپ جیسے دو ٹانگوں والے جانوروں کی مدد کے لیے نہیں۔ ہم مردوؤں کے ساتھ کیس کیس طرح کی ستم رانیاں۔ نا انصافیاں اور نامہربانیاں ہوتی ہیں۔ اللہ میاں کے کان ہوتے تو وہ بھی ہمارا دکھڑا سن کر چیخ پڑتے لیکن یو۔ این۔ او۔ والوں کے پاس ناک کان آنکھیں بلکہ مخبر بھی ہیں پھر اُن تک ہماری فریاد کیوں نہیں پہنچتی ؟

کوشش : کالج میں ہمارے ایک دوست تھے تیغ بہادر خار۔ شاعر تو خیر نہیں تھے بہرحال منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی طرح مشاعروں کی غزلوں کی ہیرا پھیری کر کے ایک آدھ غزل مینوفیکچر کر لیتے تھے اور کالج کی تقریبوں میں سُنا کر واہ واہ کے ٹھونگرے سمیٹ لاتے تھے۔ بہرحال پنجابی ہوتے کے باوجود اردو نثر بڑی پیاری اور حسین لکھتے تھے۔ ادبِ لطیف اور ادبی دنیا میں کبھی کبھار اُن کی کہانیاں شائع ہو جایا کرتی تھیں۔ نثر تو اول درجے کی لکھتے تھے لیکن ملک کی تقسیم کے بعد بمبئی آکر فلموں کو پیارے ہو گئے ہیں اور تیسرے درجے کی فلمیں پروڈیوس کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں لاہور میں ایک اور صاحب ہوا کرتے تھے۔ دیس راج رہزن۔ وہ صاحب شاعر تو کیا متشاعر بھی نہیں تھے۔ شکل صورت سے حجام لگتے تھے لیکن اُن کے سر کے بال اس طرح مونڈے ہوتے تھے جیسے کسی حجام سے نہیں بلکہ کسی بھیڑیں مونڈنے والے سے تہذیب گیسو کرائے ہوں۔ جامہ زیب بھی ایسے ہی تھے کہ فل سوٹ میں ایسے لگتے تھے جیسے کفن پہن کر چلے آرہے ہیں۔

یہ صاحب اچھے کہانی کار تھے۔ اور لاہور کے ادبی حلقوں میں مقبولیت بھی حاصل کر رہے تھے۔ اس زمانے میں کہانی کار بھی بطور فیشن اپنے نام کے ساتھ تخلص کا دُم چھلا لگا لیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے نام کے ساتھ رہزن کا تخلص ایسے لگتا تھا جیسے کسی بے تکے شاعر کی غزل کا مطلع ہی بحر اور وزن سے خارج ہو۔ ویسے بھی وہ شکل صورت سے رہزن کی بجائے جوتی چور لگتے تھے۔

ہمارے دوست خار صاحب کو اردو کے ادیبوں سے ملنے اور اُن سے دوستی گانٹھنے کا بہت شوق تھا وہ رہزن صاحب سے بھی اکثر ملا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہمیں بھی وہ اُن کے دولت خانے پر لے گئے۔ اُن کی خوبصورت بیوی کو دیکھا تو ہمیں یقین آیا کہ یہ ضرور رہزن رہے ہوں گے۔ ورنہ ان کی شکل صورت کے حساب سے کوئی چھتنی بھی ان سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوتی۔

بلاشبہ یہ حضرت افسانہ اچھا لکھتے تھے لیکن اُن کا اردو تلفظ ان کی شکل صورت سے بھی زیادہ HORRIBLE تھا۔ مانا کہ پنجابیوں کو اپنے اکھڑپن کی وجہ سے ... رعایت کی اجازت ہے لیکن اس قدر زیادہ بھی نہیں کہ گاڑی ہی پٹری سے اُتر جائے بلکہ پٹری ہی کو اکھاڑ پھینکے ۔۔۔!

لاہور میں اردو کے ادیبوں کا ایک "حلقہ اربابِ ذوق" تھا۔ جہاں نئے اور منجھے ہوئے دونوں طرح کے ادیب شمولیت کرتے تھے۔ اُن کی تخلیقات پر بڑی صحت مند اور تعمیری نقطہ نظر سے تنقید کی جاتی تھی تاکہ اُبھرتے ہوئے ادیب اپنی تخلیقات کو زیادہ بہتر بنا سکیں۔

ایک مرتبہ رہزن صاحب نے بھی اپنی کہانی پڑھی۔ کہانی کی تو سبھی لوگوں نے تعریف کی لیکن اُن کے تلفظ

کی ایک ہزار ایک غلطیاں نکال گئیں۔ حتیٰ کہ وہ "کوشش" کو "کوشش" بولتے تھے۔ حالانکہ کوشش بولنا مشکل نہیں۔

ان کے تلفظ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا گیا تو فرمانے لگے میں تو ایسے ہی پڑھوں گا۔ ایک صاحب نے ازراہِ مذاق کہا "حضرت صاحب کم سے کم کوشش کو تو کوشش پڑھنے کی کوشش فرمائیے۔"

رہبر صاحب نے جواب دیا "میں ہرگز کوشش نہیں کروں گا ــــــ!"

□□

کریک بیتاوی
(بہار)

"رات کے بارہ بجے"

اپنے کمرے کی بغل میں سُن کے کتوں کی صدا
میں نے بیگم کو جگایا رات کے بارہ بجے

شاعرِ آوارہ دن بھر کی سرگشتگی کے بعد
پیٹ خالی گھر میں آیا رات کے بارہ بجے

کرفیو میں لوٹنے اور پھونکنے کی چھوٹ تھی
میں بھی کچھ سامان لایا رات کے بارہ بجے

میرا اک شاگرد کہہ کر میرے مصرعے پہ غزل
مشورہ لینے کو آیا رات کے بارہ بجے

صحنِ مسجد سے نکل کر سوئے میخانہ چلا
یارو کس کا ہے یہ سایا رات کے بارہ بجے

کاش کوئی دیکھتا اس وقت بیگم کا جلال
جبکہ اک مہمان آیا رات کے بارہ بجے

میرے پٹنے کی خبر سُن کر میرا بیٹا کریک
ہلدی چونا لیکے آیا رات کے بارہ بجے

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

کہکشاں تک ہے

دکاں سے فاصلہ چھ میل کا اپنے مکاں تک ہے
سفر پیدل ہمارا روز ہی گھر سے دکاں تک ہے

اگر اُن کی رسائی راکٹوں سے کہکشاں تک ہے
رسائی کا ہے بس اپنی محلہ کارواں تک ہے

یہ مت پوچھو کہ میری شہر میں شہرت کہاں تک ہے
میری شہرت مغلپورے سے بس پچھلی کماں تک ہے

مرا ہمسایہ تک واقف نہیں میرے تخلص سے
بس اب خود ہی سمجھ لیجئے مری شہرت کہاں تک ہے

ہمارا دیش ہے گاڑی ہماری پھر ٹکٹ کیوں لیں
کرینگے بے ٹکٹ ہم تو سفر گاڑی جہاں تک ہے

جو ہیں جغرافیہ داں وہ وضاحت اس کی فرمائیں
ہمارے دیش کی انگلینڈ میں سرحد کہاں تک ہے

مری تصویر سے آیا جو بچوں کو ڈراتی ہے
بھیانک پن مری تصویر میں جانے کہاں تک ہے

بڑی بیوی الگ رہتی ہے اب بیٹوں کو لیکے اپنے
بڑے حضرت کی رغبت آجکل چھوٹے کی ماں تک ہے

بڑا انجینئر منجلا ہے لیڈر تیسرا ٹیچر
دلوں میں ان کے دیکھو باپ کی چاہت کہاں تک ہے

وہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے جب آتا ہے دینے پر
مگر فی الوقت اس کی دین بس چیونٹیاں تک ہے

بظاہر تو بہت ہی مہرباں ہے آجکل لیڈر
یہ تم جانو ملاوٹ اُسکی باتوں میں کہاں تک ہے

خیالوں کے محل تعمیر کرتے ہیں خیالوں میں
خیالوں کا ہمارے سلسلہ اب شاہجہاں تک ہے

ادب میں بھی ملاوٹ کا تقاضہ ہے تو پھر یارو
یہ اپنی شاعری محدود کیوں آہ و فغاں تک ہے

بہت سے بہرے جیسے سر پھرے آتے ہیں میداں میں
یہ مت کہیئے ظرافت اب ظریفِ ناتواں تک ہے

نسیم سحر (جدہ)

تل دیکھتا ہوں

تجھے جب میں اے سنگدل دیکھتا ہوں
لگے ہے کہ پتھر کی سل دیکھتا ہوں

مجھے اب کوئی نیل کرتہ نہ دیتا
کہیں زخمِ دل، مندمل دیکھتا ہوں

بدن پہ نہیں ہے لنگوٹی بھی لیکن
میں خوابوں میں کپڑے کی مل دیکھتا ہوں

مرا داخلہ [illegible]
[illegible] دل

[illegible] اس کو
جو میں شیخ کو مشتعل دیکھتا ہوں

مجھے ایک جھٹکا سا لگتا ہے یکدم!
جو ماہانہ بجلی کا بل کیا دیکھتا ہوں

بڑی کوششیں کیں کہ وہ مان جائے
نتیجہ مگر سب کا "تل" دیکھتا ہوں

بانو سرتاج
(چندرپور، مہاراشٹرا)

جو کچھ سُنا......

پہلے پہل جب ہم چندرپور ضلع میں آئے تو بے حد خوش تھے۔ یہ ضلع کئی ایسی باتوں کے لیے مشہور تھا جن کا ذکر ہم سنتے آئے تھے یا کتابوں میں پڑھ رکھا تھا۔۔۔ جیسے ہم نے سُنا تھا کہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں پیڑ ایک ساتھ جہاں جگہ ہوتے ہیں وہ جگہ جنگل کہلاتی ہے۔ بغیر لباس کے رہنے والی، منہ ہاتھ پیٹ پاؤں کو رنگنے والی ایک مخلوق ہوتی ہے جسے آدی واسی کہا جاتا ہے۔ امیری غریبی کا فرق مٹا کر تمام انسانوں کو مساوی حقوق دلانے کے خواہشمند کچھ انسان ہوتے ہیں جو نکسلائٹ کہلاتے ہیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ویسے یہ ضلع بدنام بھی کافی تھا۔۔۔۔ فطرت انسانی ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر اچھی چیز کی برائیاں ڈھونڈی جاتی ہیں۔۔۔ کہا جاتا تھا کہ افسروں کے عتاب کے شکار ماتحت عموماً اس علاقے میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ جو کچھ ہی دنوں میں یہاں کے گرم موسم، غیر معمولی بارش اور جما دینے والی ٹھنڈ سے تنگ آکر درست ہو جاتے تھے اور پھر کبھی افسروں کے سامنے سر اٹھانے یا افسروں کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

مگر شوہر نامدار یہاں عتاباً نہیں بلکہ پرموشن پر بھیجے گئے تھے سو ہم نے مسرت سے دیار غیر کو گلے لگایا۔۔ ہمیں بے حد مایوسی ہوئی جب ہم نے چندرپور میں ہر چیز کو خلافِ روایت اور خلافِ حکایت پایا۔

ہم نے پرائمری اسکول کی جغرافیہ کی کتاب میں اس ضلع کے جنگلات کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ حتیٰ کہ چندرپور میں ٹرانسفر کی خبر جب ہم نے لندن میں بس گئے اپنے چچا جان کو دی تو انھوں نے لکھا، تمہارے خط سے ان دنوں کی یاد تازہ ہو گئی جب میں اور بھائی جان (والد مرحوم) وہاں کے جنگلوں میں شکار کھیلا کرتے تھے کیا جنگل تھا۔ قدم قدم پر سانبھر، ہرن، جنگلی بکرے قدم بوسی کو آجاتے تھے۔ اصرار کرتے تھے کہ ہمیں بھی شہر لے چلو اور ہم ان کے اصرار کو ٹال کر کسی نہ کسی کو جیب میں ڈال کر گھر لے ہی آتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ؛ اس خط نے جذبۂ تجسس کو ہوا دی۔ جنگل دیکھنے کا شوق تھا۔ اب نہ گھوڑا دور تھا نہ میدان۔ جنگلی علاقے میں تھے۔ آفس کی جیپ تھی۔ حوصلے جوان تھے بس نکل پڑے۔

شہر کی آبادی سے آگے نکلتے ہی ڈرائیور نے کمنٹری شروع کر دی۔ "یہاں پہلے بے حد گھنا جنگل تھا

بھی رات کی طرح گہرا اندھیرا چھایا رہتا تھا، کچھ کلومیٹر آگے جانے کے بعد راستے کے دونوں طرف کے خالی میدان کی طرف اشارہ کرکے کہا، "یہ سانبھر کے شکار کا بہترین علاقہ تھا، یہ جو نالہ دیکھ رہی ہیں آپ۔ یہاں چلچلاتی دھوپ میں بھی شیر آرام کرتے دکھائی دے جاتے تھے۔ اِس سڑک کے اُس پار دیہاتی ٹولیوں میں ہی گزرتے تھے۔ پھر ڈرائیور نے ایک جگہ جیپ روک دی۔ بولا۔ یہ سڑک ابھی کچھ برس پہلے بنائی گئی ہے ورنہ جنگلی بھینسے یہاں تک آجاتے تھے۔ سفید موزے پہنے ہوئے جنگلی بھینسے کبھی کبھی جیپ اور کاروں کو ایک ٹکر سے اُلٹا دیتے تھے۔ وہ دُور اُس طرف تندربن شروع ہو جاتا تھا۔ جھنڈ کے جھنڈ مور بانسوں کے جنگل میں گھوما کرتے تھے"۔

ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ "چُپ بھی کرو۔ اب کچھ ہے بھی کہ بس تھا ہی تھا"۔

ڈرائیور نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "کہاں بائی صاب۔ اب جنگل کہاں۔۔ بس جنگل کا ذکر رہ گیا ہے۔ جیسے ہمارے بزرگ ہمیں سنایا کرتے ہیں کہ اُن کے زمانے میں دو پیسے مَن گیہوں اور پیسہ سیر گھی ملتا تھا۔ اُسی طرح ہم اپنے بچوں کو جنگل کی کہانی سُنایا کریں گے کہ بیٹا۔ ہمارے زمانے میں لوگوں کو گرمی یوں نہ کھاتی تھی جیسے آج کھاتی ہے۔ پانی کی قلت نہ ہوتی تھی۔ جنگلی جانوروں کے مسکن اجاڑے نہ جاتے تھے۔ لاکھوں کروڑوں درخت ساتھ ساتھ پھلتے پھولتے تھے مگر کسی کی نظر میں نہ آتے تھے"۔

پھر ہمیں اپنے ضلع کے آدی واسیوں کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ہم تو سوچتے ہیں وہ زمانہ جلد آئے گا جب دنیا کی چکا چوند، خود غرضی، بے کاری اور مفلسی سے تنگ آکر انسان پھر پہاڑوں کا رُخ کرنے لگا اور آدی واسیوں کی طرح زندگی گزارنا چاہے گا۔ ہم نے آدی واسیوں کی بستی تک جانے کا پروگرام بنایا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ ہم انہیں پہچانیں گے کیسے؟ نیم برہنگی ابھی تک اُن کی خاص پہچان تھی جیسے مہذب طبقے نے اپنا لیا تو شرم سے پانی پانی ہو کر آدی واسیوں نے پورا لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔ اطلاع فراہم کرنے والے کے لہجے میں خاصی اُداسی تھی مگر ہمیں خوشی ہوئی۔ ہم نے برملا اس کا اظہار بھی کر دیا۔ انہوں نے اُسی بے نیازی سے کہا "تو اب آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔"؟

اس بے ہودہ، نامعقول سوال پر ہمیں غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئے۔ کہا "ہم ان کا رہن سہن، اُن کے جسموں کا گودنا وغیرہ دیکھنا چاہتے ہیں"۔

وہ خبردار کرتے ہوئے، بلکہ ڈراتے ہوئے بولے۔ "آدی واسی بستیوں میں نہیں رہتے"۔ "کافی اندر جانا پڑے گا۔ مگر سنبھل کر جایئے کہ کہیں نکسلائٹ کے شبہے میں دھر نہ لیے جائیں"۔

ہمارا سارا جوش دھرا رہ گیا۔ انہوں نے نکسلائٹ سرگرمیوں اور پولیس سے اُن کے 'تعلقات' کے بارے میں ایسے ہولناک واقعات سنائے کہ ہم نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ آدی واسیوں کے چہروں کے گودنوں کی جھلک پر ہی اکتفا کرکے رہ گئے۔

اس شہر کے مچھروں نے بھی ہمیں بے حد مایوس کیا۔ ان کے بارے میں ہم نے کہیں پڑھا تھا۔ پڑھتے بھی کیسے؟ کون سے دیا۔ کئی پیا ہوتے ہیں کہ تذکرہ ہوتا مگر ہوائی یہ تھی کہ چندرپور کے مچھر نازک بدن۔ نازک خیال، نرم دل اور خوش گلو ہیں۔ نہایت مہذب بھی واقع ہوئے ہیں۔ جیسے ان معنی میں کہ جب تک کوئی کھانا کر پیٹ بڑا کر کے انہیں دعوت نہ دے تو وہ نہیں فرماتے۔ سُنا تھا کہ فیملی پلاننگ میں یقین رکھتے ہیں اس لیے اتنی تعداد میں کبھی نہیں

ہوتے کہ پریشانی کا باعث ہوں۔ ہم نے ایسے شمالی مچھروں کا ذکر پہلے کبھی نہیں سنا تھا اس لیے دید کے متمنی تھے۔ مگر ہم سے ملنے کہیے یا ہمارا استقبال کرنے کہیے کہ مچھروں کا جو پہلا ڈیلی گیشن آیا وہ ان تعریفوں کے قطعی منافی تھا۔ کراہیت کی حد تک بے ڈھول، بھونڈی آواز میں اُلٹے سیدھے راگ الاپتے ہوئے وارد ہو گئے نہ سلام نہ کلام۔ محبت سے لپٹ گئے۔ پہلے تو ہم سمجھے کسی اور شہر کا ڈیلی گیشن ہے۔ وہاں کے طور طریقے اسی طرح کے ہوں گے مگر تعارف ہوا تو جانا کہ اسی ضلع کے رہنے والے ہیں۔ ہر شئے پہ چھایا ہوا اُن کا راج تھا۔ کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں وہ نہ تھے۔ بدرو میں استراحت فرماتے تھے تو صاف پانی کے مٹکوں کے نیچے بھی قیام کرتے تھے۔ گندے کپڑوں کے ڈھیر میں رہتے تھے تو اُجلی دُھلی چادروں پر بھی صاف "چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں" والی مصروفیات میں شامل رہتے تھے۔ کان میں گھس کر زبردستی راگ سنانے کی اُن کی قوم کی پرانی عادت ہے ہی۔ مگر انتہائے محبت میں منہ میں بھی گھسنے کی کوشش کرتے تھے۔ بات کرتے وقت منہ کھولنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ▭▭

امتحان کا چوّا

مختار یونس

ٹیوٹر

ٹیوشن پڑھا رہا ہوں بڑی دھوم دھام سے　　؛　　لیتا ہوں نقد فیس ہر اک خاص و عام سے
واقف ہوں ممتحن کے رہائش مقام سے　　؛　　ریزلٹ سنوار لیتا ہوں ٹیلی گرام سے

امپورٹنٹ سوال کراتا ہوں حل یہاں
کے جی کے کتنے طفل بنے کونسل یہاں

طالب علم

پرچہ کہاں چھپا تھا پتہ مجھ کو چل گیا　　میں کوچۂ پریس میں بھی سر کے بل گیا
جب ہال امتحان میں زیرِ بغل گیا　　نگراں تھا ہوشیار پتہ اس کو چل گیا

پرچے پہ لال پین سے کچھ تبصرہ لکھا
میں تین سال کے لیے مرحوم ہو گیا

سرپرست

پولس کے زیرِ سایہ ہوا آہ! امتحان　　مشکل سوال دیکھ کے روتی تھیں بیٹیاں
ریزلٹ کے بعد کرنا ہے اُن سب کی شادیاں　　اِن نمبروں پہ گر نہ ہوئے آپ مہرباں

مٹی کا تیل ڈال کر چولہا جلائیں گی
یہ جل مریں گی موت کو دولہا بنائیں گی

ممتحن

اکزامنر ہوں آپ کا پرچہ ہے میرے پاس　　آئے ہیں آپ دُور سے کر کے ضلع کراس　　CROSS
بندہ ہے داس آپ کا ہرگز نہ ہوں اداس　　زیرِ وصفت کو میں بناتا ہوں فرسٹ کلاس

نمبر کے ساتھ کچھ تو مگر پیش کیجیے
دریا دلی کا چیک بہ پیش کش دیجیے
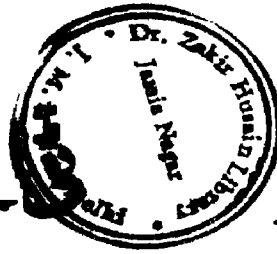
ٹی۔وی کے بغیر

مفلس فاروقی

بچوں کا تھا تقاضا بیوی کا تھا تقاضا
سب کا کئی دنوں سے ٹی۔ وی کا تھا تقاضا

قسطوں پہ جا کے آخر اک دن خرید لایا!
گویا چراغ والا اک جن خرید لایا!

اس دن سے گھر کی میرے حالت نہ مجھ سے پوچھو
کیا بن رہی ہے میری درگت نہ مجھ سے پوچھو

چھوٹے بڑے سب اس کے دیوانے ہو گئے ہیں
ٹی۔وی کی شمع کے سب پروانے ہو گئے ہیں

دن رات سارے گھر میں اک انتشار سا ہے
سب کو چڑھا ہوا اک گویا بخار سا ہے

پینے کی سدھ نہیں ہے، کھانے کی سدھ نہیں ہے
بچوں کو مدرسے تک جانے کی سدھ نہیں ہے

بیوی کچن میں جا کر کیونکر پکائے کھانا
ٹی۔وی پہ آ رہا ہو جب کھیل ایک شہانا

کرکٹ کے میچ کی تو کچھ بات ہی نہ پوچھو
کیا اس کے ہیں مقرر اوقات کیا نہ پوچھو

بچے بڑے جتن سے دن رات جاگتے ہیں
جب میچ ہو تو سرپٹ ٹی۔ وی پہ بھاگتے ہیں

اک پروگرام اس پر جب خاندان آئے
ٹی۔ وی کے پاس اٹھ کر سب خاندان آئے

عالم ہی کچھ عجب ہے "یہ جو ہے زندگی" کا
ہوتا ہے جس سے ہر دم احساس تازگی کا

دلچسپ اس قدر ہے ہر پروگرام اس کا
گرویدہ ہو چکا ہے ہر خاص و عام اس کا

القصہ یہ کہ گھر میں اک شور ہے مسلسل
آٹھوں پہر ہے شورش، ہنگامے اور ہلچل

ٹی۔ وی نہیں ہے گویا اک قہر ہے، بلا ہے
اک مرض ہے کہ جس میں ہر شخص مبتلا ہے

دفتر کو اپنے اکثر بن کھائے جا رہا ہوں!
کرنی کا اپنی پھل میں اس طرح کھا رہا ہوں

دفتر سے لوٹتا ہوں جب گھر تھکا تھکایا!
کھاتا ہوں صبر کر کے دوپہر کا پکایا

پیتا ہوں چائے بھی اب ہوٹل میں جا کے اکثر
سوتا ہوں اپنے ہاتھوں بستر لگا کے اکثر

سن لے جو بات میری فرصت کہاں کسی کو
ٹی۔ وی کے مشغلوں سے مہلت کہاں کسی کو

سوچا کہ اونے پونے جیسے ہو بیچ آؤں
اور اس بلائے جاں سے اپنا گلا چھڑاؤں

بیوی کے پاس جا کر، بچوں کو بھی بلا کر
ظاہر کیا ارادہ اک روز موقع پا کر

سکتہ ہوا سبھی کو سنتے ہی یہ اچانک
دیکھا ہو جیسے سب نے سپنا کوئی بھیانک

اک لمحہ یونہی بیتا پھر ہوش میں سب آئے
اور ہوتے ہوتے آخر پھر جوش میں سب آئے

بولا ہر ایک نے جب کھولی زبان اپنی!
ٹی۔ وی کے واسطے ہم دیدیں گے جان اپنی

ٹی۔وی پہ ہی جئیں گے۔ ٹی۔وی پہ ہی مریں گے
ٹی۔ وی بغیر آخر ہم جی کے کیا کریں گے

○

یشخ رحمٰن اکولوی

اور ہم بیمار ہوئے....

صبح کی چائے کے بعد سودا سلف کے نام پر دکان داروں سے جھک جھک، ناشتے پر اسکول کے ہوم ورک کے سلسلے میں بچوں کو پھٹکار، دوپہر بارہ بجے سے پانچ بجے تک دفتر میں مغز ماری، رات کے کھانے پر بیوی سے تو تو میں میں، پھر رات گئے تک دوستوں کی محفل میں گپ بازی۔

یہ تھے ہمارے روزانہ کے نامعقول معمولات، جن سے اب ہم صددرجہ اکتا گئے تھے اور ان سے کچھ دنوں کے لیے چھٹکارا حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہے تھے اور آخرکار ہم اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اپنے ذہن میں مرتب شدہ ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم لندن پلٹ (LONDON RETURN) ڈاکٹر ماروتی کے ہاں جا پہنچے، ان کا دواخانہ مریضوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مطلع صاف نہ دیکھ کر ہم باہر ہی کھڑے رہ گئے، مریضوں کی بھیڑ چھٹی تو ہم اندر داخل ہوئے اور جھٹ سے ایک کرسی پر براجمان ہو گئے کہ کوئی دوسرا اس پر قابض نہ ہو جائے، ہندوستان میں یوں بھی کرسی لوگوں کی کمزوری ہو کر رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر ماروتی بیماریوں کا علاج کم کرتے ہیں لوگوں کو بیماریوں میں مبتلا زیادہ کرتے ہیں۔ ان کے بیماری ناموں (MEDICAL CERTIFICATES) کی بڑی مانگ ہے، چاہے کوئی محکمہ ہو، افسران ان کے بیماری ناموں کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے سرٹیفکٹ کے بغیر اپنے کسی ماتحت کو بیمار ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے کوئی ماتحت کسی دوسرے ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ داخلِ دفتر کرے تو اس کی ماں روتی ہے، مطلب یہ کہ اس کی چھٹی جلد منظور نہ ہوگی، اسے قرض (LOAN) ملنے میں دیر لگے گی۔ ڈاکٹر ماروتی کا سرٹیفکٹ ساری دفتری منزلوں سے فوراً گزر جاتا ہے، ایسا کیوں؟ واللہ اعلم! بہرحال قصہ مختصر! ہم نے ڈاکٹر موصوف سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب ہم بیمار ہونا چاہتے ہیں" "بصد شوق!! فرمایئے آپ کس مرض میں مبتلا ہونا پسند کریں گے؟ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، بس ہٹے کٹے مسٹنڈوں کو ایسے ایسے موذی امراض میں مبتلا کر چکا ہوں کہ اچھے اچھے ڈاکٹر دہائی لول گئے۔ آپ کہیں تو دردِ دل، دردِ جگر، دردِ شکم میں مبتلا کر دوں کسی الرجی سے آپ کا رشتہ جوڑ دوں آپ کے خون کا دباؤ کم زیادہ کر دوں، یا کسی نفسیاتی مرض کی آڑ دیں آپ کو لے لوں۔ کہیئے کیا کہتے ہیں؟؟

" ڈاکٹر صاحب ہم اپنے روزمرہ کے معمولات سے بری طرح اوب گئے ہیں، اور تبدیلی ماحول کیلئے
خود پر کسی فرضی بیماری کو مسلط کرلینا چاہتے ہیں تاکہ اس بہانے کم از کم ایک مہینہ دفتر سے چھٹی ہوجائے اور
ہم گھر کے صحت بنانے کا موقع بھی مل جائے" " بہتر تب تو کسی معمولی درد سے بھی آپ کا کام چل جائے گا۔ ورنہ
آج کل ایک بیماری (MYSTHENIAGRAVIS) کا بڑا چرچا ہے، بیماری کیا ہے، بیماریوں کا اچھا خاصا
مجموعہ ہے فالج، نروس بریک ڈاؤن، احساس کمتری، ناطاقتی (MYSTHENIAGRAVIS) بیماری۔
" اداکارا امیتابھ بچن اسی بیماری میں مبتلا ہے، بڑی ہی LATEST بیماری ہے۔ ابھی ابھی اس کا
نام رکھا گیا۔ اس بیماری کے نام پر کسی بھی شخص کو دفتر سے برس دو برس کی چھٹی بہ آسانی مل سکتی ہے"۔ "تو آپ
ہمیں کسی بیماری میں مبتلا کر رہے ہیں نا" ہم نے اس بچے کی طرح للچا کر یہ فقرہ کہا جسے اس کی فرمائش کے پورا ہونے کا
یقین پہلے ہی دلایا جاچکا ہے۔

" میری رائے ہے کہ آپ پسلی کے درد میں مبتلا ہوجائیں" ڈاکٹر نے بڑی اپنائیت سے کہا اور پھر ایک
آنکھ دبا کر بولے " بائیں پسلی کے درد میں"۔
" ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے "؟
" میرا مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں مالش کرنے کا کام بیگم کے ذمے ہوگا" پھر انھوں نے معنی خیز انداز میں ایک
قہقہہ لگایا۔ اب ہم خوشی خوشی گھر کی طرف چلے جارہے تھے، ہماری جیب میں ڈاکٹر ماروتی کا سرٹیفکٹ تھا جس کی رو
سے ہم بائیں پسلی کے درد میں مبتلا تھے اور ہمیں ایک مہینے کے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ اور مکمل علاج کے لیے ہزار
روپے خرچ ہونے کا اندیشہ تھا۔ ہم نے سوچا اس سرٹیفکٹ کی بنیاد پر دفتر سے ایک ماہ کی رخصت مل جائے
گی اور قرض (LOAN) بھی مل جائے گا، لطف رہے گا۔ قرض ملنے کی بات ذہن میں کیا آئی ہرے بھرے
نوٹ آنکھوں کے سامنے لہلہانے لگے، اور خوشی کے مارے ہماری چال میں تیزی آگئی۔ لیکن جیسے ہی ہم اپنے
مکان کے قریب پہنچے ہم نے اداکاری شروع کردی، اب ہمارے چہرے سے ناتوانی اور پریشانی برسنے لگی۔
قدم دھیرے دھیرے بڑھنے اور اٹھنے لگے، چال ترچھی ہوگئی، دائیں ہاتھ نے بائیں جانب کی پسلیوں کو تھام لیا۔
جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے بیگم " ہائے اللہ کیا ہوا؟ " کہہ کر ہماری طرف لپکیں اور ہم نے دل ہی دل میں اپنی
کامیاب اداکاری پر خود کو داد دی، بیوی کو بے وقوف بنانا آسان کام نہیں ہوتا، ہم نے بھرائی ہوئی آواز میں
جواب دیا " کچھ نہیں بیگم! ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ڈاکٹر ماروتی نے انکشاف کیا کہ ہم بائیں پسلی کے درد میں مبتلا ہیں"۔
" لیکن پہلے کبھی آپ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا، یکایک یہ کیسے ہوگیا؟ " بیگم نے حسب عادت جرح کی۔ بیگم، بیماری
اور سالی کا کوئی بھروسہ ہے نہ جانے کب آدھمکیں۔ عام حالات میں لفظ " سالی " بحث وتکرار کا باعث بنتا لیکن اس
وقت حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بیگم ٹال گئیں۔ " آیئے پلنگ پر لیٹ جایئے" بیگم نے ہمیں سہارا دے کر
لٹا دیا۔ جب ہم نے بیگم کو بتایا کہ ہم نے دفتر سے ایک مہینے کی رخصت لینی ہے تو انھوں نے یہ کہہ کر داد دی کہ
" ہم نے خلاف عادت زندگی میں پہلی بار عقل مندی کا کام کرکے شیخ چلی مرحوم کو مایوس کیا ہے"۔
ہم بیمار کیا ہوئے ہمارے دن پھر گئے بیگم جو پہلے گھر لو کام اور چار عدد بچوں کی وجہ سے
برائے نام بیوی ہو کر رہ گئی تھیں ہماری خدمت میں لگی رہتیں، ہماری بیماری کی خبر سیلاب کے پانی کی طرح پھیل گئی

تھی اور عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ عیادت کرنا بھی ایک فن ہے اور اس فن سے ناواقفیت کی وجہ سے عیادت کرنے والے بیمار کے لیے وبالِ جان ہو جاتے ہیں۔ عیادت کرنے والوں نے ہماری بیماری سے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کچھ یوں کیا تھا۔

"کہیں کوئی پسلی اندر سے ٹوٹ نہ گئی ہو"

"گُردے کے درد کی ابتداء پسلی سے شروع ہوتی ہے"

"دل کا دورہ اکثر اس طرح کے درد کے بعد پڑتا ہے"

آخر الذکر خیال سن کر ہمارے منہ سے ہائے نکل گئی۔ اس "ہائے" کے نتیجہ میں ہمارا غریب خانہ عیادت کرنے والوں سے یکلخت خالی ہو گیا، انھوں نے سوچا کہ مبادا ہماری یہ ہائے "الوداعی ہائے" واقع ہو اور ہماری موت کا الزام ان پر آ جائے اس لیے وہاں سے کھسک جانا ہی ان لوگوں نے بہتر سمجھا۔ بیگم پریشان ہو اُٹھیں اور قرآنی آیات کا ورد کرنے لگیں اور ہم بیگم کی پریشانی سے محظوظ ہوتے رہے۔

ہم نے سوچا تھا کہ بیمار ہونے پر پھل، خشک و تر میوے اور دنیا جہاں کی نعمتیں نوش کریں گے، صحت بنائیں گے لیکن ہماری اُمید بر نہ آئی، اور پرہیز کے نام پر ہمارا کھانا پینا حرام کر دیا گیا۔ کھانسی زکام ہونے پر کھانسنے اور چھینکنے سے جسم کو جھٹکے لگیں گے، ان جھٹکوں سے پسلی کا درد بڑھ سکتا ہے اس لیے سرد پھلوں کا پرہیز، خشک میوے ثقیل ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے پیٹ میں گیس بنے گی۔ یہ گیس درد میں اضافہ کر سکتی ہے اس لیے یہ بھی ممنوع، ہم بیمار کیا ہوئے اچھے خاصے پرہیزی آدمی ہو گئے اور معاملہ یک نہ شد دو شد والا ہو گیا ایک طرف مرغوب غذاؤں سے محروم کر دیئے گئے، دوسری طرف پرہیز اور مقوی غذاؤں کے نام پر نہایت بدمزہ چیزیں کھلائی پلائی جانے لگیں۔ اُبلی ہوئی توڑ کی دال کا پانی، پھٹا ہوا دودھ، اُڑد کی بھیگی ہوئی کچی دال، بکری کے گوشت کا پھیکا شوربہ، کلیجی کا عرق اور ستم بالائے ستم اُبلا ہوا پانی۔ قصہ مختصر! پرہیزی کھانوں کی وجہ سے ہماری صحت دن بہ دن گرتی گئی اور چھٹیاں ختم ہوتے ہوتے ہم "ٹائیفائڈ" میں مبتلا ہو گئے۔ فرضی بیماری کے نام پر جو لون (LOAN) لیا تھا وہ بھی غیر ضروری کاموں میں خرچ ہو چکا تھا، اس لیے اب حقیقی بیماری کے لیے چھٹی اور لون کے لیے درخواست کر دی ہے اور دفتر سے اس کی منظوری کے منتظر ہیں!!

غزلیں

نیاز سواتی (پاکستان)

پاس سرمایہ ہوا تو تیرے گُن گائیں گے لوگ
جیب خالی ہوگئی تو غیر بن جائیں گے لوگ

دولتِ قارون بھی ان کو عطا کر دیں اگر
دامنِ حرص و ہوا کو پھر بھی پھیلائیں گے لوگ

نکتہ چینی کو بناؤ تم نہ اپنا مشغلہ
ورنہ لٹھ لیکر تمہارے پیچھے پڑجائیں گے لوگ

بھیگی بلی بن کے تجھ سے قرض تو لے جائیں گے
تجھ سے پھر سو بار چکر گھر کے لگوائیں گے لوگ

زندہ رہنا ہے تو بدھو بن کے رہنا چھوڑ دے
ورنہ تگنی کا تجھے سب ناچ نچوائیں گے لوگ

ریٹ گر بڑھتے رہے یوں ہی حجامت کے نیاز
داڑھی مونچھیں سال میں اک بار منڈوائیں گے لوگ

○

وہ قرض اپنا بھول ہی جائے خدا کرے
وہ قرض مانگنے کو نہ آئے خدا کرے

ہم کال کے بہانے چلیں روز اُس کے گھر
وہ گھر پہ ٹیلی فون لگائے خدا کرے

بہکا رہے ہیں باس کو میرے مخالفین
وہ اُن کی ہاں میں ہاں نہ ملائے خدا کرے

خالی ہے جیب آخری ہفتہ ہے اِن دنوں
مہمان آج گھر میں نہ آئے خدا کرے

ناصح پہ آشکار نہیں لطفِ میکشی
تھوڑی سی کوئی اس کو پلائے خدا کرے

پڑھ کر نماز کرتا ہوں ہر روز یہ دُعا
وہ آج میرا قرض چکائے خدا کرے

گھر آئے ساس شوق سے میرے پر اے نیاز
مجھ سے نہ اہلیہ کو لڑائے خدا کرے

○

قید سے اپنے عدو کو کیوں رہا کرتے ہیں آپ
پھر سے کیوں اُلجھن میں خود کو مبتلا کرتے ہیں آپ

سیر ہو کر جو بہت رشوت لیا کرتے ہیں آپ
اس سے کچھ افسر کو بھی حصہ دیا کرتے ہیں آپ

کاش ماتحتوں سے اور پبلک سے بھی یوں ہی ملیں
جھک کے اپنے باس سے جیسے ملا کرتے ہیں آپ

آپ کا اک لفظ اک گھنٹے میں پڑھ سکتا ہوں میں
ہاتھ سے یا پاؤں سے خط کو لکھا کرتے ہیں آپ

نثر پر بھی آپ کچھ احسان فرمایا کریں
صرف شعروں پر ہی کیوں مشقِ جفا کرتے ہیں آپ

○

شوہر بحضورِ اہلیہ

اک شخص شکو دیر سے باہر سے لوٹا گھر کو جب
بیگم کے ڈر اور خوف سے
آتے ہی اپنے گھر میں وہ
جھولا جھلانے لگ گیا، بچے کا جو ننھا سا تھا
جب آنکھ بیگم کی کھلی
[illegible]

بیگم سے وہ کہنے لگا:۔
"اے جانِ من! جانِ وفا!
بچہ تمہارا دیر سے روتا ہے جھولے میں اِدھر
لیکن بڑے آرام سے سوئی ہوئی ہو تم اُدھر"
شوہر کا یہ جملہ سُنا تو اہلیہ کہنے لگی:۔
"مجھ کو [illegible]

میں نے نہیں کھیلیں تمہاری طرح کچی گولیاں
بچہ تو میرے بیڈ پہ ہے آرام سے سویا ہوا
اور تم عبث مصروف ہو جھولا جھلانے میں یہاں

نظر برنی (نئی دہلی)

شاعر کا خط سامع کے نام

محترم نظر نواز، تسلیم

ادھر کافی دنوں سے میرے دل میں ایک خلش تھی کہ میں آپ سے مخاطب ہو کر شکایت کروں کہ حضرت ایسی بھی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ شاعر داد کا بھوکا ہوتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ شاعر کی فطری کمزوری اپنے کلام کی اشاعت ہے۔ جب تک وہ دوسروں کو اپنا تازہ کلام نہ سنا ڈالے واقعی اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ دنیا شاعر جیسی مخلوق سے اسی لیے گھبراتی ہے کیوں کہ یہ مخلوق اپنے پیٹ کا درد دور کرنے کے لیے سامعین کو تختۂ مشق بناتی ہے اور پھر یہ اپنے شکار کو اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک کہ اس کا شکار لقمۂ اجل نہ ہو جائے۔

محلے کا ایک لڑکا بتا رہا تھا کہ آپ اس کو سبزی منڈی میں ملے جہاں آپ کچھ سبزیاں خرید رہے تھے۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ آپ اس لارج اسکیل (LARGE SCALC) کی شاپنگ کے بعد میرے غریب خانے پر ضرور تشریف لائیں گے اور گزشتہ ایک ماہ کی تخلیقات سننے کی زحمت گوارا کریں گے۔ اسی غرض سے میں نے اپنی بیاض سرہانے رکھ لی تھی مگر آپ تو ڈوج دے گئے۔ ایسا کیوں؟ میں تو اپنا کلام سنانے کے لیے آپ کی پورے دن کی "دہاڑی" ادا کر دیتا ہوں۔ ساتھ کا ناشتہ اور کھانا بونس کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ پھر یہ تغافل کیوں؟

آپ شاید اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ شاعری ایسے ویسے لوگوں کا دھندا نہیں۔ اس کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت ہے۔ وہ زمانے لد گئے جب شعرا کو یہ شکایت ہوتی تھی۔

اللہ کسی شخص کو شاعر نہ بنائے — اس کو گلہ سایۂ شیطان رہے گا
شاعر پہ ہمیشہ سے ہے اللہ کی پھٹکار — مقروض رہے گا وہ پریشان رہے گا

شاعری کے لیے بڑے جان وسط منٹ اور جسمانی و ذہنی ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ فن جوئے شیر لانے سے ہرگز کم نہیں ہوتا۔ اس عمل میں ایسی ایسی اذیتوں اور کلفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ یہ زمانہ سائنس اور مادیت کا زمانہ ہے۔ انسانی کردار کو مادی تناظر میں رکھ کر آزمایا جاتا ہے۔ بانگ اور فرائی

یعنی ڈیمانڈ اور سپلائی کے فارمولے کو شاعری میں برتا جاتا ہے مگر اس ضمن میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ شاعری ایسی جنس ہے جس کی ڈیمانڈ تو کم ہے لیکن سپلائی بہت زیادہ ہے۔ ڈیمانڈ اور سپلائی کی کسوٹی پر شاعر کو پرکھنے کے بعد ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شاعری کی اس بیقدری کے چند اہم اسباب ہیں مثلاً امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ عوام کے فکری میلانات و رجحانات، پسند و ناپسند اور ذوق جمال میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ شاعری کی مقبولیت ہندوستانی فلموں اور مشاعروں سے ضرور بڑھی ہے لیکن ادبیات میں آج بھی اس کو وہ مقام حاصل نہیں جو کہ نثر کو مل چکا ہے۔ متاخرین اور متوسطین کے دور تک اس کا طوطی بولتا تھا لیکن الطاف حسین حالی نے نثر کی وکالت کرکے زبردست ہیجان پیدا کردیا اور شاعری کی مارکیٹ ویلیو گھٹ کر رہ گئی۔

حالی کی مخالفت کے قطع نظر، ایمانداری سے جب ہم خود اپنا محاسبہ کرنے بیٹھتے ہیں تو یہ بات بھی معقول نظر آتی ہے کہ صنف شاعری ایک گھسا پٹا ریکارڈ ہے جس کو سنتے سنتے سامعین بور ہوگئے ہیں۔ یقیناً اسی لیے ہم شعرا کو آپ جیسے قدر دانوں اور سخن فہموں کی تلاش رہتی ہے اور جب آپ ایک بار ہمارے ہتھے چڑھ جاتے ہیں تو پھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ جیسے طرفدار غالب اور خریدار سخن معدودے چند ہی تو باقی رہ گئے ہیں۔

شاعر اور سامع کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر سامع نہ ہو تو شاعری فضول! جنگل میں مور ناچتا ہے تو ناچتا رہے لیکن جب تک اسے کوئی صاحب ذوق اور اہل نظر نہ دیکھ پائے تو پھر اس ناچ کا کیا فائدہ؟ شاعر اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال سکے اور اس درد کو اپنے پیٹ ہی میں پالتا رہے تو اندیشہ یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹوں میں یا تو شاعر پاگل ہوجائے گا یا پھر وہ کسی کا قتل کرڈالے گا۔ اور اگر ان دونوں متبادل حرکتوں سے باز رہا تو عین ممکن ہے کہ اخباروں کی شہ سرخیوں میں اس کی خودکشی کی خبر شائع ہو۔ چنانچہ حفظ ما تقدم کے طور پر ہماری پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ آپ جیسا سامع ملے اور ہم اپنا تخلیق آپ کے کانوں میں انڈیل کر راحت کا سانس لے سکیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم شعراء (جو روایتی طور پر بڑے خوددار اور انانیت پسند سمجھے جاتے ہیں) اپنی ان روایتی خوبیوں کو بسا اوقات بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور سامع کی طرف بھوکے شیر کی طرح جھپٹتے ہیں۔

تنقید اور وہ بھی شاعری کی تنقید ایک ادبی فریضہ اور جمہوری حق سمجھا جاتا ہے۔ شعرا کے کلام میں محاسن و معائب کی تلاش کرتے وقت بعض نقاد سرقہ کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے مگر وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ توارد اور استفادہ بھی کوئی چیز ہے؟ خیالات اور انداز بیان کوئی شاعر اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آتا۔ اگر مطالعہ اور تجربہ کی بازگشت شاعر کے کلام میں محسوس ہوتی ہے تو اس میں بیچارے شاعر کا کیا قصور؟ اور اس کو شاعرانہ سرقہ سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے؟!

شاعری کرنے سے زیادہ مشکل فن شاعری کو دوسروں تک پہنچانے کا فن ہے۔ اس فن نے قومی لعنت (NATIONAL EVIL) کی شکل اختیار کرلی ہے۔ جس کو دیکھیے وہی شاعر نظر آتا ہے۔ آزادی اور جمہوریت کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوا ہے کہ ہمارے ملک کا ہر دوسرا آدمی شاعر بنا بیٹھا ہے۔ سچ پوچھئے تو موجودہ عہد میں شعرا کی تعداد سامعین سے نسبتاً زیادہ ہے۔ اگر کوئی سروے کرایا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ معاشی، تعلیمی اور اخلاقی شعبوں کی ترقی سے کہیں زیادہ شعبۂ شعرگوئی میں ترقی ہوئی ہے جو قوم کی تنزلی سے

سنیے محترم! میں ایسا ویسا یا سڑک چھاپ شاعر نہیں ہوں۔ میں سال بھر میں دو ایک ماہ چھوڑ کر پورے
دس مہینوں تک آل انڈیا مشاعروں میں شریک ہوتا ہوں اور اسٹیج پر اچھے بھاؤ تاؤ اور کرتب دکھا دکھا کر داد و
تحسین وصول کرتا ہوں اور لوٹ بھی۔ یہ بات علاحدہ ہے کہ مجھے اس تجارت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے
کی غرض سے کافی جوڑ توڑ، مشاعروں کے کنوینروں سے دوستی اور ان کی چاپلوسی اور ضمیر فروشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اخبار
و رسائل میں اپنے فوٹو اور اپنی شاعری پر فرضی ناموں سے مضامین لکھ لکھ کر شائع کرانے پڑتے ہیں تاکہ میں اپنی
شخصیت ادبی حلقوں میں پروجیکٹ کر سکوں۔

میں مانتا ہوں کہ موجودہ معاشرہ میں عیب جوئی، غیبت اور منافقت کا بول بالا ہے بالخصوص اردو
شعرا میں ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کا عام رواج ہے۔ سنا ہے کہ ہمارے ایک حریف شاعر فرماتے ہیں کہ میں
متشاعر اور "مہمل گو" ہوں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں فن عروض سے نابلد اور نصابی تعلیم سے بے بہرہ ہوں۔
مجھے موصوف کے دونوں الزامات تسلیم، لیکن میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ارسطو، سقراط اور افلاطون کون سے
مکاتیب میں پڑھے تھے جن کو دنیا "نابغانِ عصر" سمجھتی ہے۔ رہا فن عروض سے واقفیت کا سوال، میرے نزدیک
یہ کسوٹی فرسودہ اور آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئی ہے۔ فعولن، فعلن، فاعلات کی گردان کون کرتا پھرے؟ مجھے جب
کوئی شعر کہنا ہوتا ہے تو ذرا سا گنگنانا شروع کر دیتا ہوں۔ کبھی کبھی تو غسل خانے میں ہی پوری غزل ہو جاتی ہے۔ میں
دوسروں کے مال کا قائل نہیں۔ اگر یہ عادت ہوتی تو متاخرین کے دواوین اٹھا اٹھا کر تحریف اور توارد کے پردے
میں دیوان کے دیوان شائع کرا دیتا۔ اسی لیے تو صاحب دیوان کہلوانے کے اہتمام سے ابھی تک محروم ہوں۔ سو باتوں
کی ایک بات یہ ہے کہ خیالات کسی کی میراث نہیں ہوتے بلکہ ان پر تو عوام کا استحقاق ہوتا ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے

لیڈر کی یہ پہچان کہ وہ پھولتا جائے　　شاعر کی یہ پہچان کہ موٹا نہیں ہوتا

لیکن بھائی صاحب! میرے معاملے میں یہ شعر پورا نہیں اترتا کیوں کہ میں شاعر ہوتے کے باوجود موٹا ہوں۔
ممکن ہے کہ اس کا راز یہ ہو میرے اندر یہ دونوں علتیں موجود ہیں کہ میں شاعر بھی ہوں اور لیڈر بھی۔

اچھا شاعر وہ ہے جس میں ہوٹنگ جھیلنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہو کیوں کہ ہوٹنگ کو ہضم کرنے
کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ جس شاعر کو ہدف ہوٹنگ بنایا جاتا ہے بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہی شخص مستقبل
قریب میں مقبول ترین شاعر بن گیا۔ اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک شاعر صاحب ڈائس پر کھڑے اپنا کلام
سنا رہے تھے لیکن ان کو شعر کی صحت کا خیال نہ رہا۔ خارج از بحر شعر ہونے کے باوجود سامعین کی طرف سے
مکرر مکرر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ جب کئی مرتبہ شعر دوہرانے کے باوجود مکرر مکرر کی آواز نہ تھمی تو
شاعر صاحب نے جھنجھلا کر پوچھا:
آخر وہ اس شعر کو اتنا کیوں پسند کرتے ہیں؟ تو سامعین کی طرف سے جواب آیا: آپ اس وقت تک شعر دوہراتے
رہیے جب تک شعر درست نہ ہو جائے۔ اس پر شاعر صاحب بے حد خفیف ہوئے اور مائک چھوڑ [illegible]

آج کل مشاعروں میں تین قسم کے کامیاب شعرا کو اچھا مالی فائدہ نصیب ہے۔ اول وہ شعرا جو ترنم
[illegible] کے [illegible] سے قدرے واقف ہوں۔ دوم وہ شاعرات جو حسین ہونے کے علاوہ

خوش الحانی میں بھی فارغ التحصیل ہوں اور فقرے بازی کے ہنر سے واقفیت رکھتی ہوں۔ سوئم وہ شعراء جو مزاح کے نام پر پھبتی، فقرہ بازی، پھکڑ پن اور ابتذال سے گریز نہ کریں۔ چونکہ ہم اس کسوٹی پر قطعی پورے نہیں اترتے اس لیے مشاعروں کے مقبول شعراء میں شمار نہیں ہوتا۔ البتہ ہم نے یہ نسخہ ضرور سیکھ لیا ہے کہ شعراسٹیج پر براجمان شعرا یا پھر کسی سرکردہ شخصیت کو مخاطب کرکے پیش کردیا جائے تو داد مل ہی جاتی ہے کیوں کہ کم از کم اسٹیج کے شعراء کا تو یہ اخلاقی فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس ہاتھ داد دیں تو اس ہاتھ داد لیں گے ہی۔

اور کیا عرض کردوں؟ باقی سب خیریت ہے۔ بھابی کے لیے ایک عدد ساڑھی اور بچوں کے لیے چند کھلونوں کا انشورڈ پارسل علیحدہ سے روانہ کردیا گیا ہے۔ ملنے پر اطلاع بھیج دیجیے!

فقط داد کا بھوکا

جاہل دانا پوری

عابد معز (حیدرآباد)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

مت بجائیے

بجانے کے لیے ڈھیر سارے ساز ہیں۔ ڈھول، طبلہ سے لے کر الکٹرانک گٹار تک موجود ہے۔ جنھیں استعمال کرنا ایک فن ہے۔ ہارمونیم پر راگ وہی چھیڑ سکتا ہے جسے ہارمونیم بجانا آتا ہو، طبلہ پر طبلہ ماسٹر ہی ہاتھ مار سکتا ہے۔ ستار بھی وہی بجا سکتا ہے جسے ستار بجانے کا فن آتا ہو۔ ایسے ہی دوسرے سازوں کے لیے مہارت ضروری ہے۔ ہماری نظر میں صرف ایک ہی ساز ایسا ہے جسے بغیر مہارت بجایا جا سکتا ہے۔ یہ ساز ہارن ہے ہارن بجانے کے لیے کسی فن کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دبانا شرط ہے۔ ہارن کو کیسے بھی دبائیے پوں پوں یا بھوں بھوں کرتا ہے۔ اسی آسانی کی وجہ سے ہارن حیدرآبادی شہریوں کا پسندیدہ ساز بن چکا ہے۔ سال کے بارہ مہینے، مہینے کے تیس دن، دن کے چوبیس گھنٹے، گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ ہمارے شہر میں یہ ساز حسبِ مقدور بجتا رہتا ہے۔ اور ہم جیسے ہارن بے زار لوگوں کو سر پیادے پڑنے کا محاورہ یاد آتا ہے۔

ہمارا قیاس ہے کہ گاڑیوں میں چاہے وہ ہاتھ گاڑی ہو کہ موٹر گاڑی، نئی ہو کہ پرانی، اچھی ہو کہ خراب ایک ہارن فٹ ہوتا ہے بلکہ بعض گاڑیوں میں صرف ہارن ہوتا ہے۔ ہمارے شہر کے میکانک گاڑی میں لگا ہارن بجا کر گاڑی کی بیماری کی تشخیص کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک میکانک کا خیال ہے کہ اگر ہارن اچھا ہو تو بریک کی ضرورت نہیں پڑتی اور جس گاڑی کو چلاتے وقت کم سے کم بریک کا استعمال ہو، وہ بہترین گاڑی ہوتی ہے۔

ایمانداری سے اگر دیکھا جائے تو ہمارے شہر میں ہارن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سڑکیں اتنی شاندار ہیں کہ وہ ان پر دوڑنے والی گاڑیوں کا پرزہ پرزہ ڈھیلا کر دیتی ہیں۔ رہی سہی کسر میکانک پوری کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً ہمارے شہر کی گاڑیوں کا پرزہ پرزہ لرزہ بہ اندام رہتا ہے۔ چلتے وقت اینٹ سے اینٹ بجانے کے مترادف پرزہ سے پرزہ بجتا رہتا ہے۔ زوردار آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شاک ابزاربر اور سیٹ سے چوں چوں چیں چیں کی آوازیں، انجن سے کھڑ بھڑ کی آوازیں، سائلنسر سے پھٹ پھٹ کی آوازیں اور سونے پہ سہاگہ سڑک پر موجود گڑھوں میں گرنے سے عجیب و غریب آوازیں آتی رہتی ہیں۔ دور سے پتہ چل جاتا ہے کہ گاڑی آ رہی ہے۔ ہارن کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی لیکن صاحب ہمارے ذوق کی داد دیجیے ہم گاڑی کی آواز سے اونچا بجنے والا ہارن لگاتے ہیں۔ کرنل شفیق الرحمن نے اپنے مضمون میں ایک گاڑی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس گاڑی کا ہر پرزہ سوائے ہارن کے بجتا تھا

لیکن ہمارے شہر کی گاڑیوں کے کل پرزے ہارن سمیت کورس میں ایسے بجتے ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ اگر ڈرائیور کو موسیقی سے لگاؤ ہے تو پھر کیا کہنے۔ گاڑی میں ٹیپ ریکارڈر نصب ہوتا ہے۔ گاڑی کے پرزوں ہارن اور ٹیپ ریکارڈ کے بجنے سے سڑک میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ پیدل راہ گیروں کو لگتا ہے پیروں تلے زمین سرک رہی ہے یا پھر زلزلہ کا ہلکا سا جھٹکا لگا ہے۔

جس طرح سے کمزور بینائی والوں کے لیے دو قسم کی عینک ہوتی ہے دور کی نظر کی عینک اور قریب کی نظر کی عینک اسی طرح سے ہارن بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ دور سے بچنے کے لیے اور قریب سے بچانے کے لیے ایک ہی گاڑی میں یہ دو ہارن فٹ ہوتے ہیں۔ دور سے بجنے والے ہارن کی آواز بہت تیز ہوتی ہے۔ اس کا استعمال شہر میں ممنوع ہوتا ہے لیکن ہمارے شہر میں یہی ہارن بجتا ہے۔ بجانے والے کہتے ہیں کہ شہر میں ہارن کے علاوہ دوسری آوازیں بہت آتی ہیں۔ ہارن کی آواز اس چیخ و پکار سے تیز ہونی چاہیے۔ نزدیک کا ہارن بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں سمجھیے شکریہ دیتے وقت بجایا جاتا ہے۔ دور سے بجانے کا ہارن ایک فٹ یا اس سے زائد کی دوری سے بجایا جاتا ہے۔ اکثر ڈرائیور دونوں ہارن کو ایک ساتھ یا ایک کے بعد ایک استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے شہر میں چھوٹی بڑی گاڑیوں کو مختلف قسم کی روشنی اور ہارن سے سجانا فیشن ہے۔ ہارن کی آوازیں عجیب و غریب اور موسیقی آمیز ہوتی ہیں۔ بعض لوگ گاڑیاں صرف اس شوق کو پورا کرنے کے لیے رکھتے ہیں سڑک پر چلتے ہوئے یہ گاڑیاں روشنی اور ہارن کی بدولت راہ گیروں کی توجہ مبذول کر لیتی ہیں۔ اکثر ہمیں محسوس ہوا کہ ایسے لوگ بحالت مجبوری گاڑی اس لیے چلاتے ہیں کہ وہ سواری ہے اگر ان کا بس چلتا تو گاڑی کی ہیڈ لائٹ روشن کیے ہارن بجاتے ہوئے گاڑی کو گود میں اٹھائے خود دوڑتے پھرتے ہیں۔

کسی بھی وجہ سے ٹریفک رکنے پر ہمارے شہر میں ہارن بجنے کا مقابلہ منعقد ہوتا ہے۔ مختلف النوع گاڑیاں ایک دوسرے میں گھس کر ٹیں ٹیں اور پیں پیں کرنے لگتی ہیں۔ ہمارے ایک لیڈر دوست نے اس پر یوں اظہار خیال کیا کہ ٹریفک میں بے قاعدگی کے خلاف احتجاجاً ہارن بجایا جاتا ہے۔ ہم نے کہا بھائی خاموشی سے بھی تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا "خاموشی مسئلوں کو پیدا کرتی ہے اور احتجاج مسئلوں کا حل ہے۔" ٹریفک جام ہونے پر بجنے والے ہارن کے تعلق سے ہمارے ایک شاعر دوست عرض کرتے ہیں کہ دراصل وقت گزاری کے لیے مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے۔ کسی ہارن کی بحر چھوٹی ہوتی ہے تو کوئی ہارن بڑی بحر میں بجتا ہے۔ کسی گاڑی کا ہارن تحت اللفظ میں تو کوئی ہارن ترنم سے بجتا ہے۔ کوئی ہارن قصیدہ تو کوئی ہارن مرثیہ ہوتا ہے۔

گاڑی چلانے کے لیے ایکسیلیٹر دیا جاتا ہے۔ روکنے کے لیے بریک لگایا جاتا ہے۔ انجن کو قابو میں کرنے کے لیے کلچ اور رفتار کے لیے گیروں کا استعمال ہوتا ہے۔ ان چار چیزوں سے گاڑی چلتی ہے دوڑتی ہے اور رکتی ہے۔ گاڑی چلانے کے لیے ہارن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گاڑی کے لیے ہارن غیر ضروری بلکہ چھٹی انگلی کی طرح بدنما انگشت ہے۔ غیر ضروری چیزوں کا استعمال ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ بعض لوگ صرف ہارن بجانے کے لیے گاڑی چلاتے ہیں۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے کے ساتھ ہی ہارن بجانے لگتے ہیں۔ ہارن کی آواز سن کر لوگ ان کے لیے راستہ دیتے ہیں اگر ہارن نہ ہوتا تو ایسے حضرات ہمارے شہر میں گاڑی نہیں چلا سکتے تھے۔ قبل از وقت ہارن نہ بجنے سے ان کے لیے راستہ صاف نہ ہوتا اور گویا وہ سامنے والے سے ٹکرا جاتے۔

ہمارے شہر میں چند علاقے ایسے ہیں جہاں ہارن بجانا ممنوع ہے دواخانے اور اسکول کے قریب و جوار لیکن پھر بھی ان علاقوں میں ہارن بجایا جاتا ہے۔ ہم اپنے ایک دوست کی گاڑی پر بیٹھے دواخانے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ اس علاقے میں ہارن بجانا ممنوع تھا۔ اس کے باوجود ہمارے دوست مسلسل ہارن بجائے جارہے تھے۔ ہم نے انھیں ٹوکا تو فرمایا "ہارن بجانا اس لیے ممنوع ہے کہ ایکسیڈنٹ کی صورت میں دواخانہ قریب ہے۔ لیکن میں ہارن اس لیے بجا رہا ہوں کہ ایکسیڈنٹ کی نوبت ہی نہ آئے۔

ہم تو خیر کنویں کے مینڈک ہیں۔ ملک سے باہر ہم نہیں گئے لیکن ہمارے کئی دوست باہر رہتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے شہر میں ہارن بجتے ہوئے دیکھ کر کہا ہمارے یہاں ہارن بجانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے ہارن بجانا اس کی غیرت کو للکارنا ہوتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے۔ مختلف رفتار کے لئے سڑک کے مختلف حصے ہوتے ہیں۔ خاموشی سے مقررہ رفتار پر گاڑی چلائی ہوتی ہے۔ ہم نے انھیں جواب دیا بھائی ہمارا ملک غریب ہے۔ ہماری سڑک کے حصے نہیں ہو سکتے، تمام سواریاں بالکل سیکولر طریقے سے چلتی ہیں۔ یگانگت کے اظہار کے لیے ہارن بجائے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم سفر کا لطف اٹھاتے گنگناتے ہوئے جارہے تھے کہ پیچھے سے زوردار ہارن بجا ہمیں پر صور اسرافیل کا گمان گزرا۔ ہم پریشان ہو کر ہڑبڑا گئے۔ گرتے گرتے سنبھلے اور پلٹ کر دیکھا تو ایک چھوٹی سی منی گاڑی تھی جسے ایک نحیف و ناتواں صاحب چلا رہے تھے۔ یہی ہارن موصوف کی بے خیالی میں یوں بجتا تو ہمیں یقین ہے کہ ان کی روح پرواز کر جاتی۔

ہارن کی وجہ سے ڈرائیور تو خیر سفر کا لطف اٹھا نہیں سکتا لیکن مسافرین بھی سفر سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ چند دن پہلے کی بات ہے ہم شہر کی بس میں سفر کر رہے تھے۔ ہاتھ میں فلمی ماہنامہ تھا۔ کم سن ہیروئن کی بوڑھے ہیرو کے ساتھ عشق کی داستان میں گم تھے کہ مسلسل بجتے ہوئے دلخراش ہارن نے کھڑکی سے باہر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ آس پاس کچھ نظر نہ آیا۔ صرف ہارن بجتا رہا۔ ڈرائیور بھی آواز سے تنگ آکر بس کو سڑک کے کنارے لے آیا کچھ دیر بعد ایک پرانی کھٹارا لاری جھومتے ہوئے رینگتی آئی اور کچھوے کی رفتار سے یوں گزر گئی جیسے ہم اسی کا انتظار اور استقبال کر [illegible]

مظمون [illegible] کر لیا ہوگا کہ ہم ہارن [illegible] ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ شہریوں سے درخواست کریں کہ "ہارن مت [illegible] آیا کہ جو نقار خانے میں پڑ [illegible] لیکن آواز کے ساتھ بجتے ہیں طوطی کی کون سنے گا!؟

ڈاکٹر راہی قریشی

([illegible])

مُبارک ہو!

ولیمہ ہے تو مہمانوں کو بریانی مبارک ہو
مگر دُلھے کو پانی کی پریشانی مبارک ہو!

عزیزِ جاں، قریبِ جاں، رفیقِ جاں جو ہے اب تک
وہ بعدِ عقد ہوگی دشمنِ جانی، مُبارک ہو

گھروں میں دانہ پانی ہوگیا نایاب، یہ سچ ہے
محلوں میں مگر بچوں کی ارزانی مُبارک ہو

وکیلوں سے مراسم بھی تجھے دلوا نہ کردیں گے
عدالت بھی یہ فیصلِ رب ہے "دیوانی" مُبارک ہو

سواگت کے لیے انڈے ٹماٹے لائی ہے جنتا
نئے نیتاؤں کو کپڑوں کی تابانی مُبارک ہو

ہر اک باورچی خانہ، خانہ ویرانی کا منظر ہے
یہ آٹے، دال، گھی، شکر کی؟ مُبارک ہو

خدا کا شکر، جو تھی اہلیہ بھی ہوگئیں رخصت
چلو، ہر عُقدۂ مشکل کی آسانی مُبارک ہو

خسر صاحب ہی ٹلتے ہیں نہ ساس اب گھر سے جاتی ہیں
نئے داماد کو یہ خانہ ویرانی مُبارک ہو

بہو بیٹے چلے آتے ہیں سب "قارئین" سے راہی
بزرگوں کو اب اپنے دَر کی دَربانی مُبارک ہو

ظفر چکریوی

باقی ہے (غزل)

ہمارا پیار ابھی تک جوان باقی ہے
شباب ختم ہوا، داستان باقی ہے

چلا ہے رشتی مگر اس کا بل تو ہے قائم
ہزار لٹ گئے ہم پھر بھی شان باقی ہے

بلا سے بک گئے تالاب، کھیت، باغیچے
کریں گے عیش کہ اب بھی مکان باقی ہے

یہ جھوٹ ہوگا، اگر تم کو کہہ دوں میں قاتل
کہ اب بھی تن میں مرے تھوڑی جان باقی ہے

جو گھر میں آئے ہوئے تھے وہ ہوگئے رُخصت
مگر جو دل میں تھا وہ میہمان باقی ہے

پٹائی کوچۂ جاناں میں یوں ہوئی میری
بدن پہ زخموں کا اک اک نشان باقی ہے

تمام کرکے مرا کام خوش نہ ہو ظالم
لیے قصاص مرا خاندان باقی ہے

ہماری بیوی کے کانوں میں اب بھی ہے سونا
غریبی میں بھی یہ سونے کی کان باقی ہے

امیدواروں میں سالا بھی اک وزیر کا ہے
نکل چکا ہے ریزلٹ، امتحان باقی ہے

وہ ہاتھ پاؤں چلانے کے اب نہیں قابل
مگر یہ کم نہیں، منہ میں زبان باقی ہے

ہمارے باپ کا گھر بِک گیا تو کیا ڈر ہے
ہمارے قبلہ سسر کی دکان باقی ہے

ہزار خون خرابے پہ صلح ہو تو گئی
دلوں میں جنگ کا لیکن پلان باقی ہے

ممتاز مہدی (حیدرآباد)

ٹے لی وی ژن (عرف دُور دُشمن)

ہمارے ایک پڑوسی ہیں جو دُور کے رشتہ دار بھی ہیں ـــــ دور سے دشمن بھی قریب سے ہمدم بھی۔ اس لیے ہم انھیں "دور دشمن" سے یاد کرتے ہیں۔ ہم نے دُور دشمن کو اطلاع دی کہ ٹیلی ویژن کی ایجاد ہوئی ہے تو کہنے لگے "ٹیلی ویژن سے تو میں ۱۹۵۶ء سے واقف ہوں، روسی نے حیدرآباد کی صنعتی نمائش میں پیش کیا تھا" ان کے الفاظ اور انداز سے ایسا لگا کہ جیسے دور دشمن نے ان دیکھا چانٹا رسید کیا ہو پھر انھوں نے بتایا کہ ٹیلی ویژن کو سلیس ہندی اور کھری اردو میں "دُور درشن" کہتے ہیں اور درشن کے لفظ میں عقیدت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ لہٰذا جو بھی دُور درشن پہ پیش کیا جائے اس کا بڑی عقیدت سے دیدار کرنا چاہیئے۔ ان کے انداز تکلم سے گفتگو میں تلخی کے جراثیم منڈلاتے نظر آ رہے تھے لہٰذا ہم نے بھی اُلٹا سیدھا کچھ پلانا ضروری سمجھا "دور درشن ٹی وی کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ بھارت سرکار نے اپنے ٹیلی ویژن کے ادارے یا محکمہ کا نام "دور درشن" رکھا ہے۔ جس طرح ریڈیو کے محکمہ کا نام "آکاش وانی" رکھا گیا ہے۔
بھلا تم ہی بتاؤ میرے پیارے دور دشمن ریڈیو خریدنا ہو تو کیا دکاندار سے یہ کہو گے کہ ایک عدد آکاش وانی تو بتلانا یا ٹی وی خریدنا ہو تو یہ کہو گے کہ "ایک کلر دور درشن خریدنا ہے" اور مکمل تلخی پیدا کرنے کے لیے ہم نے ایک ان دیکھا چانٹا ان کی طرف پھینک دیا پوچھا کہ "آپ کے گھر میں ٹی وی ہے"؟ کہنے لگے "نا بھیا ابھی ارادہ نہیں ہے" ہم نے ڈانٹ پلائی "پھر کل سے جو تمہارے مکان کے سر پر مرغ کی کلغی کی طرح "ANTENA" لٹک رہا ہے وہ کیا ہے"؟ وہ بھاگے بھاگے گھر گئے اور ہانپتے کانپتے لوٹ آئے اور مژدہ سنایا کہ "گھر میں بہت سے مہمان ہیں ہماری گھروالی ان مہمانوں کو جو ٹی وی کی مبارکباد دینے آئے ہیں سمجھا رہی ہے کہ ٹی وی آتے ہی خراب ہو گیا ہے اور REPAIR کو گیا ہے میرا خیال ہے اس نے کوئی نہ کوئی گھر کی چیز بیچ کر صرف انٹینا خرید لگایا ہے"۔ دور دشمن چھ مہینے تک رشتہ داروں اور دوست احباب سے پریشان رہے کوئی نہ کوئی بہانہ بتاتے رہے آخر کار انھوں نے آفس سے فیسٹول اڈوانس، سیکل اڈوانس، موٹر سیکل اڈوانس نہ جانے کون کون سے اڈوانس لیے تو انھیں ایک عدد ٹی وی نصیب ہوا۔
دور دشمن صاحب ٹیلی ویژن ہو گئے ان کی چال نرالی ہو گئی، لوگوں سے ملنے جلنے کا انداز بدل گیا۔ ہم نے ایک دن دور دشمن کو ان دیکھے چانٹوں سے سدھارنا چاہا تو کہنے لگے "ٹیلی ویژن شان کی چیز ہے اسٹانڈرڈ کی چیز ہے" ہم نے بتایا کہ ہمارے ہاں ٹیلی ویژن سات سال سے ہے لیکن ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا کہ یہ شان کی چیز ہے

پھر ان کی ہم نے جھونپڑ پٹیوں کی سیر کروائی اور بتایا کہ ٹیلی ویژن تو گھر گھر رہا نہیں، جھونپڑی جھونپڑی میں بھی آچکا ہے پھر یہ شان یا اسٹانڈرڈ کی چیز کہاں رہی البتہ ان کا یہ ان دیکھا پا فضلا ہمارے لیے قابل غور ثابت ہوا کہ ہم نے جب ٹی وی خریدا تھا تو وہ ضرورت کی نہیں بلکہ شان بلکہ حماقت کی چیز تھی چونکہ اس وقت ٹی وی پر صرف "پالو چیلو" جیسے پروگرام ہوا کرتے تھے۔ ہفتے دو ہفتے بعد دور درشن کی اکڑی گردن معمول پر آئی تو انہوں نے ایک دن جبکہ ہمارے گھر بجلی فیل تھی (حالانکہ گھر پاس پاس ہیں، بجلی کے لائن الگ الگ ہیں ہمارے ہاں بجلی فیل ہو تو ان کی لائن پر اثر نہیں ہوتا یا VICE VERSA) بہت ہی پیار اور محبت سے اپنے گھر لے گئے اور اولمپک کے افتتاحی پروگرام کا نظارہ کروایا۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر ہونے لگا کہ وہ اپنا رعب صاحب ٹی وی کی حیثیت سے جما رہے ہیں تو ہم نے ان کی توجہ ان کی نادانیوں کی طرف موڑ دی۔ پوچھا کہ "ہمارے دور درشن! ٹی وی سے آدمی کا فاصلہ کم سے کم دس تا ۱۲ فیٹ ہونا چاہیے" تو انھوں نے فوری جواب دیا کہ "یہاں کمرہ تو کمرہ دالان بھی چھ فیٹ سے بڑا نہیں ہے بھلا ہم کیسے دس بارہ فیٹ کا فاصلہ رکھیں گے" اکثر ہم دیکھا کرتے تھے کہ ٹی وی پروگرام کے بعد جب کبھی ہم سے ملتے تو ان کی آنکھیں لال انگارہ ہوتیں اور ان سے پانی بہتا رہتا" جب آنکھوں کے بارے میں پوچھا جائے تو بتاتے کہ ٹی وی پر بہت ہی SERIOUS مناظر دیکھ کر آرہا ہوں۔ لیکن آنکھوں کا راز یہ کھلا کہ دور درشن اپنے چھوٹے سے کمرے کو اندھیرا کر دیتے ہیں اور کئی لوگ جمع ہو کر ٹی وی کے دیدار کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ ٹی وی دیکھنے کے لیے شاید وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ سینما ہال کا سا ماحول ٹی وی روم کا بھی ہونا چاہیے۔ اپنی آنکھوں اور سر میں درد اور کھنچاؤ ہم نے محسوس کیا تو ان سے عرض کی کہ "بار لِلّٰہ کمرے میں روشنی کا انتظام کیجیے" کہنے لگے "آہستہ بولیے کہیں میری بیوی نے آپ کی اناڑی باتیں سن لیں تو وہ دوبارہ آپ کو آنے نہ دے گی"

دور درشن محلے والوں کو زحمت دینے کی خاطر بے وقت ٹیپ ریکارڈر کی آواز تیز کر دیتے ہیں تاکہ انھوں نے جو "دور درشن" کے پروگرام کے آغاز کی شہنائی ٹیپ کر رکھی ہے سارا محلہ سن سکے جس کے نتیجے میں کیا بچے کیا بوڑھے اپنے اپنے ٹی وی کو فوری "آن" کر بیٹھتے ہیں اور خفت اٹھاتے ہیں۔ ہم نے انہیں کے فارمولے سے انہیں کو یکم اپریل کو اپریل فول بنایا۔

ایک صبح تڑکے ہم نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ دور درشن سرکاری نل پر اپنی دھن میں مگن دانتوں پر منجن گھس رہے ہیں ان سے کچھ فاصلے پر ان کے آخری صاحبزادے کرکٹ کے یوز دیتے ہوئے کامنٹری بھی دے رہے ہیں یکایک لڑکے نے کامنٹری میں جوش بھر دیا "اور یہ ہا اظہرالدین کا خوبصورت چھکا" بس پھر دور درشن فوری خیالوں کی دنیا سے نکل آئے اور اپنے لڑکے کو صلواتیں سنائیں کہ "دن رات کرکٹ ٹی وی میں مرا رہتا ہے نہ لکھتا ہے نہ پڑھتا ہے کم بخت دور ہو جا میری نظروں سے" ان کا لڑکا فوری چھکا اور ہماری کھڑکی کے قریب آگیا اور دوبارہ کمنٹری یہ کہتے ہوئے شروع کر دی کہ "رکاوٹ کے لیے ہمیں کھید ہے"

ایک سہانی تعطیل بھری شام دور درشن بہت ہی سنجیدگی سے بولے "آج کا انسان انسان نہیں رہا، آج کا سماج، سماج نہیں رہا" ان کی باتوں سے احساس ہوا کہ وہ کسی جدید لائبریری فورم کے مباحثے میں شرکت کر کے لوٹے ہیں۔ ہم نے کہا "میاں وہی آپ کل کہہ رہے تھے کہ ٹی وی نے سماجی رشتوں کو مزید باہم جوڑ دیا ہے

وہ بھابیاں وہ چچا حضرات جن کی صورتیں دیکھ کر بہ عجلت گزر جایا کرتے تھے اب روزانہ ٹی وی کے بہانے بلاناغہ مل بیٹھتے ہیں اور یہ بھی کہ بڑے چھوٹوں کے آداب و مراسم پھر سے دیکھنے کو مل رہے ہیں کہ ٹی وی کی محفل میں جیسے ہی کوئی بڑا آیا چھوٹے نے اس کے لیے کرسی خالی کردی اور ٹی وی بچوں پر ایک احسان عظیم ہے۔ سو آپ بچپن میں فلم ماں باپ کی چوری سے دیکھا کرتے تھے اور اس شوق کے لیے سودا سلف سے پیسے چرایا کرتے تھے اور فلم چھوٹنے پر سینما ہال سے گھر تک "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرتے تھے اور اس ورد کے اثر سے بہت سی گرفتوں سے محفوظ بھی ہو جایا کرتے تھے نئی نسل کو ان ساری دشواریوں سے گزرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ نئی نسل کا تین دن کا بچہ بھی ٹی وی سے لطف اندوز ہوتا ہے یہ ساری باتیں کیا انسان کے سماجی رشتوں میں استوار کی باتیں نہیں ہیں"۔ ساری باتیں وہ غور سے سنتے رہے اور بولے "میرا خیال بھی یہی ہے کہ آج کل تو ایک آدمی دوسرے آدمی کا گرویدہ بلکہ اپنا دل نکال کر بندر کا دل لگا لے رہا ہے" لیکن پھر بھی بڑے بڑے ادیبوں کا یہی خیال ہے کہ آج کا آدمی تنہا ہو گیا ہے" تنہائی پر مزید گفتگو ہو سکتی تھی لیکن دور دشمن نے موضوع بدل دیا اور کہا "آج ہماری پوری فیملی سکنڈ شو فلم دیکھنے گئی ہے"۔ ہم نے تعجب سے پوچھا کہ "بھئی ہزاروں روپے کا ٹی وی خرید کر کیا فائدہ جبکہ فلم پر فضول خرچی بھی جاری ہے"۔ کہنے لگے "ٹی وی لاتے ہی میں نے سختی سے احکامات جاری کر دیئے تھے کہ فلم دیکھنے سینما ہال کوئی نہیں جائے گا لیکن ہم کیا ہمارے احکامات کیا! اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایک دن آدھے کا جو شوق تھا اب کم ہو کر ہفتے میں دو وقت کا ہو گیا ہے۔

ہماری گفتگو جاری تھی کہ اتنے میں ایک صاحب میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس دو چھوٹے بچوں کے ساتھ دقیانوسی میوزیم میں رکھنے لائق سیکل تھامے غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے دور دشمن سے مخاطب ہوئے کہنے لگے "بچے کہتے ہیں تمہارے گھر میں ٹی وی ہے"۔ دور دشمن ان کے انداز سے گھبرائے کہنے لگے "بچوں کو کیسے معلوم ہوا کہ میرے پاس ٹی وی ہے"۔ بچوں نے فوری کہا "ٹی وی کا انٹینا دیکھ کر"۔ دور دشمن سنبھلتے ہوئے بولے "ہے تو سہی کہیے کیا بات ہے"۔ ان صاحب نے اسی غصہ کی حالت میں کہا "فوری اپنا ٹی وی آن کرو۔ یہ بچے دیکھنے آئے ہیں"۔ دور دشمن نے ٹالنے کے انداز میں کہا "دیکھئے یہ وقت نماز کا ہے اور ہم غیر ضروری لوگوں کو گھر میں جمع بھی نہیں کر سکتے۔ معاف کرنا کسی اور کے پاس جائیے"۔ یہ سنتے ہی وہ صاحب کف کا جھاگ اڑانے لگے۔ سیکل ایک طرف پھینک دی اور انتہائی بلند آواز میں گویا ہوئے کہ "سارے ٹی وی والے میرے بچوں کو ٹی وی نہیں دکھانا چاہتے۔ ادھر ان لڑکوں کا بچہ ٹیوشن پڑھنے بیٹھا ہے، کل ان کا امتحان ہے اور یہ ضد کر رہے ہیں کہ پہلے ٹی وی دیکھیں گے پھر ٹیوشن پڑھیں گے اور امتحان کی تیاری کریں گے۔ جناب آپ کو معلوم ہونا چاہیئے دو گھنٹے سے گلی گلی کوچہ کوچہ ایک کر دیا کوئی راضی نہ ہوا اب میں دیکھتا ہوں آپ کیسے راضی ہوں گے"۔ وہ آستین چڑھا کر دور دشمن کی طرف بڑھے تھے کہ دور دشمن نے خیریت اسی میں سمجھی کہ ٹی وی دکھا دیں۔ ان تینوں کے ساتھ وہ ہیں بھی اندر لے گئے۔ سفید چاندنی بچھی تھی، انتظام اچھا ہی تھا، زبردستی کے مہمان آ بیٹھے اور ٹی وی سے لطف اندوز ہونے لگے اتنے میں ایک بچے نے کہا "پانی ــــ" بچے کے باپ نے آنکھیں گھما کر دور دشمن کی طرف دیکھا۔ دور دشمن بھاگے گئے، پانی لائے اور دست بستہ پانی پیش کیا دوسرے نے بھی پانی کی فرمائش کی دور دشمن کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ بچوں کے باپ نے دھاڑا "ایک وقت میں سب کے لیے لا لینا چاہیئے۔

دور دشمن بھاگے جگ اور گلاس لے آئے تو دیکھا کہ ایک بچے نے سفید چادر کو میلا کر دیا ہے۔ بچے کے باپ نے
کہا "اس کے لیے ایک صاف ستھری نیکر لاؤ کہیں اسے سردی لگ جائے گی" دور دشمن تقریباً روتے ہوئے
بولے "اتنی عمر کا کوئی چھوٹا بچہ ہمارے گھر میں نہیں ہے" ان صاحب کو غصہ آگیا انھوں نے ڈانٹ کر کہا "ارے
اڑوس پڑوس کہیں سے بھی مانگ کر لاؤ" دور دشمن اپنی انڈر ویر لے کر آئے۔ آدھ گھنٹے بعد ایک بچے نے
کہا "بڑی ہی زور کی بھوک لگی ہے" دور دشمن نے بھی تھوڑی ہمت اور شجاعت سے کام لیا کہنے لگے "دیکھیے!
بچوں کا ٹیچر انتظار کر رہا ہوگا، بچوں نے ٹی وی پروگرام دیکھ لیا ہے" صاحب موصوف نے بے تکلفی سے
کام لیا پروگرام کو ایک موٹی سی گالی دی اور کہنے لگے "ایک کے بعد ایک اتنے اچھے پروگرام آرہے ہیں خود
میرا دل نہیں کرتا کہ جاؤں آپ ایسا کیجیے جلدی سے تھوڑا تھوڑا دال کھانا جو بھی ہے ہم تینوں کے لیے
لائیے" دور دشمن ملائم گفتگو سے متاثر ہوگئے اور ایک ٹرے میں تین تھال میں کھانا سجائے لے آئے۔ بچوں
نے کہا "یہ اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتے آپ کو زحمت ہوگی اپنے مبارک ہاتھوں سے کھلا دیجیے" دور دشمن
نے بڑی سعادت مندی دکھائی اپنے ہاتھوں سے بچوں کو کھانا کھلایا۔ ٹی وی پر پروگرام آتے گئے
ہم دونوں کو نیند آگئی۔ بارہ بجے جاگے تو بن بلائے مہمان غائب تھے ٹی وی پر کوئی سمیلن چل رہا تھا اور گھر کا
بہت سا قیمتی سامان بھی غائب ہو چکا تھا ۔۔۔!!

محمد طارق (مہاراشٹر)

مُدرّس کا خط ۔ مُدرّس کے نام

میرے عزیز ترین دوست!

آداب و نیاز!

روایت کے مطابق میں آپ کے خط کا دو تین روز تک بے حد منتظر رہا۔ بالکل اس پکّے روزے دار کی طرح جو عیدِ رمضان کے چاند کا انتظار کرتا ہے۔ میری دلی کیفیت بھی ویسی ہی تھی جیسی ۲۹ویں تاریخ کو روزہ دار کی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ دلوں کی کیفیت تو صرف اللہ ہی بہتر جانتا ہے آپ کب سے اس کے کام میں دخیل بن گئے۔ بات ایسی نہیں۔ میں اپنے مشاہدہ کی بات کر رہا ہوں — ویسے مشاہدے غلط بھی ہوسکتے ہیں۔ خدا کرے میرے سارے مشاہدات غلط ہوجائیں۔" آمین"

— بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مجھ میں یہی بڑی کمزوری ہے جو بات کہنی چاہیئے وہ تو رہ جاتی ہے اور ان کہی بات لبوں پر آجاتی ہے۔ میں اپنی اس کمزوری کا خمیازہ ابھی کچھ قبل ہی بھگتا ہوں اور آج تک بھگت رہا ہوں۔ ہوا تھا یہ کہ میں نے اپنی بیوی کو باتوں ہی باتوں میں ترنگ میں آکر اپنے کالج کے دور کی داستانِ عشق سنا ڈالی۔ میری داستانِ عشق سن کر اس کا دل جل جل کر کباب ہوگیا تھا۔

اس وقت مجھے عورت کی ایک عظیم کمزوری کا خدائی وجود کی طرح یقین کرلینا پڑا کہ عورت کے لیے دوسری عورت کی تعریف ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ میں نے صرف یہ غلطی کی تھی کہ اپنی داستانِ عشق میں محبوبہ کے حسن کی تعریف کرڈالی۔ بس پھر کیا تھا وہ بے حد طیش میں آگئی بولی "وہ حسین تھی تو اُسے ہی گھر لاؤ میں تو چلی میکے۔"

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سوٹ کیس لے کر منہ اٹھا کر میکے چلی گئی۔ . . . میں اُسے روکتا ہی رہ گیا۔

— کیا کروں، سوچتا ہوں دوسری شادی کرڈالوں لیکن ابھی پہلی شادی کا ہی قرض سر سے نہیں اترا اس لیے ہمت نہیں ہورہی ہے۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا کا محاورہ بھی بے کار فضول، بکواس لگ رہا ہے۔ اس لیے اب دنیا چار فیصلہ کیا ہوں کہ وہ کوئی بھینس نہیں کہ اُس کے آگے بین بجانے پر کھونٹے سے بھی جگالی کرتی

رہے گی ــــ وہ میری بیوی ہے۔ سسرال جاکر اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر اس کے حسن پر ایک قصیدا
سُنا ڈالوں گا۔ اپنے حسن کا قصیدا سُن کر مُردہ عورت بھی جی اُٹھتی ہے وہ تو پھر ایک جیتی جاگتی عورت
ہے۔ فوراً میرے ہمراہ چلنے کے لیے بضد ہو جائے گی۔

دیکھئے ـ ہے نا! جو بات میں پوشیدہ رکھنا چاہ رہا تھا۔ زبان پر آ ہی گئی۔ بات ایسی ہے کہ جب
سے بیوی میکے گئی ہے میں شاعر بن گیا ہوں، خیر جانے دیجیے ان فضول باتوں کو۔

خاص بات یہ ہے کہ میرے پاس سینٹر نمبر ۴۲۰ سے آپکے اسکول کے انگریزی کے پرچے آئے ہیں۔

اکثر یہ ہوتا آیا ہے کہ جب بھی آپکے اسکول کے پرچے آنے ہوتے ہیں دو روز پہلے ہی واللہ اعلم کیسے
آپ کو خبر لگ جاتی ہے اور آپ کا پُرخلوص خط مع رول نمبروں کی لسٹ کے دستیاب ہوتا ہے۔ رول نمبروں کی
فہرست میں آپ یہ بھی بڑے سلیقہ سے اندراج کر دیتے ہیں کہ کون سے طالب علم کو کتنے فیصد نمبر مجھے دینے ہیں۔
نہ جانے کیوں مجھے آپ کی ارسال کردہ رول نمبروں کی فہرست دیکھ کر تھوک دوکان پر لگا اشیاء کی قیمتوں کا
بورڈ یاد آجاتا ہے۔ اب دو چار روز سے "ٹین والا" کی کرانہ دوکان پر اشیاء کی قیمتوں کا لمبا بورڈ دیکھ کر
مجھے آپ کے طویل خط کا بے صد انتظار رہنے لگا ہے۔ ذہن میں عجیب عجیب واہیات خیال آرہے ہیں۔
سوچ سوچ کر جی گھبرا رہا ہے۔ بلڈ پریشر ہائی ہوتا جا رہا ہے۔ کہیں خدا نہ کرے آپ کے دل سے قوم کا درد ختم
تو نہیں ہو گیا جس طرح آج کل دوکانوں پر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء کے لیے تقریباً "نو اسٹاک" کا بورڈ
لگا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح دردِ قوم کے لیے آپ نے اپنی گردن میں "نو اسٹاک" کی تختی تو نہیں لٹکا رکھی؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو اپنی قوم سے نفرت ہو گئی۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر اپنی قوم کا کیا ہوگا؟
دیکھیے۔ اگر کسی متعصب قسم کے شخص نے آپ کے دل میں قوم کے لیے غصّہ پیدا کر دیا ہو تو آپ غصّہ تھوک دیجیے۔
غصّہ تھوکنے کے لیے اگالدان کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی مخصوص جگہ کی جب چاہیں جہاں چاہیں غصّہ
تھوکا جا سکتا ہے۔ صرف "مہذب" چہروں کا خیال رکھنا ضروری ہے ــــ یاد رکھیے غصّہ تھوکنے والے کو
اللہ پسند فرماتا ہے اور مذکورہ غصّہ تھوکنے والے کو اللہ تو بعد میں ہماری قوم پہلے پسند کرے گی اور آپ کی
ترقی کے لیے "دست بدعا" ہو گی۔

اس لیے آپ فوراً واپسی ڈاک سے خط لکھیے اور ساتھ ہی رول نمبروں کی فہرست بھی ارسال فرمائیے۔
ہماری قوم کا خیال ہم نہیں رکھیں گے تو کیا کوئی "سوشلسٹ" رکھے گا۔ ہمارا دیسی سوشلسٹ!

میں ایک خاص بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ سینٹر نمبر ۸۴۰ سے میری اسکول کے انگریزی کے پرچے آپ کو
ارسال کئے گئے ہیں۔ رول نمبروں کی فہرست خط کے ساتھ منسلک ہے۔

سارے بچے آپ کی نگاہِ کرم کے محتاج ہیں۔ خاص طور پر اقلاً لائن رول نمبرس، انھیں O.T. کے مارکس
ملنے ہی چاہیئے کیوں کہ وہ سب میرے قریبی رشتہ داروں کی ہونہار۔ فرمانبردار اولادیں ہیں۔ باقی ماندہ طلبہ کو ۶۰٪
یا آپ کے بازوؤں میں گر دم خم ہیں تو ۷۰٪ کے نمبرات دے کر آپ اس کارِ ثواب کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔
ویسے سارے طلبہ کافی ذہین ہیں اتنے کہ میں جب انھیں انگریزی پڑھاتا تھا تو مجھ سے سوال کرنے میں ذرا بھی نہیں
جھجکتے تھے۔ اس کا اندازہ آپ کو طلبہ کی جوابی بیاض دیکھ کر بخوبی ہو جائے گا کہ انھوں نے صرف سوال ہی لکھے ہیں۔

میں آپ کے خط کا ایسے انتظار کروں گا جیسے روزہ دار مغرب کی اذاں کا انتظار کرتا ہے۔ جب تک آپ اذان نہیں دیں گے میں روزہ نہیں کھولوں گا۔ میری علامتی بات سمجھ گئے نا!!

فقط
قوم کا ادنیٰ خادم
ایم ایس بھارتی۔ ایم۔ اے (اردو، انگریزی)

حیدر

بیوی کا خط پاکر شوہر کا جواب سعودی عرب سے

لاغر تربلی کی نظم "باقی خیریت" کے جواب میں

خط تمہارا پچھلے ہی ہفتے ملا تھا جانِ من
ہوگئی تاخیر خط لکھنے میں مجھ سے ابکی بار

خط لکھا ہے تم نے یا اخبار ہندوستان کا
ہر سطر بد نظموں کی ہے فقط لمبی قطار

اختلاج قلب جو مدت سے اک خاموش تھا
ہوگیا بیدار وہ خط پڑھتے ہی پھر ایک بار

ڈی ڈی اب تم کو ملے گی جانِ من نہ پھر کبھی
واپسی کی میں ٹکٹ بنوا رہا ہوں ہوشیار

کیوں کہ میرا ایگریمنٹ اب مکمل ہوگیا
کر رہا ہوں ان دنوں میں پھر تلاش روزگار

لیکن اب لگتا ہے کہ ہندوستان ہی کی طرح
یاں بھی سردس کی فضا شاید نہیں ہے خوشگوار

کار اور ٹی وی کی اب فرمائشیں بے سود ہیں
بلکہ ٹیپ اور سائیکل بھی بیچ دولے گل بہار

کہدو اپنے بھائی سے کہ ملکے اپنے گھر پہ ہے
آرہا ہوں دیکھنے میں خود ہی اپنا کاروبار

جو ملی تک تھا نیداری تیرے نانا جان کو
ہر برس دادی کے آنگن میں ترنی آئے بہار

تم نے امی جان سے لڑ کر نہ کی کچھ کام کی
وہ نہ ہوتیں تو کہاں سے کرتیں تم میرا شکار

گر گئی برسات میں دیوار تو میں کیا کروں؟
کہدو اپنے باپ سے بھجوادیں اٹھلی سو ہزار

کیا مری فرقت میں تم بالکل پاگل ہوگئیں؟
میں نہ آؤں گرستی ہونے کا ہو کچھ بھی دچار

ویسے بھی اک شیخ کی بیٹی ہے مجھ پہ مہرباں
بلکہ عہد و پیماں بھی اب ہو چکے ہیں درمیاں
اب فقط شادی کی ہے تیاریاں زیرِ بحث
ایسے کرنا تم دعا کہ خوش رہیں ہم دونوں بس
معاف کردینا مجھے اس بیوفائی کے لیے
بلکہ بہتر ہے کہ تم بھی بھول جاؤ اب مجھے

پاگل عادل آبادی

غزل

پینڈے ڈول سے پانی بھر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں
گنجے ہو کر کنگھا کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

باوا دادا شیر کے منہ میں پنجہ ڈال کو لڑتے تھے
بیٹے چپکلی دیکھ کو ڈر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

میراہی گھی کا دودھ کا خرچہ میری کمئی پہ چلتا تھا
بیگم بھی اب ورزش کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

مرغی خانہ کھول کو بیٹھے آتا جاتا کچھ بھی نئیں
سارے انڈے گندے کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

کام بنانا ہو تو نوٹاں لے کر آؤ بولا تھا
خالی پیلی شٹنگ کر رئیں نئیں بولے تو سنتے نئیں

ٹوٹی پکچر پہلا دن اور پہلا کھیل ہی دیکھیں گے
گر رئیں، پڑ رئیں، لڑ رئیں، مر رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

سحری کر کو سوئے تھے افطار کے نزدیک جاگیں گے
روزہ رکھ رئیں فاقہ کر رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

خود کو کھا رئیں ہوٹل میں اور جا کو سو رئیں مسجد میں
جورو بچے بھوکے مر رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

ان کو نگوڑہ دیکھ کو میں تو شادی کو ہو بولا تھا
پھر الٹا الزام بھی دھر رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

کھاتے پیتے لوگاں کی بھی حالت ایسی ہو رئی نا ں
کیئکو چھوٹے چغلی کو رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

جیسا کرنا ویسا بھرنا مولوی صاحب بولے تھے
پلٹن اپنی دیکھ کو ڈر رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

انگریزی کتوں کو پاگل روز کھلا رئیں بریانی
دیسی کتے بھوکے مر رئیں، نئیں بولے تو سنتے نئیں

سراج نرملی

غزل

قوم کے وہ جو نگہبان بنے بیٹھے ہیں
لوٹ کر دیش کو دھنوان بنے بیٹھے ہیں

کون سی گرنی کا آٹا وہ بھلا کھاتے ہیں
تنے جو پتلے تھے، پہلوان بنے بیٹھے ہیں

ہم نے دشمن کو بھی گرویدہ بنایا اپنا
بیٹھے کرتے تھے جو اب فیان بنے بیٹھے ہیں

کام دھندہ نہیں شیطان کو اب تو کچھ بھی
آج انسان ہی شیطان بنے بیٹھے ہیں

منتظر ان کا، یہاں ہے مرا ڈائننگ ٹیبل
وہ کسی اور کے مہمان بنے بیٹھے ہیں

جن کو غزلیں کبھی ہم لکھ کے دیا کرتے تھے
آج وہ صاحب دیوان بنے بیٹھے ہیں

کام ویسے ہیں نہ، اطوار ہمارے ویسے
نام کے ہم بھی مسلمان بنے بیٹھے ہیں

یہ بلائے وہ، مرے گھر کو، سراج آئے ہیں
اور زبردستی کے مہمان بنے بیٹھے ہیں

-۰- -۰- -۰-

FAN ● HATE

جہاں قدر چغتائی

شاہین کی لاٹ

اب سے پچاس سال پہلے ہم
بچے نہ رہے ہوں مگر لڑکے ضرور تھے۔
س وقت ہم نے حیدر آباد کا نام سُنا
ھا۔ اس کے بعد کانگریس نے حیدرآباد
ی جیل بھرنے کا اندولن چلایا ــــ
م نے بھی سوچا ــــ چلو حیدرآباد
لیں۔ مگر ہم نہ جا سکے
رانے برسوں بعد چھپر پھاڑ
کردینے والا فارمولا ہم پر
ہرایا اور ہم کو حیدرآباد
ہنچایا۔ مانا کہ ملک میں
ہے کی پٹریوں کا جال
ھلا ہے مگر سفر کرنے کا
قع بہت کم لوگوں کو
تا ہے۔ ہوا یوں کہ حیدرآباد
ے زندہ دلوں نے دنیا بھر
ے مزاح نگاروں کو دعوت

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کی گنبد پہ
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

دے کر بلایا اور عالمی ہیومر کانفرنس منا ڈالی۔ غلطی سے دعوت نامہ ہمارے نام بھی چلا آیا ہم سوچنے لگے خیال و عمل کے درمیان نصف صدی کا فاصلہ ہو سکتا ہے۔ مگر خوش تھے کہ ہمارے خیال نے عملی جامہ پہنا تو سہی۔ ہم حیدرآباد اس طرح گئے کہ کرایہ ہمارا یہاں کی اُردو اکاڈمی نے ادا کیا۔ قیام و طعام و سواری کا بندوبست زندہ دلان حیدرآباد نے کیا ـــــ اور ہم کو معلوم ہو کہ حیدرآباد کس طرح جاتے ہیں۔ مگر ہم جب ریلوے پلیٹ فارم پر گاڑی سے اترے تو دور بورڈ پر لکھا تھا 'سکندرآباد' ہم سامان لے کر پھر گاڑی پر سوار ہونے لگے تو لانے والوں نے بتایا کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ ہم پریشان کہ یہ کیا ہوا۔ ٹکٹ پر حیدرآباد لکھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک میزبان کی نظر پڑی اور پھر ہم سکندرآباد کے ریلوے اسٹیشن پر اُتر پڑے۔ کہا کسی سے کچھ بھی نہیں۔ کیسے کہتے، عالمی کانفرنس کے لوگ احمقانہ باتیں تو کر سکتے نہیں مگر سمجھ گئے کہ شہر کا نام ہی بدل گیا ہوگا۔ مگر ایک ہفتہ بعد واپسی پر پھر نام بدلا ہوا پایا۔ تا پیلی۔ یہ ہندوستان کا پہلا شہر تھا جو صرف اندر سے حیدرآباد ہے۔ ہم کو نام کے چکر سے نکلنا چاہیے کہ گئے تھے تو نیشنل تھے واپس ہوئے تو انٹرنیشنل ہو گئے۔ گھر پر ہمارے دوست جھنولال جی تشریف لائے اور بولے خوشی کی بات ہے کہ آپ دشمنوں کی محفلوں میں مسخری کرنے گئے تھے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا ـــــ پھر سوچا حیدرآباد والے پھر بھی بلائیں گے۔ یہ باہر سے لوگوں کو بلاتے ہی رہتے ہیں اور انھوں نے لوگوں کو بلایا اس بار اقبال سیمینار کے نام پر ـــــ چارمینار اور سیمینار کتنے پاس کی چیزیں لگتی ہیں۔ کتنی اچھی بات ہو جو ہر سیمینار' چارمینار میں ہی ہوا کرے ـــ شگوفے کا ایک نمبر جو دیکھا تو اقبال کا شخری نمبر تھا۔ ہم پچھلے ساٹھ برس سے اقبال کا نام سن رہے ہیں۔ لب پہ آتی ہے دعا بن کے ـــــ سے لیکر' مذہب نہیں سکھاتا تک ہم نے بھی پڑھا ہے۔ وہ غضب کے شاعر تھے۔ ممولے کو شاہین سے لڑا دیتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ بڑے بڑے نواب بٹیریں اور مرغ لڑایا کرتے تھے اور حکومتیں کھو بیٹھے۔ سنا ہے اقبال نے بڑی زوردار کتاب بال جبریل بھی لکھی ہے کیوں نہ لکھتے۔ مگر وہ شاعر تو تھے نہیں کہ آواز یا کے ساتھ دم نکل جاتا۔ شاعری نہیں حکیم اور ڈاکٹر دونوں تھے۔ انکی حکیمی کی جگہ جگہ ڈاکٹری کی تختیاں لگا کر مریضوں کا علاج کر رہے ہیں۔ اقبال کیا کہنا چاہتے ہیں۔ شاعری کی زبان میں ہم تھوڑا بہت سمجھتے ہیں کیونکہ ہماری اقبال سے تھوڑی بہت سلام دعا بھی تھی۔ لیکن ہندی دان نسل اقبال کی باتیں کیسے سمجھیگی۔ مگر دھڑا دھڑ اقبال پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ شاید اس لیے کہ انگریزی ادب میں شیکسپیر کا یہی حال ہے۔ اگر ہمارے ادیب شاعروں کی کھال [illegible] اسی طرح نکالتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ غالب اور اقبال سرے سے شاعر ہی نہ رہیں گے۔ ایسا ہو سکتا ہے کسی درخت کی جڑیں جب کھوکھلی ہونے لگتی ہیں تو اوپری سطح پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اقبال کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کا کام کر رہے ہیں۔ ضرور کریں مگر ہم اپنے تھوڑے سے علم میں تھوڑا سا اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے کہ اقبال کا شاہین کیا ہے۔ اس کے پروں کی لمبائی اڑتے وقت کتنی ہوتی ہے جیسے چھت کے پنکھے کی ہینسٹھ انچ تک ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ کتنی بلندی پر اُڑ سکتا ہے۔ کتنی مدت تک ہوا میں اڑتا

رہ سکتا ہے۔ کتنی دیر بھوکا اور کتنی دیر پیاسا رہ سکتا ہے۔ بسیرا کرنے کے لیے کتنی اونچی چٹان پسند کرتا ہے۔ اکیلا رہتا ہے یا شاہینہ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ شاہین کا بچہ کتنے دن میں انڈے سے باہر نکلتا ہے۔ شاہینہ کتنے انڈے دیتی ہے۔ کتنے دن ان کو سیتی ہے۔ ان میں نر کتنے اور مادہ کتنی ہوتی ہیں۔ شاہین اولاد کی پرورش میں شاہینہ کی مدد کرتا ہے یا نہیں۔ ایک انڈے کا وزن کتنے گرام ہوتا ہے۔ انڈے پہاڑ کی چٹان سے ڈھلک تو نہیں جاتے شاہین بچے دانہ کھاتے ہیں یا انڈے سے نکلتے ہی اپنا شکار خود تلاش کر لیتے ہیں۔ بچوں کو چھوڑ کر دونوں خوراک کی تلاش میں نکل جاتے ہیں یا اس کا انتظام کرنا باپ کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ ایک شاہین بچہ کتنے دن بعد اُڑنے کے لیے پر تولنے لگتا ہے اور کتنے دن بعد شکار پر جھپٹتا ہے اور کس پرندے پر۔ شاہین کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنے برس کی ہوتی ہے۔ نر اور مادہ کی پہچان کیا ہے۔ آنکھیں بند کر کے سوتا ہے یا کھول کر۔ کیا طوطے، مینا کی طرح شاہین کو پالتو بنایا جا سکتا ہے۔ کیا شاہین اپنی عمر کے آخری حصہ میں بھی اسمارٹ رہتا ہے۔ اُڑتے اُڑتے مرتا ہے یا چٹان پر بیمار ہو کر۔ ٹھیک وقت پر سوتا اور جاگتا ہے یا جب اس کا جی چاہتا ہے۔ جب شاہین بلندی سے پستی کی جانب شکار کے لیے آتا ہے تو اس کی رفتار اس وقت عمران خاں کی گیند سے کم ہوتی ہے یا زیادہ ــــ اسی قسم کے بہت سے سوال اور بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کی واقفیت سے علم و آگہی میں اضافہ ہی ہوگا اور اقبال شناسی میں بڑی مدد مل سکے گی۔ یہ سوال یوں پیدا ہوگا کہ اکثر لوگ ہم سے اس قسم کے سوالات اکثر پوچھتے رہتے ہیں اور کیوں نہ پوچھیں کسی چڑیا گھر کا نہیں اقبال کا شاہین ہے ہم تو کچھ جانتے نہیں مگر وہ سب بہت کچھ اقبال پر لکھتے ہیں ان کا فرض ہوتا ہے یا ان پر لازم آتا ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں اور بڑی کتاب نہیں تو چھوٹا موٹا آرٹیکل یا کتابچہ شاہین پر یعنی اقبال کے شاہین پر چھاپ کر ایک بڑے ادبی خلا کو پُر کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس مضمون کو غور سے پڑھ لینے کے بعد اس جانب سنجیدگی سے غور کرنے پر ہماری طرح مجبور ہو جائیں گے۔ کیونکہ اقبال کو سمجھنے سے پہلے ان کے شاہین کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے ہم اقبال کو ابھی تک نہیں سمجھ سکے جو اقبال کو سمجھ گئے وہ یقیناً سمجھدار ہیں۔ آپ خود یہ بات سوچ کر دیکھیں کہ وہ شخص جس کو اقبال کے شاہین کی قوتِ پرواز کا علم نہ ہو۔ شاعر کے خیال کی بلندی کو کس طرح چھو سکے گا۔ لہٰذا بات صاف ہے۔ اقبال شناسی کے لیے شاہین شناسی بہت ضروری۔ ورنہ بغیر دیکھے بلبل کی باتیں کرنے سے فائدہ کیا ہوگا۔ ہندوستان میں جب تک آزادی تقریر و تحریر حاصل ہے جو جی چاہے لکھو کہو زبان و قلم پکڑنے والا کوئی نہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اقبال کے شاہین کے بارے میں اتنا ہی کم جانتے ہیں جتنا میں اور میں بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے شاہین کی وجہ سے شہر بھوپال میں ادیبان شاہین نواز پر لاٹھی چارج ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہوا یوں کہ مدھیہ پردیش سرکار نے خالص ادبی بنیاد پر اور کچھ اس خیال سے کہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ والا شعر برمحل کہہ گئے ہیں۔ اقبال کی یادگار کے طور پر اقبال میدان تعمیر کرایا۔ بہت خوب صورت اور قیمتی

بس - ریاستہ نے ترتیب اک خانہ باغ' والا ہی سمجھ لیجیے - پھر جشن افتتاح ہوا جس میں وزیر اعلیٰ اور کابینہ کے دوسرے وزیر اور دی آئی پی اور ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ حسین بھی اس تقریب میں شریک تھے - ایک شاندار اسٹیج پر بھاشن ہو رہے تھے۔ ایک طرف سے آوازیں آ رہی تھیں ــــــ افتتاح نہیں ہوگا ـــ اقبال کے شاہین کو ہٹایا جائے یہ اقبال کا شاہین نہیں ہے - پولیس ڈنڈے اور تاروں کی ڈھالیں لیے تیار - کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا اور شہر کی فضا نارمل ہو گئی - نعرے بازی کی وجہ یہ بھی تھی کہ عدالت نے اسٹے آرڈر کی درخواست ٹھکرا دی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ وہ پرندہ جسکو اقبال میدان کے اونچے ستون پر بٹھایا گیا ہے اقبال کا شاہین نہیں ہے - جب تک اصلی شاہین نہ مل جائے رسم افتتاح کو روک دیا جائے - افتتاح تو نہ رک سکا مگر آج بھی تحریک جاری ہے لیکن دیکھی جا رہی ہیں - جڑی ماروں سے رابطے قائم کیے جا رہے ہیں - میں نے اپنے ایک شاہین نواز دوست سے کہا میاں ابتوہ جو بھی ہوا اونچی جگہ پر بیٹھ گیا تم ناحق پریشان ہوتے ہو وہ غصّہ میں نڈر سے بولے آپ دیکھنا ہم لوگ اس الّو کے پٹھے کو اتار کر ہی دم لیں گے - ایسے کتنوں کو اتار سکو گے ہم نے سمجھایا مگر وہ ہمارا جملہ یا تو سمجھ نہیں سکے یا سمجھ گئے اور چلے گئے - شاید بے جا نہ ہوگا اگر اس جگہ "شاہیں نشیں" کا ذکر بھی کر دیا جائے - اقبال میدان کے ایک جانب بیس فٹ اونچا ایک پتھر اور سمنٹ کا ستون یا پلّر ہے جو نیچے سے اوپر کی جانب گاؤدم ہے - آسانی سے سمجھنے کے لیے آپ اس کو الٹا گاؤدم ستون مان لیجیے - ظاہر ہے کہ اوپری حصہ چھوٹا کچھ تو قدرتی طور پر ہوگا اور کچھ چھوٹا دیکھنے سے بھی لگے گا - اس اوپر والے سرے پر ایک بہت بڑی چٹان بہت بڑی کرین کی مدد سے رکھی گئی ہے - پھر اس کو بڑی ہنرمندی سے چوکور خانے میں گول چیز کو نصب کرنے کے فارمولے کے مطابق لگایا گیا ہے پھر اوپر اس چٹان کے ٹکڑے کے سب سے اوپری حصے پہ اقبال کے شاہین کو بٹھایا گیا ہے - جی ہاں بسیرا کرتے وقت کا مجسمہ بنایا گیا ہے - قطب کی لاٹ تو آپ نے دیکھی ہوگی - نہیں تو اشوک کی لاٹ کا نام سنا ہوگا بس تو یہ تیسری شاہین کی لاٹ ہے - جس پر تو شاہیں ہے بسیرا کر والا شعر پیتل سے ڈھال کر لاٹ کی ایک جانب فٹ کیا گیا ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ بسیرا کر رہا ہے شاہیں پہاڑ کی چٹان پر - مگر کچھ لوگ نہیں چاہتے کہ وہ بسیرا کرے وہ تو کہتے ہیں شاہین کا کام پرواز کرتے رہنا ہے اور یہی بات سارے فساد کی جڑ ہے - شاہیں کی لاٹ تو ہم نے آپ کو دکھا دی اب کوشش کرتے ہیں اگرچہ کام بہت مشکل ہے کہ شاہیں بھی آپ کی نظروں کے سامنے آجائے - لاٹ والا شاہیں نہ تو سنگ مرمر سے کاٹ کر بنایا گیا ہے نہ گن میٹل کو ڈھال کر - مٹی یا پلاسٹر آف پیرس کا بھی نہیں - ایک بہت بڑے آرٹسٹ نے جدید ترین ٹیک نیک سے بنایا ہے - کسی ایسی دھات کے تاروں سے جن میں زنگ نہیں لگ سکتا آپ نے خدا بھی تک تاروں سے بنایا گیا مجسمہ نہ دیکھا ہوگا - دنیا میں کہیں ہو تو کبھی نہ کبھی دیکھ لیا جائے - یہ پہلا تار بافتہ مجسمہ ہے شاہیں کا حقیقت یہ ہے کہ میں الفاظ میں سمجھا ہی نہیں سکتا کہ کس طرح کا ہے - یہ شاہین دیکھنے میں - میں اپنی سمجھ سے وضاحت کروں گا تو سمجھا جائے گا میں بھی شاہیں پرست ہوں - ہمت کرتا ہوں اتنی بڑی لاٹ کی چھت

ہو گئی تھی۔ خدا کی مدد سے شاہین شناسی کا مسئلہ بھی حل ہو ہی جائے گا ورنہ آپ خود کبھی یہاں آکر دیکھ لیں گے سب سے
بہتر تو یہی رہے گا لیموکھا کبھی اصلی مزے کا تجربہ ہو سکتا ہے۔ پھر بھی جو وعدہ کیا ہے تو نباہنا پڑے گا۔ بس تو ایک کام کیجیے
اپنے شہر کے مشہور جھینگا بسار کو تلاش کیجیے اور اس سے کہیے کہ بھیا مجھ کو پنسل کی موٹائی والے تار کا ایک اتنا بڑا پنجرہ
بنا دے جس میں ایک بکری آسانی سے بند ہو سکے۔ پیچھے والے حصہ میں تاروں کے مضبوط پائے بنا دیے کہ مینگنیاں
نکالنے کے لیے پنجرے کو بار بار اٹھانا نہ پڑے وہ خود بخود پنجرے سے باہر آجائیں۔ وہ گھبرائے گا سمجھنے پر۔ اسے بتائیے
اتنے اونچے جتنے حلوائیوں کی بڑی انگیٹھی کے ہوتے ہیں۔ اوپر کے حصے میں پنجرے کو لٹکانے والے تار بالکل اوپر نوک دار
ہوں۔ جب پنجرہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو ایسی سڑک کی منڈیر پر رکھ دیجیے جس کے نیچے بھی ایک ایسی سڑک ہو جس
پر ہر قسم کی گاڑیاں ہر وقت گزرتی رہتی ہوں۔ کسی پل پر بھی پنجرے کو رکھا جا سکتا ہے۔ جب کوئی سیمنٹ سے بھرا ٹرک نیچے
سے گزرنے لگے تو وقت اور رفتار کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے پنجرے کو منڈیر سے نیچے سیدھا پھینک دیجیے۔ دھیان رہے
کہ پنجرہ ٹرک کے نیچے آئے اوپر ہرگز نہ آئے۔ اس کو صبح سے شام تک وہیں پڑا رہنے دیجیے۔ مختلف قسم کی گاڑیاں بے فکرا
سے گزرنے دیجیے پنجرے کے اوپر سے۔ جب شام کو آپ اس پنجرے کو اٹھائیں گے تو ایک تار کا مجسمہ بن چکا ہو گا اسی کو
آرٹسٹ کی نظر سے دیکھ کر اس کا نام رکھ دیجیے۔ جیسے جدید آرٹسٹ مصوری میں کرتے ہیں۔ لاٹ والا شاہین گو
کسی اور طریقے سے بنایا گیا ہے۔ تار کا اس لیے ہی بنایا گیا ہے کہ ہوا ہر طرف سے گزر جائے مجسمہ پر آنچ نہ آئے۔ اب
شاہین کا حال یہ ہے کہ گاؤں والے مور سمجھتے ہیں۔ شہری بچے گدھ یا چیل۔ صرف پڑھے لکھے لوگ شاہین سمجھتے ہیں۔ ایک
طبقہ ایسا ہے جو شاہین تو کہتا ہے مگر اقبال کا شاہین اس کو نہیں مانتا ــــ قصہ مختصر یہ کہ حالات نے اقبال کے شاہین کو
ایک مسئلہ بنا کر شہر کے اردو داں لوگوں کے لیے کھڑا کر دیا ہے۔ ایک خاتون کی طلاق ملک کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے اب
شاہین کی بات آگئی۔ عین ممکن ہے کل شاہین پر اسی اقبال والے شاہین پر ہنگامے پیدا ہوں۔ بابری مسجد اقبال کا
شاہین اور ہندوستان۔ بہتر ہو کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ سانپ مر جائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ہماری سمجھ میں ایک
بات آئی ہے جس سے لاٹ پر بیٹھا ہوا شاہین اقبال والا شاہین ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں نہایت بزرگ ایک
سلیم علی ہیں۔ جو پرندوں کے متعلق اتنا جانتے ہیں کہ خود پرندے اپنے بارے میں نہ جانتے ہوں گے۔ ان سے معلوم
کرنے کے بعد شاہین کی سوانح حیات شاہین کی لاٹ کے چاروں طرف کندہ کرا دی جائے۔ اقبال کے شعر لاٹ پر لکھا
دیے جائیں اور ایک بار پھر کسی وزیر جنگلات کے دست مبارک سے شاہین کی لاٹ کی رسم افتتاح کرا دی جائے۔ میدان
اقبال کا۔ لاٹ شاہین کی ــــ دونوں الگ الگ بھی ساتھ ساتھ بھی۔ ویسے شاہین لاٹ پر ... ہے۔ اسے بیٹھے رہنے
دیا جائے۔ جو شاہین کو اڑتا ہوا دیکھنا چاہیں اقبال کا کلام دیکھ لیں۔ وہ خون کو گرم کرنے کے لیے جھپٹتا پلٹتا۔ بے عمل لوگوں
کو پر پرواز بخشتا ہوا۔ عمل کی عریض و بسیط فضاؤں میں انتہائی بلندیوں پر پر پھیلائے نظر آجائے گا۔ میں سوچتا ہوں اب
کہاں ایسے شاعر پیدا ہوں گے جو انسان کے بازوؤں پر شاہین کے پر لگا کر پروازیں کریں کیونکہ مشکل سے ہی دیدہ ور
پیدا ہوتا ہے۔

سید بیکس نواز شارق

جدہ

نسیم سحر ــــــ سب کا شاعر

"نسیم سحر۔ میرا دوست ہے۔ دوست ایسا جو دوستی میں دشمنی اور دشمنی میں دوستی کرنا جانتا ہو۔ یہ اپنی ضد آپ ہے، اپنا جواب آپ ہے، اپنا حریف آپ ہے۔ اسی لیے وہ کسی سے نہیں لڑتا، کسی سے نہیں ڈرتا، دشمنوں کے گریباں پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے اپنے ہمزاد کو پکڑنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے کہتا ہے ؎

میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں آتا — اپنے ہمزاد کو پکڑتا ہوں

نسیم کا مزاج نسیم سحر جیسا فرحت بخش ہے، اس کی شخصیت کا سحر ایک بار ملنے والے کو بار بار ملنے پر مجبور کرتا ہے، اس طرح یہ نسیم سحر بھی ہے اور صبا و نسیم بھی۔

نسیم میں قلندرانہ شان ہے۔ فن کاروں کی خودداری، معماروں کا عزم، مدبروں کی فہم، صناعوں کا سلیقہ، ساحروں کا سحر اور دیوانوں کی دیوانگی بھی ہے۔ پیارے انسانوں کی وہ تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں جنہیں اوصاف حمیدہ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جن کے سبب نسیم یاروں میں یار، شاعروں میں شاعر اور ادیبوں میں ادیب ہے، اس سے دشمنی کرنا بہت مشکل اور دوستی کرنا بہت آسان ہے۔

نسیم کی مسکراہٹ اس کی شخصیت کا ایک حصہ ہے۔ وہ مسکراہٹ جس میں غیروں کے لیے دعوت، دوستوں کے لیے سکون، تشناساؤں کے لیے محبت اور دشمنوں کے لیے انسانیت کا پیغام موجود ہے۔ مجھے نسیم سے کبھی بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ شرفا کی یہ بھی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اسی لیے میں نسیم کے آگے اپنے دل کی باتوں کو کھلی کتاب جیسا رکھ دیتا ہوں جس سے وہ کبھی کبھار میرے شعور کا لاشعور کا بھی مطالعہ کر لیتا ہے۔

تین سال پہلے نسیم سے میری ملاقات "حلقہ ارباب ذوق جدہ" کے ایک مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ یہ اعتماد صدیقی کے ساتھ حلقہ کی محفل میں پہلی بار شرکت کرنے آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ رسمی تعارف ہوتا نسیم نے غائبانہ تعارف کی اساس پر تعارف کو ایک نئی راہ دکھائی اور "وعلیکم السلام" کہہ کر اعتماد صدیقی کو ہم سے اور ہم کو اعتماد صدیقی سے یوں متعارف کرایا۔ یہ ہیں "بیکس نواز شارق" ہمارے دوست اور حلقہ کے معتمد عمومی، اور یہ ہیں اعتماد

صدیقی" ہمارے دوست اور علاقے کے صدر۔ ہم نے کہا "محمد شکیب میں تعارف کا مگر آپ کی تعریف" کہنے لگے میں
نسیم سحر ہوں" مشاعرہ شروع ہوا تو ان سے نسیم صبح گاہی کے خوشگوار جھونکوں جیسے شعر بھی سننے کو ملے۔ ہم نے
سوچا کیا ہی عجیب آدمی ہے، اتنا اچھا شاعر ہے اور اتنا منکسر المزاج کہ شعر کی داد ایک بار ملنے پر بھی بار بار سلام کرتا
کرتا ہے۔ کلام سناتے وقت کاندھے اٹھا اٹھا کر یوں جھک جاتا ہے جیسے زمیں بوس بھی ہو رہا ہے اور زمین میں
اتر بھی رہا ہے۔ عجز و خلق کا یہ پیکر اپنی کسر نفسی میں ذرہ برابر بھی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ جوں جوں نسیم زمین میں اترتا
جاتا ہے، اس کے شعر اٹھتے جاتے ہیں، شعر کیا اٹھتے ہیں اس کا قد خود بخود اٹھتا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے سامعین
واہ واہ کے نعرے لگاتے ہوئے نسیم کو گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں۔

نسیم بھائی کلام سناتے وقت اتنے مسرور اور شرمندہ شرمندہ نظر آتے ہیں جیسے یہ کلام ان کا نہ ہو بلکہ کسی
استاد کی ڈائری ان کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ یہ مشاعروں میں اتنی تیزی سے کلام پڑھ کر اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں جیسے
انہیں اپنے کلام اور اپنی جگہ دونوں پر کسی کے قابض ہو جانے کا احتمال ہے۔

نسیم سحر سے مل کر آپ کو یہ احساس ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ دو شعری تصانیف کے خالق، مترجم،
صحافی اور ادیب سے مل رہے ہیں بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ محض کسی مزاح نگار سے مل رہے ہیں۔ ہر بات میں ہنسی
کا پہلو تلاش کر لینا، لوگوں کو ہنسانا، تنہائیوں میں اپنے آپ پر ہنس لینا، مزاحیہ مضامین لکھنا، خاکے اڑانا، لطیفے
جننا، اور حد تو یہ کہ ادبی محافل کی رپورتاژ بھی مزاحیہ انداز میں قلمبند کرنا نسیم سحر کی مرغوب عادتیں ہیں۔ یہ ہمارے نسیم
بھائی "سحر والے" دوسروں پر ہنسنے کی بجائے اکثر اپنے آپ پر ہنسنا پسند کرتے ہیں اور انہیں جب یہ شبہ پیدا ہو جائے
کہ اپنے آپ پر ہنسنے میں انہیں ناکامی ہو رہی ہے تو آئینہ دیکھ کر ہنستے ہیں اور خوب ہنستے ہیں۔ اور جب ہنستے ہنستے
ان کا حلیہ بگڑنے لگتا ہے تو یہ اپنے ہی عکس سے خود معذرت کرتے لگتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ یہ عکس ان کا اندر کا
آدمی ہے جو قلمکار ہے، بے حد حساس ہے۔ خود دار ہے، قوم کی میراث ہے، انسانیت کا علمبردار ہے، خود احتسابی
کا یہ انداز اگر سب کو آجائے تو کوئی کسی پر نہیں ہنس سکتا۔ یہ حس مزاح اور اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے، اسی لیے تو نسیم
اپنی غزلوں پر آپ پیروڈیاں بھی لکھتے ہیں۔ اس کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ غزل پہلے لکھتے ہیں کہ پیروڈی۔

نسیم بھائی سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ باضابطہ مزاحیہ شاعری بھی کرتے ہیں اور اس میں کامیاب
بھی ہیں۔

حالیہ عرصہ میں نسیم بھائی کی جسامت میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ چند سال قبل دیکھا ہوا شخص ہرگز یقین
نہیں کر سکتا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے کبھی اپنے ڈیل ڈول سے بے شمار کارٹون آرٹسٹوں کو فائدہ پہنچایا تھا۔ اس
تبدیلی کے بعد تو نسیم بھائی کو یوں بھی زیادہ خوش ہونا چاہیے کہ انہوں نے اپنے پرانے قرض خواہوں اور نازنینوں کی گرفت
سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔ نسیم بھائی کا یہ خیال ہے کہ اس تبدیلی سے ان کے اندر کے شاعر کو ضرور ٹھیس

پہنچی ہے کہ اب صرف دور دراز کے لوگ ہی انہیں مشاعرہ پڑھنے بلاتے ہیں جہاں کے حالیہ ڈیل ڈول سے بعض صرف نام سے آشنا ہیں۔ البتہ وہ مشاعرہ باز جن کے ہاں ان کے پیچھے ڈیل ڈول کی وجہ ان کی وزن دار شاعری تھی۔ ان کے خود تعارف کرانے کے باوجود بھی پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس طرح نسیم بھائی کے کردار اور جسمانی اعتبار کے مابین بڑا تضاد رہا ہے۔ ان کا سفید چادر جیسا کردار تو ہمیشہ اُجلا اُجلا اپنی اصلی حالت پر رہا مگر ان کے ڈیل ڈول کا کوئی اعتبار نہیں رہا کہ نسیم سحر خشکی پر تو بے حد لطیف اور تری پر اپنے میں رطوبت لیے بے حد وزنی نسیم بحر بن جاتے ہیں، تاہم آپ اس کو ان کی شخصی بے اعتباری پر محمول نہ کریں بلکہ عجز و انکسار سمجھیں۔

نسیم بھائی کے خیال میں ان کا دل جو ہماری طرف کھنچتا ہے اس کی یہ نفسیاتی وجہ بھی ہے کہ وہ چند برس پہلے تک تن و توش کے اعتبار سے ہماری جیسی صحت و توانائی رکھتے تھے حالانکہ وہ اپنی موجودہ متناسب جسمانی سے ناخوش بھی نہیں ہیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ انسان تو فطرتاً میں پرست اور میں پسند ہوتا ہے، اس کو اپنا ہر دور ہر جلوہ اچھا لگتا ہے، اگر اچھا نہ لگے تب بھی وہ اس سے مانوس ضرور ہوتا ہے، اس دور کی ایک جھلک اسے ماضی کی کسی مانوس یادوں سے ملا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے تلخ ابواب کو بھی ہر دور کا انسان پڑھتا ہے اور انہیں جاننا ضروری سمجھتا ہے۔ ہم اس بات سے نسیم سحر کی کامیاب شاعری کی ایک بنیادی وجہ کو جان گئے کہ اس باشعور ذہن کی کارفرمائی نے نسیم سحر سے ایسے تلخ حقائق پر مبنی اشعار بھی کہلوائے ہیں اور اسی لیے اس کے باوجود بھی وہ حلقۂ ادر سعودی عرب کے محبوب ترین شعراء میں سے ایک ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نسیم سحر کا کلام صرف لائبریریوں کی زینت بنا ہوا نہیں ہے بلکہ ہند و پاک کے ادبا و نقاد اسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں، تبصرے لکھ رہے ہیں، خامیاں تلاش کر رہے ہیں، خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔ اب رہے قارئین تو ان میں کے بعض صرف پڑھتے ہی نہیں بلکہ گھورتے بھی ہیں، ان میں بعض شعراء قارئین بھی شامل ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ ان کا یہ ردِ عمل اپنے آپ پر غصہ کرنے کی علامت ہے کہ شاعر پر، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے اس عمل کے پیچھے کیا کیا نفسیاتی کیفیات پوشیدہ ہیں۔

ہم نے ایک دن نسیم سحر سے پوچھا "جناب! مزاح نگار، صحافی، ادیب اور مترجم تو آپ تھے ہی، کیا آپ کی انا کی تسکین کے لیے اتنی ساری تہمتیں ناکافی ثابت ہوئیں جو شاعری کو بھی گلے لگا لیا"۔ کہنے لگے "بھائی! میں دوسری تہمتیں تو صرف اپنی انا کی خاطر برداشت کرتا ہوں، البتہ شاعری اپنی اور دوسروں کی انا کی خاطر کرتا ہوں"۔ ہم نے کہا "حضور! بات واضح نہیں ہوئی"۔ کہنے لگے "ہمارے ادب دوستوں کا یہ مزاج بنا ہوا ہے کہ وہ ادب کی دوسری اصناف [illegible] لاتے ہیں اور نہ ہی ان سے مل کر اس درجہ خوش و مطمئن ہوتے ہیں البتہ شاعری" ان کے نزدیک سب سے اہم ترین وصفِ انسانی ہے"۔

نسیم سحر، شاعر خود شناس ہے۔ خود شناسی کا وصف اونچے درجہ کے شعراء میں ہوتا ہے۔ کائنات کے مطالعہ اور تخیل کی پرواز سے آگے کی بات شاعر میں خود شناسی کا جوہر ہے جس کی مدد سے ایک شاعر

ارتقائی منازل طے کرکے قومی اور بین الاقوامی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔

نسیم بھائی ان شاعروں یا ادیبوں میں سے نہیں جنہیں یہ عادت سی ہو جاتی ہے کہ خود اپنے فن کے محاسن کو دوسروں کے آگے جبراً سنانے لگیں بلکہ وہ تو زیادہ داد پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص ان کی تخلیقی صلاحیت کے گن گا رہا ہو تو ان کے چہرہ کی تختی پر ندامت کا پسینہ ظاہر ہوتا ہے۔ دراصل، تخلیق کار یا فنکار کو جو داد کی ہوس ہو جاتی ہے اس کی ایک وجہ خود فن کار کے اندازہ سے کہیں کم قدردانی کا احساس ہوتا ہے دوسری یہ کہ فنکار کو خود اپنے فن پر اتنا اعتماد نہیں ہوتا کہ وہ توصیف و تعریف سے مبرا ہو کر یہ کہہ بیٹھے :

"نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ"

آج کی یہ محفل کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ نسیم سحر کی شام مناکر ان کے قد کو متعین کرکے کم کر دیا جائے بلکہ نسیم سحر کے دوسرے مجموعہ کلام "ہر بوند سمندر" کی رونمائی کے بہانے نسیم سحر کے بہروپیہ فنکار کو بے نقاب کرنا ہے۔ قد منوانے کا شوق تو انہیں ہوگا جو اپنے قد کو خوب جانتے ہیں مگر احساس کمتری سے تنگ آکر لوگوں سے اپنا قد معلوم کرتے ہیں اور بونے ثابت ہو جانے پر بھی نہیں شرماتے کیونکہ انہیں تو یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ لوگ، انہیں اس سے کم قد نہ سمجھ بیٹھیں۔ یہاں تو نسیم کی معصومیت، انکسار اور بڑائی کا یہ عالم ہے کہ اس کو خود اپنے قد کا پتہ نہیں ـــــ البتہ یہ شاعر خود شناس خوب جانتا ہے کہ وہ قد آور ہے اور جو بھی اس سے انکار کرتا ہے۔ نسیم اسی سے اپنا قد نپواتا ہے، کہتا ہے ؎

اس کو بھی گماں ہے مری کوتاہ قدی کا ٭ قد میں جو ابھی میرے برابر نہیں آیا

بہر حال آپ حضرات احتیاطاً اس غلط فہمی کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دیں کہ نسیم بھائی شاید آج اپنے کلام کے اجرا سے اس لیے متفق ہوئے ہیں کہ انہیں یہ دعویٰ ہے کہ یہ کلام کسی اور کا نہیں بلکہ صرف ان کا ہے۔ ہم یہ واضح کرتے چلیں کہ یہ کلام صرف نسیم سحر کا نہیں بلکہ یہ ایسی مشترکہ میراث ہے جس کا کوئی تصفیہ نہیں۔ اس کے وارث ہم سب ہیں۔ ایک نسل ہے، ایک معاشرہ ہے، ایک شاعری کا دور ہے۔

قلمکار کہیں مجرم نظر آتا ہے تو کہیں محقق، یہی بیمار تو یہی معالج، یہی گواہ، یہی وکیل، یہی منصف، یہی رہبر یہی دانشور، یہی مدبر، یہی محرر، یہی مفسر، اور یہی مصور بھی ہوتا ہے۔ یہ سمجھنے والوں کے لیے سب کچھ ہے اور نہ سمجھنے والوں کے لیے کچھ بھی نہیں، قلمکار سب پر لکھتا ہے، قلمکار سب کا ہوتا ہے، نسیم بھائی قلمکار ہیں اسی لیے ان کا کلام سب کا ہے۔ اور نسیم سحر سب کا شاعر ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

۱۹۸۵ء میں
پاکستان میں طنز و مزاح

طنز و مزاح کا زعفرانی کھیت تیار کرنے میں "اردو پنچ" اور "نیرنگ خیال" نے اہم خدمات سرانجام دیں اور اصنافِ شعر و نثر میں مزاح نگاروں کو متنوع انداز میں متعارف کرایا۔ غلام الثقلین نقوی نے "اک طرفہ تماشا" میں اپنی ہمہ گیر سنجیدگی سے مزاح کے خالص زاویے پیدا کیے۔ اس سے فرخندہ لودھی نے یہ نتیجہ نکالا کہ فنکار تو بہتا دریا ہوتا ہے۔ "کبھی طغیانی، کبھی سبک خرام" اور مظفر بخاری نے یہ کہ شائستہ مزاح سنجیدگی کے داخل میں بھی موجود ہوتا ہے۔ شکور حسین یاد کے مزاح پاروں کا مجموعہ "تماشا کہیں جسے" شائع ہوا اس کا سرورق کتاب خریدنے کی ترغیب دیتا ہے۔ سرورق کے دونوں اطراف مصنف نے اپنی تصویریں چھاپ دی ہیں۔
کرنل محمد خاں نے لکھا ہے کہ یہ قاری کے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس کتاب کی تحریر سے کتنی رعنائی اور توانائی اخذ کرتا ہے۔ گویا امتحان مصنف کا نہیں بلکہ قاری ہی عرصۂ محشر میں کھڑا ہے۔ ذاکر علی خاں کی کتاب "قلمرو" نے بھی ایک مخصوص لہجے کی لطافت پیدا کی، ان کا ایک جملہ ملاحظہ کیجیے۔

"لکھنوی دو پلی اور علم ٹوپیوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ایکٹرسوں اور بیویوں میں ہوتا ہے۔"

اشفاق حسین نے "جنٹلمین الحمد للہ" میں "ہیومرلن یونیفارم" پیدا کیا۔ منظر علی خاں اس صنف کی طرف مسلسل پیش قدمی کر کے فتوحات حاصل کرتے رہے ہیں۔ ان کے مضامین میں سے "قوم، قومیت اور قومیانہ" اور "دو طے اور شہر والے" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، ممتاز مفتی، ارشد میر جیسے بڑے مزاح نگاروں کے ساتھ منشا یاد، سید محسن، صلاح الدین حیدر، رشید نثار، دلیپ سنگھ، عاصی سعید جمیل یوسف نے بھی دل کھول کر پھلجھڑیاں پیش کیں۔ شاعری میں مزاح کے چند اچھے نمونے قتیل شفائی، دلاور فگار، ضمیر جعفری، شاہد انواری، سرفراز شاہد، ظہور خاں نیاز سیوانی، منظر علی خاں منظر، اور متعدد دوسرے شعرا نے پیش کیے۔ کرنل محمد خان نے اسٹاک لیکاک کے تراجم سے اردو ادب کو روشناس کرایا۔ لیکن ان کا انداز تخلیقی تھا۔ ڈاکٹر تونسوی نے اسالیب تنقید کو مزاحیہ رنگ دینے میں متعدد کامیابیاں حاصل کیں۔ "بگولوں کا ہم سفر" ان کی ایسی ہی تالیف ہے جو مضحک مسکراہٹ کو جنم دیتی ہے۔ خالص مزاح کے چند اچھے زاویے اقبال ساغر صدیقی

ے نکھارے۔

پیروڈی: پیروڈی میں مشفق خواجہ کا مضمون "رسالہ در معرفت ابنِ انشاء" شاید اس سال کی بہترین تخلیق شمار کی جاسکتی ہے۔ "ایک طرز تماشا" میں غلام الثقلین نقوی نے سفرنامے کی پیروڈی "لاہور سے لوڈو وال" کے نام سے پیش کی، جائزہ نگاری کی ایک بہت آزیں پیروڈی نسیم شاہد نے تخلیق کی اور اس کی بازگشت دور دور تک سنی گئی، اس صنف میں چند اچھے نمونے ظفر اقبال نے بھی پیدا کیے، وہ اصل کی مضحک نقل اتارنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور اب یہی ان کی پہچان شمار ہو رہی ہے۔ شفیق الرحمن پیروڈی میں حدِ تہذیب کو قائم رکھتے ہیں اور مزاح دندان نما کے بجائے شائستہ مسکراہٹ کو جنم دے ڈالتے ہیں، ان کی پیروڈی [illegible]۔ "تقدیر کا انٹرویو" لطافت آمیز مزاح کی نمائندہ ہیں۔

کالم نگاری: اخبارات پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ گزشتہ سال کالم نگاری ادیبوں کی مقبول ترین مشغولیت رہی ہے۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی سے لے کر خالد احمد تک متعدد ادیبوں نے کالم لکھے۔ کسی نے شیخ سعدی بننے کی کوشش کی اور کسی نے شیخ چلی۔ ادبی صفحات پر مزاح کی پھلجھڑیاں بھی بکھر گئیں اور سنجیدہ مباحث کے گل بھی کھلائے گئے۔ احمد ندیم قاسمی ("لاہور لاہور ہے" اور "رواں دواں") کے ہاں معاشرتی تبصرے کا رجحان نمایاں ہوا، اور حرفوں کے مزاروں پر قاسمی صاحب نے متعدد دیے روشن کیے۔ انتظار حسین (باتیں اور ملاقاتیں، لاہور نامہ) نے معاشرہ اور ادب کے موسموں کی خبر دی، ظفر علی راجہ نے مزاح سے زاویہ ظفر پیدا کیا، مستنصر حسین تارڑ نے کارواں سرائے سے اور عطاء الحق قاسمی نے "روزن دیوار سے" زندگی کا مشاہدہ کیا، اور دونوں نے مختلف النوع نتائج مرتب کیے۔ منظر امکانی نے "غیر ادبی باتیں" میں ادبی شخصیات اور کتب کو پس منظر سمیت اہمیت دی، اختر امان نے "سات رنگ" میں ادب کا تناظر نئے انداز میں مرتب کیا۔ خالد احمد (لمحہ لمحہ)، ستار طاہر (حلقہ دام خیال)، جاذب کاشمیری (کراچی کے شہر سے)، یونس احقر (کنارہ راوی)، جعفر بلوچ (کنارہ راوی)، علی حیدر ملک (شہر قائد)، امجد قریشی (گوشہ سخن)، نار تلیط (لاہوریات)، حسن رضوی (ادب نامہ)، جاوید اختر بھٹی (حاشیے) نے ادبی وقائع نگاری کا فریضہ سرانجام دیا اور اخبارات کے قومی رابطے پر مختلف شہروں کی تقریبات کا آنکھوں دیکھا احوال نشر کیا۔ ذوالفقار احمد تابش، انجم اعظمی، قمر جمیل اور الف شاہ نے ادب کے سنجیدہ مسائل کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا، امجد اسلام امجد نے "چشم تماشا" کو سفرنامہ میں، ضمیر جعفری نے "نظر غبارے" کو یاد نگاری میں اور ظفر اقبال نے "تذکرے" کو پیروڈی کی صنف کے لیے استعمال کیا۔ متو بھائی کا گریبان ادباء کی عفات پر والہانہ ہمدردی سے چاک ہوتا رہا۔ ادبی منظر پر تبصرے کی ایک صورت اسلم کمال کے کالم "قلم موقلم" سے ابھری، طارق جامی (احوال)، رضی الدین رضی (ڈلتے ڈرتے) کوہستانی (دامن کوہ)، علمدار حسین (رجحان)، کرد مجاز (ادبی باتیں)، اختر امان (سات رنگ)، یا توقی (باتیں ادب کی) کے ہاں تبصرے میں رد عمل کا زاویہ بھی نمایاں ہوا۔ ادبی کالم نگاری میں "خامہ بگوش" کے گہرے طنزیہ انداز نے بے رحم حقیقت نگاری کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس کا معاشرتی زاویہ نصر اللہ خاں کے کالموں سے ابھرا۔ لیکن خامہ بگوش کے قلم تلے جو بھی آتا وہ پانی مانگے بغیر ہی موت کے گھاٹ اترتا رہا۔ اختر فیصل اور فرخندہ لودھی کے کالموں میں آگہی کا قرینہ موجود تھا لیکن ان کی نمود کم کم ہوئی۔ دور اندیش، کالی داس، ابن قلم اور خیر اندیش نے شخصیات کے عقب میں جھانکنے اور غیر ہموار گوشے ابھارنے کی سعی جاری رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان ناموں کے پس پردہ

صابر لودھی، منظر امکانی، معین الدین عقیل، پاشا رحمن کی آوازیں موجود ہیں، سلمان بٹ نے کالم کو انشائیہ اور منظر الاسلام نے تجریدی افسانے کا متبادل بنا دیا۔ افسوس کہ گزشتہ سال سلمان بٹ فوت ہوگئے اور ان کے بعد کالی داس اور الف شاہ نے بھی کالم کی دنیا سے منہ موڑ لیا۔ فریدہ حفیظ، منشا یاد، منصور قیصر، راشد نور نے رواں دواں انداز میں ادبی کالم نگاری کی ہے تاہم میرا خیال ہے کہ حسن رضوی کی معروضی رپورٹنگ نے بیرونی دنیا میں بھی مقبولیت حاصل کی۔ اور انھوں نے پاکستان میں بھی اپنا ریکارڈ قائم رکھا۔ بھارت میں فکر تونسوی واحد کالم نگار ہیں جن کا قلم معاشرتی ناہمواریوں کو ادبی زاویے سے نکھارتا چلا جاتا ہے۔ زید بن حارثہ کے کالم "صبح بخیر" کا انتخاب منظر عام پر آیا۔ اس سال کے دوران کالموں سے جو چبھتے ہوئے جملے ابھرے ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

۱. ساقی فاروقی کا مجموعہ "بہرام کی واپسی" کلام کی وجہ سے نہیں نام کی وجہ سے خاصہ مقبول ہوا۔
۲. خامہ بگوش محسن بھوپالی کی غزل پڑھتے تو انھیں "شاعر انتباہ" کا خطاب دیتے۔
۳. غالب اور ناصر زیدی ایک ہی جیسے لفظ استعمال کرتے ہیں بس ذرا لفظوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔
۴. شہرت اور شاعری کی دوڑ میں شاعری پیچھے رہ جاتی ہے۔ شہرت آگے نکل جاتی ہے۔
۵. وہ دن گئے جب ادیب رجحان سازی کرتے تھے اب زمانہ سازی یا کتاب سازی کرتے ہیں۔
۶. افتخار عارف کے اعزاز میں تقریب نہیں بلکہ پبلک ریلیشنگ سمینار منعقد ہوا۔ [کتاب نما سے] ○

دے کے خط...

(مراسلے)

* جناب ایڈیٹر صاحب — تسلیم
شگوفہ کا اقبال نمبر پرسوں شام ملا۔ کل ہی میں نے از ابتدا تا انتہا مکمل پڑھ ڈالا۔ مضامین کی کیا تعریف کروں۔ میرے مضمون کو چھوڑ کر ایک سے ایک بہتر ہے کسی مخصوص مضمون کا نام نہیں لیتا تاکہ دوسروں سے بے انصافی نہ ہو۔ نظم کا حصہ نثر سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ پاکستانی اہل قلم کے مضامین اور نظمیں بطورِ خاص جاذبِ نظر ہیں۔

بہت سے رسالوں کے جغادری اقبال نمبر نکلے لیکن شگوفے کے نمبر کی بات ہی دوسری ہے۔ دلچسپی میں کوئی اقبال نمبر اس کے آس پاس نہیں پہنچتا۔ خیال آتا ہے کہ بین الاقوامی اقبال سیمینار میں آخری اجلاس طنز و مزاح کے لئے مخصوص کر دیا جاتا جس میں شگوفہ کے مضامین اور نظمیں پڑھی جاتیں۔

اتنی عجلت سے لکھنے کا سبب یہ ہے کہ اپنے مضمون کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ میں نے مضمون میں شامل تحریروں کے لئے لکھا تھا۔

"مندرجہ بالا دونوں تحریریں منشی مرغوب رقم نے نظم کے ساتھ چھپوائی ہوں گی لیکن میرے علم کی حد تک کسی مجموعے میں نہیں چھپیں"

یہ صحیح نہیں مجھے اپنے ذخیرۂ کتب ہی میں خواجہ حسن نظامی کی تحریر تین کتابوں میں مل گئی اور راز خود، بغیر کسی دوسرے کی نشان دہی کے۔ مولوی عبدالرزاق کی مرتبہ کلیاتِ اقبال کے مقدمے میں ص ۶۰ تا ۶۲ پر ہے۔ میں نے اس مقدمے کو بارہا دیکھا ہے لیکن اتفاق سے یہ تحریر نظر سے اوجھل رہ گئی تھی۔ عبدالقوی دسنوی کی کتاب "اقبال اور دلی" میں اس کا محض ایک جزو ہے اور عبداللطیف اعظمی کی "اقبال دانائے راز" میں خواجہ حسن نظامی کی مکمل تحریر اور منشی مرغوب رقم کی تحریر کا خلاصہ ہے۔ عبداللطیف صاحب نے ان تحریروں کی تاریخ ۱۹۱۸ء لکھی ہے جو صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ نظمیں تو زمانہ کانپور میں جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکی تھیں۔

ایک اور تصحیح۔ مضطر مجاز صاحب کے مضمون میں ص ۱۸۱ پر ایک پیروڈی کو ہری چند اختر کی نظم کی پیروڈی قرار دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ میرے علم کی حد تک یہ لورح ناروی کی غزل کی پیروڈی ہے۔

گیان چند
شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

* سالنامہ اور اس کے بعد کا شمارہ آپ کے کمال کا جیتا جاگتا ثبوت۔

بس مزید زورِ کمال کی دعا مانگ سکتے ہیں۔ شرم سے پانی پانی ہو رہی ہوں کہ پانی کی دُہائی جو کاغذ پر تقریباً ۳ ماہ بیشتر دی گئی تھی اس ماہ سپرد ڈاک کی جا رہی ہے۔ اب بھی کام آسکے تو آپ کی قسمت۔

شفیقہ فرحت۔ بھوپال

* "اقبال نمبر" پڑھا۔ اس قدر خوبصورت نمبر شائع کرنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا اقبال کی ظرافت کے اتنے گوشے سامنے آسکیں گے۔ شبیت کے کارٹون بہت خوبصورت ہیں۔ سرورق بھی سیمینار کے پس منظر میں بامعنی بنایا گیا ہے۔ طالب کے اسکیچ میں عابد علی خاں صاحب کی کاوشوں کا اچھا عکس ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال کے موضوع پر اس طرح کے خصوصی نمبر کی اشاعت اہلیانِ شگوفہ کا ہی حصہ ہے۔

انیس الرحمٰن۔ حیدرآباد

* تازہ شمارے میں برق آشیانوی اور ڈسکو الیکشن (عابد معز) بہترین ہیں۔ نظموں کا حصہ بھی خاصا

جاندار ہے۔
بانو سرتاج چندرپور

★ دو دن پہلے شگوفے کا اقبال نمبر ملا۔ میں دلوی صاحب کے گھر پر دیکھ چکا تھا۔ آپ نے معلوم نہیں کیسے اتنا اچھا نمبر نکال لیا۔ عابد علی خاں کی تصویر دیکھ کر مسرت ہوئی۔

یوسف ناظم، بمبئی

★ میرے بھائی۔ کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ شگوفہ میرے گھر ہنسی خوشی کی سوغات لئے پہلی بار آیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بے ساختہ ہنسنا ایسی دولت ہے کہ لاٹری کی رقم کے ساتھ بھی نہیں مل سکتی۔ اور یہ دولت میرے نصیب میں کم کم آئی ہے۔ اب اس کو کیا کروں، جو "شگوفہ" آپ نے فروری میں چھوڑا تھا۔ اس کی اطلاع اپریل میں دے رہا ہوں۔ دس دن کے بعد راجستھان کے سفر سے لوٹا تھا۔ بس سے اترا تھا تو اذاں ہو رہی تھی۔ غریب نواز کی بارگاہ کا تصور عجیب عجیب زاویوں سے سر ابھارتا تھا۔ مجھ جیسا بے بضاعت اور بے کردار آدمی اس دربار میں قدم بوس ہو سکا یہی بڑی بات تھی۔ ہاں ایک احساس سانپ کی طرح پھن اٹھا اٹھا کر ڈسنے کی کوشش کرتا لیکن میں صاف بچ نکلتا۔ میرے غریب نواز نے مجھے اس سکون سے کیوں نہیں نوازا جس کو میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں۔ یہ جینے کی ہوس میں زندگی کرنے کی یہ خلش، کب تک دل اس طرح گزارے جیسے اس کو چپ لگ گئی ہو ـــ خالی مکان کے سارے سناٹے جب سینے میں اٹھ آتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ آپ اس کیفیت کو کبھی محسوس کریں۔ بس کچھ اسی طرح ٹوٹا پھوٹا حضور کی چوکھٹ پر پہنچا ہوں۔ پھر حاضری دی ہے، پھر حاضری دی ہے اور پھر حاضری دی ہے ـــ لیکن وہ قدم ہی نہ ملے جن کو آنسوؤں سے بھگو سکتا ـــ یہاں خدام نے غریب نواز سے کسی غریب کو نہ ملنے دینے کے سارے جتن کر رکھے ہیں ـــ محبتوں کا، عقیدتوں کا، دل کا، دل کی رسوائیوں کا، آنکھوں کا، ان کی بھیگی پلکوں کا کس آسانی سے اس آستانے کے خدام مول تول کرتے ہیں، بھاؤ تاؤ کرتے ہیں کیا بتاؤں۔

گھر میں داخل ہوا تو گھر کے باہر یہ بھٹ رہی تھی۔ بجلی کا کھٹکا دبا کر کمرے کے اندھیرے سے دور کئے۔ چوکھٹ میں پڑی ہوئی ڈاک سمیٹی۔ خطوط الگ کئے، رسالے الگ شگوفہ پر پہلی نظر ڈالی اور الیاس احمد گدی کا خط کھولا لکھا تھا۔ آپ کا دوست ۲۵ر جنوری کی صبح ہم سے جدا ہوگیا۔ غیاث احمد گدی ۲۵ر جنوری کو مرگیا تھا اور مجھے ۱۰ر فروری کو اطلاع مل رہی تھی۔ غیاث احمد گدی اس پائے کا افسانہ نگار تھا کہ اگر وہ کسی اور زبان میں مرتا تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح نہیں، شہر میں فساد کی طرح پھیل جاتی۔ لیکن غیاث احمد گدی اردو میں مرا تھا جانے کب سے بالاقساط مر رہا تھا۔ اس سے میری قلمی ملاقات تو برسہا برس پہلے، اس کی کہانی "امام باڑے کی اینٹ" سے ہوئی تھی۔ میرا ناول "چراغِ تہہِ داماں" سیپ پاکستان سے جب شاہکار میں ڈائجسٹ ہوا تو دوسرے ساتھیوں کے علاوہ غیاث احمد گدی اور قاضی عبدالستار نے ٹوٹ کر تعریفی خطوط لکھے۔ مبارکباد دی ـــ علیگڈھ میں اردو افسانے کے بیس سال والے سمینار میں، پہلی بار میں غیاث سے مل سکا۔ کس پیار سے، کس خلوص سے وہ میری آمد کا منتظر تھا۔ سہ روزہ سمینار کے اختتام پر ہم یونیورسٹی کیمپس سے قاضی عبدالستار کے گھر منتقل ہوئے اور ان کے مہمان رہے۔ چار پانچ دن کی یکجائی، دن دن بھر کا ساتھ، شامیں، کھلی چھت، راتیں ـــ کیسی کیسی صحبتیں دیکھتے دیکھتے یاد بن گئیں ـــ پھر وہ میرے ساتھ دلی آیا اور میرے ساتھ ہی میرے خالہ زاد بھائی محبوب سلمہ کے گھر ٹھہرا۔

شاذ کے مرنے سے پہلے ـــ صرف ایک دن پہلے ـــ نہیں گھنٹوں پہلے ـــ میں دواخانہ' اسری میں اس سے ملا تھا ـــ اس نے وعدہ لیا تھا کہ میں جلد ہی پوچم بار

سے پھر آئیں۔ دوسرے دن کے طلوع سے قبل وہ مرگیا۔
اس نے مجھے کتنی محبت دی۔ کیسی منزلت کی کتنی عزت دی
یہ داستان زندگی وفا کرے تو لکھوں ــــ وہ دنیا سے
اٹھ گیا تھا۔ مجھے حیدرآباد میں رہ کر بھی خبر نہ ہوئی۔ قلب
کا مریض ہوں۔ میرے پیار میں میرے بچوں نے یہ خبر چھپادی
اور میں بوجھم پاڑ چلا گیا ـــ شاذ نے مار رکھا تھا،
غیاث احمد گدی نے مرتے کو لوٹا۔ پیارے بھائی یوں
سمجھئے کہ یہ چہرے سامنے سے ہٹائے نہ ہٹتے تھے ایسے
میں جسارت نہیں کر پاتا تھا کہ شگوفہ کی اوراق گردانی
کروں۔ وہ جو سینے میں بسا بسا سا کوئی غمکدہ تھا، تو ہن،
چوکیدار کی طرح اس کی حفاظت کرتا کہ باہر سے کوئی قہقہہ
کوئی ہنسی اپنا تاثر اندر نہ پھینک جائے۔ بس کوئی آٹھ
دس دن پہلے ہمت کرکے چوروں کی طرح شگوفہ اٹھا لیا
پہلے ہی دل کی فضا کو تہس نہس کرنے والوں میں فکر
تونسوی تھا۔ کیا عمدہ شبیہہ آپ کے آرٹسٹ نے اس یار
"طرحدار" کی بنائی ہے۔ یہ میرا جوانی کا ساتھی ہے۔ اس
وقت بھی میں اس کے 'حسن اسفل' پہ تبرہ بھیجتا تھا
اور وہ میرے 'نقوشِ اجمل' کے گن گاتا تھا۔ یہ ان
دنوں کی بات ہے جب وہ احمد ندیم قاسمی کے بعد ادبِ لطیف
کا ایڈیٹر بن گیا تھا۔ اور اس کے باوجود 'فاران' 'نظامیہ'
کے چکر میں سرگرداں تھا۔ شگفتہ جیسی تیکھی نظمیں لکھتا
تھا اور حسین لیڈر پیڈس پر اپنی بدصورتی کا انتقام لیتا
تھا۔ آپ کے شگوفے میں داخل ہوتے ہی جب اس
شخص نے غمکدے کے ذہنی چوکیدار کو مشکیں باندھ کر
مارا پیٹا تو پھر میں ایک ایک سے ملنے لگا۔ یوسف ناظم
مزاح میں شرافتیں اور شرافتوں میں مزاح۔ بدالشکن
کو اس طرح گڈمڈ کرتے کہ دونوں میری گرفت سے
نکل نکل جائیں۔ ہے کوئی ایسا فنکار آپ لوگوں کی صف
میں جس کی شرارتوں پر شرافتوں کا گمان ہو۔ پھر مجتبیٰ
سے ملا۔ اس میرے پیارے کا ڈھنگ نرالا ہے۔ دل

میں اندر ہی اندر اترتا جاتا ہے اور چٹکیاں بھرتا جاتا
ہے۔ غم کو جھنجھنا بنا کر بجاتے ... پھرنے والا
مجتبیٰ ــــ اس کے بعد میں "شگوفے" کا ہو رہا۔ نئے
پرانے سبھوں نے کچھ نہ کچھ جھولی میں ڈال دیا۔ بہ شمول
ید اللہ مہدی، فیاض احمد فیضی "ڈارون کا مجسمہ"
رشید عبدالسمیع جلیل، عابد معز، بانو سرتاج اور نسیم سحر
اب یہ بات اور ہے کہ اپنی جھولی ہی چھلنی چھلنی ہے۔
چنانچہ شب خون کا تازہ شمارہ ۱۸۹ ملا۔ زیب غوری
کے سوگ میں، میں نے خود کو بھی شامل کر لیا۔ غزل کے
اس معتبر نام سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب
اریب زندہ تھے اور صبا کے لئے زیب کی غزلیں اریب کو
وصول ہوتی تھیں۔ کئی سال ہوئے زیب ان دنوں بھی
بیمار تھے۔ حالت بیماری ہی میں اریب کو خط لکھا تھا
اپنی ایک غزل کا ذکر کیا تھا۔ جس کے اشعار مجھے اب بھی
یاد ہیں۔ اریب رہا نہ زیب غوری۔ میں جو اس دلچسپ
"سانحہ" کی رازداری کا بارگراں اٹھانے کو زندہ ہوں
بھلا کس طرح زبان کھول سکتا ہوں۔ ایک مشہور گلے باز
شاعر نے زیب کی غزل حق دوستی ادا کرتے ہوئے
مشاعرہ میں اپنے نام سے پڑھ دی تھی۔ وہ غزل آج
تک انہیں کے نام سے چلتی ہے۔ سچ پوچھئے تو نئی
غزل کا باقی کے بعد یہ دوسرا بڑا نقصان ہے۔ میں کچھ
زیادہ اداس ہو گیا تھا ــــ اس لئے کہ غیاث احمد گدی
کے انتقال کی اطلاع تک 'شب خون' میں نہیں چھپی
کیا فاروقی اور ادارۂ شب خون کو اس کی خبر ہی نہیں ہے
منیر (میری بیوی) کے انتقال پر فاروقی نے دوسرے
ساتھیوں کے ساتھ مجھے تعزیتی ٹیلی گرام دیا تھا ــــ وہ
بھلا گدی کی موت پر کس طرح چپ رہ سکتے ہیں۔ گدی
کی موت میری نسل کے افسانہ نگاروں میں ایک بہت
اہم نام کی موت ہے۔ ایک بڑے نام کی موت۔ میں
اس سلسلے میں فاروقی صاحب کو لکھ رہا ہوں۔

یہ پھر ایک بار آپ کا ممنون ہوں کہ سالنامہ بھیج کر آپ نے زندگی کا حوصلہ دیا۔

اقبال متین پوچم پاڑ

✱ شگوفہ کا مزاح نمبر نہ صرف نظر سے گذرا بلکہ دل کو چیرتا ہوا نکلا۔ اور دیکھ یا ہر وہ ظالم شرار اس دن سے اس پر دوسرا جھونکا سا لگانے کا بس تو پھر دیکھنا کیسا اب تو آگ سی بھڑک اٹھی ہے۔ مزاح نمبر کے تعلق سے تریبندر لوتھر صاحب کے تعزافیہ نے فن خطاطی کی طغرا نویسی کا طرز یاد دلایا جو حیدرآباد میں بہت مقبول و مشہور ہوا۔

دوسرے نمبر پر آپ کا سالنامہ بھی خوش قسمتی سے دستیاب ہوا جس کا سرورق میرے ایک پرانے ملاقاتی فنکار عزیز صاحب کا تیار کردہ ہے۔ ایک یاد پرانی پھر سے جاگ اٹھی۔ کراچی کے رتن تالاب کی یادیں تازہ ہوگئیں۔

محبوب الحسن آدم۔ گلبرگہ

✱ تازہ شمارہ میں ترجمہ بہت اچھا ہے۔ چکرورتی راج گوپال چاری ایک مدبر، سیاست داں کے علاوہ اتنا اچھا انشائیہ لکھ سکتے ہیں کسی کے گمان میں بھی نہ تھا۔ بہتر ہے کہ آپ اسی طرح دوسری زبانوں کا مزاح بھی اُردو میں پیش کریں۔

رؤف خوشتر۔ گلبرگہ

✱ شگوفہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس پت جھڑ کے موسم میں آپ کی کوشش اور کاوش کے طفیل میں یہ اُمید ہے کہ شگوفہ روز افزوں پروان چڑھتا رہے گا۔

جناب صغیر احمد سحر سندیلوی صاحب کو میں ایک سنجیدہ نثر نگار کی حیثیت سے جانتا تھا لیکن شگوفہ میں ان کے دو مضامین "قصہ چہار بیویاں" اور "ادب نواز مرغیاں" پڑھ کر ان کی طنز و مزاح نگاری کا قائل ہوگیا۔ قارئین کیلئے "کیچم اُلٹو" بھی ایک خاص ناشتہ ہے۔

محمد سلیم، کانپور

-○- -○- -○-

R. No. 15822/68 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd. No. H. HD 6
Vol. 19 Copy 5
May 1986 Phone: 557716

JUNE 1986 **Rs. 4-00**

جلد : —— ۱۹
شمارہ : —— ۶

ایڈیٹر :- ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

:- مجلس مشاورت :-

بھارت چند کھنہ ۔ نریندر لوتھر ۔ یوسف ناظم ۔ مجتبیٰ حسین

:- مجلس ادارت :-

حمایت اللہ ۔ محمد منظور احمد ۔ مسیح انجم

جنرل منیجر :- سمیع جلیل
منیجر اعزازی (بمبئی) فیاض احمد فیضی

کتابت : محمد غالب ۔ محمد عبدالرؤف

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۲

قیمت فی پرچہ ۲/ روپے

زرِ سالانہ : چالیس روپے ——— بیرونِ ہند سے : ایک سو پچیس روپے

خط و کتابت کا پتہ : "شگوفہ" ۔ ۳۱ ۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۱ (اے پی)

فون آفس : 557716 ۔ رہائش : 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

نثری پیروڈی

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (شہر حیدرآباد)

حق تو یہ ہے ... (ترجمہ)

ایسی کی تیسی (تنقید)

بال کی کھال (تبصرہ)

چورنے (نظمیں)

یوسف ناظم

ایک اخباریہ

ریڈیو پر آپ دنیا بھر کے اسٹیشنوں سے خبریں سن لیجیے، لیکن ان تیز تیز پڑھی اور سنائی جانے والی خبروں کے سُن لینے سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے جو اخبار پڑھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ ریڈیو سے اتنا جھوٹ نشر بھی نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ اخباروں کے ذریعہ پھیلایا جاتا ہے۔ خبریں ٹیلی ویژن سے بھی سنی جا سکتی ہیں لیکن یہ سننے سے زیادہ دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ لباس کی نفاست لب و لہجے کی ملائمت اور ـــــ آپ سمجھ گئے کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مستورات کے ان مظاہر سے خبروں کی تیز ابیت دب جاتی ہے اور اب تو ایسا بھی نہیں ہے کہ اخباروں میں سچی خبریں چھپتی ہی نہیں ہیں۔ پریس جب سے آزاد ہوا ہے (یہ ابھی تھوڑے دنوں پہلے کی بات ہے) اخباروں میں سچی خبریں نہ صرف چھپنے لگی ہیں بلکہ بہت زیادہ چھپنے لگی ہیں گو یہ سب ایک سی ہوتی ہیں مثلاً کسی شہر میں بلوہ ہو گیا (جو ہوتا ہی رہتا ہے) تو خبر یہی چھپے گی کہ فلاں شہر میں ایک جلوس جا رہا تھا۔ اس پر کہیں سے پتھر پھینکے گئے ـــــ یاد رہے کہ ہمارے یہاں جلوس پر پتھر ضرور پھینکے جاتے ہیں (ورنہ جلوس آگے بڑھتا ہی نہیں) اور یہ پتھر عموماً وہ لوگ پھینکتے ہیں جنہیں مرنے یا اپنی دوکانیں لٹوانے اور جلوانے کا شوق ہوتا ہے ـــــ یہ خبر جب بھی اخبار میں چھپتی ہے لوگ اس کے سو فیصدی صحیح ہونے کا یقین کر لیتے ہیں اور اتفاق یہ ہے کہ اس طرح کی خبریں ہر مہینے ضرور چھپتی ہیں اور بعض وقت تو اخبار پڑھتے وقت شبہ ہوتا ہے کہ کہیں ہم پُرانا اخبار تو نہیں پڑھ رہے ہیں ـــــ اخبار ہمیشہ صبح سویرے پڑھنا چاہیے۔ ستی سی محسوس ہوتی ہے۔ دل میں ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ جس دن اخبار میں کسی کرفیو، کسی بینک کے لوٹے جانے اور کسی نوجوان شادی شدہ خاتون کے نذرِ آتش کیے جانے کی خبر نہیں چھپی سمجھ لینا چاہیے کہ پریس اس دن آزاد نہیں تھا۔

ہر اخبار میں ایک اداریہ بھی ہوتا ہے جس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ ایڈیٹر خود لکھتا ہے۔ ہم اس خام خیال کی تردید نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ صرف وہی اداریے ایڈیٹر کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں جن کے

بارے میں دوسرے یا تیسرے دن دو یا تین تعریفی خط ضرور چھپے ہوں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ خط بھی ایڈیٹر ہی کے لکھے ہوتے ہیں۔ ہم اس خیال کی بھی تردید نہیں کرنا چاہتے کیونکہ آخر ہم بھی عوام میں سے ہیں اور رائے عامہ میں ہمارا بھی کچھ عمل دخل ہے۔ لیکن چونکہ ہم قدرے مختلف عوام ہیں اس لیے ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ ایسے سارے خط خود ایڈیٹر کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ صرف وہ خط ان کے لکھے ہوتے ہیں جن میں ان کی بہت زیادہ تعریف ہوتی ہے۔۔۔
دکھا گیا ہے کہ عورتیں اپنے حسن کی اور ایڈیٹر اپنے اداریوں کی تعریف سن کر ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں یعنی ختم ہو جاتے ہیں۔

اخبار چاہے خود کا خریدا ہوا ہو یا مانگا ہوا، اسے شروع سے آخر تک پڑھنا چاہیے۔ سرکاری ملازمتوں کے اعلان اگر کچھ لوگ نہ پڑھیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ ملازمتیں سب کے لیے تھوڑے ہی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے سرکاری ملازمتیں غیر مصدقہ لوگوں میں نہیں بانٹی جا سکتیں۔ ان ملازمتوں میں کس کا کتنا حصہ ہے یہ سب جانتے ہیں اور اس کا ذکر اس لیے بھی غیر ضروری ہے کہ یہ بہت معمولی بات ہے بلکہ ایک لحاظ سے کوئی بات ہی نہیں ہے بیرون ملک بھی تو آخر بیسیوں ملازمتیں ہیں۔ ان کے اعلان پڑھیے ۔۔۔۔۔۔ تو اخبار پڑھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پورا اخبار پڑھا جائے تاکہ کوئی اہم خبر پڑھنے سے رہ نہ جائے۔ اس کا نتیجہ برا ہوتا ہے (آج کل تو ہر کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے)

ہم برسوں سے سالم اخبار پڑھنے کے عادی ہیں ۔۔۔۔۔ آپ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ مرغ مسلم کھالیں تو یہ عادت جڑ پکڑ لیتی ہے ۔۔۔۔۔ اور اس عادت کی وجہ سے ہماری معلومات ان لوگوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہیں جو اخبار کی یا تو صرف سرخیاں پڑھتے ہیں یا صرف کوئی مخصوص کالم ۔۔۔۔۔ کچھ لوگ تو صرف "ضرورت رشتہ" کا صفحہ پڑھنے کے لیے اخبار خریدتے ہیں اور اتنی خط و کتابت کرتے ہیں کہ ان کے پاس تصویروں اور تحریروں کا انبار لگ جاتا ہے۔ یہ سب لوگ پہلے ہی سے شادی شدہ ہوتے ہیں۔ اور صرف اس لیے خط و کتابت کرتے ہیں کہ آدمی کی کوئی نہ کوئی "ہابی" ہونی چاہیے۔

جی چاہتا ہے کہ کوئی دلچسپ خبر (جو آپ نے نہیں پڑھی ہے) آپ کی خدمت میں پیش کی جائے ۔۔۔۔۔ تو عرض ہے۔

یہ خبر اٹلی کی ہے۔ اس خبر میں بتایا گیا ہے کوئی گیارہ سال پہلے اٹلی کے کسی شہر کی عدالت نے ایک خاتون کو ایک عدد مرغی کے سرقے کے سلسلے میں ۱۰ ماہ قید کی سزا سنائی تھی۔ (قید سادہ ۔ قید سادہ غالباً اس لیے کہ خود مرغی کے سرقے میں کافی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے) لیکن اس حکم پر عمل نہیں کیا جا سکا ۔۔۔ نہیں نہیں۔ یہ شبہ نہ کریں کہ اس حکم پر عمل نہ کیے جانے کی کوئی غیر سرکاری وجہ تھی (جیسا کہ عموماً اکثر ملکوں میں ہوتا ہے اور قیدی یا تو عدالت کے احاطے سے فرار ہو جاتے ہیں یا پھر اگر یہاں موقع نہ مل سکے تو جیل کے احاطے سے) بلکہ اس حکم کی تعمیل اس لیے نہیں کی جا سکی کہ اٹلی میں (جہاں کے کھانے اور مسولینی مشہور ہیں) یہ قانون نافذ ہے کہ اگر کسی خاتون کے بچہ ہونے والا ہو اور جرم کی نوعیت معمولی ہو جیسی کہ مرغی کا سرقہ وغیرہ تو اس خاتون مذکورہ کو اس حالت میں جیل نہیں بھیجا جا سکتا ۔۔۔۔۔ عجیب ملک ہے جہاں ان کے طلوع ہونے سے پہلے ہی بچوں کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے جبکہ کچھ ملکوں میں تو (شادی شدہ) خواتین کو اس حالت تک پہنچنے ہی سے روکا جاتا ہے۔ طرح طرح کی ترغیبات دی جاتی

ہیں اور وہ اس حالت کو پہنچ بھی جائیں تو رفع حالت کی تدابیر قانونی طور پر اختیار کی جاسکتی ہیں اور کچھ ملکوں میں تو ایسے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں کہ خواتین جیل جانے کے بعد اس حالت کو پہنچی ہیں (اسے قید با مشقت کہا جاتا ہے)۔۔۔۔۔۔ آپ نے صحیح سوال کیا کہ آخر ۱۱ سال کی طویل مدت تک اس حکم پر عمل کیوں نہیں کیا جاسکا ۔۔۔۔۔۔ ہنسیے مت ، آپ کوئی مزاحیہ مضمون نہیں پڑھ رہے ہیں (لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ مزاحیہ مضمون پر ہنسی آتی کہاں ہے) ہم آپ کو ہنسنے سے اصل میں اس لیے منع کر رہے ہیں کہ اس خبر میں یہ بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ ان ۱۱ سالوں میں محترمہ ۱۴ مرتبہ اس حالت کو (کامیابی کے ساتھ) پہنچ چکی تھیں اور جب بھی پولیس یا محکمہ عدالت کے کارکن ان کے گھر جاتے وہ ایک طبی صداقت نامہ پیش کر دیتیں جس میں تازہ ترین صورتِ حال درج ہوتی ــ (یوں بھی عیاں را چہ بیاں کا معاملہ ہوتا) خاتون مذکورہ کی عمر ۴۲ سال بتائی گئی ہے ۔ یعنی جب انھوں نے وہ (ناشدنی) مرغی چرائی تھی تو ۳۱ سال کی تھیں ۔ خبر اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ قانون محترم کا پورا بائیوڈاٹا اس میں درج نہیں ہے ۔ مطلب یہ کہ خبر میں یہ تفصیل نہیں دی گئی ہے کہ ان کی شادی کس سنہ میں ہوئی اور جس وقت انہیں مرغی کے سرقے کی ضرورت پیش آئی وہ بغرض ہنی مون گئی تھیں یا اس ضیافت میں کچھ اولادیں بھی حصہ لینے والی تھیں ۔ اس خبر میں ہمیں افسوس ہے کہ یہ بھی نہیں بتایا گیا ہے کہ ان کے خاندان کی موجودہ کیفیت کیا ہے اور وہ کتنے افراد پر مشتمل ہے (افراد کی بجائے ہم اسٹاف کا لفظ استعمال کرنا چاہیں گے) اور یہ کہ اس اسٹاف میں ذکور و اناث کا کیا تناسب ہے ۔ کیا وہی تناسب ہے جو ان دنوں سرکاری اور میونسپل دفاتر میں رائج ہے ۔

ہم نے سنا تھا کہ قانون سے بچنے کے کئی راستے ہیں اور یہ کہ قانون داں حضرات اپنے موکل کو قانون و انصاف کی زد سے بچائے رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر ہی لیتے ہیں لیکن اس واقعہ میں جس کی تفصیل ابھی ابھی ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کی ، کسی ماہر قانون کے مشورے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ محترمہ نے بذاتِ خود (اپنی عقل اور عمل) سے اپنے آپ کو جیل جانے سے محفوظ رکھنے کی تدبیر ۔ آسان تدبیر ڈھونڈ نکالی ۔۔۔۔۔۔ قدرت نے بھی ان کا ساتھ دیا ۔۔۔۔ قدرت کے متعلق مشہور ہے کہ یہ آدمی کا اکثر ساتھ دیتی ہے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی کو قوتِ ارادی سے کام لینا چاہیے ۔۔۔۔۔۔ صدقِ دل سے آرزو کرو خود بخود پوری ہوگی ۔۔۔۔۔ خواہ نیت قانون سے بچنے ہی کی کیوں نہ ہو ۔

اس خبر سے ہم نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا (آپ بھی کیجیے) کہ اٹلی صرف زرخیز ہی نہیں مردم خیز علاقہ بھی ہے ۔ (اس مردم خیزی میں ان خواتین کا بھی ہاتھ ہے) مردم خیز علاقہ ہم اس علاقے کو کہتے ہیں جہاں جانوروں کے مقابلے میں آدمی زیادہ پیدا ہوں ۔ صرف چند بڑے آدمیوں کے پیدا ہو جانے کی بنا پر کسی علاقے کو مردم خیز کہنا یا تو سیاست ہے یا صرف شاعری ۔ واقعہ نگاری نہیں ہے ۔

اس خبر سے مستفید ہونے کے بعد اٹلی کی وقعت ہماری نظروں میں اور بڑھ گئی ۔ اس ملک کے ہم ہمیشہ سے قائل رہے ہیں ۔ رومن فلاسفر ، جو بے حد مشہور ہیں ، اسی ملک میں پیدا ہوئے ۔ مجنوں اور فرہاد

کی ہم بہت تعریفیں کرتے ہیں لیکن جولیس سیزر کو بھول جاتے ہیں۔ کسی بھی نظم یا غزل میں اس کا ذکر نہیں آتا۔ یہ عاشق جانباز بھی اسی ملک کا ہونہار فرزند تھا۔ فرہاد کے ہاتھ میں تیشہ تھا اس کے ہاتھ میں شمشیر (مجنوں کے تو دونوں ہاتھ خالی تھے)۔ جولیس سیزر نے قلوپطرہ کو ازسرنو ملکہ بنا دیا (ویسے وہ اس کی مستحق تھیں بھی) اس کے علاوہ ہمیں اس ملک کی دوسری چیز جو بہت زیادہ پسند ہے وہ رومن رسم الخط ہے۔ ہمیں تو شبہ ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ رسم الخط رسم دنیا بن جائے گا ——— حد یہ ہو گئی کہ اب تو وہ لوگ بھی جو صرف ایک مخصوص زبان کا رسم الخط بدلنے پر مصر ہیں، یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم لوگ جتنی بھی زبانوں کے حلقہ بگوش ہیں۔ ان سب کا رسم الخط ایک ہونا چاہیے۔ اسی لیے تو ہم عرض کر رہے تھے کہ جب بھی کوئی اخبار پڑھیے۔ شروع سے آخر تک پڑھیے۔ کچھ لوگ اخبار پڑھتے پڑھتے سو بھی جاتے تھے۔ وہ اخبار بھی ویسے ہوتے تھے۔ نیند آور۔ اب تو جو بھی اخبار پڑھیے آنکھیں کھلی کی کھلی رہتی ہیں ———

سینما کے اشتہارات بھی ضرور پڑھیے لیکن ان اشتہاروں کے ساتھ جو تنہا یا مشترکہ تصویریں چھپتی ہیں ان سے نظریں چرائیے۔ نظریں چرانا ہی ایک ایسی چوری ہے جو جرم نہیں ہے ———

●●

برق آشیانوی
(حیدرآباد)

شیر خورمہ مبارک

ایک ہوتا ہے شیر یعنی دودھ اور دوسرا ہوتا ہے خرما یعنی کھجور اور جب یہ دونوں گلے مل لیتے ہیں تو بن جاتا ہے "شیر خورمہ" جو حلق سے اتر جاتا ہے تو لوگ دل بھر گلے ملتے پھرتے ہیں۔ ماہ رمضان کے پورے روزے رکھنے کے بعد شوال کی پہلی تاریخ یعنی عید کے روز صبح کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ زندگی میں کبھی صبح کے وقت کھایا ہی نہ تھا اور آج ہی کھانے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ پورا ایک مہینہ نماز فجر سے پہلے سحری کھانے میں گذرا تھا۔ جس قدر یہ "احساس" ہوتا ہے اس سے زیادہ اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غرض صبح عید کے لذیذ پکوان کے بعد سب سے زیادہ لذیذ شیر خورمہ حلق سے اتر جاتا ہے تو دل بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ○

(یعنی تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

ہم اپنے گھر کی نفسیات کا اتنا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں کہ اپنے گھر کی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ "ماہر نفسیات" ہیں۔ چنانچہ شیر خورمہ نے ہمارے منہ میں پہلا قدم رکھا نہیں کہ تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں۔ "واہ کیا لذیذ شیر خورمہ بنا ہے کہ اس کی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔" پھر گفتگو کا رخ بدل دیتے ہیں اور کچھ اس قسم کی بحث شروع کر دیتے ہیں تاکہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ دراصل ہماری نیت کیا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہوتے ہوئے بھی بعض وقت اپنی تنگ دامانی پہ روتی ہے اسی پر تو حضرت جوش ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

دل کا دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتا نہیں
آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

ہمارا بالکل یہی حال ہے اس وقت ———— ایسا ہی شیر خورمہ کو لیجیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی دل کھول کر تعریف کریں۔ لیکن جتنا دل کھلتا ہے اتنی زبان نہیں کھل سکتی یعنی الفاظ نہیں ملتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں "سبحان اللہ کیا شیر خورمہ" ارشاد ہو آیا ہے کہہ سکتے۔" واللہ کیا شیر خورمہ نازل ہوا ہے۔ یا اس طرح کہہ لیجیے۔ "جزاک اللہ وہ شیر خورمہ" اترا ہے یا ایسا ہے کہ جواب نہیں۔ لیکن چونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور یونیورسٹی میں مزید تعلیم

"یافت" کر رہے ہیں (تعلیم "یافت" کرنا ہماری اپنی جدت ہے۔ زبان کے اعتبار سے اس کی صحت یا عدم صحت کی بحث میں ہم اس لیے نہیں پڑنا نہیں چاہتے کہ کہیں خود ہماری صحت یا "عافیت" خطرہ میں نہ پڑ جائے) چنانچہ اس "یافتہ" اور "یافتگی" کا اظہار اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ شیر خورمہ کی باقاعدہ تعریف نہ کی جائے اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ہمارے گھر کی جملہ "نفسیات" میں ایک چیز یہ بھی شامل ہے کہ بھابی جان صاحبہ اپنی یا اپنے کارناموں بہ شمول تین لڑکوں کی تعریف کو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھتیں جب تک کہ انگریزی زبان کے چند جملے اور جملے نہ ہو سکیں تو کم از کم الفاظ استعمال نہ ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ اس بات پر فخر کرتی رہتی ہیں کہ انھوں نے مشن اسکول میں دسویں جماعت میں پانچ مرتبہ فیل ہونے کے بعد امتحان لینے والوں پر لعنت بھیج کر تعلیم ترک کر دی تھی۔ ہم انگریزی جملوں میں فی الحال تعریف کرنا اس لیے بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ جملہ ذرا سوچ سمجھ کر بنانا پڑتا ہے کیونکہ بھابی جان اکثر صحیح الفاظ کے غلط معنی لے کر اپنی انگریزی دانی کا ثبوت دینا چاہتی ہیں۔ البتہ ان الفاظ کا بے تکان استعمال کرتی ہیں جن کو وہ خود اکثر غلط موقعوں پر استعمال کر کے اپنی دانست میں بالکل صحیح سمجھتی ہیں۔ لہٰذا ہم تعریف شروع کر دیتے ہیں۔ "کیا شیر خورمہ ہے بھابی جان کہ جس کو کیا کہتے ہیں marvellously grand .... یا یوں کہنا چاہیے Most Wonderful اگرچہ امّی جان بھی برسوں بلکہ "صدیوں" سے بناتی آرہی ہیں لیکن یہ taste اور یہ flavour تو کچھ اور ہی ہے۔ یعنی یہ تو بالکل لیٹسٹ ڈزائن (Latest Design) کا ہے اگرچہ شیر خورمہ کے متعلق لفظ ڈزائن کا استعمال کچھ موزوں و مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن بھابی جان صاحبہ اس لفظ کو اس کثرت سے استعمال کرتی ہیں کہ جائے، شربت، کچھ بلکہ کلچر کے بارے میں بھی ڈزائن ہی کہا کرتی ہیں۔ غرض یہ سب تعریفیں ہم جس نیت سے کرتے ہیں دوسرے لوگ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں لیکن ہماری بھابی جان اس لیے نہیں سمجھتیں کہ وہ اپنی تعریف سن کر پہلے سے زیادہ موٹی ہو جاتی ہیں۔ جب وہ بہت موٹی ہو جاتی ہیں تو ان کی عقل اسی تناسب سے ان سے زیادہ موٹی ہو جاتی ہے۔ جب عقل موٹی ہو جاتی ہے تو باریک باتیں ان کے پلے نہیں پڑتیں۔ غرض اس تعریف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بھابی جان صاحبہ پورے خلوص کے ساتھ شیر خورمہ کا ایک اور پیالہ ہماری جانب بڑھا دیتی ہیں۔ ہم کچھ بنا دٹی عذر کرتے ہیں کہ ارے ـ ارے ـ بھابی جان اتنا شیر خورمہ بھلا کیسے کھا پی سکوں گا۔ یہاں پھر ایک مسئلہ پیدا ہو گیا کہ شیر خورمہ کھانے کی چیز ہے یا پینے کی۔ ہم نے جتنا اس مسئلہ پر غور کیا اتنا ہی ہمارے ذہن میں ایک مجلس مباحثہ منعقد ہوتی چلی گئی اور عالم خیال میں اس کے دونوں پہلوؤں پر تقریریں سنائی دینے لگیں۔ مقررین کی ایک جماعت یہ کہتی تھی کہ "شیر" یعنی دودھ کی رعایت سے یہ پینے کی چیز ہے۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ اس میں "خورمہ" یعنی کھجور کے علاوہ سیویوں کی کثرت اور مغزیات کی موجودگی اس کو کھانے کی چیز بنا دیتی ہے لہٰذا یہ کھانے کی چیز ہے۔ ہم نے اس مجلس مباحثہ کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنی تقریر صدارت میں یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ شیر خورمہ کے لیے کھانے اور پینے کے الفاظ کو ملا کر ایک نئی اصطلاح وضع کی جائے۔ اور وہ ہے "کھا پینا"۔ اس اصطلاح کا استعمال شیر خورمہ کے ساتھ بول چال

میں اس طرح کیا جانا چاہیے ہم آج میں نے شیر خورمہ" کھا پی لیا — لیجیے یا شیر خورمہ کھا پی لیجیے۔ یا کیوں صاحب آپ کچھ شیر خورمہ "کھا پینا" پسند کریں گے۔؟"

ہائے نہ ہوئے آج وحیدالدین سلیم صاحب قبلہ جو ہماری اس جدت کی داد دیتے ہوئے ارشاد فرماتے کہ۔

"ایسے ہی باکمال لوگوں سے اردو زبان "پاؤں پھیلا رہی ہے"۔

بہرحال ہم نے پوری عیاری و مکاری کے ساتھ بھابی جان صاحبہ کی تعریف کو شیر خورمہ سے بھی آگے بڑھایا اور لگے ہاتھ یہ بھی کہہ دیا کہ آج تک جتنے پکوان بھابی جان صاحبہ کے ہاتھوں یا ذرا سی نگرانی میں بھی ہوئے ہیں۔ وہ اتنے لذیذ ثابت ہوئے ہیں کہ ان پر سے کئی اعلیٰ درجے کی ہوٹلیں قربان کر کے کسی ندی یا تالاب میں پھینک دی جا سکتی ہیں۔ اب تو تیسرا پیالہ شیر خورمہ کا آ گیا۔ اس کے بعد بھابی جان صاحبہ "من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو" کے مصداق ہماری تعریف شروع کر دیتی ہیں۔ "مسعود کا کھانا پینا میرے جی کو لگتا ہے (کیونکہ وہ خود بھی کھانے پینے میں ہم سے کم نہیں بلکہ ہاتھ دو ہاتھ زیادہ ہی ہیں) ہم پکوان پر محنت اور توجہ صرف کرتی ہیں کہ چیز اچھی بنے لیکن یہ کیا کہ کھانے والے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ ہاں ہاں میں تو اور سبھوں کے کھانے کو سونگھنا ہی کہتی ہوں تولہ دو تولہ کھانا بھی کوئی کھانا ہوتا ہے۔ یہ تو سونگھنا ہوتا ہے سونگھنا۔ کھاتا ہے میرا مسعود۔ لو مسعود ایک اور پیالہ۔ دیکھو اس میں میں نے بادام چرونجی، پستے چلغوزے کچھ زیادہ ہی شریک کیے ہیں۔" لیجیے یہ چوتھا پیالہ تو خاص الخاص آ گیا۔ لیکن ادھر منہ لگایا تھا کہ ادھر والد صاحب گرجے۔ "کہاں ہے مسعود — ؟ عید گاہ بھی چلے گا یا دستر خوان پر عید کی نماز پڑھے گا"۔ نتیجہ یہ کہ اس چوتھے پیالے کو جس طریقہ پر حوالۂ کام و دہن کرنا چاہیے تھا وہ نہ ہو سکا۔ عجلت میں جو حلق سے اتارا اس کو زہر مار کرنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ بڑی تیزی کے ساتھ کپڑے بدلے کیونکہ والد صاحب قبلہ کا یہ عالم رہتا ہے کہ مسعود تو مسعود گھر کے ایک چوہے کو بھی وہ ساتھ لے جانا چاہتے ہوں اور اس کو تیار ہونے میں کچھ دیر ہو تو وہ اس وقت تک انتظار کریں گے کہ وہ چوہا بھی کپڑے بدل کر تیار ہو جائے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد حضرت والد صاحب نے خطبہ شروع فرما دیا جس کو عید کے خطبے سے قبل کا خطبہ کہا جا سکتا ہے اور جس کے مختصر اور منتشر بول یہ تھے۔ "کھانے میں اعتدال ہونا چاہیے۔ زیادہ کھانے سے صحت خراب ہو جاتی ہے (جس کی مثال وہ خود اپنے آپ سے دیا کرتے تھے) میرا کوئی بچہ اتنا پیٹو نہیں (حالانکہ کئی مرتبہ ارشاد فرما چکے ہیں کہ ہماری اس عمر میں جو خوراک ہے وہ آج کل کے "لونڈوں" یعنی نوجوانوں میں نہیں ہے) زیادہ میٹھا کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں (کئی مرتبہ میٹھے کی پوری ایک پلیٹ کھانے کے بعد ڈاکٹروں کے اس قول کو غلط قرار دے چکے ہیں کہ زیادہ میٹھا کھانے سے دانت خراب ہوتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں اپنے پورے اکتیس دانت گن کر بتلا چکے ہیں۔ باقی ایک دانت جو ٹوٹ چکا تھا اس کے بارے میں کبھی پوچھا جاتا ہے تو والدہ صاحبہ کی طرف دیکھ کر ہنس دیتے ہیں۔ دستر خوان پر سے تو ہاتھ پکڑ کر اٹھانا پڑتا ہے۔ جتنی دیر میں، میں دو پلیٹیں کھا لیتا ہوں، یہ کمبخت ایک پلیٹ بھی پوری نہیں کھاتا اور لوگ کھا کر اٹھ جاتے ہیں (اور اکثر یہ کہاوت دہراتے رہتے ہیں کہ مرد کے کھانے اور عورت کے نہانے میں دیر نہیں ہونی چاہیے) کھانے میں زیادہ دیر کرنے سے عقل موٹی ہو جاتی ہے۔ درسی کتابیں اتنی دیر تک نہیں پڑھی جاتیں جتنی دیر کھانے میں لگائی جاتی ہے جس کی وجہ سے دو مرتبہ فیل ہو چکا ہے . . .

لے لو وہاں تو نماز کی تیاری ہو رہی ہے۔ پوری جماعت کھڑی ہو گئی ہے ...... اور یہ سب مسعود کی وجہ سے۔"

کار رک جاتی ہے۔ کار سے اتر کر لشتم پشتم گھس گھسا کر جہاں جن کو جگہ ملی وہیں کھڑے ہو گئے اور بفضلِ خدا نماز پوری ہو گئی۔ پھر جتنے دوست احباب عزیز اقارب ملے ان سے گلے ملتے رہے اور "عید مبارک" شروع ہو گئی۔ واپسی میں عیدگاہ سے لے کر گھر تک والد صاحب کی پھر ایک تقریر شروع ہو جاتی ہے جس کا عنوان ہوتا ہے "مسعود کے زیادہ کھانے اور اس سے زیادہ دیر تک کھانے سے صحت پر مضر اثرات اور اس کے معاشی، معاشرتی اقتصادی اعتبار سے نقصانات" یہ عنوان اگرچہ طویل نظر آتا ہے۔ لیکن آج کل ہم نے دیکھا ہے کہ کہانیوں، یا مضامین کے عنوانات کبھی ایک اور کبھی دو سطروں میں قائم کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں شوق ہوا کہ حضرت والد صاحب قبلہ کی تقریر کو ان کی بزرگی و عظمت کے علاوہ ان کی طویل القامتی کے اعتبار سے ذرا طویل رکھیں۔ گھر پہنچنے پر تقریر تو ختم نہیں ہوتی البتہ اجلاس منتشر ہو جاتا ہے۔ اور ہم بھابی جان صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر ایک مکاری کے ساتھ عرض کرتے ہیں۔

"شیر خورمہ مبارک"

●●

مقرب حسین مقرب
رتلام (مدھیہ پردیش)

قیمتی چھتری

چلا تھا ہو کے اک ہوٹل سے رخصت — تو آئی مجھ پہ اک تازہ مصیبت
ہوئی یہ بھول بس مجھ سے خدایا — کہ اُس ہوٹل میں چھتری چھوڑ آیا
یہ میرے واسطے مشکل بڑی تھی — کہ چھتری بھی نہایت قیمتی تھی
اچانک پھر سے میں ہوٹل کو لوٹا — جہاں ٹھہرا تھا اُس کمرہ پہ پہنچا
یہاں قسمت نے یوں بدلا لیا تھا — وہ کمرہ دوسرے کو دے دیا تھا
ہٹا کر میں نے اُس کمرہ کا پردہ — بہ شوقِ جستجو اندر جو جھانکا
وہیں سے بڑھ گئی کچھ دل کی دھڑکن — وہاں تھا ایک دولہا اور دُلہن
یہ دِکھتا تھا نئی شادی ہوئی ہے — کہ کل ہی خانہ آبادی ہوئی ہے
وہ غافل تھے کہ دروازہ کھُلا ہے — کوئی پردہ کے پیچھے بھی کھڑا ہے
جو سچ پوچھو وہ تھے دنیا سے غافل — حسیں جوڑے کی تھی رومانس منزل
دلہن دولہا کے خود آغوش میں تھی — جوانی دونوں جانب جوش میں تھی
مری آنکھوں نے یہ منظر جو دیکھا — میں خود گھبرا کے پردہ چھوڑ بیٹھا
بڑی رومانٹک وہ گفتگو تھی — مجھے سننے کی بھی کچھ آرزو تھی
سنوں دلچسپ باتیں اُن کے منہ سے — کھڑا تھا اس لئے پردہ کے پیچھے
کہا دولہا نے اے جانِ زمانہ — تجھے میری قسم سچ سچ بتانا
ترے سینے میں نازک دل ہے کس کا — ترے رُخسار پر یہ تِل ہے کس کا
تجھے میری قسم یہ بھی بتا دے — ہیں کس کی ملکیت آنکھوں کے پیالے
یہ تیرے جامِ جم کس کے لئے ہیں — تیری زلفوں کے خم کس کے لئے ہیں
یہ تیری شوخیاں، تیری شرارت — تیرے بازو ہیں یہ کس کی امانت
تیری رعنائیاں کس کے لئے ہیں — تیری تنہائیاں کس کے لئے ہیں
کہا دُلہن نے شرما کر لجا کر — ذرا کچھ اور بھی نزدیک آ کر
مرے سینے میں نازک دل ہے تیرا — مرے رخسار پر یہ تِل ہے تیرا

یہ میری شوخیاں، میری شرارت
مرے بازو میں یہ تیری امانت
یہ میرے جام جم تیرے لئے ہیں
میری زلفوں کے خم تیرے لئے ہیں
تو ہی مالک میری تنہائیوں کا
تو ہی مالک ہے سب انگڑائیوں کا
اُدھر خیرات جم کر بٹ رہی تھی
اِدھر چھاتی ہماری پھٹ رہی تھی
نظر آیا مجھے کچھ ایسا خطرہ
اگر دولہا نے یہ دلہن سے پوچھا
کہ وہ کونے میں رکھی ہے جو چھتری
ذرا یہ بھی بتادے ہے وہ کس کی
کہیں ایسا نہ ہو، دُلہن یہ کہہ دے
تمہیں مالک ہو اسے سرتاج اُس کے
میں یہ سب سوچ کر گھبرا گیا تھا
میں گھبرا کیا گیا "بھیرا" گیا تھا
وہیں پر میں نے پردہ کو ہٹا کر
قدم دو چار کمرہ میں بڑھا کر
کہا میں نے کہ او مجنوں کی اولاد
تری خدمت میں ہے اتنی سی فریاد
تری دُلہن کی ہے ہر چیز تیری
مگر کونے میں وہ چھتری ہے میری
مقدر اُس نے چکر سے بچایا
میں چھتری لے کے فوراً بھاگ آیا

قمر الزماں قمر (رانچی)

نقّاد (پیروڈی)

[روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ]

برتر از اندیشۂ سود و زیاں نقّاد ہے
مہرباں نقّاد ہے، نامہرباں نقّاد ہے
تو اسے پیمانۂ عقل و تجسّس سے نہ ناپ
چوں چرا نقّاد ہے یا این و آں نقّاد ہے
اپنی دُنیا خود ہی پیدا کر اگر شاعر ہے تو
تو زمیں پر رہ بلا سے آسماں نقّاد ہے
کوہ کن کا قول ہے نقّاد کے بارے میں یہ
"جوئے شیر و تیشۂ و سنگِ گراں نقّاد ہے"
شعر گوئی میں تو خاک و دھول سے آگے نہیں
شعر کم فہمی میں لیکن اِک جہاں نقّاد ہے
شاعری کے بحر پر اُبھرا ہے تو مثلِ حباب
شاعروں کے واسطے اک امتحاں نقّاد ہے
ہو اگر شاعر کو غالبؔ، میرؔ بننے کی ہوس
پہلے وہ نقّاد کوئی مہرباں پیدا کرے
شاعری کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
اور شعروں میں فروغِ جاوداں پیدا کرے

عطاء الحق قاسمی
(پاکستان)

گھوڑے

تانگے میں جُتے ہوئے گھوڑے کے متعلق ہم نے گزشتہ روز خاصی معلومات حاصل کی ہیں۔ یہ معلومات
لحاظ سے FROMHORSE'SMOUTH ہی کے ضمن میں آتی ہیں کیوں کہ گھوڑا اس وقت پاس ہی موجود
ا جب ہم اس کے مالک سے باتیں کر رہے تھے۔ مثلاً اس گفتگو کے دوران ہمیں یہ معلوم ہوا کہ تانگے میں جتا ہوا
گھوڑا قریباً سو روپے روزانہ کماتا ہے۔ یعنی وہ قریباً اٹھارویں سکیل میں ہے تاہم اس میں سے اس کے ہاتھ
ن بیس پچیس روپے ہی آتے ہیں جو اس کے چارے وغیرہ پر خرچ ہوتے ہیں۔ باقی رقم اسے تانگے میں جوتنے
لے کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ گھوڑے کی پنشن، گریجویٹی اور طبی سہولتوں وغیرہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ
ب حالات پر DEPEND کرتا ہے یعنی اگر اس کی بیماری قابلِ علاج ہے اور زیادہ رقم کی متقاضی نہیں
ہے، نیز مالک کو اس امر کا اطمینان ہے کہ صحت یاب ہونے پر گھوڑا اپنی ڈیوٹی پوری طرح انجام دے سکے گا
اس کا باقاعدہ علاج معالجہ کرایا جاتا ہے اور یوں اسے طبی سہولتوں کے فقدان کی شکایت محسوس نہیں ہوتی۔
وڑا جب بوڑھا ہو جائے اور اپنے فرائض کما حقہٗ انجام دینے کے قابل نہ رہے تو اسے پنشن اور گریجویٹی یک
شت ادا کر دی جاتی ہے۔ اس کی صورت یوں ہوتی ہے کہ اسے تانگے میں جوتنے والا مالک اسے اونے پونے داموں
بیچ دیتا ہے اور گھوڑا، یہ رقم بطور امانت اپنے پاس رکھتا ہے اور پھر اس کے پراویڈنٹ فنڈ میں سے کچھ رقم مزید
ل کر وہ نیا گھوڑا خرید لیتا ہے!

متذکرہ گھوڑے کے اوقاتِ کار کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق ایک فرض
شناس اور محنتی گھوڑا، موسم سرما میں صبح سے لے کر رات تک اپنی ڈیوٹی انجام دے سکتا ہے، جبکہ موسم گرما
ما اس سے صرف بارہ گھنٹے ڈیوٹی لی جاتی ہے۔ اوور ٹائم کے متعلق ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یہ قدرے
تلف صورت میں اسے ملتا ہے اور یہ صورت یوں ہے کہ ڈیوٹی کے اختتام پر اسے ایک گھنٹے تک کھڑا رکھا کیا جاتا
ہے چنانچہ اس کی مستی جاتی ہے نتیجے میں اگلے روز تانگے میں جوتے جانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ گھوڑے کے لیے
ز کچھ سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں اور وہ یوں کہ رات کو اسے جہاں باندھا جاتا ہے، وہ تین چار گز سے بھی
یادہ ہوتی ہے تاکہ وہ کھل کر "لوٹنیاں" لے سکے۔ متذکرہ گھوڑے کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کی دادا ان ڈیم

یہی "لوٹنیاں" لینا ہے۔

گھوڑے کو ہفتہ وار چھٹی بھی باقاعدگی سے ملتی ہے، تاہم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اپنی چھٹی کس طرح گزارتا ہے، لیکن اس کے متعلق چونکہ شنید یہ ہے کہ وہ بہت ملنگ قسم کی مخلوق ہے۔ اس لیے اس سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ چھٹی کے روز گھر پر ٹیلیویژن دیکھتا ہوگا، دوپہر کو چائنیز کھانا کھانے چلا جاتا ہوگا یا DATING وغیرہ کرتا ہوگا بلکہ اس کے متعلق امید یہ ہے، امید ہی نہیں، اطلاع بھی یہی ہے کہ وہ سارا دن فرش پر "لوٹنیاں" لیتے گزار دیتا ہے اور پھر اگلے روز خوشی خوشی دوبارہ تانگے میں جت جاتا ہے!

تانگے میں جوتے جانے والے گھوڑے کے عموماً بال بچے نہیں ہوتے۔ یہ ساری عمر تجرد میں بسر کرتا ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے بچپن میں اپنے والد بزرگوار اور والدہ محترمہ کو بھی جتا دیکھا ہو اور خود تانگے کے پچھلے حصے میں بندھی رسی کے ذریعہ سارا دن ان کے ساتھ ساتھ گھسٹا ہو اور پھر بالغ ہونے پر تلاشِ معاش کے لیے اسے ان سے بچھڑنا پڑا ہو۔ اگر یہ امکانی وجہ درست ہے تو پھر اس کے مجرد رہنے کے فیصلے کی داد دینا پڑتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ گھوڑا واقعی گھوڑا ہے گدھا نہیں ہے!

گھوڑے کی آنکھوں پر دائیں اور بائیں جانب کھوپے چڑھائے جانے کی وجہ ہم نے دریافت کی تو اسے تانگے میں جوتنے والے مالک نے بتایا کہ یہ اقدام محض گھوڑے کے اخلاق کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ دائیں بائیں جانب سے گزرنے والی گھوڑیوں نیز سینما کے پوسٹروں پر اس کی نظر نہ پڑ سکے اور وہ سیدھے راستے پر گامزن رہے۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ یہ حفاظتی انتظامات دو طرفہ طور پر کیے جاتے ہیں، یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ ٹریفک کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا تاہم اس نے وضاحت کی کہ گھوڑے کو ڈیوٹی کے اختتام پر اور ہفتہ وار تعطیل کے روز یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ زمین پر جی بھر کر لوٹنیاں لے۔ ہمارے اس سوال پر کیا انجمن تفریح صالحین (ریس کلب) والے گھوڑوں کے لیے کوئی خصوصی تفریحی پروگرام وضع نہیں کرتے۔ وہ خندہ زن ہوا اور بتایا کہ یہ انجمن صالحین کی تفریح کے لیے ہے۔ گھوڑوں کی تفریح کے لیے نہیں۔

اس گفتگو کے دوران انجمن انسدادِ بے رحمی حیوانات کے متعلق معلوم ہوا کہ اس کے ارکان بہت معاملہ فہم واقع ہوئے ہیں۔ تانگے میں جوتے جانے والے گھوڑے کے مالک نے بتایا کہ بسا اوقات یہ لوگ لڑکھڑاتی ٹانگوں اور گز بھر زبان باہر نکالے کسی ہانپتے گھوڑے کو دیکھ کر تانگہ روک لیتے ہیں اور بازپرس کرتے ہیں۔ لیکن جب انہیں علیحدہ لے جا کر صحیح صورتِ حال سمجھائی جاتی ہے تو بظاہر نظر آنے والی صورتِ حال سے غلط فہمی کا شکار نہیں ہو پاتے، چنانچہ وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر معاملہ فہم نہ ہوں، تو انسان کی بجائے "گھوڑے کے منہ سے" نکلی ہوئی بات پر ہی یقین کر بیٹھیں۔

تانگے میں جوتے جانے والے گھوڑے کے بعد ہماری ملاقات شادی بیاہ پر دولہا کی سواری کے کام آنے والے گھوڑے کے مالک سے بھی ہوئی اور دورانِ گفتگو اس سے خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ گھوڑا بھی اس وقت پاس ہی کھڑا گردن کھرلی میں دانہ کھا رہا تھا۔ اس وقت اس کی کمر پر آرائش کی کوئی چیز نہ تھی، بلکہ اس کا جسم دھول سے اٹا ہوا تھا۔ ہمارے ایک سوال پر ہمیں بتایا گیا کہ گھر میں یہ گھوڑا اس سے بھی زیادہ برے حال میں ہوتا ہے البتہ کسی شادی کی تقریب میں شرکت سے قبل اس کے سر پر خوبصورت پھندنا لگایا جاتا ہے۔ گوٹے کناری والے

طور سے اسے ڈھانپا جاتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی زین اس پر کسی جاتی ہے، ایسے گہنے پہنائے جاتے ہیں، پاؤں پر مہندی لگائی جاتی ہے اور جھانجریں پہنائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ ہمیں یہ بتائی گئی کہ یہ گھوڑا دراصل مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ خاصا STATUS CONSCIOUS ہوتا ہے اس لیے شادی وغیرہ کی تقریب میں مکمل تیاری کے بغیر جانے پر رضامند نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ جب اتنی ٹھاٹھ باٹھ والے گھوڑے پر دولہا سوار ہوتا ہے تو یہ مڈل کلاس گھوڑا اس پر پھولے نہیں سماتا کہ اسے تقریب کی سب سے اہم شخصیت کا گھوڑا بننے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ گھوڑے کے مالک نے بتایا کہ یہ مڈل کلاس گھوڑا ساری عمر اپنے سے برتر کلاس میں شامل ہونے کی کوشش میں اس کلاس کا گھوڑا بنا رہتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ زیادہ سے زیادہ بوجھ اسی گھوڑے پر لادا جاتا ہے۔ چنانچہ شادی کی تقریب میں اسے دولہا کے علاوہ شہ بالے کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

اس گفتگو کے دوران ایک یہ بھی ہوا کہ شادی کی تقریبات کے دوران اس گھوڑے کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دولہا کے کوئی عزیز عین اس کے برابر میں کھڑے تھیلے میں ہاتھ ڈال ڈال کر دولہا پر سے سکے نچھاور کرتے ہیں اور پھر بچے ان سکوں پر لوٹ پڑتے ہیں، ہمیں بتایا گیا کہ یہ مڈل کلاس گھوڑا بھی پوری شدت کے ساتھ اس لوٹ مار میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ مگر وضعداری اور بزدلی آڑے آجاتی ہے۔ اگر اسے اس کام کے لیے مناسب مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ کسی کو قریب نہ پھٹکنے دے!

یہ مڈل کلاس گھوڑا تمام عمر شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا رہتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس بار اس گھوڑے کو باقاعدہ ماہرِ نفسیات کے پاس لے جانا پڑا! ماہرِ نفسیات نے اس کے کان میں کچھ کہا جس پر اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اس پر ماہرِ نفسیات نے اس کے علاج سے معذوری کا اظہار کیا۔ بعد میں اس ماہرِ نفسیات نے بتایا کہ اس نے پوچھا تھا: "تم گھوڑے کی بجائے انسان بننا پسند کرو گے کہ سر پر کلغی اور پاؤں میں قیمتی جھانجر کے بغیر بھی ایک گھوڑا معزز ہو سکتا ہے!" مگر اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس نوع کی نفسیاتی پیچیدگیاں دراصل مختلف عوامل کے باعث اس میں پیدا ہوتی ہیں اور ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ چونکہ ابتدا ہی سے یہ شادی بیاہ کی تقریبات میں لوگوں کو زرق برق لباس اور قیمتی گہنوں میں ملبوس دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے سر کی کلغی اور پاؤں کی جھانجر سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوتا خواہ اس کے لیے اسے دولہا اور اس کے شہ بالے کو بھی اپنی پیٹھ پر سواری کیوں نہ کرانا پڑے!

اس گھوڑے کو متذکرہ نوع کی تقریبات میں اگلے پاؤں اُٹھا کر رقص کرنے کی کوشش کرتے بھی دیکھا جاتا ہے لیکن اس کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی، کیوں کہ اس صورت میں دولہا کے منہ کے بل گرنے کا خدشہ ہوتا ہے جبکہ گھوڑے کی نیت بہرحال نیک ہوتی ہے۔ وہ تو محض بڑے لوگوں کی خوشی کو اپنی خوشی ظاہر کرنے کے لیے رقص کرنا چاہتا ہے، تاہم گھوڑے کے مالک نے دورانِ گفتگو گھوڑے کی نیت پر بھی شک کا اظہار کیا اور کہا کہ اسکی یہ حرکت دانستہ ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف دولہا میاں کو منہ کے بل گرانا چاہتا ہے بلکہ وہ باراتیوں پر بھی دو لتیاں جھاڑنے کی دبی دبی خواہش دل میں رکھتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسا کر بھی گزرتا ہے تاہم زیادہ تر وہ "کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے" کے چکر میں رہتا ہے۔ اس کی اصلاحی وجہ یہ بتائی گئی کہ چوں کہ معاشی حالات کے باعث اس گھوڑے کی اپنی شادی نہیں ہو پاتی اس لیے وہ لاشعوری یا شعوری طور پر کسی اور کو بھی سہرے باندھے نہیں دیکھ سکتا!

دلاور فگار
(پاکستان)

نقلی ادویہ، نقلی مردہ، نقلی موت

[آج کل دواؤں کے مارکیٹ میں نقلی ادویہ کا سیلاب آگیا ہے لیکن موجودہ حکام اس طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں اور یہ نظم بھی اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے شائد متعلقہ حکام اس سیلاب کو روکنے کی تدابیر کریں۔]

اب تو ہر شعبہ میں پایا جاتا ہے جعلی عمل　　جعلسازی ہو رہی ہے ادویہ میں آج کل
چونکہ جعلی ادویہ کھاکر مرے گا اب مریض　　سلسلہ تیمار داری کا نہیں ہوگا عریض
سرخیاں یہ ہونگی اب روزانہ ہر اخبار کی　　ایک ہی گولی میں چھٹی ہوگئی بیمار کی
دیکھ کر میت کو چکر کھا گیا اک گورکن　　ڈاکٹر جعلی تھا، جعلی لگ گیا انجکشن
مرنے والا جس کو موت آئی ہے اک آسیب سے　　موت کی جعلی سند نکلی ہے اسکی جیب سے
قبر میں مردہ سے یہ کہتے ہیں اب منکر نکیر　　کس معالج نے تمہیں دی ہے یہ معجون کبیر
ٹیبلٹ لائے تھے تم کس میڈیکل سٹور سے　　نام آہستہ کیوں لیتے ہو بولو زور سے
لی تھی کس سٹور سے تم نے یہ ٹیرا مائی سین　　رحم کر تجھ اس دکان والے پہ رب العالمین
خودکشی کو بھی بہانہ چاہیئے تھا اک نہ اک　　کون تھا وہ جس سے لی تھی تم نے انٹی بائٹک
یہ وٹامن ڈی کی بوتل کس دکان سے لائے تھے　　موت برحق تھی یہ ڈی ڈی ٹی کہاں سے لائے تھے
کیوں ہے میری بات پر خاموش مُردے کچھ تو بول　　کون سے سٹور میں ملتے ہیں جعلی کیپسول
کل ہی اک سُرخی لگی تھی روزنامہ شان میں　　جعلی مُردوں کی وجہ سے رش ہے قبرستان میں
تم نے جعلی ادویہ کھالیں یہ کیسی بھول کی　　کس طرح پہچان ہو اب قاتل و مقتول کی
تم کو قبرستان میں بالفرض ہم کردیں جو پاس　　عالم بالا میں روکیں گے تمہیں مردم شناس
روک دے گا آپ کو یہ کہہ کے دربانِ جناں　　آپ قبل از وقت کیوں تشریف لائے ہیں یہاں؟
میری مانیں تو دوا اصلی دوبارہ کھائیے　　اس دوا سے مریئے اور مر کے یہاں پھر آئیے

اس طرح تو تم کو محشر میں نہ بھیجا جائے گا
پھر دوبارہ مر کے آؤ گے تو دیکھا جائے گا

-٥- ❀ -٥-

عاشق محمد خاں (کوٹ ادو پاکستان)

بسلسلۂ تذکرہ بزرگانِ جدید
حضرت بلند اختر پسروری

عابدِ کامل، زاہدِ اکمل، حکیم مکمل حضرت بلند اختر پسروری لاجوردی سلسلۂ تقسانیہ کے بانی مبانی تھے۔ سرور کے اعلیٰ ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے فیوض و برکاتِ بے پایاں کی بدولت مقبولِ خواص و عوام تھے۔ یپ کے خلفا میں حضرت طائرلاہوتی کا مقام بے مثیل و بے نظیر تھا۔ شہرت آپ کے خلیفہ عارف کی دُور دُور تک تھی ور شخصیت اس شاگردِ رشید کی خاصی مشہور تھی۔ قصّہ مختصر، آپ کا تذکرہ حضرت طائرلاہوتی کے نام سے پہلے ہی پیش کیا جاچکا ہے۔

حضرت بلند اختر، دھیمے مزاج، تند طبع اور جوشیلے فکر و جولانیٔ ذہن کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ مزاج میں لوّن گویا کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہی سبب ہے کہ آپ صبح کچھ کہتے تھے، شام کو کچھ فرماتے تھے اور دوسری صبح کچھ اور۔ للّٰہ جلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دور کے جس شخص کو ایک بار عاملِ کامل مان لیا پھر اسے کبھی نہ مانا۔ قلم میں وہ طاقت تھی کہ ادھر موضوع سوجھتا تھا اور ادھر رسالہ تکمیل پا جاتا تھا۔ شنید ہے کہ کبھی کتب خانوں کے نگراں تھے، اسی زمانے کا بے شمار کتب سے کیا گیا "استفادہ" زندگی بھر کام آتا رہا۔ غریب الذہن طالبوں کی ضرورت کیلیے بلا تالیف تصنیف دراحوالِ تاریخ زبان و ادب اس طرح رقم کی کہ بڑے بڑے مورّخ دنگ رہ گئے اور کتاب ہاتھوں ہاتھ بک کر عوام الناس کو ۳۳ فیصد نمبر میں کامیاب کرانے لگی۔

آپ ایک متقی، پرہیزگار اور دانشمند بزرگ تھے اور یہ آپ کی دانشمندی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے کتابوں کی نیک کمائی سے نام کمایا اور عالم لامکاں میں مکاں بنایا۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اُن سے کوئی بھی چھاپنے والا کچھ بھی لکھنے کی فرمائش کرتا، آپ بڑی فراخدلی سے لکھ کر دے دیتے۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ آپ نے بعض اوقات یہ بھی خیال نہ کیا کہ کس نے کس کتاب کا تقاضہ کیا اور آپ نے کون سی کتاب اٹھا کر اسکے حوالے کر دی۔ الغرض ایسی بے شمار کتابوں پر آپ کا نام چھاپ کر جعلسازوں نے آپ کے نام پر مال کمایا اور آپ کی نذر بھی کیا۔ ایک تاریخ نویس کا بیان ہے کہ حضرت طائرلاہوتی نے جو تذکرہ "ہمسفر بگڑوں کا" آپ

کی ذات والا تبار پر رقم کیا تھا، وہ آپ کی اپنی خود نوشت تھی مگر دیگر بے شمار روایتوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔!

آپ کی نسبت بے شمار معجزے، لاتعداد کرشمے اور ان گنت کرامات روایت کی جاتی ہیں۔ چند ایک کا احوال رقم کیا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے آپ ایک بزرگ داتا سے سرگودھا شہر میں بیعت تھے۔ مگر چند سالوں میں آپ پر انکشاف ہونا شروع ہوا کہ وہ بزرگ داتا کہ اپنی مثال آپ برصغیر پاک و ہند میں رکھتے ہے اور لوگ جوق در جوق اس بزرگ کے حضور پہنچتے ہیں، آپ کی "خودی" جاگ اٹھی۔ آپ نے فوراً اس بزرگ کی تکذیب کا اعلان کیا اور اپنا قبلہ درست کرتے ہوئے شہر کے عظیم آدمی حضرت قدیم نادمی سے رجوع کیا۔ حضرت موصوف سلسلہ لاجوردیہ کا سنگ بنیاد رکھنے والے تھے۔ آپ نے ان کے ہاں اندرون شہر پناہ لی۔ کیونکہ حضرت قدیم نادمی مرجع خلائق تھے اور اطراف و جوانب سے تحفے انہیں ہدیہ ہوتے تھے۔ اُن کا رسالہ در احوالِ عقل و خرد موسوم "الجنون" انہی ہدایہ و تحائف کے بل پر چلتا تھا اور معاون ان کے اس چراغ سے نام اپنا روشن کرتے تھے۔ یہ روشنی خاص و عام میں پھیلتی تھی۔

حضرت بلند اختر کو قیافہ شناسی پر عبور کامل و دسترس لامحدود حاصل تھی۔ چہرہ دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے کہ یہ دشمن دین سرگودھا سے آیا ہے۔ لہذا جاہ و جلال رنگ لاتا تھا مگر تحمل سے کام لیتے۔ یوں ان کے منہ کی بجائے قلم سے کف بہتا تھا اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جب قلم روانی میں ہوتا، پھر کوئی نہ بچ سکتا۔ آپ نے پہلے پہل اہلِ سرگودھا کو بہت منہ لگایا اور ان کا ہر حال میں دم بھرا۔ مگر زمانہ ناقدر ہے اور احساس اہمیت سے یکسر عاری ہے۔ سرگودھا والے کم عیار نکلے۔ بس آپ نے اسی دن قلم سے تلوار کا کام لیا اور ان کو عطا کردہ سارے القابات و خطابات پر خط تنسیخ پھیرا اور اُن کی جدید "صفِ انشاء" کو گردن زدنی قرار دے دیا۔ آپ کے اس عمل صالح کو سارے عالم میں سراہا گیا اور اس کارِ خیر کو "کہہ مکرنی" کا نام نامی ملا۔ بلاشبہ یہ اپنے دور کی عظیم ترین کہہ مکرنی تھی۔

سلسلۂ لاجوردیہ نرگسیہ کے بانی مبانی ہونے کے ناتے آپ کو نرگسی چہرے اور کوفتے حد درجہ پسند تھے۔ اپنے شاگردانِ رشید سے فرمائش کر کے نرگسی کوفتے کھاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شاگردوں کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ آپ کو ایک بار "چسک" پڑ گئی مگر آپ نے اپنے تقوے اور زہد کے زور سے "چک" کا علاج کر لیا۔ کمر تو ٹھیک ہو گئی مگر قلم کی "چک" برقرار رہی۔ اکثر تذکروں میں اس چک پر تفصیل سے واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں کو اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ آپ کی بیشتر تصانیف اسی "چک" کی بدولت عالم شہود میں جلوہ پذیر ہو سکیں۔

آپ نے مریدانِ باصفا کی ایک طویل صف پیدا کی اور اپنے روحانی فیوض و برکات سے انہیں اتنا نوازا کہ اُن میں سے بعض آپ کی زندگی ہی میں آپ کے منہ آنے لگے تھے۔ سچ ہے آدمی کا اپنا کیا آگے آتا ہے۔ کچھ حضرات

قدیم نامی کا دستِ شفقت تھا اور کچھ ان مریدانِ باصفا کی سعادت مندی، کہ نام آپ کا چار دانگِ عالم میں گونجنے لگا۔ اہلِ دیبل کہ ساحل پر "سیپ" چنتے تھے، آپ کے نام کو گھونگا سمجھ کر اپنے ایوانوں میں سجانے لگے۔ ادھر ریاست میں "سائبان" نام کا ایک ڈیرہ تھا۔ وہاں آپ کی شہرت آپ کے خلیفہ اول حضرت طائرِ لاہوتی کے ذریعہ پہنچی۔ اہلِ دیبل اور اہلِ ریاست نے اپنے اپنے صحائف آپ کے نام کیے اور اہلِ دانش وحکمت سے آپ کے حق میں مضامین بزورِ ربط وتعلق لکھوا کر چھپوائے۔ چند ایک بہت زیادہ عقیدت مندوں نے چاہا کہ ان میں اہل واقعات اور آپ کی زندگی کے سچے حقائق بھی شامل ہو جائیں مگر آپ نے بے نیازی سے منع کر کر فرمایا "ایسا مت کرو۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم سے اس کا حساب مانگے گا۔ ایسا سچ جس سے فتنہ انگیزی کا خدشہ ہو، اس سے خاموشی بہتر ہے۔" لہٰذا ان کے عقیدت مندوں کے مضامین نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ آپ سچ کو آگ سمجھتے تھے۔ اور بہت گھبراتے تھے۔ اکثر اقرباء کو اس سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

آپ کی پاکیزگیٔ طبع اور طہارتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ کسی ناگوار نام کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اہلِ سرگودھا کو مرتد قرار دے چکے تھے۔ آہستہ آہستہ اطراف وجوانب کے تمام دیگر مضافات کو بھی ردِ ایمان قرار دینے لگے تھے۔ ایک سالانہ تذکرہ بر سبیلِ تفنن برائے دوستاں مرتب کرتے تھے۔ ہر سال کے اس جائزے میں حسابِ دوستاں چکاتے تھے۔ اور تجدیدِ رسم وراہ کی صورت نکالتے تھے۔ جو احباب درخورِ اعتنا نہ جانتے تھے۔ انہیں نکال باہر کرتے تھے۔ اور ہر سال نئی دوستیاں اور دوستیوں کے نئے معیار وضع کرتے تھے۔ اللہ اللہ وضع داری آپ پر ختم تھی، آپ نے کچھ حکایاتِ خونچکاں بھی رقم کی ہیں۔ حکایت کو ایسے ایسے اسلوب سے نبھایا کہ اپنے ماضی کے ہر حکایت نویس کو پیچھے چھوڑ گئے۔ آپ اپنی حکایات کو افسانہ کہا کرتے تھے مگر وقت کی میزانِ نقد ونظر نے آپ کی ہر تصنیفِ شریف کو "فسانۂ عجائب" کا نام دیا۔

آپ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی دونوں شاخوں پر بیٹھتے تھے اور ان کو ایک گردانتے تھے۔ بزرگانِ سلسلۂ نادمیہ کے زیادہ قائل تھے۔ حضرت مستور حسین یاد کے خاص پیرد کاروں میں سے تھے۔ انہیں اپنے دور کا حرفِ آخر جانتے تھے، افسوس کہ بزرگِ مذکور کو بیشتر مؤرخین نے حرفِ غلط لکھا ہے۔ آپ کا کلام بلاغت نظام برابر کئی اونٹوں کے بار کے ہے۔ کنایوں کے انبار، مضامین کی یلغار، الغرض کذب کے طومار باندھنے اور غنچے کو گلزار باندھنے میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ تصویروں میں "الابیض والاسود" (بلیک اینڈ وائٹ) کو ناپسند کرتے تھے۔ البتہ ملون (رنگین) تصاویر کے لیے ملک کے نامور اخباروں کو اجازت دے رکھی تھی کہ ہر چہارشنبہ کے دن چھاپیں۔ بیشتر مریدانِ باصفا اور شاگردانِ باوفا سے یہی کام لیا۔

مشہور ہے کہ سائیکل آپ کی دلپسند سواری تھی بلکہ بعض بڈھے راویوں نے یہاں تک دروغ گوئی کر دی کہ آپ اور سائیکل یک جان و دو قالب تھے۔ غالباً وحدۃ الوجود سے تعلق کی وجہ بھی یہی تھی آپ کو عوام الناس نے کبھی سائیکل اور حضرت طائرِ لاہوتی کے بغیر نہ دیکھا۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ہوے نہ ہوے آپکی سائیکل ضرور

مجلس میں پائی گئی۔ کم ظرف کہاں نہیں ہوتے، آپ کے خلوص کو آپ کی سائیکل سے مشابہ بھی قرار دیا گیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کی سائیکل اکثر پنکچر رہتی تھی۔ بریک کام نہیں کرتے تھے اور ہینڈل "لوز" ہونے کے سبب کسی ایک رخ نہیں رہتا تھا۔ اس پر بھی آپ کے خلوص کو سائیکل کے مماثل قرار دیا جاتا رہا۔ افسوس صد افسوس کہ زمانہ سخت کم عیار ہے اور قدر اس کو ذرا بھی صاحب کمالوں کی نہیں۔

آپ بیک وقت بے شمار علوم و فنون کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ شہوانیات سے تاریخ تک اور جنسیات سے دینیات تک سبھی مضامین پر علم آپ کا محیط تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ حجریے سے لے کر سرقے تک تمام اصناف پر دسترس تھی اور آپ نے یہ فن نہایت مشاقی سے اپنے شاگردوں کو بھی سکھایا مگر بعض روایتوں میں ایسے تجاہل کا تبانہ گردانا گیا اور حجریے سے لے کر سرقے تک آپ کی رغبت کی نسبت مضمون باندھا گیا ہے۔ الغرض ایک زمانہ آپ کے روحانی درجات کا قائل تھا اور زمانوں تک آپ کی ذات کے اثرات رہے۔ آج بھی آپ کی سیرت پسرور کی تحصیل میں مرجع خاص و عام ہے۔ (آج کل ضلعوں کا دور ہے، اگر پسرور ترقی کر کے ضلع بن گیا ہو تو پرانے تذکروں میں تصحیح کر لی جائے)۔ وما علینا الا البلاغ......!

گرگٹ گورکھپوری

آدمی سے شوہر تک

(۱)

ہوئی تھی ابتدا اک دلگی سے وہ بڑھ کر پاس آئیں دانت پیسے
کہا لونڈے سے ہو کتنی عمر ہوگی چلے ہو عشق فرمانے ابھی سے
کہا ہم نے ریہرسل کر رہے ہیں ہمیں کرنی ہے شادی اک پری سے
وہ لے کر کیا کرے گا پھول گوبھی جسے ہو پیار جوہی کی کلی سے
یہ سُن کر وہ ہوئیں آپے سے باہر گریباں کو پکڑ کر برہمی سے
بڑے غصّے سے بولیں نوٹ کر لو برے شوہر ہوئے تم آج ہی سے
جو نام آیا کبھی حور و پری کا تراشوں گی زباں اُلٹی چھُری سے

(۲)

نہ پوچھو دوستو پھر حال اپنا جو عاقل ہو سمجھ لو اَن کہی سے
حکومت گھر میں بیگم کر رہی ہیں مزہ ہم لے رہے ہیں بندگی سے
تماشہ جو ہے بلّی کا ہے جاری اندھیرا کھیلتا ہے روشنی سے
نہیں ہوتیں زباں سے مطمئن جب تو اکثر کام لیتی ہیں چھڑی سے
توازن پیار کا رکھتی ہیں قائم کبھی نشتر، کبھی چارہ گری سے
ہوئے ہم بید مجنوں اور بیگم قوی تر ہوتی جاتی ہیں قوی سے

(۳)

ہوئی ہے ذہن کی وہ وہ دھلائی جنوں بڑھنے لگا ہے چاندنی سے
نہ اب ہوتا ہے خوف مرگ طاری نہ اب ہے اُنس باقی زندگی سے
نہ قوت ہی رہی اب فیصلے کی نہ ہمت ہی کہ کچھ پوچھیں کسی سے
سفر کشمیر کا کرتے ہیں لیکن، ہمیشہ لوٹ آتے ہیں "توی" سے
ہے یہ احساس کہ کچھ کھو گیا ہے مگر واقف نہیں ہم اس کمی سے
بہت دن بعد جب آئینہ دیکھا تو وحشت سی ہوئی بے چہرگی سے
ارادہ کر لیا ہے بھاگ جائیں چھڑا کر پنڈ اپنا دیوٹی سے

(۴)

جو ہمت کر کے نکلے گھر سے باہر　لگے اپنے پڑوسی اجنبی سے
تعجب سے اِدھر دھوبی نے دیکھا　کمہاروں نے اُدھر دیکھا خوشی سے
اچانک کرشن چندر نے بھی رُک کر　ہمیں دیکھا بڑی سنجیدگی سے
کہا "کیوں مارے مارے پھر رہے ہو　مجھے نفرت ہے بیٹا سرکشی سے"
"نکل کر میرے افسانے سے باہر　لگا ہیں لڑکھی میں کس گدھی سے"
"تمہارا سارا پیکر کاغذی ہے　پس اوراق بیٹھو جاؤ خوشی سے"
وگرنہ .... کون پھر سنتا وگرنہ　پلٹ کر بھاگ آئے ہم گلی سے

(۵)

کہا بیگم نے "کیوں تم لوٹ آئے"　تمہیں سب دیکھتے تھے پیار ہی سے
سبب اس پیار کا پوچھا جو ہم نے　تو وہ بولیں بڑی سنجیدگی سے
"ذرا صورت تو دیکھو اپنی گرگٹ
تم اب شوہر ہوئے ہو آدمی سے"

-٠- -٠- -٠-

* صابر بہاری
(رانچی)

ایک کنواری کی دعا

(روحِ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ۔ استادِ محترم جناب رضا نقوی واہی کی نظم "نئے لیڈر کی دعا" سے متاثر ہو کر)

یارب مرے دل کو وہ دوشیزہ تمنّا دے　جو عشق کو تڑپا دے جو خود مجھے تڑپا دے
دنیائے محبت میں جھنڈا مرا لہرا دے　چہرے پہ وہ رونق دے آنکھوں میں وہ نشہ دے
وہ جوشِ جوانی دے وہ چال وہ مکھڑا دے　لڑکوں میں رقابت کی جو آگ کو بھڑکا دے
لڑکوں کا جو ہے حصّہ وہ مجھ کو بھی آقا دے　پردے سے اوبی ہوں میں پردے سے نکلوا دے
تاثیر زباں میں اب ایسی مرے مولا دے　بھائی کو جو دھوکا دے اور باپ کو چکمہ دے
جس سمت یہ نکل جاؤں گلزار [illegible]　ہاں میری [illegible] کو [illegible] کا [illegible] دے
عاشق کی لنگوٹی تک باتوں میں اتروا لوں　وہ پیار دکھا دے کا وہ حسنِ سلیقہ دے
جو حسن میں ہے غیرت وہ بھی نہ رہے باقی　عورت کی جو فطرت ہے، اس دل سے نکلوا دے

القصہ تو داسی کی اک یہ بھی دعا سن لے
"شوہر مجھے اے مالک بس عقل کا اندھا دے"

ضیا حسنی

ہوشیار ــــــ اے عشق...

اب ہم خیر سے اپنی عمر کی گولڈن جوبلی منا کر فارغ ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ وسوسہ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا" اکثر سانپ بن کر پھنکارنے لگتا ہے اور ہم سہم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت مستقبل کئی بھیانک روپ دکھاتا ہے۔ ویسے ہم آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ خدا کے فضل سے ابھی تک ہم بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہیں۔ ماشاء اللہ خوب دُور کی سوجھتی ہے۔ رسیلے نغموں اور کھنک دار قہقہوں پہ کان کھڑے ہوتے ہیں۔ اور خوب رویوں کو اچٹتی نظر سے دیکھنے سے بھی نہیں چوکتے۔ سر دست ہاتھ پیر بغاوت نہیں کرتے ورنہ آج کل کے لڑکوں کی طرح یہ بھی من مانی کرنے لگیں تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ بہر حال اچھی گذر رہی ہے۔ البتہ گاہے گاہے یادداشت چکمہ دے جاتی ہے۔ کبھی ہم اپنی یادداشت پر کافی بھروسہ کرتے تھے۔ بچپن میں ہم نے جو کچھ پڑھا اور سنا تھا وہ ہمارے ذہن میں کھُب کر بیٹھ گیا تھا۔ اساتذہ کے اشعار نوک زبان رہتے تھے۔ اس وقت کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات چلی ہو اور ہم نے برمحل شعر نہ سنایا ہو اور اب یہ عالم ہے کہ وضع داری کے طور پر موقع پہ کوئی شعر تو سنائے جا رہے ہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ ادھر کوئی شعر سنا نہیں پاتے۔ جو شعر ہماری نوک زبان پہ آتا ہے وہ لنگڑاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

غرض جب کئی بار ہماری یادداشت نے دھوکا دیا تو فوراً ہی خیال آیا کہ یہ ڈھلتی عمر کا کرشمہ تو نہیں ہے۔ پھر ہمیں یہ مشہور بات یاد آگئی "پیری صد عیب" چلیے! ایک عیب سے تو تعارف ہو گیا۔ جب باقی ننانوے عیب سامنے آئیں گے اور ان کے بارے میں تفصیل سے سوچنے کے قابل رہے تو ان کے بارے میں بھی غور کریں گے۔ سر دست جو ہر دن بھول چوک ہو جاتی ہے اسے سنتے چلیے!

ایک دن ہمارے ایک باذوق نوجوان ساتھی آئے اور اپنی بھری جوانی کی کچھ رنگین جھلکیاں دکھانے لگے ہم نے گذارش کی "پھول مسکراتے ہیں دل پہ چوٹ پڑتی ہے۔ انھوں نے یہ مصرعہ سنا ہی نہیں اور وہ اسی طرح

رنگین بیانی پر تلے رہے۔ ہم سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے اور ان کی باتیں سنتے رہے بھلا وہ کب چین سے بیٹھنے والے تھے۔ انھوں نے ہمیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

" بزرگوار! آپ کے پہلو میں دل ہے یا پتھر کا ٹکڑا۔ باتوں باتوں میں ہم نے دل نکال کر رکھ دیا اور آپ گم صم بیٹھے ہیں۔"

" میاں! اب ہمیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کے لیے مجبور نہ کرو"

صاحبزادے پھر بھی خاموش نہ ہوئے اور کڑی سے کڑی ملاتے رہے۔ آخر تنگ آکر ہم نے دھیرے سے کہا۔

یہ مے پرستی ہے تو شانِ مے پرستی کیا ہے
بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے

انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" بجا ارشاد لیکن شعر پٹری سے اُتر گیا ہے۔ شعر اس طرح ہے محترم!

" یہ مے کشی ہے تو شانِ مے کشی کیا ہے
بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے"

" اس شعر کو برسوں پہلے سنا تھا۔ میاں! اب ہمیں کل کی بات یاد نہیں رہتی لیکن معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی جوانی کی باتیں کرنے لگتا ہے تو ہم دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں بقول شاعر:

جب کسی نے تمہارا نام لیا
بے چین دل کو اپنے تھام تھام لیا

" قبلہ! اس شعر کا بھی حلیہ بگاڑ دیا آپ نے۔ میں عرض کرتا ہوں۔

" ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا"

یہ تو اشعار کی بات ہوئی اس کے آگے سنئے! مسعود کو محمود، ورما کو شرما، شبانہ کو فرزانہ کہہ دینا تو روزانہ کا معمول ہو گیا ہے۔ لیکن ادھر اپنے بچوں کے ناموں کے سلسلے میں جو الٹ پھیر ہوئی تو بیگم نے نہ صرف کان کھڑے کیے بلکہ لگے ہاتھوں یہ طنزیہ جملہ بھی چپکا دیا۔ " اللہ خیر کرے اب کچھ یاد نہیں رہتا۔ بچوں کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ میرا نام تو یاد ہے کہ اسے بھی بھلا بیٹھے!"

" آپ کا نام کیسے بھول سکتا ہوں؟

کہنے کو تو یہ بات کہہ دی لیکن ذہن پر کافی ٹھوکے لگانے کے بعد بھی بیگم کا نام کسی طرح یاد نہیں آیا البتہ وہ پیارے پیارے نام یاد آتے رہے جن سے ہم انہیں مخاطب کرتے ہیں۔ غرض جب ہم چیزیں کھونے لگے اپنے پرایوں کے نام بھولنے لگے۔ جانی پہچانی گلیوں کو فراموش کرنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کسی شناسا

کے مکان پر دستک دینے کی بجائے کسی انجان شخص کے دروازے جا پہنچے اور کال بیل کے چھیڑتے ہی اوٹ سے ایک رسیلی آواز اُبھری۔

"بڑے میاں! دوسرا دروازہ دیکھیے!"

تو نہ صرف ہم شرمندہ ہوئے بلکہ یہ یقین بھی ہو گیا کہ اب ہم تو بہ استغفار کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ کیا عرض کریں کسی نہ کسی چیز کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانا روزانہ کا معمول ہو گیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ایسا عمل کرنے سے پہلے ہم کافی چوکنا رہتے ہیں۔ مستعدی کا یہ عالم ہے کہ اسی خیال میں ڈوبے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں ضروری چیزیں لے جانا ہے۔ پھر انہیں چیزوں کو چھوڑنے میں ذرا تساہل نہیں کرتے۔ ادھر ہم کھونے اور گنوانے کی مہم کافی تیزی سے چلا رہے ہیں اور ادھر اہل خانہ ہماری اس طرح نگرانی کرتے ہیں جیسے پولیس کسی عادی مجرم پر نگاہ رکھتی ہے۔ عالم یہ ہے کہ ہم سو کر بیدار ہوتے ہی بچے ہمارا محاصرہ کر لیتے ہیں۔ بستر کو اچھی طرح دیکھتے ہیں گھر کے کونے کونے کھنگال ڈالتے ہیں۔ چھان بین کے اس طویل تجربہ کے بعد ایسی بات سامنے آئی ہے کہ ہم جہاں جہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ نہ سہی تو کچھ سگریٹیں اور چند سکے ہی چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ بیگم وقت رخصت ہمیں اس دعا کے ساتھ الوداع کہتی ہیں:

"خداوندا! آپ کو مع ضروری سامان کے واپس آنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین"

لیکن ہم افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ بیگم کی یہ دعا کبھی قبول نہیں ہوئی۔ اور جب ہم گھر پہنچتے ہیں تو کوئی نہ کوئی چیز گنوا کر ہی اندر داخل ہوتے ہیں۔ ہم سستی اور ضروری چیزیں ہر دن کھوتے رہتے ہیں۔ پھر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ داغ مفارقت دینے والی ان بیش قیمت چیزوں میں ایک خوب صورت بال پن بھی ہے۔ جسے ہم آج تک بھول نہیں سکے۔ وہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ہمیں بار بار اور بے اختیار یاد آجاتا ہے۔ وہ نہ صرف ہمیں لکھنے کے لیے اکساتا بلکہ موقع پر ہمیں وقت اور تاریخ سے بھی آگاہ کرتا تھا۔ یقین کیجیے! ہم اپنے گھریلو معاملات میں لاپرواہی کرتے لیکن اس قلم کی نگرانی کافی مستعدی سے کرتے تھے بالکل اسی طرح جیسے کوئی شکی مزاج شوہر اپنی خوبرو، شوخ اور چنچل بیوی پر نگاہ رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اپنے پرائے سبھی اس قلم کے حسن و جمال پر ریجھے ہوئے تھے اور اس پر جان چھڑکتے تھے اور جب تک اسے ہاتھ میں نہ لے لیتے انہیں کسی کل چین نہ آتا اس لیے ہم چوکنا رہتے تھے کہ کسی طرح اس کا اغوا عمل میں نہ آنے پائے۔ غرض اس قلم نے مہینوں رفاقت کی اور ایک دن اچانک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے کر چل بسا۔ یہ جانکاہ حادثہ اس دن رونما ہوا جب ہم صبح سویرے اسے کوٹ کی اوپر کی جیب میں نمایاں طور پر لگائے ہوئے تھے۔ بیگم نے اسے دیکھتے ہی کافی خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

"قیمتی قلم ہے اسے اندر کی جیب میں رکھیے۔"

ہمیں اتنا یاد ہے کہ گھر سے رخصت ہوتے ہوتے ہم نے اسے پینٹ کی اگلی جیب میں محفوظ کر لیا تھا یہی وہ جیب ہے جس میں ہم نوٹ بھی رکھ لیتے ہیں اور ہمارے ہاتھوں کے اس سے قریبی روابط ہیں۔ لمحہ بہ لمحہ اپنے آپ ہاتھ

اس کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ غرض ہمیں اس قلم کو اس جیب میں رکھنا تو یاد ہے لیکن وہ کب اور کس طرح ہم سے جدا ہو گیا یہ بالکل یاد نہیں۔ ہم اس قلم کی جدائی میں سینہ چاک اور دل فگار گھر پہنچے۔ بیگم ہمیں دیکھتے ہی بولیں۔

"خیریت تو ہے۔ چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟"

بیگم کو ہم نے شریکِ غم کرتے ہوئے اس حادثے کی خبر سنادی لیکن وہ تیکھے انداز میں بولیں۔

صبر کیجیے۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ ویسے اس قلم نے حقِ رفاقت خوب ادا کیا۔ مجبوری یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ میں کوئی چیز ٹکتی ہی نہیں۔ وہ تو کہیے کہ میں آپ کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں ورنہ آپ مجھے بھی سرِ راہ کہیں گم کر دیتے۔

ادھر عینک کے کھونے کے پے در پے واقعات پیش آئے تو ہمیں ایک سن رسیدہ باس یاد آئے جنھوں نے دورانِ گفتگو ایک ضروری فائل میں اپنی عینک باندھ کر کمشنر کے پاس بھیج دی تھی۔ عینک کے سلسلہ میں دفتر میں تفتیش ہو رہی تھی۔ کئی بے گناہ زد میں آرہے تھے۔ عین اسی وقت کمشنر نے اس عینک کو واپس کر کے ان بے گناہوں کی گلوخلاصی کرائی۔ اس وقت ہمیں اس واقعہ پر تعجب ہوا تھا لیکن آج جو ہم پر بیت رہی ہے اور تین عینکوں کو ہم نے دو ماہ کے وقفے میں جن چونکا دینے والے حالات میں کھویا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ عمر کی اس منزل میں یہی ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اب ہمارے تجربات بھی سنتے چلیے! جب ہم نے یکے بعد دیگرے تین عینکیں گنوا دیں اور ہمارے حوصلے پست ہوتے دکھائی نہیں دے رہے تھے تو ہم نے دو عینکیں بنوا ڈالیں ایک کو دفتر میں رکھتے ہیں اور دوسری گھر میں۔ ایک دن ہم دفتر میں بیٹھے ہوئے ایک فائیل دیکھ رہے تھے اور ہمیں اس میں وہ ضروری کاغذ نہیں مل رہا تھا جس کے معاملے کو آگے بڑھایا جاتا۔ موقع پر ریکارڈ کیپر بھی نہیں تھے عین اس وقت ہمارے ایک دوست آگئے اور انھوں نے اپنی باتوں میں اس طرح الجھایا کہ ہمیں وقت رخصت اپنے سامان کا جائزہ بھی لینے نہیں دیا۔ اُن کی خصوصیت بھی قابل بیان ہے کہ جب وہ مخاطب ہوتے ہیں تو دوسری طرف توجہ دینے کا موقع نہیں دیتے۔ چنانچہ ہم دفتر سے روانہ ہو کر سڑک تک آگئے انہیں خدا حافظ کہا۔ اسی اثنا میں بس آگئی اور ہم جھٹ بس کے اندر داخل ہو گئے لیکن کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ ابھی سانس کا اتار چڑھاؤ بھی ٹھیک کر پائے تھے کہ شناسا کنڈکٹر آگیا اور ٹکٹ کے پیسے مانگے۔ اس وقت ہمیں پتہ چلا کہ پرس تو الماری میں چھوڑ آئے۔ ایسا خیال آتے ہی ہمارے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ معاملہ فہم کنڈکٹر بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے نرمی سے بولا۔ کوئی بات نہیں۔ کل پیسے دیدیجیے گا۔"

اب اگلے دن کی روئیداد سنیے! صبح سویرے ہم شیو کر رہے تھے اور بیگم ہمارے سامنے بیٹھی ہوئی چھالیہ کترنے کے ساتھ ساتھ گرہستی کے سلسلہ میں اپنے کارہائے نمایاں بھی بیان کرتی جا رہی تھیں۔ ہم ان کی شیریں گفتاری میں لگا ہے گا ہے الجھ تو جاتے تھے لیکن دفتر والی عینک کے محل وقوع پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اب ہم شیو کر چکے تھے اسی وقت اخبار آگیا۔ ہم نے احتیاطاً عینک کو اپنی جگہ رہنے دیا اور گھر والی عینک کو بھی زحمت نہیں دی کہ کہیں وہ بھی دفتر نہ جا پہنچے اور اخبار کی شاہ سرخیوں کو بغیر عینک کے پڑھتے رہے۔ اسی دوران پوسٹ مین آگیا اور ایک رسالہ دے گیا

جس میں ہماری کہانی شامل تھی۔ اب ہم نے بے اختیار ہو کر جلدی سے بیگ سے عینک نکالی اور اپنی کہانی کو انہماک سے پڑھنے لگے۔ اسی دوران چھوٹی بچی آئی اور اس نے پلاسٹک کا ناشتہ دان، چرمی بیگ میں رکھ دیا۔ ہم نے اسے پچاس پیسے دیئے پھر ہم نے عینک کو میز پر رکھا اور اس پر اخبار رکھ دیا۔ کپڑے پہنے بال سنوارے بیگ کو لے کر سڑک پر آگئے تھوڑی دیر بعد بس آگئی جس نے بخیر و عافیت دفتر پہنچا دیا۔ وہاں بیگ کا جائزہ لیا تو دھیان آیا کہ عینک تو غریب خانہ میں نو کلومیٹر دور تعطیل منا رہی ہوگی۔ زندگی میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ ان کا سدھار بھی ہو جاتا ہے۔ وقت ضرور ایک ساتھی اپنی عینک دے دیتے ہیں۔ اس طرح کام چلتا رہا لیکن اپنی عینک بار بار یاد آتی رہی۔

اب بھول چوک کے ان واقعات نے ہمیں کافی مستعد کر دیا ہے اور ہم ہر لمحہ احتیاط سے گرد و پیش کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ پھر بھی کئی دنوں کے وقفے کے بعد کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو کر ہمیں چونکا دیتا ہے اس لیے ہم شاعر کے اس خیال سے متفق ہو گئے ہیں۔ ع ہوشیار اے عشق وہ نازک مقام آ ہی گیا

اسرار جامعی
(پٹنہ)

اُردو مُردہ باد!

[بہار میں اُردو کو جب دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو اُردو مخالفین کا ایک جلوس نکلا تھا اس کا حال پیش خدمت ہے]

اسرار اپنے شہر میں نکلا تھا اِک جلوس
اُردو کے دشمنانِ فضیحت مآب کا
نعرہ لگا رہے تھے بڑے زور شور سے
وہ "اُردو مُردہ باد" کا اور "انقلاب" کا

وحید عادل (حیدرآباد)

کرایے کے ٹٹو

وہ بے درد انساں کرایے کے ٹٹو
وہ جن کا نہ درماں کرایے کے ٹٹو
وہ صد فتنہ ساماں کرایے کے ٹٹو
عفونت بداماں کرایے کے ٹٹو
بھلا دیں سب احساں کرایے کے ٹٹو
پکڑ لیں گریباں کرایے کے ٹٹو
نہ اخلاق ان میں نہ انسانیت ہی
وہ بدتر ز حیواں کرایے کے ٹٹو
اگر ہاتھ ان کے ذرا گرم کر دیں
تو ہاتھ آئیں آساں کرایے کے ٹٹو
وہ کیا آلۂ کار اہلِ حسد ہیں
یا ہیں کاسہ لیساں کرایے کے ٹٹو
کبھی خول سے اپنے باہر نہ آئیں
رہیں خود میں غلطاں کرایے کے ٹٹو

دوست محمد خان
(نئی دہلی)

جدید غزل

سمندر میں غوطے لگاتا رہا
بہت ٹھنڈ تھی پر نہاتا رہا
ملا ہی نہ مغرور چہرہ جبت
پولیس کو میں رشوت کھلاتا رہا
مری ذات چھت سے لٹکتی رہی
زمیں پر ہی میں کسمساتا رہا
بہت بھیڑ تھی یوں تو بنکوں میں پر
میں تنہا تھا، ڈالر بھناتا رہا

وہی کرب اب بھی وہی درد ہے
دوا وید سے یوں ہی لاتا رہا

عابد معز
(حیدرآباد)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

دُور کا جادُو

حیدرآبادی پچھلے پندرہ بیس سال سے پیسہ کمانے کے لئے غیر ممالک کو جارہے ہیں جسے عرفِ عام میں "باہر جانا" کہتے ہیں۔ بعض شہری دولت جمع کر کے وطن واپس آگئے۔ بہت سارے ابھی وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چند لوگ آ اور جا رہے ہیں۔ بقیہ شہری جو باہر نہیں گئے ان کے دل میں باہر جانے کا ارمان ہے۔ نئی نسل کی پہلی اور آخری خواہش ہے کہ پڑھ لکھ کر انجینئر اور ڈاکٹر بننے سے زیادہ جلد از جلد بالغ ہوکر پاسپورٹ بنوائیں اور باہر جائیں۔ کمانے کے لئے باہر جانے کی وبا سے ہر شہری متاثر ہے خواہ وہ مزدور پیشہ ہو کہ سخنور و دانشور۔ باہر جانے والوں اور باہر جانے کا ارمان رکھنے والوں کو دیکھ کر اکثر ہمیں محسوس ہوا جیسے اب دیارِ وطن میں جینے کا مزا نہیں رہا۔ زندگی گذارنے اور زندگی کا مزہ لوٹنے کیلئے وطن سے کوچ کرنا ضروری ہے۔ وطن کی آب و ہوا صرف پیدائش کے لئے موافق ہے۔ چنانچہ دنیا کا ہر چھٹا شخص ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے۔

ہر انسان اپنے منہ میں سونے کا چمچہ لئے پیدا نہیں ہوتا۔ بہتیرے انسان بغیر چمچہ کے پیدا ہوتے ہیں اور جو بغیر چمچہ لئے پیدا ہوئے وہ کسی نہ کسی وجہ سے باہر نہ جاسکے۔ اندر یعنی اپنے ہی شہر میں رہے۔ ہمارا اس جینے کا مضمون انہیں "اندر والوں" کے نام ہے۔ ہمارا اپنا بھی شمار انہیں لوگوں میں ہوتا ہے۔ سمجھئے انگور کھٹے ہیں یا ہم نے جانا نہیں چاہا' بہرصورت ہم قلی قطب شاہ کے بسائے ہوئے شہر ہی میں موجود ہیں۔ اکثر و بیشتر ہم جیسے اندر والے باہر والوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر پریشان ہو جاتے اور مایوسیوں کے اندھیرے میں ڈوبنے لگتے ہیں'' ایسے وقت اپنے آپ کو صبر کی تلقین کرنی پڑتی ہے۔

بچپن میں ہم نے الہ دین کا چراغ نامی وگرامی کہانی پڑھی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے ہم نے جادوئی چراغ کی تمنا بھی کی تھی۔ ایک دن ہمارے پاس چاکلیٹ خریدنے کے لئے پیسے نہ تھے تو ہم نے بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر الہ دین کے چراغ کیلئے دعا مانگی تھی۔ کئی سال بعد ہم ایسی ہی کہانی جیسا واقعہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ہمارے پڑوس میں ایک لڑکا رہتا ہے اس کے والد جنذی تھے اور ان کا انتقال بچے کی اوائل عمری میں ہوا۔ ماں نے محنت کر کے لڑکے کو پالا اور پوسا۔ لڑکا ضدی تھا تعلیم حاصل نہ کرسکا۔ بے دلی سے بجلی کا کام سیکھا۔ سنتے ہیں کہ محلہ میں کسی کے گھر بجلی غائب ہونے پر فیوز ڈالنے کیلئے گیا وہاں اس لڑکے کی ملاقات گھر کے باہر کے داماد سے ہوئی اور شیخ صاحب افریقی ساحر کی طرح اس

لڑکے کو باہر لے گئے ۔ اس کے بعد چند مہینوں میں اس کی جھونپڑی عالیشان سہ منزلہ عمارت میں تبدیل ہوگئی۔ خدمت کے لئے خادم مامور ہوئے ۔ گھر میں آرام و آسائش کی تمام چیزیں آئیں ۔ جب بھی وہ لڑکا باہر سے آتا محلہ میں گویا جشن ہوتا۔ دوست احباب کو تحفے تحائف ملتے ۔ایک دن اس لڑکے نے گلی کے نکڑ پر محلہ کے رئیس اعظم کی حسین و جمیل لڑکی کا دیدار کیا ۔ اس سے نکاح کا ارمان کیا ۔ اپنے جادوئی چراغ کی مدد سے ڈھیر سارے کپڑے ، مٹھائی اور زیور کے ساتھ اپنا پیغام بھجوایا ۔ رئیس اعظم نے لڑکے کو اپنی فرزندی میں قبول کرلیا ۔ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے ۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گذار رہے ہیں ۔ ایک صاحب کی شادی اس شرط پر ہوئی کہ سسرال والے انھیں باہر بھجوائیں گے' سو انھیں باہر روانہ کیا گیا ۔ جادوئی چراغ ہاتھ آیا ۔ بہترین فرنیچر اور دیگر ضروریاتِ زندگی سے آراستہ گھر بنوالیا ۔ صاحبِ جائیداد بن بیٹھے ۔ بینک میں پیسہ جمع کیا اور پھر اپنی مرضی اور پسند سے دوسری شادی کی ۔ اب دو بیویوں کے اکلوتے شوہر بنے عیش کرتے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست نے ایک واقعہ سنایا۔ "میرے ڈرائیور کے ہاتھ بھی جادوئی چراغ لگا ہے۔ باہر جانے سے پہلے وہ مجھ سے بخشش اور انعام وصول کیا کرتا تھا اور اب جب بھی وہ باہر سے آتا ہے تو مجھے یہ کہہ کر نوازتا ہے کہ صاحب آپ نے بڑے وقت میں میری مدد کی تھی۔" ایک دو واقعات ہوں تو انھیں قلمبند کیا جائے۔ ہمارے شہر میں ہر روز ایسے کئی واقعات ہوتے رہتے ہیں جنھیں ہم اندر بیٹھے ایک دوسرے کو سناتے اور ڈھارس بندھاتے رہتے ہیں ۔ "صبر کرو میاں ، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔"

ہمارے شہر کے معاشی اور سماجی حالات اس قدر سنگین ہو چکے ہیں کہ اگر آپ باہر نہ جانا چاہیں تو بھی آپ کو باہر بھیجنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ روکھی سوکھی کھاکر گذارنا چاہیں تب بھی آپ کے ہاتھ میں پاسپورٹ اور گلے میں ویزا ڈال کر باہر دھکیلا جاتا ہے۔ لڑکے تو خیر لڑکے ہیں انھیں کمانے جانا چاہیئے لیکن ہمارے شہر میں لڑکیوں کا نکاح کرکے باہر بھیجا جاتا ہے ۔ ایسے حالات میں لڑکیوں کے ہاتھ میں چراغ کے بجائے بوڑھا جن خود رہتا ہے ۔ لیکن سنتے ہیں ایک جن پر چار حاکم بھی حاسد رہتے ہیں۔ بوڑھے جن ہمارے شہر کی لڑکیوں کی نازبرداریاں کرتے ہیں ۔ انھیں اور ان کے خاندان والوں کو خوش و خرم رکھتے ہیں ۔ جب یہی لڑکیاں اپنے ہم وطنوں سے ملنے آتی ہیں تو پہچاننے میں دشواری ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی لڑکی ہے جو باہر جانے سے پہلے کالی پیلی ، دبلی پتلی اور نحیف و ناتواں تھی اور اب ایسا حسن نکھر آیا کہ آس پاس کے نوجوان ٹھنڈی آہ بھر کر صبر کرلیتے ہیں۔

باہر نہ جانے والے اڑیل شہریوں کو مختلف طریقوں سے سمجھایا اور منایا جاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک فرد کے دور ہونے سے گھر کے دوسرے افراد خوش و خرم رہ سکتے ہیں ۔ بہنوں کی شادیاں ہوسکتی ہیں ۔ والدین کا قرضہ چکایا جاسکتا ہے۔ صاحبِ جائیداد بن سکتے ہیں ۔ بچوں کو اچھے اسکول میں تعلیم دلوا سکتے ہیں ۔ اپنوں کے لئے اتنی بھی قربانی نہیں دی جاسکتی ؟ یہ کچھ دن ہی تو دیارِ غیر میں رہنا ہے۔ پھر ہمارے خطوط اور کیسیٹ آتے رہیں گے۔ دوست احباب سے خیر خیریت معلوم ہوتی رہے گی ۔ اس کے علاوہ تمہیں وہاں تفریح کی اور بھی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ کھانے کو اچھا ملے گا۔ ویڈیو پر ہندوستانی اور پاکستانی فلمیں دیکھ سکتے ہو ۔ مہدی حسن اور رونا لیلیٰ کی غزلیات سن سکتے ہو۔ "اچھے اور نیک بندوں کی طرح دوسروں کے لئے اپنا آرام تج دو ۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی سمجھایا جاتا ہے اب آپ سے کیا چھپائیں ہماری بیوی نے ایک مرتبہ ہم سے کہا تھا " اب آپ میں اور مجھ میں چھ بچوں کا فاصلہ ہے میں گھر گرہستی کے جھمیلوں میں الجھی رہتی ہوں اور آپ گھر کی چکی چلانے کے لئے دن رات محنت کرتے ہیں۔

ہے کہ آپ باہر چلے جائیں اور کما کر لائیں۔ بچے سیانے ہوگئے ہیں وہ بھی پوچھتے ہیں کہ آپ باہر کیوں نہیں گئے۔
بیوی مجھ پر طنز کر رہا تھا کہ میں نے آپ کو روکا ہوگا۔ مختلف طریقوں سے سمجھانے اور منانے سے کام نہ بننے پر
غیرت کو للکارا جاتا ہے۔ ہم نے ایک بیوی کو کہتے سنا: "جائیے آپ پڑھے لکھے ہیں تو کیا ہوا۔ ہمیں پڑے پڑے
انگریزی میں پیار بھری باتیں کرتے ہیں۔ آپ سے تو رشید کا ان پڑھ ڈرائیور شوہر اچھا ہے۔ باہر جاکر اس کے لئے
زیور اور اچھے اچھے کپڑے بھیجتا رہتا ہے۔" ہمارے ایک ساتھی ادیب کی بیوی نے طعنہ دیا "آپ یہیں بیٹھے کاغذ کالا
کرتے رہیئے۔ ہماری ماما تک شیخ کے بچوں کو سنبھالنے باہر جاچکی ہے۔" ایسے ناگفتہ بہ حالات میں یہاں بیچارہ
رہنے والا صبر نہ کرے تو کیا کرے۔

یہ بات نہیں ہے کہ یہاں والے باہر جانا نہیں چاہتے۔ جانے کیلئے لاکھ جتن کرتے ہیں لیکن پھر بھی بات
نہیں بنتی۔ ہم ایک صاحب کو جانتے ہیں جو ہرفن مولا ہیں۔ باہر جانے کے لئے انھوں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ ڈرائیونگ
سیکھی۔ گریجویٹ تو تھے ہی ٹائپ کرنا بھی سیکھا۔ شارٹ ہینڈ میں مہارت حاصل کی۔ ایک مرتبہ باہر کے لئے الکٹریشن
درکار تھے سو انہوں نے بجلی کا کام سیکھ لیا۔ ٹی وی اور فریج میکانک بھی بنے۔ ان کے دوست نے بلوانے کے لئے
انھیں ڈرافٹسمین بنایا۔ ایک اور مرتبہ وقت کی تنگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمپاؤنڈر کا جعلی سرٹیفکیٹ لیا۔ ہر مرتبہ
کسی نہ کسی حیثیت سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن ان کی تقدیر میں باہر جانا لکھا تھا اور نہ ہی وہ باہر گئے۔
سچ تو یہ ہے کہ باہر جانے کی آس کے مارے کئی شہری اندر ہی لٹ گئے۔ اب ہم ایسے لوگوں کے لئے ماتم
نہ کریں تو اور کیا کریں۔

باہر جاکر آنے والے حضرات خیر سے چند دن وطن میں رہ کر چلے جاتے ہیں، اندر والوں کو خوش کرنے کیلئے
اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ تحفہ بھی لاتے ہیں۔ باہر کی تنہائی اور مشکلات کا رونا روتے ہیں۔ کہتے ہیں پیسہ ہی سب کچھ
نہیں ہے۔ اندر والوں کو ایک گونہ سکون ملتا ہے کہ چلو اچھا ہی ہوا ہم باہر نہیں گئے۔ اس کے برخلاف باہر والوں
کے اہل و عیال سال کے بارہ مہینے اپنی امارت سے اندر والوں کے سینے پر مونگ دلتے ہیں۔ ہم ایک صاحب سے
واقف ہیں جن کے بیٹے باہر ہیں۔ بچوں کے باہر سے اندر آکر جانے کے بعد اپنے دوست احباب کو گھر بلاکر باہر سے
آئی ہوئی چیزیں دکھلاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم بھی ان کے مہمان بنے۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔ قالین اور
پردے باہر کے تھے۔ دیواری گھڑی باہر کی تھی۔ وقت بتلانے کے لئے کانٹے پھرتے اور ہندسے بھی نمودار ہوتے،
گھنٹے بجتے اور میٹھی وسریلی آواز میں وقت بھی سنایا جاتا تھا۔ ایک اسٹریو فونک ٹیپ اور ریڈیو بھی تھا۔ آواز
چاہیئے آواز سنیئے، موسیقی چاہیئے آواز نہیں سنائی دے گی، موسیقی نشر ہوتی رہے گی۔ سب کو سنائیے یا کان میں
فون لگاکر خود اکیلے سنیئے۔ کلر ٹی وی اور ویڈیو۔ ساتھ میں ڈھیر ساری فلموں کے کیسٹ، کیمرہ، تصاویر، بچوں کے
کھلونے، پین، ہاتھ کی گھڑیاں، کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم فہرست لکھنے بیٹھ جائیں تو "شگوفہ" اسی فہرست پر
ختم ہوجائے۔ ہماری تواضع [illegible] سے لائے ہوئے سوکھے میوے اخروٹ، بادام، پستہ، کھجور سے کی گئی۔ برتن
بھی باہر ہی کے تھے [illegible] ہمارے سامنے [illegible] لیکن ایکسپورٹ کوالٹی ہے صرف
باہر ملتی ہے اندر ملاوٹ شدہ چائے دستیاب ہے۔ صاحب خانہ کی مہربانی [illegible] انہوں نے ان تمام اشیاء کی نمائش
فرمائش کی۔ وداع ہوتے وقت انھوں نے ہماری رائے جاننا چاہا۔ رائے سن کر وہ نہ جانے کیوں خفا ہوگئے۔ ہم

نے کہا تھا ۔ "تمام اشیاء باہر کی ہیں سوائے آپ کے ۔" محاورہ "مخمل میں ٹاٹ کا پیوند" کی یاد آتی ہے۔
باہر جانے سے صحت اچھی ہوتی ہے۔ باہر جاکر آنے والوں کی قابل رشک صحت دیکھ کر کم از کم صحتمند رہنے کیلئے ہم نے باہر جانا چاہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی ہمیں یہی مشورہ دیا تھا "اچھا کھائیے اور تفکرات سے دور رہئے۔ اندر یہ دونوں چیزیں آپ کی پہنچ سے باہر ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ باہر چلے جائیں"۔ ڈاکٹر صاحب کا مشورہ سن کر ہمیں مرض دق کی یاد آئی جس کے علاج کے لئے مریضوں کو اچھی غذا اور آرام دہ صاف ستھرا ماحول فراہم کرنے کے لئے شہر سے دور پُر فضا پہاڑی مقام پر بھیجا جاتا ہے۔ ہم نے جھجکتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا۔ "ڈاکٹر صاحب خدا ناخواستہ ہمیں مرض دق تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "اب تو نہیں ہے اگر اندر کے حالات ایسے ہی رہے تو ایک دن ضرور ہو جائے گا۔"

لوگ کہتے ہیں کہ باہر جاکر کمانے سے زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے جس سے اندر والوں کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ ہمیں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ اس کے برخلاف باہر جانے کی وبا کے بعد سے اندر مہنگائی میں دن دوگنی اور رات چوگنی اضافہ ہوا ہے۔ باہر والوں کی قوت خرید بڑھتی گئی اور اندر والوں کی قوت خرید کم سے کم ہوتی گئی۔ بازار میں اندر والے کسی شئے کا بھاؤ تاؤ کرتے رہتے ہیں کہ باہر والے اسی چیز کے منہ مانگے دام ادا کر کے خرید لے جاتے ہیں۔ تب دوکاندار اندر والوں سے آگے بڑھنے کے لئے کہتا ہے اور بے چارے اندر والے صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے اندر والے زندہ رہنے کے لئے غذا اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا بمشکل ہتھیا لیتے ہیں۔ رہنے کے لئے مکان کا صرف ارمان رکھتے ہیں۔ بعض وقت اندر والوں کی مکانی تنگدستی کے لئے ظفر کا یہ مصرعہ گنگنانا پڑتا ہے۔ ع

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

حالات یکساں نہیں رہتے۔ وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آج کل باہر والوں کو اندر واپس کیا جا رہا ہے۔ اب بہت کم حیدرآبادی باہر جا رہے ہیں۔ باہر والے سوچ رہے ہیں کہ اب ہم اندر کیا کریں۔ اندر والے بھی غور و فکر میں لگے ہیں کہ باہر والوں کا کیا کیا جائے۔ باہر والوں کی بازآبادکاری کے تعلق سے مضامین لکھے جا رہے ہیں، سیمینار منعقد ہو رہے ہیں اور مختلف تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر ایک اندر والے تباہ حال شہری نے ہم سے کہا۔ "عابد میاں ہمارے جیسے اندرونِ خانہ برباد لوگوں کی دعا ہے کہ باہر سے خون پسینہ کی کمائی سے لائے گئے پیسے کا ڈھنگ سے استعمال ہو۔"

--

نوید بلاسپوری

لمبی لمبی مونچھیں میری ہونٹوں پہ اک جھالر تھی
منہ کے اندر بھی اتنی تھی جتنی منہ کے باہر تھی

جن مونچھوں پر پیار سے اکثر ہاتھ میں پھیرا کرتا تھا
جن کو دیکھ کے دنیا کیا خود میرا سایہ ڈرتا تھا

مونچھ کی میری بات نہ پوچھو تاؤ میں جب بھی آتی تھی
بچے چھپتے پھرتے تھے اور گھر والی تھراتی تھی

جب تک مونچھ تھی میرے چہرے پر، یہ چہرہ کیا نورانی تھا
جتنا پانی آج ہے اس سے زیادہ ہی کچھ پانی تھا

لہرا لہرا کر جب میرے ہونٹوں کو سہلاتی تھی
آفس میں بھی بیٹھے بیٹھے نیند مجھے آجاتی تھی

بیوی نے جھلا کے کہا جب تم نے یہ کیا رکھی مونچھ
میں نے اس کی چٹیا پکڑی اس نے پکڑی میری مونچھ

جانے کتنی مونچھیں اکھڑی ہوں گی کھینچا تانی میں
بہتر ہوتا گر مرجاتا میں چلو بھر پانی میں

شرم سے پانی پانی ہوکر آخر میں نے نوچ دی مونچھ
میرے بانکے چہرے پر تو تم نے بھی دیکھی تھی مونچھ

غزلیں

سید شاہد تبسم ۔ اورنگ آباد (بہار)

کتنی مجھ پر ہے مہرباں بیگم
میں زمیں ہوں تم آسماں بیگم

تم نہ جاؤ کبھی مزاروں پر
کھو نہ جاؤ کہیں وہاں بیگم

اوس گرنے لگی ہے بستر پر
کردو آنچل کا سائباں بیگم

سچ تو یہ ہے سیاہ راتوں میں
خوب چمکے گی کہکشاں بیگم

کیا کہیں گے محلے والے بھی
یوں اُڑاؤ نہ دھجیاں بیگم

حادثہ ہوگیا ہے راہ میں ایک
کیا کہوں تم سے داستاں بیگم

میں تبسم ہوں میرا ساتھ بھی دو
تم ابھی لو نہ ہچکیاں بیگم

محمد حفیظ الدین فردوس
کورٹلہ۔ کریمنگر۔ (اے پی)

"میونسپل انجینئر ہوں میں" وہاں کہتے ہیں
کل تلک جو تھے یہاں جھاڑو لگانے والے

مہر جورو کا ادا کیا وہ کریں گے یارو!
اُس کے گہنوں کو جو ہمیشہ بیچ کے کھانے والے

پائلٹ اپنے من پان والا کو سمجھتے تھے ہم
اب پتہ چل گیا، ہیں رکشہ چلانے والے

جنگ میں جا کے وہ دشمن سے لڑیں گے کیسے
جوتیاں بیوی کی دن رات ہیں کھانے والے

سننے آئے ہیں تو فردوس بچے گا کیسے
وہ جو استادوں کی غزلیں ہیں سنانے والے

اقبال ہاشمی

قصہ فوٹو کا

ذکی بلگرامی ہے شاعر تو ہوگا — مگر ہے یہ ظالم مصور غضب کا
"شگوفہ" کے دفتر میں تصویریں لے کر — ذکی نے ادیبوں کو مٹھی میں بھینچا
جو بچ رہ گئے تھے فسونِ ذکی سے — انھیں محوِ ماتم "شگوفہ" نے دیکھا
غیاث متین ہوں کہ پرویز مہدی — ذکی نے انھیں اپنے ڈھب سے دبوچا
ہلاکِ ظرافت مسیح حزیں کو — صلیبِ تصاویر پر دھر گھسیٹا
تھے مضطر ہلاکِ تھکن اور پستی — ذکی بے رحم نے انھیں بھی نہ چھوڑا
رشیدم سمیعم جلیلم کا فوٹو — جلالم شدیدم کی تفسیر نکلا
ہیں عابد معز بھی مریضِ ظرافت — مگر ان کا فوٹو ہے لقمان جیسا
شکن در شکن ابھرے منظور احمد — مصور نے ان کو صنم سا تراشا
ہیں ستار صدیقی سنجیدہ شاعر — مگر سیٹھ ستار فوٹو میں ابھرا
مدیرِ "شگوفہ" کی تصویر لے کر — نمایاں کیا ان کے چہرے پہ چشمہ
نزاعی ہے کردار چشمے کا لیکن — مگر ذی فسوں نے یہ جھگڑا چکایا
مدیرِ "شگوفہ" کو شیشے میں کس کر — فریم کی جکڑ میں انھیں خوب جکڑا
یہ اپنے ہی دفتر میں لٹکے ہوئے ہیں — کھلا ہے "شگوفہ" میں کیسا شگوفہ

ہلاکِ فسونِ ذکی بلگرامی
کبھی ہاشمی کا بھی ہو جائے چہرہ

لاغر دہلی

غزل

لگ نہ جائے کہیں نظر صاحب — توند کو رکھئے ڈھانک کر صاحب
شمعِ محفل ہیں بیویاں جن کی — ہیں وہی آج معتبر صاحب
ہو گئیں ہیں امر محبت میں — ہڈیاں ساری ٹوٹ کر صاحب
سخت مشکل ہے اس گرانی میں — صرف تنخواہ پر گذر صاحب
ہم نے داماد اک خریدا ہے — گھر میں جو کچھ تھا بیچ کر صاحب
سانس بھی لیتے ہیں میاں لاغر — اپنی بیگم سے پوچھ کر صاحب

* مجید جمال
(اورنگ آباد)

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

جیسا کہ جتایا اور جانا جاتا ہے اُردو شاعری
ا قرطاس بہت بڑا ہے اس کی پلیٹ سے دنیا کی کوئی
بیز محفوظ نہیں۔ سائنس، سیاست، سیاحت، نفسیات، جذبات
ے نجوم اور علم نجوم تک زندگی کے تمام شعبوں کو گھیر لینا اُردو شاعری کے بائیں
تھ کا کھیل ہے وہ دایاں ہاتھ داد پر آداب بجا لانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اسی لئے آپ
ے دیکھا ہوگا اکثر شعراء کا رجحان اور کندھا بائیں طرف جھکا ہوتا ہے۔
یاس و قیافہ غالب ہے کہ غالب کے خیال کا خمیازہ ہم نے ملک میں کئی جگہ بھگتا اب ملک میں وہی کیفیت
اری ہے جس کا اشارہ غالب نے بہت پہلے کیا تھا۔

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بت ہوا کہ غالب علم نجوم اور نظام سیاست سے واقف تھے۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ شعر میں اور کتنے پہلو
ں۔ شعر کو اور زیادہ مبہم اور مہمل بنانے کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ کوئی دانشور اس پر ازسرِ نو تحقیق کرے۔
ہا جاتا ہے کہ شعر کو سمجھنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ پہلے اُس کی نثر کر لی جائے، نثر کرتے ہی شعر کی اصلیت یوں
ل جاتی ہے جیسے عورت کی سنگھار اُترنے کے بعد۔

رنگ نقلی ہی سہی پر مت کھرچیے گا کہ سے
کیا ضروری ہے کہ ہر ایک شے کو پرکھا جائے

م شریعت کے پابند اور بشر نواز کے ہمنوا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عورت اور شعر محفوظ ہونے کی چیزیں ہیں۔
مجھنے کی نہیں۔ خیر شعر کی نثر ملاحظہ فرمائیے۔ دونوں مصرعوں کو ملا کر بات ایک جملے میں ختم ہو سکتی تھی کہ میرا

قتل کرنے کے بعد جلد پشیماں ہونے والا جفا سے توبہ کرکے اور بھی پشیماں ہوگیا۔ جو ہوا اچھا ہوا نجانے اور کتنے قتل ہوتے۔ واضح طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ قاتل توبہ سے پشیمان ہوا یا قتل سے۔ شعر کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ طے کرنا بے حد ضروری ہے کہ آیا قتل ہوا تھا یا نہیں۔ اساتذہ کا خیال ہے جو بزرگانہ تو ہوسکتا ہے برتر نہیں۔ قتل کا لفظ محض زور بیان کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ عاشق کا زور لفظوں کے علاوہ کسی چیز پر نہیں چلتا۔ قتل اگر جسمانی اور عمداً ہوتا تو محبوب بجائے پشیماں ہونے کے پریشان ہوتا۔ دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلتا اور منصف محبوب کو سزائے موت یا خوں بہا دینے کا حکم صادر کرتا۔ لہٰذا پریشانی اور پشیمانی جو دراصل عاشق کا مقدر ہے بلاوجہ محبوب کو ملوث کرنے کے لئے الزام کی طرح تراشی گئی ہے۔ جس زمانے میں غالب نے یہ شعر لکھا تھا اُس زمانے کا عام دستور تھا جو غالب ہی نے ہم کو بتایا تھا کہ مغل بچہ جس کو چاہتا تھا مار رکھتا تھا۔ اس روایت کی رو سے قتل محبوب کا ہونا چاہیئے تھا۔ وحشت میں ہر ایک نقشہ الٹا نظر آتا ہے آپ ضرور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ شعر میں کہیں بھی عاشق اور معشوق کا ذکر نہیں آیا پھر ہم نے کہاں سے انھیں داخل دفتر کیا۔ آپ حق بجانب ہیں ہم مجبور، جفا صرف معشوق کر سکتا ہے۔ یہ بات کب اور کیوں طے ہوئی پتہ نہیں لیکن یہ طے ہے کہ اُردو شاعری کے جیالے خوبصورت اور حسین معشوق کو انتہائے محبت میں قاتل کے نام سے مخاطب کرتے آئے ہیں۔ نہ غالب نے پابند کیا تھا نہ ہم آپ کو پابند کرسکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو مقتول کی جگہ انسان اور قاتل کی جگہ شیطان کو سامنے رکھ کر شعر سمجھیں یا کچھ اور۔ شعر کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔ شعر کا مطلب ہر آدمی اپنے حساب سے سمجھ اور سمجھا سکتا ہے۔ اُردو میں آزاد خیالی جمہوریت سے پہلے وارد ہوئی تھی۔

شعر میں وہ تمام باتیں ڈھونڈ نکالنا جو اُس میں دور دور تک نہ ہوں دانشوروں، نقادوں اور معلموں کا کام ہے۔ آپ پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ خیالی گھوڑے دوڑاتے میں جیت ہار کا ڈر نہیں رہتا۔ ہماری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرنے کے بعد عاشق کو کیسے پتہ چلتا کہ اُس کا قاتل یعنی معشوق نہ صرف پشیماں ہوا بلکہ جفا سے توبہ کرلی۔ البتہ یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ مقتول عاشق نے اپنی خواہش جس پر خود اس کا دم نکل گیا ہو (ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے) پیشن گوئی کی شکل میں قلمبند کردی ہو کہ میرے مرنے کے بعد معشوق نہ صرف میرے قتل کی ذمہ داری قبول کرلے گا بلکہ پشیماں ہو کر جفا سے توبہ بھی کرلے گا۔ اس لئے یہ بھی قرین از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ معشوق یعنی مشکوک قاتل (کہ قتل ابھی ثابت نہیں ہوا ہے) نے رحم کھاکر مرحوم کی دیرینہ خواہش، روح کو سکون، ایصالِ ثواب وغیرہ پہنچانے کی غرض سے پشیمانی وغیرہ کا اظہار کیا اور کسی مناسب آدمی کے ساتھ وفا کا سلوک اختیار کرکے جفا کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے عاشق کے حق میں اُسی کے ساتھ دفن کردیا ہو۔ وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ معاملہ گمبھیر اور سنگین معلوم ہوتا ہے۔ تشویش، تحقیق و تفتیش طلب ہے۔ کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ امکانات پر پوری طرح غور کرلیا جائے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ قتل ذہنی ہو۔ لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ عاشق ذہین تھا۔ بالفرض محال اگر یہ مان بھی لیں کہ وہ ذہین تھا تو معاملہ اور بھی اُلجھ جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ذہین آدمی عشق اور شادی سے پرہیز کرتا ہے۔ تو قتل کس کا، کب، کیوں اور کیسے ہوا۔ قتل کا اگر کوئی عینی شاہد مل بھی جائے تو عاشق

کا بیان جو اُس نے مرنے کے بعد دیا بغیر چشم دید گواہوں کے، عدالت چاہے قبول کر لے ہم تسلیم نہیں کر سکتے جہاں تک جفا سے توبہ کا تعلق ہے ہم نے تو آج تک کسی کو جفا و جبر سے توبہ تلّا کرتے نہیں دیکھا۔ ذاتی تجربہ تحریری بیان کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں کہ وفا کرنے والے پر جبر کیا جاتا ہے جس سے تنگ آ کر وہ وفا وغیرہ جیسے غیر اہم کام چھوڑ کر کسی مفید اور نیک کام کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ گو غالب کا اندازِ بیاں کچھ اور ہے (ہماری سمجھ کچھ اور) لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ ہم بلاوجہ غالبؔ کے مغلوب بن جائیں۔ غالبؔ لوگ غالبؔ کی ہر بات پر واہ واہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ مزید اپنی قابلیت کا راز فاش نہیں کرنا چاہتے۔ رہا ہمارا تو آپ سے کیا پردہ ہمارے پاس جسارتِ جاہلانہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہمیں کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ لیکن حق و باطل کا فیصلہ بغیر جاہلوں کی مدد کے نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سخن فہم ہیں۔ غالبؔ کے طرفدار نہیں۔ دوسرا مکتبِ فکر جس کا بیان اوپر آ چکا ہے کہتا ہے کہ ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں۔ دوسرے مصرعے میں جو پشیمانی اور زود پشیمانی کی تکرار کی گئی ہے صرف کانوں کو بھلی لگنے کے لئے کی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر کسی غلط یا خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ پھر آپ کی مرضی ویسے بھی جمہوریت اور اُردو میں غلط بات کا صحیح مطلب سمجھنے کی آزادی سبھی کو ہے۔ آپ کے بنیادی حق پر حرف اٹھانے والے ہم کون؟

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا اور ابھی تک اُسی پر برقرار ہیں کہ اُردو شاعری کا قرطاس بہت ہی بڑا ہے۔ دُنیا کی ساری باتوں کا منبع اُردو شاعری ہے۔ سائنس کو All-in-one اور Two-in-One کا تصور اسی اُردو شاعری کی دین ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

عمارت میں پایہ بڑی چیز ہے
تجارت میں مایہ بڑی چیز ہے
دُکھی سر پر قائم رہے تا ابدا
بزرگوں کا سایہ بڑی چیز ہے

غالبؔ کا غلبہ غیور دُکھی جالنوی پر نہیں تھا۔ اِسی لئے دُکھی (وہ دُکھی کیوں رہتے تھے؟ مقالہ نویس متوجہ ہوں) ایک ہی قطعہ میں فن تعمیر و تجارت اور اختلافات کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی خوبیاں بیان کرنے سے بھی نہیں چوکے۔ پُرانے زمانے میں اس فن کو تعلّی کہا جاتا تھا۔ جدید شاعر اسی بات کو تلاشِ ذات کا نام دیتے ہیں۔ پتہ نہیں جدید شاعر کب تک تلاشِ ذات میں گم رہیں گے۔ آپے سے باہر کب ہوں گے۔ ہمیں تو روایتی شاعر ہی اچھے لگتے ہیں کہ نہ صرف انہوں نے تلاشِ ذات کر لی تھی بلکہ مستقبل قریب و بعید سے دور کی کوڑی بھی ڈھونڈ لائے تھے۔ حال میں لانے اور لکھنے کی صنف سخن قوال مقبول کر چکے ہیں۔ صنف نازک کو اشتہارات کی وجہ سے اب کسی سخن ور کی ضرورت نہیں تو پھر بے چارہ جدید شاعر مابعد مستقبل کیا لکھے اسی لئے جدید تر اُردو شاعر اور شاعری کے مستقبل پر مستقبل گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

غالبؔ کو غیب کی باتوں کا اتنا علم نہیں تھا جتنا علامہ اقبالؔ کو تھا۔ علامہ کو اگر مستقبل کا شاعر کہیں تو بجا ہوگا۔ علامہ کو جدید شاعری سے پیدا ہونے والے خوف کھنائیوں اور قدیم شاعری سے لگاؤ کا اندازہ تو تھا ہی، سائنس میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ وہ بخوبی جانتے تھے۔ لہٰذا یہ انھیں کی پیشین گوئی تھی کہ ستاروں

سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو سچ ثابت کرنے کا کام غیر اُردو داں طبقہ نے کیا۔ جس کے فیوض و فوائید کا عشر عشیر بھی اُردو والوں کو نصیب نہیں ہوا۔ لوگ اعتراف حقیقت تک نہیں کرتے ۔ idea کی کوئی قیمت ہوتی ہے کہ نہیں ۔ رہا اُردو داں طبقہ اور ہندوستانی قوم تو وہ ابھی تک عشق کے امتحان میں مبتلا ہیں امتحان میں شرکت کب کریں گے اور نتیجہ کیا برآمد ہوگا کچھ کہنا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔

گو اُردو شاعری ساری دنیا کو لپیٹ لیتی ہے۔ کسی کو آج تک اُردو میں سائنسی تجربات و تجارت کرتے نہیں دیکھا۔ جس طرح کی تجارت کی بات فراق گورکھپوری نے کی اُس کو سُن کر لگتا ہے کہ وہ گورکھ دھندہ تو ہوسکتا ہے تجارت نہیں۔ بہتر ہوتا اُردو اور خود شاعر دونوں کے لئے کہ وہ گھاٹے کا سودا نہ کرتے۔

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبار الفت میں
ہم اپنے سر تیرا اے دوست ہر الزام لیتے ہیں

بھلا ایسا آدمی تجارت کیا کرے گا جو گھاٹا اُٹھانے کیلئے رضاکارانہ تیار اور تجارت میں دوستی کا قائل ہو۔ فراق صاحب کو پتہ نہیں تھا کہ گھوڑا گھاس سے دوستی کرے تو کھائے کیا۔ لیکن کیا کیا جائے شروع ہی سے اُردو کا مزاج نقصان دہ لڑکپن کی طرف مائل ہے۔ اسی لئے اُردو میں لوگ اپنی خوشی کے لئے نہیں خدمت کے لئے لکھتے ہیں۔ آج کل تو خدمت کی خواہش اتنی شدید ہوگئی ہے کہ جس شخص کو خدمت کا خیال آتا ہے سب سے پہلے اُردو کا انتخاب کرتا ہے۔ اس طرح کی خدمت انتخاب جیتنے کے لئے بہت مفید ہوتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ دنیا کی بقیہ زبانیں بغیر خدّام کو موقع دیئے ترقی کرتی جارہی ہیں۔ وہاں انتخاب کیسے ؟ اور خدّام کا ذریعۂ معاش کیا ہوگا ؟ آپ کو خدمت کا چشم دید واقعہ سُناتے ہیں۔

کسی ٹرک کے بریک فیل ہونے پر ٹرک نے ایک فقیر کو کچل دیا اور سامنے کھڑی ہوئی کار سے جا ٹکرایا۔ کار میں ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ کار کا کچھ نقصان ہوا لڑکی کو کچھ نہیں ہوا۔ یہ منظر دیکھتے ہی اطراف میں کھڑے خدام کی رگِ خدمت پھڑکنے لگی۔ اُن میں سے ہر شخص لڑکی کی خیر و عافیت پوچھتا اور ٹرک ڈرائیور کو مارتا رہا آخر میں جھگڑا اس بات پر ہونے لگا کہ لڑکی کی خیر و عافیت پہلے کون پوچھے۔ اس دوران وہ فقیر چل بسا جس پر گذر کر ٹرک کار سے ٹکرایا تھا۔ اُردو غزل کی وجہ سے کچھ ایسی طرح کی خدمت اُردو زبان کی بھی ہورہی ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ اُردو کو خاطر خواہ نقصان غزل اور اُردو کے خدمتگار ہی پہنچائیں گے۔ دوسروں کو اس نیک کام میں حصہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس مسئلے پر فوراً انگریزی میں کوئی Survey ہونا چاہیئے کہ ترقی کی تمام بات آج بھی اس ملک میں انگریزی ہی میں ہوتی ہے۔ غلط انگریزی اور مشکل ہندی پر وقت ضائع کرنا۔ آ- اُردو کو ہندی کہنا بھی ریختہ کی خدمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس طرح ملک اور مادری زبان دونوں کی خدمت ایک ساتھ ہوجاتی ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ [illegible] ۔ ہم غالب کا یہ شعر اُردو کی اُردو کی تمام انجمنوں کے نام منسوب کرتے ہیں۔

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

فضل عالم

ترجمہ: عطا عابدی (دربھنگہ)

یہ وصیتیں بھی خوب ہوتی ہیں ــــــ

سبھی وصیتیں حیرت انگیز نہیں ہوتیں۔ لیکن یہاں جن وصیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اتنی حیرت انگیز ہیں کہ انہیں پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ افسوس کا سبب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا حق ہوتے ہوئے بھی وہ اس سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

"میں اپنی ساری دولت سانپوں کے نام لکھ رہا ہوں، میرے اس پیسے سے جتنے زیادہ سانپوں کو ہو سکے دودھ پلایا جائے۔"

یہ وصیت آسٹریلیا کے ایک بہت بڑے تاجر کی تھی جس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ سانپوں سے اس کی محبت کا سبب یہ تھا کہ جوانی میں ایک بار ایک سانپ کی وجہ سے اس کی ملاقات ایک خوب صورت لڑکی، میریا سے ہوگئی اور پھر یہ ملاقات محبت میں بدل کر شادی کی صورت اختیار کر گئی۔

اس تاجر کی اپنی بیوی میریا سے اتنی محبت تھی کہ اس نے اس کی موت کے بعد دوسری شادی بھی نہیں کی اور جب خود مرنے لگا تو اپنی پوری دولت سانپوں کے نام کر گیا۔

"میں نے اپنی دولت خون پسینہ ایک کرکے کمائی ہے۔ اس لیے میری دولت سے جتنا خون اور پسینہ ہو سکے خرید لیا جائے اور پھر اس سے میری قبر کو روزانہ تر کیا جائے۔"

یہ وصیت ایک ایسے خبطی مزدور کی تھی جس نے حقیقت میں کافی دولت خون اور پسینہ بہا کر جمع کی تھی۔ اس کی خواہش کے مطابق ویسا ہی کیا گیا اور برسوں تک اس کی قبر کو جانوروں کے خون سے نہلایا گیا یہاں تک کہ اس کی قبر "لال قبر" کے نام سے مشہور ہوگئی۔

لندن میں ایک بوڑھی عورت نے مرتے وقت خواہش ظاہر کی کہ اس کی ساری جمع کی ہوئی دولت کو اس کے سامنے لایا جائے پھر اس نے اپنی ساری پونجی پر پیٹرول چھڑک کر اس میں آگ لگا دی اور کہا "اب میں چین سے مر سکوں گی۔"

ایک دولت مند عورت ایک ایسے شوہر کے جال میں بری طرح سے پھنس گئی جو بہت ہی خود غرض

اور دھوکہ باز تھا۔ وہ تادمِ آخر اس سے نفرت کرتی رہی۔ اس سے جان چھڑانا اس کے لیے مشکل تھا۔ اپنے وصیت نامہ میں اس عورت نے لکھا ——

"میرے مرنے کے بعد میری دولت سے میرے شوہر کو ایک اٹھنی دے دی جائے تاکہ وہ اس سے ایک کارتوس خرید کر خودکشی کرے ہاں یہ کام انجام دینے کے لیے وہ میرے پستول کا استعمال کر سکتا ہے۔"

ایک صاحب جن کے دوست بہت زیادہ تھے وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ان کا کون دوست پُرخلوص ہے اور کون خودغرض۔ مرنے سے پہلے اس نے دو وصیت نامے لکھے اور اپنے وکیل کو بتادیا کہ پہلا وصیت نامہ میرے دفن ہونے سے پہلے اور دوسرا دفن ہونے کے بعد کھولا جائے۔

اس کے مرنے کے بعد جب وصیت نامہ کھولا گیا تو دوستوں کو اُمید تھی کہ انہیں بھی ضرور کچھ ملے گا لیکن اس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ ——

"مجھے اس وقت دفن کیا جائے جب رات کے تین بجے ہوں۔"

یہ سن کر دوستوں کا موڈ خراب ہوگیا۔ سردی بہت زیادہ تھی —— طوفانی بارش تھی کہ تھمتی نہ تھی۔ ایسے میں رات کے تین بجے قبرستان جانا جوکھم اٹھانے سے کم نہ تھا۔ اس لیے اس کے دوست افسوس ظاہر کرکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

چند دوستوں نے سردی، تاریکی اور بارش کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دے کر رات کے تین بجے اپنے دوست کو دفنایا۔

دوسرے دن جب دوسرا وصیت نامہ کھولا گیا تو اُس میں لکھا تھا کہ ——

"میری ساری دولت صرف ان دوستوں میں تقسیم کردی جائے جو مجھے دفن کرنے رات کو قبرستان پہنچے تھے۔"

اُس کی دولت پچاس لاکھ روپے پر مشتمل تھی ——

امریکہ میں جب ایک کنجوس دولت مند شخص بوڑھا ہو کر بستر مرگ پر پڑا تھا تو اُسے ایک دم اپنے بینک میں جمع کیے پیسے کا خیال آیا۔ اُس نے فوراً وصیت کی کہ میری ساری جمع کی ہوئی دولت میری قبر میں میرے ساتھ ہی دفنادی جائے۔

—— لیکن ——

اس کی یہ وصیت حکومتِ وقت کے قانون کے خلاف تھی۔ اس لیے اس کی دولت کو اس کے وارثوں میں بانٹ دیا گیا۔

اسپین کے شہر میڈرڈ میں ایک غریب کلرک کے مرنے کے بعد جب اس کی وصیت پڑھی گئی تو سبھی حیران رہ گئے۔ اس نے لکھا تھا کہ ——

"میرے مکان کے اندر بڑے کمرے کے شمال میں کھدائی کی جائے - گہری کھدائی کے بعد ایک صندوق ملے گا - اس صندوق میں جتنی بھی دولت ہو اُس سے غریبوں کے لیے ایک اسپتال بنوایا جائے - لیکن یہ کام پہلی اپریل کو ہونا چاہیے کیونکہ یہ میرا جنم دن ہے -"

پہلی اپریل کو جب کھدائی شروع ہوئی تو ایک صندوق ملا - لیکن صندوق میں ایک پرچہ ملا جس میں لکھا تھا -

"اپریل فول" -

یونان کا ایک زمیندار ۶۵ سال کی عمر میں مر گیا - اس کے تین لڑکے تھے - ابھی باپ کو دفن بھی نہیں کیا گیا تھا کہ تینوں میں لڑائی شروع ہو گئی - اس کا سبب دولت تھی - والد کی وصیت سے اس کا کوئی بھی بیٹا مطمئن نہیں تھا - اس لیے انھوں نے والد کو بھی کوسنا شروع کر دیا -

شومیٔ قسمت کہ زمیندار مرا نہیں تھا - ہوش میں آتے ہی جب اس نے بیٹوں کا یہ حال دیکھا تو اُسے بہت غصّہ آیا اور اس نے فوراً وکیل کو بلا کر اپنی پہلی وصیت کو رد کر دیا اور نئی وصیت کے ذریعہ اپنی ساری دولت اپنے کتے، بلی اور مینا کے نام کر دی -

کویت کے ایک دولت مند شیخ کو جب اپنی زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اُس نے وصیت کی -

"میں اپنی ساری دولت اپنے پوتے کے پرپوتے کے نام لکھ رہا ہوں - اگر میرے پوتے کا کوئی پرپوتا نہ ہو تو دولت پرپوتوں میں برابر برابر بانٹ دی جائے -"

شیخ کو اس کے سارے رشتہ داروں نے بہت سمجھایا لیکن وہ ضد پر اڑا رہا اور آخر وقت تک اپنی ضد پر قائم رہا -

افریقہ کے ایک حبشی کو اپنی ایک پرانی موٹر سے اتنی محبت تھی کہ اس نے وصیت میں لکھا کہ ـــــ

"میرے پیسے سے میری موٹر کو پٹرول دیا جاتا رہے - اس کا انجن ۲۴ گھنٹے چلتا رہے چاہے وہ خود چلے یا نہ چلے"

اس کے بھتیجوں کو اس وصیت پر اتنا غصّہ آیا کہ انھوں نے حبشی کے مرتے ہی اس موٹر میں پٹرول ڈالا ـــ اور آگ لگا دی -

●●

حیدر بیابانی
ایلچپور

شکوہ

میرے مولا یہ کیسی اُلٹ پھیر ہے — اک گدھا کہہ رہا ہے کہ وہ شیر ہے
زاغ انگور کھا کے کہیں ڈھیر ہے — ہنس کی چونچ میں اک سڑا بیر ہے
تیری سرکار میں کیسا اندھیر ہے

لوگ تربوز خربوز کھاتے رہے — ناریل توڑ کر موج اُڑاتے رہے
آم طوطا پری گھر میں آتے رہے — رام پھل اور پپیتے بھی پاتے رہے
میری قسمت میں انجور کا ڈھیر ہے
تیری سرکار میں کیسا اندھیر ہے

سب کی شادی ہوئی میں کنوارا رہا — غم کا مارا ہوا میں بیچارا رہا
سب کے سہرے بندھے سب ہی گھوڑی چڑھے — میں اکیلا یہاں بے سہارا رہا
عمر پچپن ہوئی اور کیا دیر ہے
تیری سرکار میں کیسا اندھیر ہے

سیر تھا میں کبھی پاؤ بھر رہ گیا — کچھ اِدھر رہ گیا کچھ اُدھر رہ گیا
ہیں قویٰ مضمحل میں صفر رہ گیا — اب کہاں حوصلہ صرف ڈر رہ گیا
جو بھی ملتا ہے مجھ کو سوا سیر ہے
تیری سرکار میں کیسا اندھیر ہے

کوئی لیڈر بنا اور نڈر ہو گیا — جھوٹ کہہ کر کسی کا گزر ہو گیا
ایک کانا بھی اہلِ نظر ہو گیا — کوئی پیشی اور کوئی زبر ہو گیا
اک ترا نام لیوا ہی کیوں زیر ہے
تیری سرکار میں کیسا اندھیر ہے

جگر نظام آبادی

تین شعر

اُن کے بنگلے کے جتنے بھی دربان تھے — راستے کی ہمارے وہ چٹان تھے
گرمیوں میں بھی باہر میں سوتا نہ تھا — سارے بچے محلے کے شیطان تھے
میرے محبوب کے گھر کے سب لوگ ہی — ایک سے ایک بڑھ کر پہلوان تھے

ظہیر آفاق (مدراس)

"قبرستان کے اوراق"

ایک جائزہ

تصنیف : "قبرستان کے اوراق"
مصنف : لٹکن چکپٹوری
پبلشر : بوگس پبلیکیشن، جڑ منڈل پور
قیمت : جو جی میں آئے وہ دے دینا
ضخامت : ۲½ کلو۔

لٹکن چکپٹوری صاحب کی یہ پہلی تصنیف ہے
ں میں مصنف نے بڑی زندہ دلی سے صفحۂ اول پر
تحریر فرمایا ہے کہ ان کی یہ تصنیف اغلاط کا مجموعہ
سہی، لیکن مصنف کا شوق جائز قرار دیتا ہے جیسے
راق گورکھپوری نے اعلان کیا تھا کہ اُردو شاعری
ردیف قافیہ زبردستی کی چیزیں ہیں۔ بالکل اسی
ل میں لٹکن صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ مذکر مونث
رجمع اُردو ادب کی بیہودہ چیزیں ہیں لہٰذا لٹکن
ب دورِ حاضر کے فراقِ ثانی ہیں۔

اس تصنیف کی کچھ اہم خصوصیات ہیں جو ناجائز
دم ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہیں۔ مثلاً پیش لفظ
انہوں نے عرض کیا ہے کہ لفظ پدوری انہیں ورثہ
ملی ہے۔ ان کے والد محترم کے چچازاد بھائی کے
لف اُردو زبان کے انسائیکلو پیڈیا تھے۔ ان کی
ی ماں کے بہنوئی کے سالے کے داماد اُردو زبان
شیکسپیر تھے وہ اپنی کتابیں شائع کرنا نہیں
ہتے تھے صرف شائع کرنے کی آرزو رکھتے تھے
اور یہ آرزو ان کے فاتحہ چہلم پر بڑی بے آبرو ہوکر
نکل گئی۔

لٹکن چکپٹوری صاحب نے "قبرستان کے اوراق"
لکھ کر ایک بہت بڑے پرانے قبرستان کی یاد کو تازہ
کیا ہے جس میں انہوں نے اس بات کی تحقیق کی ہے
کہ اس قبرستان میں کتنے شاعر، افسانہ نگار اور ناقدین
دفن ہیں اور ان کی موت کی وجوہات کیا تھیں کتنے
شاعروں نے خودکشی کرلی، کتنے شاعروں نے اپنی
معشوقاؤں کی یاد میں قربانی دے دی اور کس کس نے
مرنے سے پہلے موت کو گلے لگالیا۔ ان کے عاشقانہ
ہنگاموں کی تفصیلات، ان کے دیگر ہنگامہ خیز کارناموں
کی تفصیل درج ہے اور کون شاعر اس قبرستان میں داخلہ
لینے کے بعد تلقین سے پہلے اپنی روح کو اُڑا لے بھاگے
اور رات کے اندھیروں میں ان کی روحانی کارگزاریاں
کیا تھیں، ان تمام ترقی پسند رجحانات کو اُجاگر
کیا گیا ہے۔

انہوں نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ یہ قبرستان
کتنے سال سے "زندہ" ہے۔ یہاں کتنی میتیں زندہ ہیں
اور کتنے مُردہ ہوئے ہیں۔ اس قبرستان میں شاعر
حضرات زیادہ تعداد میں دفن ہیں یا افسانہ نگار؟
مختصر یہ کہ شاعرانہ قبرستان ہے یا افسانوی!

بہرحال ان کا یہ تحقیقی مقالہ بڑا باکمال ہے
ان کے اس ریسرچ کا نتیجہ ایک شاندار تھیسس پر

ہوتا ہے اور قبرستان پر ان کی یہ تصنیف ایک
ل کا رنامہ ہے ، اور ان کا یہ کارنامہ ایک بے نظیر
یک ہے !

اس تصنیف میں انہوں نے قبرستان کی منظر کشی
خانہ انداز میں کی ہے۔ قبروں کے پس منظر بڑے دل
ہ انداز میں قلمبند کئے ہیں۔ بعض قبروں پر جو پتھر
ے ہوئے ہیں۔ ان پر کچھ آزاد شاعری کے مصرعے نقش
ں۔ اس آزاد شاعری کی نوعیت کا بڑا اچھا مذاق اڑایا
ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ شکن صاحب کچھ اس طرح
یان فرماتے کہ قبرستان نے آزاد شاعری کا مذاق
ڑایا ہے یا آزاد شاعری نے قبرستان کا مذاق اڑایا
ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد شاعری شاید قبرستان
ن سے شروع ہوئی ہے۔

اس تصنیف میں محاورے اور تشبیہات فارسی آمیز لگتے ہیں۔ قبروں کو اوراق سے تشبیہ دی ہے۔ اس قبرستان کی ہر قبر ایک ورق کے مصداق ہے۔ قبرستان میں جس طرح ہوا کے جھونکے جھکولے لیتے ہیں، قبریں بھی اوراق بن کر اڑنے لگتی ہیں، کتنا اچھا انداز ہے شکن صاحب کا۔ شاید یہ بھی ترقی پسند تحریک کی ایک نئی شاخ ہوگی جس سے پتہ چلتا ہے کہ شکن چلگپوری ترقی پسند تحریک کے حامی ہیں، اور قبرستان ترقی پسند تحریک کا دلدادہ ہے۔

میری رائے میں اہلِ ذوق حضرات اس تصنیف کا مطالعہ کریں۔ --

-٠- -٠- -٠-

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

آدھی تنقید آدھی تاریخ

(حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما" (مصنفہ انیسہ سلطانہ) کی رسم اجرا جناب نریندر لوتھر نے ۱۲؍اپریل کی شب صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ پروفیسر سیّدہ جعفر کی صدارت میں منعقدہ جلسہ میں انجام دی۔ مہمانانِ خصوصی جناب ڈاکٹر مجاور حسین رضوی اور ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال تھے۔ جناب رحمت یوسف زئی (کنوینر) نے معتمد جلسہ کے فرائض انجام دیئے۔ یہ مضمون اسی موقع پر پڑھا گیا۔
ممتاز مہدی)

انیسہ سلطانہ یم اے یم فل کی تحقیقی کتاب کا محور "طنز و مزاح" ہے۔ کبھی کبھار آدھی بات کہہ دینے یا لکھ دینے سے بھی طنز و مزاح کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جیسے اضافی الفاظ کا حذف ہو جانا "رامو کا گدھا ہے" میں سے "کا" نکال دیجیے تو ہو جائے گا "رامو گدھا ہے" اسی طرح "گلابی اُردو" کے مطالعہ سے "مسخری کیفیت" کا احساس ہوتا ہے یا کسی اسم کو اُلٹا پڑھنے سے بھی استہزا کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے "قاسم" کو "مساک" پڑھا جائے۔ ان کیفیتوں کو سامنے رکھ کر جب انیسہ سلطانہ صاحبہ کی کتاب کے سرورق کو سنوارنے کی بات آئی تو خوش نویس غوث صاحب نے کتاب کے عنوان کو ہر دو آدھے اور مکمل قاری کو اُلٹا پڑھنے کی ترغیب دی ہے پہلی نظر میں کتاب کا عنوان کچھ یوں لگے گا۔ نشو و نما کی مزاح و طنز میں حیدرآباد"۔ لہذا "بسم اللہ" کے ساتھ ہی مسکراہٹ کی ننھی پھلجھڑی چمن ادب میں جگمگا جاتی ہے۔ ذرا سنبھل کر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کا عنوان ہے "حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما" ایک کیف آور سماں بندھ جاتا ہے۔ اور طنز و مزاح کی بیل "زمین سے آسمان کی طرف جاتی نظر آتی ہے اور آسمانی پھیلاؤ لیے دامن میں طنز و مزاح کی مختلف کوائف کی سیر کروا دیتا ہے۔ عنوان آدھا اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ "نشو و نما" پہ جا کر بیل" ٹھہر گئی ہے "زوال" یا "انتہائی عروج" کے الفاظ کے ساتھ بات تکمیل کو پہنچتی۔ لیکن انیسہ سلطانہ صاحبہ کو اپنے پیچھے چلی آنے والی ریسرچ اسکالروں کی فوج کا بہت زیادہ خیال ہے۔ لہذا عنوان آدھا ہی رکھا اور اسے

زمانی قید کی زنجیر میں جکڑ دیا یعنی ۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۰ء بعض گوشے یوں ہی چھوڑ دیے ہیں شاید وہ انہیں آدھے لگے ہوں
طنز و مزاح کے عالمی صدر مقام حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے لیے ان گوشوں کے قدموں کی چاپ طنز و مزاح کے دل کے
قریب ہی کہیں سنائی دیتی ہے۔

آج کا انسان اکیسویں صدی میں چھلانگ لگانے کے لیے بے تاب ہے جبکہ بیسویں صدی ہی میں مرد کی نصف
یعنی عورت نے اپنا چولا یوں بدلنے کی کوشش کی ہے کہ لباس و وضع قطع سے مرد اور عورت کی تخصیص جاتی رہی اور
حیدرآبادی بولی میں مونث کو مذکر سے بدلنے کا رواج قدیم ہے اور جب انیسہ سلطانہ صاحبہ کی کتاب کے عنوان سے
فراغت پا کر ہم جملہ حقوق مصنف کے حق میں محفوظ کر دیتے ہیں جبکہ مصنف کے بجائے مصنفہ ہونا چاہیے تھا تو ہمیں مصنفہ
کی سعادت مندی کا قائل ہو جانا پڑتا ہے کہ انھوں نے انتساب اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ وہاں سے آگے بڑھتے
ہیں تو پروفیسر گیان چند صاحب اور عالی جناب ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی صاحب گواہوں کی مسند پر بیٹھے نظر آتے
ہیں اور ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب وکیل بنے ہیں تو ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ سرجن کے روپ میں سرٹیفکٹ نوازنے کیلئے
تیار ہیں۔ جب ڈائرکٹر آف کلچرل افیرس حکومت آندھرا پردیش اور ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے مالی تعاون کا ذکر آتا ہے
تو یوں لگتا ہے جیسے چھوہارے، مصری بادام لٹائے جا رہے ہوں لیکن یہ شادی آدھی ادھوری اس لیے رہ جاتی
ہے کہ دولہا دولہن قاضی اور براتی ایسے غائب ہیں جیسے طنز و مزاح سے مرثیہ یا VICE VERSA۔

ادب میں آدھے پن کا میلان روایتی ہے جو تحقیق، تنقید سوانح، تاریخ ہی میں نہیں ملتا بلکہ سارا تخلیقی سرمایہ
آدھے پن کا شکار نظر آتا ہے چونکہ ادب میں کوئی بھی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ بعض آدھے شعرا اتنے زبان زد
و عام ہیں کہ مصرعہ اولیٰ یا مصرعۂ ثانی اپنی شناخت ہی کھو بیٹھے ہیں۔ اور ایسے گم ہیں جیسے کسی بانجھ کی سنتان۔
اردو کے قدیم تذکروں کا خزانہ جہاں آدھا تحقیقی ہے۔ وہیں آدھا تنقیدی۔ جہاں آدھا سوانحی ہے وہیں آدھا تاریخی
جب تنقید کی دھارا علیحدہ بہنے لگی تو تحقیق کو حقارت سے دیکھ کر آگے بڑھنا چاہا جبکہ تنقید کا دریا تحقیق کی متوازی سطح
سے مل کر رواں ہوتا ہے۔ تحقیق نے اپنے آدھے وجود کو تنقید سے الگ نہیں سمجھا اور تخلیق جتنا معلق اور آدھی ہوگی اتنی
ہی لافانی ہوگی چونکہ تخلیق کا آدھا حصہ قاری کو مکمل کرنا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ قاری کی تربیت آج اتنی مکمل ہو گئی ہے کہ
ہر تخلیق کا آدھا پن ادب کے ہر قاری کو مکمل حظ پہنچا رہا ہے۔

آج تازہ وارد ہونے والی مختصر سی حجم والی کتاب کی مصنفہ جنہوں نے حیدرآباد کے طنز و مزاح کی آدھی تنقید
اور آدھی تاریخ لکھی ہے ان کا کتاب کے حجم سے موازنہ نہ کیجیے گا۔ کسی کتاب کے حجم کو دیکھ کر اس کے آدھے یا مکمل ہونے
کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یاد رہے حجم (جمع حجامت نہیں۔ بعض وقت مختصر سی مختصر حجم والی کتاب جامع ہو سکتی
ہے لیے مصنف سے عموماً اور انیسہ سلطانہ صاحبہ سے خصوصاً یہ عرض ہے کہ اردو کی کوئی کتاب جب تک اغلاط نامہ
کی اوڑھنی نہیں اوڑھ لیتی جامع اور بالغ کہلانے سے رہ جاتی ہے چاہے مصنف یا مصنفہ کسی ادارہ اودیب سے ہی کیوں نہ متعلق ہو
کیوں نہ ہو ورنہ شاہ علی بنڈہ میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہونے والے شاعر حفیظ خاں مذاق ۱۹۱۸ء میں شاعرانہ مذاق
کرتے ہوئے نظر نہ آتے (ملاحظہ ہو انیسہ سلطانہ صاحبہ کی پہلی اور تازہ کتاب کا صفحہ نمبر ۲۳۲)۔

وہ گوشے جنہیں آدھے ادھورے سمجھ کر مصنّفہ نے نظر انداز کر دیا ہے جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا یوں ہے کہ طنز ومزاح کی مکمل داخت و پرداخت میں اسٹیج اور ریڈیو کا آدھا جائزہ لیا گیا ہے۔ پرنٹیڈ مواد کو خوب کھنگالا ہے حیدرآباد کے اسٹیج پر مکمل ادبی، آدھے ادبی اور غیر ادبی ڈرامے پیش ہوتے ہی رہتے ہیں جہاں ادبی ڈراموں میں "عورت کا قتل" اہم ہے وہیں "ادرک کے پنجے" کے قبیل کے ڈراموں کی ماہیت کی جانچ پڑتال بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ "ادرک کے پنجے" کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ حیدرآباد کے ایک مزاحیہ اسٹیج شو نے عالمی ریکارڈ قائم کرتے ہوئے "گینس بک" میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ اس کے علاوہ برہان حسین، ڈاکٹر سلمان، زینت ساجدہ اور جیلانی بانو کے صرف اور صرف نام گنا حاشیہ برداروں میں گنا دیے گئے ہیں جبکہ حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو ونما میں ان چاروں کا مستقل باب ہونا چاہیے تو دوسری طرف پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا مرحوم نے اپنی میٹھی میٹھی بولی کا جادوئی اثر دکھایا ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے مزاحیہ مشاعرہ کی صدارت کے ساتھ مزاحیہ شاعروں سے زیادہ سامعین کو گدگدایا ہے۔ ڈاکٹر طاہر علی خاں نے موتی لڑی زبان سے لطیفوں کو عنوانات کے تحت بانٹ چھانٹ کر چھپوا کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کا ذکر حاشیہ برداروں میں بھی نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کی ادبی ریل گاڑی کو گرین سگنل" دکھایا گیا لیکن ان کی گاڑی" سگنل پوسٹ "تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ زنجیر کھینچ کر روک دی گئی۔ بہت سے ادباء اور شعراء کی زبان سے شکوہ بلکہ آنکھوں سے اشک شوی کے سامان اس کتاب میں مل جاتے ہیں تو یہ خیال مزید استحکام پانے لگتا ہے کہ زندہ ادیبوں اور شعراء پر ریسرچ کا کام نہیں ہونا چاہیے تاکہ زندہ ادیب و شاعر اپنی والی دنیا میں مگن تخلیق کرتا جائے۔ اس کی زندگی ہی میں اس کے مقام کے تعین سے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دل برداشتہ ہو کر تخلیقی عمل کو روک دے اور وہ تخلیق منظر عام پر آنے سے رہ جائے جو بقیہ زندگی میں اس کا کارنامہ ثابت ہوتا۔ چاہے لاکھ برقی آشیانوی بسیار نویسی کی ترغیب دیتے رہیں۔

جامعات میں تحقیقی مقالات کے گوداموں کی جہاں تک بات ہے، یہ تحقیقی مقالات آسمان پر ستاروں اور سیاروں کی شکل میں ہیں۔ جن کا دور سے نظارہ صرف ان کے اعداد و شمار حاصل کرنے تک محدود ہوتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی سیارہ یا ستارہ اپنا حقیقی جلوہ دکھائے۔ پروفیسر سیدہ جعفر صاحبہ کا یہ معنی خیز قول ہے کہ" جامعات کے مقالوں میں بہت سے چھپانے کے لیے ہوتے ہیں تو بہت سے چھپانے کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ پہلی سیارے"کی طرح انیسہ سلطانہ صاحبہ کا یہ سیارہ بھی جو مختصر سہی پوری آب و تاب کے ساتھ چھپ چھپا کر آپ کے قریب چلا آیا ہے۔ اب آپ اس کی نمایاں چوٹانی چمک دمک اور اس میں پوشیدہ کمیاب، نایاب و نادر گوہروں کا بہت ہی قریب سے مشاہدہ و مطالعہ کرسکتے ہیں اور دعا کیجیے کہ دوسرے سیارے، ستارے بھی گرد جھاڑ کر اپنا بھرپور وجود لیے آپ تک چلے آئیں جو واقعی چھپانے والے ہوں اور آپ کو اندازہ ہوسکے کہ ہمارے اردو ریسرچ اسکالر صبح و شام ایک کر کے کیسے کیسے بیج بوتے ہیں کیسے بیل بوٹے" پروان چڑھ رہے ہیں۔ کس طرح ادب کا آسمان اپنے آسمانی پھیلاؤ میں اردو ادب کو

[illegible] ہے ۔

جہاں تک انیسہ سلطانہ صاحبہ کے پہلی سیارے کا میں نے مشاہدہ کیا ان کو مبارکباد کا مستحق پایا کہ انہوں نے پوری آب و تاب سے اسے سجایا ، سنوارا اور حیدرآباد کو اپنے احسان کے بوجھ تلے دبانے کی کوشش کی اور کامیاب رہیں ۔ اُردو لکھنے پڑھنے والے ہمت سے کام لے کر صرف ۳۰ روپیے کے عوض اسے ضرور محسوس کریں کہ مصنفہ کی حوصلہ افزائی ہو اور ان کی مزید تصنیفات منظر عام پر آسکیں اور ہم کہہ سکیں کہ

توشاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

●●

ردِّ عمل

بہارالدین ریاض (دکن)

شادی سے پہلے دیکھا تھا میں نے حسین خواب　　تعبیر الٹی ہوگئی کھاتی ہوں پیچ و تاب
جور و ستم کی اس کے میں لاؤں کہاں سے تاب　　مٹی میں مل گیا اجی امی مرا شباب
جس سے نچوڑوں تیل میں وہ تل نہیں رہا
"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

ایجاب اور قبول میں جو رمز تھا چھپا　　کرتا خلاف ورزی ہے وہ اس کی برملا
وہ ٹھیس اعتبار کو میرے لگا گیا　　معصوم خواہشوں کا گھروندا جلا گیا
طوفان بپا ہے پیار کا ساحل نہیں رہا
"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

میرا کلب کو جانا گزرتا ہے ناگوار　　وہ میرے دوستوں سے الجھتا ہے بار بار
ہر بات پہ چلاتا ہے وہ مجھ پہ اختیار　　ڈر اس کا کیوں اعصاب پہ میرے رہے سوار؟
امی وہ میرے پیار کے قابل نہیں رہا
"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

کہتی ہوں لا دو جب بھی سنیما کا ایک ٹکٹ　　منہ بھینچ کے وہ زور سے یوں دیکھے ڈپٹ
دہشت زدہ سی کونے میں جاتی ہوں میں سمٹ　　مجھ پر عقاب کی طرح پڑتا ہے وہ جھپٹ
میری ادا و ناز کا بسمل نہیں رہا
"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

میں احترام کوئی نہیں اس کا؟ کیا کہا　　بس رہ گیا وہی میری کشتی کا ناخدا!
اب تک وہ ہم خیال میرا کیوں نہ بن سکا　　ہرجائی میں ہوں گر تو نہیں وہ بھی باوفا
شوہر کے وہ وظیفے کا عامل نہیں رہا
"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

لازم نہ تھا کہ چھوڑ کے آتی میں اس کا گھر　　اس کو لگا چاہیئے تھا کہ رکھتا وسیع نظر
ہوتا نہ معترض مرے اک ایک فعل پر　　جائز مطالبہ پہ نہ کرتا اگر مگر
وہ حسن کیا جو رونقِ محفل نہیں رہا
"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

تھی مجھ کو کیا خبر مجھے یہ دن دکھائے گا　　ساڑی کہوں جو لانے کو وہ بھول جائے گا
دینے ڈنر کو روز بہانے بنائے گا　　شاپنگ پہ لے کے جانے سے [illegible] [illegible]
وہ میرے اخراجات کا حامل نہیں رہا
"جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

شمیم حنفی

شکر پارے

مشورہ ــــــ

ایک بار محرم الحرام کے موقع پر لکھنؤ کی ایک بزم عزا میں شوکت تھانوی کے ایک شیعہ دوست انھیں بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔

ذاکر نے جب مصائب اہل بیت کا بیان شروع کیا تو حاضرین مجلس میں ہر شخص متاثر نظر آنے لگا۔ کتنی ہی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور گلے رندھ گئے۔

شوکت مرحوم کے دوست پر بھی رقت طاری تھی۔ انہوں نے بیقرار ہوکر بلند آواز میں کہا۔

"بخدا اب سنا نہیں جاتا! کیا کروں؟"

شوکت تھانوی نے ادھر ادھر نظر ڈالی پھر چپکے سے اُن کے کان میں بولے۔ "سنّی ہو جاؤ!"

تحفہ ــــــ

امتیاز علی تاج اور حجاب امتیاز علی کے ساتھ شوکت تھانوی کے علاوہ ایک اور دوست بھی تھے جن کے بال ضرورت سے زیادہ لمبے تھے۔ وہ حضرت اس غلط فہمی کے شکار نظر آتے تھے کہ لمبے بال اُن کے حُسن میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعرانہ شخصیت کے بھی ضامن ہیں۔

"کیوں صاحب! آپ کی سالگرہ کس تاریخ کو ہوتی ہے؟"

شوکت مرحوم نے اچانک اُن سے پوچھا۔

انہوں نے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی، مسکرائے پھر ایک خاص اندازِ دلربائی سے سوال کیا۔

"۱۸ اگست کو! لیکن آپ یہ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟"

شوکت تھانوی نے بہت سادگی سے کہا — "اُس موقع پر میں آپ کو بالوں میں لگانے کا فیتہ اور باب پنس تحفے میں دینا چاہتا ہوں!"

پیروڈی ــــــ

خواجہ عزیز الحسن مجذوب بڑی وارفتگی کے عالم میں یہ شعر جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے ؎

کیا سے کیا تُو نے یہ اسے شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں کر دیا

شوکت تھانوی سے ضبط نہ ہو سکا۔ جلدی سے بولے "خواجہ صاحب! پہلے میرا مطلع سُن لیجئے!"

"پڑھیئے!" خواجہ صاحب نے ایکبارگی رُک کر غور سے اُن کی طرف دیکھا۔

"عرض کرتا ہوں ؎

کیا سے کیا بیرم کو اکبر تُو نے ہاں ہاں کر دیا
پہلے خاں پھر خانِ خاں، پھر خانِ خاناں کر دیا

ابّا کے نام ــــــ

شوکت تھانوی محمد عمر نام کے ایک نو عمر طالب علم تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے والد کو اپنی تعلیم کے سلسلے میں ایک خط لکھا۔ ساری باتیں لکھنے کے بعد انہوں نے اختتامیہ کے طور پر یہ شعر بھی لکھا تھا ؎

"مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

(بیسویں صدی، اپریل ۹۴ء سے) ــ

جالے کے کھالے (تبصرہ)

بصرہ:- ڈاکٹر لئیق صلاح

احتشام حسین حیات و شخصیت اور کارنامے

مصنف:- ڈاکٹر فدا المصطفیٰ فدوی

زیر نظر تصنیف " احتشام حسین حیات و شخصیت ور کارنامے ڈاکٹر فدا المصطفیٰ فدوی کا تحقیقی مقالہ ہے دصوف مہا ودیالیہ ناگپور میں اردو اور فارسی کے استاد ں۔ احتشام حسین کے خاندانی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سادات رضویہ سے تھا۔ وہ ظم گڑھ کے ایک موضع ماہل میں اپریل ۱۹۱۲ء میں یدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ اُن کا ہلا افسانہ "نگار" میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرار اُن کا تقرر ہوا۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور ہی سے احتشام حسین س تحریک سے وابستہ رہے لیکن باقاعدہ طور پر یمونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں بنے۔ مختلف انجمنوں سے وابستگی اور ان کی غیر معمولی مقبولیت کے تعلق سے مصنف نے جو تفصیلات پیش کی ہیں، وہ احتشام صاحب کی ہر دلعزیزی کا واضح ثبوت ہیں۔

" ہر انجمن انھیں اپنا سمجھتی تھی اور جن انجمنوں سے انھیں نظریاتی اختلاف تھا وہ بھی انھیں اپنانے کی فکر میں لگی رہتی تھیں۔"

انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کو ایک پس منظر کے طور پر پیش کر کے مصنف نے احتشام حسین کی ادبی سرگرمیوں کا بڑے اچھے انداز میں احاطہ کیا ہے۔ اختر علی تلہری سے ادبی مباحثے، پی۔ ڈبلو۔ اے کے جلسے، ۱۹۴۷ء کی کل ہند کانفرنس، وغیرہ ایسے مختلف گوشے ہیں جن پر سے پردے اُٹھائے بغیر، احتشام حسین کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا مشکل تھا

ڈاکٹر مصطفیٰ فدوی نے احتشام حسین کے سفر نامے " ساحل و سمندر" پر تبصرہ کرتے ہوئے، ان کے خطوط سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ راک فلر فاؤنڈیشن کے باوجود وہ اشتراکیت ہی کے حامل رہے۔ اس سفر سے ان کی وسیع النظری میں اور اضافہ ہوا۔

مصنف نے شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے احتشام حسین کے خدوخال کو اُبھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور ان کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے جہاں انھیں پُرکشش شخصیت بتانے کی سعی کی ہے، وہیں ان سے اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے احتشام حسین کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے، ان کا مقام متعین کیا ہے اور انھیں ترقی پسند تنقید کا قائد تسلیم کیا ہے، ساتھ ہی ان کی کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کیا ڈاکٹر فدا المصطفیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نظریاتی وعلمی تنقید کو جو وقار احتشام صاحب نے بخشا ہے، وہ کسی اشتراکی نقاد کے بس کی بات نہیں لیکن بعض اوقات اقتصادی اور معاشی رشتوں کی وضاحت کی خاطر ادبی و جمالیاتی قدروں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی نقادانہ صلاحیتیں اشتراکیت کے حامیوں اور غیر اشتراکیوں، دونوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ نے انھیں بجا طور پر حالی کے بعد ایک ایسا نقاد قرار دیا ہے، جس کی تقلید بے شمار نقادوں نے کی ہے۔

احتشام حسین کو مصنف نے ماہر لسانیات کی حیثیت سے بھی متعارف کروایا ہے۔ ایک طویل فہرست ان موضوعات

کی درج کی ہے، جس پر انہوں نے قلم فرسائی کی تھی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے ان کی شاعری پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُس دور کے تمام ترقی پسند شعراء کی طرح احتشام حسین کے یہاں بھی روحانیت اور حقیقت کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد شاعری کے مزاج میں جو تبدیلی ہوئی جسے ہم "جدیدیت" کہتے ہیں، اُس کی جھلک بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی۔ مصنف کا خیال ہے کہ وہ اس طرف توجہ کرتے تو یقیناً صف اول کے شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔ مصنف نے احتشام حسین کو ایک اچھا افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے ان کے فنی محاسن کا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ ایک ممتاز افسانہ نگار نہ بن سکے لیکن ۱۹۴۷ء تک ان کا مقبول افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا تھا جس کا ثبوت ان کے افسانوی مجموعے "ویرانے" کی چار بار اشاعت ہے۔

فن ڈرامہ نگاری کے بارے میں لکھا ہے کہ احتشام حسین نے نہ صرف اس صنف پر تنقیدی نظر ڈالی بلکہ کئی طبع زاد ڈرامے انہوں نے لکھے ہیں۔

آخری باب میں احتشام حسین کی مکتوب نگاری سے تعلق سے تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ ان خطوط میں نجی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ مختلف ممالک اور شہروں کے سیاسی و سماجی حالات کے علاوہ ہمعصروں اور شاگردوں سے بھی دل کھول کر باتیں کی گئی ہیں۔ علمی و ادبی موضوعات کے سبب مصنف نے ان خطوط کو سرسید، شبلی اور ابوالکلام آزاد جیسے مشاہیر کے مکتوبات کے حامل قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ قدوی نے بہت ہی محنت اور جستجو سے احتشام حسین کے تعلق سے مواد اکٹھا کیا ہے اور مختلف دلائل سے اپنے بیان کو تقویت پہنچائی ہے۔ شروع سے آخر تک معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس کے سبب مصنف کا شمار اچھے محققین میں کیا جا سکتا ہے لیکن اس تصنیف میں ایک بات کی کمی محسوس ہوئی، وہ یہ کہ واقعات کی بنیاد تحریری مواد پر رکھی گئی ہے۔ احتشام حسین کو اس دنیا سے رخصت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اور اُن مقامات تک پہنچ بھی دشوار امر نہیں۔ جہاں موصوف کے جاننے والے موجود ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اگر اُن کے ساتھیوں، شاگردوں اور رشتہ داروں سے مل کر اُن کے بیانات قلمبند کرتے تو کتاب اور زیادہ شاندار اور جاندار ہو سکتی تھی۔

بہرحال! یہ تصنیف، احتشام حسین جیسے قدآور ادیب اور نقاد کے شایانِ شان ہے۔ محققین اور طالب علم اس سے زیادہ تفصیلی معلومات شائد کسی اور کتاب سے حاصل نہ کر سکیں گے۔

یہ کتاب مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔ کتابت وطباعت گوارا ہے۔

طابع : شمسی فائن آرٹس مومن پورہ، ناگپور
سال اشاعت : ڈسمبر ۱۹۸۵ء۔
قیمت : چالیس روپے
ملنے کا پتہ : حنیف بک ڈپو، مومن پورہ۔ ناگپور۔

-۲- -۲- -۲-

ما ہمای گرم پروازیم فیض از ما مجوی
سایہ ہم چون دود بالا میرود از بال ما

غالب

"ہم گرم پرواز ہما کی مانند ہیں،
ہم سے فیض کی اُمید رکھنا فضول ہے
کیونکہ سایہ ہمارے پروں سے دھوئیں
کی طرح اُوپر ہی اوپر سے نکل جاتا ہے"

غالب

عمل :- پروفیسر شکیل الرحمٰن صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی

غالب اور سن ستاون

مہاراشٹرا اُردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام سیمینار

مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی جانب سے ۶ر مئی ۱۹۸۶ء کو "غالب اور سن ستاون" کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ مجلس صدارت میں علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری شامل تھے۔ سیمنار کے آغاز میں اُردو کے بزرگ ادیب سید سبط حسن کی وفات ناگہانی پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔ علی سردار جعفری نے سید سبط حسن کی کتابوں اور ان کے ادبی کارناموں پر مختصر روشنی ڈالی، آپ نے فرمایا کہ سبط حسن نے اُردو میں دانشوروں کی روایت کو فروغ دیا ہے اور اُردو ادب میں وہ اسی حوالے سے پہچانے جائیں گے۔

سیمینار کا پہلا مقالہ ڈاکٹر شیخ فرید نے پیش کیا، آپ نے غالب کے فارسی کلام اور مختلف تاریخی حوالوں سے غالب اور سن ستاون کے تعلق پر روشنی ڈالی۔

دوسرا مقالہ پروفیسر فضیل جعفری نے "غالب سن ستاون، چند وضاحتیں" کے عنوان سے پیش کیا آپ نے غالب کے معترضین خصوصاً ہنس راج رہبر کی کتاب "غالب حقیقت کے آئینے میں" کے حوالے سے غالب پر کئے گئے چند اعتراضات کی وضاحت فرمائی اور فرمایا کہ دستنبو کے حوالے سے غالب کو غدارِ وطن سمجھنا درست نہیں ہے، دستنبو غالب کا ایک روزنامچہ ہے جو انگریز سرکار کی خوشنودی کے لئے لکھا گیا ہے۔ ان کے صحیح درد کا اندازہ ان کے خطوط اور مختلف اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔
ڈاکٹر ظ انصاری کنوینر سیمینار نے مختلف تاریخی حوالوں سے فرمایا کہ شمالی ہندوستان کے علاوہ کسی اور علاقے نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی درآمدات سے بُنکر برادری براہِ راست متاثر ہوئی تھی۔ اس کے مقابل جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے عوام کو کمپنی نے اپنے مفاد میں شریک کر لیا تھا۔ لہٰذا یہاں بغاوت نہیں ہوئی، آپ نے غالب کے تعلق سے فرمایا کہ غالب نے کُل ۶۱ قصیدے لکھے ہیں، انگریز حاکموں کی مدح میں صرف وہی قصیدے ہیں جو کسی درخواست کے ساتھ بطور نذرانہ یا رشوت بھیجے گئے۔ ان میں ممدوح کی مدح تھوڑی سی ہے، اور اسی قدر ہے جتنی حاجت روائی کے لئے لازم ہے۔

سیمینار کے اختتام پر پدم شری عبدالحلیم جعفر خاں نے ستار پر انقلابی نغمہ سنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔ اس کے بعد ایکٹ، کی جانب سے مجیب خاں نے "الشور اللہ تیسرو تام" ڈرامہ پیش کر کے داد و تحسین وصول کیا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان
ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
مجلسِ مشاورت:
○ بھارت چند کھنہ ○ نریندر لوتھر
○ یوسف ناظم ○ مجتبیٰ حسین
مجلسِ ادارت:
○ حمایت اللہ ○ محمد منظور احمد ○ مسیح انجم
جنرل منیجر: سمیع جلیل
منیجر اعزازی:
فیاض احمد فیضی (بمبئی)
کتابت: محمد غالب، عبدالرؤف
طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
قیمت فی پرچہ: ۳ روپے
زرِ سالانہ: ۴۰ روپے بیرونِ ہند سے ۱۲۵ روپے
شگوفہ - ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس: 557716
" رہائش: 521064
جولائی ۱۹۸۶ء
جلد: ۱۹
شمارہ: ۷

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

فوڈ اِن

کنہیا لال کپور

پرہیز اور بدپرہیزی

انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے۔ پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔ ہمیں اس کہاوت پر صرف ایک اعتراض ہے۔ علاج تو صرف تب کرایا جاتا ہے جب آدمی بیمار پڑتا ہے۔ لیکن پرہیز ہر روز کرنا پڑتا ہے۔ یعنی کچھ اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے کہ زندگی کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔

پرہیز میں اعتقاد رکھنے والے لوگوں کے لیے بدپرہیزی ایک ایسا ہوّا بن جاتی ہے جس سے وہ ہمیشہ خود ڈرتے اور دوسروں کو ڈراتے رہتے ہیں۔ شاید انہی کو کسی شاعر نے مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے:

؎ یہ کہتی ہیں موجیں کہ طوفان سے کھیلو　　　کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

دراصل حد سے زیادہ پرہیز کرنے والے حد سے زیادہ بزدل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کافی دل لگی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو لال مرچ کو دیکھ کر لال بھبوکا ہو جاتے ہیں۔ لال جھنڈی کی طرح وہ اِسے خطرے کی علامت سمجھتے ہیں۔ اگر سبزی میں ذرا سی لال مرچ بھی ڈال دی جائے وہ اُسے کھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے نکسیر سے لے کر بواسیر تک جتنی بیماریاں ہیں اُن سب کی جڑ لال مرچ ہے۔ اُن کا بس چلے تو لال مرچ کی کاشت اور خرید و فروخت قانوناً بند کرا دیں۔ ایک دن کھانا کھانے کے بعد انہیں پتہ چلا سبزی میں لال مرچ تھی۔ بہت پریشان ہوئے۔ بار بار کہتے! خدا خیر کرے آج ہم نے لال مرچ کھالی ہے۔ ہم نے انہیں سمجھایا حضرت! لال مرچ کو سنکھیا سمجھ کر آپ لال مرچ اور سنکھیا دونوں سے بے انصافی کر رہے ہیں۔ یقین کیجیے۔ لال مرچ سے آپ کی موت ہرگز واقع نہ ہوگی۔ اِدھر ہمارا یہ حال ہے جب تک سبزی میں لال مرچ نہ ہو ہم اُسے سبزی ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے سبزی میں نہیں لال مرچ میں سبزی ہونی چاہیئے۔

ہمارے ایک دوست اگر کسی دن دیر سے اٹھیں تو سارا دن کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ اور یوں محسوس کرتے ہیں جیسے اُن سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے ہیں رات کو دیر سے سویا اور صبح دیر سے اٹھا جائے تو تندرستی خراب ہو جاتی ہے۔ ہمارا ذاتی تجربہ ہے، اس مفروضے میں کوئی صداقت نہیں۔ پچھلے

جاپانی معالج سے ہم دیر سے سونے اور دیر سے اُٹھنے کے عادی ہیں۔ اگر ان کی بات میں ذرہ بھر بھی سچائی ہوتی، اب تک ہماری صحت مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہوتی۔ اس کے برعکس ایک آدھ بار جب ہم غلطی سے صبح کے چار بجے اُٹھنے کی حماقت کر بیٹھے۔ ہمارا وہ حال ہوا کہ ہم نے کانوں کو ہاتھ لگائے پہلے تو بے تحاشا چھینکیں آئیں۔ پھر سر بھاری ہو گیا۔ سارا دن دفتر میں اونگھتے رہے۔ چار بجے کے قریب جو جمائیاں آنا شروع ہوئیں اور اس وقت تک آتی رہیں جب تک ہم بستر پر دراز نہ ہو گئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہم نے پھر کبھی صبح سویرے اُٹھنے کا نام نہیں لیا۔

کچھ اور لوگ کہتے ہیں چائے کا زیادہ استعمال مُضرِ صحت ہے۔ زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹوں میں چائے کا ایک پیالہ پینا چاہیئے۔ چائے کے متعلق ڈاکٹر جانسن کی طرح ہمارا عقیدہ ہے۔ اگر چائے واقعی پینے کے قابل ہو تو اُسے پیالوں کے حساب سے نہیں بلکہ چائے دانیوں کے حساب سے پینا چاہیئے۔ یعنی یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ کتنے پیالے نوش کئے جائیں بلکہ کتنی چائے دانیاں خالی کی جائیں۔

ہمارے چند احباب کہا کرتے ہیں اگر سردی کے موسم میں ہر روز نہایا نہ جائے تو طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے۔ خون کو منجمد کر دینے والی سردی میں ہم غسل کرنے کو راحت تصور کرتے ہیں نہ دانشمندی۔ پھر ہمارا جسم ہر روز غلیظ نہیں ہو جاتا کہ ہمیں نہانے کی ضرورت محسوس ہو۔ ہم صرف اتوار کے دن گرم پانی سے غسل کرتے ہیں اور جب جسم سے غلاظت اترتی ہے تو اُس شخص کو دُعا دیتے ہیں جس نے صابن جیسی مفید چیز ایجاد کی۔

کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں یہ وہم ستاتا رہتا ہے فلاں چیز کے فوراً بعد فلاں چیز نہیں کھانی چاہیئے۔ نہیں تو پیچش یا بدہضمی ہو جائے گی۔ آلو بخارا کے بعد آلوچہ نہیں کھانا چاہیئے۔ آلوچے کے بعد کیلا نہیں کھانا چاہیئے چائے کے بعد لسی نہیں پینا چاہیئے۔ خربوزے کے بعد تربوز نہیں کھانا چاہیئے۔ دہی کے ساتھ مولی نہیں کھانی چاہیئے۔ چاول کے ساتھ حلوہ نہیں کھانا چاہیئے۔ اس معاملے میں ہمارا اصول تو یہ ہے ہر چیز کے ساتھ یا فوراً بعد ہر دوسری چیز کھا لینی چاہیئے بشرطیکہ اسے کھانے کو جی چاہے۔ بہر حال کسی چیز کے بعد کوئی اور چیز کھا بھی لی جائے تو پھر آہ بھر کر یہ نہیں کہنا چاہیئے۔ میں نے کھیرا کھانے کے بعد چائے پی لی ہے۔ خدا جانے اب کیا ہوگا۔ اول تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور اگر کچھ ہوا تو زیادہ سے زیادہ پیٹ میں درد ہوگا جسے چورن کی ایک چٹکی پھانک کر دفع کیا جا سکتا ہے۔

بہت سی بدپرہیزیاں کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اگر کسی بدپرہیزی سے جان جانے کا خطرہ نہ ہو تو اُسے کر لینا چاہیئے۔ نیز خطروں سے اتنا بھی نہیں ڈرنا چاہیئے کہ خطرہ مول لینے کی ہمت اور صلاحیت ہی نہ رہے۔ پرہیز بڑی "مفید مصلحت" اور بدپرہیزی نہایت "خطرناک جنون" سہی۔ لیکن بقول آل احمد سرور ؎

کسی کی مصلحت اچھی کہ اپنا یہ جنوں بہتر
سنبھل کر گرنے والو ہم تو گر گر کر سنبھلتے ہیں

اشاروں کی زبان!

اشاروں اور کنایوں کا استعمال شاعر اور گونگے اشخاص ہی نہیں کرتے ایک عام آدمی بھی کرتا ہے۔ خاص طور پر اپنی گفتگو میں تبھی تو ایک شاعر کو یہ کہنا پڑا ؎

کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا کرتے ہیں لوگ ؏ خامشی بھی ایک طرزِ گفتگو ہے دوستو۔

دراصل کڑوی بات اشاروں میں ہی کہی جاسکتی ہے۔ تہذیب کے علاوہ دانشمندی کا بھی یہی تقاضا ہے۔ ابراہیم لنکن ایک فوجی جرنیل بحث کر رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہتا لنکن اُسے رد کر دیتے۔ آخر تنگ آکر اس نے کہا "مسٹر پریذیڈنٹ کیا آپ سمجھتے ہیں میں بیوقوف ہوں؟" لنکن نے بڑی نرمی سے جواب دیا "میں تو آپ کو بیوقوف نہیں سمجھتا لیکن ممکن ہے میں غلطی پر ہوں؟"

جارج برنارڈ شاہ سے ایک شخص کہنے لگا "آج میں فلاں دفتر میں گیا وہاں کچھ افسر میرے ساتھ بڑی بے رخی کے ساتھ پیش آئے۔ لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کون ہوں وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔ برنارڈ شاہ نے اُسے بناتے ہوئے پوچھا "گستاخی معاف! لیکن آپ آخر ہیں کون؟"

عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے جو عقلمند نہیں ہیں۔ ان کے لیے بھی کئی بار اشارہ بڑا کام کر جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی بن بلائے ملاقاتی کی گفتگو سے اکتا جاتے ہیں۔ تو بار بار جماہیاں لیتے ہیں۔ گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ اگر وہ پھر بھی نہ سمجھے تو چونک کر کہتے ہیں "اُف گیارہ بج گئے۔ تو آپ آج رات یہاں ہی آرام کیجیے۔ میں ساتھ والے کمرے میں آپ کا بستر لگوا دیتا ہوں" اس اشارے کو سمجھ کر وہ فوراً کہتا ہے میں اب اجازت چاہوں گا۔

جب ہمارا کوئی دوست ہمیں کوئی چیز۔ کتاب کیمرہ یا کار۔ مستعار دینا نہیں چاہتا وہ صاف انکار کرنے کی بجائے اشاروں سے کام لیتا ہے ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں اقرار کے پردے میں انکار کیا جا رہا ہے۔ اور ہمارا جی چاہتا ہے۔ کاش ہم اتنے مہذب نہ ہوتے اور اس کو مخاطب کرکے کہہ سکتے:

نہیں ہی کیوں نہیں کہتے زباں سے : "نہیں" کا کام کیوں لیتے ہو "ہاں" سے

دو پڑوسنیں جب آپس میں لڑتی ہیں تو ایک دوسری پر چوٹ کرنے کے لیے اشاروں اور کنایوں کا سہارا لیتی ہیں۔ ان میں سے ایک دوسری کے بدتمیز بچوں کو نشانۂ مشق بناتے ہوئے کہتی ہے "کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں بچے پیدا ہی اس لیے کرنا چاہئیں تاکہ وہ ہمسایوں کا دم ناک میں کر دیں۔ ہر وقت گلی محلے میں وہ اُودھم مچائیں کہ آدمی بدحواس ہو جائے" دوسری بولتی ہے "اے بہن! جن کو خدا اولاد سے محروم رکھتا ہے وہ ہر وقت دوسروں کے بچوں کو دیکھ کر جلتے اور کڑھتے ہیں" پہلی جواب الجواب عرض کرتی ہے "بھلا اس میں جلنے یا کڑھنے کی کیا بات ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں ایسی اولاد سے بانجھ رہنا کہیں بہتر ہے"

"جی ہاں۔ اگر ان تک ہاتھ نہ پہنچے تو انگور کھٹے ہی ہوا کرتے ہیں"

اشاروں کا سب سے زیادہ استعمال ڈپلومیٹ کیا کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے ڈپلومیٹ کی "ہاں" کا مطلب "شاید" اور "شاید" کا مطلب "نہ" ہوتا ہے اور جو ڈپلومیٹ لفظ "نہ" کا استعمال کرتا ہے وہ ڈپلومیٹ ہی نہیں ہوتا.... بعض اوقات تنقید نگاروں کو بھی اشاروں کی زبان میں گفتگو کرنا پڑتی ہے۔ ایک شاعر نے کسی تنقید نگار کے سامنے غالب کی غزل اپنے نام سے پڑھنے کے بعد اس کی رائے دریافت کی۔ تنقید نگار نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "مرزا اسد اللہ خان غالب صاحب! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہم نے تو پڑھا تھا آپ اٹھارہ سو انہتر میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ آپ زندہ ہیں"

ایک افسانہ نگار نے کسی نقاد کو اپنا افسانہ سنانے کے بعد پوچھا "آپ کو کیسا لگا؟" نقاد نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "موضوع بہت اچھا ہے۔ یہ افسانہ واقعی عظیم ہوتا اگر . . ."

"اگر"؟

"اگر موپاساں نے اس پر لکھ کر یہ موضوع ہمیشہ کے لیے ختم نہ کردیا ہوتا"!

جب زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ لوگ اشاروں کی مدد سے اپنا مطلب ادا کیا کرتے تھے۔ زبان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جیسے جیسے انسان مہذب ہوتا گیا۔ اس نے محسوس کیا صاف گوئی کی بجائے اشاروں کنایوں سے کام لینا چاہیئے تاکہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ رفتہ رفتہ وہ اتنے مقبول ہوگئے کہ وہ جو حضرت میر نے اپنے متعلق کہا تھا۔ بیسویں صدی کے بیشتر معزز اور مہذب اشخاص پر صادق آتا ہے۔ ؎

اک آفتِ زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں اپنے سارے مطلب ادا کرے ہے

□□

نامور مزاح نگار کنہیا لال کپور کے یہ نادر مضامین جو روزنامہ "ہند سماچار" میں کئی سال قبل شائع ہوئے تھے۔ ہمیں کپور صاحب کے کاغذات سے حاصل ہوئے۔ ا

— مدیر

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور

ان دنوں جو پاکستانی ادیب بھی بیرونِ ملک جاتا ہے وہ واپسی پر سفرنامہ ضرور لکھتا ہے۔ اس سے ہم نے یہ
دازہ لگایا ہے کہ جو غیر ملکی پاکستان آتے ہوں گے واپسی پر وہ بھی یقیناً ایک عدد سفرنامہ ضرور قلمبند کرتے ہوں گے
جس طرح ہمارے ہاں کے بعض سیاح کسی غیر ملک میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں ہی سے اس کی پوری تہذیب اور
مدن کا کچا چٹھا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اسی طرح ممکن ہے بعض غیر ملکی سیاح بھی سپر ایکسپریس پر پاکستان
ا ایک چکر کاٹنے کے بعد اپنے قارئین کو پاکستانی عوام اور یہاں کی معاشرت کے بارے میں فیصلہ کن معلومات دے
الے ہوں، سو ہم نے چشمِ تصور میں ایک ایسے غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ ملاحظہ کیا ہے جس نے چند روز لاہور میں
یام کیا اور پھر اپنے تاثرات ایک کتابی صورت میں پیش کر دیئے۔ اس "سفرنامہ" کے کچھ حصے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

سُرخ فوج سے سامنا: جب میں نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا تو سُرخ فوج کے سپاہیوں نے مجھ پر
دھاوا بول دیا۔ ان میں سے کوئی میرا دامن کھینچ رہا تھا اور کسی کا ہاتھ میرے گریبان پر تھا۔
ن کے چہرے زرد تھے، گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں۔ ان میں بچے بھی تھے اور کمر خمیدہ بوڑھے
بھی۔ ان کے جسم لاغر تھے اور آنکھوں میں بے چارگی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں عجلت میں کوئی فیصلہ کر بیٹھتا۔ میری نظر سرخ
ردیوں ہی میں ملبوس کچھ دوسرے افراد پر پڑی جو دیگر مسافروں کا سامان لاغر طاقی ٹانگوں کے ساتھ سر پر اٹھائے
یٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ تب میں نے جانا کہ یہ سوشلسٹ نہیں بلکہ وہ کھاد ہیں جس سے سوشلزم کے کھیت کی
یداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ ان محنت کشوں کی قمیص پر "فی پھیرا آٹھ آنے" لکھا تھا۔ بعد میں ایک پاکستانی دوست
نے مجھے بتایا کہ انہیں استعمال کرنے والے لیڈروں کی قمیضوں پر "فی پھیرا ـــــ ایک غیر ملکی پھیرا" لکھا ہوتا ہے۔

ایک حیرت انگیز رسم: میرے لیے یہ امر باعثِ حیرت تھا کہ پاکستان میں عورتوں اور مردوں سے کہیں زیادہ
مردوں اور مردوں کو اختلاط کی آزادی حاصل ہے۔ کیونکہ میں نے بے شمار نوجوان
دیکھا جو ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ اسی طرح میں نے مردوں کو عورتوں
سے زیادہ "سیکسی" لباس میں ملبوس پایا۔ انھوں نے سکرٹ قسم کی کوئی چیز پہنی ہوئی تھی جسے وہ اتنا اُوپر اٹھا کر چلتے

تھے کر وہ منی سکرٹ بلکہ مائیکرو منی سکرٹ میں تبدیل ہوجاتی تھی۔ میں نے لوگوں کو برسرِعام کسی ایسی دیوار کی طرف منہ کرکے جس پر کسی گدھے کی تصویر بنی ہوئی تھی "دھواں دھار" حرکت کرتے ہوئے بھی پایا۔ اگلے روز میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی "شارع عام پر فحش حرکات کرتے ہوئے گرفتار"۔ یقیناً وہ یہی لوگ ہوں گے۔

خوشحال اور ماڈرن معاشرہ: اپنے ملک سے روانہ ہوتے وقت میں نے اپنے ایک پاکستانی صنعت کار دوست کو اپنی آمد سے مطلع کردیا تھا، چنانچہ شام کو وہ مجھے ہوٹل سے اپنے بنگلے میں لے گیا جہاں اس نے میرے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہاں عورتیں، مردوں کے شانہ بشانہ مے نوشی میں مشغول تھیں اور اپنے دوستوں کے بازوؤں میں جھول رہی تھیں۔ میں بھی اُن پُرمسرت لمحات سے پوری طرح فیضیاب ہوا۔ یہ بیس کنال میں واقع بارہ بیڈروم کا بنگلہ تھا جس میں صرف میرا دوست اور اس کی خوبصورت بیوی رہتی تھی یہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ پاکستان کی تہذیبی اور معاشی پسماندگی کے بارے میں، ہمارے پریس کا تمام پراپگنڈہ بے بنیاد ہے، کیونکہ میں نے جو کچھ دیکھا اس کے مطابق پاکستان تہذیبی لحاظ سے کسی صورت بھی یورپ یا امریکہ سے کم نہیں ہے۔ اور دولت کی فراوانی میں تو وہ غالباً ان ملکوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے، کیونکہ ہمارے ہاں عموماً دو یا تین بیڈروم کے گھر ہوتے ہیں ــــ بے شک ایک ملک والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس فرسٹ ہینڈ انفارمیشن ہو

بے مثال آزادئ صحافت: لاہور میں میری ملاقات ایک صحافی سے بھی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پاکستان میں صحافت پوری طرح آزاد ہے، چنانچہ ثبوت میں اس نے مجھے ڈھیر سارے رسائل و جرائد دکھائے۔ ایک اخبار نے کسی دفتر کے ایک کلرک کی بدعنوانیوں کے خلاف زبردست اداریہ تحریر کیا تھا اور لکھا تھا کہ اگر اسے فی الفور تبدیل نہ کیا گیا تو اس سے حکومت کی بے پناہ مقبولیت متاثر ہونے کا امکان ہے۔ ایک اور اخبار میں شائع شدہ ایک کارٹون میں کارپوریشن کا نلکا دکھایا گیا تھا جس میں سے پانی کی بجائے ہوا کا اخراج ہو رہا تھا اور یوں کارپوریشن حکام کی نااہلی پر مؤثر تنقید کی گئی تھی۔ ایک اور اخبار کے کالم نویس نے اس لاوارث شخص کا نوحہ لکھا تھا جو سردیوں کی رات میں فٹ پاتھ پر ٹھٹھر کر مرگیا تھا اور پھر وہ علاقے کی پولیس پر بُری طرح برسا تھا جس نے سردیوں کی رات میں اس شخص کو فٹ پاتھ پر سونے دیا۔ اسی طرح میرے ایک صحافی دوست نے کچھ ایسے رسائل بھی دکھائے جن میں اور تو اور خود پاکستان کے قیام کے خلاف کھل کر اپنے مؤقف کا اظہار کیا گیا تھا۔ ایسے جرائد بھی میری نظروں سے گزرے جن میں بالکل عُریاں تصویریں چھپی تھیں اور جن کی تحریریں واضح طور پر جنسی اشتعال کے ذمرے میں آتی تھیں۔ اگر میں یہ سب رسائل اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ پاکستان میں پریس آزاد نہیں ہے لیکن یہ سن کر معلوم ہے کہ یہاں پریس کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ میں پاکستانی قوم کو اس پہ مبارک باد کہتا ہوں، کیونکہ اس نے یہ آزادیاں یقیناً بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہوں گی۔

شادی کی رسوم: مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ پاکستان میں شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کا راضی ہونا کافی نہیں، بلکہ ان کے والدین کا راضی ہونا ضروری ہے، تاہم وہ اس سلسلے میں اولاد کی مرضی ضرور دریافت کرتے ہیں۔ اگر لڑکا لڑکی "ہاں" کردیں تو یہ شادی ہو جاتی ہے اور اگر "نہ" کہیں ــــ تو بھی ہو جاتی ہے۔ مجھے یہاں ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ بارات میں بے شمار لوگ تھے جو پیدل چل رہے تھے اور دولہا گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ دولہے کو گھوڑے پر بٹھانے کی رسم میرے لیے ناقابلِ فہم تھی ممکن ہے اس کا

تعلق گھوڑے کی ذہنی سطح یا "ہارس پاور" وغیرہ سے ہو۔ بارات میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے سر پر کچھ صندوق اٹھائے ہوئے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ اس میں دلہن وغیرہ کے لیے قیمتی پارچہ ہیں جو دلہن والوں کو دکھا کر دولہا واپس اپنے گھر لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان کپڑوں کو "وری" کہہ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ "وری" سن کر میں بہت چونکا کیونکہ ہمارے یہاں بھی یہ لفظ موجود ہے اور اپنی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جن معنوں میں پاکستان میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں وری (WORRY) کا مطلب "پریشانی" ہے۔ اور جن کپڑوں کو یہاں "وری" کہا جاتا ہے وہ بھی پریشانی ہی کے زمرے میں آتے ہیں کیونکہ انہیں بلا وجہ اٹھا کر دلہن کے گھر لے جانا پڑتا ہے جبکہ بالآخر انہیں واپس دولہا کے گھر ہی آنا ہوتا ہے۔

ٹرانسپورٹ کے قدیم ذرائع: مجھے لاہور اس لحاظ سے بھی اچھا لگا کہ یہاں کے لوگ اپنی بے پناہ خوشحالی اور حد درجہ ماڈرن ہونے کے باوجود بعض قدیم روایات کو بھی عزیز رکھے ہیں۔ اس میں سرفہرست ٹرانسپورٹ کے ذرائع آتے ہیں جن میں زمانۂ قدیم سے اب تک سر مو تبدیلی نہیں کی گئی۔ چنانچہ مجھے یہاں ایک ایسی سواری پر بیٹھنے کا اتفاق ہوا جس کے تین پہیے تھے۔ اگلی نشست پر صرف ڈرائیور بیٹھتا تھا اور پچھلی نشست دو مسافروں کے لیے تھی۔ اسے رکشہ کہا جاتا ہے، اس میں سفر کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اگلی نشست صرف ڈرائیور ہی کے لیے کیوں مخصوص کی گئی ہے۔ اس تیز رفتار اور ہجوم میں "زگ زیگ" [ZIGZAG] بناتی ہوئی سواری کی اگلی نشست پر دراصل بیٹھ بھی وہی سکتا ہے جو کسی سرکس کا انتہائی ماہر فنکار ہو۔ شیر کے منہ میں گردن ڈال سکتا ہو اور کپڑوں کو آگ لگا کر پانچ ہزار فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانے کی ہمت رکھتا ہو۔ اسی طرح ایک لاہوری دوست مجھے ایک پنجابی فلم "ہیر رانجھا" دکھانے کے لیے اپنے ہمراہ لے گئے۔ اس کے ایک سین میں ہیر کو اس کا چچا مارتا ہے جس کے باعث ہیر کے ماتھے سے خون بہنے لگتا ہے۔ اس پر اسے فوراً ایک لکڑی کی بنائی ہوئی ڈولی میں بٹھا دیا جاتا ہے جسے چار افراد کاندھوں پر اٹھائے ہوتے ہیں اور یہ لوگ یقیناً اسے ہسپتال لے گئے ہوں گے۔ میرے لیے یہ ایمبولینس بہت [FASCINATING] تھی۔ ہم یورپ والے اپنی قدیم روایات کو بالکل ترک کرتے جا رہے ہیں جو کوئی اچھی بات نہیں۔

شرمیلی دوشیزائیں: لاہور میں قیام کے دوران پاکستان کی شہری تہذیب کا اندازہ تو مجھے اس ضیافت ہی میں ہو گیا تھا جہاں میں نے لڑکیوں کو مے نوشی کرتے اور چیک ٹو چیک CHEEK TO CHEEK ڈانس کرتے دیکھا تھا اور ان لمحات میں میں نے جانا تھا کہ مشرق کے بارے میں تمام کہانیاں کہانیاں ہی ہیں۔ نیز یہ کہ اگرچہ مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب لیکن پاکستان میں یہ بہر حال ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح بغل گیر ہیں، تاہم میری خواہش تھی کہ میں دیہاتی کلچر کے بارے میں بھی کچھ جانوں، کیونکہ شہر اور دیہات کی تہذیب میں ہر جگہ عموماً خاصا فرق پایا جاتا ہے، چونکہ میرے پاس وقت کم تھا اور یوں میرے لیے دیہات میں جانا ممکن نہ تھا، اس لیے ایک پاکستانی شناسا کے مشورے پر میں ایک پنجابی فلم دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ یہ فیصلہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ فلمیں کسی ملک یا علاقے کی تہذیب کا صحیح عکاس ہوتی ہیں۔ فلم کے دوران مجھے ایک بار پھر اس امر پہ بے پایاں خوشی ہوئی کہ پنجاب کے دیہات معاشی لحاظ سے نہ صرف یہ کہ پسماندہ نہیں ہیں بلکہ تہذیبی لحاظ سے انہیں پنجاب کے شہروں پر بھی برتری حاصل ہے۔ معاشی لحاظ سے دیہی معاشرہ مجھے یوں خوشحال محسوس ہوا کہ عام

مزارعین کی بیٹیوں کو زرق برق لباس اور قیمتی میک اپ سے آراستہ حالت میں گھر کے کام کاج کرتے دکھایا گیا تھا اور ان کے ماڈرن ہونے نیز تمام TABOOS وغیرہ سے آزاد ہونے کا ثبوت اس امر سے ملتا تھا کہ وہ بھرے میلے میں اپنے "بوائے فرینڈ" کے گلے میں بانہیں ڈال کر پھرتی تھیں، سیٹیاں بجاتی تھیں اور ڈانس کے دوران ہر سیکنڈ بعد اپنے بوائے فرینڈ سے چمٹ جاتی تھیں۔ مجھے یورپ اور امریکہ کی نسبت پنجاب کے ان دیہات میں آزادیٔ نسواں (WOMEN LIB) کی تحریک زیادہ مضبوط محسوس ہوئی، کیونکہ شادی بیاہ کے سلسلے میں اپنی مرضی منوانے کے لیے وہ اپنے والدین کے سامنے پُرجوش تقریر کرتی دکھائی دیں۔ تاہم مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ پنجاب کے دیہات کی یہ بھرے بھرے جسم والی آزاد خیال لڑکیاں کھیتوں میں "بلا تکلف" قسم کے ڈانس کرنے، نیم عریاں لباس پہننے، والدین کے سامنے دھڑلے سے اپنی محبت اور تعلقات کا اعلان کرتے اور حیلے بہانے سے جسم کے ایک ایک عضو کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اچانک کسی سین میں دوپٹہ اپنے سر پر رکھ لیتی تھیں اور شرمانا شروع کر دیتی تھیں۔ یہ شاید اس لیے کہ مشرق بہرحال مشرق ہے اور شرمانا یہاں کی "اسپیشلٹی" [SPECIALITY] ہے۔ چنانچہ اس کے مظاہرے کے لیے فلم میں کوئی نہ کوئی سچوایشن بہرحال نکالنا پڑتی ہے! گڈ شو بڈیز!

نظریاتی پختگی: مجھے یہاں کے لوگوں میں ایک قابلِ تعریف چیز ان کا اپنے نظریہ میں پختہ ہونا بھی لگی۔ ان کے دلوں میں برائی کے لیے شدید نفرت اور نیکی کے لیے محبت ہی محبت موجزن ہے۔ ایک اسمگلر سے میری ملاقات ہوئی، میں جتنی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا، وہ مسلسل اس امر پہ نوحہ کناں رہا کہ لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ایک نائٹ کلب کی پیلے ڈانسر نے میرے سامنے معاشرے میں بڑھتی ہوئی جنسی انارکی سے اظہارِ بیزاری کیا۔ ایک گراں فروش تاجر نے کہا کہ رزقِ حلال سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ ہر نئی حکومت کے قیام پر پارٹیاں بدلنے والا ایک سیاسی رہنما اس امر پر زور دے رہا تھا کہ اصولوں پر کسی صورت "کمپرومائز" نہیں ہو سکتا۔ ایک بڑا جاگیردار اپنے ہی مزارعین کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہا تھا۔ میرے لیے یہ سب کچھ بہت خوشگوار تھا۔ ہم یورپین لوگ جو کرتے ہیں اسے درست سمجھتے ہیں لیکن پاکستانی عوام گو برائی کو برائی سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں تاہم نیکی کے لیے ان کے دل میں خیر سگالی کے گہرے جذبات موجود ہیں۔ برائی کو ختم کرنے کے لیے اپنی اصلاح کوئی بڑا کام نہیں، اصل کام موقع بہ موقع نیکی کا جھنڈا بلند کرنا ہے اور یہاں کے عوام اس فریضے سے بخوبی عہدہ برا ہوتے ہیں۔

انگریز کا بچہ: لاہور کے عوام کو انگریز قوم کے ساتھ شدید محبت ہے اور وہ آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات خاصی باعثِ حیرت تھی کیونکہ انگریزوں نے ڈیڑھ سو برس تک یہاں کے لوگوں کو غلام بنائے رکھا ہے اور اس دوران ان پر سخت مظالم روا رکھے ہیں، لیکن اس کے باوجود لوگ انھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ انگریز کے دَور کے بعض خانساموں اور خان بہادروں سے گفتگو ہوئی تو انہیں کہتے سنا کہ انگریز کا جواب نہیں تھا۔ ایک روز ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے بچے کو گود میں لیے پلکارے دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ منہ سے کچھ بولے بھی جا رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں لوگ اپنے بچوں کو بہلانے کے لیے ان کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں، چنانچہ میں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ شخص اپنے بچے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ: "آہا! میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا

لگتا ہے"۔

مہمان نوازی: ابھی میں نے جس ہمراہی کا ذکر کیا ہے وہ مجھے لاہور میوزیم کے قریب ملا تھا اور میں نے اس سے راستہ دریافت کیا تھا لیکن وہ ساتھ چل پڑا کہ میرے پاس خاصا وقت ہے۔ میں تمہیں لاہور دکھاؤں گا۔ چنانچہ یہ نوجوان مجھے شاہی قلعہ، شاہی مسجد، شالیمار گارڈن اور لاہور کے دیگر تاریخی مقامات دکھانے لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھے لاہور کی بعض خاص چیزیں مثلاً فالودہ، لسی، کھیلاں پتیسے، سگھاڑے، لوک، گجک، کانجی، مرونڈے اور نجانے کیا کیا کچھ کھلایا۔ بعد میں وہ مجھے اپنے گھر لے گیا جو اندرون شہر واقع تھا۔ اس نے مجھے باہر کے کمرے میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں اور پھر مجھے یوں لگا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی ذرا سا دروازے کا پٹ کھولتا ہے اور اس دوران کوئی سیاہ آنکھ اندر کو جھانکتی نظر آتی ہے اور پھر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہلکی ہلکی مترنم ہنسی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خواتین ہیں جو اپنے گھر میں ایک غیر ملکی مہمان کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ خواتین مجھے چوری چھپے کیوں دیکھ رہی ہیں اندر کیوں نہیں آ جاتیں۔ گلبرگ میں تو ایسا نہیں تھا، مگر بعد میں مجھے پتہ چلا کہ لاہور میں بعض علاقے ایسے بھی ہیں جو ابھی تک بہت آرتھوڈاکس ہیں۔ اس دوران وہ نوجوان کمرے میں آیا اور معذرت کرنے لگا کہ اسے کچھ دیر ہو گئی کیونکہ وہ چائے وغیرہ کے انتظامات میں مصروف تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گھر کے اندرونی حصے سے مختلف لوگوں کی آوازیں مختلف کونوں سے آنے لگیں۔ وہ غالباً ایک دوسرے کو چائے کے انتظامات کے سلسلے میں مدد کے لیے پکار رہے تھے جس کے باعث ایک خاصی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک بچہ چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا، اس ٹرے میں صرف چائے ہی نہ تھی بلکہ کھانے پینے کا اور بھی بہت سا سامان تھا۔ اس نے "کیکز" (بسکٹ) کی پلیٹ میری طرف بڑھائی لیکن میں نے "تھینک یو" کہہ کر انکار میں سر ہلا دیا، کیونکہ اب میری طبیعت متلانے لگی تھی لیکن جتنا بھی انکار کرتا تھا اتنا ہی اس کا اصرار بڑھتا چلا جاتا تھا۔ پتہ چلا کہ یہاں اصرار کے ساتھ کھلانے کو مہمان نوازی کہا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اسے (DA-(SENTERY (خرابیٔ معدہ) کہتے ہیں۔ واپسی پر اس نوجوان نے مجھے اتنی ہی گرمجوشی سے الوداع کہا اور چلتے چلتے درخواست کی کہ اگر اپنے ملک واپسی پر میں اس کے لیے ورک پرمٹ ارسال کر سکوں تو وہ بہت ممنون ہو گا۔ اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا جو میں نے اپنی ڈائری میں درج کر لیا جہاں میں نے ورک پرمٹ کے خواہش مند دیگر بے شمار مہمان نواز پاکستانیوں کے ایڈریس پہلے سے نوٹ کیے ہوئے تھے۔ (باقی آئندہ)

قطعات

اسمٰعیل ظریف

روزوں سے غافل رہے مہینہ بھر　　سمجھ رہے ہیں کہ یہ تو کوئی خطا نہ ہوئی
ظریفؔ عید مبارک کہو گے کس منہ سے　　نمازِ عید بھی تم سے صحیح ادا نہ ہوئی

ماہ صیام آتے ہی صحت بگڑ گئی　　کانوں پہ ہاتھ دھرتے تھے روزوں کے نام سے
تو نے نمازِ عید میں تک بھول کر ظریفؔ　　پہلے سلام پھیر لیا پیش امام سے

عید سعید اپنی آکر گذر گئی ہے　　ہم عظمتِ رمضاں کا اقرار تو کرتے تھے
روزوں کے تعلق سے مت پوچھیے کچھ ہم سے　　سحری نہ سہی لیکن افطار تو کرتے تھے

شعبان میں جب آتی ہے شعبان کی عید　　شوال میں کیوں آتی ہے رمضان کی عید
ہر سال رہا کرتا ہے جھگڑا اس کا　　ہے چاند کے چکر میں مسلمان کی عید

۱

مجید بیدارؔ (اورنگ آباد)

سنو جب بھی بیگم بچاتے لگے گی　　خرد پھر تمہاری ٹھکانے لگے گی
کروگے اگر خوب صورت سے شادی　　ہتھیلی پہ تم کو نچانے لگے گی
ہوئی گھر میں دولت کی کثرت تو سمجھو　　شرافت بھی آنسو بہانے لگے گی
جو غلطی سے بیگم سے جھگڑو تو بھگتو　　وہ شجرہ تمہارا سنانے لگے گی
اگر لوگے رشوت تو انجام سن لو　　وہ گردن تمہاری پھنسانے لگے گی
محبت میں ٹھکّے لگائے تو بولے　　تری یاد دن بھر ستانے لگے گی

۲

وہ ساری توتوں کو مری آزما گیا　　دسترپہ باتوں باتوں میں دس نان کھا گیا
اک بار وہ جو کھڑکی سے صورت دکھا گیا　　محسوس یوں ہوا کوئی بھونچال آ گیا
اتنا ہی تھا شعر　　کہ یکیٹ گئے تھے ہم　　DEBAR کر کے چیف ہمیں گھر بٹھا گیا

مجید بیدارؔ (اورنگ آباد)

رؤف خوشتر (بیدر)

دوڑ پیچھے کی طرف

تعطیلات تھیں اور ہمارے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ ہم حقیقی طور پر بھینس کی ڈکار، طائروں کی پکار، ٹیڑھے میڑھے راستوں کے غبار اور مرغابیوں کے شکار سے محظوظ ہوں۔ اس لیے کہ اب تک یہی زندگی کا مشاہدہ و مطالعہ بالترتیب دلیپ کمار کی فلموں اور پریم چند کے ناولوں سے ہو رہا تھا۔ کافی چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ شہر سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر پر ہمارا آبائی وطن ایک دیہات میں ہے۔ جہاں کچھ بچے کھچے رشتہ دار مجموعۂ اضداد و مجموعۂ اعداد کی شکل میں سکونت پذیر ہیں۔

انھیں اطلاع دی گئی کہ ہمارا گاؤں آنے کا مقصد کھلے آسمان (یہاں تو بجلی ٹیلی فون ٹیلی ویژن کے تاروں اور کار خانوں کے دھوئیں نے آسمان کو چھپا دیا ہے) اور کھلے انسان (یہاں تو خیر۔۔۔ جانے دیجیے) کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ فطرت سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔

فلاں دن فلاں بس سے آرہے ہیں۔ انھیں پہچاننے کے لیے ایک عدد پاسپورٹ سائز فوٹو بھی بھجوایا۔ اور یہ لکھ دیا کہ ہمیں لینے کے لیے بیل گاڑی منگوا لائیں (جب زندگی کے ہچکولے کھاتی گزر رہی ہے تو پھر بیل گاڑی کے ہچکولوں کا مزہ کیوں نہ لیں)۔ اس دوڑ میں جب کہ لوگ دولت کے لیے بیرونی ممالک پرواز کر رہے ہیں، ہم راحت کے لیے اندرونِ ملک کے سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔

مقررہ دن دوست ہمیں رخصت کرنے کے لیے بس اسٹانڈ پہنچ گئے اور موقع محل کے اعتبار سے فرمائش کرنے لگے چنانچہ یہاں کوئی وی سی آر، ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر کی فرمائش نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ کوئی دہی کی ہانڈی کوئی لال اِملی، کوئی مکئی کے بھٹے اور کوئی خالص شہد کی فرمائش کر رہا تھا۔ ہم بڑی سعادت مندی سے ہر ایک کی فرمائش نوٹ کر رہے تھے۔

خیر بس چل پڑی اور ہمارا ذہن دوڑنے لگا کہ وہاں گاؤں میں صبح سویرے جاگ کر طلوعِ آفتاب کا نظارہ کریں گے اور ورڈس ورتھ WORDS WORTH کی نظمیں یاد کریں گے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سنیں گے اور شہر کی عورتوں کی آوازوں سے ان کا موازنہ کریں گے۔ باولیوں میں سارے مسائل ڈبو کر تیرتیں گے۔ بھینسوں پر بلیڈ کران کا خالص دودھ پیئیں گے۔ مکئی کے بھٹے اور گنے سے شکم سیر ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

بس کے ساتھ ہمیں بھی جھٹکا اُسی وقت لگا جب وہ رُک گئی۔ ہم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر کا منظر دیکھا۔ اُسے گاؤں کون کہے گا۔ پکی سڑکیں، ہوٹلیں (جن میں ریڈیو اور کیسیٹ پر فلمی گیت چیخ رہے تھے "ذرا بچ کر کہاں جاؤ گے") مٹھائیوں کی دوکانیں، جن پر مٹھائیوں کی مدح میں (جس کا ثبوت بے شمار مکھیاں تھیں) لکھی ہوئی تحریریں، سائیکل رکشاؤں کی بھیڑ (بیل گاڑیوں کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا) سینما کے پوسٹر، غرض یہاں بھی وہی شور جو شہروں میں سُنتے ہیں۔ اور ہم بے ساختہ کہہ اُٹھے۔ ؎

بہت شور سُنتے تھے دیکھا تو نکلا کا

ٹھنڈی سانس اور سامان لے کر ہم اپنے متوقع میزبان حنیف بھائی کو ڈھونڈنے نکلے ذرا آگے بڑھے تو ایک صاحب سفاری میں ملبوس ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں ہمارا فوٹو جگمگا رہا تھا، ملے اور کہنے لگے۔

"ہیلو بھائی صاحب آپ نے آنے میں دیر کر دی۔ چلئے رکشہ حاضر ہے گھر چلتے ہیں۔"

ہم نے فرطِ اشتیاق سے بیل گاڑی کے متعلق دریافت کیا۔

حنیف :- اب کہاں بیل گاڑی ؟ صرف چند بیل رہ گئے ہیں جو غریب کسان اپنے یہاں رکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے پاس ٹریکٹر ہیں۔ سنتے ہیں کہ سارے بیل شہر منتقل ہو گئے ہیں۔ وہاں محکمہ حیوانات اور فلم والے ان کا مختلف طریقوں سے استحصال اور استعمال کر رہے ہیں۔

ہم :- بیل ہی دیہات چھوڑ شہر منتقل ہوتے ہیں جو نہیں جانتے کہ سب سے اچھا کلچر، ایگری کلچر ہے۔ دراصل اب شہروں میں بیل یا بیل نما انسان ہی مزے سے رہ سکتے ہیں۔ اب ہم گاؤں نما شہر کو تفصیل سے دیکھنے لگے۔ پکی عمارتیں پکی سڑکیں، دوکانیں جن پر انگریزی بورڈ نمایاں تھے۔ پان کی دوکانوں پر ضرورت سے زیادہ بھیڑ تھی۔ ہم نے اس کا سبب پوچھا۔

حنیف :- یہ لوگ کرکٹ کمنٹری سُن رہے ہیں۔ نتیجتاً اسکور زیادہ اور اناج کم ہو رہا ہے۔

ہم :- کیا یہاں بھی اس کا شوق ہے ؟

حنیف :- ہم لوگ گھروں میں گھر والی کی کمنٹری سُننے سے بچنے کے لیے کرکٹ کمنٹری سُنتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ایسے کھیل سال بھر کیوں نہیں ہوتے ؟

راستے میں بھینسوں کا غول نظر آیا جو دُم ہلا ہلا کر چل رہی تھیں۔

حنیف :- دیکھئے بھینسیں دُم سے اشارہ کر رہی ہیں کہ اپنا رکشہ آگے بڑھائیے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ دراصل ڈنمارک سے ایک ٹرینڈ گائے آئی ہوئی ہے اور اُس سے یہ بھینسیں آداب آمد و رفت سیکھ گئی ہیں۔ ایک مچھلی جب سارے تالاب کو گندہ کر سکتی ہے تو ایک گائے سارے گاؤں کی بھینسوں کو ٹھیک بھی تو کر سکتی ہے۔

ان مہذب اور شائستہ بھینسوں کو دیکھ کر ہمیں شہر کی وہ عورتیں یاد آئیں جو بیچ سڑک پر جعلی بالوں کی چوٹی لہرا کے دندناتی پھرتی ہیں اور ٹریفک میں خلل ڈالتی ہیں۔ کاش کہ ڈنمارک کی گائیں شہروں میں بھی آجائیں اور اصولِ ٹریفک سکھلائیں۔

گھر پہنچے تو وہاں ٹیپ بج رہا تھا اور بچے جیک اینڈ جل گا رہے تھے۔ اور ہمیں "اے میرے دل کہیں اور چل" والا نغمہ یاد آیا۔ بچوں نے کہا "انکل آپ نے دیر کر دی ہم کب سے آپ کا WAIT کر رہے ہیں۔"

خیر صاحب ہم حسبِ عادت آٹھ بجے سے پہلے اُٹھ نہ سکے اور سورج ہمارا انتظار کئے بغیر طلوع ہوگیا۔ صبح کا دلنواز منظر جوش ملیح آبادی کا شعر گنگناتا ہوا رخصت ہوگیا۔ سہانے مناظر اور شبنمی ماحول سے ہم یہاں بھی محروم ہوگئے۔ حنیف بھائی دودھ کی بوتل لیے آرہے تھے تو بھینس کے خالص دودھ کا خیال پانی پانی ہوگیا۔ باؤلیوں میں نہانا چاہا تو بچوں نے روک دیا کہ انجن چل رہا ہے۔ خالص دہی اور شہد اب شہروں کو جاتا ہے۔ لال املی کے درخت اب شجرِ ممنوع بن گئے ہیں۔

غرض ہم جس خالص دیہات اور اُس کی امتیازی خصوصیات کا تصوّر لے کر نکلے تھے وہ ٹوٹ گیا اور ہم نے سوچا کہ اس سے تو اچھا ہے کہ اپنے شہر میں ہی رہیں۔ ہم نے سامان باندھا۔

حنیف :- ارے بھائی اتنی جلدی آپ جا رہے ہیں۔ دو دن ہی تو رہے۔ کچھ دن اور ٹھہر جائیے۔

ہم :- (فلسفیانہ انداز میں) بزرگوں سے سنتے ہیں کہ دنیا چار دن کی ہے دو دن تو آپ کے پاس رہے۔ بقیہ دو دن بیوی، بچوں اور دوستوں کے ساتھ گزاریں گے۔

اور صاحب شامت کے لیے نہیں عصری راحت کے لیے اپنے شہر کا رُخ کیا۔

دوست ہیں بلکہ اپنی فرمائشی چیزیں لینے بس ڈپو پر موجود تھے۔

ہم :- دیکھو بھئی خالص دہی یہاں کی ڈیری میں ملتا ہے خالص شہد بھی یہاں کی دکانوں میں دستیاب ہے۔ لال املی والے صاحب لال املی کا سوٹ سلوائیں اور ہری املی سے کام چلائیں۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں۔ دیہات کی چیزیں دیہات والوں کے ساتھ اب شہروں میں آگئی ہیں۔ دیہات دیہات نہیں شہر بن گئے ہیں۔ وہاں کے اکثر لوگ محنت سے جی چرا رہے ہیں اور کھیتوں میں کام نہیں کر رہے ہیں۔

رپورٹ دی اور گھر کی راہ لی۔ راستے میں دلیپ کمار کی فلم گنگا جمنا دیکھی اور دیہی ماحول کو یاد کیا۔ اب ہمارے ہاتھ میں پریم چند کا ناول گئودان ہے اور ذہن میں شاعرِ مشرق و مغرب کا مصرع گونج رہا ہے

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

▬ ▬

پاگل عادل آبادی

بھیجے کو اپنے کام میں لاروں کھڑے کھڑے
پک پاکٹنگ میں خوب کماروں کھڑے کھڑے

دربانی اس کے در کی بھی کرنی پڑی قبول
ناز اس حسین کے میں اٹھاروں کھڑے کھڑے

ہے میرے آگے پیچھے بھی کاروں کا اک ہجوم
چوراستے پہ سائیڈ بتاروں کھڑے کھڑے

بیگم ہے سینما میں تو بچہ ہے میرے پاس
نیپل سے اسکو دودھ پلاروں کھڑے کھڑے

پنکھا ہلا نا بھول کے پنکھے کے سامنے
منڈی میں اپنی خود ہی ہلاروں کھڑے کھڑے

بس ہو کہ ریل ہو کہ وہ راشن کی ہو دکان
میں اپنی ساری عمر گنواروں کھڑے کھڑے

بیٹھا جو اُن کے پاس تو سننے پڑیں گے شعر
اپنی غزل ہی اُنکو سناروں کھڑے کھڑے

بہکا سکے مجھے بھلا شیطان کی کیا مجال
خود اُسکو اُنگلیوں پہ نچاروں کھڑے کھڑے

پونم کو آتوں بول کو آرینگے اماس کو
فٹ پاتھ پر جوانی لٹاروں کھڑے کھڑے

بیگم خراٹے بھرتی ہے کیا نیند آئے گی
پنکھا میں گھنٹے بھر سے ہلاروں کھڑے کھڑے

پتلون میری ٹائیٹ ہے بیٹھوں میں کس طرح
پاگل وضو بھی ابتو بناروں کھڑے کھڑے

غزل

لاغر نرملی

"نیم سرجن" کی "پوری" یہ پہچان ہے
گھر کے پچھواڑے میں WN شمشان ہے

چمٹا رہتا ہے کیوں باس کے پاؤں سے
کوئی پاجامہ ہے یا کہ انسان ہے

میں خیالوں میں اُن کے تھا کھویا ہوا
ڈاکٹر نے کہا یہ تو بے جان ہے

کس قدر "غیر فطری" ہے گھر آپ کا
کمرہ کوئی نہیں صرف دالان ہے

دال میں کالا لگتا ہے کچھ کچھ مجھے
معنی خیز اُن کے ہونٹوں کی مسکان ہے

کڑکی میں ہلّو ہلّو کھسک جائیں گے
دوستوں کی یہی ایک پہچان ہے

خوب جوڑی ہے لگنے نہ پائے نظر
ہم ہیں لاغر تو بیوی پہلوان ہے

مانک ٹالا (بمبئی)

زقندِ مکرّر

اس مرتبہ ہم ہوائی راستے کی بجائے بحری اور بری راستے سے برطانیہ کی راجدھانی لندن پر حملہ آور ہوئے۔
لجیم کے ساحل اوسٹ اینڈ (بمعنی مشرقی کنارہ) سے فری (FERRY) میں کار سمیت سوار ہوئے۔ چند ہی گھنٹوں میں
ڈور (DOVER) کے تٹ پر ہمارا لشکر بلا مزاحمت لنگر انداز ہوگیا۔

حالانکہ یہ اگست کا مہینہ تھا، گرمی کا موسم جوبن پر ہونا چاہیئے تھا لیکن اس مرتبہ گرمی کسی بال ودھوا کی جوانی
طرح آئی۔ کب آئی کب گئی کسی کو پتا ہی نہ چلا۔ یورپ کی سندریاں جولائی اور اگست کے دو مہینوں کا باقی دس
نے اس قدر بے صبری اور بے قراری سے انتظار کرتی ہیں جس طرح کوئی مجبور مٹیار اپنے پردیسی پریتم کی واپسی کے
لیے بے قرار رہتی ہے۔ سال بھر میں یہی دو مہینے ہوتے ہیں کہ جب وہ سمندر کے ساحل پر جاکر جوبنا کے ابھار اور جسم کی
ر کا مظاہرہ فرماسکتی ہیں۔ لیکن اس مرتبہ قدرت نے ایسا ستم ڈھایا کہ یہ دو ماہ بھی برسات اور کہرے کی نذر ہوگئے۔
وہ بیچاری سندر ناریاں دل مسوس کر رہ گئیں۔ اور ہمیں بیلجیم اور برطانیہ کے ساحلوں پر نظر بازی کا سامان میسّر
ہوسکا اور ہم اُن سے بھی زیادہ دل مسوس مسوس کر رہ گئے۔

قصہ مختصر۔ ہماری کار کینٹ (KENT) کے خوبصورت اور فرحت افزا علاقے سے فراٹے بھرتی ہوئی لندن کے
دل ویسٹ اینڈ اور گرد و نواح کے فیشن ایبل علاقے میں داخل ہوئی۔ اس علاقے کی گہما گہمی اور رونق دو ہی تین سال کے
صے میں اس قدر بڑھ جائے گی یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ہمارے چہرے پر خجالت کے آثار اور پیشانی پر پشیمانی کے پسینے کے گوہر ہائے آبدار نمودار ہوگئے۔ مانا کہ
م نے اپنی پچھلی زیارتوں کے دوران حتی المقدور ہر طرح کا عملی تعاون پیش خدمت فرمایا تھا لیکن اس قدر بھرپور بھی
یں کہ برطانیہ کو بڑھتی ہوئی آبادی اور بے روزگاری کے جانگسل مسائل سے برد آزمائی کی نوبت آجاتی۔

ہم نے جبین سے پسینہ پونچھتے ہوئے چاروں کھونٹ نگاہ دوڑائی تو دل کو کسی قدر تسلی ہوئی کہ اس پردہ
نگاری کے پیچھے اکیلے ہم ہی چھپے نہیں بیٹھے بلکہ کچھ تو دو لیتے ملکوں کے باشندوں کی شب و روز کی مشقت بھی شامل
حال تھی۔

ہم نے پکاڈلی سے آکسفورڈ اسٹریٹ اور آکسفورڈ اسٹریٹ سے ریجنٹ اسٹریٹ کے درمیان سوہو (SOHO)

کے علاقے کے سبھی کوچہ و بازار کی خاک چھان ماری۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ دل کو گونہ تسکین ہوئی کہ سوہو کی سبھی رنڈیاں معروفِ کار تھیں اور ہماری سرپرستی سے بے نیاز ہوچکی تھیں!

لنڈن کا موسم وہاں کی ناریوں سے بھی کہیں زیادہ سیماب صفت ہوتا ہے۔ اسی لیے بی۔بی۔سی کی ٹیلی ویژن سروس پر ہر دوسرے گھنٹے خبروں کے ساتھ موسم کے حال بلکہ بے حالی کی حالت کا تذکرہ بھی زور وشور سے ہوتا ہے۔ دراصل وہاں کے باشندوں کو خبروں سے زیادہ وہاں کے موسم کی سیمابی کیفیت کی زیادہ فکر رہتی ہے۔ اس لیے وہ ہر دوسرے گھنٹے خبروں کی چاند ماری برداشت کرتے رہتے ہیں کہ موسم کے حال کی جانکاری خبروں کی ایک بھرپور خوراک (DOSE) حلق سے نیچے اُتارنے کے بعد ہی حاصل کرسکتے ہیں۔

ہم نے بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر بیلجیم سے روانہ ہونے سے پہلے بی۔بی۔سی کے دو تین نیوز بلیٹن ہضم فرما کر گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ کہ اگلے روز موسم خوش گوار اور مطلع طمانیت خیز ہوگا۔ چنانچہ ہم سالِ رواں کے موسم گرما کے یورپی فیشن کے مطابق ایک باٹکی سی ٹی شرٹ (T - SHIRT) اور ایک بڑی ہی طرحدار ہاف پینٹ (HALF PANT) میں ملبوس ہوکر لنڈن کی تسخیر کے لیے روانہ ہوئے تھے لیکن وہاں پہنچے تو بادو باراں کے جھکڑوں نے ہمارا استقبال فرمایا۔ بہر حال ہم برداشتہ خاطر نہیں ہوئے۔ اگلے روز ہم نے ایک نہایت بڑھیا گرم سوٹ زیبِ تن فرمایا اور مٹر گشتی کے لیے نکلے۔ لیکن اس روز لوگ باگ ننگے بدن لنڈن کی سڑکوں پر چہل قدمی فرمارہے تھے۔ لنڈن کی مشاطائیں ٹی شرٹوں میں جام چھلکاتی ہاٹ پینٹ (HOT PANTS) میں گوری گوری ٹانگوں کی بہار دکھاتی نظر آئیں۔ ہاٹ پینٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پہننے والیوں کے جسموں کو ٹھنڈک لیکن نظر بازوں کی نگاہوں اور دلوں کو گرمی پہنچاتی ہیں۔

ہر علاقے کے میونسپل پارکوں کے کھلے تالابوں میں علاقے کے سبھی مرد عورتیں، بچے، بوڑھے، ڈبکیاں لگاتے اور گھاس کے سرسبز قطعوں پر دھوپ سینکتے نظر آئے۔ نوجوان طرحدار لڑکیاں بکینیاں (BIKINIS) پہنے دعوتِ نظارہ دیتی نظر آئیں۔ بکینی دنیا بھر کے ملبوسات میں مختصر ترین لباس ہوتا ہے (اگر اسے لباس کے زمرہ میں شمار کیا جاسکے تو) لیکن اس قدر اختصار کے باوجود اس کا طول و عرض یوم پیدائش کے لباس سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ انہی دنوں اخبارات میں ایک خبر بجلی کے کوندے کی طرح گری اور فیشن کی دنیا کے خرمن میں آگ لگاگئی کہ بکینی کا موجد عارضۂ قلب میں مبتلا ہوکر بھرپور جوانی یعنی بیاسی برس کی بالی عمریا میں اس دنیائے فیشن کو داغِ مفارقت دے گیا۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھاگئے

بزرگوں سے سنا تھا (اور اس بات کی اب تصدیق بھی ہوگئی) کہ اللہ میاں جس سے جس قدر زیادہ پیار کرتا ہے اس کا اتنی ہی جلد اوپر سے بلاوہ آجاتا ہے۔ ویسے بھی یہ خبر گشت کررہی تھی کہ عالم بالا میں حسینوں اور حسن پرستوں کی بہت زیادہ بہتات ہوگئی ہے اور وہاں فیشن ڈیزائنروں (FASHION DESIGNERS) کا بہت توڑا ہوگیا تھا۔ لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ان کے مطابق وہ بے چارہ اسی فکر میں گھل گھل کر دل کا روگ لگا بیٹھا تھا کہ بکینی کے طول وعرض میں مزید کتر بیونت کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی اور آخر یہی غم جان لیوا ثابت ہوا۔

بات سے بات نکل آتی ہے بکینی کا ذکر چل نکلا تو ہمیں ہیروڈز (HARRODS) کا خیال آگیا۔ یہ ڈیپارٹمنٹ اسٹور لنڈن کے سب سے زیادہ فیشن ایبل اور پاش (POSH) علاقے میں آباد ہے۔ اور غالباً دنیا کا سب سے مہنگا اسٹور ہے۔ یہاں دنیا بھر کے رئیس بلکہ بگڑے رئیس اور ان کی بیگمات خرید و فروخت کو فیشن میں شمار کرتے ہیں۔

برطانوی چھتر چھایا کے پیچھے اُس زمانے کے راجے نواب اِسی اسٹور کی سرپرستی فرمایا کرتے تھے۔ اور جس زمانے میں ہمارے ملک میں پیسے کی دو گلوریاں ملا کرتی تھیں یہ حضرات اس اسٹور سے دو پاؤنڈ میں ایک پان خرید کر نوش جان فرمایا کرتے تھے۔

ہم بھی اس اسٹور کی سرپرستی فرمایا کرتے تھے اور لنڈن کی ہر زیارت میں اپنی بے پناہ معروفیات کے باوجود ونڈو شاپنگ (WINDOW SHOPPING) کے لیے تھوڑا بہت وقت ضرور نکال لیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ (غالباً اس اسٹور کی ہسٹری میں پہلی مرتبہ) ہم نے اس کے باہر سیل (SALE) کے پوسٹر چسپاں دیکھے۔ چنانچہ ہم بھی جی کڑا کر کے اسٹور کے اندر تشریف لے گئے۔ اندر ایک جگہ ایک نہایت ہی سڈول ماڈل کے بدن پر بکنی کی بہار دیکھی تو ہمارا وضو ٹوٹ گیا۔ ع

وہ شبنم کی انگیا ہی تنگ و چست

ہمارا دل مچل مچل اُٹھا۔ آخر دل ہی تو ہے، سنگ و خشت تو نہیں۔ (ویسے دل اور سنگ و خشت میں کچھ خاص فرق نہیں۔ دونوں کہیں نہ کہیں پھینکنے کے کام آتے ہیں) خیر ہم اس کی طرف کچے دھاگے کے بغیر ہی کھنچتے چلے گئے۔ کچھ دیر اس کا سراپا نگاہوں سے نہارتے رہے۔ پھر ہمت کر کے بکنی کے ایک سرے کو چھو لیا۔ اس انداز سے کہ گویا ہم اس کے کپڑے کی کوالٹی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ حالانکہ نیت میں فتور تھا کہ اس بُتِ طنّاز کے چکنے مرمریں بدن کا لمس محسوس کریں اور دل کو تھوڑا سا گرما لیں۔ لیکن ہمارے چھوتے ہی چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا — ہم ہڑبڑا اُٹھے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ناگہاں ہماری نظر اس کے لیبل پر جا پڑی اور ہم پر اس برقی جھٹکے کا مطلب واضح ہو گیا۔ قیمت تھی اس کی ایک سو اسی پاؤنڈ محض!

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قیمت!

چچا غالب نے بھی ایک مرتبہ ایک چار گرہ کپڑے کا ذکر فرمایا تھا لیکن کچھ تلخ و ترش انداز میں کہ وہ عاشق کا گریبان تھا۔ شعرا حضرات ہمیشہ تعلّی اور مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا عشق ہمیشہ یک طرفہ ہوا کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ بھی خالی خولی بلکہ محض خیالی وگرنہ ہمارے بھوکے ننگے شاعر کہ جنھیں یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ اگلے وقت کی چار روٹیوں کا انتظام کیوں کر اور کیسے ہوگا، وہ گریبان کو پھاڑ کر اپنی اکلوتی رفو در رفو قبا کی رفاقت سے محروم ہو جانے کا خیال بھی دل میں کیوں کر لا سکتے ہیں؟

یہ لوگ گریبان ضرور پھاڑا کرتے تھے لیکن بڑی احتیاط اور قرینے سے تاکہ بوسیدہ و تار تار پیرہن کو گزند بھی نہ پہنچے اور بنیے، پٹھان قرض دار اپنے پیسے کی وصولی کے لیے انہیں گریبان سے پکڑ بھی نہ سکیں۔

مُلک کی حسیناؤں کو پچھلے وقتوں میں بھی معلوم تھا کہ محض شاعری سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس لیے وہ ان کے سائے سے بھی بدکتی تھیں۔ انہی کے مارے پردے کا رواج بہت سخت تھا کہ اگر ان ندیدوں کو اُن کی کسی اُنگلی کی ایک پور بھی نظر آگئی تو ہائے وائے کا شور مچ جائے گا اور وہ بے چاریاں مُفت ہی میں بدنام ہو جائیں گی۔ نتیجے میں خانہ آبادی کے مواقع سے محروم رہ جائیں گی۔ اور اپنی پیشانی پر بدنامی، دل میں حسرتوں کے داغ اور شانوں پر جوانی کا بوجھ اٹھائے آخر میں لحد کی یخ بستہ تاریکیوں میں دھکیل دی جائیں گی۔

خود ہماری مثال آپ کے سامنے ہے۔ بھرپور جوانی میں ہم بھی شکیل بدایونی اور جمیل جالبی ہوا کرتے تھے۔

شعر و شاعری اور افسانہ طرازی میں بھی یکتائے روزگار تھے (لیکن محروم روزگار تھے) بیک وقت کئی کئی سٹلر رخ اور ماہ وشوں کی زلف و رخسار کے قتیل شفائی ہونے کا دم بھرتے تھے لیکن کسی بیوقوف نے گھانس تک ڈالنے زحمت گوارہ نہ فرمائی ــــ ہم ترستے رہے اک نظر کے لیے!

لیجیئے ذکر ہو رہا تھا اس پری وش کا لیکن ہمارا بیان کہاں ــ سے کہاں بھٹک نکلا ــــ قصہ مختصر ہم اس شعلہ بداماں پری رُخ کے بدن سے چار سو چالیس دو لٹ کا برقی جھٹکا کھا کر جان کی امان مانگتے ہوئے وہاں اُلٹے پاؤں بھاگے اور کسی دوسرے اسٹور میں جا کر پناہ لی۔

دوسرے اسٹور میں بھی یہی حال تھا البتہ قیمتیں کافی کم تھیں۔ پھر بھی ہم بہت محتاط رہے۔ پیش دستی پس و پیش ہی کرتے رہے کہ نوبت ڈھول ڈھپے پر نہ پہنچ جائے۔ لاکھ مٹی کی پتلیاں سہی لیکن تھیں تو سراپا ناز

لنڈن کے سبھی چھوٹے بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹور اور شاپنگ سینٹرز انواع واقسام کے سامانوں اور بھانت بھانت کے خریداروں سے بھرے پُرے رہتے ہیں۔ ویسے بھی یہاں کے دوکاندار اپنا سامان اس ڈھنگ سے سجا کر رکھتے ہیں کہ آنے جانے والے لوگ لا محالہ ان میں گھس جاتے ہیں اور کچھ نہ کچھ خرید کر ہی باہر نکلتے ہیں! کہتے ہیں مہذب ڈاکا کہ کسی نہ کسی طرح پیسہ آپ کی پاکٹ سے نکال لیا جائے۔ اس کے خلاف پولیس میں رپٹ نہیں لکھائی جا سکتی۔ اردو کے شاعر نے شاید یہاں کے خریداروں کے لیے ہی کہا تھا کہ ؏

پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

ویسے بھی گود سے لیکر قبر تک یہاں کے ہر فرد و بشر کی زندگی اور موت کی ذمہ داری سرکار کے سر ہوتی ہے۔ اس لیے لوگ اردو کے شاعروں کی طرح کفن کے لیے کوڑی تک رکھنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

لنڈن میں بڑے بڑے MONUMENTS، سیرگاہیں اور باغات ہیں۔ لیکن یہ سبھی مقامات بوس وکنار اور راز و نیاز کے کام آتے ہیں۔ بشائد نوجوان جوڑوں کو اس مفید اور سود مند کام کے لیے گھروں کی گھٹن لینا ہے دراصل کسی نوجوان لڑکے کی کوئی گرل فرینڈ نہ ہو یا کسی نوجوان لڑکی کا کوئی بوائے فرینڈ نہ ہو یا کوئی لڑکی شومئی قسمت سے شادی سے پہلے کنواری رہ جائے تو لوگ اُسے شک و شبے کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی جسمانی یا ذہنی خامی ہوگی۔ اور غالباً نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دوسروں کو اس غلط فہمی کے مرض میں مبتلا ہونے سے بچانے کی خاطر ہر جگہ اپنی جسمانی اور دماغی صحت کا مظاہرہ فرماتے نظر آتے ہیں۔

لندن میں ہم نے کئی MONUMENTS دیکھے تو معاً واٹرلو کا خیال بھی آگیا۔ واٹرلو وہ مقام ہے کہ جہاں برطانیہ کے فاتح اعظم ڈیوک آف ویلنگٹن نے نپولین کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ نپولین کی عبرت ناک شکست کی یادگار کے طور پر انگریزوں نے ایک شاندار محاورہ بھی گھڑا تھا:

NAPOLEON MET HIS WATERLOO (نپولین اپنے واٹرلو سے ہمکنار ہوا!)

ہم نے سوچا کہ انگریزوں نے نپولین کی اس توہین آمیز شکست کی یادگار میں اس قدر شاندار محاورہ گھڑا ہے تو اس کی لاش پر سو دُرّے لگانے کے لیے کوئی نہ کوئی شاندار یادگار بھی قائم کی ہوگی۔ چنانچہ ہم ٹکٹ کٹا کر واٹرلو کے اسٹیشن پر جا پہنچے اور اس کے گرد و نواح کا دُور دُور تک دورہ کیا لیکن ہمیں کہیں کوئی یادگار کھڑی نظر نہ آئی سوائے اس بوسیدہ و پژمردہ اسٹیشن کی عمارت کے کہ جس کا نام واٹرلو تھا۔

ہم بھی پہلے پہل ہندوستان اور پاکستان کے دیگر معزز محققین کی طرح یہی سمجھتے تھے کہ یہ کھنڈر سا اسٹیشن اس الم ناک سانحے کی یادگار کے طور پر کھڑا کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ہم میں تحقیق و تجسس کا مادہ دیگر محترم و معزز محققین سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی تحقیق و جستجو جاری رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور آج ہم انتہائی فخر سے یہ اعلان فرماتے ہیں کہ واٹرلو کی دریافت کا سہرا ہمارے سر ہے۔

ایک مرتبہ جوانی میں بھی ہم نے اپنے سر پر سہرا باندھا تھا۔ لیکن اس سہرے کی یاد آتے ہی دل و دماغ کی گہرائیوں میں کونین کی سی تلخیاں گھلنے لگتی ہیں۔ ہوا یوں کہ ہم نے دوستوں کے ہشکانے پر روزِ اول ایک بلی کی گردن مروڑ ڈالی تھی۔ نتیجے میں ہماری جھانسی کی مہارانی نے ہماری اچھی طرح دھلائی کرنے کے بعد حجلۂ عروسی کے دروازے کے باہر دھکا دے دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ ایک بے زبان جانور کی ہتیا کرتے ہوئے تمہارے ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گئے؟ وہ دن اور آج کا دن ہم بے زبان بنے ہر روز اپنی ہتیا کے مظاہرے کا نظارہ فرماتے ہیں ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

قصہ کوتاہ ہم نے واٹرلو کو بیلجیم میں دریافت فرما لیا ہے۔ یہ بیلجیم کے صدر مقام برسلز سے پندرہ بیس میل کی دوری پر ایک چھوٹا سا خوبصورت قصباتی مقام ہے۔

نپولین ملک پر ملک فتح کرتا جا رہا تھا۔ سارے یورپ کی چھوٹی بڑی سلطنتیں ایک کے بعد ایک اس کی فوجِ ظفر موج کے آگے سرنگوں ہوتی جا رہی تھیں۔ اور یورپ کے سبھی آمر بے بسی سے آسمان کی جانب نگاہیں لگائے کسی معجزے کے انتظار میں تھے۔

دراصل نابرابری، بھوک، بیکاری اور مجبوری کی کوکھ سے انقلاب جنم لیتے ہیں۔ اس زمانے کے یورپ کے شہنشاہوں کو دیکھیے۔ خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے اور غریب غربا کو کیک کھانے کے مشورے مفت تقسیم کرتے تھے۔ ان کی استراحت کے لیے بڑے بڑے محل ماڑیاں اور ڈلیے تھے۔ لیکن غریب نپولین کو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے شب بسری پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اگر وہ نپولین کو بھی آرام و راحت کیلئے ایک آدھ محل یا ڈاچا الاٹ کر دیتے تو یورپ کا نقشہ ہی درہم برہم نہ ہوتا۔ — خیر۔ یورپ کی حکومتوں نے برطانیہ کے شہنشاہ سے مدد کی بھیک مانگی۔ چنانچہ برطانیہ کے آمر نے ڈیوک آف ویلنگٹن کو اپنی فوجوں سمیت ان کی مدد اور نپولین کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ سارے یورپ کی فوجیں ڈیوک صاحب کے زیرِ کمان نپولین کی فوجوں سے نبرد آزما ہو گئیں اور اُسے پہلی اور آخری شکست کی تلخی سے روشناس کرایا۔

یورپ کی سلطنتوں نے مل کر واٹرلو کے مقام پر اس یادگار فتح کی یادگار قائم کر دی ہے۔ یہاں ایک گول عمارت میں واٹرلو کی جنگ کا ایک سینرمک (PANORAMIC VIEW) تیار کیا گیا ہے۔ جسے دیکھنے سے ساری جنگ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے — لیکن اس عمارت کے اندر اور باہر یادگاری تحفے تحائف فروخت کرنے والی دکانوں میں جو اشیاء فروخت ہوتی ہیں ان سب پر نپولین اعظم کی تصویریں جلوہ افروز ہوتی ہیں — ڈیوک صاحب کا سارے افسانے میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔

یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر درج بالا انگریزی محاورے کی لامحالہ یاد آگئی لیکن تھوڑے سے تصرف کے ساتھ —

DUKE OF WELLINGTON MET HIS WATERLOO.

ڈیوک آف ولنگٹن اپنے واٹرلو سے ہمکنار ہوئے۔

مشغلے رشوت کے ہم ، ہر روز سر کرتے رہے
پر ہماری جیب خالی ڈاکٹر کرتے رہے

خدمتِ علم و ہنر ہم عمر بھر کرتے رہے
اور سب اعزاز حاصل بے ہنر کرتے رہے

ہم نے سوچا تھا بنیں گے ڈاکٹر ہم بھی مگر
زندگی بھر بیل گاڑی میں سفر کرتے رہے

دوپہر تک وہ اُدھر آرام سے سوتا رہا
انتظارِ یار شب بھر ہم اِدھر کرتے رہے

درد تو محسوس کرتا تھا میں اپنے پاؤں میں
ڈاکٹر لیکن علاجِ دردِ سر کرتے رہے

نیاز سواتی (پاکستان)

پیرودی

"پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن" (اقبال)

پھر الکشن نے جگایا جذبۂ حبِّ وطن
مجھ کو پھر وعدوں سے پرچا کے لگا لیڈر کا فن

بوتھ پر ووٹر کھڑے ہیں قطار اندر قطار
ہیں پرانے گندے گندے کالے پیلے پیرہن

ووٹ کی پرچی پہ روشن ہے الکشن کا نشاں
اس نشاں کو اور چمکاتی ہے سکوں کی لگن

کالے دھن میں ڈھونڈھ پایا انسان زندگی
تو نہ بن میرا، فقط اپنا ہی بن اپنا ہی بن

من کی دنیا؟ من کی دنیا فقر و فاقہ، بے زری
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا عیش و عشرت کا چمن

کالی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
ورنہ انکم ٹیکس ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

تن کی دنیا میں نہ پایا میں نے بے رنگی کا راج
تن کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

شاہ حسین نہری

پہلے پاپا کو میرے پلا ساقیا
دیکھ پھر زندگی کا مزہ ساقیا

خواب میں بڑبڑاتی تھیں کل اُن کی ماں
میرے بڈھے کو مجھ سے ملا ساقیا

ان کے بیلن سے زخمی ہوا میرا سر
ہوگئی ظلم کی انتہا ساقیا

کریم ضیا (بمبئی)

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

(شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ)

ہمارے دواخانے

قدرت کے کارخانے میں ہر شئے کا جوڑ پیدا کیا گیا ہے چنانچہ انسان کبھی صحت مند رہتا ہے تو کبھی بیمار بھی پڑتا ہے۔ صحت مندی کے مزے تو انسان خوب اٹھاتا ہے۔ لیکن بیماری میں وہ فسانۂ شکایت و تکلیف بن جاتا ہے۔ ہم نے کسی شخص کو بیماری کے مزے لوٹتے نہیں دیکھا حالانکہ بیماری کا بھی اپنا ایک مزا ہوتا ہے۔ روزمرہ کے کام کاج چھوڑ کر بستر میں آرام سے رومانی ناول پڑھتے رہیے۔ گھر والوں کی توجہ کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ وقت پر گرم گرم کھانے کو ملتا ہے۔ بیماری کی مخصوص غذا جیسے اورڈبل دودھ کھا سکتے ہیں۔ تکلیف دور ہونے کے بعد تھک کر نیند آتی ہے جو صحتمندی کے دوران میسر نہیں آتی ایسی سہانی اور میٹھی نیند کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے بیماری کے ان فوائد کے باوجود کوئی انسان بیمار ہونا نہیں چاہتا۔ بیماری کو ایک قہر، عذاب اور ایک بلا سمجھتا ہے۔ بیماری میں جو روپیہ پیسہ خرچ ہوتا ہے اسے اسراف جانتا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے معالج ہیں۔ اکثر اوقات بیماری کو ہنسی خوشی برداشت کر لیا جاتا ہے۔ لیکن معالجین سے وابستگی ہمیں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ "ہو الشافی! تو ہمیں بیماری اور پھر شفا دے لیکن معالجین کے عتاب سے بچا رکھ۔"

"مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ" کے مصداق ہم نے اپنے دوست کے بارے میں سنا کہ آنکھ کا آپریشن ہوا ہے سو ہم ان کی عیادت کو پہنچے۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے دوست کی آنکھ پر پٹی کے ساتھ پیر بھی پلاسٹر میں جکڑا ہوا ہے۔ ہمارے پوچھنے پر انھوں نے بتلایا "میں آنکھ کے آپریشن کے لیے دواخانے گیا تھا وہاں باتھ روم میں پھسل کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔" ایک اور دوست نے شکایت کی "میں نے کھانسی کے لیے انجکشن لیا تھا۔ کھانسی تو کم ہوئی لیکن انجکشن کی جگہ ایک پھوڑا بن گیا ہے۔ اب اس کا علاج کروا رہا ہوں۔" جیسے جوڑ بیماریوں کا ساتھ ہونے کے علاوہ دواخانے کی چند مخصوص بیماریاں ہوتی ہیں جو دواخانہ آنے والوں کے ساتھ نتھی ہو جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ ہم اپنے ایک دوست کی عیادت کے لیے دواخانہ گئے تو ساتھ میں دواخانہ سے انفکشن اٹھا لائے جو ہمیں ایک عرصہ تک بیمار رکھا تھا۔ دواخانے میں مریض کی انفرادی بیماریاں مساوات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجتماعی بیماریاں بن جاتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست دواخانے میں یرقان کے باعث شریک ہوئے سیدھے بازو کے مریض کو ٹائیفائڈ تھا۔ تیسرے دن ہمارے دوست کو یرقان کے ساتھ

ٹائیفائڈ بھی ہوا۔ اس سے پہلے کہ بائیں بازو والے مریض کا نمونیا انھیں متاثر کرتا وہ اپنی جان بچانے کے لیے گھر واپس آگئے

غائب دماغی صرف پروفیسروں کی میراث نہیں ہے۔ یہ طرۂ ہر قابل شخص کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کی مثال لیجیے ایک انجکشن کے بجائے دوسرا انجکشن اور ایک دوا دوسرے کو دے دینا معمولی باتیں ہیں۔ ایک مرتبہ ہم اپنی زوجہ محترمہ کے لیے دوا لانے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ تکالیف بیان کیں۔ ڈاکٹر نے غور سے سنا اور دوا تجویز کی اور بے خیالی میں ہمیں انجکشن لینے کو کہا۔ ہم اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر نے ہمیں انجکشن دے دیا۔ ڈاکٹر پر حقیقت عیاں ہوئی تو فرمایا "کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں ہے۔ آپ کو کیفیت کا انجکشن دیا گیا ہے۔ مریضہ کی بیماری کے لیے میری تجویز کردہ دوائیں استعمال کروائیے۔ یہ واقعہ آپ کو شاید لطیفہ لگے لیکن اب جو واقعہ ہم بیان کرنے جا رہے ہیں اس کی شہرت دنیا بھر میں ہو چکی ہے۔ ہمارے شہر کے ڈاکٹروں نے بیمار آنکھ کے بجائے صحت مند آنکھ نکال دی تھی۔ مریضہ کا نام آج بھی ہمیں یاد ہے۔ اس مظلوم بچی کا نام نسرین بانو تھا۔ چند دن قبل شہر کے ایک دواخانے میں آپریشن کرکے مریض کے پیٹ سے وہ قینچی برآمد کی گئی جو ایک دوسرے دواخانے کے ڈاکٹروں نے مریض کے پیٹ میں "فکسڈ ڈپازٹ" کی تھی۔ یہ مثالیں ڈاکٹروں کی غائب دماغی کی تھیں۔ نرسیں کہاں پیچھے رہنے والی ہیں۔ وٹامن کے شربت کے بجائے بچوں کو ڈیٹال پلایا گیا تھا۔ اب آپ ہی بتلائیے جب ہمارے دواخانے اور معالجین ایسے ہوں تو ہم بیمار ہونے سے کیوں نہ گھبرائیں ؟

علاج کے لیے ہمارے شہر میں دو قسم کے دواخانے اور معالج دستیاب ہیں۔ سرکاری اور خانگی دونوں طرح سے علاج کروانے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ فرق صرف ضابطہ کا ہے۔ سرکاری علاج میں پیسہ بے ضابطہ دینا پڑتا ہے۔ جبکہ خانگی علاج میں روپیہ پیسہ ضابطہ سے خرچ ہوتا ہے ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ خانگی دواخانوں سے مایوس ہوکر آخر میں مریض سرکاری دواخانے پہنچتے ہیں جہاں ان کی مایوسی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ موت کے لیے یہ ایک قسم سے THROUGH PROPER CHANNEL راستہ ہے۔ سرٹیفکیٹ ملنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ ہمارے شہری لوگ پیدا مختلف خانگی دواخانوں اور گھروں پر ہوتے ہیں۔ لیکن مرنا ان کی قسمت میں سرکاری دواخانوں میں لکھا ہے اس قسم کی آخری خدمت کے علاوہ عموماً حیدرآبادی سرکاری دواخانوں سے بحالت مجبوری رجوع ہوتے ہیں۔ جب ان کے پاس خانگی علاج کروانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ سرکاری دواخانوں میں ایک جم غفیر رہتا ہے مریضوں کی لانبی قطاریں لگی ہوتی ہیں جو مریض اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں ان کو قطاروں میں ٹھہرے رہنا پڑتا ہے یہ اور بات ہے کہ مریض کی باری آنے تک وہ فرسٹ ہو جاتا ہے۔ بغیر قطار صرف انھیں مریضوں کا معائنہ ہوتا ہے جنھیں اسٹریچر پر بحالت نزع لایا جاتا ہے یا پھر وہ لوگ جو دواخانہ والوں کے "اپنے تپنے" ہوتے ہیں قطار میں گھنٹہ دو گھنٹہ کھسکتے رہنے کے بعد ڈاکٹر کے دیدار نصیب ہوتے ہیں۔ شکایتوں اور تکالیف بیان کرنے کے بجائے ان کا عنوان سنانا پڑتا ہے۔ "بخار" "اجابتیں" "دل کا درد" "شکر کی بیماری" "بلڈ پریشر" بعض مریض اپنا دکھڑا سنانے لگتے ہیں تو انھیں ڈانٹ دیا جاتا ہے۔ "ہمیں سب معلوم ہے" اپنے آلے سے مریض کو چھوا اور اکثر اوقات بغیر چھوے ہی نسخہ لکھ دیا۔ تشفی نہ ہونے پر لب کشائی کی اجازت بھی نہیں جیسے منصف نے فیصلہ لکھ دیا سو لکھ دیا۔ کچھ کہنے پر داد نہ ہوانے کی مدد سے۔ مریض کو ڈاکٹر کے سامنے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

ایسے دوسرے ڈاکٹر کے سامنے فیس ادا کر کے کی جاتی ہے۔ نسخہ حاصل ہونے کے بعد دواؤں کے لیے قطار میں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ انجکشن، گولیوں، شربت اور پٹی بندھوانے کے لیے مختلف قطاریں بنی ہوتی ہیں۔ اکثر انجکشن، گولیوں اور شربت کا اسٹاک ختم ہو جاتا ہے لیکن قطار باقی رہتی ہے۔ خوش قسمتی سے کبھی دوا ملتی بھی ہے تو ایک یا دو گولیوں پر ٹرخا دیا جاتا بقیہ دواؤں کے تعلق سے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ تکلیف سے اگر نجات پانا ہے تو انھیں بازار سے خریدنا پڑتا ہے۔ سرکاری دواخانے سے ادھورا معائنہ غلط تشخیص اور آدھی ساری دوائیں حاصل کرنے میں سارا دن گذر جاتا ہے۔ تھکن سے طبیعت نڈھال ہو جاتی ہے۔ بیماری دور کرتی ہے۔ پھر کسی خانگی معالج کا رخ کرنا پڑتا ہے۔

آج کل کوئی بھی کام سفارش اور رشوت کے بغیر نہیں ہوتا۔ دواخانے میں مریض کا داخل ہونا بھی اسی کلیہ کے زیر اثر ہے۔ ویسے کبھی کبھار "نیکی" کی نیت سے چند مریضوں کو اس کلیہ پر عمل کیے بغیر سرکاری دواخانوں میں شریک کر لیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ہم بھی شریک رہے۔ بڑے دواخانوں کی نشانی ہے کہ وہاں علم طب سیکھنے کے لیے طالب علم آتے ہیں۔ وہ تمام نو سیکھ ڈاکٹر مریض کو تختۂ مشق بنائے ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں اور رات تمام مریض بیماری اور تختۂ مشق کے ردعمل کی تکالیف سے کراہتے رہتا ہے۔ ڈاکٹر یہ احسان جتاتے ہیں کہ ہم تمہیں مفت دیکھ رہے ہیں حالانکہ بخشش اور انعام کے نام پر مریض کو لوٹا جاتا ہے۔ اکثر دوائیں خریدنی پڑتی ہیں۔ معائنے بھی باہر کروانے پڑتے ہیں دواخانے میں کبھی ایکسرے فلم نہیں ہے تو کبھی کوئی معائنہ کرنے کے لیے درکار کیمیا غائب ہے۔ دواخانے سے روانگی کے وقت ہماری بیماری میں خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے ہمیں یہ کہہ کر ڈسچارج کیا کہ ہم نے بہت دن پلنگ کو گھیرے رکھا ہے۔ اب ہمارا پلنگ کسی دوسرے مستحق مریض کو ملنا چاہیے سرکاری دواخانے کے فرش پر ہمہ اقسام کی گندگی کی طرح مریض بھی پڑے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات دواخانہ یتیمی کا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔ دواخانے سے گھر آنے کے بعد ہم نے حساب کتاب کیا تو انکشاف ہوا کہ خانگی علاج کے تخمینہ سے زائد پیسے سرکاری دواخانے میں خرچ ہوئے۔ ڈاکٹروں اور دواخانے کے دوسرے اسٹاف کے ناز نخرے غیر ضروری طور پر برداشت کیے۔ یار دوستوں نے سرکاری دواخانے میں شریک ہونے پر ہمیں [illegible] جانا اس نقصان دہ سودے کو دیکھ کر ہم مزید بیمار ہو گئے۔

جیل اور سرکاری دواخانے دو ایسی جگہیں تھیں جہاں مفت میں جینے کا حق حاصل تھا کہ دواخانوں میں مفت مرنے کی سہولت بھی تھی لیکن ہمارے شہر میں چند دن سے سرکاری دواخانوں میں غذا بند کر دی گئی ہے۔ دواؤں کا بھی کچھ حصہ مفت ملنے لگا۔ سنتے ہیں کہ سرکاری دواخانوں کو صنعتوں میں شمار کیا جائے گا۔ ان صنعتوں میں مریضوں کی صحت تیار کی جائے گی۔ پیداوار پر اکسائز ڈیوٹی اور سیلس ٹیکس عائد ہوگا۔ ڈاکٹروں اور دیگر ملازمین کو بونس بھی ملے گا۔ مریض اپنے آپ کو ٹھیک کروا کر بل ادا کریں گے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا "چلو اچھا ہی ہوا۔ اب ہمارے ریٹائرنے کے بعد ہمیں سوچنا نہیں پڑے گا کہ مفت علاج کروائیں یا خانگی دواخانوں میں پیسے سے صحت کے دام لگائیں۔ ہر دو جگہ صحت کو خریدنا پڑے گا اور جو اصحاب علاج کی قیمت چکانے کی سکت نہیں رکھتے۔ بہتر ہے کہ وہ بیمار ہی نہ پڑیں۔

ہمارے شہر کے سرکاری دواخانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ان میں کام کرنے والے ہڑتال کرتے ملازمین اتنے حساس ہوتے ہیں کہ مریض تکلیف کے باعث صبر کا دامن چھوڑ کر اونچی آواز میں کچھ کہدے تو ہڑتال کر دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اور نرسس آپس میں لڑ پڑیں تو ہڑتال۔ مریض کے دوست احباب کچھ کہدیں تو سڑکوں پر ملازمین کا نکلنا ہے۔ پولیس بلوائی جاتی ہے۔ خاطی لوگوں کو گرفتار کرنے تک ہڑتال ہوتی ہے۔ تنخواہ بڑھانے، دیگر الاؤنس وغیرہ کے لیے ہڑتال تو ہر کوئی کرتا ہے اس بنیادی حق کا استفادہ دواخانے والے بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ڈاکٹروں نے ۱۹۸۲ء میں طویل ترین ۷۰ دن کی ہڑتال کی تھی جو ایک ریکارڈ ہے۔ شاید آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ہمارے شہر میں موت کی اہم وجوہات میں ایک وجہ " دواخانوں میں ہڑتال بھی ہے" تاہم وقتاً فوقتاً اور چھوٹی موٹی باتوں پر ہڑتال سے اب دواخانے والے مریض بیزار رہنے لگے ہیں۔ اسی لیے آج کل بات کو آگے بڑھانے اور ہڑتال پر جانے کے بجائے وہیں آپس میں ہاتھا پائی کر کے معاملہ کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے۔ مریض یا اس کے تیمارداروں کو غصہ آنے پر وہ دواخانے والوں پر ایک دو گھونسے رکھدیتے ہیں جوابی فرض ہے کہہ کر حسب مقدور پٹائی کرتے ہیں۔ یوں معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔

علاج معالجہ کی تصویر کا دوسرا رخ خانگی دواخانے ہیں۔ طب آج کے دور میں مقدس پیشے کے حدود سے نکل کر بزنس بنتا جا رہا ہے۔ بیمار صحت کے گاہک بن کر ڈاکٹر اور دواخانے چلاتے ہیں۔ بزنس کے اصول پر گاہک کی تشفی کا مکمل خیال رکھا جاتا ہے۔ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد صحت کا بل پیش ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر کے معائنہ کی فیس، نرس کی خدمات کے دام، کمرے اور کمرے میں موجود فرنیچر کا کرایہ، دواؤں کی قیمت میں لائٹ اور نل کا بل ادا کرنا ہے کتنا کچھ شامل ہوتا ہے ہمارے خیال میں صحت دواؤں کے استعمال سے زائد بل چکانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اچھے بزنس مین کی طرح خانگی دواخانے بھی نفع کا بزنس کرتے ہیں۔ انھیں امراض کا علاج کرتے ہوئے جلد ہی صفائی امید ہوتی ہے۔ قریب الختم مریضوں کا علاج کر کے نام کی بدنامی اور بل پر جھگڑا نہیں چاہتے۔

ہم وطنوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ صحت مند رہتے بلکہ زندہ رہنے کے لیے ہمیشہ ایک خطیر رقم جمع رکھیں۔ کہہ نہیں سکتے کہ کب بیمار پڑیں۔ ہم نے ایک ڈاکٹر کو کہتے سنا تھا کہ گاہک اور بیمار کا بھروسہ نہیں نہ جانے کب آئے۔

جہاں قدر چغتائی (بھوپال)

جنازے کے پیچھے

ہم میں سے کسی سے بھی کبھی ایسی حرکت سرزد ہوسکتی ہے۔ جو سخت شرمندگی کا باعث ہوسکتی ہے۔ غلطی بہرصورت انسانی فطرت میں داخل ہے۔ ارسطوئے وقت بھی کبھی ایسی بھول کرسکتا ہے کہ شیخ چلی کو بھی ہنسی آجائے۔ ایک دن کی بات ہے کہ ہمارے ایک قریبی عزیز کا انتقال ہوگیا وہ ہمارے بزرگ تھے اور ہم بھی بہت عقیدت مندی کے ساتھ اُن سے تعلقات نباہتے چلے آرہے تھے۔ صبح کے نکلے شام کو گھر پہنچتے ہی یہ بُری خبر ہم کو ملی۔ پہلے تو یقین نہ آیا کہ خبر سچی ہے۔ ایک دن پہلے تک وہ بھلے چنگے تھے۔ ذرا کے ذرا میں یہ کیا ہوگیا پھر کسی نے کہا شرکت کرنا ہو تو جلد جایئے جنازہ اُٹھنے والا ہے۔ ہمارے سماج میں مرنے کے بعد آدمی کی قدر زیادہ ہوتی ہے بھوک اگرچہ زیادہ لگ رہی تھی کیونکہ سویرے ایک بسکٹ ایک چائے پی کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے مگر اب کھانا کھانے کا سوال ہی کہاں تھا۔ ہمیں معلوم تھا اگر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے بغیر پیٹ بھر کھائے ہم سے اٹھا نہ جائے گا۔ اتنی دیر میں جنازہ اٹھ جائے گا۔ ہم تین باتوں میں ہمیشہ سے گھبراتے ہیں۔ شادی کی مبارک باد دینے میں دعوت میں کھانے کی تعریف کرنے میں اور مرنے والوں کے عزیزوں کو سمجھانے بجھانے کے معاملے میں۔ پہلی اور آخری بات تھوڑی بہت نباہ لیجاتے ہیں مگر دعوت میں کھانے کی تعریف والی بات بالکل ہمارے بس کی نہیں۔ یہ بات ہم جانتے ہیں کہ چالیسویں کے کھانے کی تعریف ولیمہ کی دعوت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مگر جو کھانے ان دونوں خوشی و غم کی دعوتوں میں کھلائے جاتے ہیں ان میں ذرا بھی فرق نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص جو دعوتِ طعام دیتا ہے چاہتا ہے کہ کھانے کی تعریف کی جائے۔ اس کا یہ خیال بے جا تو نہیں شاعر محض الفاظ جوڑ کر شعر بناتا ہے سناتا ہے اور ایک ایک لفظ کی داد چاہتا ہے۔ جبکہ یہاں پیٹ بھرنے کا سوال ہوتا ہے ایک ایک لقمہ پر تعریف کی جانی چاہیئے ایسے ملک میں جہاں اپنا پیٹ بھرنا دشوار ہو وہ کتنا عظیم آدمی ہوگا۔ جو دوسروں کا پیٹ بھرے۔ چنانچہ ایک بار ہم تعریف کرنا بھول گئے اور کھانے کے بعد دعوت دینے والے صاحب ہمارے پاس آئے نہایت عاجزی سے بولے "آپ نے کھانا بہت کم کھایا شاید مزیدار نہ تھا" ہم نے گھبرا کر کہا نہیں صاحب ہم نے تو بڑے سے بڑے رئیس کے ذیمہ میں ایسی پرتکلف نعمتیں دسترخوان پر نہیں کھائیں جو آپ نے چالیسویں کے موقع پر سجائی اور کھلائی ہیں۔ خدا مرحوم کو جنت میں جگہ

دے۔ صاحب خانہ کا بس چلتا تو ہم کو مار ہی ڈالتا کیوں کہ وہ دعوت دراصل ولیمہ کی ہی تھی اسی دن ہم کو چالیسویں کی دعوت میں جانا تھا۔ ہاں تو ہم ذکر کر رہے تھے جنازے میں شرکت کا۔ مگر بھوک کی وجہ سے کھانے کا حال زیادہ بیان ہوگیا۔ ہم جنازے میں شرکت کی غرض سے فوراً ہی گھر سے روانہ ہوئے اور مکان پر پہنچے تو جنازہ روانہ ہو چکا تھا۔ جنازہ تو کیا روانہ ہوا ہوگا۔ لوگ جنازہ لے کر روانہ ہو چکے تھے مگر ہم سمجھے کسی نے ہم سے مذاق کیا ہوگا کیونکہ گھر پر عام طور پر جو ہوتا ہے وہی ماحول تھا۔ ہم دستک دینے والے ہی تھے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی نے انگلی کا اشارہ کر کے بتایا کہ سب قبرستان گئے ہیں۔ ابھی ابھی ــــ ہم نے سوچا ابھی ابھی کی بات ہے ذرا ہیں ان جانے والوں سے جا ملیں گے۔ رفتار کو بڑھانا پڑا اور تیزی سے قبرستان کی طرف روانہ ہوئے مرحوم کی باتیں یاد آرہی تھیں اور ہم ہر قدم پہلے قدم سے تیز تر رکھتے تھے مگر آگے بہت کم ہی بڑھتے تھے۔ شاید اس کی وجہ بھوک ہو ــ مرحوم کی وفات کا غم ہو یا دونوں کیفیات کے ایک ساتھ جمع ہوجانے کے باعث ایک قسم کی پریشانی کا عالم ــ شام کا وقت تھا اور ہم جنازے کی تلاش میں بھاگے چلے جارہے تھے۔ ہم جس رفتار سے چل رہے تھے وہ بھاگنے کی تعریف میں آتی ہے۔ گلیوں اور بازاروں کی ناہموار اور بدبودار سڑکوں کو پھاندتے ہوئے۔ خوانچے والوں اور دکانداروں سے غمگین لہجے میں دریافت کرتے ہوئے کہ ان میں سے کسی نے اس سڑک سے کوئی جنازہ تو جاتے نہیں دیکھا کوئی سر ہلا کر جواب دیتا کوئی انگلی اٹھا نا اس پوچھ تاچھ کے دوران ہماری نظر ذرا فاصلہ پر جا کر رکی۔ ایک بھیڑ تھی کہ چلی جارہی تھی ہم سوچنے لگے کتنے لوگ جنازے کے ساتھ جارہے ہیں یا ہم یہاں بھی پیچھے رہ گئے۔ رفتار میں کار کی طرح گیر بڑھا کر مزید اضافہ کیا۔ اور بھول گئے کہ آدمی ہیں کار کی مشین نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح جنازے کی اس بھیڑ کے قریب پہنچ ہی گئے۔ لیکن جنازہ نظر نہیں آیا دونوں پاؤں پر کھڑا ہونے کے بعد بھی نہیں۔ اتنے میں یہ بھیڑ اس سڑک پر مڑنے لگی جو قبرستان نہیں جاتی۔ پھر خیال آیا جگہ جگہ نئی کالونیاں آباد ہو رہی ہیں ماڈرن قبرستان بس گیا ہوگا۔ گھبرا کر ایک آدمی کو پکڑا جو بھیڑ میں پیچھے رہ گیا تھا مگر ہم سے پھر بھی آگے تھا اور پوچھا کہ جنازے کو کہاں لے جارہے ہو۔ "وزیرستان" اس آدمی نے ہم کو ذرا غصہ کے انداز میں جواب دیا۔ "حضرت یہ جنازے کے لوگ نہیں درجہ چہارم کے ملازمین کی زندہ لاشوں کا خاموش جلوس ہے عوامی وزیروں کے بنگلوں کی طرف جارہا ہے۔

ہم بتا نہیں سکتے کہ یہ بات سن کر ہم کو کتنی تکلیف پہنچی کیوں کہ ہم جنازے کا پیچھا کرتے بہت دور چلے گئے تھے اور وہ بھی قبرستان سے مختلف سمت میں ــــ اتفاق دیکھیے کہ اس خاموش جلوس کو بھی آج ہی اور اسی وقت اور اسی جگہ نکلنا تھا۔ بغیر جنازے میں شرکت کئے واپس ہونا ہر اعتبار سے غلط تھا مرحوم کی باتیں اور مہربانیاں ہمیں مجبور کر رہی تھیں۔ لہٰذا پھر سوئے قبرستان روانہ ہوئے پنشن یافتہ عہدیدار کی طرح سورج کا اقتدار کم ہوگیا تھا۔ کرنیں ماند پڑ چلی تھیں اور اس کا چہرہ اس بار زرد ہوگیا تھا جو [illegible] حسین چہرہ منہ دھونے کے بعد پھیکا [illegible] کی طرح ہو [illegible] ہے۔ کالوں کے نقاب [illegible] املی کے درختوں کے سائے بہت لمبے ہو گئے تھے [illegible] کہیں کہیں قبروں پر پڑ رہی تھیں قبرستان کے ایک کونے میں کافی لوگ خاموش کھڑے تھے۔ ہم سوچنے لگے کہ کہیں پھر دھوکا تو نہیں کھا رہے ہیں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس خاموش جلوس کا یہ خاموش جلسہ ہو۔ بس تو جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔ اور واپس جانے والوں کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھتے رہے۔ پھر ہمت کر کے آگے بڑھے۔ گورکن [illegible] مٹی کے ڈھیر کو اونچا کر رہے تھے بھیڑ چھٹ چکی تھی ہم نے مٹی دی قبر پر

فاتحہ پڑھی خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو کسی طرح شرکت تو کرلی مگر ہمیں حیرت اس بات پر تھی کہ مرحوم کے عزیزوں میں سے کوئی بھی نہ تھا نہ بیٹا نہ بھائی نہ داماد نہ دوست ـــــ ہم نے سنا ہے کہ یورپ کے ممالک میں میت کو ٹھیکہ پر اٹھادیا جاتا ہے شاید یہاں بھی وہی طریقہ اپنا لیا گیا ہوگا۔ ہم بھی واپس ہوئے ہم سے ذرا آگے ایک آدمی ایک بچے کا ہاتھ پکڑے قبرستان کی نیم تاریک ماحول کو پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امّی۔ امّی کی سسکتی آواز چند ٹوٹی قبروں کو پار کرتی ہمارے کانوں تک آئی۔ مت رو بیٹا ـــ میں تیرے لیے اس سے اچھی دوسری امّی لادوں گا جو چھوٹی سی ہوگی اور تیرے ساتھ خوب کھیلا کرے گی میں نے بہت پہلے سے تیرے لیے اس کا انتظام کر رکھا ہے۔ بس تو چپ ہوجا میرے بچے ـــ بوڑھے برگد کے درخت کے سائے سے ایک بوڑھی سی آواز تسلی دیتی رہی اور اجالے کی طرح قبرستان میں کہیں دب کر رہ گئی ـــ اب ہم قبرستان سے باہر والی سڑک پر آچکے تھے ـــ ہمارے کان میں امّی امّی کی سسکتی آواز گونج رہی تھی اور یہ آواز بھی کہ مت رو اچھی سی امّی لادوں گا بچے سے ہمدردی ماں کے مرنے پر افسوس کر رہے تھے پاس سے گزرتی کار کے ہارن نے چونکا دیا۔ جس قبر پہ ہم فاتحہ پڑھ کر آرہے تھے وہ تو بچے کی ماں کی تھی۔ تو پھر وہ مرحوم کا جنازہ کہاں گیا؟؟

اب تک ہم اس حالت کو پہنچ چکے تھے کہ دوسرے لوگ ہمیں قبرستان سے گھر لے جائیں۔ اور ایسا ہی ہوا جب ہمیں ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ہم فٹ پاتھ پہ بے ہوش پائے گئے تھے اور اسی عالم میں گھر لائے گئے تھے ـــ لہٰذا ہم یہی کہیں گے کہ ہمیشہ جنازے کے ساتھ ہی چلنا بہترین طریقہ ہے۔ ■■

انوار انصاری (رانچی)

روٹھنا

جس طرح خوشی اور غم، سکھ اور دکھ، ہنسنا اور رونا زندگی کے اہم پہلو ہیں۔ اسی طرح روٹھنا اور منا بھی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں۔ انسان کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آتے ہیں کہ انسان روٹھنے کے لیے مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے مگر روٹھ کر ان ہونی کام بھی پورا کر لیتا ہے۔ روٹھنے سے انسانی دماغ کی ہلکی پھلکی تفریح ہو جاتی ہے۔ سیاسی جماعتیں روٹھنے کے آرٹ سے بخوبی واقف ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو روٹھنے کی وجہ سے ہی دل بدلی کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ اگر آپ کسی پارٹی سے روٹھ جائیں تو آپ کو اس پارٹی کے چھوڑنے کا غم نہ ہوگا کیونکہ دوسری سیاسی جماعتیں باہیں پھیلا کر آپ کو اپنے حلقے میں شامل کرنے کے لیے تیار رہیں گی۔

جس طرح دشمن پر شب خوں مارنا فتح کی ضمانت ہے۔ پیٹھ میں پیچھے سے چھرا مارنا شاندار تفریح ہے۔ جھوٹ کو سچ بنانا ایک عمدہ آرٹ ہے۔ اسی طرح موقع اور بے موقع روٹھ جانا بھی اعلیٰ انسانی خصلت ہے۔

جس طرح مکر، فریب، غیبت، عیاری اور مکاری بے ضرر عمل ہیں اسی طرح روٹھنا بھی ایک بے ضرر عمل ہے۔ روٹھنے والے کو چونکہ نقصان نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ روٹھ روٹھ کر دوسروں کا نقصان کرتا ہے۔

جس طرح فلم کی کامیابی کے لیے بجرا ور وزن سے مبرا گانوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح شادی بیاہ میں شادی کو کامیاب بنانے کے لیے بے موقع روٹھنا بھی ضروری ہے۔ دولھے میاں کی جب کوئی فرمائش پوری نہیں ہوتی تو وہ بھی روٹھ جاتے ہیں اور ان کو منانے کے لیے ساس، سسر، سالے اور سالیاں اور دیگر گھر کے ممبران اور محلے کے لوگ پریشان ہو جاتے ہیں اور فرمائشیں پوری کر کے روٹھے ہوئے دولھے میاں کو منا ہی لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ لالچی اور مکار دولھے یا ان دولھے کے رشتہ دار جہیز کم ملنے کی صورت میں روٹھ جاتے ہیں مگر ایسا روٹھنا کس کام کا۔ جہیز تو سماج کے لیے ایک لعنت ہے اور اس لعنت کو حاصل کرنے کے لیے روٹھنا ایک [illegible] ہے۔

جس طرح طوطا چشم بننے کے لیے انسان کو مشق کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روٹھنے کے لیے بھی انسان کو اچھے اور پر موڈ طاری کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے موقع نکال کر انسان کو روٹھنے کی مشق کرنی چاہیے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر روٹھنے کے مقابلے منعقد کرائے جائیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دنیا کے کئی بڑے ممالک ایک دوسرے سے روٹھ کر امن کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

جس طرح رونا، ہنسنا، گنگنانا انسان کا پیدائشی حق ہے اسی طرح روٹھنا بھی اس کا ازلی حق ہے۔ کبھی انسان بے وقت ہنستا ہے اور بے موت مرتا ہے۔ روٹھنے کے فن کو بچوں اور عورتوں نے خوب ترقی دی ہے۔ بات بات پر روٹھنا اور بات بات پر منانا کوئی بچوں اور صنف نازک سے سیکھے۔!!!

جس طرح الکشن کے زمانے میں خود بخود سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے، قومی اتحاد اور ایکتا کا نعرہ لگنے لگتا ہے۔ اسی طرح تہوار کے موقعوں پر روٹھنے کے عمل میں سرگرمی آجاتی ہے۔ گھر کا ہر فرد کسی نہ کسی بات پر روٹھ کر اپنی بات منوانے کے لیے تلا رہتا ہے۔ بچے تو بچے ہی ٹھہرے۔ ان کی الٹی سیدھی فرمائشوں پر اگر دھیان نہ دیا جائے تو سمجھیے تہوار کے دن قیامت کا منظر سامنے ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے بچوں کی فرمائشیں تو کسی نہ کسی طرح پوری کر دی جاتی ہیں مگر بچوں کے ساتھ بیگم کی فرمائشوں پر خاکسار نے اگر دھیان نہ دیا تو سمجھیے سوا نیزے پر آفتاب آدھمکتا ہے۔ زمین تانبے کی ہو جاتی ہے۔ اور گفتگو میں "لو" کے جھکڑ کی آمد معلوم ہوتی ہے۔ ناچار کمر خم کر کے روٹھی ہوئی بیگم کی فرمائشیں پوری کی جاتی ہیں تاکہ درجۂ حرارت میں کچھ کمی آئے اور موسم اعتدال پر آجائے۔ میں اپنی خیریت اسی میں سمجھتا ہوں کہ بیگم روٹھی نہ رہا کریں بلکہ مسکرا کر میرا خیر مقدم کریں اس لیے اپنی بیگم کو منا کر "بے غم" بنائے رہتا ہوں یعنی

ہاتھوں میں گل لیے ہیں نمائش کے واسطے ہے پوشیدہ اس قبا میں ہے تلوار دیکھنا

بچپن میں اچھی چیزوں کو دیکھ کر دل میں لالچ اور حرص کا آنا تو فطری بات ہے اکثر ایسا ہوا ہے کہ اسکول کے دوستوں کی چیزوں کو میں غور سے دیکھتا اور گھر آکر ان چیزوں کی فرمائشیں کر دیتا۔ جب میری فرمائشوں پر سیدھی طرح دھیان نہ دیا جاتا تو میں گھر کے سبھی افراد سے روٹھ جاتا۔ نہ ہنستا، نہ بولتا، نہ کھاتا، نہ پیتا اور نہ چھکاریں بھرتا۔ گھر میں میری یہ حالت دیکھ کر ابا اور اتی جان پریشان ہو جاتیں اور آخر جیت میری ہوتی۔ یعنی روٹھنے کی بدولت میں وہ خاص چیز حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ بچپن کا یار روٹھنا تو بچپن میں بے حد اچھا لگتا تھا مگر اب یہ حال ہے کہ روٹھنے کا وہی حربہ میرے ننھے منے بچے اب مجھ پر آزما رہے ہیں۔ کوئی انڈا کے لیے روٹھا ہوا ہے تو کوئی T.V. سیٹ کے لیے ضد مچا رہا ہے تو کوئی بے وقت بے موسم سیب کی فرمائشوں پر تان سین کا راگ الاپنے میں مشغول ہے۔ غرض کہ اب بچے وقت بے وقت روٹھ کر میری زندگی اجیرن کیے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی قدرت بھی انسان سے روٹھ جاتی ہے۔ موسم میں بے وقت تبدیلی آجاتی ہے۔ وقت پر بارش نہیں ہوتی ہے۔ ہر طرف ہاہا کار مچ جاتا ہے۔ بارش کے لیے اندر دیوتا کی پوجا ہونے لگتی ہے

اگر غور سے دیکھا جائے تو زندگی کے ہر پل میں انسان کو روٹھنے سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ گویا روٹھنا زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ روٹھنے کو اگر زندگی سے خارج کر دیا جائے تو زندگی بے مقصد اور سپاٹ معلوم ہوگی۔ روٹھنے سے زندگی میں اتار چڑھاؤ آتا ہے۔ یوں بھی سیدھی اور سپاٹ زندگی کس کام کی جب زندگی میں نشیب و فراز نہ ہو، خوشی اور غم نہ ہو، بہار اور خزاں نہ ہو۔ اس لیے میری دلی خواہش ہے کہ ہر انسان روٹھنے کو اپنا لے تاکہ زندگی حسین اور دلکش ہو جائے اور زندگی میں بہار آجائے۔

●●

تصوّر

(ایک مدت بعد وطن لوٹتے ہوئے)

جواں ہو کر وہ قد میں ڈھائی میٹر ہو گئے ہوں گے
سیہ تو تھے ہی پہلے اب سیہ تر ہو گئے ہوں گے

کئی عاشق گلی میں ان کی چکر کاٹتے ہوں گے
کئی عشاق کے سیکل تو پنچر ہو گئے ہوں گے

خدا جانے کہ ان کے باپ کی حالت ہے اب کیسی
شرابی سے وہ اب مٹکے کے خوگر ہو گئے ہوں گے

بہن اُن کی کئی بچوں کی اماں ہو گئی ہو گی
اور ان کے بھائی اب غنڈوں کے لیڈر ہو گئے ہوں گے

کئی امراء فقیروں کے مماثل ہو گئے ہوں گے
کئی فقراء مقدر کے سکندر ہو گئے ہوں گے

ہمارے گاؤں کے سرپنچ تھے جو دشمن اُردو
یقیناً آج اردو کے منسٹر ہو گئے ہوں گے

جنھوں نے گاؤں کی درگاہ سے چادر چرائی تھی
وہ اب درگاہ کے اصلی مجاور ہو گئے ہوں گے

وہ جن کو عورتوں کے نام سے بھی سخت نفرت تھی
یقیناً آج تابعدار شوہر ہو گئے ہوں گے

وہ بچے جو ہمارے سامنے ننگے پھدکتے تھے
وہی بچے کئی بچوں کے فادر ہو گئے ہوں گے

میاں قیسی بھلے انساں سے شاعر ہو گئے ہوں گے
جھگڑ کر اہل گھر سے بے گھر ہو گئے ہوں گے

قیسی قمر نگری (کرنول)

گرمی میں

شب وصال کا مت پوچھ حال گرمی میں
وبالِ جان ہے دل کا اُبال گرمی میں

نہ گرم باہوں کے حلقے میں لیجیے مجھ کو
کہ دور رہ کے ہوں آسودہ حال گرمی میں

رئیس شہر کا کتا پیئے میاں لسی
غریب کو تو ہے پانی محال گرمی میں

نہیں ہے فین تو زلفوں کی ہی ہوا دیجے
خدارا کیجیے کچھ تو خیال گرمی میں

ہوا بھی صبح سے چلتی ہے تمتمائی ہوئی
ہے آفتاب کا اسپر جلال گرمی میں

کرو نہ فین کی باتیں یہ کہتی ہیں بیگم
مجھے بھی رہتا ہے اس کا ملال گرمی میں

ہے سر پہ چھت نہ کوئی سائبان آنچل کا
غریب بزمی کا پوچھو نہ حال گرمی میں

مجیب الرحمٰن بزمی (راچی)

مراٹھی ۔ جیونت دلوی

اردو ترجمہ : بانو سرتاج

چوری ہوئی ہی نہیں

(ایک درمیانی طبقے کے کلرک کی کھولی کھولی ایک چال کی ہے اس لیے زیادہ نہ کہنا ہی بھلا کھولی کے درمیان میں داخلی دروازہ ہے۔ اور دروازے کی دونوں طرف کھڑکیاں ہیں۔ اسٹیج پر گو ایک ہی کمرہ دکھائی دے رہا ہے مگر دائیں طرف باورچی خانہ بھی ہے۔ وقت آدھی رات کا ہے مگر پردہ اُٹھنے پر اتنی روشنی اسٹیج پر رہے گی جس سے کمرے کی چیزیں دکھائی دے سکیں۔ رات کے وقت روشنی کیوں ہے اس طرح کا سوال اٹھانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ناٹک اگر اندھیرے میں شروع ہوگا تو ناظرین کو دکھائی کیسے دے گا؟ اس لیے تھوڑی بہت روشنی ضروری ہے۔ اس وقت دونوں کھڑکیاں بند ہیں۔ دروازہ بھی بند ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ شاستری بودا، اُن کی پتنی بائی اور فرزند مدھو کہیں باہر گئے ہیں۔ آدھی رات کو کہاں گئے ہوں گے اس طرح کی بحث میں نہ پڑتے ہوئے یہ واضح کر دیں کہ یہ لوگ سینما گئے ہیں۔

پردہ اُٹھتا ہے تو شاستری اور بائی دروازہ کھول کر اندر آتے ہیں اور ہڑبڑا کر لائٹ آن کرتے ہیں کمرے میں تتر بتر پڑے ہوئے سامان کو دیکھ کر دبی آوازوں میں چیختے ہیں)

بائی : ضرور کچھ گڑبڑ ہے ورنہ تالا کھلا کیسے تھا؟

شاستری : تو بھی میں نے سترہ مرتبہ کہا کہ دو دو بار تالا کھینچ کر دیکھ لو، تمہیں دیکھنا نہیں چاہیئے تھا؟

بائی : چار مرتبہ کھینچ کر دیکھا تھا مگر بند تالا بھی توڑ لیا تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟

شاستری : (پیشانی پہ ہاتھ مار کر) اب تالے کو مرنے دو۔ چور کیا کیا لے گئے پہلے وہ دیکھو (قدم آگے بڑھاتے ہی ایک گٹھری سے اٹک کر گر پڑتے ہیں۔ گرتے ہی چور چور چلاتے ہیں)

بائی : (گھبرا کر) کہاں ہے چور؟

شاستری : (جھینپ کر اٹھتے ہیں) نہیں گٹھری ہے۔ میں سمجھا چور ہے۔

بائی : ساری دنیا سے نرالا ہے تمہارا ڈر۔ میں عورت ہو کر نہیں ڈری اور تم مرد جیسے مرد ہو کر چیخنے لگے۔ (عین اُسی وقت ٹیبل پر سے ایک گلاس لڑھکتا ہوا بائی کے اوپر گرتا ہے۔ بائی۔ چور چور چیختی ہوئی کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑتی ہیں)۔

شاستری : (پہلے خود بھی ڈر جاتے ہیں پھر گرا ہوا گلاس دیکھ کر چڑھ جاتے ہیں) یہ کیا بچوں کی طرح چیخنی ہو؟ وہ دیکھو چوہا بھاگا جا رہا ہے۔ چوہے نے گلاس گرایا تو اس میں گھبرانا کیسا؟ فرض کر لو اگر چور بھی ہوتا تو کیا کر لیتا؟! میرے یہاں ہوتے ہوئے کیا کر لیتا؟!

بائی : ابھی بھی چھاتی دھڑک رہی ہے کیا رہا اور کیا گیا یہ بھی اب مجھے سوجھنے والا نہیں۔

شاستری : پہلے الماری کھول کر دیکھو۔

بائی : کھولنا کیا؟ الماری کھلی ہوئی ہی ہے۔

شاستری : (پلنگ کے نیچے دیکھتے ہوئے) دیکھو۔ کچھ گیا کیا —؟

بائی : (الماری کھول کر) اگھا بائی۔ گہنے گئے۔

شاستری : (ایک دم اُٹھ کر) گہنے گئے؟ ہرے رام۔ (نیچے بیٹھ جاتے ہیں)۔

بائی : تمہارا ایسی رہتا ہے۔ میں نے سینما جاتے ہوئے گہنے پہننے چاہے تو تم نے کہا رات کا وقت ہے۔ اُتار کر رکھ دو۔ اب کیا کیا جائے؟

شاستری : (اچانک کچھ یاد آتے ہی خوشی سے اٹھتے ہوئے) یعنی الماری میں کے گہنے گئے۔

بائی : نہیں تو پھر اور کہاں کے؟

شاستری : الماری میں کے گہنے گئے تو جانے دو۔ وہ نقلی تھے۔ لے جانے دو۔ اُلٹے چور ہی پھنسیں گے۔

بائی : پہلے بھگوان کی مورتی کے سامنے لوٹے میں رکھے ہوئے گہنے تو دیکھ لو۔ (شاستری بھاگتے ہوئے اندر جاتے ہیں۔ اِدھر ایک تصویر کے پیچھے سے ایک قفل بند ڈبہ نکال کر بائی نوٹ گننے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ لوٹا لیے ہوئے شاستری آتے ہیں)۔

شاستری : (مسرت سے) ایشور کی کرپا۔ لوٹے تک چوروں کا ہاتھ نہیں گیا۔ سب بھگوان کے سپرد کیا تھا۔ دیکھا اُن کا کمال۔

بائی : اور یہ نوٹ بھی جیسے تھے ویسے ہیں میرے پتا جی کی فوٹو کے پیچھے چھپائے تھے اس لیے رہ گئے۔ میرے پتا جی کا چہرہ کتنا رعب دار ہے۔

شاستری : (غصّے سے) ہاں ہاں۔ تمہارے پتا کے چہرے کو بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے یہ دیکھو کہ کیا کیا چوری گیا؟

بائی : کچھ نہیں گیا۔

شاستری : بس نقلی گہنے گئے ہیں۔

بائی : لو مُردار کھاؤ نقلی گہنے۔ پچیس روپے بھی نہیں ملنے والے۔

شاستری : بلکہ بیچنے جائیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ اب تو تمہیں میری بات پٹی نا۔ کہ میں نے تمہیں نقلی گہنے کیوں لاکر دیئے؟ سمجھیں اب۔ تم کہتی تھیں میں کنجوس ہوں اس لیے نقلی گہنے لایا ہوں۔ پر اب میری ہوشیاری کی قائل ہوئیں کہ نہیں؟

بائی : لیکن میں نے سونے کے گہنے پہننے کیلئے نہیں نکالے۔ کیا یہ میری ہوشیاری نہیں؟

شاستری : ٹھیک ہے۔ دیکھ لی تمہاری ہوشیاری۔ چلو اب کیا کیا گیا اس کی فہرست بنائیں۔

بائی : کچھ گیا ہی نہیں تو۔

شاستری : خاموش رہو۔ بالکل نہ بولو۔ ہم پولس سے کہیں گے کہ دس ہزار کا مال چوری ہوا ہے۔ اس سے کم از کم دو چار ہزار کا مال تو واپس مل ہی جائے گا۔

بائی : مگر مال گیا ہی نہیں تو ملے گا کہاں سے؟

شاستری : تمہیں نہیں معلوم۔ پولس کہیں کے بھی چوروں کو پکڑ لائے گی اور کسی کا مال کسی کو دلوائے گی۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔

(مدھو ٹارچ کی روشنی پھینکتا ہوا آتا ہے۔ بائی کھڑکیاں کھولتی ہیں)

مدھو : کیا ہوا؟ کیا گڑبڑ ہے؟

شاستری : (دبی آواز میں) چوری ہوگئی. چوری.

مدھو : (گھبرا کر) چوری. (یکایک چلاتا ہے) چور. چور. (پڑوس میں رہنے والے انّا اور گنگا بائی بھاگتے ہوئے آتے ہیں)

انّا : کیا گڑبڑ ہے شاستری گوُدا.

مدھو : چور. چور. چور.

(انّا اور گنگا بائی بھاگتے نکلتے ہیں)

شاستری : بھاگئے نہیں انّا. چور بھاگ گئے ہیں.

(انّا واپس آکر دروازے کے پاس کھڑے ہوتے ہیں. گنگا بائی کھڑکی کے پاس ہی کھڑی رہتی ہیں)

انّا : چور گئے نا؟ وہی میں نے کہا. تم تو یا نکل ٹھنڈے ہوگئے.

شاستری : تمہیں کیا لگا چوروں سے لین دین کر رہا ہوں.

انّا : مگر یہ چوری ہوئی کیسے؟

شاستری : (چڑھ کر) چور آئے اور چوری کر گئے.

انّا : (متفق ہوکر) ہاں یہ ممکن ہے. مگر مال کتنے کا گیا؟

شاستری : آٹھ دس ہزار کا.

گنگا : آٹھ دس ہزار کا! اگلیا بائی! یعنی کافی سیونگ تھی آپ کی. بائی تو ہمیشہ کہتی تھیں کہ پیسہ بچتا ہی نہیں.

بائی : نقد نہیں تھے گنگا بائی. گہنے گئے.

شاستری : اور چاندی کے برتن گئے.

انّا : چاندی ہی کے برتن گئے کیا؟ ذرا ایک بار دیکھو.

گنگا : اور کیا؟ اسٹین لیس اسٹیل کے برتن گئے ہونگے.

شاستری : کیا چاندی اور اسٹیل کا فرق ہمیں سمجھتا نہیں انّا؟

انّا : (اپنی دھن میں) آٹھ دس ہزار کا مال گیا یعنی بڑی چوری ہوئی.

شاستری : پھر ہم کہہ کیا رہے ہیں؟

انّا : (پھر اپنے میں مگن) یعنی کافی سیونگ (بچت) تھی. ہاں.

شاستری : (چڑھ کر) سیونگ نہیں. گہنے اور برتن گئے ہیں انّا.

انّا : مگر سیونگ کے بغیر گہنے اور برتن آئیں گے کہاں سے؟ واہ! سیونگ ہو تو ایسی ہو. واہ! واہ! شاستری گوُدا. شاباش. سیونگ ہو تو ایسی.

مدھو : (چڑھ کر) آپ انکم ٹیکس میں کلرک ہیں کمشنر نہیں. یو آر اے کلرک اینڈ ناٹ کمشنر. سمجھے؟ انکم کتنی اور خرچ کتنا. یہ پوچھنا آپ کا کام نہیں.

انّا : (گرم ہوکر) رعب مت دکھا. تو میٹرک پاس ہے. جسٹ نان میٹرک. اور میں. (گنگا بائی کی طرف دیکھ کر) میں اُس وقت کا میٹرک ہوں.

گنگا : یعنی سمجھو کہ بی. اے.

مدھو : مگر ہیں تو کلرک ہی نا. کہ کمشنر ہیں.

انّا : مگر میں ڈرافٹ کرتا ہوں. تیری طرح کاغذات فائل کرنے والا فائلنگ کلرک نہیں ہوں. ڈرافٹ کرتا ہوں میں.

شاستری : (چڑھ کر) ارے! یہ کیا ہے؟ وقت کونسا ہے اور بحث کونسی کر رہے ہو؟

انّا : ارے یہاں چوری ہوئی ہے.

(اس گرما گرم بحث کو سن کر جوشی. چوپڑے وغیرہ آجاتے ہیں)

انّا : میں بھی تو وہی کہہ رہا ہوں کہ یہ چوری ہوئی کیسے؟

جوشی : (آنکھیں ملتے ہوئے) چوری ہوگئی؟ کیا کہہ رہے ہیں)؟

انّا : چوری ہوگئی؟

جوشی : وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ چوری ہوئی کیسے؟

شاستری : (پیشانی پہ ہاتھ مار کر) نصیب میرا. •

جوشی : نصیب ہی کہنا چاہیئے۔ نہیں تو دن ڈھلے چوری ؟

انا : خواب دیکھ رہے کیا جوشی بُووا۔ دن ڈھلے؟ آدھی رات کا وقت ہے۔ آدھی رات کا۔

جوشی : (گڑبڑا کر) کتنے بجے ہیں ؟

شاستری : (پیشانی پر ہاتھ مار کر دھم سے نیچے بیٹھ جاتے ہیں) ہت تیرے کی۔ گھڑی بھی گئی۔

بائی : انّابائی۔ دیوار گھڑی بھی گئی۔

چوپڑے ماسٹر: (سامنے آتے ہوئے) مگر شاستری بُووا کے یہاں گھڑی بھی تھی کیا کبھی ؟

جوشی : وہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔

انا : روزانہ وقت تو ہم سے پوچھتے تھے۔

گنگا : اور وہ بھی آدھے آدھے گھنٹے سے۔

بائی : گھڑی بلانے کے لیے وقت نہیں پوچھا جاتا؟

چوپڑے : مگر آپ کے یہاں گھڑی تھی ہی نہیں شاستری بُووا۔

شاستری : (غصے سے) مدھو۔ تو اس بے کار کی بحث میں نہ پڑ۔ جا کر پولیس میں رپورٹ دے دے۔ (مدھو جاتا ہے)

جوشی : (سر کھجا کر) حیرت ہے ایسے چوری ہوئی کیسے؟

چوپڑے : میں ساڑھے دس بجے لیٹرین گیا تھا۔ تب دروازہ بند تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

بائی : مگر تالا بند تھا کیا ؟

چوپڑے: تالے پر چوروں جیسی نظر کون رکھتا ہے ؟

بائی : ہم لوگ آئے تب بھی دروازہ بند تھا مگر قفل کھلا تھا۔

جوشی : آپ لوگ کیا کر رہے تھے ؟

شاستری: کہہ تو رہا ہوں ہم تینوں سینما گئے تھے۔

چوپڑے : دیکھا اسی لیے مفت کا پاس ملنے پر سنیما نہیں جانا چاہیئے۔

شاستری: مفت کے پاس کہاں کہاں سے آئے ؟ اچھے خاصے ایک روپے پانچ آنے کے تین ٹکٹ خریدے تھے۔

چوپڑے : مدھو تو کہہ رہا تھا کہ پاس ملے ہیں۔

شاستری : مدھو کو عقل نہیں ہے۔

چوپڑے : اپنے بچے کو اس طرح نہیں کہنا چاہیئے۔ اس طرح بچے کی نشوونما رک جاتی ہے۔ بچوں کے دل مرجھا جاتے ہیں۔ بچے تو نازک پھول ہوتے ہیں۔

شاستری: چوپڑے ماسٹر۔ زیادہ شان مت مارو۔ اپنا علم اسکول تک ہی رکھو۔

بائی : پہلے بی ٹی تو ہو جاؤ۔ وہاں دوبار ناپاس۔

چوپڑے : بائی صاحب۔ صرف ایک مضمون میں فیل ہوا ہوں۔ باقی سب مضامین میں فرسٹ کلاس ہے۔

شاستری : ارے ! لیکن یہ کیا ہے ؟ وقت کونسا اور بحث کونسی ؟ چوپڑے ماسٹر یہاں چوری ہوئی ہے چوری۔

جوشی : میں وہی کہہ رہا ہوں۔ انا بالکل پڑوس میں ہیں پھر چوری ہوئی کیسے ؟

انا : میں بھی وہی کہہ رہا ہوں۔ میں بازو والے کمرے میں سو رہا تھا پھر چوری ہوئی کیسے ؟

بائی : بُرا وقت آئے تو پڑوسی بھی کام نہیں آتے۔

گنگا : (ٹھسکار کر) پڑوس میں رہتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کیا کہ تمہارے دروازے پر بیٹھے رہیں۔

چوپڑے : (اچانک) ایک خیال آیا ہے۔

(سب لوگ چوپڑے کی طرف دیکھتے ہیں)

شاستری : ... بھئی۔ جلدی بولیے۔

چوپڑے : کہاں کا ہوگا ؟

شاستری : یہ اسکول میں بچوں سے پوچھو۔

چوپڑے : (سوچتے ہوئے) جس نے تمہیں سینما کے پاس دیئے اس نے تو نہیں کی چوری۔

جوشی : ممکن ہے۔ نہیں تو کسی اجنبی چور کو کیسے پتہ

علیا کر میں اسی وقت تم لوگ گھر پر نہیں ہو۔

شاستری : (غور کرتے ہوئے) ممکن ہے۔ ممکن ہے۔ ہوگا۔ ہوگا۔

بائی : اسی لیے میں کہہ رہی تھی کہ اُس کرندیکر کے پاس مت لو۔ (سب ہنستے ہیں۔ ایک پُررعب شخصیت والا نوجوان آتا ہے۔)

نوجوان : میں سی۔آئی۔ڈی انسپکٹر ہوں۔ چوری یہاں ہوئی ہے۔؟

شاستری : ہاں صاحب! یہاں ہوئی ہے چوری۔ یہ دیکھئے کمرے کی حالت۔

نوجوان : کیسے ہوئی چوری؟

شاستری : صاحب نصیب اپنا۔ اور کیا؟

جوشی : شاستری بووا۔ تمہاری گرہ دشا بدل گئی ہے کیا؟

شاستری : جی۔ نہیں جی۔ دوسرا اپنی حیدر، گیارہواں کیتو 'یکت' ہے اس وجہ سے مالی فائدہ ہونا چاہیئے۔

نوجوان : پھر تو چوروں کے ہاتھ کچھ لگا ہی نہ ہوگا۔

انّا : وہی میں بھی کہتا ہوں۔ مال گیا ہی نہ ہوگا۔

شاستری : کیسے نہیں گیا؟

بائی : آٹھ دس ہزار کا مال گیا ہے۔

نوجوان : کیا کیا گیا ہے بتایئے۔

بائی : گہنے گئے۔ چاندی کے برتن گئے۔

شاستری : گھڑی گئی۔

چوپڑے : لیکن گھڑی تھی ہی نہیں ان کے یہاں۔

شاستری : کسی کو بتایا نہیں تھا ہم نے۔ گھڑی تھی صاحب ہمارے یہاں۔

بائی : ریڈیو گیا۔

انّا : ریڈیو؟ ان کے یہاں ریڈیو تھا بھی کبھی؟

جوشی : حیدر 'کیتو یکت' ہے نا! مالی فائدہ کرلینے کا ارادہ ہے۔

بائی : تھا ہمارے یہاں ریڈیو۔

جوشی : کبھی آواز نہیں سنی تھی ہم نے۔

بائی : تمہارے گھر کے جھگڑوں میں ریڈیو کی آواز کہاں سے سُنائی دے گی؟

چوپڑے : ہم نے بھی کبھی آواز نہیں سنی!

شاستری : تمہارے آٹھ بچے ہمیں ریڈیو سننے دیں تب نا!

نوجوان : آٹھ بچے کس کے ہیں؟

چوپڑے : (گردن جھکاکر) مجھے ہیں صاحب!

نوجوان : آپ کرتے کیا ہیں؟

چوپڑے : ماسٹر ہوں صاحب۔

بائی : صرف بےکاری کا دھندا۔

نوجوان : کس کا؟

بائی : ان چوپڑے ماسٹر کا۔

چوپڑے : (چڑھ کر) تمہارے یہاں ریڈیو تھا ہی نہیں۔ صاحب میں گواہی دینے کو تیار ہوں۔ ایشور کی سوگندھ کھاکر کہتا ہوں کہ سچ بولوں گا، جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ان کے پاس ریڈیو تھا ہی نہیں۔

بائی : اور اگر ثابت کردیا کہ ریڈیو تھا تو؟

شاستری : کیسے ثابت کروگی؟ چوری جو ہوگیا ہے۔

جوشی : کیسا ریڈیو تھا؟ کس کمپنی کا تھا؟

بائی : سیلون ریڈیو تھا۔ (سب ہنستے ہیں)

شاستری : ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں؟ سیلون ریڈیو نہیں ہوتا کیا؟

نوجوان : اچھا اور کیا گیا؟

شاستری : گیا تو بہت کچھ مگر اسی وقت کیسے سب بتاؤں؟

نوجوان : آپ کے پڑوس میں کون رہتا ہے؟

شاستری : یہ انّا رہتے ہیں۔

نوجوان : انّا کون ہیں؟

انّا : (عاجزی سے) میں صاحب! انکم ٹیکس میں ہوں۔ گورنمنٹ سرونٹ۔

نوجوان : جب چور آئے تب آپ کیا کر رہے تھے؟
انّا : سویا ہوا تھا صاحب۔
نوجوان : آپ سوئے تھے۔ تب آپ کو کیسے پتہ چلا کہ چور آئے تھے۔
انّا : جب ہم جاگ رہے تھے تب چور نہیں آئے تھے اتنا پکا ہے۔ ہم سوئے ہوئے تھے۔
نوجوان : ہم یعنی اور کون ؟
انّا : میری پتنی۔
نوجوان : اُس وقت وہ کیا کر رہی تھی ؟
انّا : میرے سو جانے پر وہ کیا کرے گی ؟ وہ بھی سو گئی تھی۔
نوجوان : (غور کرتے ہوئے) مگر جب یہ سوئے تھے تو چور آئے کیسے ؟
جوشی : انّا کی نیند غضب کی ہے صاحب۔ وہ ایک بار سو گئے تو چور انھیں بھی اڑا کر لے جائیں تو انہیں خبر نہ ہوگی۔
نوجوان : میں نے آپ سے پوچھا تھا ؟
جوشی : غلطی ہوگئی صاحب (رخسار پہ طمانچے مارتا ہوا، توبہ کرتا ہوا پیچھے ہٹتا ہے اور خاموش کھڑا رہ جاتا ہے)۔
نوجوان : انّا۔ نیند میں آپ خراٹے لیتے ہیں ؟
انّا : (عاجزی سے) ہاں صاحب۔ تھوڑے تھوڑے۔ مگر دھیرے دھیرے۔
چوپڑے : دھیرے کیسے ؟ پوری چال گونج جاتی ہے ان کے خراٹوں سے۔ دوسرے سو نہیں سکتے۔
نوجوان : میں نے آپ سے پوچھا ؟
چوپڑے : غلطی ہوئی۔ معاف کیجئے صاحب۔
شاستری : چوپڑے صاحب کو درمیان میں بولنے کی عادت ہی ہے۔
نوجوان : انّا۔ آپ کے خراٹوں کی وجہ سے چوروں کو
ہوئی۔ سمجھے آپ !
انّا : ہاں صاحب۔
نوجوان : آپ کے خراٹوں سے یقینی طور پر چوروں کو پتہ چل گیا کہ آپ سو گئے ہیں۔
جوشی : اتنی سی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔
(نوجوان انھیں گھور کر دیکھتا ہے۔ جوشی بُوَا دانتوں میں انگلی دبا کر خاموش ہو جاتے ہیں)
انّا : کیا کروں صاحب۔ خراٹے لینے کی میری عادت پُرانی ہے۔
نوجوان : عادت توڑیئے۔ ایک چھوٹی سی عادت کی وجہ سے خطرناک چوری ہوگئی۔
کیا ہوا ؟
انّا : (ہاتھ ملتے ہوئے) چوری ہوگئی۔
گنگا : انھوں نے ڈاکٹر کا، وید کا علاج بھی کیا مگر عادت جاتی نہیں۔
انّا : ڈاکٹر کہتے ہیں علاج نہیں ہے اس کا۔ نیند میں منہ کھلا رہ جانے سے آواز نکلتی ہے۔
نوجوان : تب سوتے وقت منہ کھلا نہ رکھا کریں۔
انّا : وہ تو کھلا ہی رہتا ہے صاحب۔
نوجوان : منہ کھلا رہ جائے تو جاگ کر منہ بند کرنا چاہیے اور پھر سونا چاہیے۔ کیا ؟
انّا : ہاں صاحب۔
جوشی : اچھا ہوا۔ اس چوری کی وجہ سے ان کے خراٹوں کی تکلیف تو دور ہوئی۔
نوجوان : (جیب سے گہنے نکالتا ہے) یہ گہنے آپ کے ہیں ؟
بائی : ہاں۔ ہاں، ہمارے ہی ہیں۔
شاستری : (چونک کر) چور مل گیا۔
نوجوان : آپ چونک کیوں گئے ؟
شاستری : نہیں تو۔ نہیں تو۔ ؟

جوان : یہ گہنے آپ کے ہیں؟
استری : ہاں ہمارے ہیں۔
جوان : کتنے تولے کے ہیں؟
استری : (بائی سے) کیوں؟ کتنے تولے کے ہونگے؟
ئی : مجھے کیا پتہ؟ تم ہی لائے تھے۔
استری : مجھے لگتا ہے آٹھ دس ہزار کے ہوں گے۔
جوان : ہوں گے۔
ئی : پندرہ تولے کے بھی ہو سکتے ہیں۔
جوان : یہ سونے کے ہیں؟
استری : ہاں۔ ہاں سو فیصد۔
جوان : یہ نقلی۔ رولڈ گولڈ کے نہیں؟
استری : نہیں بھی ہو سکتے ہیں۔
جوان : نہیں بھی ہو سکتے ہیں۔
استری : ہو بھی سکتے ہیں۔ (سب ہنستے ہیں)
جوان : یہ نقلی گہنے ہیں کیا؟
استری : ہاں۔ ہیں۔
جوان : پھر سونے کے ہیں کیوں کہا؟
استری : (عاجزی سے) غلطی ہو گئی صاحب۔
جوان : غلطی ہوئی کیسے؟
استری : غلطی سے غلطی ہو گئی صاحب۔ (سب ہنستے ہیں)
جوان : ہم! تو آپ کا سیلون ریڈیو گیا۔
استری : ہاں صاحب۔
جوان : آپ کی دیوار گھڑی گئی؟
استری : ہاں صاحب۔
جوان : آپ کے چاندی کے برتن گئے؟
استری : ہاں صاحب۔
جوان : یہ سب سچ ہے؟
استری : (بائی سے) کیوں؟ سچ ہے نا؟
ئی : مجھے کیا پتہ؟

شاستری : پھر کیسے پتہ ہوگا؟
نوجوان : مجھے پتہ ہے۔ ان نقلی گہنوں کے سوا آپ کا کچھ چوری نہیں گیا۔
شاستری : (گھبرا کر) کیسے پتہ چلا؟ چور پکڑا گیا کیا؟
نوجوان : ہاں۔
شاستری : کہاں ہے وہ بدمعاش؟ اُسے یہاں لائیے۔ پھاڑ کر کھا جاتا ہوں۔
نوجوان : میں ہی وہ چور ہوں۔
جوشی : (گھبرا کر) چور۔ چور۔
نوجوان : کون چلایا یہ؟
جوشی : (گھبرا کر) کوئی نہیں۔ میں۔ میں غلطی سے چلایا۔ (سب کھسکنا چاہتے ہیں مگر وہ کمرے کے درمیان ہیں اور چور دروازے پر)۔
نوجوان : کوئی اپنی جگہ سے ہلے گا نہیں۔ لاشیں گرادوں گا۔ یہ لیجئے آپ کے گہنے۔ نقلی گہنے۔ یعنی اب آپ کا کچھ چوری نہیں ہوا۔
شاستری : ہاں صاحب۔
نوجوان : ریڈیو نہیں گیا۔
شاستری : ہاں صاحب۔
نوجوان : دیوار گھڑی چوری نہیں ہوئی۔ چاندی کے برتن چوری نہیں گئے۔
شاستری : ہاں صاحب۔
نوجوان : یعنی کہ چوری ہوئی ہی نہیں۔
شاستری : نہیں نہیں۔ چوری ہوئی ہی نہیں۔
نوجوان : اسی لیے پولیس میں رپورٹ لکھانے کی ضرورت بھی نہیں۔
چوپڑے : مگر مدھو تو پولیس اسٹیشن گیا ہے۔
نوجوان : کس نے اُسے بھیجا؟
شاستری : وہ خود ہی گیا ہے۔
نوجوان : پولیس آئے تو انہیں بتایئے کہ چوری ہوئی ہی نہیں۔

شاستری : ہاں صاحب ۔
نوجوان : اور اگر پولیس کو بتایا کہ چوری ہوئی ہے تو جانتے ہیں کیا ہوگا ؟
شاستری : ہاں صاحب ۔
نوجوان : کیا ہوگا ؟
شاستری : چوپڑے ماسٹر، جواب دیجیے نا ۔
چوپڑے : مجھے سوال پوچھنے کی عادت ہے جواب دینے کی نہیں ۔
نوجوان : لاشیں گرا دوں گا ۔
جوشی : (گھبرا کر) لاشیں ؟
شاستری : ہاں صاحب ۔ ہم پولیس سے نہیں کہیں گے ۔
نوجوان : میں جاتا ہوں ۔ چیخے چلائے تو یاد رکھنا ۔
(چور جاتا ہے ۔ اس کے جاتے ہی شاستری اور باقی دم سے پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ لمحہ بھر کوئی کچھ نہیں بولتا ۔ بس پسینہ پوچھتے ہیں ۔ ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں)
جوشی : (اچانک غصہ سے سرخ ہو کر) حرام خور بدمعاش ۔
شاستری : وہ چور نا ؟
جوشی : نہیں آپ ۔ چوری آپ کے گھر اور لاشیں ہماری ۔
چوپڑے : نہیں تو کیا ؟ چوری کا مال ۔ ۔ ۔
شاستری : کوئی بولے نہیں ۔ وہ سن لے گا ۔ چوری ہوئی ہی نہیں ۔ چوری ہوئی ہی نہیں ۔ (بڑبڑاتے رہتے ہیں)
آتما : ہو گی کیسے ؟ حقیقت میں چوری ہوئی ہی نہیں ۔
چوپڑے : اور کیا ؟ بالکل نہیں ہوئی چوری ؟
جوشی : اور چور بھی کتنا شریف ۔ گہنے واپس کر دیے ۔
شاستری : نقلی تھے اس لیے واپس کیے ۔
گنگا : مگر نقلی گہنے استعمال کیوں کیے جائیں ۔ مفت کا رعب جمانے کو ؟
بائی : تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔
گنگا : اسی لیے ایسی چوری ہوتی ہے ۔

شاستری : بولو نہیں ۔ بولو نہیں ۔ چوری ہوئی ہی نہیں ۔
آتما : منحوس کہیں کا ۔ میرے خراٹوں پر تنقید کر گیا ۔
جوشی : مگر آپ خراٹے لیتے ہی کیوں ہیں !
آتما : چوگنی آواز میں خراٹے لوں گا ۔ کبھی نہیں چھوڑوں گا ۔ جان بوجھ کر خراٹے لوں گا ۔
چوپڑے : وہ چور ہوا تو کیا ہوا ؟ اس کی بتائی ہوئی ترکیب استعمال کر کے تو دیکھو ۔ نیند میں منہ کھلا رہ گیا تو جاگ کر منہ بند کرنا اور پھر سونا ۔ یہی تو ۔ ۔ ۔
آتما : (چڑھ کر) ہرگز نہیں ۔ نیند میں غلطی سے منہ بند ہو گیا تو جاگ کر منہ کھلا رکھوں گا ۔ چھوڑوں گا نہیں ۔ چور تو چور ۔ اوپر سے سینہ زور ۔
شاستری : آتما خدا منہ بند رکھیے اب ۔ نہیں تو وہ پھر سے آجائے گا ۔ چوری ہوئی ہی نہیں ۔ (وہی جملہ دہراتے ہوئے ادھر ادھر ٹہلتا ہے ۔ مدھو اور انسپکٹر آتے ہیں) ۔
بائی : آ گیا مدھو ۔ آ بابا آ ۔ مجھے تیری ہی فکر تھی ۔
انسپکٹر : کہاں ہوئی چوری ؟ کیسے ہوئی ؟
شاستری : چوری ؟ کہاں ؟ نہیں ۔ چوری ہوئی ہی نہیں ۔
انسپکٹر : یعنی ؟
مدھو : ایسا کیا کرتے ہیں بابا ۔ اپنے ہی گھر چوری ہوئی ہے نا ؟
شاستری : نہیں ۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا مدھو نہیں رے ۔ چوری ہوئی ہی نہیں ۔
انسپکٹر : یہ کیا گڑبڑ ہے ؟
شاستری : اس نے سپنا دیکھا ہوگا صاحب ۔
انسپکٹر : پھر تم سب یہاں کیوں جمع ہو ؟
شاستری : یہ مدھو نیند سے اٹھ کر گیا ۔ کہاں گیا ؟ کیا گیا ! کہاں سے گیا ؟ اس کا وچار کر رہے تھے ۔
انسپکٹر : (ہنستے ہوئے) تو یہ بات تھی ۔ تو میں جاتا ہوں ۔
شاستری : معاف کرنا صاحب آپ کو تکلیف ہوئی ۔

بائی : آپ ساتھ تھے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارا لڑکا بل گیا۔

انسپکٹر : ڈیٹس آل رائٹ۔ مگر آئندہ ہوشیاری سے کام لیں۔ سوتے وقت اندر سے تالا لگالیں۔

شاستری : ہاں۔ ہاں صاحب۔ معاف کریں۔ معاف کریں۔

(انسپکٹر جاتا ہے)

مدھو : (بپھر کر) ایسا کیوں کر رہے ہیں بابا آپ؟

شاستری : ارے تو نیند سے اٹھ کر چلا گیا۔

مدھو : ایسا کیوں کہتے ہیں۔ کیا ہم سینما نہیں گئے تھے۔

شاستری : نہیں گئے تھے۔ وہ سب خواب تھا۔

چوپڑے : پاس پر سینما گئے تھے نا۔

مدھو : ہاں۔ بتایئے انہیں

چوپڑے : کرنندی کرنے پاس دیئے تھے نا۔

مدھو : ہاں۔

چوپڑے : پھر ٹھیک ہے۔ وہ سپنا ہی تھا۔ (سب ہنستے ہیں)

مدھو : (بُری طرح چڑھ جاتا ہے) غلط ہے جھوٹ ہے۔ وہ سپنا نہیں تھا۔ یہاں حقیقتاً چوری ہوئی تھی۔ میں نیند میں نہیں تھا۔ میں جاگ رہا تھا میں جاگ رہا تھا۔

شاستری : چپ نہیں۔ چپ نہیں۔

سب مل کر مدھو کو اٹھاتے ہیں اور پلنگ پر لٹا کر کمبل اوڑھا دیتے ہیں۔

بائی : مدھو سو جاؤ میرے بچے۔

شاستری : اس طرح نیند میں سے نہیں اٹھنا چاہیئے۔ یہاں کہاں چوری ہوئی بھلا۔ چوری ہوئی ہی نہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

محمد محمود شریف محمود

جو اُلجھے بال ہوں سر پہ تو اک جنگل بیاباں ہے
اگر ہو جائے یہ گنجا تو پھر ٹینس کا میداں ہے

کبھی چٹیا، کبھی چونڈا، کبھی اک گھونسلا سر پہ
عجب انداز کے فیشن نظر آئیں تو حیراں ہے

کیا میک اپ جو چہرے کا تو بدلا رنگ کچھ ایسا
وہی مکھڑا جو تو آتھا اب اک مہرِ درخشاں ہے

نظر ڈالے کوئی اُس پر کسی میں دم نہیں اتنا
ہے ماہر وہ کراٹے کی بتا اُس کا پہلواں ہے

غزل محمودؔ کہنے سے غزل گانا ہی بہتر ہے
کہ ہے فٹ پاتھ پہ شاعر تو بنگلے میں غزل خواں ہے

○

بچھایا جال فیشن نے کہاں سے اب کہاں تک ہے
احاطہ آجکل اسکا ہر اک ننھے میاں تک ہے

چڑھاتے ہیں بدن پر اب غلافوں کی طرح کپڑے
ہے مشکل اب کھچانا بھی ہوئی تنگی یہاں تک ہے

کڑکتی ہے وہ بجلی سی بپھرتی شیرنی جیسے
یہ گھر والی کا غصہ تو زمیں سے آسماں تک ہے

کبھی سڑکوں پہ دادا تھے مگر جب پڑ گئے ڈھیلے
تو پھر دادا گری اُن کی فقط بچوں کی ماں تک ہے

فٹا فٹ بولتا ہے یہ مقرر جوش والا ہے
مگر محمودؔ جوش اسکا تو بس اسکی زباں تک ہے

غزلیں

"پھلجھڑی"

احمد النساء غزالہ (حیدرآباد)

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجلے مکان میں
ہر سال فیل ہوتی ہوں میں امتحان میں

ابا پتنگ اُڑانے پہ لیتے مری خبر
دوڑی نہ آتیں اماں اگر درمیان میں

گیہوں کا کھیت دیکھ دُعا مانگتی ہوں میں
بھرتا نہیں ہے پیٹ مرا ایک نان میں

آتا ہے بار بار یہ مضمون خیال میں
یکسر اساتذہ ہی نہ ہوں اس جہان میں

احمد یہ سچ ہے جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
دل کی زباں جھلکتی ہے اپنے بیان میں

رفیع احمد (مالیگاؤں)

سُنا ہے قدیم زمانے میں ایک شخص بنام حاتم طائی گذرا ہے جس کے شب وروز لوگوں کے سوالات یعنی فرمائشیں پوری کرنے میں گذرتے تھے۔ یہاں نہ اتنی فرصت ہے نہ دولت۔ جن کو خدا نے دولت اور فرصت دونوں عطا کیے ہیں وہ حاتم کی بجائے قارون بنے پھرتے ہیں۔ فرمائش کرنے والا تو فرمائش کرکے چین کی بانسری بجاتا ہے۔ لیکن فرمائش کرنے والے کے بارہ بج جاتے ہیں۔

"فرمائش" کہنے کو تو ایک چھ حرفی لفظ ہے لیکن اپنے اندر دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلا حرف "ف" ہے۔ فرمائش پوری کرنے کے لیے فرصت چاہیے۔ فرصت کے اوقات ہی میں فرمائشیں پوری کی جاتی ہیں۔ کام کے اوقات میں کس کم کو فرمائش یاد بھی رہتی ہے دوسرا حرف "ر" ہے۔ فرمائش پوری کرنے کے لیے رقم چاہیے۔ فرمائش اور روپے میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فرمائش جتنی بڑی ہوگی رقم اسی قدر تگڑی خرچ ہوگی۔ تیسرا حرف "م" ہے۔ "م" سے مدت مراد ہے۔ فرمائش پوری ہونے میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف ہوتا ہے۔ بڑی فرمائشوں کی تکمیل میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ تاج محل کی تعمیر میں کتنا عرصہ لگا یہ بات ہر خاص وعام جانتا ہے۔ چوتھا حرف "الف" ہے۔ "الف" علامت ہے۔ ارادے کی۔ فرمائش پوری کرنے کے لیے ارادہ کرنا بھی ضروری ہے۔ فرمائش کی تکمیل میں آپ نے ذرا سا تساہل برتا کہ آپ پر غفلت پرستی اور کاہلی کا الزام لگا۔ پانچویں نمبر پر ہمزہ ہے جو الف کا نعم البدل مانا جاتا ہے۔ اس الف سے ہم اجتہاد مراد لیں گے بعض فرمائشوں کی تکمیل بڑی جدوجہد چاہتی ہے۔ خصوصًا زنانہ فرمائشوں کی تکمیل میں آلہ دین کو گھر اور دوکان کے درمیان یا در لوم کے شٹل کی طرح دوڑنا پڑتا ہے۔ "فرمائش" کا آخری حرف "ش" ہے۔ "ش" سے شکریہ اور شکایت دونوں مراد ہیں۔ فرمائش پوری ہونے پر شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور پوری نہ ہونے پر شکایتوں کا طومار باندھ دیا جاتا ہے۔

اس دُنیا میں تین ہٹیں بڑی مشہور ہیں۔ بال ہٹ، تریا ہٹ اور راج ہٹ۔ بچوں کی ضد یا فرمائش بال ہٹ کہلاتی ہے۔ بچہ اگر کسی چیز کے لیے مچل جائے تو اُسے بہلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ دیش کو آزادی کیا ملی یہاں کا بچہ بچہ لیڈر بن بیٹھا۔ اگر آپ نے اپنے بچے سے کھلونا لانے کا وعدہ کیا اور لیڈروں کی طرح بھول بیٹھے تو وہ بچہ آپ کا سیاسی حریف

بن جائے گا۔ وہ آپ کو اسکول نہ جانے کی دھمکی دے گا۔ آپ دفتر جانا چاہیں تو راستہ روکو تحریک شروع کر دے گا۔
اس کا آخری حربہ بھوک ہڑتال ہوگا اور بھوک ہڑتال کے آگے بڑی بڑی حکومتیں گھٹنا ٹیک دیتی ہیں۔ ہماری اور آپ کی
کیا بساط ہے؟ ہاں کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ بچے نے کوئی انہونی فرمائش کی ہو اور آپ نے اس کے بچپن کا فائدہ اٹھاتے
ہوتے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا ہو۔ مثلاً آپ کے پڑوس میں شادی ہے۔ نوشہ کو دیکھ کر آپ کے ننھے میاں مچل گئے کہ
ابا جان میں بھی دولہا بنوں گا۔ آپ تھوڑا پریشان ہو گئے۔ لیکن [illegible] سے کام لیں گے۔ اپنے پڑوسی سے
ایک چھوٹا سا ہار لے کر بچے کے گلے میں ڈال دیں گے۔ بچہ خوش ہو گیا اور آپ کے سر سے بلا ٹل گئی۔

بال ہٹ چھوڑ کر اب تریا ہٹ کی طرف آیئے۔ زنانہ فرمائشیں [illegible] ہوتی ہیں۔ انھیں ٹالنے کی مجال ہم آپ
کیا کسی رستم زماں میں بھی نہیں۔ اگر زنانہ فرمائش کسی وجہ سے پوری نہ ہو سکی یا آپ عجلت میں بھول جاتے ہیں تو اسے یاد دلانے
یا جتانے کا ڈھنگ بڑا اچھوتا ہوتا ہے۔ جس چہرے پہ آپ کو گلاب کے پھول کا گمان ہوتا ہے وہی آج آپ کو گوبھی کا پھول
نظر آئے گا۔ دسترخوان پر جلی روٹیاں آپ کا استقبال کریں گی۔ علاوہ نمک کم اور سالن میں مرچ زیادہ رہے گی۔ بلا وجہ
بچوں کی دھلائی اور برتنوں کی پٹائی ہوگی۔ یہ حرکات کسی جدید افسانے کی علامتیں نہیں۔ جنھیں آپ نہ سمجھتے ہوں۔ آپ
ان اشاروں کو خوب سمجھتے ہیں۔ میں دل میں "جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو" کا وظیفہ
پڑھتے ہوئے "شہر بدر" نہ سہی "گھر بدر" ضرور ہو جاتے ہیں۔ زنانہ فرمائشوں سے اگر ہم نالاں ہیں تو اس کے شکر گذار بھی ہیں۔
اگر زنانہ فرمائشیں نہ ہوتیں تو دنیا تاج محل جیسی حسین و جمیل عمارت سے محروم رہ جاتی۔ بھارت سرکار کو بھی ممتاز محل کا شکر گذار
ہونا چاہیے۔ کیونکہ تاج محل کی بدولت وہ ہر سال لاکھوں روپے کماتی ہے۔

سیاسی دنیا میں فرمائشوں کا نام ہے "مطالبات"۔ "چوری کرو جماری کرو، ہماری مانگ پوری کرو"۔ "روٹی کپڑا
مکان دو ورنہ کرسی چھوڑ دو۔" اس قسم کے فرمائشی نعرے عوام لگاتے ہیں یا یوں کہیے کہ اپوزیشن عوام سے لگواتی ہے جلسہ
جلوس، راستہ روکو بھارت بند، بھوک ہڑتال اور مرن برت وغیرہ مطالبات منوانے کے مختلف طریقے ہیں یہ وہ حیلے
ہیں جن کے ذریعہ اپوزیشن، حکمران پارٹی کی پوزیشن عوام کی نظروں میں گرانا چاہتی ہے۔ لیڈر بھی بڑے گھاگ ہوتے ہیں۔ الکشن
کے موقع پہ ان مطالبات کو پورا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ووٹ لے کر وہ کرسی پہ جا کر ڈٹ جاتے ہیں اور عوام اسی طرح سڑکوں
پر نعرے لگاتے رہ جاتے ہیں۔

ادبی دنیا بھی فرمائشوں سے خالی نہیں۔ خصوصاً ہمارے مشاعرے۔ واہ واہ سبحان اللہ، کیا بات ہے، مکرر ارشاد
فرمایئے، اس قسم کے نعرے مشاعروں میں بلند ہوتے رہتے ہیں اور شعراء کو ایک شعر بار بار پڑھنے کی زحمت دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر
مترنم شعراء شاعر کم اور ریتان سین زیادہ نظر آتے ہیں۔ جس شاعر کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔
وہ کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ مشاعروں کا دوسرا دور تو فرمائشی دور ہی کہلاتا ہے۔ سامعین سے سب سے زیادہ داد بٹورنے والا شاعر سب
سے بڑا شاعر یعنی مشاعرہ لوٹنے والا کہلاتا ہے۔ الغرض دنیا کا ہر انسان کچھ نہ کچھ فرمائش یا خواہش رکھتا ہے۔ اگر اس کی تمام خواہشیں
بھی پوری ہو جائیں تو وہ یہی کہے گا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ؏ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

دو مُلاؤں میں عید کی مُرغی حرام

زندگی کے مختلف شعبوں میں شہر اکولہ کے لوگ مختلف حوالوں سے جانتے ہیں۔ لیکن اب اس شہر کو عیدالفطر کے حوالے سے بھی پہچانا جا رہا ہے کہ امسال اس شہر نے دو دن عیدالفطر منائی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی اس لیے اس شہر کی شہرت، پی جماؤ کی غیبت کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے دہ منہ بکان در کان چاروں طرف پھیل گئی۔ اس شہرت کا کریڈٹ CREDIT یہاں کے مُلّاؤں کو جاتا ہے۔ یہاں کے مُلّا اور ان کے پیرو مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور عیدالفطر کے موقع پر یہ گروہ بندی کھُل کر سامنے آتی ہے۔ عید کا چاند اس گروہ بندی سے پورا پورا لطف اٹھاتا ہے۔ یہ شرارتاً دنیا کے مختلف مقامات پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہے۔ اگر نہیں چمکتا ہے تو اکولہ کے اُفق پر۔ اور بس عید سے متعلق ایک فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ مُلّا لوگ ریڈیو، ٹیلی ویژن کی خبر کے ساتھ خود کو وابستہ کر لیتے اور اتفاق رائے سے ایک ہی دن عید منائی جاتی۔ لیکن پچھلے چند برسوں میں مُلّاؤں کا زور اس قدر بڑھ گیا کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور رویت ہلال کمیٹی کی اطلاع ان کے نزدیک معتبر و مستند نہ رہی۔ عید کا چاند، ان کی انا کا چاند ہو گیا، جسے یہ اپنی مرضی سے زیر اثر مسجد کے اُفق پر طلوع کرنے لگے۔ نتیجتاً اس سال مسلمانانِ اکولہ نے دو مختلف دنوں نو اور دس جون کو نماز عیدالفطر ادا کی۔ چاند رات کو پورا شہر دو مختلف گروہوں میں بٹ گیا۔ ایک گروہ کے علمبردار اعلان کرتے کہ کل عید نہیں ہے۔ روزہ رکھا جائے تو تھوڑی ہی دیر بعد دوسری پارٹی اعلان کراتی کہ خبردار جو کل روزہ رکھا۔ کل تو عید ہے۔ کھانے کھلانے کا خاص الخاص دن۔ روزہ حرام ہے۔ عام آدمی پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں؟

انسان فطرتاً خود غرض ہے۔ بیوپاری ذہن رکھنے والے مسلمانوں نے دوسرے دن کی عید کو بڑی خوش دلی سے "ویل کم" کہا۔ مثلاً درزی خوش تھے کہ چلو دو دن عید ہوگی تو کام نمٹانے کو ایک دن اور ملے گا۔ اور جن لوگوں کو اس مرتبہ عید پر وعدہ، پہنانے کا ارادہ تھا انہیں کپڑے پہنا دیں گے۔ اب وہ اپنے گاہکوں سے کہہ سکتے تھے کہ صاحب ناراضگی کی کیا بات ہے؟ آپ نے کپڑے عید کے لیے سلوائے تھے۔ کل بھی عید ہے۔ یہ کپڑے پہن لیجئے گا۔ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ خشک میوے اور دوسری ضروریات عید بیچنے والے شادماں تھے کہ گاہکوں کی بھیڑ دو دنوں میں بٹ جائے گی۔ ایک ہی دن رش نہیں ہوگا۔ جن کے ہاں آج تک کوئی انتظام نہیں ہو پایا تھا نہیں سکتے کہ کہاں ہو جائے اور

اس کا فائدہ بھی ان کو ملے۔

یہ تو تھا شہر کا حال۔ اب آیئے ہمارے غریب خانے کی طرف۔ پہلی عید یعنی ۹ جون کو ہم بیدار ہوئے تو صبح کے ۸½ بجے تھے۔ بیگم نے کہا "جلدی سے غسل کر کے تیار ہو جایئے۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آج ہی عید ہے۔ ۹½ بجے نماز عید ادا کی جائے گی۔ ہم نے چونک کر پوچھا" آج عید ہے؟ کل رات تو دیر تک اسی لیے جاگتے رہے کہ ملاؤں کا فیصلہ جان لیں کہ آج عید ہے کہ نہیں؟ اتنے میں میاں محمد فاروق سے معلوم ہوا کہ ملاؤں کے فیصلوں کے مطابق آج اور کل دو دن مختلف مساجد میں نماز عیدالفطر ادا کی جائے گی۔ ہم نے بیگم سے کہا "یہ بھی خوب رہی۔ خیر اس وقت، وقت اتنا کم ہے کہ غسل کر کے نماز کے لیے تیار ہونا ممکن نہیں۔ پھر ہم ذہنی طور پر بھی تیار نہیں ہیں اس لیے نماز کل ہی پڑھ لیں گے۔ یوں بھی ایسی نمازیں اللہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوں گی جن کی ادائیگی میں انہماک کی کمی پائی جائے گی۔ اب حالات کی کوکھ سے سوال پیدا ہوا کہ کس دن کی عید صحیح ہے؟ تو اس کا فیصلہ کرنے والے ہم کون؟ یہاں ملاؤں نے فیصلہ کر دیا وہاں اللہ تبارک و تعالیٰ کرے گا۔ اگر خدانخواستہ اس معاملہ میں ہم خطاداروں میں شمار کئے گئے تو اس میں بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اس کا عذاب بھی ملاؤں کے سر جائے گا۔

ہم نے اپنے طور پر طے کر لیا تھا کہ کل کی یعنی دوسرے دن کی عید منائیں گے۔ ہم نے سوچا سسرال میں کونسی عید منائی جا رہی ہے؟ پتہ کرنا چاہیئے اس لیے ہم اپنی سسرال جا پہنچے اور دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ہماری سالی صاحبہ نمودار ہوئیں۔ انھوں نے کہا "السلام علیکم" ہم نے کہا "آپ لوگ آج عید منا رہے ہیں یا کل"؟ انھوں نے کہا "پرسوں" اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ہم نے کہا اللہ آپ کی مراد پوری کرے۔ ویسے اب اکولہ میں یہ بھی ناممکن نہیں رہا کہ کل ملاؤں کا ایک گروہ اپنے علمبرداروں کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہو اور اعلان کر دے کہ "عید آج نہ کل بلکہ پرسوں"۔ اس لفظ پرسوں سے ہمیں حیدرآبادی پرسوں یاد آگیا اور ہم نے سوچا برسوں پہلے عیسائی مذہب پر پادریوں کی جو اجارہ داری تھی۔ کچھ ایسا ہی وقت اکولہ میں مذہب اسلام پر آنے والا ہے۔ ہم نے سالی صاحبہ سے کہا "مذاق مت کیجئے۔ ہم جلدی میں ہیں۔ اس لیے فوراً بتا دیجئے کہ آپ کے ہاں کب عید منائی جا رہی ہے؟ ہمیں سنجیدہ دیکھ کر وہ باز آئیں اور بولیں "ہم لوگ کل عید منا رہے ہیں"۔ ہم نے کہا بہت بہت شکریہ۔ ہم عید کا سلام کرتے کل حاضر ہوں گے۔

دو دن کی عید مسلسل سے بہت سے فائدے اور نقصانات ہوئے ہوں گے۔ ہماری نظر میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ یہ بات کھل گئی کہ اکولہ کے مسلمانوں میں مذہبی معاملات میں بھی زبردست نفاق ہے۔ کسی بھی قوم کو جوڑے رکھنے کا کام مذہب کرتا ہے جس قوم میں مذہبی نفاق پیدا ہو جائے اُسے بکھر کر برباد ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مضمون لکھنے کے لیے ہمیں ایک موضوع عیدی کی طرح ہاتھ لگا۔ ■□

شکیل رضا بنگلوری

شادی رچالو

دلالی کا پیشہ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں معیوب اور غیر مہذب سمجھا جاتا رہا ہو لیکن فی زمانہ اس پیشے کو غیر مہذب اور معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے ایک معزز اور نفع بخش پیشہ مانا جاتا ہے۔

ہمارے استفسار پر ایک دلال صاحب نے دلیل دیتے ہوئے کہا تھا کہ آج دلالی کا پیشہ اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ دلالوں کو دلال نہیں کہا جاتا، بلکہ انہیں سیکرٹ ایجنٹ ڈبل او سیون کہا جاتا ہے۔ وہ آسمان کی بلندیوں پر جا پہنچے ہیں۔ آثار بتاتے ہیں کہ وہ وہاں سے مزید آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اگلی بار ہماری سرکار ان دلالوں کو خلا نوردوں کی جگہ استعمال کرنے لگے تاکہ ستاروں کی سرزمین پر دلالی کی بنیاد رکھ سکیں۔

ہم نے تو اپنے بچپن میں لوگوں کو ہاتھوں، کھیتوں اور مکانوں کی دلالی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن آج گائے بیل اور بکروں کے علاوہ گھوڑوں، گدھوں اور خچروں کے دلال سڑکوں، ہوٹلوں اور پارکوں میں دلالی کرتے ہوئے اور تعلی بیڑیاں پیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ جیسے جیسے انسانوں کی آبادیوں میں اضافہ ہونے لگا، باغ اور کھیت سکڑتے گئے اور دلالوں کی تجارت پھیلتی گئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا آج کل ہر چیز کی دلالی کی جانے لگی ہے اور دلال صاحبان زندگی کے ہر میدان میں گھس پڑے ہیں۔ چاہے وہ تجارت ہو صنعت ہو یا سیاست کا میدان اور پھر آج کل تو صحافت کے علاوہ ادب کے میدان میں بھی دلال صاحبان اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

آپ کو اگر چائے کی پتی خریدنا ہو یا کسی وزارت کی کرسی! کسی پیڑ کی شاخ پر یا کسی بلند و بالا عمارت کی چھت پر کھڑے ہو کر آواز لگائیے ایک چھوڑ ہزار دلال جمع ہو جائیں گے۔ اور وہاں سے جہاں آپ کھڑے ہیں، ہائی جمپ لگانے کے لیے اصرار کریں گے اور آپ جھوٹا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق کود پڑیں گے اور جب آپ کے قدم زمین پر رنجہ ہوں گے تو آپ یقین رکھیے آپ کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ ہاں البتہ آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس ہائی جمپ کے دوران آپ کی بھاری بھرکم جیب غائب ہوگئی! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ ہائی جمپ کے لیے پر تول رہے ہوں گے تو آپ سے پہلے آپ کی جیب جمپ کر جائے۔ دلالوں کی چال میں پھنس چکی ہوگی اور آپ ہائی جمپ کا ارادہ ترک کر کے خودکشی کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ مگر آپ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ یہاں بھی یقیناً خودکشی کے لیے بھی آپ کو کسی دلال کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔ جو آپ کو بتائے گا کہ آپ کے لیے آسان ترین خودکشی

کونسی ہوگی اور آپ کو یہ مشکل ترین مرحلہ کس طرح سر کرنا ہوگا اور پھر وہ آپ کی خدمت میں اتنی ساری ترکیبیں پیش کرے گا کہ آپ کسی ایک ترکیب کے انتخاب میں ناکام ہونے کے بعد کسی اور دلال کا در کھٹکھٹانا شروع کر دیں گے، جس طرح بخدا ہم نے کھٹکھٹایا تھا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مذکورہ بالا ہائی جمپ کا ارادہ ترک کر کے اور خودکشی کی ترکیب کے انتخاب میں ناکام ہونے کے بعد ہم اپنے ایک شاعر دوست کے مشورے پر شہر کے ایک مشہور دلال کی خدمت میں حاضر ہوئے جو خود بھی ایک اچھے شاعر کہلاتے ہیں۔ انھوں نے ہماری روداد ہائی جمپ سماعت کرنے کے بعد کئی ماہ تک ہمیں ہوٹلوں سڑکوں اور پارکوں میں اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں اور ہم بھی صورت میں داد پر داد دیتے رہے آخر کار ایک دن جب گشتی مشاعرہ اختتام کو پہنچا تو آپ نے صدارتی تقریر شروع کی جو سینکڑوں اشعار پر مشتمل تھی۔

بہر حال تقریر کے بعد آپ نے شاعرانہ لہجہ میں فرمایا دیکھیے رضا صاحب —— میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا مسئلہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مسئلہ بڑا آسان مسئلہ ہے بلکہ وہ مسئلہ ہی کیا جو آسان مسئلہ نہ ہو اور پھر جہاں تک مسائل کا سوال ہے زندگی کے نشیب و فراز میں کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی کوئی مسئلہ تو آتا ہی رہتا ہے۔ یہاں تو مسئلہ یہ ہے کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ خیر مسئلہ کیا ہے اس مسئلہ کو جانے دیجیے مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے خودکشی اور آسان ترکیب کے سلسلے میں میری خدمات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ پہلی بات جو آپ سے گوش گذار کرنے جا رہا ہوں وہ یہ کہ میں بڑا عدیم الفرصت شخص ہوں۔ مگر آپ جب آہی گئے ہیں تو آپ کو مایوس لوٹانا نہیں چاہتا مگر آپ کو بھی تھوڑا صبر کرنا پڑے گا کیونکہ صبر کرنا ہی زندگی کی نشانی ہے۔ دیکھیے کتنے صبر آزما مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر ایک دلال پیدا ہوتا ہے اور پھر ایک شاعر کو دلال بننے میں نشیب و فراز عبور کرنا پڑتا ہے۔ خیر جناب عالی اس خیالی شاعری، دلالی ماہری اور ظاہری و باہری معاملات کو چھوڑیے۔ کیونکہ آج کل ہر طرف مکر و فریب کا ایک جال سا پھیل چکا ہے۔ عام انسان تو انسان، مہذب قسم کے شاعروں ادیبوں اور فن کاروں کے اندر کچھ ہوتا ہے اور باہر کچھ ہوتا ہے۔ مگر اس مکر و فریب کے لیے ہم کسی کو قصور وار نہیں ٹھیرا سکتے! کیونکہ ایک شاعر ادیب اور فن کار بھی آخر ایک انسان ہی ہوتا ہے! بہر حال میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کہ ہم خود بھی اس جستجو میں نکلے تھے کہ خودکشی کی آسان ترکیب کیا ہے! کسی نے کہا کہ میاں یہ تو بڑی آسان بات ہے ہم نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ محترم تو وہ بزرگ صاحب نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ اے برخوردار تم بس اتنا کرو، شادی رچالو، تم نے پوچھا تھا کہ محترم لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیجیے کہ شادی کی آسان ترکیب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تھا کہ کسی دوشیزہ سے آنکھ لڑا سکتے ہو! ہم نے مزید سوال کیا کہ آپ تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ کہنے لگے ......

اے میاں نہ صرف ہمارا بلکہ ہمارے دادا مرحوم کا یہ پکا تجربہ ہے جس کی بدولت آج ہم کئی درجن پوتوں اور نواسوں کے مالک ہیں۔ اللہ رکھے !!

اور کسی نے کہا تھا کہ بھائی صاحب آپ کسی [illegible] کے [illegible] تو ہم اس بات [illegible] آئے

کیونکہ شاعر تو ہم تھے ہی! اس لیے ہم نے سوچا کہ صدر کیا چیز ہے ہم تو بلا شرکت غیرے کسی بھی انجمن کے مالک و مختار بن سکتے ہیں۔ لیکن جناب من ہمیں یہاں بھی مایوس ہونا پڑا۔ جانتے ہیں۔ آپ کیوں؟ وہ اس لیے کہ جیسے ہی ہم نے کرسی صدارت سنبھالی! انجمن خود بخود ختم ہو کر رہ گئی اور آج ہم خود ایک انجمن بن گئے ہیں!!

اب ہمارے لیے کیا حکم ہے جناب عالی؟ ہم نے اکتا کر پوچھا تو دلال صاحب نے کہا کہ آپ ہمارے نائب بن جائیے تاکہ ایک اور انجمن کی بنیاد رکھنے میں آسانی ہو سکے۔ کیونکہ کوشش کرنا تو آخر دلالوں کا کام ہی ہے۔

●●

"حلفی شگوفہ"

اقبال ہاشمی

نوٹ : حیدرآباد لٹریری فورم (حلف)[1] کے زیر اہتمام ۱۵ جون ۱۹۸۹ء کو حیدرآباد میں طنز و مزاح پر مبنی ایک محفل منعقد ہوئی تھی ۔ اس محفل کا منظوم پس منظر قارئین "شگوفہ" کے لیے پیش ہے ۔ (ا ۔ ہ)

حلف ہے ایک علامت جدید لہجے کی
حلف کے ذرے بھی سورج پہ بھاری پڑتے ہیں
حلف تو ویسے لگے ہے بہت ہی سنجیدہ
برائے طنز و برائے مزاح اک بیٹھک
مگر غیاث متین[2] نے یہ اہتمام کیا

پلائے تین ہی نثری مزاح کے پیالے
طبیب پیشہ ہیں عابد معز[2] جنہیں کبھی
کبھی مریضوں کو بڑھ کر یہ گدگداتے ہیں
یہ آج آرکٹیکٹوں سے ہیں بہت نالاں
خدا کی لاٹھی میں آواز ہی نہیں ہوتی
مسیح انجم مضمون جس گھڑی گونجا
طبیب جتنے ہیں سب کی بڑی کھنچائی کی

خدا کا ہاتھ خدا جانے کیسا ہے
دکھائے ایسے عروس البلاد کے جلوے[3]
غرض کہ تینوں نے بھرتہ نکال ڈالا ہے

ہے اس کی آہ میں سردی تو واہ میں گرمی
یہ ایک فاصلے سے لیکن بہت جھگڑتے ہیں
بلا کا طنز ہے اس کی رگوں میں پوشیدہ
اسی لیے تو بلائی گئی نہیں اب تک
بسور تو کر ہنسانے کا انتظام کیا

بہک رہے تھے جنہیں پی کے سارے مست
ہمیشہ رہتے ہیں ٹانگوں میں ان کی دو پہیے
ہمارے زخموں پہ نشتر کبھی لگاتے ہیں
نجانے کتنے دلوں سے نکل رہا ہے دھواں
خدا کی لاٹھی کسی آنکھ نے نہیں دیکھی
خدا کی لاٹھی کی آواز کا گمان ہوا
بڑے وثوق سے ان سب کی جگ ہنسائی کی

کوئی کہے کہ وہ پرویز مہدی جیسا ہے
وہاں کی دلیوں کے قصے یہاں دھکے
کہ ہنسنے والوں کو ہنستا نکال ڈالا ہے

---

[1] حلف کے معتمد تنظیمی و ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
[2] ممتاز مزاح نگار (ڈاکٹر) عابد معز نے آرکٹکٹس پر مضمون سنایا جس کے بعد ممتاز طنز نگار مسیح انجم نے ڈاکٹروں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ۔
[3] نامور مزاح نگار پرویز ید اللہ مہدی نے اس محفل میں بمبئی کی لوکل ٹرینوں پر مضمون پیش کیا ۔

پھر اس کے بعد ہوئی شعر و شعر کی پیمائش — کسی نے داد بٹوری کسی نے فہمائش
بڑے سکون سے اقبال ہاشمی کو سنا — بجا ہوا تھا مگر داد کا لب و لہجہ
سنائے بمبولٹے نے چودس میں اپنے افسانے — بہت سے چہرے لگے تھے دہیں پہ شرمانے
غزل کے ساتھ ہی بمباٹ[2] آئے نظموں پر — سبھی نے دیکھا یہاں دھوپ چھاؤں کا منظر
غزل کے بعد ہی طالب[3] نے کر دیا شکوہ — جہاں پہ اردو کا اپنی بٹھا دیا سکہ
وہ جن کے ذمے شگوفہ کی ہے ادارت بھی — سنبھالے بیٹھے ہیں کرسی وہی صدارت کی
جناب صدر مخاطب ہیں سامعین سے — کوئی تو کان سے سنتا ہے اور کوئی دل سے
مسیح انجم و پرویز کی ستائش کی — معز کو کھینچا ذرا سا تو ڈھیل بھی دے دی
سراہا تھوڑا سا اقبال ہاشمی کو مگر — بہت ہی نالاں تھے بمباٹ کی خموشی پہ[4]
فلک پہ شعر کی طالب بٹھائے جاتے ہیں — یہ خوش لباسی پہ اپنی سراہے جاتے ہیں
مزاح و طنز کی بھرپور کی وکالت بھی — کہ بزم بزم بھی تھی اور یہ تھی عدالت بھی

یہ بزم ہاشمی گوشے پہ ہوئی برپا
ابھی بھی ہوتا ہے اس بزم کا بڑا چرچا

۱۔ مسیح انجم ۲۔ صبغۃ اللہ بمباٹ ۳۔ طالب خوندمیری ۴۔ بمباٹ نے پچھلے دنوں شعر کہنے پر کم توجہ دی تھی۔ اشارہ اسی طرف ہے۔

تھپڑ عادل آبادی

٥

میکدے کی دکانوں میں ہڑتال ہوئی جب سے — بیگم کا کلر بھی تو پھیکا نظر آتا ہے
اٹھ بیٹھ کے جلدی توبہ بھی کرو مسٹر — اب ہاتھ میں بیوی کے چمٹا نظر آتا ہے
یہ جنس بدلنے کا چلن ہے وبا جب سے — مجنوں بھی مجھے سچ مچ لیلیٰ نظر آتا ہے
کس کس کو کہوں اندر کس کس کو کروں باہر — ہر چور کی داڑھی میں تنکا نظر آتا ہے
کیا ٹھیک کہ سب عاشق دو دن کو گئے تھپڑ — بازار محبت جو ٹھنڈا نظر آتا ہے

ڈاکٹر طیب انصاری

ظریف اقبال

(تبصرہ)

مصنف: سلیم تمنائی
سید منظور احمد

حضرت سلیم تمنائی اردو کے بزرگ اور معتبر انشاء پردازوں میں سے ایک ہیں۔ ٹیپو سلطان شہید اور اقبال ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اقبال کے ایک شعر پر انہوں نے ایک دلچسپ بحث چھیڑی تھی۔ وہ یادگار رہے۔ اب انجمن ترقی اردو ہند شاخ میسور نے حضرت سلیم تمنائی کی ایک پر لطف اور پر مزاح کتاب "ظریف اقبال" شائع کی ہے جو انھوں نے اپنے نوجوان دوست جناب سید منظور احمد کی رفاقت و تعاون سے ترتیب دی ہے۔

اقبال کی ذات اور شاعری کے کتنے ہی پہلو ہیں جن پر خامہ فرسائی نہیں ہوئی۔ اقبال کی ذات اور شاعری ہمہ پہلو ہے۔ ان پہلوؤں میں سب سے دلچسپ پہلو جو رہا ہے وہ مزاح ہے۔ ان کی مزاحیہ شاعری پر بے شمار مضامین لکھے گئے لیکن سلیم تمنائی اور منظور احمد نے یہ جو لطیفے یکجا کیے ہیں وہ اقبال کی ذاتی اور نجی زندگی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ بقول عطیہ بیگم فیضی میں نے دیکھا کہ اقبال فارسی، عربی اور سنسکرت میں ... رکھتے تھے۔ حاضر جواب، ظریف اور ملنسار تھے۔ گفتگو میں کسی مخاطب کی ذرا سی کمزوری سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور حاضرین پر تابڑ توڑ چوٹیں کرتے چلے جاتے تھے۔"

ظریف اقبال میں اقبال کے مخاطب زیادہ تر سر شہاب الدین ہیں۔ سلیم تمنائی صاحب نے دیگر اکابر کے علاوہ ان سے متعلق لطائف زیادہ جمع کیے ہیں۔ دو ایک لطیفے نقل ہیں۔

○ "میرے یہ عزیز دوست خدا کے وجود کے منکر ہیں۔" نصر اللہ خاں نے اقبال سے کہا — ذرا انہیں سمجھائیے۔"

"جس کو خدا نہ سمجھا سکا۔ اقبال مسکرائے۔ اس کو میں کیا سمجھا سکوں گا؟!"

سر شہاب الدین کی رنگت سیاہ تھی۔ ایک دفعہ وہ سیاہ سوٹ پہن کر اسمبلی میں تشریف لائے۔ علامہ نے ہنس کر فرمایا۔

"چودھری صاحب! آج آپ تو ننگے ہی چلے آئے۔"

مزاح میں تہذیب و شائستگی ہو تو وہ فن بن جاتا ہے ورنہ پھکڑپن۔ ان دنوں مزاح کے نام پر ایسی بھی تحریریں پڑھنے کو مل رہی ہیں جو ہماری روایتی تہذیب اور شائستگی کے منافی ہیں۔ ایسے آدمی کو گدگدا کر تو ہنسا سکتے ہیں مگر ... نہیں!

ظریف اقبال میں کلام اقبال سے مزاحیہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ ظریف اقبال مختصر سی کتاب ہے لیکن اقبال کی ذات کے ایک اہم اور ... پہلو کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہے۔ سرورق خوبصورت ہے اور موضوع کی عکاسی کرتا ہے۔ دس روپے ... نے یہ کتاب صدر انجمن ترقی اردو میسور ... ۲۱ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

دے کے خط ... (مراسلے)

عزیز مکرم سید مصطفیٰ کمال صاحب سلام مسنونہ

حیدرآباد میں آپ سے بہت سرسری اور مختصر ملاقات رہی، سمینار کے بعد بڑی مصروفیتوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہوا، جس میں بیرون حیدرآباد کے سفر بھی شامل ہوگئے۔ چنانچہ کوئی وقت آپ جیسے حضرات سے ملنے کا پھر نہ مل سکا۔ اس کا قلق رہے گا۔

زندہ دلان حیدرآباد کی کارگزاریاں کی کچھ خبریں یہاں تک پہنچتی ہیں اور شگوفہ بھی ایک عرصہ تک کسی وسیلہ سے غالب لائبریری میں پہنچتا تھا۔ ان سے دیرینہ نسبت کے بعد آپ سے ملنا بڑی خوشی کا باعث ہوا تھا۔ آپ کا مرحمت کردہ خاص شمارہ "ہندوستانی مزاح نمبر" مجھے بالواسطہ مل گیا تھا، میں نے یہاں آکر اسے بالاستیعاب دیکھا، دلچسپ اور متنوع کے ساتھ ساتھ آپ حضرات کی سعی نے اسے خاصہ مفید بھی بنا دیا ہے۔ میں آپ کی اس عنایت کو اور آپ سے ملاقات کے کیف کو نہ بھول سکوں گا۔

میں آپ کے دیگر احباب سے بھی ملنے کا خواہاں رہا، مصطفیٰ مجاز صاحب سے بھی دوبارہ نہ ملنے کا مجھے بہت افسوس ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل
استاذ شعبۂ اردو، جامعہ کراچی،

"شگوفہ" کا خصوصی شمارہ اقبال نمبر مل گیا تھا۔ افسوس ہے کہ ذاتی مصروفیات اور بعض مشکلات و تکلیفات کے باعث پیشتر ازیں خط نہ لکھ سکا۔

اقبال پر جو بیسویں صدی کے سربرآوردہ فلسفی، حکیم اور معرکۃ الآرا سنجیدہ سخنور تھے، "شگوفہ" کا خصوصی شمارہ شائع کرنا سچ مچ جوئے شیر لانے

کے مترادف تھا۔ لیکن مدیر مصطفیٰ کمال اور مہمان مدیر مصطفیٰ مجاز کا کمالِ عقلی و ذہنی رنگ لایا اور اقبال کی ہمہ رنگ شخصیت میں طنز و مزاح کے نئے رنگ کی دریافت اور تفصیلی تجزیہ و مطالعہ نے ایسا رنگ جمایا کہ اہلِ نظر واہ واہ کر اٹھے اور اہلِ کمال خوشحال و فارغ البال ہو کر عش عش کرتے گئے۔

تقریباً جملہ تخلیقات نثری و شعری معیاری اور بلند پایہ ہیں۔ اور اس پر طرہ مختلف النوع کارٹون ہیں جو شمارہ کے طنزیہ حسن کے ضامن ہیں۔ شگوفہ کی ایک اور خوبی قابلِ ذکر یہ ہے کہ مدیر کی جانب سے قائم کیے گئے مختلف عنوانات بے حد دل کش اور موزوں ہوتے ہیں اور ادبی و فنی چاشنی کے ساتھ ساتھ اپنے ہمراہ طنز و مزاح کی شوخی و طراری بھی رکھتے ہیں۔ جیسے شمارۂ ہذا کی تخلیقات نثری پر عنوان "اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن" اور منظومات شعری کا عنوان "لڑا دے ممولے کو شہباز سے" بہت ہی موزوں اور دلفریب ہیں۔ آخر الذکر عنوان (جو پیروڈیوں پر ہے) میں طنز و مزاح کے متعدد پہلو نکلتے ہیں جن سے اربابِ ذوقِ سلیم محظوظ و مسحور ہونگے۔ مہمان مدیر اور مدیر کے قلم سے نکلے ہوئے اداریے خوب ہیں۔ لیکن ہر دو اصحاب اقبال کی بھاری بھرکم شخصیت سے مرعوب معلوم ہوتے ہیں۔

مختلف دلچسپ اور پُر مغز مضامین کے درمیان "علامہ اقبال سے معذرت ..." (مشفق خواجہ) "ہم پر احسان جو نہ کرتے" (برق آشیانوی) اور "اقبال سے اکبال تک" (پروفیسر یداللہ مہدی) یہ تین مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کیونکہ ان میں اقبال ہی کا ذکر نہیں بلکہ اقبال کی ذات سے ہٹ کر عام انداز میں طنز و مزاح کی داد دی گئی ہے۔ اس طرح کہ یہ اقبال سے متعلق ہے بھی اور نہیں بھی۔ بہر کیف الغایاں مذکورہ حقائق قارئین کے لیے لمحاتِ فکریہ مہیا کرتے ہیں۔

دلاور فگار اور سید محمد جعفری کی پیروڈیاں بہت پسند
آئیں۔ عام شمولہ پیروڈیوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں
اقبال کے اشعار اور انداز کا اکثر استعمال کیا گیا ہے۔
"شگوفے" اکثر لکھے گئے ہیں لیکن ان میں موضوعات میں
تنوع اور قدرت کا فقدان کھٹکتا ہے۔ دلاور فگار
اور سید محمد جعفری کے ہاں اقبال کا سارنگ و آہنگ کس
قدر مہکتا ہے۔

اس جامع اور بھرپور خصوصی شمارے کی اشاعت
اور پیش کاری پر دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔

سراپا نیاز
راز سنتوکھ سری (چنڈی گڑھ)

محترمی۔ تسلیم!

شگوفہ کا "اقبال نمبر" پیش نظر ہے۔ سب سے پہلے
تو آپ کی کوشش و کاوش کے لیے مبارک باد پیش کرتا
ہوں۔ اقبال نمبر بہت ہی خوب اور طنز و مزاح کی دنیا میں
ایک اچھا اضافہ ہے۔ ابھی میں نے سرسری مطالعہ کیا ہے۔
مضامین اور نظمیں اور پیروڈیاں کافی دل پذیر ہیں۔ ایسا
دستاویز حاصل ہونے پر اگر شکریہ نہ ادا کیا جائے تو
کفران نعمت ہوگا۔

قمر الزماں قمر (رانچی)

محترم و مکرم عالی جناب کمال صاحب۔ سلام مسنون۔

"اقبال نمبر" ملا شکریہ۔ واقعی حیرت بالائے حیرت
ہے ایک تو اقبال جیسے عظیم شاعر پر نمبر نکالنا وہ بھی
آج کے دور میں اور پھر لطف یہ کہ مزاحیہ و طنزیہ ماہنامہ
کے لیے؟؟؟ بہرحال میری طرف سے مبارک باد قبول
فرمایئے اتنا اچھا نمبر نکالنے پر۔

مختار احمد سندیلوی

شگوفہ کا اقبال نمبر واقعی معرکے کی چیز ہے۔
ڈاکٹر علامہ اقبال کے سلسلہ میں مزید معلومات کا اضافہ ہوا۔

سید تبسین، رائے پور (مدھیہ پردیش)

شگوفہ کا اقبال نمبر ملا۔ شعیب کے کارٹون معنی خیز
اور موثر ہیں۔ اس سے اس [illegible] ہو پایا کیسے؟ جس
سے شگوفہ کی ایک کمی بھی پوری ہو جائے گی۔ اقبال کے
مزاحیہ پہلوؤں پر یہ ایک خوبصورت نمبر ہے۔ اور شگوفہ
کی روایات کے مطابق اس نمبر کو بھی ہم یادگار کہہ سکتے
ہیں۔

انعام الحق، (پٹنہ سٹی)

بندہ نواز! آداب۔

"شگوفہ" جون چھپا سی نظر نواز ہوا۔ تخلیقات میں
گم ہو کر میں دنیا سے بے نیاز ہوا۔ مسرت ہوئی، خوشی
اس وقت اور بڑھ گئی جب چھپی ہے نظم مری یہ نمودار
ہوا۔ میں ایک نظم اشاعت کو جلد بھیجوں گا۔ اگر حاضر
کا کیڑا اکرم نواز ہوا۔

نیاز مند
گرگٹ گورکھپوری

عید مبارک ایڈیٹر بھائی
سیوئی، لچھا اور ملائی
ایک جگہ کی کون بتائے
گھوم گھوم کر کھانا بھائی
پانچ عدد بچوں کی شکلیا
لیکر ساتھ میں جانا بھائی
اپنی چھت پہ چاند دیکھے
سب آئے پر وہ نہ آئی
عید کے دن بھی دید نہیں ہے
ہائے کیسی قسمت پائی!
عید منائے کھوبخ تو کیسے
دو لیج ڈاؤن ہے نمبر بھائی۔

مرزا کھونچ، بیتیا

"جنگِ آزادی"

علاقائی عصبیت
کالے دھندے
تشدد
رشوت
فسادات
نفرت
افراط زر
ایجی ٹیشن

AUGUST 1986 **Rs. 4-00**

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

فون آفس: 557716 رہائش: 521064

جنرل منیجر: سمیع جلیل

سرورق: شعیب

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

منیجر اعزازی: فیاض احمد فیضی (بمبئی)

مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

کتابت: محمود سلیم، محمد عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
قیمت فی پرچہ: ۴ روپے
زرِ سالانہ ۴۰ روپے بیرونِ ہند ۱۲۵ روپے
شگوفہ، ۳۱ - بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

نہیں آتی تو یاد (یادِ رفتگاں)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مرا شہر لوگاں سوں (حیدرآباد)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

چوری (منظومات)

کنھیا لال کپور

سب سے بڑا جھوٹ!

امریکہ میں ایک مرتبہ جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہوا۔ انعام اس شخص کو دیا گیا جس نے کہا "ایک کمرہ میں پچاس عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور کمرے میں مکمل خاموشی تھی"۔ یہ شاید اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب عورتیں مردوں سے زیادہ باتیں بنایا کرتی تھیں۔ یا جب وہ باتیں بنانے کے معاملہ میں مفت میں بدنام تھیں۔ آج کل اگر کمرہ میں عورتوں کی بجائے مرد ہوں تو اس قسم کا ہنگامہ برپا ہوگا۔ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے گی۔

ہمیں یاد ہے۔ ایک دفعہ ایک وائس چانسلر پرنسپلوں سے خطاب کر رہے تھے۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا۔ کالجوں میں ڈسپلن کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ہم نے دیکھا وائس چانسلر کی تقریر کے دوران قریب قریب تمام پرنسپل ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں معروف ہیں۔ کوئی کسی سے کہہ رہا ہے۔ "یار! تم تو بالکل گنجے ہوگئے۔ کیا ہماری بھابی اب کچھ زیادہ خاطر و مدارات کرنے لگی ہیں"؛ کوئی اور کسی سے پوچھ رہا تھا بتایئے آپ کے کنھیا کا کیا حال ہے؟ کوئی کسی سے درخواست کر رہا تھا۔ "خدا کے لیے اب تو یہ سوٹ اتار دیجئے پچھلے پانچ سال سے آپ اسے پہن رہے ہیں"۔ کبھی کبھی اس قسم کے فقرے بھی سُنے جا سکتے تھے "یہ وائس چانسلر تو ایک دم بور ہے۔ جب آدمی صحیح انگریزی نہ بول سکتا ہو۔ اسے ہندی میں تقریر کرنی چاہیئے"۔ جب وائس چانسلر نے اپنی تقریر ختم کی اُس نے جل بھُن کر کہا۔ "حضرات! جب پرنسپلوں کی کانفرنس میں ڈسپلن کا یہ حال ہے۔ تو کالجوں میں ڈسپلن کا خدا ہی حافظ ہے"!

ہماری رائے میں یہ نہ صرف جھوٹ بلکہ سفید جھوٹ ہے۔ کہ عورتیں زیادہ باتونی ہوتی ہیں۔ اور باتوں کی جنگ میں مردوں سے بازی لے جاتی ہیں۔ ہمارا تجربہ تو یہ ہے چاہے عورت کتنی چالاک ہو۔ بحث و مباحثہ میں زیادہ تر مرد سے مات کھا جاتی ہے ایک بیوی نے شوہر سے تنگ آکر کہا "آہ! میں بھی کتنی بے وقوف تھی۔ جب میں نے تم سے شادی کی"؟ شوہر نے برجستہ جواب دیا "جانِ من تم واقعی بہت بے وقوف تھیں۔ مگر افسوس مجھے اس وقت اس بات کا علم نہ تھا"۔

کسی بیوی نے شوہر سے پوچھا "کیا تم مجھے چاہتے ہو"؟ شوہر بولا "دل و جان سے"۔

" اگر میں مر جاؤں تو ؟"

" خدا کے لیے ایسا مت کہو "

" فرض کیجئے۔ میرے دل کی حرکت اچانک بند ہو جائے "

" تو میں پاگل ہو جاؤں گا "

" واقعی ؟ "

" تمہارے سر کی قسم "

" دوسری شادی تو نہیں کرو گے " ؟

" اتنا پاگل تھوڑی ہو جاؤں گا۔ کہ دوسری شادی نہ کردوں "

اگر ہندوستان میں جھوٹ بولنے کا مقابلہ کیا جائے تو سب سے بڑے جھوٹ کے کچھ نمونے اس قسم کے ہوں گے :۔

۱۔ ایک اسّی سالہ سیاسی رہنما نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا " حضرات ! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ میں نے آج تک جھوٹ نہیں بولا "

۲۔ دو پنجابی دوست ایک لمبی مدت کے بعد ملے انھوں نے مصافحہ کیا۔ بغلگیر ہوئے۔ ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ اس اثنا میں انھوں نے ایک دوسرے یا کسی اور کو کوئی گالی نہیں دی۔

۳۔ ایک شخص کو یکلخت یاد آیا۔ اُسے ایک ایسے جلسہ میں شرکت کرنا ہے جس میں فلمی دنیا کی نامور ہستیاں مدعو کی گئی ہیں۔ اُس نے بیوی سے کہا۔ پانچ منٹ میں تیار ہو جائیے۔ تاکہ ہم وقت پر پہنچ سکیں۔ بیوی نے دو منٹ میک اپ پر اور دو منٹ لباس تبدیل کرنے پر صرف کیے۔ اور پانچ کی بجائے چار منٹ میں تیار ہو گئی۔

۴۔ لکھنؤ کے رہنے والے دو شخص آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اپنی گفتگو کے دوران انہوں نے ایک بار بھی لفظ " ہم " کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی اس بات کا دعویٰ کیا۔ کہ نفاست اور نزاکت میں اہلِ لکھنؤ کا کوئی جواب نہیں !

۵۔ ایک ہندوستانی شوہر رات گئے گھر لوٹا۔ جب اس کی بیوی نے پوچھا۔ وہ کہاں تھا۔ اس نے کوئی جھوٹا بہانا پیش کرنے کی بجائے صاف صاف اقبال کر لیا۔ کہ وہ اپنی خوبصورت اور نوجوان ٹائپسٹ کے ساتھ فلم دیکھنے گیا تھا۔

۶۔ ایک دفتر میں پانچ کلرک کام کرتے ہیں۔ وہ سب وقت پر دفتر میں آتے ہیں۔ کبھی شکایت نہیں کرتے کہ انھیں دس کلرکوں کا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ کبھی آج کا کام پرسوں پر نہیں چھوڑتے۔ اور کبھی وقت سے پہلے دفتر سے نہیں جاتے۔

۷۔ اردو کے ایک شاعر نے غزل کہی۔ وہ نہ تو سامع کی تلاش میں گھر سے نکلا۔ اور نہ اس نے اپنے مہمان سے کہا " رات ایک غزل ہو گئی تھی " زحمت نہ ہو تو سماعت فرمائیے۔ عرض کیا ہے "

۸۔ دو بنگالی جب آپس میں بات چیت کرتے ہیں کبھی نہیں کہتے۔ کہ بنگال نے زندگی کے ہر شعبہ میں ہندوستان کی رہنمائی کی ہے۔ کلکتہ ہندوستان کا کلچرل دارالخلافہ ہے۔ اور اگر بنگال کو ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ تو باقی صفر رہ جائے گا۔

[" یہ مختصر مضمون روزنامہ ہند سماچار میں شائع ہوا تھا۔ اس کا تراشہ ہمیں کنھیا لال کپور کے ذاتی کاغذات " سے حاصل ہوا] مدیر

یوسف ناظم (بمبئی)

شیرو کا خط جھبو کے نام

بمبئی، پہلی جولائی

جانِ من! جیتے رہو۔ تمہارا بھیجا ہوا تحفہ مل گیا جو میں نے کل فروخت بھی کر دیا۔ اچھی قیمت آئی۔ یوں سمجھو منہ مانگے دام ملے۔ (اس ایئر گرام کی قیمت بھی انہی پیسوں سے ادا کی ہے) تم جانتے ہو یہ مسالے پیسنے کی مشین ہمارے کسی کام کی نہیں تھی۔ ایک تو ہم لوگ سالنوں میں اب مسالے ڈالتے ہی نہیں ہیں۔ (کسی خاتون افسانہ نگار کا ایک آدھ افسانہ ہی پڑھ لیا جائے تو اس میں اتنا مسالہ مل جاتا ہے کہ سب مسالوں کی ہوس جاتی رہتی ہے) اور اگر ہم کسی سالن میں مسالے ڈالتے بھی ہیں تو انھیں پیستے نہیں۔ ہم لوگ خود اتنے پسے ہوئے ہیں کہ کسی پسی ہوئی چیز کی خواہش ہی نہیں رہی۔ اس لیے تمہارا گرائنڈر ایک ایسے گھر میں پہنچ گیا ہے جہاں پہلے ہی سے کئی گرائنڈر موجود تھے۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ ہمارے یہاں باہر کی چیزیں جمع کرنے کے شوقین لوگ بکثرت ہیں خاص طور پر وہ خواتین جو سوشل سروس میں حصہ لیتی ہیں ان چیزوں کی ٹوہ میں رہتی ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب ہمارے گھر پر "سوشل سروس خواتین" کی ایک نشست ہوئی تھی تو کئی چیزیں دیکھنے کو ملی تھیں۔ میں نے تو گھر میں کہہ رکھا ہے اس نشست پر جو وقت اور پیسہ خرچ ہو اس کی زیادہ پرواہ نہ کی جائے اور دو چار ماہ میں ایک میٹنگ ضرور ہمارے گھر پر منعقد ہونی چاہیئے تاکہ معلوم تو ہو کہ فارن میں کیا کیا نئی چیزیں بننے لگی ہیں۔ ہم سے چوری نہ ہو سکے تو کم سے کم ہیرا پھیری تو جاری رہنی چاہیئے۔ پچھلی میٹنگ میں ہمارے گھر کا ڈرائنگ روم بالکل میوزیم نظر آ رہا تھا۔ طرح طرح کی چلتی پھرتی ڈرائنگیں نظر آئیں۔ ایک خاتون کے گلے میں نئی وضع کی گھڑی لٹکی ہوئی تھی۔ جو ہر پندرہ منٹ پر الارم بجا کر اطلاع دیتی تھی کہ ملے میری شاندار مالکن! میں بھی (آپ کی زبان کی طرح) چل رہی ہوں۔ ان خاتون کی ایک ہم جلیس خاتون نے اس گھڑی کی طرف دستِ شوق بڑھانے کی بجائے ناک بھوں چڑھا کر فرمایا تھا جنھیں گہرافشانی فرمائی تھی کہ اونہہ۔ میری فرسٹ کزن نے ایسی ہی ایک گھڑی میرے لیے ہانگ کانگ سے خرید کر بھیجی تھی لیکن میں کہاں اسے لیے گلے میں لٹکائے لٹکائے پھرتی۔ میری یہ جویلری کے ساتھ یہ گھڑی کچھ جچ بھی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے میرا پانی ملازمہ کو دے دیا۔ ان محترمہ کے اس ریمارک پر (ظاہر ہے جو کافی سخت ریمارک تھا اور کسی بھی صنفِ نازک کی محفل میں نہیں کیا جانا چاہیئے تھا) اس دن سوشل سروس ملتوی کرنی پڑی۔ خواتین صرف ویڈیو دیکھتی رہیں۔ (گھڑی کا الارم ہر پندرہ منٹ پر بجتا رہا)

یہ خواتین لنچ پر آئی تھیں۔ ڈنر کھا کر واپس گئیں۔ بیچ میں شام کی چائے سے بھی شوق فرمایا۔ یہ بھی ایک عصرانہ ہی تھا۔ اگلی نشست مسز ملہوترہ کے گھر پر ہے لیکن مسز ملہوترہ، میٹنگ سے ایک یا دو دن پہلے یقیناً بیمار پڑ جائیں گی۔ یہ ان کا ہمیشہ کا دستور ہے۔ خود ہی کہتی ہیں کہ اے ماؤ، بہو بیٹی۔ مرے ہاں میٹنگ کا اعلان مت کیا کرو۔ یہ اعلان مجھے راس نہیں آتا۔ اتفاق یہی ہوتا ہے کہ اگر ان کے گھر ہونے والی میٹنگ کسی اور کے گھر منتقل کر دی جائے تو عین میٹنگ کے دن، ٹھیک ہو جاتی ہیں اور محفل میں ہنسی خوشی حاضر رہتی ہیں کہتی ہیں کل ہی میرے دیور لندن سے آئے اور آتے ہی میری صورت دیکھ کر مجھے کچھ گولیاں دیں۔ کیا اچھی گولیاں ہیں۔ میرے فیملی ڈاکٹر، ایس پی مہتا تو پریشان ہو گئے تھے۔ ان کی دی ہوئی دوا کام ہی نہیں کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتی ہیں کہ ان کے دیور کی عنایت کی ہوئی گولیاں بہت اسٹرانگ ہیں اس لیے ان کے ری ایکشن سے بچنے کے لیے بدرقے کے طور پر ملک شیک (بمعہ پستہ بادام) ضرور پینا چاہیئے۔ یہ سن کر مجبوراً ان کی خدمت میں ملک شیک کا ایک بڑا سا گلاس پیش کرنا پڑتا ہے ورنہ سوشل سروس کے کاموں میں خلل پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے ـــــ

جب تم مسز ملہوترہ سے نہیں ملے۔ یہ تمہارے یہاں سے جانے کے بعد کی پیداوار ہیں۔ (واقعی کاشت کی ہوئی چیز ہیں) یہاں ان کے جتنے بھی واقف کار ہیں۔ واقف کار سے مراد وہ لوگ نہیں جو ان کی کار سے واقف ہیں بلکہ وہ لوگ جو ان کی کارکردگی سے واقف ہیں۔ ان سب کی یہ خواہش بلکہ کوشش ہے کہ انھیں کسی صورت سے یہاں سے اکسپورٹ کر دیا جائے۔ خود مسٹر ملہوترہ کی بھی یہی تمنا ہے۔ مسز ملہوترہ سے کہا گیا ہے لیکن انھیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ سوشل سروس کے میدان میں نام اور عزت کمانے کی خاطر دو چار سال باہر کے ملکوں میں رہنا ضروری ہے کیونکہ عوام تو معمولی کاموں ہی سے مرعوب ہو جاتے ہیں لیکن حکومت صرف اس وقت متاثر ہوتی ہے جب کوئی بیرونی ہاتھ ان کی تائید میں اٹھتا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ فارن ریٹرن ہونے کی وجہ سے موصوفہ کسی یادگار کمیٹی کی صدارت یا نائب صدارت کے لیے موزوں قرار پا جائیں۔ مسز ملہوترہ اس نکتہ پر غور کر رہی ہیں۔ ورنہ عام طور پر وہ کبھی غور کرتی نہیں ہیں بس یہی چاہتی ہیں کہ لوگ انھیں نہ صرف غور سے سنیں بلکہ غور سے دیکھیں بھی۔ مسٹر ملہوترہ ان دونوں محاذوں پر ناکام ثابت ہوئے۔

ہمارے یہاں ان دنوں سوشل سروس ذرا زیادہ ہی ہو رہی ہے اور خاص طور پر خواتین کی نظر عنایت اس موضوع پر زیادہ ہے۔ گھر کے کاموں سے ان کی دلچسپی پہلے ہی صفر تھی اب یہ صفر بھی معدوم ہو گیا ہے۔ اب جہاں بھی عورتیں جمع ہوتی ہیں کسی جھنڈے تلے ہی جمع ہوتی ہیں۔

• میں نے تمہارے دوست سے کہا ہے کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے مجھ سے ضرور ملیں۔ مجھے بھی تو آخر کوئی تحفہ تمہیں بھیجنا چاہیئے اور ایسا تحفہ بھیجنا چاہیئے جو تم فروخت نہ کر سکو۔ (ناس کی ڈبیا یا پان پراگ کا ڈبا کیسا رہیگا)

• بمبئی میں کئی دن سے سکون ہے۔ تھوڑے دن پہلے یہ بند ضرور ہوا تھا لیکن بالاقساط یعنی آج شہر کا ایک ٹکڑا بند ہے تو کل دوسرا ہاں دوسرے شہر ضرور بند ہوتے رہیں۔ لیکن تمہیں ان سے کیا کرنا ہے۔ کچھ دن پہلے آندھرا پردیش بند ہوا تھا اب کھل گیا ہے۔ ہمارے شہر بھی اب "بند قبا" کی طرح ہو گئے ہیں کھلتے ہیں بند ہوتے ہیں اور پھر کھلتے ہیں ـــــ

طوائف الملوکی کے معنی کیا ہیں یہ تو پتہ نہیں لیکن اس لفظ پر ان کا ضرور اثر ہے جو ـــ اب چلتے چلتے دعا دو۔

تمہارا۔ شیرو!

ـــــــــــــ

وجاہت علی سندیلوی

میرا امتحان

کچھ لوگ چاند پر پہنچ گئے، کچھ مریخ کا چکر لگا آئے، کچھ خلاء میں چہل قدمی کر آئے، کچھ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ گئے، کچھ سمندر کی تہہ کی خبر لے آئے، کچھ انٹارٹکا میں جھنڈا لگا آئے وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے ان سب کی ہمت جرأت اور مہم جوئی کی دل کھول کر داد دی ــــ لیکن اب آپ سے کیا چوری ہے ان پر کبھی رشک نہیں آیا اور ان کے کارناموں کو خود دہرانے کا جی ہرگز نہ چاہا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو دل ہی دل میں ہم نے ایسے لوگوں کے ہوش و حواس کو کچھ مشکوک ہی سمجھا جو تھوڑی سی واہ واہ کی خاطر اپنی جان کو جوکھم میں ڈال دیتے ہیں۔ جو حضرات اپنی جان کی بازی لگا کر ہم جیسے انسانوں کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اُن کی جتنی بھی تعریف و تحسین کی جائے کم ہے۔ ہم اکثر نوجوانوں کو ایسے حضرات کی تقلید کرنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب بھی دیتے رہتے ہیں لیکن خود ہم رشک اُن ہیں لوگوں پر کرتے ہیں جو اپنے اعصاب کی صحت اور توازن کے بل بوتے پر نتیجے سے بالکل بے پرواہ ہو کر جو جی میں آتا ہے کر بیٹھتے ہیں اور اندیشۂ سود و زیاں سے ہمیشہ بے نیاز رہتے ہیں۔

مثلاً ہمارے جو ملاقاتی سرکس میں گولے کے مانند توپ سے داغے جاتے ہیں اور پچیس تیس میٹر فضا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے ایک جال میں جا گرتے ہیں ہم اُن کی تعریف بہت کرتے ہیں لیکن ہم رشک کرتے ہیں اپنے دوست لائق صاحب پر جو گھر سے کسی ضروری چیز کی خریداری کے لیے لائے ہوئے سب روپے تاش کی ایک نشست میں ہار جانے کے بعد ہنستے ہوئے واپس جاتے ہیں اور اپنی بیگم صاحبہ کو روپوں کے غائب ہو جانے اور اپنے دیر سے واپس آنے کی کوئی ایسی معقول وجہ بتا کر فوراً اطمینان سے سو جاتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی چیخ اور پکار سے آدھا محلہ دیر تک جاگتا رہتا ہے۔

ہمیں رشک آتا ہے تو اپنے پڑوسی پانڈے جی پر جو نگر پالکا کے چناؤ میں لگاتار دو مرتبہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے ضمانت ضبط کروانے کے بعد بھی بڑے سکونِ قلب اور پُرامید انداز سے تیسری مرتبہ پھر آزاد امیدوار کا اپنا ایک خودساختہ جھنڈا لے کر میدان میں اس شان سے کود پڑے ہیں جیسے اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ ہوا ہی نہیں اور وہ پھر گلی گلی اپنی جیپ پر لاؤڈ اسپیکر سے چلاتے پھر رہے ہیں "جو ہم سے ٹکرائے گا، چورچور ہو جائیگا"۔

سڑک بنوائے گا، شرما جی۔ بلب جلوائے گا، شرما جی۔ مہر لگاؤ شرما جی کی ناک پر" اُن کا انتخابی نشان ناک ہے اور انھیں اس کی بالکل فکر نہیں کہ وہ خود ان کے پوسٹر ہی پر کٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہمیں رشک آتا ہے تو اپنے دوست شاکر علی مسکین پر، جن کو قدرت نے جہاں ایک طرف موٹا تازہ شاعر بنایا ہے وہاں دوسری طرف ستم ظریفی سے اُن کے گلے میں جاپانی گڑیا والی چیں چیں قسم کی آواز بھر دی ہے۔ اس زیادتی کی وجہ سے غزل پڑھتے وقت انہیں نہ صرف غیر معمولی طور سے چیخنا بلکہ حلق کی مدد کے لیے ناک کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اب سامعین مشاعرہ کی اس بدذوقی کو کیا کہیے کہ اِدھر مسکین صاحب مائک پر نغمہ سرائی کے لیے تشریف لاتے ہیں اور اُدھر اُن پر پاگل پن کا شدید ترین دورہ پڑ جاتا ہے اور وہ جامۂ انسانیت کو چاک کر کے کتے، بلی اور بکرے کی بولیاں بولنے لگتے ہیں۔ سامعین کی اس گستاخی اور بدتمیزی پر اُن کو جتنا بھی ملامت کیا جائے کم ہے لیکن حضرت مسکین کو بھی داد نہ دینا ظلم ہوگا کہ وہ سامعین کے اس رویہ کو کسی وعدۂ وصل تک بھول جانے والے محبوب کی طرح بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور ہر ہونے والے مشاعرے میں بلائے جانے کا انتظار کیے بغیر تازہ حجامت بنوا کر چست چوڑی دار پاجامہ اور فوری استری کی ہوئی سیاہ شیروانی پہن کر ڈائس پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ اگر اپنی عاقبت اندیشی سے منتظمینِ مشاعرہ ان کو غزل پڑھنے کا موقع نہیں دیتے ہیں تو وہ باقاعدہ خفا ہو جاتے اور دورانِ مشاعرہ ہی ان کو بے نقط سنانے لگتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہوتا ہے کہ منتظمین کے خلاف مورچہ قائم کرنے میں سامعین بھی حضرت مسکین کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ دونوں ہی کی دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر سامعین کو پہلے سے یہ سُن گُن مل جاتی ہے کہ حضرت مسکین کو دعوتِ سخن نہیں دی جائے گی تو وہ اپنے دل کی لگی دوسرے شاعروں پر بجھانا شروع کر دیتے ہیں اور یہ مثل صادق آ جاتی ہے کہ دھوبی سے زور نہ چلے گدھے کے کان اُمیٹھے۔ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اب اکثر شاعر صاحبان کسی مقامی مشاعرے میں شرکت کرنے سے پہلے منتظمین سے یہ قسم کھلواتے ہیں کہ وہ ان کو اپنا کلام سُنانے کی دعوت دینے سے پہلے حضرت مسکین کو ضرور پڑھوا چکے ہوں گے — غالباً اس خیال سے کہ سامعین کی ہوٹنگ اور شور و غوغا مچانے کی نوک اُن کی باری آنے سے قبل ہی ختم ہو چکی ہوگی۔

ہمیں ان مصنفین پر بالکل رشک نہیں آتا جن کی کتاب تصنیف ہونے سے قبل ہی ناشرین اُن کا گھیراؤ شروع کر دیتے ہیں یا جن کی کتابیں مطبع کی روشنائی خشک ہونے سے پیشتر فروخت ہو جاتی ہیں اور ناظرین یا شائقین اگلے اڈیشن کے لیے پیشگی قیمت جمع کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمیں رشک آتا ہے تو اپنے عزیز حمید اللہ کی ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ پر جو خدا جھوٹ نہ بلوائے آٹھ کتابوں کے بلا شرکت غیرے مصنف ہیں۔ یہ آٹھوں کتابیں انہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر خود اپنے مصارف سے چھپوائی ہیں — شاید ہی کسی کے لیے کسی ادارے سے انہیں جزوی امداد اشکِ بلبل کی طرح ملی ہو۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے انہوں نے کاتبوں کے گھروں کی دھول چھانی، ایک دو سے ہاتھا پائی بھی کی، کاغذ کے تاجروں سے لڑ بھڑ کر اُن کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائی، مطبع والوں کے گھروں کے سامنے بھوک ہڑتال کی۔ مقدمہ اور تعارف لکھنے والوں کے گھروں پر خود جا کر دعوت نامے تقسیم کیے اور صرف اسی رسم میں اتنے روپے صرف کر دیئے کہ جتنے اپنے لڑکے کی دعوتِ ولیمہ میں بھی نہیں کیے تھے — اور پھر ہوا کیا؟ آٹھوں کتابوں کے بنڈل، سوائے ان چند کتابوں کے جو رسمِ اجرا کے موقع پر بطور تبرک تقسیم کی گئی تھیں یا جنھیں

اظہارِ خلوص میں حمید اللہ اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کے سر تھوپ آئے تھے یا جنھیں بغرض تبصرہ چند رسالوں کو بھیجا گیا تھا، ان کے چھوٹے سے گھر میں الماریوں پر، نعمت خانے کے اوپر، چارپائیوں کے نیچے اور مرغی کے ڈربے کے برابر رکھے ہوئے ہیں۔ بچے ان پر اونچا نیچا کھیلتے اور مرغے ان پر کھڑے ہو کر بانگ دیتے ہیں۔

حمید اللہ کی ناولوں اور افسانوں کا مرکزی خیال ہمیشہ اصلاحی ہوتا ہے۔ وہ اصلاح کے لیے طرح طرح سے عوام اور خواص کو جھنجھوڑتے ہیں۔ کبھی ان کا مذاق اڑاتے ہیں، کبھی انہیں عبرت دلاتے ہیں، کبھی ان پر لعن طعن بھی کر بیٹھتے ہیں اور کبھی زیادہ جوش میں آکر ہیروئن کے ہاتھوں، زیادہ جہیز مانگنے والے ہیرو کا قتل بھی کروا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کی یہ سب تخلیقات عوام تک پہنچ گئی ہوتیں تو اب تک ہمارے سماج کا تھوڑا بہت سدھار تو ضرور ہی ہو گیا ہوتا —— لیکن کاش کہ بنڈلوں میں بند ان گونگی کتابوں سے بیچارے حمید اللہ ہی کی کچھ اصلاح ہو جاتی۔

آج سویرے منہ اندھیرے ہوا خوری کے واسطے جانے کے لیے جیسے ہی اپنے مکان کا صدر دروازہ کھولا، حمید اللہ کو اپنا منتظر پایا۔ پوچھا "کیسے؟ خیریت؟" اس نے بغل سے نکال کر ایک کتاب کا مسودہ میرے ہاتھوں میں رکھ دیا "آپ کو میری اس نئی کتاب کا مقدمہ لکھنا ہے۔" میرا منہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "اچھا تم اپنی نئی کتاب شائع کرانا چاہتے ہو؟ جی میں تو آیا کہ کہہ دوں "تو شیروانی صاحب یہ نوٹوں کے بنڈل کہاں رکھو گے"؟ لیکن اس نے اس کا موقع ہی نہیں دیا "دیکھیے پروفیسر دستگیر نے بڑی شاندار تقریظ لکھی ہے اور علامہ سیف الحق نے دیباچے میں قلم توڑ دیا ہے، مشہور صاحب تعارف اور میرے خاندانی حالات لکھ رہے ہیں۔ اب آپ ایسا چمتکار مقدمہ لکھ دیجیے کہ جی ہاں! بس! سنا ہے کہ آج کل انعام دینے والے ادارے کتاب کے مواد کے بجائے اس کی لکھائی، چھپائی، گٹ اپ اور اس کے مقدموں وغیرہ ہی پر انعام دیتے ہیں۔ بس صاحب اب یہ میرا نہیں آپ کا امتحان ہے۔"

■ ■

اے غمِ دل کیا کروں...

مفلس فاروقی

(روحِ مجاز سے معذرت کے ساتھ)

آپ تو کاروں میں گھومیں اور میں پیدل چلوں　　آپ بریانی اڑائیں اور میں بھوکا رہوں
بے بسی کا اپنی کس کے سامنے شکوہ کروں　　روؤں، پیٹوں، چیخوں چلاؤں کہ یونہی چپ رہوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر الیکشن میں برابر چن کے آتے ہیں گدھے　　مسندوں پر بیٹھ کر موجیں اڑاتے ہیں گدھے
ڈگریوں پر میری میرا منہ چڑاتے ہیں گدھے　　دیکھتا ہوں کس مزے سے کھیر کھاتے ہیں گدھے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دیکھتا ہوں چونچ میں ہر زاغ کی انگور ہے　　ہو بہو شکل و شباہت سے جو اک لنگور ہے
ایک پہلو میں پری ہے دوسرے میں حور ہے　　اک مری بیوی کہ جو مثلِ شبِ دیجور ہے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ایک ٹوٹی چارپائی شب گزاروں کس طرح　　ہاتھ پھیلاؤں کدھر ٹانگیں پساروں کس طرح
کس طرح ہنسا کروں کھٹمل کو ماروں کس طرح　　قرض آنکھوں کا پرانا ہے اتاروں کس طرح
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ہاتھ میں جس کے ہے لاٹھی بھینس اس کے پاس ہے　　ساس جو تھی اب بہو ہے، ہر بہو اب ساس ہے
قول کی عظمت نہ وعدے کا کسی کو پاس ہے　　بے حسوں میں کس لیے زندہ مرا احساس ہے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

صبح جنتا، دوپہر شیوسینا، مسلم لیگ شام　　چار دن ان کو نمستے تین دن ان کو سلام
اب سیاست اک مداری کے تماشے کا ہے نام　　ہر گھڑی بدھو بنائے جاتے ہیں جس میں عوام
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

زندگی اب میں ترے جنجال سے بیزار ہوں　　وقت کی اس ٹیڑھی ترچھی چال سے بیزار ہوں
روز و شب سے اور ماہ و سال سے بیزار ہوں　　کس طرح کہہ دوں کہ میں سسرال سے بیزار ہوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ فطرت کو نیا اک موڑ دوں　　طور اپنے مصلحت والے وہ سارے چھوڑ دوں
رشتوں ناطوں کے سبھی بندھن پرانے توڑ دوں　　توڑ دوں ٹانگیں کسی کی سر کسی کا پھوڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
کیا کروں، کیا کروں... اے غمِ دل کیا کروں

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور

اس نوجوان کے گھر سے واپسی پر میرے معدے میں خاصی گڑبڑ تھی، چنانچہ میں نے

ایک حکیم سے ملاقات : راستے میں ایک حکیم کی دکان دیکھی تو اندر داخل ہوگیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک مریض نے بتایا کہ حکیم صاحب ملک کے بہت بڑے طبیب ہیں۔ میں علاج کے لیے کسی ڈاکٹر کی دکان پر بھی جا سکتا تھا لیکن میں نے طبِ مشرق کے کمالات کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، چنانچہ میں نے خود کو یہاں پاکر بہت تھرل (THRILL) محسوس کی۔ حکیم صاحب کے کمرے میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں اور وہ ان کے درمیان میں عینک چہرے پر چڑھائے ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے میری نبض دیکھی اور اس دوران آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر غور و فکر کی گہری لکیریں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنا ہاتھ نبض پر سے اُٹھایا۔ آنکھیں کھولیں اور پوچھا: "عربوں کی طرف سے تیل کا ہتھیار استعمال کرنے سے آپ کی معیشت پر کیا اثر پڑا ہے"؟ میں اس سوال پر بہت سٹپٹایا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ میرے مرض کے بارے میں مجھ سے پوچھیں گے۔ جب میں نے دانستہ طور پر اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو انہوں نے دوسرا ہاتھ دکھانے کو کہا اور ایک بار پھر کچھ دیر کے لیے گہرے غور و فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد اُنہوں نے ہاتھ اٹھالیا۔ عینک اتار کر میز پر رکھی اور میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگے: "کیا انگولا کی صورتِ حال میں تبدیلی کا کوئی امکان ہے"؟ اس بار میں سخت جھنجھلایا اور میں نے بالکل چپ سادھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ روایات کے مطابق دراصل طبِ مشرق سے وابستہ افراد صرف طبیب ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاست دان، سماجی کارکن، شاعر اور ادیب بھی ہوتے ہیں، چنانچہ حکیم صاحب کے ہاں جو ہزاروں کتابیں نظر آ رہی تھیں ان میں سے چند ایک طب کے موضوع پر بھی تھیں۔ باقی کتابیں دیگر فنون سے متعلق تھیں۔ ایک نازک سا فرق یہ بھی معلوم ہوا کہ ان اطباء کے نامور آباء و اجداد اپنے پیشے میں مکمل مہارت اور تمام تر دلچسپی لینے کے بعد کچھ وقت سیاست، معاشرت اور شعر و ادب کے لیے بھی نکال لیتے تھے جبکہ ان کے پیروکار زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرم حصہ لینے کے بعد اگر کچھ وقت بچتا ہے تو وہ طبابت پر صرف کرتے ہیں۔

دو چکلے : جس طرح جائیداد کی خرید و فروخت کے لیے ہمارے ہاں مختلف ایجنسیاں کام کرتی ہیں اسی طرح مشرق میں باقاعدہ ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو جائیداد کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ شادی کے لیے مناسب رشتوں کے ضمن میں اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ ان "دچولوں" کے پاس معاشرے کے تمام طبقوں سے متعلق لوگوں کے نام پتے اور ان کی تصویریں موجود ہوتی ہیں، چنانچہ یہ گاہکوں کو باقاعدہ رجسٹرڈ کرنے کے بعد انہیں لڑکے اور لڑکی کے بارے میں مکمل کوائف مہیا کرتے ہیں اور بوقتِ ضرورت تصویر بھی مہیا کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کچھ ایسے ادارے موجود ہیں، مگر واضح رہے وہ شادی بیاہ سے متعلق نہیں ہیں۔

اخباروں میں اشتہارات : اس کے علاوہ کئی لڑکیوں کے والدین ذاتی طور پر بھی اخبار میں اشتہار دیتے ہیں جس میں دیگر کوائف کے علاوہ لڑکی کی ذاتی جائیداد کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہوتی ہے۔ اس طرح لڑکے کے والدین کی طرف سے جو اشتہارات شائع ہوتے ہیں ان میں ذات پات اور عقیدہ کے تعین کے علاوہ اس امر پر بھی زور دیا گیا ہوتا ہے کہ لڑکا اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا ہے یا یہ کہ وہ کاروبار کا متمنی ہے چنانچہ صرف ایسے حضرات رجوع کریں جو اس سلسلے میں اس کے ساتھ تعاون کر سکتے ہوں۔

سلامی : مجھے یہاں ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ بڑی پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا تاہم میں نے دیکھا کہ کھانے سے قبل لوگ ایک ایک کر کے دولہا کے پاس جاتے تھے اور اسے کچھ روپے پیش کرتے تھے۔ دولہا کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا جو یہ رقم گنتا اور ایک کاپی میں درج کرتا چلا جاتا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی کہ ہر کوئی اپنے کھانے کا بل خود ادا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے "ڈرج رسم" کہا جاتا ہے جبکہ یہاں کے لوگ اسے "سلامی" کہتے ہیں۔

باراتیوں پر سنگ زنی : جس رسم کا میں ذکر کرنے لگا ہوں مجھے وہ خود دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ ایک پاکستانی دوست نے مجھے بتایا کہ یہاں بعض دیہات میں جب لڑکے والے بارات لے کر دلہن کے گھر پہنچتے ہیں تو دلہن کے رشتے دار عورتیں مکان کی چھت پر سے انھیں خوب اور ہر طرح کی گالیاں دیتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ انھیں پتھر بھی مارتی ہیں لیکن دولہا اور باراتی اس کا بُرا نہیں مانتے۔ مجھے یہ رسم اچھی نہیں لگی۔ ہمارے ہاں بھی بعض لوگ شادی کے "انسٹی ٹیوشن" کے خلاف ہیں اور وہ اس امر کو ایک غیر فطری فعل سمجھتے ہیں کہ ایک عورت اپنی تمام عمر ایک مرد کے ساتھ اور ایک مرد اپنی تمام عمر ایک عورت کے ساتھ صرف کر دے، تاہم وہ شادی انسٹی ٹیوشن کے خلاف اپنا نکتۂ نظر اس جارحانہ انداز میں پیش نہیں کرتے جس طرح پنجاب کے ان دیہات میں کیا جاتا ہے۔

دولہا کے ساتھ ہنسی مذاق : لاہور میں جس شادی میں شرکت کا مجھے اتفاق ہوا تھا اس میں ایک رسم میں نے یہ بھی دیکھی کہ شادی کے اگلے روز جب دولہا اپنی دولہن کو اس کے والدین کے گھر لیکر جاتا ہے تو دولہا کی سالیاں اس کے ساتھ بہت ہی مذاق کرتی ہیں۔ مثلاً وہ بغیر فوم کے پلنگ پر صرف چادر بچھا کر دولہا کو اس پر بیٹھنے کے لیے کہتی ہیں اور دولہا لاعلمی کی بنا پر اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ میرے دوست کے ساتھ بھی یہی مذاق کیا گیا تھا اور کل مجھے اس کا خط موصول ہوا ہے جس میں اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک ہسپتال ہی میں ہے۔

جوتی چُرانے کی رسم : اس موقع پر دولہا کی سالیاں اپنے بہنوئی کو جوتیاں اتار کر بیٹھنے پر زور دیتی ہیں چنانچہ جب وہ جوتیاں اتارتا ہے تو موقع پاکر یہ سالیاں جوتی غائب کر دیتی ہیں۔ بعد میں اس جوتی کی واپسی کے لیے دولہا کو منہ مانگی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ جوتی چُرانے کی یہ رسم شادی بیاہ کے علاوہ ہر جمعہ کو مسجدوں کے باہر بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ رسم سالیاں ادا نہیں کرتیں۔ ممکن ہے یہ رسم سالے ادا کرتے ہوں تاہم میں نے اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کی۔

حاضرین کو چھوہارے مارنا : یہاں شادی کے موقع پر ایک رسم یہ بھی ہے کہ نکاح سے فراغت کے بعد دولہا کے کوئی عزیز محفل میں موجود حاضرین کو چھوہارے مارتے ہیں۔ اسے یہاں چھوہارے لٹانا کہا جاتا ہے۔ ایک چھوہارا میری ناک کو بھی لگا جس کے باعث ناک کئی دن تک سوجی رہی۔ چھوہارے کے بارے میں وضاحت کر دوں کہ جب کھجور پڑی پڑی سوکھ جائے تو یہاں کے لوگ اسے چھوہارا کہنے لگتے ہیں۔ نیز یہ کہ چھوہارے کی شکل صرف چھوہارے سے ملتی ہے۔

پیسوں کی بارش : ایک رسم یہ بھی کہ گھوڑے یا کار میں سوار دولہا کے کوئی عزیز چینج سے بھرا ہوا ایک بیگ لے کر بارات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور موقع بہ موقع بیگ میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالتے ہیں اور پھر پوری قوت کے ساتھ اسے دے مارتے ہیں۔ یہ رسم ان بچوں کو خوش کرنے کے لیے نبھائی جاتی ہے جو صرف پیسے لوٹنے کے لیے بارات کے آگے آگے چل رہے ہوتے ہیں، چنانچہ وہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ اگر کسی بارات میں ایسا نہ ہو تو یہ بچے چند قدم ساتھ چلنے کے بعد "اوئے اوئے" کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کا مطلب یہاں باراتیوں کی "ناک کٹ جانا" سمجھا جاتا ہے۔ یہ ناک کٹ جانے کی وضاحت میں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں خود نہیں سمجھ پایا کہ بیٹھے بٹھائے ناک کیسے کٹ سکتی ہے حالانکہ ناک کٹنے کے زیادہ چانسز دھاتی سکے باراتیوں کے منہ پر مارنے میں پوشیدہ ہیں۔ بہرحال پیسے لٹانے کی اس رسم سے بچے اور باراتی سبھی خوش ہوتے ہیں۔ اس فعل کے دوران اگر کسی کو تشویش ہوتی ہے وہ یا تو کسی کار کے مالک کو ہوتی ہے جس کے ونڈ اسکرین ہر بار خطرے میں پڑ جاتی ہے اور یا پھر کار کی عدم موجودگی میں خود گھوڑے کو ہوتی ہے جو متعدد بار دھاتی سکوں کی زد میں آتا ہے۔ اس صورت میں اس کے قریب کھڑے افراد حفظ ما تقدم کے طور پر خود بہ خود ایک دولتی فاصلے پر ہو جاتے ہیں۔

آئینہ دکھانا : یہاں شادی سے پہلے دولہا دلہن نے چونکہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھا ہوتا لہٰذا انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ برتا جاتا ہے دولہا کو عورتوں کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں اسے دلہن کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے۔ یہاں دونوں اگرچہ ساتھ ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں تاہم وہ ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ دلہن نے ایک تو گھونگھٹ نکالا ہے اور دوسرے اس نے گردن جھکائی ہوتی ہے۔ اس موقع پر ان کے پاؤں میں ایک آئینہ لاکر رکھ دیا ہے تاکہ وہ کم از کم ایک دوسرے کی شکل دیکھ سکیں، کیوں کہ انھوں نے تمام عمر ایک دوسرے کے ساتھ گزار ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس آئینے میں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں اور پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ تمام عمر ایک دوسرے کے ساتھ بسر کریں گے۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ رسم ادا کرنے سے قبل بزرگوں نے ان کا

نکاح پڑھا دیا ہوتا ہے ۔

عورت پاؤں کی جوتی؟: میں نے لاہور میں بیشتر لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ پیسہ ہاتھ کی میل اور عورت پاؤں کی جوتی ہے تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ میں نے یہاں لوگوں کی کثیر تعداد کو اس جوتی اور میل کے لیے ذلیل و خوار ہوتے دیکھا ہے ۔ یہ میل تو کچھ لوگوں کے ہاتھ آجاتی ہے مگر بیشتر اس کے لیے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں البتہ شادی کی بدولت جوتی سب کا مقدر بنتی ہے بلکہ کئی ایک تو جوتی کی بجائے جوتیوں کی خواہش کرتے ہیں اور یہ خواہش اس وقت پوری ہوجاتی ہے جب وہ مزید شادیاں کرتے ہیں ۔

سالا اور بہنوئی: عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کے باعث یہاں سالا ایک گھٹیا چیز اور بہنوئی ایک آسمانی چیز سمجھی جاتی ہے تاہم ہر شخص جو یہاں بہنوئی کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے وہ بیشتر صورتوں میں کسی نہ کسی کا سالا بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں ہر شخص کی آدھی زندگی بطور بہنوئی اور آدھی زندگی بطور سالے کے گزرتی ہے ۔ ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہاں داماد کو تو سرآنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے لیکن گھرداماد کے ساتھ بڑا حقارت آمیز سلوک ہوتا ہے ۔ واضح رہے داماد وہ ہوتا ہے جو لڑکی کو بیاہ کر لایا ہوتا ہے اور گھرداماد اسے کہتے ہیں جسے لڑکی بیاہ کر لاتی ہے ۔

گھر کی رانی: میں نے ابھی عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کا ذکر کیا تھا مگر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس قسم کے خیالات صرف ان پڑھ لوگوں میں پائے جاتے ہیں، کیونکہ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ عورت کے متعلق اس قسم کے خیالات نہیں رکھتا وہ اسے گھر کی رانی سمجھتے ہیں اور اسے پوری پوری عزت دیتے ہیں تاہم اس رانی کے فرائض میں جھاڑو دینا، برتن صاف کرنا، پوتڑے دھونا، کھانا پکانا، جھاڑ پونچھ کرنا اور شوہر نیز اس کے ماں باپ بھائی بہن، رشتے دار اور دوستوں کے ناز نخرے اٹھانا ہے ۔ باقی رہے "راجہ" کے فرائض سو وہ سب کچھ کرتا ہے جو راجے مہاراجے کرتے ہیں ۔

موت کی قبل از وقت اطلاع: انسانی زندگی میں خوشیاں اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں، چنانچہ لاہور میں قیام کے دوران جہاں مجھے شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت کا موقع ملا، وہاں میں نے موت وغیرہ کی رسومات میں بھی شرکت کی اور سچی بات تو یہ ہے کہ پراسرار مشرق کی باقی چیزوں کی طرح یہ رسومات بھی مجھے "تھرلنگ" THRILLING محسوس ہوئیں ۔ مثلاً مغرب والوں کے لیے یہ اطلاع شاید ناقابل یقین ہو کہ یہاں وفات پانے والے ہر شخص کو اپنی موت کے بارے میں قبل از وقت علم ہوجاتا ہے ۔ اس کا ثبوت بعض مرنے والوں کے لواحقین کی گفتگو سے ملا ۔ ان میں سے ہر ایک یہی بتاتا تھا کہ مرحوم نے مرنے سے دو ایک ہفتے یا چند روز قبل کچھ ایسی باتیں کہیں جن سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ وہ عنقریب فوت ہونے والے ہیں ۔ میری ملاقات یہاں صحت مند نوجوانوں سے بھی ہوئی اور ان کا محبوب مشغلہ بھی صبح کے ناشتے سے لیکر رات کے کھانے تک موت ہی کے بارے میں گفتگو کرنا تھا ۔ مجھے پتہ چلا کہ زندگی سے تمام تر مایوسی کے باوجود یہ لوگ بہرحال اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ہی فوت ہوتے ہیں اور موت وغیرہ کے بارے میں ان کی گفتگو محض ٹائم پاس کرنے کے لیے ہوتی ہے ۔

بیگن ڈالنے کی رسم: دیہات کے بیشتر اور شہر کے بعض گھرانوں میں ایک رسم یہ ہے کہ فوتیدگی کی صورت

ں برادری کی خواتین اپنے گھر سے مرنے والے کے گھر تک ننگے پاؤں بین کرتی آتی ہیں۔ گھر کے قریب پہنچتے
ہنچتے ان کی آہ و زاری بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ گھر کی دہلیز میں قدم رکھتی ہیں اور اس کے
ساتھ ہی کہرام مچ جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ باری باری مرنے والے کے قریبی لواحقین کو جپھا ڈال کر روتے چلی
اتی ہیں ... نکالتی ہیں۔ وہ اپنی خشک آنکھیں چھپانے کے لیے لمبا گھونگھٹ نکال لیتی ہیں تاہم اگر رونے رلانے
کے دوران ان کی خشک آنکھیں نظر آ جائیں تو بھی یہ کوئی معیوب امر نہیں گردانا جاتا کیوں کہ دونوں پارٹیوں کے
درمیان یہ چیز "انڈرسٹڈ" UNDERSTOOD ہوتی ہے۔

مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے؟ تعزیت کے لیے آنے والے لوگ مرنے والے کے کسی قریبی عزیز سے پہلے تعزیت کے کلمات کہتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر کوئی یہ
سوال پوچھتا ہے کہ مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے؟ دراصل یہ سوال تعزیت کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ
مرحوم کا وہ عزیز وفات سے تین چار روز قبل کے واقعات خصوصاً مرنے سے چند گھنٹے قبل کے واقعات
پوری تفصیل سے سناتا ہے اور کسی ایک خاص مقام پر پہنچ کر دھاڑیں مارنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوئی دوسرا
شخص تعزیت کے لیے آتا ہے اور پوچھتا ہے "مرحوم فوت کس طرح ہوئے تھے؟" چنانچہ وہ یہ داستان
ایک بار پھر پوری تفصیل سے سناتا ہے اور مقررہ وقت پر دھاڑیں مارنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت
تک جاری رہتا ہے جب تک تعزیت کرنے والے آتے رہتے ہیں اور پوچھتے رہتے ہیں کہ مرحوم آخر
بات کس طرح ہوئے تھے؟ حتیٰ کہ مرحوم کا وہ عزیز نڈھال ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہر تعزیت کرنے والے
کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بتاتا ہے کہ مرحوم دراصل اس طرح فوت ہوئے تھے!!

کندھا دینا: یہاں میت کو ایمبولینس کی بجائے چارپائی پر ڈال کر قبرستان تک لے جایا جاتا ہے چنانچہ باری
باری چار آدمی چارپائی اٹھاتے ہیں اور اسے یہاں "کندھا دینا" کہا جاتا ہے کئی دفعہ ایسا بھی
ہوتا ہے کہ ایک شخص کندھا دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منتظر ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا
شخص آگے بڑھے اور اس کی جگہ کندھا دے مگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی چنانچہ اسے ڈگمگاتی ٹانگوں
کے ساتھ اس وقت تک یہ سفر طے کرنا پڑتا ہے جب تک کوئی دوسرا شخص اس کی دستگیری کو نہیں پہنچتا۔ یہ سفر
اس صورت میں زیادہ طویل محسوس ہونے لگتا ہے جب مرحوم کی شخصیت زیادہ وزنی ہو اور کندھا دینے والے
کا قد باقی تین کندھے دینے والوں سے ہم آہنگ نہ ہو!

مردوں کو قربانی کرنا: کسی محفل میں میری ملاقات ایک سوگوار شخص سے ہوئی جس کے والد کو فوت ہوئے کچھ
عرصہ گزر رہا تھا۔ وہ اپنے والد کی وفات سے متعلق گفتگو کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا "پورے ست
من گھی خرچ ہوا ہے"۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید یہاں مُردوں کو گھی کے دفن کیا جاتا ہے لیکن بعد میں
پتہ چلا کہ میرا یہ اندازہ درست نہیں تھا کیونکہ متذکرہ شخص کا نومن گھی چہلم کی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے
کا خرچ ہوا تھا۔

قل اور چہلم کی رسومات: قل اور چہلم کی رسومات کو یہاں مذہبی اہمیت حاصل ہے۔ قل کی رسم وفات کے تیسرے روز
کی جاتی ہے۔ جبکہ چہلم کی تقریب چالیس دن پورے ہونے کے بعد منائی جاتی ہے۔ اس

روز مرحوم کے عزیز و اقارب جمع ہوتے ہیں اور مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے پلاؤ زردہ اور قورمہ وغیرہ پکایا جاتا ہے تاکہ غربا و مساکین میں تقسیم کیا جا سکے۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے کہ "خیرات کا آغاز گھر ہی سے کیا جاتا ہے" یہ محاورہ غالباً یہاں بولی جانے والی زبان میں بھی موجود ہے کیونکہ یہ پلاؤ، قورمہ اور زردہ وغیرہ مرحوم کے عزیز و اقارب کھاتے ہیں اور اس روز مرحوم کے گھر میں جشن کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس روز صرف دو تین چہرے سوگوار نظر آتے ہیں جو مرحوم کے قریب ترین عزیزوں میں سے ہوتے ہیں۔

بوٹی کی تلاش: چہلم کی ایک تقریب میں مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا میں نے دیکھا کہ لوگ یہاں کھانے پر جھپٹ رہے تھے ساتھ ساتھ ٹھٹھا مخول بھی جاری تھا۔ کھانے کے اختتام پر لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ان میں سے ایک گروہ کے چہروں پر خاصا کھچاؤ تھا اور وہ رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے ہمراہی سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا گفتگو کر رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ یہ کھانے کی گھٹیا کوالٹی پر بڑبڑا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس میں بوٹی ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی تھی۔ نیز یہ کہ یہ برادری کے لوگ ہیں اور انہیں "شریک" کہا جاتا ہے۔

تعزیتی وفود: مرحوم کے لواحقین سے تعزیت کے لیے آنے والے لوگ صرف وفات سے تین چار روز تک ہی نہیں آتے بلکہ یہ سلسلہ پورا سال جاری رہتا ہے۔ بسا اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ مرحوم کے لواحقین مرحوم کو بھول چکے ہوتے ہیں اور نئے سرے سے زندگی کی خوشیوں میں شریک ہو گئے ہوتے ہیں کہ کوئی تعزیت کنندہ اچانک کسی روز گھر کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ معذرت کرتا ہے کہ وہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اتنا عرصہ تعزیت کے لیے حاضر نہ ہو سکا اور پھر اس کے بعد وہ مرحوم کے بارے میں رقت آمیز گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ اس پر ایک بار پھر کہرام مچ جاتا ہے اور جب آہ و بکا کا یہ سلسلہ اپنے عروج پر پہنچنے لگتا ہے تو وہ اجازت طلب کرتا ہے کیونکہ اس نے ایک جگہ شادی کی مبارک باد کے لیے بھی جانا ہوتا ہے۔

قیام و طعام کا معقول بندوبست: مرحوم کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں آنے والے عزیز و اقارب ان رسومات سے فراغت کے بعد اپنے اپنے گھروں کو نہیں لوٹتے بلکہ ان میں سے کئی ایک مرحوم کے لواحقین کو تسلی وغیرہ دینے کے لیے مہینہ دو مہینہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ وہیں قیام کرتے ہیں۔ اس دوران ان کی پوری پوری مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ مجھے اہلِ مشرق کی یہی چیز پسند ہے کہ ایک تو وہ مہمان نواز بہت ہیں اور اس کے لیے موقع محل کی کوئی قید نہیں اور دوسرے ان میں باہمی محبت، غمگساری اور ایک دوسرے کا درد بٹانے کے جذبات بہت قوی ہیں۔ ان دونوں جذبات کا بھرپور اظہار میں نے موت وغیرہ کے موقع پر بطور خاص دیکھا ہے!

...در آبادی

ہے خوشامدی جو بھی، بول اُسی کا بالا ہے
کل وہ کامراں ہوگا، جو بھی آج چمچا ہے

صرف جامہ زیبی میں، حُسن، حُسن ہوتا ہے
ورنہ بے لباسی میں، بے تُکا ہیولا ہے

حُسن کے تغافل کا، عاشقی کو شکوا ہے
دِل کی صاف بستی میں، کوڑا اور کچرا ہے

اِس سے سیکھئے، کیسے کنٹرول کرتا ہے
مُرغیوں کے جھرمٹ میں، ایک مُرغ تنہا ہے

کیا ہے آپ کے دِل میں، کہیئے کیا ارادہ ہے
شیخ جی، اِدھر کیوں یہ میکدے کا رستہ ہے

گیت بے سُرے کچھ میں خود سُنانے والا ہوں
میرے گیت مالے کی، آج رسمِ اجرا ہے

سب نے پھیر لیں نظریں، مفلسی میں ہوں تنہا
کوئی ہم نوالہ ہے اب نہ ہم پیالہ ہے

دیکھا ہوگا لوگوں نے، وہ بھی باید و شاید
میں نے خر سواروں کو، شہسوار دیکھا ہے

بے بُلائے مہمان کیوں روز آ دھمکتے ہیں
ہے مکان میرا یا، کوئی پاٹھ شالا ہے

چور تھے چچا پہلے اور بھتیجا تھا قاضی
بن گئے چچا قاضی، چور اب بھتیجا ہے

جتنے سود سے جائز ہیں سود سب ہیں ناجائز
سود جس میں جائز ہے، عشق کا وہ سودا ہے

ایک بار مُردہ بھی اُن کو دیکھ لیتا ہے
زندہ تو اُنھیں میں نے، بار بار دیکھا ہے

مستقل مزاجی کل جس کی کارآمد تھی
سرپٹ آج وہ انسان، دوغلا، نکما ہے

...ملی

...ایشِ لطف و کرم ہوگی نہ پوری اپنی
...رکے لوگ ہیں کنگال چلو لوٹ چلیں

...نہ بن جائیں کہیں، پاؤں کی بیڑی یارو
...سن ہے کھولے ہوئے بال چلو لوٹ چلیں

...کے آئے ہیں مجھے حُسن کے بازار میں آپ
...سکے گی نہ یہاں دال، چلو لوٹ چلیں

...سن سے آنکھ ملانا نہیں آساں یارو!
...رکے اُڑ جاتے ہیں سب بال چلو لوٹ چلیں!

شعبان صوفی
(دھولیہ)

خون جب عارضِ گلنار کا پائے کھٹمل
سُرخ تر ہو کے نہ آپے میں سمائے کھٹمل

چوس ڈالا ہے اسے آج کی مہنگائی نے
خون کی اب نہ مرے آس لگائے کھٹمل

رات ساری کفِ افسوس ہی ملتے گزری
کاٹ کر بھاگ گئے ہاتھ نہ آئے کھٹمل

ایک ہی بار گھڑی بارہ بجاتی صوفی
رات بھر میرے مگر بارہ بجائے کھٹمل

نمکین غزلیں

نیاز سواتی
(پاکستان)

(۱)

کھُلے گا بعد میں تجھ پر کہ شادی کا مزہ کیا ہے
ابھی تو ابتدا ہے تُو ابھی سے سوچتا کیا ہے

پڑوسی کو پڑوسن ڈانٹتی ہے ایک ہفتے سے
نہ جانے شوہرِ مظلوم کی آخر خطا کیا ہے

معطل کر کے اک ماتحت کو، افسر نے فرمایا
میاں روتے ہو کیوں تم اِس قدر آخر ہوا کیا ہے

زباں میں اُس کی لکنت ہے اور ہم بھی اونچا سُنتے ہیں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ ہم سے کہہ رہا کیا ہے

خدا مختار ہے مرضی ہے اس کی جس طرح چاہے
خدا بندے سے کیوں پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

نیازؔ! ہوتا نہیں ہم پر اَثر کچھ کیپسولوں کا!
نہ جانے آج کل اِن کیپسولوں میں بھرا کیا ہے

(۲)

مکاں اپنا جو تھا جوئے میں اُس کو ہار بیٹھے ہیں
اور اب نقلِ مکانی کے لیے تیار بیٹھے ہیں

سمجھتے ہیں وہ ان کی راہ میں بیکار بیٹھے ہیں
ہم اپنے دِل میں لے کر حسرتِ دیدار بیٹھے ہیں

کلرکی بھی اگر مِل جائے، ہم اس پر بھی راضی ہیں
ہم ایم۔ اے پاس کر کے گھر میں اب بیکار بیٹھے ہیں

وہ یوں بزمِ سخن میں خامشی سے شعر سُنتے ہیں
کہ جیسے مُنہ میں اپنے ڈال کر نسوار بیٹھے ہیں

سمجھتے ہیں اِدھر ماں باپ پڑھتے ہیں سبق بچے
لگا کر وہ ادھر بیٹھک میں وی سی آر بیٹھے ہیں

نہیں آتی ہے ان کو پیش دِقّت کچھ بھی رشتے میں
جو سروس کے لیے جا کر سمندر پار بیٹھے ہیں

غلط سمجھے ہو، جو سمجھے ہو، ہمسایوں کے بچے ہیں
ہمارے چار سُو اپنے ہی برخوردار بیٹھے ہیں

(۳)

معرکے رِشوت کے ہم ہر روز سَر کرتے رہے
پر ہماری جیب خالی ڈاکٹر کرتے رہے

خدمتِ علم و ہُنر ہم عمر بھر کرتے رہے
اور سب اعزاز حاصل بے ہُنر کرتے رہے

ہم نے سوچا تھا بنیں گے پائلٹ ہم بھی مگر
زندگی بھر بیل گاڑی میں سفر کرتے رہے

دوپہر تک وہ اُدھر آرام سے سوتا رہا!
انتظارِ یار شب بھر ہم اِدھر کرتے رہے

درد تو محسوس کرتا تھا میں اپنے پاؤں میں
ڈاکٹر لیکن علاجِ دردِ سَر کرتے رہے

مشغلہ غیبت ہے اپنا، دوست اور احباب کی
کام یہ کرنا نہ تھا ہم کو مگر کرتے رہے

مجھ سے پہلے مر گئے وہ میرے وارث اے نیازؔ!
میرے مرنے کی دُعا جو عمر بھر کرتے رہے

محمد خورشید نادر (کامٹی)

والدین

اللہ تبارک تعالیٰ کا کرم و احسان ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو والدین جیسی نعمت عطا فرمائی۔ یہ نعمتِ عظمیٰ مفت اور عام ہے۔ زاہد و عابد اور خاطی و عاصی کی کوئی تخصیص نہیں، حتیٰ کہ منکر و ملحد اور زندیق و مرتد کو بھی اس سے محروم نہ رکھا۔ لطف یہ کہ یہ نعمت بلا طلب ملی ہے، اور وہ جو غالبؔ نے کہا ہے ع

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے

تو اس کا اطلاق والدین پر بھی ہوتا ہے کیونکہ بچوں کو والدین بے طلب ہی ملتے ہیں۔ نہ بچوں کا مزاج گدایانہ ہوتا ہے نہ ان میں خوئے سوال ہوتی ہے۔

• یہ والدین بچوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک، ان کے ایام طفلی کا سہارا، پرورش، نگہداشت اور تعلیم و تربیت کے ذمہ دار، ان کے جملہ اخراجات کے کفیل اور شرارتوں کے معاملہ میں ان کے وکیل ہوتے ہیں۔ والدین یہ فرائض اعزازی طور پر انجام دینے کے لیے مامور من اللہ ہیں۔ انہیں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور نہ صلہ کی پرواہ۔ وہ اس بات کے لیے مجبور ہیں کہ حتی المقدور اپنے فرائضِ منصبی انجام دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

بعض والدین عجیب الوضع ہوتے بعض غریب القطع، بعض شاخِ بے ثمر کی طرح ہوتے بعض کثیر العیال اور قلیل الغذا۔ کچھ قران السعدین کے نمونے ہوتے ہیں، کچھ اجتماعِ ضدین کے۔ بعض میں موزونیت پائی جاتی ہے بعض میں شتر گربگی۔ بسا اوقات ماں ٹینی ہوتی ہے، باپ کلنگ اور بچے رنگ برنگ۔ بعض عجیب الخلقت مجموعوں کو دیکھ کر ایمان لانا پڑتا ہے کہ ان کی جلد سازی میں یقیناً دستِ قدرت کا دخل ہے۔ لیکن قدرت ایسے ماڈل تفریحِ طبع کے لیے نہیں دیدۂ عبرت نگاہ کے معائنہ کے لیے فراہم کرتی ہے، بقیہ معاملات میں خود حضرتِ انسان کی کاوش و انتخاب کا دخل ہوتا ہے۔ بعض مضحکہ خیز جوڑے شرارت یا دانستہ چشم پوشی کے باعث بھی وجود میں آتے ہیں۔ ایک دردمند بیوی نے اپنے شوہر سے کہا،

"آپ کا دوست جس لڑکی سے شادی کرنے والا ہے، وہ انتہائی بدسلیقہ، زبان دراز اور بد اخلاق قسم کی ہے آپ اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟" شوہر نے گردن جھٹک کر کہا، "میں اسے ہرگز نہیں

کروں گا، میں جب تم سے شادی کرنے والا تھا تو کیا اس نے مجھے حقائق سے آگاہ کیا تھا؟

مگر بعض معاملات میں فریقین جملہ معاملات بالا بالا ہی طے کر لیتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

ایک صاحب اپنے خانگی حالات سے سخت نالاں، بیزار اور دل برداشتہ تھے۔ کسی نے سبب دریافت کیا تو کہا،

"اپنی ناعاقبت اندیشی اور جلد بازی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ ہوا یہ کہ جب اس سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تو میں بولتا رہا اور وہ سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہی۔ بعد میں ملاقات ہوئی تو وہ مسلسل بولتی رہی اور مجھے بولنے اور مزید دریافت حال کا موقع ہی نہ ملا۔ وقتِ نکاح قاضی صاحب بولتے رہے اور ہم دونوں سنتے رہے، لیکن اب یہ حال ہے کہ ہم دونوں بولتے ہیں، بچے روتے ہیں، محلہ والے سنتے ہیں اور رشتہ دار ہنستے ہیں۔"

ایک اور صاحب سے شادی کے بعد کے حالات پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے پوری سودا دِ حیات صرف ایک مصرع میں ادا کر دی۔ یعنی فرمایا کہ

خام بدم، پختہ شدم، سوختم

ایک لوگرفتار جو ابھی تک زیرِ دام پھڑک رہے تھے اپنے قلبی تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا،

"مجھے اس بات کا کوئی غم نہیں کہ بیوی بدصورت ملی اور دو بچے ساتھ لائی، قلق اس بات کا ہے کہ جہیز برائے نام ملا۔"

پھر ایک دلدوز آہ کے بعد کہا ہے

مجھے غرقاب ہونے کا نہیں اس بات کا غم ہے
جہاں کشتی مری ڈوبی وہاں پانی بہت کم تھا

ہمارے ایک واقف کار کی ازدواجی زندگی بڑی پُرسکون اور قابلِ رشک ہے ہر وقت مطمئن اور مسرور دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے اس کامیابی کا راز دریافت کیا گیا تو مسکراتے ہوئے کہا،

ابتداءً میں بھی بڑا افسردہ، ملول اور پریشان خاطر رہا کرتا تھا۔ دن تو کسی صورت کٹ جاتا مگر شام ہی سے چراغِ مفلس کی طرح بجھا بجھا سا رہتا کیونکہ گھر کے تصور ہی سے روح فنا ہوتی تھی۔ آخر اپنے پیر و مرشد سے رجوع کیا۔ ان کی نگاہِ التفات نے گویا گھر کے در و دیوار ہی بدل دیئے۔ یہ آں جناب کے ملفوظات سے ہے کہ اپنی منکوحہ کو تھوڑے وقفہ سے یہ بات جتاتے رہنا چاہیئے کہ بیک وقت چار بیویاں رکھنا شرعاً جائز ہے۔ میں نے اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا ہے اور اسی پر عمل پیرا ہوں، چنانچہ اب اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

ایسے والدین اب خال خال نظر آتے ہیں جو ہم پلّہ اور ہر لحاظ سے متوازن ہوں، ورنہ مشاہدہ شاہد ہے کہ عموماً ایک فریق دوسرے پر حاوی و غالب ہوتا ہے، اپنی کارکردگی کے باعث نہیں بلکہ قوتِ گویائی کے بل بوتہ پر۔ یہ شریکِ حیات، شریکِ غالب کا درجہ رکھتا ہے، اور قدرت نے اس کی زبان کی تخلیق میں نہ جانے کیا ترکیب رکھی ہے کہ اگرچہ وہ قینچی کی طرح چلتی ہے مگر تمام عمر اس کی دھار کند نہیں ہوتی بلکہ یوماً فیوماً تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

غالب نے غالباً ذاتی تجربہ کی بناء پر کہا ہے ؎

بات پر واں زبان کٹتی ہے ٭ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

غالبِ خستہ پر ہی منحصر نہیں، علامہ اقبال جیسے شمشیر بکف مردِ مومن نے بھی دہائی دی ہے ؎

یہ دستورِ زباں بندی کا ہے کیسا تیری محفل میں ؛ یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

علامہ موصوف "ذوالقرنین" تھے، نہ جانے کیا گزرتی ہوگی۔ گمان غالب ہے کہ انہوں نے اپنے مرشدِ روحانی مولانا رومؒ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے "سرِّ بیگماں" کو "حدیثِ دیگراں" کے طور پر پیش کیا ہے۔

ایسے خانگی ماحول میں جہاں ایک فریق کو اتنی بالادستی اور تفوق حاصل ہو کر فریقِ ثانی ہمیشہ سکڑا، سہما اور دم بخود رہے، اسے نہ اذنِ لب کشائی ہو نہ مجالِ دم زدن تو ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کے باعث بڑے پیچیدہ نفسیاتی اثرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد ایک شوہر مرضِ خود کلامی میں مبتلا ہو کر بوقتِ شب بحالتِ خواب باآوازِ بلند بڑبڑانے لگے۔ شادی سے قبل یہ عارضہ نہ تھا۔ ان کی زوجہ محترمہ نے انہیں ایک نفسیاتی معالج کو دکھایا تو اس نے پوری رام کہانی سننے کے بعد ان کی بیگم کو تخلیہ میں طلب کر کے کہا،

"آپ کے شوہر کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ صرف اتنا کیجئے کہ انھیں بھی دن میں بولنے کا موقع دیجئے!"

جن گھروں میں ایسا ماحول ہو کہ ایک فریق نان سٹاپ لکچر دیئے جائے اور دوسرا کان دبائے سنتا رہے تو اس گھر کے بچے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

ایک ماں نے اپنی بچی کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تم کتنی فضول بکواس کرتی ہو اور مسلسل شور مچارہی ہو، اپنے بھائی کو دیکھو! وہ کتنی خاموشی سے کھیل رہا ہے۔"

بچی نے کہا "اس کی خاموشی کا وہ سبب نہیں ہے، جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ ہم پاپا۔ ممی۔ گیم کھیل رہے ہیں۔ میں ممی کا رول ادا کر رہی ہوں اور یہ پاپا کا۔ پاپا رات گئے گھر آئے ہیں اور میں انہیں آپ کے لہجہ میں ڈانٹ رہی ہوں، اس لیے اسے تو خاموش رہنا ہی ہے۔"

حالات کے مارے ہوئے بعض شوہر خود اپنے گھروں میں بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان مجبوروں پر ناحق خود مختاری کی تہمت لگائی جاتی ہے، کیونکہ ویٹو پاور (حقِ تنسیخ) ان کی بیگمات کو حاصل ہوتا ہے وہ جو چاہتی ہیں کرتی ہیں اور یہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک وکیل صاحب ہیں، بے حد ذہین و طباع اور بے حد شریف و سنجیدہ۔ عدالت میں اپنی قانونی موشگافیوں کے باعث فریقِ مخالف کا ناطقہ بند کرتے اور منصف کو اپنے قانونی استدلال اور زورِ خطابت سے اپنا ہمنوا بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے مگر جب گھر پہنچتے ہیں تو ان کے طرۂ پُر پیچ و خم کا سارا پیچ و خم نکل جاتا ہے کیونکہ بیوی سخت جاہل مغرور، منہ زور اور بے لگام ہے۔ وہ جب للکارتی ہے تو انہیں نبضِ کائنات ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وکیل صاحب صلح پسند اور عافیت جُو انسان ہیں، جانتے ہیں کہ ایک خاموشی سو بلا کو ٹالتی ہے۔ اس لیے وہ بیوی کی کسی بات کی تردید کرنے سے عمداً گریز کرتے ہیں۔ ایک دن ان کے صاحبزادے نے کسی معاملہ میں ان سے مداخلت کی اپیل کی تو بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا،

"میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کرسکتا، یہ میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ ہائی کورٹ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کو رد کر کے خود اپنا فیصلہ صادر کرے، بلکہ اس پر رائے زنی اور تبصرہ کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں کہ یہ توہینِ عدالت کے مترادف ہوگا۔"

مردوں کی ایک عام شکایت ہے کہ عورتیں بسیار گو ہوتی ہیں۔ اس شکایت میں کچھ مبالغہ ہے، کچھ حقیقت ہے اور کچھ زیبِ داستاں کے لئے اضافہ شدہ ہے۔ ایک خاتون دروازے میں کھڑی کسی دوسری خاتون سے محو گفتگو تھیں، ان کے شوہر نامدار شیر خوار بچے کو لیے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب دو گھنٹے گزر گئے اور گفتگو ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو شوہر نے اندر سے کہا،

"کس سے باتیں کر رہی ہو؟ انہیں اندر آنے کے لیے کیوں نہیں کہتیں؟"

بیوی نے پلٹ کر جواب دیا،

"پڑوسن ہے۔ میں تو اسے اندر آنے کے لیے بار بار کہہ رہی ہوں مگر وہ کہتی ہے کہ اسے ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں"۔ اور دونوں پھر گفتگو میں مشغول ہو گئیں۔

غالباً اسی بسیار گوئی کے باعث ہمارے ایک شناسا داغ مرحوم کا ایک شعر معمولی تصرف کے بعد اس طرح پڑھتے ہیں ؎

ملے جو حشر میں لے لوں زبان بیگم کی ؛ عجیب چیز ہے یہ طولِ مدّعا کے لیے

(داغ کے اصل شعر میں "بیگم" کی جگہ "ناصح" ہے)

والدین کے نصف جزو کو مغرب میں نصف بہتر تسلیم کیا جاتا ہے یہ اہلِ مغرب کی فراخدلی اور حقیقت پسندی کی دلیل ہے۔ مگر اہلِ مشرق نے اسے کبھی درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور تا حال ناقص العقل سمجھے ہوئے ہیں حالاں کہ یہ اپنے بقیہ نصف کی بہ نسبت زیادہ باشعور اور دور اندیش ہوتی ہے اور شوہر کی خیر خواہ بھی۔ ایک صاحب شام میں گھر لوٹے تو ڈرائینگ روم میں ایک اجنبی کو ایک ہینڈ بیگ سمیت موجود پایا۔ بیوی کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا،

آپ گزشتہ کئی دنوں سے بخار اور کھانسی میں مبتلا ہیں اور علاج کے باوجود کوئی افاقہ نہیں دکھائی دیتا، اس لیے میں نے انہیں طلب کیا ہے"۔

شوہر، بیوی کے اس جذبۂ خیر خواہی سے بہت متاثر ہوا اور کہا،

"تم ناحق پریشان ہو، موسمی بخار ہے، چند روز میں از خود جاتا رہے گا۔ خیر! اب تم نے ڈاکٹر صاحب کو طلب کر ہی لیا ہے تو میں انہیں خود کو دکھائے دیتا ہوں"

اجنبی نے حیرت سے بیوی کی طرف دیکھا تو بیوی نے جلدی سے کہا،

"یہ ڈاکٹر نہیں بیمہ ایجنٹ ہیں"

شوہر عموماً بیویوں کی بے التفاتی اور بے رخی کے شاکی ہوتے ہیں مگر یہ محض غلط فہمی ہے۔ بیوی کیلئے اس کا شوہر ہی مجازی خدا ہے مگر اسے شوہر کی خوشنودی کے علاوہ کچھ دوسری چیزوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ خیر خواہی کے علاوہ کفایت شعاری پر بھی نظر رکھتی ہے۔ ایک محترمہ اپنے شوہر کے ہمراہ دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس پہنچیں اور کہا،

"ڈاکٹر صاحب! دانت میں سخت تکلیف ہے، مگر ہمیں ایک جگہ جلد از جلد پہنچنا ہے، یونہی کافی تاخیر ہو چکی ہے، اس لیے سوئی وغیرہ کی ضرورت نہیں آپ یونہی دانت نکال دیجیے"۔

ڈاکٹر نے انہیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے شوہر کو کرسی کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا،
"ڈاکٹر صاحب! دانت میرا نہیں، ان کا نکلوانا ہے۔"

بیوی، خواہ کسی کی ہو، اسرافِ بیجا کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہاں! اس کے زیورات اور ملبوسات کی خریداری پر خرچ ہونے والی رقم کی بات دوسری ہے۔ بقیہ معاملات میں وہ فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر بفرضِ محال فضول خرچی ناگزیر ہو تب بھی وہ اس میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک صاحب چین سموکر (CHAIN SMOKER) تھے۔ یعنی مسلسل سگریٹ پیتے تھے۔ بیوی نے لاکھ جتن کئے کہ یہ عادتِ بد چھوٹ جائے اور یہ غیر ضروری خرچ کم ہو جائے مگر شوہر عادت سے مجبور تھے لیکن وہ بنتِ حوّا ہی نہیں جو کھلی سے تیل نکالنے کا ہنر نہ جانتی ہو۔ چنانچہ اس نیک بخت کو وہ تدبیر سوجھی جو کسی مرد کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ اس نے شوہر کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھما دیا اور کہا،

"آپ سگریٹ کی راکھ اس میں جمع کیجئے اور اس میں نمک خوردنی ملا کر منجن کی طرح استعمال کیجئے اور بازار سے منجن کی خریداری بند کر دیجیے۔"

مَرد فطرتاً لاابالی اور لاپرواہ ہے۔ وہ معمولی اور غیر اہم چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر بیوی جزئیات پر بھی گہری نظر رکھتی ہے۔ ایک ماں نے اپنے بچّہ سے کہا۔
"دیکھو! آج سامنے کی دوکان سے کوئی سودا سلف خرید کر مت لانا"
بچّہ نے حیرانی سے پوچھا "کیوں"؟
ماں نے کہا:۔ "وہ دوکاندار آج ہمارے گھر سے تمہارے دادا کا ترازو اور بانٹ لے کر گیا ہے۔"

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مَرد ہر معاملہ میں غبی ہوتا ہے۔ بعض خاص معاملات میں تو وہ اتنا زیرک و دانا ہوتا ہے کہ عورت بھی عشقِ معشوقانہ کرتے غش کھا جاتی ہے۔ دو سہیلیاں عرصہ کے بعد دوبارہ ملیں۔ وہ عورت جو خود کو ہوشیار سمجھتی تھی اپنی سہیلی کے شانہ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوسری سہیلی نے جو اس کی شادی کے پس منظر سے بخوبی واقف تھی، حیرانی سے اس گریہ و زاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے سسکیوں کے درمیان کہا،
"میں دھوکہ کھا گئی اور خود اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئی۔ میرا شوہر مجھ سے زیادہ شاطر نکلا"
سہیلی نے دریافت کیا "کیوں! کیا وہ دولت مند نہیں ہے؟ اس کی دولت حاصل کرنے کے لیے ہی تو تم نے اس سے شادی کی تھی"
پہلی سہیلی نے کہا "دولت مند تو ہے، مگر شادی کے وقت اس نے جو عمر بتائی تھی اس سے بیس سال کم عمر کا نکلا"

تجربہ شاہد ہے کہ عموماً دھوکہ وہی کھاتے ہیں جو خود کو ہوشیار اور دوسروں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ایک محترمہ نے شادی کے بعد اپنے شوہر سے شکایت کی
"آپ مجھے شادی سے پہلے بہت تحائف دیا کرتے تھے۔ طلب کرنے پر بھی اور بے طلب بھی۔ مگر آج شادی کو تین سال ہو گئے۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد ہم میاں بیوی کی سرحد عبور کر کے والدین بن گئے مگر آپ نے پھوٹی

کوڑی کا بھی تحفہ نہ دیا ؟"
شوہر نے کہا "کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ جال میں مچھلی پھنس جانے کے بعد کوئی شکاری اسے چارہ کھلاتا ہے ؟ تم خود کو بہت ہوشیار اور مجھے عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا سمجھتی تھیں مگر اب کیا خیال ہے ؟"
شوہر سے فرمائش کرنا بیوی کا حق سہی مگر اپنی تن پوشی کے لیے شوہر کی کھال کھینچنا بھی دانش مندی نہیں۔ ایک صاحب نے اپنی بیوی کو تحفہ کے طور پر ایک کوٹ پیش کیا جس میں کسی برفانی جانور کی نرم و نازک بالوں سے بھری کھال کی پیوند کاری کی گئی تھی۔ بیوی پہلے تو بہت خوش ہوئی مگر پھر دفعتہً اداس ہو گئی۔ شوہر نے ڈوبتے دل سے پوچھا:
"کیوں ! کوٹ پسند نہیں آیا ؟"
بیوی نے کہا "کوٹ تو بہت خوبصورت اور قیمتی ہے مگر میں اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں جس کی کھال اس کوٹ کے لیے کھینچی گئی ہے"۔
شوہر نے گلوگیر آواز میں کہا "ہمدردی کے لیے شکریہ !"
بعض بیویوں کو شکایت ہوتی ہے کہ انہیں موزوں شوہر نہ مل سکے۔ بالکل یہی شکایت ان کے شوہروں کو بھی ہوتی ہے۔ والدین کا در چھوڑ حاصل کرنے کے بعد یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کے بعد گلو خلاصی ناممکن تو نہیں مگر دشوار ضرور ہو جاتی ہے۔ ایک خاتون کو اپنی خوش فہمی پر سخت ندامت اور پشیمانی ہوئی۔ شادی کے کئی سال بعد جب ان کی خوش فہمی دور ہوئی اور انہیں اپنے شوہر کے ناکارہ اور نااہل ہونے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اپنے شوہر سے بڑے تاسف سے کہا،
"شادی سے قبل آپ کہا کرتے تھے کہ میں کسی لائق نہیں۔ مگر میں نے اسے آپ کی خاکساری پر محمول کیا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سچ کہہ رہے تھے"۔ شوہر نے کہا "تم مجھ پر فریب دہی کا الزام عائد نہیں کر سکتیں۔ میں آج بھی اس بات پر قائم ہوں کہ میں کسی لائق نہیں ہوں"
لیکن اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہو گا کہ غلطی صرف ایک فریق ہی سے ہوتی ہے۔ دوسرا فریق اس سے بھی بڑی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ ایک شخص نے اپنے نئے پڑوسی سے کہا،
"وہ کالی کلوٹی، بھدی، موٹی اور بدصورت عورت جو ابھی آپ کے گھر میں داخل ہوئی کون ہے"؟
"وہ میری بیوی ہے"
"آپ کی بیوی ہے! معاف کیجیے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، میں سمجھا . . . ."
اس شخص نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "نہیں بھائی ! غلطی تو دراصل مجھ سے ہوئی ہے"
اسی لیے شریکِ حیات کے انتخاب میں تعجیل مناسب نہیں "پہلے تولو پھر بولو" اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ یعنی کامل غور و فکر اور تفتیش و تفحص کے بعد ہی کہنا چاہیے کہ "جی ہاں ! قبول کیا میں نے" ورنہ تیراز کمان جستہ باز نیاید۔ اس ضمن میں کسی فریب خوردہ کا قول ہے کہ شادی بوقت صبح کرنا اولیٰ ہے کیونکہ اتنا وقت بہر حال باقی رہتا ہے کہ انتخاب پر نظرِ ثانی کر کے غلطی کا ازالہ کیا جا سکے یا اس کا کفارہ ادا کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔ اس کے برعکس شام میں شادی کرنے میں یہ قباحت ہے کہ اس کے بعد غور و فکر تو درکنار پچھتانے کا بھی وقت نہیں رہتا

اسی لیے کہا گیا ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ بے شک! بعض بزرگانِ سابقہ نے یہ بھی کہا ہے کہ نیک کام میں دیر نہ کرنی چاہیئے مگر یہ مشورہ انھوں نے غالباً صاحبِ اولاد ہونے کے سلسلہ میں دیا ہے۔ شادی کے معاملہ میں صبر و تامل ہی مناسب ہے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سجدۂ شکر کے بعد سجدۂ سہو ادا کرنا پڑے۔

انگریز بھی اس معاملہ میں محتاط تھے۔ ایک انگریز بزرگ کا قول ہے کہ "Look before you Leap" یعنی کودنے سے پیشتر یہ دیکھ لو کہ زمین ہموار ہے یا نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ جلد بازی میں کسی کنوئیں یا کھائی میں جا پڑو۔

بہر حال غور و فکر اور احتیاط لازم و مقدم ہے بشادی سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی بالخصوص خانگی معاملات میں ورنہ عجلت ندامت و پشیمانی کا باعث ہو سکتی ہے۔ ایک صاحب رات گئے گھر پہنچے۔ بھوک کی شدت سے آنتیں قل ہو اللہ کا ورد کر رہی تھیں، دیکھا کہ بیگم خورد و کلاں کے نرغہ میں اس طرح بیٹھی ہیں جیسے مرغی اپنے چوزوں کے درمیان۔ معلوم ہوا کہ کھانا تیار نہیں۔ جل بھن کر خود کباب ہو گئے۔ بیگم سے استفسار کیا تو وہ بولیں:

"کھانا کون تیار کرتا، آپ نے ملازمہ کو فون پر گالیاں دیں وہ اسی وقت ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔"

"ارے! فون پر ملازمہ تھی، میں سمجھا تم ہو"

خانگی معاملات میں اس نوع کے واقعات کا ظہور پذیر ہونا معمولات سے ہے لیکن اگر محترمہ امور خانہ داری سے واقف ہوتیں تو ایسی ناگوار صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ اسی لیے ماہرینِ فرائضِ نسواں کا کہنا ہے کہ امور خانہ داری سے مکمل واقفیت زیورات اور ملبوسات سے زیادہ اہم ہے ورنہ تعلقات میں کشیدگی اور پیچیدگی پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک شوہر اپنی کاروباری مصروفیات سے خستہ اور بھوک سے نڈھال، افتاں و خیزاں گھر پہنچے۔ مگر پہلا لقمہ منہ میں رکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ قہر آلود نظروں سے بیوی کو گھورا اور لقمہ کو بمشکل نگلنے کے بعد پوچھا ــــ "یہ کھانا تم نے تیار کیا ہے؟"

"جی ہاں!" بیوی نے لہک کر کہا۔ "اس کی ترکیب میری ایک سہیلی نے بتائی تھی، کیوں؟ کیسا لگا؟"

"وہ میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ شادی کے بعد تمہاری اس سہیلی کا کیا حشر ہوا؟"

بیوی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "اس کے شوہر نے اس کی قدر نہ کی، آجکل میکے میں ہے۔"

شوہر نے اس طرح سر ہلایا گویا سہیلی کا انجام اس کی توقع کے عین مطابق ہوا ہو۔ یوں بھی ایسی بیوی کا میکہ ہی میں رہنا اچھا ہے جو اتنا خراب کھانا تیار کرے کہ شوہر تو کجا گھر کا کتا بھی پڑوس میں جا کر کھائے۔

مرد فطرتاً بردبار واقع ہوا ہے، طیش میں اسی وقت آتا ہے جب پیمانۂ صبر لبریز ہو جائے۔ اس میں خدانخواستہ وقوف و شعور کی کمی نہیں مگر تحمل اور درگزر اس کی فطرت ہے، مگر بدقسمتی سے اس کے اس طرز عمل کو عورت کی چشم ظاہر بیں حماقت سے تعبیر کرتی ہے، خود کو اس سے زیادہ چالاک سمجھتی ہے اور پھر اسے اس چالاکی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک فیشن ایبل، روشن خیال اور آزاد رو محترمہ اچانک بیمار ہو گئیں، بستر علالت بسترِ مرگ بن گیا۔ جب دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہوا تو آخری دو ہچکیوں کے درمیان کہا،

"میں نے آپ سے بارہا بے وفائی کی ہے، مگر آپ کو اس کا علم نہ ہوا، مجھے معاف ...."

"مجھے اس کا علم ہوگیا تھا" شوہر نے بڑے سکون سے کہا" لیکن تمہیں اس کا علم نہ ہو سکا کہ تمہیں زہر کس نے دیا ہے"!
یہ سن کر ان محترمہ کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیل گئیں اور تدفین تک اسی حالت میں رہیں۔ جو بیوی خود کو چالاک اور شوہر کو احمق سمجھے گی وہ اسی طرح غچہ کھائے گی۔

دوسروں کو بے وقوف سمجھنا غالباً عورتوں کی فطرت ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی ہم جنسوں کو بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک تقریب میں چند مستورات یکجا تھیں۔ ان میں سے ایک محترمہ زیادہ تیز و طرار تھیں۔ انہوں نے لوازمات حسن استعمال کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا اور اپنے بدن کو دلی شہر کا مینا بازار بنا رکھا تھا۔ وہ محترمہ اپنی عمر اتنی کم بتا رہی تھیں کہ آخر وہ عورتیں بھی چڑھ گئیں جنھوں نے خود اپنی عمریں دس دس سال کم بتائی تھیں۔ ان محترمہ کی بغل میں ان کی بیٹی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے برداشت نہ ہوسکا تو اس نے کہا۔

"امی! اب اتنی ننھی بھی نہ بنیں۔ اپنی اور میری عمر میں کم از کم نو مہینے کا تو فرق رکھیے"۔

اپنی عمر کم بتلانا غالباً مستورات کا نفسیاتی مرض ہے اور شاید ان میں وراثتاً پایا جاتا ہے۔ ایک خاتون نے اپنے شوہر سے کہا۔

"یہ اپنی نئی پڑوسن مجھ سے بہت جلتی ہے۔ خود تو نوخیز بنتی ہے مگر میری عمر تیس سال بتاتی ہے"؟

"وہ بے وقوف ہے۔" شوہر نے کہا" اس نے تمہاری عمر کا اندازہ غلط لگایا ہے"۔

بیوی نے خوش ہو کر کہا" اچھا! میری عمر کے متعلق آپ کا کیا اندازہ ہے"؟

"کم از کم چالیس سال" شوہر نے پورے یقین سے کہا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ وبا صرف عورتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ مردوں میں بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے دروغ برگردن راوی ــــ جوش، فراق اور مجاز ایک بار کہیں ہم پیالہ تھے۔ جب کئی دور چل چکے تو جوش نے کہا:

"ماشاء اللہ ــ ابھی جوان ہیں، ہماری عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہوگی"

فراق نے پوپلے منہ سے کہا" ظاہری مشابہت سے قطع نظر میں بھی اٹھارہ بیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہوں"
مجاز نے معصومیت سے کہا" اس حساب سے میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا"

بچے والدین کو مربوط رکھنے کے لیے سنہری زنجیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو ان کے درمیان ایک تکلیف دہ خلاء محسوس ہوتا ہے۔ یہ خلاء اگرچہ مصنوعی طور پر پُر بھی کیا جاسکتا ہے، مگر اور یجنل اولاد کی بات ہی دوسری ہے۔ یہ مضبوط، پائیدار اور قابل اعتماد ثابت ہوتے ہیں۔ فریقین میں سے کوئی رسیاں تڑانے کی کوشش کرے تو یہ زنجیر پا ثابت ہوتے ہیں۔ بعض بچے فطرتاً شوخ و شنگ اور شریر ہوتے ہیں، لتنے شریر و چالاک اور ایسے بہانہ ساز کہ والدین دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ جاتے ہیں۔ ایک شریر بچہ اسکول سے کافی تاخیر سے گھر واپس ہوا۔ ماں نے تاخیر کا سبب دریافت کیا تو کہا؛

"راستہ میں اتنی کیچڑ اور پھسلن تھی کہ میں ایک قدم آگے رکھتا تو دو قدم پیچھے سرک جاتا تھا"۔

ماں نے بڑی حیرت سے کہا" اس صورت میں تو تمہیں گھر پہنچنے کے بجائے اسکول سے بھی آگے نکل جانا چاہیئے تھا"۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں" بچہ نے مسکرا کر کہا" میں نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔ اپنا منہ اسکول کی طرف کر لیا تھا

اور پُشت گھر کی طرف؟"

یہ نئی نئی شرارتوں کے موجد ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شریر بچّہ خلافِ معمول خاموش اور سنجیدہ نظر آئے تو اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ وہ شرارت سے تائب ہو چکا ہے۔ بلکہ یہ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ وہ کوئی خطرناک شرارت کر چکا ہے اور اب سنجیدگی سے والدین کے ردِّ عمل کا منتظر ہے۔

بعض بچے اتنے نڈر اور بے باک ہوتے ہیں کہ والدین تو کیا دوسروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ایک بچّہ اپنے گدھے کی رسّی تھامے چل رہا تھا۔ جب وہ ایک کیمپ کے قریب سے گزرا تو اپنے گدھے کی گردن کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور جلد جلد چلنے لگا۔ ایک فوجی یہ منظر دیکھ رہا تھا اس نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا:

" تم نے اپنے گدھے کو اتنی مضبوطی سے کیوں تھام رکھا ہے! کیا اس سے برادرانہ محبت ہے؟"

" نہیں! میں نے اسے اس لیے تھام رکھا ہے کہ کہیں یہ گدھا بھی فوج میں نہ بھرتی ہو جائے"!

فوجی نے بگڑ کر کہا "ہمیں تمہارے مریل گدھے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے کیمپ میں ایک سے بڑھ کر ایک گدھا موجود ہے"!

عورتوں کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ وہ ناقص العقل ہوتی ہیں، یہ ہوائی نہ جانے کس دشمنِ زن نے اڑائی ہے۔ ہم نے ایک واقعہِ اسرارِ نسواں سے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کی استدعا کی تو اس نے بعض ٹھوس دلائل پیش کرنے کے بعد اتمامِ حجت کے لیے ذیل کا واقعہ سنایا،

" ایک شخص کو محسوس ہوا کہ اس کا دماغ کثرتِ کار اور ہجوم افکار کے باعث ناکارہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک اسٹور میں داخل ہوا، جہاں انسانی اعضاء فروخت کیے جاتے تھے۔ سیلزمین نے اسے دو بھیجے پیش کیے ایک مَرد کا تھا اور دوسرا عورت کا۔ اس شخص کو یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ مَرد کے بھیجے کی قیمت ناقابلِ یقین حد تک کم تھی اور عورت کے بھیجے کی قیمت حدِ قیاس سے سوا۔ اس نے سیلزمین سے پوچھا،

"عورت کے دماغ کی قیمت اتنی زیادہ کیوں ہے؟ کیا عورت مَرد سے زیادہ عقل مند ہوتی ہے"؟

"جی نہیں،، سیلزمین نے مسکرا کر کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آدمی کا دماغ استعمال شدہ ہے جب کہ عورت کا دماغ سرے سے استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ اس لیے ابھی تک اصلی حالت میں موجود ہے"!

مگر ہمارے مطالعہ میں جو واقعہ آیا، وہ اس سے مختلف ہے۔

ایک والد صاحب اپنے بچّے کی انگلی تھامے برٹش میوزیم میں داخل ہوئے۔ ایک شوکیس میں دو کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں، ایک چھوٹی دوسری بڑی۔ بچہ نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو والدِ بزرگوار نے تختی پر درج شدہ عبارت کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ پلّے نہ پڑا۔ بچّے نے وضاحت کے لیے اصرار کیا تو اپنی صوابدید کے مطابق فرمایا،

" یہ دونوں کھوپڑیاں شکسپیئر کی ہیں۔ چھوٹی کھوپڑی اس وقت حاصل کی گئی تھی جب وہ بچّہ تھا اور بڑی اس وقت جب اس کا انتقال ہوا"!

یہ وضاحت اس طبقہ کے ایک فرد کی ہے جو کامل العقل ہونے کا مدّعی ہے خواتین و حضرات سے متعلق ایک اور متنازعہ فیہ مسئلہ یادداشت سے متعلق ہے۔ ماہرینِ امراضِ نسواں کی تحقیق کے مطابق مرضِ نسیان طبقۂ نسواں میں شاذ ہی پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مَردوں میں عام ہے اور شادی کے بعد مزمن صورت اختیار کر لیتا ہے خواتین اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر اس تحقیق کی نہایت شدّ و مد سے تائید و تصدیق کرتی ہیں اور اس معاملہ میں وہ حق بجانب ہیں۔

ایک میاں بیوی شاپنگ کے بعد گھر لوٹے تو شوہر نے کہا،

"تم مجھے بھلکڑ کہتی ہو مگر دیکھو! تم اپنی چھتری دوکان پر چھوڑ آئی تھیں، اور میں نہ صرف یہ کہ اپنی چھتری لے آیا ہوں بلکہ تمہاری چھوڑی ہوئی چھتری بھی ساتھ لیتا آیا ہوں"؟

بیوی نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "آپ نے یہ کیا غضب کیا! ہم تو خالی ہاتھ شاپنگ کے لیے نکلے تھے۔ وہ دیکھئے! ہماری چھتریاں تو گھر پر ہی موجود ہیں"!

ہمیں افسوس ہے کہ بہت سے سخن ہائے گفتنی بخوف طوالت ناگفتہ رہ گئے۔ ▭▭

سلطان جمہوری (بنگلور)

مونچھوں کی تاریخ

مونچھوں کا طبعی اور ماورائی جغرافیہ سمجھنے میں لوگوں نے بڑی غلطی کی ہے اور غلطی سے اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہونٹوں کے اوپر اور ناک کے نیچے بالوں کا جو خودرو پودا اگتا ہے اُسی کو مونچھ کہتے ہیں۔ ایسا سمجھنا اس کی زمانی اور مکانی معنویت کو یکسر معدوم کر دینا ہے۔ اس کی زمانی حیثیت ازل اور ابد پر محیط ہے، کیوں کہ دُنیا کی تخلیق کا خدائی سبب خواہ کچھ بھی رہا ہو، مگر انسانی مطالعہ کے نزدیک تخلیق کا سبب مونچھ ہی ہے۔

ابلیس کا انکارِ سجدہ اس کی اپنی مونچھوں کی بناء پر تھا جو روزِ ازل سے قبل ہی ارتقاء کے کمال کو پہنچ گئی تھیں۔ مگر ابلیس اپنے تمام علم کے باوجود اس سے لاعلم تھا کہ آدم کے ہارمون گلینڈز بھی ہیں جو ذرا سا چھیڑ دیئے جانے پر اپنا کیمیائی عمل شروع کر کے مونچھیں پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

مونچھوں کا ایک خاص وقت میں مذکر افراد کے لبوں پر اُگنا شعوری ارتقاء کی وہ کڑی ہے جو فرد کو سماج سے ہم آہنگ کرتی ہے اور کارِ جمہور میں حصّہ لینے کا اہل بناتی ہے۔ عورتوں کی مونچھوں کا اندازِ ظہور جُداگانہ ہے۔ یہ بال کی صورت میں نہیں بلکہ سیّال کی صورت میں وبالِ تموّج پیدا کرتی ہے اور کارِ جہاں کی "درازگی" کا اصل سبب بنتی ہے۔

مَردوں کی مونچھوں کو مونچھ جلی اور عورتوں کی مونچھوں کو مونچھ خفی کہا جا سکتا ہے۔ بعض مَرد اپنے ہونٹوں پر اس کے ظہور کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کی شانِ کبریائی پر خاکساری اور انکساری کا اُسترہ چلا کر بڑی بیدردی سے مونڈ ڈالتے ہیں، جس سے جنس کی شناخت میں بعض وقت دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اس دشواری کو عملی ذرائع سے حل کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ دشواری جو مونچھوں کا مطمحِ نظر سمجھنے سے متعلق ہوتی ہے تقریباً لاینحل ہے اور روشن ضمیری اور کشف ہی سے مونچھوں کی غرض و غایت معلوم کی جا سکتی ہے۔ دورِ حاضر کے ماہرینِ نفسیات و سائنس کا خیال ہے کہ جسمِ انسانی سے مختلف لمبائیوں کی الکٹرو میگنٹ لہریں خارج ہوتی ہیں۔ ان کی دُم پکڑ کر تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مگر رڈار اور AMMING کی تکنیک یعنی لہروں کے ذریعہ صحیح معلومات کو غلط بنا دینے کے طریقوں سے ممکن نہیں رہا ہے کہ صاحبِ مونچھ کی نیت اور عمل کی مطابقت معلوم کی جا سکے!

بعض صوفیاء نے تصوّف کے طریقے سے گریباں کے اندر جھانکا تو تہہ میں مونچھ ہی کارفرما نظر آئی۔ اس کے سوا واللہ کچھ بھی نہیں تھا۔ غالبًا اصغر گونڈوی کا اشارہ اسی طرف ہے۔ ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا ؎ جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

سابقہ تجربات کی بنا پر ہی نئی تہذیب نے مونچھ کو اولیت دی ہے اور اسے ہر کام پر مقدم رکھا ہے، یہاں تک ملکوں کے مابین یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ سب سے پہلے اس پر کس نے توجہ دی۔ یونان، مصر و روم اور چین و ایران اپنی ی جگہ دعویدار ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان جو ہر چیز کے افادی پہلو پر سب سے پہلے غور کرتا ہے اس کا تدائی با غبان ہے اور یہیں سے اس کی تشکیل و تقطیع شروع ہوئی۔

مختلف زمانوں میں مختلف حالات کے پیش نظر اس پر کافی تجربے کئے گئے۔ تاریخ کی روشنی میں سب سے پہلا تجربہ رامائن کے دور میں ہوا جبکہ راون کو رام کو شکست دینے کے لیے بڑی ڈراؤنی اور گھنی مونچھیں رکھنی پڑیں۔ ب بھی جنوبی ہند کی مورتیوں کو دیکھ کر اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد اس کی پیش قدمی شمال کی طرف ہوئی، جہاں مہابھارت کی جنگ کے بعد یہ چاروں طرف پھیلنا شروع ہوئی۔ سب سے پہلے صوبہ راجستھان نے سے قبول کیا۔ پرتھوی راج چوہان کی مونچھیں راجہ جے چند کی غداری سے بکھر نہ جاتیں تو کیا ترائن کی جنگ میں وری کامیاب ہوسکتا تھا؟؟

یہی حال رانا سانگا کے ساتھ ہلدی گھاٹ میں ہوا۔ بابر جیت تو گیا مگر اُسے احساس بھی ہوگیا کہ بغیر مونچھوں ے ہندوستان بھی فرغانہ ثابت ہوگا۔ اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کرگیا کہ جتنی جلدی ہو سکے مونچھیں رکھ لے۔ مگر یرشاہ نے اُسے موقع ہی نہ دیا اور باپ کا یہی حشر دیکھ کر اکبر نے شروع ہی سے مونچھیں بڑھانا شروع کردیں، اور سے اتنی ترقی دی کہ راجپوت سُورما سب کے سب اس کے مطیع ہوگئے۔ بھلا اُس کی مونچھوں کی عظمت اور پھیلاؤ لیا حال ہوگا کہ جب جہانگیر کی وراثت میں آئی تو وہ سنبھال نہ سکا اور جس کے نتیجہ میں حضرت شیخ سرہندیؒ کو شرعی ی سنبھالنا پڑی تھی۔ اورنگ زیب نے اسے شرعی حدود میں رکھنے کے لیے اپنی تمام قوت صرف کردی اور تمام مونچھوں انڈر گراؤنڈ ہوجانے پر مجبور کردیا۔ ایک مدت تک اس حال میں رہنے پر بے حسی طاری ہوگئی اور ۱۸۵۷ء کے غدر میں ریزوں کی للکار پر اس کا ایک بال بھی نہ اُبھرا۔ اسی واقعہ کو غالب نے یوں قلمبند کیا ہے ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار ؎ یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے ۔؟

انگریزوں کے یہاں مونچھوں کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ اس کے لیے کوئی لفظ۔ انہوں نے اسی "مشتاق" سے MOUSTACH بنالیا۔ اب اس روشنی میں شعر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم تو سراپا مونچھ بنا کر مبارزت طلب کر رہے اگر کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔ ان کی عزت و حمیت کہاں گئی؟ او گاڈ! آخر یہ ماجرا کیا ہے؟

سرزمین ہند میں فرانسیسی نوآبادیات نہ ہوتیں تو انگریزی جوہر بلا مدمقابل اپنی موت آپ مرجاتا۔ اس ت کا شدت سے انہیں احساس ہوا اور پہلی فرصت میں نوابینِ ہند سے مونچھیں مستعار لینے کا کام شروع کردیا سب میں منفرد و ممتاز مونچھ ٹیپو سلطان کی تھی جس کی آرزو نیپولین نے بھی کی تھی، اور اقبال کی خودی کے ماخذ ایک ماخذ یہ بھی تھی۔ اسی کی ستائش میں وہ ساحلِ کاویری پر نغمہ زن ہوئے تھے۔

بہرحال انگریزوں نے اپنی حکمتِ عملی سے ہندوستان میں از سرِ نو مونچھوں کی تبلیغ شروع کردی اور جس کا ہ یہ ہوا کہ بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر اور آئی سی ایس آفیسران وغیرہ نے مونچھوں کا ایک عہد قائم کردیا جس کو تاریخ میں GOLDEN ERA OF MOUSTACH یعنی مونچھوں کا عہد زرین کہتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ

اپنے عملِ خیر کو متحرک رکھنے کے لیے انگریزوں نے جس شر کی بنا ڈالی تھی آخرکار وہی اُن کی جلاوطنی کا سبب بن گئی۔ مگر جلتے جاتے وہ "موتچھ بکھیرو اور اپنی خیر" کا فارمولا بتاتے گئے جو ہر جگہ تمام شرح و بسط کے ساتھ مستعمل ہے۔

انگریزوں کی حکمتِ عملی سے اس کے پڑوسی ملک کب خاموش رہ سکتے تھے۔ فرانس نے بھی فرنچ کٹ کی تبلیغ شروع کر دی۔ دنیا کے بیشتر ملکوں نے اسے قبول کیا۔ ہندوستان میں مولانا آزاد نے جو انگریزوں کے کٹر دشمن تھے غالباً سب سے پہلے قبول کیا۔ جرمن قوم نے جو نطشے کے نسلی فلسفے کا شکار ہو چکی تھی، چھوٹا مارکر پوری فرنچ کٹ اڑا لینا چاہی مگر دو چار بال ہی ہاتھ آسکے جسے ہٹلر نے اپنی ناک کے نیچے چپکا لیا۔ وہ ناک پر مکھی بٹھانے کا قائل تھا، جس سے ایک زمانہ اس سے بیزار تھا اور نتیجے میں اس کا وہی حشر ہوا جو اُس شاعر کا ہوتا ہے جو اپنی حسیّ، وجدانی اور علمی کم مائگی کے باوجود چھوٹی بحر میں شاعری کرتا رہتا ہے۔

چھوٹی بحر کی اس عظیم غیر مقبولیت کو دیکھ کر اسٹالن نے بڑی بحر اختیار کرلی۔ جس سے چین کی سرحدیں متاثر ہونا شروع ہوگئیں اور چینیوں نے الزام لگایا کہ گرچہ اسٹالن کی موتچھوں کا جواب نہیں، مگر اس میں تو اس جدّت کی بات نظر نہیں آتی جس کی اتنی افواہ پھیلائی گئی ہے۔ نئی اور جدید شاعری کے تو ہم ہی علمبردار کہے جاسکتے ہیں کہ ہماری موتچھوں کے ہر بال کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جہاں سے چاہے نکلے اور جتنا چاہے بڑھے! اور پھر موتچھیں اپنے اظہار کا محتاج ہی کیوں رہیں؟ ہم چینیوں میں اکثر ایسے ہیں جن کی موتچھوں کی دو ایک بال بھی نظر نہیں آتے۔

یہ تمام مفروضات موتچھوں کا ارتقائی کڑیاں ہیں اور اس سلسلے میں کوئی ملک یا کوئی فرد اس کے ارتقاء کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ البتہ ہندوستان میں اس کے روشن و قوی امکانات ہیں۔ یوں تو اس کی ابتداء یہیں سے ہوئی تھی اور ہونا تو یہی چاہیئے تھا کہ اس کی مزید باضابطہ نشوونما یہیں ہوتی، مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو انگریزوں کا ہندوستان میں ہوا تھا۔

بہرحال موتچھیں خود اپنی سچائی اور ناقابلِ تردید حقیقت کی بناء پر ہندوستان کی سرحد سے نکل کر دنیا میں پھیل گئیں۔ سرحد کے پار سب سے پہلے منصور حلاج نے اِسے اناکے نام سے پکارا۔ کیوں کہ اس حقیقت کی تسلیم کے بغیر ذاتِ باری کے وجود اور اس کی تجلیات کا برجستہ اور بے خود اقرار ناممکن تھا۔ مگر لوگ انا کو مخلوق کہتے ہوئے بھی خالق سے جُدا سمجھنے کے لیے راضی نہ تھے۔ منصور کے نزدیک علحدگی کا شعور (احساسِ من و تو) پیدا کر دینا ہی خالق کا اصل کمال تھا۔ اگر بندہ اس شعور کے حق ہونے سے انکار کرے تو وہ کس شعور سے خالق کی ذات کا اقرار کرسکتا؟

مگر عوام کی موتچھیں ارتقائی سفر میں بہت پیچھے تھیں۔ اس لیے کسی نے ان کا نوٹس نہ لیا۔ لیکن خواص کے بحرِ فکر میں تلاطم ضرور پیدا ہوگیا۔ رفتہ رفتہ انہیں احساس ہونے لگا کہ دنیا کے سماجی، سیاسی اور سائنسی انقلابات کے پیچھے انہیں موتچھوں کا ہاتھ ہے۔ اگر اس کی صحیح تراش و خراش نہ کی گئی تو قدرت کی پیشہ وارانہ حریف ثابت ہوگی۔ خدا کا کام بندوں کی تخلیق کرنا ہے، اور بندوں کا کام غلام بنانا ہو جائے گا۔

اس کی تراش و خراش اور تشکیل و تقطیع کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کی گزشتہ کارگزاریوں کا کوئی باضابطہ ریکارڈ بھی موجود نہیں کہ اس روشنی میں اس کو از سرِ نو سنوارا جائے اور بنی نوعِ انسان کے لیے کارآمد بنایا جائے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب تحقیق و جستجو سے اس کی تاریخ مرتب کی جائے اور بذریعہ قانون ہونٹوں پر چسپاں کیا جائے۔ صرف وہی شخص اپنے آہنی ہاتھوں سے اسے نافذ کرسکتا جس کے پاس بانگِ درا کے علاوہ اور کوئی سامان نہ ہو۔

عملی اقدام سے قطع نظر اس کی قطع برید پر بہتوں نے روشنی ڈالی ہے. ان میں دو نام بہت مشہور ہیں ایک جرمنی کے نطشے کا اور دوسرا برصغیر کے اقبال کا۔ دونوں نے اپنے اپنے فلسفے کی لیبارٹری میں بھانت بھانت کی مونچھوں کا تجزیہ کیا. مگر دونوں کے نتائج خلاف تھے. نطشے کی مونچھیں جنگِ عظیم برپا کر کے خلائے شمس و قمر میں گم ہوگئیں اور اقبال . . . . اُن کا فلسفہ بازیافت کی حیثیت رکھتا ہے. یعنی انہوں نے مونچھ کو اپنی گرفت میں رکھ کر اس کے ہر بال کا مطالعہ کیا اور ڈھونڈھ کر اس میں سے "خودی" نکالا، جو انسانی ہیولے کا "نیوکلیس" ہے.

"اسرارِ خودی" میں انہوں نے نہایت تفصیل سے اس کا جغرافیہ بیان کیا ہے. اس کی تراش خراش اور شباہت کے طریقے بتائے ہیں اور آخر میں اس کا شاندار نتیجہ بھی دکھایا ہے. اس میں شک نہیں کہ ایسی مونچھ کے ساتھ آدمی نہ صرف اپنے جامے میں رہتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی ننگ دھڑنگ نہیں ہونے دیتا. مگر مشکل یہ کہ ایسے حجام ناپید ہیں جو اس قسم کی آٹو میٹک ٹائپ کی مونچھیں تراش سکیں جو گلشن کو دیکھ کر شبنم اور صحرا دیکھ کر طوفان بن جائے!

وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ضرورت کے وقت مونچھیں یزداں پر بھی کمند پھینک سکیں، بیخودی کے اس رمز سے بھی واقف ہوں کہ چشمۂ حیواں پر پہنچ کر سبو کا توڑ دینا جبر کا انکار اور اختیار کا علی الاعلان ہے اور خدا طلبی پر یہ کہلا بھیجنے کی شان ہو کہ کارِ جہاں کے دراز ہونے کی وجہ سے فرصت نہیں! حتیٰ کہ اس کے اندر جنوں کی صلاحیت بھی ہو کہ حشر کے میدان میں تمام بندوں کے سامنے وہ دامنِ یزداں کو چاک کر سکے!!

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ وہ قدرت سے دو دو ہاتھ کرنے والی مونچھوں کے خواہاں تھے بلکہ وہ انا کی تمام ادائے انانیت سے آگاہ ہو کر اس طرح بہ کار بند ہونا چاہتے تھے کہ خدا اور بندے کے تعلق میں شرکت سے پیدا شدہ احتیاج و مجبوری کا خاتمہ ہو جائے ورنہ عالمِ جنوں میں بھی وہ خدا کا دامن پکڑنے کی بات نہ کرتے. ہر حال میں انہیں اپنا گریباں یاد رہتا ہے اور یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے ان کی مونچھوں کی. یہ وہ خودی کو خدا بننے نہیں دیتے!

تہذیب جدید کی تمام مونچھیں مشغول بخود ہیں اور ان کے مشغول بحق ہونے کے آثار نظر نہیں آتے. دیکھ سے پہلے یہ انا اور خودی کی منزلوں تک پہنچ سکیں گی یا نہیں یہ وقت کی طوالت سے زیادہ انسان کی ہمت پر منحصر ہے. ویسے ایک ذات ایسی ضرور گزر چکی ہے جو تمام انسانوں کے لیے چیلنج ہے!! ☐

قمر الزماں قمر
(رانچی)

فکرِ گندم

فطرتِ انساں میں ہے جو حضرتِ آدم کی خُو
سونگھتا پھرتا ہے ہر فرد و بشر گندم کی بُو

چور بازاری کے باعث اس کی جب دولت بڑھی
ابنِ آدم پر مصیبت کی نئی اک تہہ چڑھی

ہو بھلا سرکار کا جس نے کیا یہ انتظام
سستے داموں پہلے گیہوں ہیں ہر صبح و شام

چند دروازوں سے لیکن جس نے چاہا لے لیا
پیسے والوں پر کرم یہ کم نہیں سرکار کا

مفلسوں کے واسطے راشن کی دوکانیں مگر
حشر کے میدان کا ہوتی ہیں نقشہ سربسر

تجربہ اپنا ہے خاص الخاص یہ عالی جناب
ہے حصولِ دانۂ گندم جہنم کا عذاب

ہاتھ میں جھولا لیے کیو میں رہا دن بھر کھڑا
تب کہیں دو سیر گیہوں سخت مشکل سے ملا

مِل گیا گیہوں تو یاد آنے لگا پھر اپنا گھر
اپنا حلیہ پاگلوں جیسا بنا تھا سربسر

سب بٹن فرقت کا لے کے دے گئے تھے مجھ کو داغ
ایک چپل بھی تھا غائب کام کیا کرتا دماغ

دھول سے چہرہ اَٹا تھا، بال تھے بکھرے ہوئے
فقرہ بانوں نے کہا مجنوں نئے پیدا ہوئے

ایک پولس گاڑی کھڑی تھی سامنے ہی موڑ پر
دیکھتے ہی اک سپاہی پاس پہنچا دوڑ کر

میں دہائی اپنے گیہوں کی اُسے دیتا رہا
میری باتوں کا نہ مطلق اُس نے کچھ نوٹس لیا

گرچہ میں نے لاکھ کوشش کی کہ پا جاؤں نجات
اور واپس ہو مری حاصل شدہ جنسِ حیات

اک منسٹر سے ریلیشن کا حوالہ بھی دیا!
ہنس کے بولا میں تو خود ہوں اک منسٹر کا چچا

کھول کر دیکھا جو تھیلا چیخ کر کہنے لگا
لایا ہے پتھر، ارادہ اس کا تھا گھر اڈّا کا

اپنا گیہوں دیکھ کر خود میں بھی ششدر ہو گیا
میرے جھولے میں عوض گیہوں کے کنکر تھا بھرا

حرصِ گندم نے نہ رکھا دین و دُنیا کا قمر
جدِّ امجد کے گنہ کا بوجھ ہے اولاد پر

غزل

لاغر مرلی

کھٹی چیزوں پہ دل اُن کا قربان ہے
آنے والا کیا پھر کوئی مہمان ہے

چھٹا رہتا ہے کیوں پاس کے پاؤں سے
کوئی پاجامہ ہے یا تو انسان ہے؟

کس قدر غیر فطری ہے گھر آپ کا
کمرہ کوئی نہیں صرف دالان ہے

کوٹھی میں ہلکو ہلو کھسک جائیں گے
دوستوں کی یہی ایک پہچان ہے

میں خیالوں میں اُن کے تھا کھویا ہوا
ڈاکٹر نے کہا "یہ تو بے جان ہے"

دال میں کالا لگتا ہے کچھ کچھ مجھے
معنی خیز اُن کے ہونٹوں کی مسکان ہے

خوب جوڑی ہے لگنے نہ پائے نظر
ہم ہیں لاغر تو بیگم پہلوان ہے

شاطر گورکھپوری

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک غزل جب میں نے کہہ لی باہمی امداد سے
میں گیا اصلاح لینے کے لیے استاد سے

تھی نئی میرے لیے آدابِ شاگردی کی بات
پہلا پہلا سابقہ تھا، پہلی پہلی واردات

ہنس کے بولے لیجیے بیٹھیے آپ اب تک کہاں روپوش تھے
جب زبان و فکر و فن رکھتے تھے کیوں خاموش تھے

کیا بتاؤں آپ کے کنبہ سے تھا کتنا لگاؤ
ہاں مگر چلتی بھی کب تک پانی پہ کاغذ کی ناؤ

میرے اپنے دوستوں میں بس یہی دو چار تھے
آپ کے مرحوم والد تو لنگوٹی یار تھے

کوئی لوٹا ہی نہیں در سے مرے دستِ تہی
آپ آئے ہیں تو ہم دیکھیں گے غزلیں آپ کی

ایک اک مصرعہ پہ دکھلاؤں گا وہ گلکاریاں
اپنی غزلیں پھینک دیں گے شہر کے سب خوش بیاں

جب بھی محفل میں پڑھیں گے آپ اصلاحی کلام
لوگ جھک جھک کر کریں گے آپ کو فرشی سلام

اہلِ دانش کتنے ہو جائیں گے محفل سے فرار
کتنوں کو دھر پکڑ لے گا ڈانس ہی پر فصلی بخار

حاسدانِ فکر و فن کے دل میں ہوں گی خارشیں
آپ پر دن رات ہوں گی دادِ نو کی بارشیں

چشمِ بد دور، آپ کے چہرے سے ہوتا ہے عیاں
بالیقیں اک روز ہوں گے نازشِ اردو زباں

آج تو ہے خیر پہلا روز، جائیں آپ گھر
کل مگر لانا نہ بھولیں، لال موہن سیر بھر

جب تلک میٹھا نہیں ہوتا ہے منہ استاد کا
رہتا ہے ہر اک غزل کا پھیکا پھیکا سا مزہ

دیکھیے بیٹھے ہیں کچھ شاگرد بھائی آپ کے
چائے بسکٹ تو ذرا اُن کے لیے منگوائیے

گھر کے اندر کمرے میں بیٹھے ہیں کچھ مہمان جی
ایک پیکٹ ہو "پناما" جی ذرا کچھ پان جی

حکم پر استاد کے پاکٹ کو پلجھانا پڑا
بادلِ ناخواستہ سب مجھ کو منگوانا پڑا

وقتِ رخصت جب لگایا میں نے خرچوں کا حساب
کر گیا دل دھک سے میرا ہو گئی حالت خراب

میری دن بھر کی کمائی صرفِ یاراں ہو گئی
کھنچنے سے پہلے ہی ہر تصویر عریاں ہو گئی

اور جس دم یہ خیال آیا کہ پھر جانا ہے کل
بن گئی میرے لیے اک زہر کا پیالہ غزل

شعر کہنا سہل، پر اصلاح مشکل ہو گئی
شاعری میرے لیے اک سمِ قاتل ہو گئی

سوچتا ہوں اب، رہوں انسان یا شاعر بنوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

روشن لال روشن بنارسی ... معہ غالب سے معذرت کے ساتھ

ہم نے مانا کہ وہ محتاط بہت ہیں لیکن
"پار" ہو جائیں گے ہم اُن کو خبر ہونے تک

لال پیلی کبھی نیلی کبھی مدھم کبھی تیز
"شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

"غالب ایوارڈ" دے کے وہ مجھ پہ خوش تھا
"ہاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں"

جب کھسک گئے تو بیٹھ کے ہوٹل میں چائے پی
"تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں"

اردو کے خیر خواہ نہیں کیا یہ اہلِ فن
"جو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں"

عابد معز

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

"پھر وہی ہفتہ"

پچھلے سال اگست کے مہینے میں "مرا شہر لوگاں سوں معمور کر" عنوان کے تحت ہمارا مضمون "پنجفتہ" شائع ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے شہر میں پانچ دن کا ہفتہ رائج کیا گیا تھا۔ ایک سال بعد ہم پھر اگست کے مہینے میں "پھر وہی ہفتہ" کے زیر عنوان آپ سے مخاطب ہیں۔ کیونکہ حیدرآباد میں چند دن قبل اعلان ہوا ہے کہ ہماری ریاست کو پھر سے ہفتہ میں چھ دن کام ہوگا۔ ہفتہ کے دن کی چھٹی منسوخ ہوگی۔ دفاتر صبح دیر سے شروع اور شام جلد بند ہوں گے۔ اہل حیدرآباد جو مزاج یار بلکہ آر (یعنی این ٹی آر) میں آئے کہہ کر ملے جلے انداز میں اظہار خیال کرنے لگے۔ پنجفتہ کا نفاذ ملازمین کو سہولت پہنچانے کی غرض سے کیا گیا تھا اور اب پھر سے چھ دن کے ہفتے کے احکام کا مقصد عوام کو سہولت پہنچانا ہے۔ ملازمین اور عوام کو سہولت پہنچانے کے علاوہ ہفتہ سے پنجفتہ اور پنجفتہ سے ہفتہ میں تبدیلی کی کوئی اور وجہ نہیں بتلائی گئی۔

ہم نے بہت غور کیا اور سوچا کہ آخر اس پنجفتہ سے فائدہ کیسے تھا۔ ہفتہ کے دن زندگی کی ہماہمی دوسرے پانچ دنوں کی طرح رہتی ہے۔ کارخانے میں مزدور کام کرتے ہیں۔ بازار کھلے ہوتے ہیں لوگ بیمار پڑتے اور دواخانے جاتے ہیں سڑکوں پر روز جیسی چہل پہل رہتی ہے حتیٰ کہ بچے اسکول اور کالج بھی جاتے ہیں۔ صرف دفاتر بند رہتے تھے۔ ہفتہ کے دن ہمیں دفتر نہ جاتا دیکھ کر ہمارا پانچ سالہ لڑکا اسکول کے بجائے دفتر جانے کی ضد کرنے لگا تھا۔ وجہ دریافت کرنے پر اس نے بتلایا تھا کہ دفتر کو ہفتہ اور اتوار دو دن کی چھٹی ملتی ہے۔

غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ پنجفتہ سے صرف بابو لوگوں کو فائدہ تھا۔ بابو لوگوں کو ہفتہ میں دو دن کی چھٹی حاصل تھی لیکن اس چھٹی کے صحیح ڈھنگ کے استعمال سے وہ قاصر تھے۔ بابو لوگوں کی بندھی ٹکی زندگی ہوتی ہے جو صدیوں سے مقرر کردہ معمولات کے اطراف گھوم رہی ہے۔ میز کرسی، فائلوں کا انبار اور ان فائلوں پر روایتی نوٹس، محدود آمدنی، کثیر العیالی، تنخواہ ملتے پر قرضداروں میں تقسیم کردینا اور بقیہ دن پھر قرضہ حاصل کر کے گزارنا۔ ایسے حالات اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہفتہ اور اتوار کو تفریح کے مزے لوٹے، شاپنگ کرے، فلمیں دیکھے یا ہوٹلنگ کرے۔ چھٹی کے دن بھی بابو صاحب کا ایک معمول ہوتا ہے۔

دیر تک سوتا۔ نیند سے بیدار ہوکر بیوی سے جھگڑنا اور غصہ بچوں پر اتار کر شہر کی سڑکیں ناپنے نکل جانا شام تک کر واپس آنا اور منہ بسورے ہوکا سو جانا۔ اس طریقہ سے چھٹی گزارنے کے لیے ہفتہ میں ایک دن کافی ہے پھر یہ دو دن کی چھٹی کا نوٹ کس بابو نے پیش کیا تھا؟ یہ پلان کس بابو نے کن حالات کے تحت اور کیوں ڈرافٹ کیا تھا؟ ہمارے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔

پنجفتہ کے ناکام ہونے کی وجہ ہماری ناقص رائے میں ملاوٹ ہے۔ پنجفتہ کے دوران ہمیں پانچ دن خالص کام کرنا اور دو دن آرام کرنا نہیں آیا۔ ہم ملاوٹ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی خالص چیز ہمیں راس نہیں آتی۔ چاول میں کنکر، دودھ میں پانی، تنخواہ میں رشوت، کاٹن میں ٹیریلین، عبادت میں ریاکاری۔ غرض ہماری زندگی کے ہر پہلو میں ملاوٹ ہے۔ دفاتر میں بھی ہمارا طریقۂ کار کام اور تفریح کو ملاکر چلانا ہے۔ صبح دن چڑھے تک آرام کرنے کے بعد دیر سے دفتر پہنچے۔ حاضری کے لیے دستخط کی گھر تا دفتر کے سفر کی تھکن اتارنے کے لیے کچھ دیر سستایا۔ دوست احباب کی خیریت دریافت کی، سیاست پر تبادلۂ خیال کیا۔ الماری سے فائل، کاغذات اور رجسٹر نکالے، گرد صاف کی، انھیں میز پر قرینہ سے رکھا، پن کھولا اور ساتھیوں کے ساتھ چائے پینے اٹھ گئے۔ بحالتِ مجبوری کبھی کبھار چائے سیٹ پر ہی پی لی ورنہ ہر روز چائے پینے کینٹین پہنچے۔ کچھ کھایا اور پھر چائے کافی پی، گپ شپ کی۔ ضرورت سے فارغ ہوئے اور سیٹ پر واپس پہنچے۔ کچھ دیر انہماک سے کام کیا کہ لنچ کا وقت ہوا۔ ہر چیز جیسی بھی اور جہاں بھی تھی اسی حالت میں چھوڑ، ٹفن باکس اٹھائے اور لنچ کرنے چلے گئے۔ لنچ کیا چائے پی اور سگریٹ پھونکا، کچھ دیر قیلولہ کیا۔ لنچ کا وقت ختم ہونے کے بہت دیر بعد سیٹ پر پہنچے۔ پھر کچھ دیر کام کیا کہ شام کی چائے کا وقت ہوا۔ چائے پی سستی توڑی اور جستی سے دفتر چھوڑنے کی تیاری میں لگ گئے۔ مختلف کاغذوں، فائلوں کو اکٹھا کیا۔ انھیں الماری میں ٹھونسا اکثر وقت سے پہلے تو کبھی کبھار وقت پر دفتر چھوڑا۔ دوستوں کے ساتھ شام کی چہل قدمی کی کبھی فلم دیکھی تو کبھی شاپنگ کی۔ رات گھر پہنچے۔ چھٹی کے دن بھی اکثر ایک دو فائل لیے گھر جاتے ہیں گھر پر کام کو یاد کرتے ہوئے آرام کرتے ہیں اور نہ ہی کام۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی کام کے وقت صرف کام اور چھٹی کے دن صرف اور صرف تفریح اور آرام کے مزے لوٹتا ہے۔ کام اور تفریح ایک ساتھ کرنے کی عادت کے حساب سے ہمیں اتوار کی چھٹی بھی نہیں ملنی چاہیے۔ ہفتہ واری چھٹیاں انھیں ملنی چاہیں جنھیں کام کرنے کا طریقہ اور آرام کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

پچھلے چند برسوں سے ہمارے شہر میں مختلف تجربے کیے جا رہے ہیں لیکن ہر تجربہ ناکام ہو رہا ہے۔ دفعتہ دفعتہ سے وزیراعلیٰ تبدیل کرنے کا عمل غلط رہا، جمہوری حکومت کو برطرف کرنے کا تجربہ ناکام رہا وظیفہ کی سبکدوشی کی عمر کم کرنا مصیبت ثابت ہوا، چند ملازمین کو برطرف کرکے پھر واپس لینا پڑا۔ ایسے ہی پنجفتہ کا نفاذ ہمارے شہر میں دوسری مرتبہ ہوا۔ دونوں مرتبہ یہ تجربہ ناکام رہا۔ وجہ کے تعلق سے ہم نے اپنی ناقص رائے کا اظہار کر دیا لیکن حقیقتاً دوسری مرتبہ ناکامی کی سنجیدگی سے اعلیٰ تحقیقات ہونی چاہیے۔ کیونکہ دو مرتبہ بھی ہمارے شہر میں دو دن کی چھٹیاں رائج نہ ہو سکیں۔ برآمد شدہ نتائج کی روشنی میں تیسری مرتبہ بہت سوچ سمجھ کر پنجفتہ کو نافذ کرنا چاہیے۔ مختلف انقلابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ مثال کے طور پر ملازمین کو چھٹی الاؤنس دینے کے تعلق سے سوچنا پڑے گا، کم سے کم چائے پینے والے ملازم کو انعام واکرام سے نوازنا ہوگا۔ سیٹ پر ملازم کو زیادہ وقت

بٹھانے کے لیے سیٹ بیلٹ لگانے ہوں گے بلکہ بلیٹ کے ساتھ لاک بھی ضروری ہوں گے ویسے یہ تجربہ تیسری چوتھی اور پانچویں بار بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ ایک شاعر نے سامعین کے اصرار پر ایک ہی مصرعہ مکرّر پڑھتے پڑھتے تھک کر پوچھا آخر میں کب تک اس مصرعہ کو دہراتا رہوں گا، انھیں جواب دیا گیا تھا "جب تک آپ اس کی تصحیح نہ کرلیں"۔

ملازمت کرنے والے شوہر اور بیوی کے لیے پنجفتہ ایک رحمت تھا۔ کہتے ہیں زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے شوہر اور بیوی ہیں۔ آج مہنگائی کے دور میں زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے دونوں پہیوں کا کام کرنا ضروری ہے۔ صبح علیک سلیک اور ناشتہ کے بعد شوہر اور بیوی اپنے اپنے دفاتر چلے گئے، شام تھکے تھکائے گھر پہنچے۔ جس سے جو بن پڑا کام کیا اور اپنے چہرے مخالف سمت کرکے سو گئے۔ اس کے برخلاف چھٹی کے دن شوہر اور بیوی مل بیٹھتے، اکٹھے ناشتہ کرتے، فلم جاتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ ہفتہ کو بھی تعطیل ہو تو بچے اسکول جاتے ہیں شوہر اور بیوی کو گھر پر کچھ زیادہ ہی مزا آتا ہے ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ صرف چھٹی کے دن وہ اور ان کی مسز شوہر اور بیوی بنتے ہیں بقیہ دن وہ دونوں "ورکنگ پارٹنرز" بنے رہتے ہیں گویا پنجفتہ میں شوہر اور بیوی کے تعلقات استوار تھے۔

پنجفتہ کے نفاذ کے بعد سے چند لوگوں نے اپنی عادتوں میں تبدیلی لائی تھی۔ صبح جلد اٹھتے پھرتی سے کام کاج کرکے دفتر پہنچتے تھے۔ شام میں دفتر دیر سے بند ہوتا تھا۔ دن تمام کی تھکن کے بعد میٹھی نیند آتی تھی۔ ہفتہ اور اتوار کو آرام کرتے، دوست احباب سے ملتے اور چھٹی کا لطف اٹھاتے تھے۔ اب پھر سے انھیں اپنی وہی پرانی عادتیں اپنانی ہوں گی۔ سورج چڑھے تک سوتے رہیں گے۔ آرام سے دفتر پہنچیں گے۔ دفتر جلد برخاست ہوگا اور چونکہ دوسرا دن دیر سے شروع ہوگا اس لیے رات دیر گئے تک دوست احباب کے ساتھ گپ شپ کرتے رہیں گے۔ اکثر لوگوں نے پنجفتہ کے نفاذ کے باوجود اپنی پرانی عادتوں میں تبدیلی نہیں لائی تھی۔ حسب روایت قدیم دفتر آتے اور چلے جاتے تھے۔ ہمارے ایک ایسے ہی دوست نے چھ دن کام کے ہفتہ کے پھر سے نفاذ پر کہا "میاں ہمیں یقین تھا کہ پانچ دن کا ہفتہ چلنے والا نہیں ہے اسی لیے ہم نے نئے اوقات کی پابندی نہیں کی تھی" ہم نے یہ سن کر کہا "اگر آپ وقت پر آتے اور جاتے تو شاید پھر سے چھ دن کام کا ہفتہ نافذ کرنے کی نوبت نہ آتی؟" ہمارے دوست نے فضاء میں دیکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا "صرف اوقات کی تبدیلی سے حالات میں بہتری نہیں پیدا ہوتی"۔

محمد حنیف انصاری
(بھیونڈی)

عیدِ قرباں منانی ہے

○

بکری کی قربانی ہے / عید قرباں منانی ہے
ٹل نہیں سکتی قربانی / رسم دیں کی نشانی ہے
پیری سے ہے جو کہ نڈھال / بیگم کی وہ نانی ہے
چابی کمر میں لٹکائے / بیوی میری سیانی ہے
گھر میں راشن آج نہیں / بیوی بھی کھسیانی ہے
روٹی دال کا جھگڑا ہے / سب کی یہی کہانی ہے
رسوا جگ میں کر دینا / عادت اُن کی پرانی ہے
جو بھی دیکھے لٹو ہو / کیسی رسیلی جوانی ہے
شیریں شیریں باتیں ہیں / گیتوں میں بھی روانی ہے
دیکھ کے اُن کو سوچا ہوں / صورت تو پہچانی ہے
پیار میں اُن کے دُنیا کی / خاک ہمیشہ چھانی ہے
ایسا دیا اُس نے دھوکا / جام میں خالی پانی ہے
اس کی اُس کی چمچہ گری / دُنیا بڑی سیانی ہے
ان کے اشاروں پر سر خم / پھر بھی آنا کانی ہے
ظلم کریں ہر روز نئے / کیسی یہ من مانی ہے
کاش کہ وہ آجائیں حنیفؔ / بھیگی شام سہانی ہے

○

غافل انصاری
(سنسارپوری)

فیشن کا مرثیہ

اس بڑھاپے میں جوانی کا یہ عالم واہ واہ
کر رہی ہیں سلوٹیں ماتھے کی ماتم واہ واہ
تیس تیس کی عمر میں ہیں اُن کی دو دو چوٹیاں
نقری زلفیں الگ ہیں ان سے برہم واہ واہ
موٹی موٹی پرت ہونٹوں پر لپ اسٹک کی منڈھی
کیوں نہ ہو شرمندہ فوٹو رکھ کے البم واہ واہ
آنکھ میں کاجل کے ڈورے کر رہے اٹکھیلیاں
روشنی آنکھوں کی ہے ہر چند مدھم واہ واہ
پرکشش اُن کی نہ چتون اور نہ اعضائے بدن
گال ہیں پچکے ہوئے سے سُرخ شلغم واہ واہ
کھال کی ساری ملاحت ہو رہی ناپید ہے
پھسلتی جاتی ہے جلدِ نا ملائم واہ واہ
پاس ہیں جھائیں کے ہڈی پر ہے لالی کا نکھار
کاسمیٹک کا کرشمہ ہے یہ میڈم واہ واہ
لے اڑی آخر سفیدی، ابروؤں کی دلکشی
ہو گیا آخر خفا ٹیسر کا تشکم واہ واہ
پرس میں ان کے جو اک رکھا ہے خطِ معشوق کا
ہے وہی بس زندگی کا ان کی سنگم واہ واہ

حلیمہ فردوس (بنگلور)

"بعد مرنے کے میرے کیا ہوگا"

جب تک جیئے مَر مَر کے جیتے رہے اور جب مر جائیں گے تو خواہش ہے کہ امر ہو جائیں۔ خواہ وہ AIR CRASH کا حادثہ ہو، یا بلند و بالا عمارت کا انہدام یا دہشت پسندوں کی گولی کا نشانہ یہ سبھی راستے تو بقا کی طرف جاتے ہیں۔ جی ہاں ایسی موت فنا نہیں عین بقا کی منزل ہے۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا وہ تو دنیا جانتی ہے وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔ اجی صاحب آج کل تو بہت کچھ ہو رہا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات یا شہر کی کرفیو زدہ فضا میں اگر ایک لاوارث لاش بھی سیاسی پارٹی کو مِل جائے تو دیکھیے اس کی کیسی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ دھوم دھام سے اس غریب کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ اس شخص کو مرنے کے بعد وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کے لیے وہ زندگی بھر ترستا رہا۔ تن بھر کپڑے کے لیے ترسنے والے شخص کو سر سے پیر تک قیمتی کپڑے سے ڈھانک دیا جاتا ہے۔ جو ایک پھول بھی زندگی میں نہ سونگھ سکا ہو اُسے پھولوں کے ہار اور گلدستوں سے لاد دیا جاتا ہے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی اور اخبار میں بھی اسی کا چرچا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم، صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعلیٰ اور بڑی بڑی انجمنوں کی طرف سے قرار دادیں منظور کی جاتی ہیں۔ آئے دن کی اموات اور اس کی تشہیر کو دیکھ کر ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ ہمارا جنازہ بھی اسی زور و شور سے نکلے۔ ٹی وی پر سینکڑوں آنکھیں ہمارا نظارہ کریں۔ اخبار میں ہزاروں لوگ پڑھیں۔ ریڈیو پر کروڑوں لوگ سُنیں۔ کاش کہ ایسا ہوتا!

گیدڑ موت آنے پر شہر کی طرف بھاگتا ہے اور انسان موت آنے پر گھر سے بھاگ نکلنے سے پہلے ہی وصیت نامہ تیار کر دیتا ہے۔ وصیت نامہ کو دیکھ کر ملک الموت کی نیت بھی پلٹ جاتی ہے اور وہ ان آدمیوں کو موت کا نشانہ بناتا ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں رہتا۔ موت ہر ایک کی قسمت میں لکھی ہے۔ چاہے وہ انسان ہو کہ جانور مگر موت وہی اچھی سمجھی جاتی ہے جس پر سارا زمانہ افسوس کرے۔ عین جوانی میں کوئی مر جائے تو سارا زمانہ اس لیے افسوس کرتا ہے کہ یہ سانحہ "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے" کے مصداق ہوتا ہے اور ہم ایسی ہی موت کے قائل ہیں۔

ویسے ہماری نگاہ میں زندگی اور موت دونوں برابر ہیں۔ نہ اِس پر اعتبار نہ اُس پہ اختیار۔ زندگی پر اعتبار اس لیے نہیں کہ

"آدمی بلبلہ ہے پانی کا اور موت" پر اقتبا بھی نہیں کیوں کہ "ڈوبتے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے"۔ زندگی جس شکل میں گذری گزار دی۔ اس لیے ہم شاندار موت کے خواہاں ہیں۔ دیکھیں ہماری دلی آرزو اور نجومی کی پیش گوئی کب سچ ثابت ہوتی ہے۔ نجومی صرف نجومی ہوتا ہے۔ جو علم نجوم کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔ اُسے آسمان پر زمین پر حتیٰ کہ انسانوں کے چہرے اور ہاتھ کی لکیروں میں بھی تارے ہی تارے نظر آتے ہیں۔ دن میں تارے، رات میں تارے غرض چوبیس گھنٹے تارے ہی تارے نظر آتے ہیں۔ جس کی تفصیل سنا کر وہ دوسروں کی جیبیں کاٹتا اور اپنی جیبیں بھرتا ہے۔ اس کی پیشین گوئی ڈوبتے کے لیے تنکے کا سہارا ہوتی ہے۔ اکثر اوقات بنتے کام بگڑتے اور بستے گھر اُجڑ بھی جاتے ہیں تب بھی آپ نجومی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ شادی کی تاریخ طے کرنے نجومی کے پاس جانا پڑتا ہے۔ گھر کا بنیادی پتھر رکھنا ہو تو نجومی سے مشورہ ضروری ہے۔ اب تو نجومی کے دن بھی پلٹ گئے ہیں۔ آج کل نئے نجومی کے لیے رٹے ہوئے طوطے اور بوسیدہ کارڈ کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ کیونکہ اس نے بوڑھے برگد کے نیچے بیٹھنا ترک کردیا ہے اس کا قیام تو شہر کے فائیو اسٹار ہوٹلوں یا وزیروں کے مہمان خانوں میں ہوتا ہے ایسے نجومی کے لیے کمپیوٹر طوطے کا نعم البدل ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں کھٹ کھٹ کی صدا سے آپ کی بولتی بند کردیتا ہے آپ عشق کے چکر میں پھنسے ہوں تو وہ آپ کی لیلیٰ کو آپ کے قدموں میں پہنچا دے گا۔ نوکری کی تلاش میں ہوں تو ایسے در کا پتہ ضرور بتائے گا جہاں پہنچ کر آپ در بدر کی خاک چھاننے سے بچ جائیں گے۔ اگر آپ لکھ پتی بننے کی خواہش میں لاٹری ٹکٹ خریدتے ہوں تو پہلے وہ آپ کو ایک عدد بیوی کا پتی بننے کا مشورہ دے گا۔ پھر بتائے گا کہ آپ کو لاٹری کب ملنے والی ہے۔ اس کی پیشین گوئی کے مطابق آپ کا نمبر ضرور آئے گا۔ لیکن ٹکٹ ہوگا کرناٹک لاٹری کا اور نمبر ملے گا کیرالا لاٹری میں۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کرناٹک اور کیرالا میں کون سا زیادہ فرق ہے۔ نجومی کی پیشین گوئی کبھی نہ کبھی سچ ثابت ہوگی۔ ہمارا تو عقیدہ ہے کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ نجومی ہوتا ہے۔

معالج دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھتا ہے اور نجومی چمکتے ہوئے قسمت کے ستاروں پر اُنگلیاں رکھتا ہے۔
تاریک زندگی میں اُمید کی کرن کو جگمگانے والا یہی شخص ہے۔ نجومی لوگوں کو جینا سکھاتا ہے جینے کے آداب سکھاتا ہے۔ مرنے کی تاریخ بتاتا ہے۔ خطرات سے آگاہ کرتا ہے۔ ہم اس کے بہت مشکور ہیں۔ اگر پیشین گوئی پر دھیان نہ دیتے تو ہمارا بینک بیلنس اس قدر نہ بڑھتا اور کسی بچت اور بیمہ کٹوتی کی طرف خیال نہ جاتا اور خواہ مخواہ ہمیں سرکاری خزانے میں اپنی کمائی کا ایک بہت بڑا حصہ انکم ٹیکس کی صورت میں ادا کرنا پڑتا۔ ایک نہیں بلکہ درجن بھر نجومیوں نے ہمارے بارے میں یہی کہا ہے کہ موت کا دن تو معین ہے لیکن آپ کی موت معین دن سے پہلے ہی واقع ہوگی۔ ایک کو جھٹلایا جا سکتا ہے لیکن درجن بھر زبانوں کو نہیں۔ اس لیے ہمیں بھی اپنی موت کا یقین ہوگیا ہے اور ہم پوری تیاری کے ساتھ اس دن کے منتظر ہیں۔ ہر قسم کی بیمہ پالیسیاں ہم نے کروالی ہیں۔ تاکہ مرنے کے بعد ایک بڑی رقم سرکاری خزانہ سے ہمارے افرادِ خاندان کو ملے۔ وصیت کے ہم قائل نہیں۔ پالیسی پر جو نام ہوگا وہی فرد پیسوں کا حقدار بھی ہوگا۔ بس سارا جھگڑا ختم۔

ہم یہ یقین سے کہتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد کوئی خلا باقی نہیں رہے گا۔ جیسا کہ اکثر شاعروں، لیڈروں کو خوش فہمی ہوا کرتی ہے۔ موت کے لیے بھی مناسب موقع ہونا چاہیئے ورنہ بڑے بڑے شاعر اگر سرد موسم میں گزر جائیں تو لوگوں کی سرد مہری دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ کسی فنکار کے مرجانے پر اخبار و رسائل میں اس کے

الاتِ زندگی اور اس کی تصاویر دیکھ کر لوگ یہی کہتے ہیں کہ وہ بڑا خوش قسمت تھا اس کی موت نے سب کو کافی متاثر
ی۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ کسی کے گزرنے سے کوئی خلاء پیدا نہیں ہوتا چند
وں کے لیے بس روایتی طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ اگر خلاء پیدا ہوتے کا سلسلہ چلتا رہے تو نہ آسمان ہوگا نہ زمین
رسم خلاؤں میں معلق رہ جائیں گے۔ بجومی کی یہ بھی پیشن گوئی ہے کہ ہماری موت سے کوئی خلاء تو پیدا نہیں ہوگا
تہ ہمارے کارہائے نمایاں کی بدولت مرنے والوں کی فہرست میں ہمارا نام نمایاں رہے گا۔

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۔ اس لیے مرنے کی خواہش میں کئی لوگ جیتے ہیں۔ اور جیتے جی مرنے کا شائبل
ں کرتے ہیں عزیز و اقرباکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے بھی ہیں کہ کہیں یہ آنسو گر مچھ کے تو نہیں اور جو زندہ رہ
دکھ جھیلنا جانتے ہیں موت انہیں گلے لگالیتی ہے اور جو کچھ انھوں نے کیا اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے لوگ
راہے پر ایسی عظیم شخصیتوں کے مجسمے نصب کرتے ہیں۔ سڑکوں کو ان کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کی بدقسمتی
ر مجسمے کے سایے میں آوارہ گرد کتے لوٹتے ہیں تو کبھی کبھار معینوں کی تیز خرامی سے سڑکوں پر لگے ناموں
تختیاں اُلٹ جاتی ہیں مرنے والوں کے مجسموں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اُسے دیکھ کر ہمیں یقین ہے کہ
لم ارواح میں ضرور ان عظیم شخصیتوں کی ایک انجمن وجود میں آئی ہوگی اور سبھی اس خیال سے متفق ہوں گے کہ

"نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا"

نظر برنی (دہلی)

محبت نامہ : ایک ظریف کا

میری ڈارلنگ، میری کتّو!

تمہارا موتیوں جڑا خط کل کی ڈاک سے باصرہ نواز ہوا۔ لیکن اِن پندرہ دنوں میں انتظار کی مشقت نے مجھے ذہنی و جسمانی طور پر بیحد لاغر بنا ڈالا۔ یہ تسلیم کہ ہماری تمہاری محبت "ٹاپ سیکریٹ" ہے اور میری پہلی قانونی بیوی اور بچوں کو اس "ایڈلٹ فلم" کے بارے میں کچھ پتہ نہیں لیکن "وہ صبح کبھی تو آئے گی"۔ جب حجلۂ عروسی ایکبار پھر آراستہ ہوگا۔ اور خود میری "بیوی نمبر" دن" ہم دونوں کو "چیف آف پروٹوکول" کی حیثیت سے وہاں داخل کرے گی۔

تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ میری قانونی رفیقۂ حیات کو شادی کے چالیس برس کے بعد مجھ میں سینکڑوں کیڑے نظر آنے لگے ہیں۔ چنانچہ میں نے مجبوراً ایک شعر کہا ہے۔ ؎

یہ مُوا دفتر کا بابو میرا شوہر بن گیا　　میری بیوی کو ہے شکوہ شومئ تقدیر کا

جس دھوبن کے ہاتھ تمہارا احوال نامہ موصول ہوا، وہ مُڑتڑ کر ابوسینا کی کتاب کا مخطوطہ بن گیا تھا۔ غالباً وہ اس پرزہ کو کسی گاہک کے کپڑے میں رکھ کر بھول گئی تھی اور کافی دھلائی اور کُٹائی کے بعد اس کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ آئندہ اس دھوبن کو محتاط رہنے کی ہدایت کردینا۔ کیونکہ لو لیٹر اور پوسٹل لیٹر میں بہرحال امتیازی فرق ہونا ہی چاہیئے۔

بے اختیار غالب کا وہ شعر یاد آتا ہے۔ ؎

خُدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا　　کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

تم نے اپنے مخصوص انداز میں میری محبت کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ جب میں تم کو بیاہ کر لاؤں گا تو اپنی پہلی بیوی کے جملہ اختیارات تمہارے حوالے کردوں گا۔ جہانگیر نے تو شراب کے ایک پیالہ پہ نور جہاں سے شادی رچائی تھی مگر میں تمہاری شادی میں یار دوستوں کی ضیافت میں پورا میخانہ لٹا دوں گا۔ لیکن ڈارلنگ، یہ تو بتاؤ کہ عشق میں یہ مول تول کیا؟ ہم نے تو سُنا تھا کہ عشق اندھا ہوتا ہے مگر اس مرتبہ تم نے فرمائشوں کی ایک لمبی فہرست بنا کر بھیجی ہے جس کی قیمت لگائی جائے تو میرے پراویڈنٹ فنڈ کی کل رقم اور بیمہ کی پالیسی کی رقم سے کہیں زیادہ بیٹھے گی۔

جب عشق کی نوعیت "آمد" والے شعر کی طرح ہے تو پھر اس میں "آورد" کیسے شامل ہوگیا؟ میں نے جب

تم سے اظہار عشق کیا تھا تو اپنی پوزیشن صاف کر دی تھی۔ میں ایک معمولی سا کلرک ہوں اور میری آمدنی کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۵۵ سال کا ہونے کو ہوں۔ ریٹائرمنٹ کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ تین بچوں کی شادیاں کر چکا ہوں دو بچوں کی شادی تم سے شادی کرنے کے بعد کروں گا تاکہ تمہارے جہیز اور تنخواہ سے کچھ SAVING کر کے اس کا متحمل ہو سکوں۔

ایک بات بہت دنوں سے کھٹک رہی ہے۔ ذرا اس کی صفائی کر کے مجھے مطمئن کر دو۔ دفتر میں تمہارے برابر کی سیٹ پر جو کارکن بیٹھتا ہے، اس سے تم اکثر ہنس ہنس کر کیوں بات کرتی ہو؟ مجھے اس کی آنکھوں میں شیطانیت اور شرارت نظر آئی۔ وہ اگر اسی طرح تمہارے قریب رہا تو اندیشہ ہے کہ ایک دن تمہارے سارے وعدے اور قسمیں بلبلے کی طرح نیچے بیٹھ جائیں گی یہ سمجھداری کی بات نہیں۔ اگر رقیب روسیاہ کو تم نے بروقت وارننگ نہیں دی اور رسم و راہ کا یہ سلسلہ چلتا رہا تو پھر تم ایک دن سنو گی کہ تمہارے ایک سنیئر عاشق نے خودکشی کر لی۔

جانِ من!

سقراط سے پوچھا گیا کہ سب سے خوبصورت جانور کون سا ہے؟ تو جانتی ہو کہ اس نے کیا جواب دیا؟ سقراط نے کہا۔ عورت۔ اس عظیم فلسفی نے یہ جواب اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر دیا تھا۔ اصل میں سقراط کی بیوی نہایت ظالم چڑچڑی اور سنگدل تھی۔ ایک مرتبہ اس نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اپنے شوہر پر انڈیل دی تھی۔ اس پر سقراط نے بڑی متانت و لجاجت سے کہا۔ آج معلوم ہوا کہ بادل جب چمکتے ہیں تو کبھی کبھی برستے بھی ہیں۔ کچھ ایسا ہی تاثر میری پہلی بیوی نے بھی دیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ عمر کی اس منزل میں قدم رنجہ ہے جہاں کم از کم عورت کو دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے میں نے جھنجھلا کر اس سے کہدیا

پچپن کی عمر شاید بیگم کی ہو گئی ہے　؎　ڈھونڈیں گے ہم یقیناً اک اور ہی ٹھکانہ
اے میرے دل کی رانی وہ خوبیاں کہاں ہیں　؎　گفتار دلبرانہ، کردار عاشقانہ

اچھا، چلتے چلتے یہ بھی کہدیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

دیکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف — تم لیڈی کلرکوں میں ایک عیب بہت نمایاں اور یکساں پایا جاتا ہے کہ تم لوگ زیادہ محنت نہیں کر سکتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تم آفس روٹین کے سوائے باقی تمام کام بڑی چستی اور لگن سے کرتی ہو مثلاً لباس اور زیورات کی باتیں، تازہ فلموں اور ایکٹروں پر بے لاگ تبصرے کڑھائی اور بنائی کی باتیں اور ان کے پریکٹیکلز وغیرہ وغیرہ۔

دنیا کے مشکل ترین کاموں میں جہاں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنا ہے وہاں عورت کو رجھانا بھی شامل ہے لیکن اس مسلمہ حقیقت کے باوجود ہم نے عشق کی اوکھلی میں سر دیدیا ہے اب "موسل" سے کیوں ڈریں؟

اس عمر میں ہمارے سودائے عشق پر اڑوس پڑوس میں کافی چہ میگوئیاں ہو سکتی ہیں مگر کم از کم مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ ممکن ہے کہ لوگ یہ کہتے پھریں۔ ؎

اس بڑھاپے میں ذرا عشق کا سودا دیکھو　؎　ان کو دیکھو ذرا مرنے کی تمنا دیکھو

اور ہاں، تمہارے مشورہ پر میں نے اپنے بالوں میں خضاب لگانا شروع کر دیا ہے حالانکہ میری بیوی اور بچے

میرے اس شوق پر خوب قہقہے لگاتے ہیں۔ ادھر پیٹ تے بتیسی کا آرڈر بھی دے دیا ہے کیوں کہ آگے کے دو دانت اور تین داڑھیں بالکل جواب دے چکی ہیں۔ یقین جانو عقد ثانی کے وقت تک میرا جسمانی جغرافیہ کافی بدلا نظر آئے گا۔

خط کافی طویل ہوگیا ہے اور تمہیں کافی بوریت ہو رہی ہوگی۔ اس لیے قلم کو یہیں روکتا ہوں۔ اُمید ہے کہ جواب جلد بھجواؤ گی اور آئندہ کب اور کہاں ملاقات ہوگی اس کے بارے میں بھی تحریر کرنا بھولیے۔

تمہارا نقطہ تمہارا
مجنوں لیلوی

اِدارۂ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں!

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵ر	روپے
دھڑ گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	〃	۸ر	〃
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ر	〃
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷ر	〃
بالآخر	مجتبیٰ حسین	〃	۱۲ر	〃
تکلف برطرف	مجتبیٰ حسین	〃	۱۴ر	〃
قطع کلام	مجتبیٰ حسین	〃	۱۲ر	〃
البتہ	یوسف ناظم	〃	۱۰ر	〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	〃	۸ر	〃
سنی سنائی	لئیق صلاح	〃	۱۰ر	〃
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	〃	۱۲ر	〃
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	〃	۱۲ر	〃
چنانچہ	مسیح انجم	〃	۱۲ر	〃
شاہین ٹائپ فش	پرویز یداللہ مہدی	〃	۱۵ر	〃
ہنستے ہنستے	برق آشیانوی	〃	۱۲ر	〃
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	〃	۱۰ر	〃
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعہ کلام	۱۲ر	〃

ممتاز مہدی
[حیدرآبادی]

"میاں اُڑنچھو کی سینما بینی"

مضمون نویسی کے لیے عموماً جو عنوانات طلباء کو پریشان کرتے ہیں ان میں میاں اُڑنچھو کی نظر میں "میرا محبوب مشغلہ" سرِ فہرست ہے ان کا خیال ہے کہ زیادہ تر طلباء و طالبات "مطالعے" کی اہمیت پر خواہ مخواہ اور زبردستی خامہ فرسائی کرتے نظر آتے ہیں جبکہ سینما بینی آخر کو سینما بینی ہے۔ اور اس سے بہتر کوئی موضوع ہو ہی نہیں سکتا۔

میاں اُڑنچھو نے اپنی زندگی کا سب سے پہلا فلم جو دیکھا یا پہلی فلم دیکھی چوتھی جماعت کی کامیابی کی خوشی میں تھی۔ ان کے والدِ بزرگوار نے اپنی معقول ترین اولادِ عظیم کے لیے معقول ترین رقم سینما بینی کے لیے منظور کی تھی۔ اولاد کی عظمت اور معقولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کالج اور مدرسے تین جلتی جماعتیں ہوتی ہیں میاں اُڑنچھو کے والد کی اولاد کی اتنی ہی کھیپ ہر سال کامیاب قرار پاکر اگلی جماعت میں قدم رنجہ ہوتی ہے۔ میاں اُڑنچھو، فلم دیکھنے پٹ پٹ کرتے مدرسے والے جتھے کے ساتھ چلے تو کالج میں زیرِ تعلیم اولاد نمبر ۲ اس جتھے کی قیادت کر رہی تھی۔ روانگی سے قبل اُڑنچھو کی والدہ محترمہ نے سب کے چھوٹے چھوٹے جیبوں میں بڑی بڑی "کھاری بوندی" کی پوٹریاں اُڑس دیں کہ فوج جنگ پر بے ہتیار کیسے جاتی ساتھ ہی تاکید کی کہ انٹرول میں کھانا یعنی چبانا، چبانے کی مناسبت سے حیدرآبادی اردو بولی میں لفظ "چبینہ" بھی کبھی مستعمل تھا یہ لفظ اب سنائی نہیں دیتا۔ شاید اس لفظ میں غریبی چھپی ہوئی تھی اب کیا لوگ امیر ہو گئے ہیں، جی نہیں "اسٹانڈرڈ" بڑھا لیا ہے۔ گڑھا کتنا کھود لیا ہے اسے ناپنے کی کسے فرصت ہے۔ بہرحال اُڑنچھو کی والدہ نے وداعی لمحوں میں پوٹریاں اُڑس کر بغلگیر ہوئیں اور پھر آبگیر ہو کر کہا "سونپ دیا اللہ کو تم سب کو" طرزِ تکلم ترجمہ آمیز تھا ورنہ ان کی روزمرہ زبان پہلی ڈھلی تھی۔ راستہ بھر لوگ اس پیدل دستے کو دیکھ کر نہ جانے کیا سوچتے مسکرا دیتے لیکن اُڑنچھو اینڈ کمپنی اتفاقی ہوئی گزر رہی تھی کہ سب انہیں دیکھ رہے تھے۔ اب مسکرانے کی تہہ میں کون جائے۔ سینما بینی کا اُڑنچھو کا پہلا تجربہ یا حادثہ تھا۔ فلم کی ہر بات ان کے سر کے برف دان میں جمتی جا رہی تھی ان کی ساری توجہ انٹرول کے ہتھیار پر تھی لیکن نہ جانے انٹرول کہاں کھو گیا تھا جب تمنا بے تاب ہو گئی تو آؤ دیکھا نہ تاؤ

فوری ہتھیار نکالا اور شروع ہوگئے، اطراف صدائیں بلند ہوئیں کہ "ہائی کمان" میں شکایت کی جائے گی لیکن اڑنچھو پر غدّاری کا ایسا بھوت سوار تھا کہ اب وہ "کورٹ مارشل" کی دھمکی بھی سننے والے نہ تھے۔ ماویانِ سینما سے جن اونچے سُروں میں انہوں نے تعریف و توصیف سنی تھی فلم کو اس کا اہل نہ پایا البتہ جنگ کے مناظر اتنے پسند فرمائے کہ ہر روز مدرسے کے انٹرول میں خود "مغل اعظم" بنتے اور کسی ایک کو شہزادہ سلیم بناتے اور میدانِ جنگ کا ڈائرکشن بھی دیتے جس کی وجہ سے بہتوں کی کتابیں اور بستے تار تار ہو جاتے۔

اگلے سال اڑنچھو کو پانچویں جماعت بھی کامیاب قرار دیا گیا، ایک بار پھر اڑنچھو کا پیدل دستہ فلم دیکھنے کی مہم پر نکل پڑا لیکن اب کی بار دستہ آدھا تھا چوں کہ آدھا دستہ اڑنچھو کے مطابق قریبی رشتے دار کی موت کے جنازے میں شرکت کرنے چلا گیا تھا۔ فلم دیکھی اداکاروں کے سلسلے میں اڑنچھو کو مغالطہ تھا ان کی باتیں جب کالج کے دستے میں سے ایک نے سنیں تو اڑنچھو کی کمزور "فلمالوجی" پر بہت افسوس کیا انہیں افسوس اس بات پر زیادہ تھا کہ اڑنچھو اردو کا مشہور فلمی رسالہ چوری چھپے شمع کی روشنی میں پڑھتے ہوئے بھی اس قدر پچھڑا ہوا ہے انہیں اس بات کا بھی افسوس رہا کہ اس فلم کے دیکھتے وقت وہ اگر ان سب کے ساتھ موجود رہتے تو بہت سی باتیں فلم دیکھتے ہوئے سمجھا سکتے۔ اڑنچھو پر بڑے بھائی کی افسوس ناک تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے اپنی "فلمالوجی" کو تیزی سے مستحکم کرنے کی ٹھان لی اور پڑوسی لڑکوں میں سب کو ٹھوک بجا کر دیکھا اور ایک کا انتخاب اس مقصد کے لیے کر لیا یہ پڑوسی بھارت کے مشہور طبلسٹ کی زوجۂ دوم کی اولاد اول تھی۔ زوجۂ دوم کی اولادِ اول بہت ہی لاڈلی تھی لہٰذا اڑنچھو نے ایک تھیٹر سے دوسری تھیٹر کا خوب خوب دورہ کیا۔ ان کا سینما بینی کا مشغلہ رات دگنا دن چوگنا ترقی کرتا گیا اس لیے کہ یہ ابتدائی دور سے تو منگل ہاٹ اور ملے پلی جیسے قریبی علاقوں کے ہو سکتے تھے اور زیادہ تر مار تنگ شو کے جہاں فلم بینی کی مختصر سی فیس وصول کی جاتی تھی جہاں فلموں کی حالت یہ رہتی کہ کبھی اُلٹی ریل (R E E L) چل رہی ہے تو کبھی خاصہ بولتی بولتی گونگی ہو جاتیں فلموں کے نام ایسے کہ نہ کبھی سننے میں آئے اور نہ دیکھنے میں۔ ایسی فلموں سے آنکھیں سینکیں تو اڑنچھو کے دماغ کی برف پگھلی اور اپنی پہلی دیکھی ہوئی کی عظمت کا احساس ہوا۔

اڑنچھو کا شوق اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ مدرسے سے غائب اور تھیٹر میں موجود میٹنی شو میں ٹھہر کر فرسٹ شو کا ٹکٹ بھی مل جائے تو مسرور و شاداں نظر آتے۔ فلم کا افتتاحی دن ہو تو افتتاحی شو کے لیے تھیٹر کی گیٹ کھلنے سے پہلے سر ٹکرانے موجود۔ گیٹ کھلا اور دھکم پیل میں ہلاکت کے اندیشے بھی موجود۔ کسی بھی موسم کا نارروا ظلم نظر انداز اور ٹکٹ کی کالا بازار کی سنسنی خیز مہم جوئی میں آگے پیچھے کہ کسی طرح ٹکٹ مل جائے۔

اڑنچھو کے ایک کلاس میٹ ہیں ان سے پوچھیں کہ کتنی فلمیں دیکھی ہیں تو جواب "راؤنڈ فیگر" میں نہیں دیتے جیسے ساڑھے پچاس، پونے پچھتر وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف تھیٹر کے گیٹ کیپر سے ربط پیدا کرتے اور سستے سستے جہاں سے موقع ملا فریضہ ادا کر دیتے۔ کلاس میں سینما کے موضوع پر موصوف سے اڑنچھو کی گرما گرم بحث جاری تھی کہ ٹیچر نے سن لیا اور اڑنچھو کو "کلاس باہر" کی سزا سنائی۔ باہر راؤنڈ ٹیچر نے سزا سن کر کہا ایسی کوئی سزا اس مدرسے میں نہیں ہے یا تو کلاس میں جائیں یا مدرسے سے باہر لہٰذا میاں اڑنچھو نے سیدھے سینما ہال کا رُخ کیا اور تفریح سے بھرپور فلم دیکھ کر ہشاش بشاش گھر لوٹے اور یہ حسین ترین سزا جب بھی ان

کی یادوں کی فلم پر ابھرتی ہے تو انہیں وہی مسرت پہنچاتی ہے جو سزا بھگتتے وقت انھوں نے محسوس کی تھی۔

میاں اڑنچھو نے یوں تو سینکڑوں فلمیں دیکھی ہیں لیکن "شہنشاہِ جذبات" کی پہلی طربیہ فلاپ فلم کو اڑنچھو سے نہ جانے کیوں خدا واسطے کا بیر ہے۔ پہلی بار کلاس میٹ کے ساتھ دیکھنے چلے تو کلاس میٹ نے حسیپدہ تھیٹر میں پہنچا دیا اور "مہابھارت" کا نظارہ کروادیا۔ کلاس میٹ کی اس حرکت کا اڑنچھو کو آج تک ملال ہے اڑنچھو کی دشمن فلم کہیں بہت دور کی "آموختہ" تھیٹر میں لگی اور اڑنچھو پائے پائے چلتے پاؤں دکھاتے پہنچے، لمبی لائن میں دھوپ کھاتے پیاس نگلتے ٹھہر کر ٹکٹ لیا لیکن فلم کو دشمنی نبھانی تھی لہٰذا دو تین مناظر نظر آتے اور بجلی غائب۔ اِدھر بجلی فیل ہوتی رہی اُدھر اڑنچھو زینہ بہ زینہ ترقی کرتے کرتے تھرڈ کلاس سے "باکس" تک پہنچ گئے۔ میٹنی شو دس بجے رات تک بھی اسی رفتار سے چلتا رہا۔ بستی والے اپنے اپنے گھر جاکر بیوی بچوں کی خیر خیریت جیسی معلومات اور پیٹ میں غذا اور دوائیں وغیرہ اضافہ کرکے چلے آتے اور اڑنچھو ان کی خوبئ قسمت پر کفِ افسوس جم کر ملتے رہے۔ "ٹکٹ کھڑکیوں" پر اگلے شو کے لیے جب دیکھیے ٹھٹ کی ٹھٹ موجود ہے۔ بھوک نے جب تڑپادیا بلکہ رُلادیا تو وہ گھر کی راہ لینے باہر آئے تو دیکھا کرشنا جن میں خواتین بھی شامل تھیں قطار باندھے کھڑی ہیں اور انہیں پیسے واپس کیے جارہے ہیں اڑنچھو نے بھی لائن سنبھالی باری آئی تو بتایا کہ "باکس" — جبکہ "باکس" کا ٹکٹ فروخت ہی نہیں ہوا تھا۔ جھوٹ کی پاداش میں جھڑکی کھاکر کھانا کھانے گھر کی طرف لپکے۔

اڑنچھو کی دشمن فلم ایک بھلی چنگی تھیٹر میں مارننگ شو میں لگی۔ حیدرآباد کے طلبا، تلنگانہ احتجاج کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے موصوف نے احتجاجی موڈ میں دھڑلے سے ٹکٹ لیا اور سنیما ہال میں گھس پڑے لمحے دو لمحے میں انٹرول کا اعلان کردیا گیا۔

دوبارہ یہ فلم حیدرآباد کے گلزار حوض علاقہ کی چھوٹی سی تھیٹر میں لگی اڑنچھو نے اپنے دوست کرشنا کو ساتھ لیا تو ایک ایک کرکے دوستوں کی اچھی خاصی منڈلی کارواں بن گئی اور مقدس فریضہ ادا کرنے تھیٹر پہنچی۔ یہاں انھوں نے دیکھا لوگ اسکرین کے سامنے والے اسٹیج پر لیٹ کر سینما کا نظارہ کررہے ہیں ٹکٹ سیٹوں سے کئی گنا زیادہ فروخت کیے گئے ہیں۔ انتظامیہ چاروں طرف بنچیں بچھاتا جارہا ہے۔ سارے ناظرین گتھم گتھا ہوچکے ہیں۔ مئی کے مہینے کے پیشِ نظر سورج آگ کے تیر برسارہا ہے اور اڑنچھو سیاہ پوش تھیٹر میں دھنسے چکے ہیں اسکرین پر ایک سلائیڈ ابھر کر ٹھہر جاتی ہے "مشین گرم ہوگئی ہے"۔ جب وہ ٹھنڈی ہوتی ہے "لائٹ آف" ہوجاتی۔ پسینے کے ریلے اڑنچھو کے جسم پر فلم کی ریل (REEL) کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ تھیٹر کی ہر دو جانب قطب شاہی انداز کی طاقیں بنی ہیں جن میں دقیانوسی لالٹین رکھی جارہی ہیں۔ لوگ لپک لپک کر سگریٹیں سلگارہے ہیں۔ بیڑیوں اور سگریٹوں کا دھواں اسی طرح دم اکھاڑ رہا ہے جس طرح حیدرآباد کے کل ہند اردو مشاعروں میں اکھاڑے کے رکھ دیتا ہے۔ مشاعروں کی طرح وہاں سے بھی اڑنچھو نے دوستوں سے اجازت لی باہر آئے راحت محسوس کی پھر پلٹ کر تھیٹر کو نہ دیکھا۔ وہ دن اور آج کا دن اڑنچھو کا یہی ارمان ہے کہ اس دشمن جاں کو ایک ہی نشست میں نیچے سے اوپر تک، شروع سے آخر تک اطمینان سے دیکھیں لیکن یہ حرافہ تو ان کی ایسی بیرن ہوگئی ہے کہ ٹی وی کے "چترہار" میں بھی جب اس نگوڑی کے گانے آنے تو کوئی نہ کوئی جھلا وہ ایسا ہوا کہ وہ گیت بھی نہ دیکھ سکے

پہلی بار بجلی بھاگ گئی۔ دوسری بار خود اڑنچھو بھاگ کھڑے ہوئے کہ ان کی بیگم کو دردِ زہ ترنگ ہوم بھگا رہے تھے۔ تیسری بار بوجہ فسادات کرفیو ٹی وی بجھا کر چھپا دیا گیا۔

بھوت، پریت، شیطان، چڑیل کا خوف کسے نہیں ہوتا خوفِ خدا الگ بات ہے۔ ایک بار اڑنچھو "ڈریم گرل" جیسی ہیروئن کی فلم میں "سوامی دیویکانند" کے لباس والے "رام راجیہ" کے "سنیاسی سی ایم" کا تھیٹر میں غرق تھے کہ ٹھیک اُن کے کاندھے پر ایک عدد "ٹانگ" نازل ہوگئی۔ یہاں جس قدر چاہے آپ خوفناک "بیاک گراؤنڈ موسیقی" دے سکتے ہیں۔ ان کے حواس موسیقی میں گم تھے کہ نازل شدہ ٹانگ خود ہی پیچھے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہی ٹانگ اُسی شان سے دوبارہ نازل ہوگئی۔ آپ یہاں طربیہ موسیقی دے سکتے ہیں چونکہ اڑنچھو کے حواس کہہ رہے تھے کہ یہ پچھلی سیٹ کی شرارت ہے۔ آپ اپنی طربیہ موسیقی کو عروج پر پہنچا دیجئے چونکہ اُڑنچھو نے پوری طاقت سے اس شرارت بھری ٹانگ کو دبا دیا ہے۔ ٹانگ کے مالک نے لرزہ خیز چیخ ماری اور بولے "نیند کے مارے پر اتنا ظلم یارو ——؟"

یہاں اڑنچھو نے "سینما بینی" جیسے محبوب مشغلے کا یوں ہی آغاز نہیں کیا تھا بلکہ سینما بینی سے متعلق کئی رجسٹرس اوپن کیے تھے۔ فلموں کی تعداد، تواریخ، تھیٹروں کے نام ہیروز، ہیروئن، کامیڈین، ویلن، موسیقاروں، شاعروں کی تفصیلات کے ساتھ یہ بھی درج کیا کہ ان کی اپنی عمرِ عزیز کا جملہ کتنا سرمایہ لٹایا ایک دن بیٹھے بیٹھے یکایک انہیں زندگی کی بے وقعتی کا شدت سے احساس ہوا اور سکندر کے جنازے کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا اور انہوں نے اپنے "سینما بینی" کے معرکۃ الآراء دفتر کو پل بھر میں پھاڑ کر پرزے پرزے کیا گیس کا تیل دیا سلائی ہاتھ میں لے کر نعرہ ہائے مختصر ترین بلند کیا۔ ع

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
"میرے" سامنے آسماں اور بھی ہیں

□□

شکیل اعجاز (اکولہ)

فُل اِسٹاپ

دو دوست آمنے سامنے بیٹھے ہیں. جن میں سے ایک شیخ صاحب ہیں. شیخ صاحب کو یہ خوش فہمی ہے کہ وہ چہرہ دیکھ کر آدمی کے خیالات بھانپ لیتے ہیں. اس لیے وہ اپنے دوست کی صورت کو غور سے دیکھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں. ابھی ابھی شیخ صاحب نے ایک رسالہ دوست کو دیا ہے جس میں ان کا لکھا ہوا ایک مزاحیہ مضمون چھپا ہے۔ دوست نے رسالے کی خراب چھپائی دیکھ کر بُری صورت بنائی اور انہوں نے نتیجہ نکالا کہ میرے مضمون کی اشاعت سے اس کو تکلیف ہوئی ہے۔ وہ خوش ہوا کہ چھپائی خراب سہی بہرحال مضمون تو چھپ گیا. اور انہوں نے سمجھا کہ خراب چھپائی دیکھ کر خوش ہو رہا ہے. اس نے بہت خوش ہو کر کہا کہ مبارک ہو. اس مضمون کی اشاعت سے مجھے بہت خوشی ہوئی اور شیخ صاحب نے سوچا کہ دل پر پتھر رکھ کر ایسا کہہ رہا ہے۔ دوست خوشی خوشی رخصت ہوا اور انہوں نے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔ "دیکھا. کیسی صورت لٹک گئی تھی. بعد میں اپنے آپ کو سنبھال لیا اور خواہ مخواہ خوشی کی ایکٹنگ کرتا رہا. مگر ہم بھی اُڑتی کے پر پہچانتے ہیں یار۔"

اس قسم کی دو ایک باتوں کو چھوڑ کر یہ فطرتاً معصوم آدمی ہیں. اب یہی کیا کم ہے کہ برسوں پہلے کسی اجنبی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تم قیافہ شناس اور مردم شناس ہو انھوں نے یقین کر لیا تھا. اور اب تک اس کی بات کو نبھا رہے ہیں. ابتداء میں بعض نتائج صحیح نکل آئے اب دنیا کی کوئی طاقت ان کو خوش فہمی کے دائرے سے نہیں نکال سکتی. خوش فہمی کے ہم قافیہ غلط فہمی میں بھی مبتلا رہتے ہیں. کوئی ان کی عیادت کرتے ہوئے کہے کہ "بہت کمزور ہو گئے ہو. صحت کا خیال رکھو. لکھنے پڑھنے، چھپنے چھپانے کو گولی مارو۔ جان ہے تو جہان ہے" یہ سمجھیں گے عیادت کرنے والا دراصل ان کو ترقی کرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا اور اس بہانے مصروفیات سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ شیخ صاحب دوستی ضرور کرتے ہیں لیکن کسی بے وقوف کی طرح نہیں کہ ایک بار کر لی تو کر لی. بلکہ دماغ سے کام لیتے ہیں۔ دوست کی حرکات و سکنات، اس کے سوچنے کی سمت و رفتار کی کڑی جاسوسی کرتے ہیں. اس لیے ان کے ساتھ وہ لوگ اچھی طرح نبھ سکتے ہیں جن کے چہرے چینیوں کی طرح سپاٹ اور آنکھیں روسیوں کی طرح ہر قسم کے جذبات سے خالی ہوں۔ غلط فہمی میں مبتلا ہونے والے بہت ہیں. لیکن بعضوں کو اس میں ملکہ ہوتا ہے. ایسے لوگ بہت جلد مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دیر تک مبتلا رہتے ہیں۔ اور اس کے بعد ۔۔۔ بھی دیر تک مبتلا رہتے ہیں۔

بہت سی عادتیں جو بظاہر عیب معلوم ہوتی ہیں، شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ شیخ صاحب چونکہ پیچھے ہمدردوں سے بھی ان کی صورت غور سے دیکھ کر نفرت کرنے لگتے ہیں اس لیے انہیں ہر طرف دشمنوں کا ہجوم ہی نظر آتا ہے۔ اس سے گھبرا کر یا دانت کھٹے کرنے کے لیے ترقی کے کاموں میں جٹ جاتے ہیں اور دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ بی۔ اے کرنے کے بعد مزید تعلیم کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کسی نے مذاق بنایا تو مصمم ارادہ کیا کہ ام۔ اے کر کے دکھاؤں گا۔ چنانچہ اس وقت پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہو چکے ہیں۔

بہت پہلے انھوں نے ایک افسانہ لکھ کر دوستوں میں بتایا۔ اس وقت تک ان کا ایک بھی لفظ کہیں شائع نہ ہوا تھا۔ ایک دل جلے نے تضحیک کے انداز میں کہا ۔۔۔

"یہ منہ اور توہر کی دال۔ تم افسانے کیا لکھو گے۔ ایک جملہ تو صحیح لکھ کر بتا دو۔"

انھوں نے بات ذہن نشین کر لی۔ خوب مشق کی۔ خوب کتابیں پڑھیں آخر ایک دن آیا کہ ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی۔ یہ پہلی جلد لے کر اس کی خدمت میں پہنچے اور مسکراتے ہوئے اُسے پیش کی۔ اس رات بہت اطمینان سے سوئے کہ آج ایک بدخواہ کو خوب شرمندہ کیا ہے۔ مزاج کی اسی خصوصیت نے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ چنانچہ محض ڈیڑھ برس میں ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کے بعض خیرخواہ جب اُن سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو اسی طرح اُچسکا دیتے ہیں اور ترقی کرتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

شیخ صاحب کا بچپن معصومیت میں گزرا۔ والد کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں اس لیے لاڈ پیار سے پرورش ہوئی۔ کسی نے قبل ہونے پر ڈانٹا نہ غلط فٹ بال کھیلنے پر ٹوکا۔ پرائمری اسکول میں یہ اتنے سادہ لوح تھے کہ والد کو آتا دیکھ کر برف کا گولا جیب میں چھپا لیتے۔ دس منٹ بعد صرف تیلی جیب سے نکالتے اور حیرت کرتے کہ جیب تو پھٹی ہوئی نہیں ہے پھر برف کا گولا کہاں چلا گیا؟ کالج کی پڑھائی کے دوران تو یہ واقعی کامیاب فٹ بال کھلاڑی ہو گئے تھے اور اپنے دوستوں کے ساتھ دور دور تک میچ ہارنے کے لیے جاتے تھے لیکن اس سے کچھ برس قبل کا ذکر ہے کہ دل و جان سے فٹ بال کھیلتے تھے۔ گھنٹہ بھر تک اِدھر سے اُدھر دوڑتے پسینے میں شرابور ہو جاتے مگر تمام وقت پاؤں ہوا میں چلاتے رہتے۔ نشانہ کا یہ عالم تھا کہ فٹ بال ہر بار ایک دو انچ کے فاصلے سے گزر جاتا۔ مگر کیا مجال کہ ایک آدھ بار بھی پاؤں سے چھو جائے۔ اس زمانہ میں گول کیپر کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ چنانچہ جس کلاس کو شکست دینی ہوتی اُدھر بہت اصرار سے بھیجے جاتے۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت کم سے کم چھ گول کھانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ بچپن ہی کی کچھ عادتیں معمولی تصرف کے ساتھ اب بھی موجود ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ پٹھانوں کی طرح لین دین کرتے ہیں۔ صبح کسی نے چاء پلا دی تو ہزار کام چھوڑ کر اُسے ڈھونڈ رہے ہیں اس کے پیچھے پیچھے گھوم رہے ہیں کہ کب چاء پلانے کا موقع آتا ہے۔ اگر وہ دو تین گھنٹے ساتھ رہنے کے باوجود ٹالتا ہی رہا تو سنجیدگی سے لڑ بیٹھے کہ جب ہم آپ کی چاء پی سکتے ہیں تو آپ کو کیا شرم ہے؟ دعوتیں بھی زبردستی لیتے رہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کی جو، اِن کی کر چکے ہوں۔

مہنگی چیزوں کو احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ اسکول جانے میں تکلیف ہونے لگی تو ایک سائیکل خریدی۔ پھر یہ سوچ کر کہ استعمال سے خراب ہو جائے گی پیدل ہی اسکول جاتے رہے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ سائیکل کا مصرف کیا؟!

بولے میں نے بہت محنت کی کمائی سے یہ نئی سائیکل خریدی ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ اسکول لا، لے جا کر جلدی سے پرانی کر دوں؟ پھر ایک دن گھر میں کسی نے اطلاع دی کہ اب سائیکل گھر میں پڑے پڑے زنگ کھا گئی ہے یعنی بغیر استعمال کے پرانی ہو گئی ہے۔ تب خوشی خوشی اُسے باہر نکالا۔ احتیاطاً اس معاملہ میں بھی کرتے ہیں کہ آس پاس پتا تے چھوٹ رہے ہوں تو داڑھی نہیں بناتے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ رقعہ لکھ کر رکھا ہے تو لفافہ نہیں۔ لفافہ ہے تو ٹکٹ نہیں۔ یہ بھی ہے تو چپکانے کے لیے گوند نہیں۔ اور سب کچھ ہے تو یہ خود موجود نہیں۔ اس کا یہ حل نکالا کہ پوسٹ آفس کا سارا سامان، کاغذ قلم گوند کی شیشی خرید لائے۔ حد یہ کہ احتیاطاً پوسٹ بکس بھی کمرے میں بنوالیا۔ خط لکھتے اور اس میں ڈال کر مطمئن ہو جاتے۔ لوگوں کے جواب آنے بند ہو گئے۔ ایک دن خود کے نام خط لکھا۔ اس کا بھی جواب نہ آیا تو بہت ناراض ہوئے۔ تب کسی نے حماقت کا احساس دلایا۔

اگر عزم و حوصلہ ہی کی ایک قسم ضد اور ہٹ دھرمی بھی ہے تو یہ "عازم و حوصل" بھی ہیں۔ کیونکہ ان کی پہلی کتاب محض ضد میں آکر اور ایک دوست کو شرمندہ کرنے کے لیے چھاپی گئی تھی۔ چھپائی کے دوران ان پر مختلف قسم کے اعصابی اور جذباتی دورے پڑے۔ آدھی کتابت ہوئی تھی کہ کاتب کے ناز نخروں سے پریشان ہو کر کسی اور سے لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے سمجھایا کہ ایک کتاب میں دو طرح کی کتابت ایسے لگے گی جیسے آدھی فلم سے وہی رول کسی اور اداکار کو دے دیا گیا ہو۔ طباعت کا مرحلہ آیا اور یہ پریس کے چکر کاٹنے لگے۔ کسی طرح کام شروع ہی نہ ہوتا تھا اور ہوا تو اس رفتار سے کہ ایک ہفتہ میں دو صفحے چھپتے۔ اوروں کی پوری کتاب چھپ جاتی۔ کاغذات اٹھوا کر دوسرے پریس میں لے گئے۔ وہاں ایک ہفتے میں ایک ہی صفحہ چھپتا۔ اس سے ایسے بد دل ہوئے کہ گھر آکر بیمار ہو گئے۔ عیادت کرنے والوں سے کاتبوں اور پریس والوں کی شکایتیں کرتے۔ لوگوں کو لکھنے لکھانے اور کتابیں چھاپنے سے باز رکھتے اور جو لوگ پہلے ہی سے باز تھے ان کی قسمت پر رشک کرتے کہ کیسے خوشحال لوگ ہیں۔ ہم سے کہا اب اگلی کتاب کے وقت میں خود پریس کھولوں گا۔ راقم نے پریس کھولنے کے بعد کی دشواریوں کا ذکر کیا تو جھنجھلا کر بولے ـــ

"اب لکھنا ہی بند کر دوں گا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ آئندہ میری کتاب نہ چھپے گی۔ اردو کا دم نکلتا ہے نکلے۔ اردو والے تو میرے ہی دم کے پیچھے پڑے ہیں۔ میں اکیلا کب تک مصیبتیں اٹھاؤں؟"

لیکن اس کے باوجود مصیبتیں اٹھاتے، یعنی کتابیں چھپواتے ہیں۔ ابھی پچھلے ماہ ہی ان کی کتاب "الف سے قطب مینار" شائع ہوئی ہے۔ کتابیں بیچنے کے بجائے مفت تقسیم کرتے ہیں اور اس حساب سے نقصان کا اندازہ لگا کے کچھ دن اداس رہتے ہیں کہ اگر یہ دس کتابیں فروخت ہو جاتیں تو سَو روپے ملتے جس سے بچّی کا فراک یا میری دوائیاں خریدی جا سکتی تھیں۔ تاہم مفت بانٹنے سے باز نہیں آتے۔ فیاضی کا تو یہ عالم ہے کہ دوستوں سے ادھار لے کر اپنی کو فلم دکھاتے ہیں۔ مہمان تشریف لائیں تو کسی اچھی ہوٹل میں خوب کھانا کھلائیں گے۔ اُدھر مہمان ہاتھ دھونے واش بیسن کی طرف گیا اور یہ نظریں بچا کر کاؤنٹر پہ خوشامد کرنے لگے کہ "یہ پیسے اُدھار رہے تنخواہ پر دے دوں گا۔" بعض اوقات ہوٹل والے شاید شرارت کرتے ہیں اور محض لطف لینے کے لیے زور زور سے انکار کرتے ہیں۔ پرانے بل کا تقاضہ کرتے ہیں۔ تب ان کی (اور مہمان کی) صورت تصویر کھینچنے کے قابل ہوتی ہے۔ ہوٹل والے کا دل کبھی یہ کہہ کر نہیں توڑا کہ مجھ پر آپ کا بقایا نہیں۔ بلکہ ہم باہر نکل کر ان سے کہیں کہ "بے وقوفوں کی طرح خاموش

کیوں کھڑے رہے؟ اس کے منہ پر ایک جملہ پھینک کر کیوں نہیں مارا کہ میں تمہارا قرض دار نہیں؟ تو محض مسکرا کر رہ جاتے۔ ایسے ظرف والے لوگ اب اس زمانہ میں کم ہی دکھائی دیں گے۔ ان ایمرجنسی حالات سے نمٹنے کے لیے بعض خوانچہ والوں۔ ہوٹل والوں اور میڈیکل اسٹور والوں کو دوست بنا رکھا ہے۔ یہ دور اندیشی اسی معاملہ میں نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔ انکی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ پہلی لڑکی کے پیدا ہوتے ہی جہیز جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور تیسری لڑکی کا جہیز تو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی خریدنا شروع کر دیا تھا۔

غور کیجئے تو ہر شخص کسی نہ کسی ہابی میں مبتلا ہے کسی کو مچھلیاں مارنے یا مکھیاں مارنے کا شوق ہے۔ کسی کو فلمیں دیکھنے یا عیب دیکھنے کی ہابی ہے۔ دوسرا رسم و رواج توڑنے یا دل توڑنے کا شوقین ہے۔ بعضوں کو سوتے رہنے یا روتے رہنے کی ہابی ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال ہر ہابی آدمی کے اختیار میں ہوتی ہے کہ جب چاہو دل بہلا لو۔ شیخ صاحب اس معاملے میں خسارے میں رہے ایسی ہابی اختیار کی جو دوسروں کے اختیار میں ہے۔ مثلاً ان کی خاص ہابی ہے خطوط کے جواب پڑھنا۔ لیکن لوگ جواب دیں گے تبھی یہ شوق پورا ہوگا نا؟ عموماً یہ ہوتا ہے کہ دس میں سے دو کے جواب ملتے ہیں اور یہ اپنی ہابی کے طفیل ہمیشہ فکرمند رہتے ہیں۔ حالاں کہ پوسٹ مین کی دعوتیں کرتے ہیں۔ اس کے سارے گھر سے، حتیٰ کہ گھر کے کتے سے بھی نہایت اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ مگر پوسٹ مین کیا کرے؟ مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کی طرف سے خط لکھنے سے رہا۔

استادِ محترم اخلاق اثر صاحب کو ریسیو کرنے کے لیے ہم صبح سے موٹر اسٹینڈ پر تھے۔ صبح آٹھ بجے شیخ صاحب کو کسی بس میں بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ ۹ بجے اُترتے ہوئے دیکھا۔ ساڑھے نو بجے پھر اسی شہر کی بس میں سوار نظر آئے تو کھڑکی کے قریب جاکر عرض کیا۔

"شیخ صاحب۔ ابھی تو اُترے تھے اس گاڑی سے۔ السلام علیکم۔ کچھ بھول آئے ہو کیا؟"

بولے "نہیں ایسی کوئی بات نہیں وعلیکم السلام۔ دراصل میں نے سنا ہے کہ کل سے بسوں کے کرائے بہت بڑھ رہے ہیں بڑے بھائی سے ملنا نہ ہو سکے گا اس لیے آج ہی چار پانچ دفعہ مل آتا ہوں۔ کون بار بار وقت اور پیسہ خراب کرے؟" ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ داڑھی بنوا کر اٹھے تو باربر کو ایک روپیہ دیا۔ پھر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے اور دو روپے دے کر کہا۔

"اس کے بعد دو ہفتوں تک جو داڑھی بڑھے گی۔ وہ بھی آج ہی دو دفعہ بنا دو۔ کون بار بار وقت، اور دماغ خراب کرے؟"

جھوٹ، ان کے اس دوست کی گردن پر جس نے ہمیں بتایا کہ کھوئے رہنے کی عادت انہیں بچپن سے ہے۔ تاریخ کے پیریڈ میں تمام وقت کھوئے کھوئے نہ جانے کیا سوچتے رہے۔ گھنٹہ ختم ہوا تو آس پاس نظر ڈالی۔ کلاس خالی دیکھ کر بازو والے سے پوچھا "آج تاریخ کا پیریڈ نہیں ہوگا کیا؟"

اسی عادت کی وجہ سے یادداشت ہمیشہ کمزور رہی۔ گھر، دوستوں اور قرض دینے والوں میں بہت بدنام ہوئے۔ پہلے سب ناراض ہوتے تھے اب ترس کھاتے ہیں (ترس کھانے والوں میں قرض دینے والوں کا نام نہیں ہے)

اُن کے اسکول لائف کے اُس دوست نے، جس کا نام خوفِ فسادِ خلق سے پردے میں رکھ رہے ہیں، ہمیں بتایا کہ ایک دفعہ ریلوے ٹکٹ ونڈو پر ان کی بحث ہوگئی۔ کلرک نے انھیں انگریزی میں خوب ڈانٹ پلائی۔ یہ مجبوراً پیچھے

رہے۔ اس لیے کہ انگریزی میں جواب دے سکے۔ گھر آکر انگلش سیکھنے کا عہد کیا۔ انگلش فلمیں پابندی سے دیکھنے لگے۔
اس زمانے میں بات چیت کے دوران مندرجہ ذیل قسم کے الفاظ کہہ کر اساتذہ کو شرمندہ اور رشتہ داروں کو
متحیر کر دیا کرتے تھے۔ Just trial. oh no. oh yes. really. what a idea کھوئے ہوئے
رہنے کی لت کی وجہ سے دو عزیز دوستوں سے زندگی بھر کے لیے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بمبئی اور دہلی دو ٹیلیگرام ایک
ساتھ کرنے نکلے۔ دو ٹیلیگرام فارم لے کر پہلے دونوں کو بھجوایا جانے والا مضمون لکھ لیا۔ پھر پتے لکھتے وقت
فارم اِدھر اُدھر ہو گئے۔ چنانچہ جس کے والد کا انتقال ہوا تھا اُسے پہنچا "بہت دنوں بعد تمہاری آرزو پوری ہوئی
میری طرف سے دلی مبارک باد" اور جس شخص نے اردو اکیڈمی کا پہلا انعام حاصل کیا تھا اسے یہ ٹیلیگرام ملا "میں
آپ کے اس غم میں برابر کا شریک ہوں — سوگوار شیخ"

چنانچہ جب دہلی اور بمبئی سے لعنت ملامت کے خطوط آئے اور یہ پتہ چلا کہ ٹیلیگرام کے پتوں میں گڑبڑ
ہو گئی تھی تو سر پکڑ کر افسوس کرنے کی بجائے، پیٹ پکڑ کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ جب ہنسی کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا
تو "فل اسٹاپ" کے طور پر صرف اتنا کہا —

"لیکن بہت بُرا ہوا۔ آئندہ احتیاط کرنی پڑے گی"

مقابل یا مخاطب لاکھ پریشان ہو اگر اس کی کسی بات پر شیخ صاحب کو ہنسی آگئی تو روکنے کا تکلف نہیں کرتے۔
کل شام کی بات ہے، ہم دونوں فلم کے انٹرول میں باہر نکل کر کھڑے کھڑے چار پی رہے تھے کہ ان کا ایک پرانا شاگرد
منہ لٹکائے چلا آیا۔ یہ ہنسی کے موڈ میں تھے پوچھا کیا ہوا؟ اُس نے کہا سر چند ماہ پہلے میری شادی ہوئی ہے۔
ہمارے گھر میں کوئی بزرگ نہیں رہتے جو کسی بات پر ٹوکیں اور احتیاط کروائیں۔ کل ہم سے بڑی بھول ہو گئی میں اُس
کے لیے پریشان ہوں۔ میری بیوی اُمید سے ہے اور کل سورج گہن کے وقت وہ کپڑے دھو رہی تھی۔ پڑوس کی
ساری عورتیں کہہ رہی ہیں کہ تم نے بہت غلط کیا۔ پھر آبدیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔ بتایئے نا۔ سورج گہن کے وقت
کپڑے دھونے سے کیا ہوتا ہے؟

"دھوبی پیدا ہوتا ہے"

شیخ صاحب نے جواب دیا۔ اور خود ہی زور زور سے ہنسنے لگے۔ وہ بیچارہ کب غائب ہو گیا پتہ بھی نہ چلا!

اداریہ

شگوفہ کا زیرِ نظر شمارہ پریس کو جا چکا تھا کہ ۱۴ اگست کی شام ممتاز مزاح نگار برق آشیانوی کے انتقال کی افسوسناک اطلاع ملی۔ برق صاحب ۷۱ برس کے تھے ادھر تین چار سال سے وہ دنیوی معاملات سے بے تعلق ہو چکے تھے۔ مشاعروں میں شرکت اور محفلوں میں آنا جانا بھی ترک تھا۔ شگوفہ اور زندہ دلانِ حیدرآباد سے گویا انھیں عشق تھا۔ چنانچہ تارک الدنیا ہونے کے باوجود میری درخواست پر وہ شگوفہ کے لیے آخر وقت تک لکھتے رہے۔ دوسرے تیسرے دن ٹیلی فون پر سب کی خبر لیا کرتے اور مہینے دو مہینے میں ایک بار مجرد گاہ تشریف لایا کرتے تھے۔ سیڑھیاں چڑھنے سے مجبور تھے۔ اس لیے نیچے ہی کم از کم آدھا گھنٹہ گزار کے یہ کہتے ہوئے لوٹ جاتے کہ دل بھرا نہیں پھر کبھی آؤں گا۔ ایسی خلیق، ملنسار اور پُرخلوص شخصیت کا اُٹھ جانا بجائے خود ایک عظیم سانحہ ہے۔ ان کے انتقال سے حیدرآباد میں طنز و مزاح نگاری کی روایت اور تحریک کو ایک دھکا پہنچا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کو کل ہند حیثیت دلانے میں ان کا بھی حصہ تھا وہ برسوں اس ادارہ کے نائب معتمد رہے۔ طنز و مزاح میں ان کا رول دہرا تھا۔ وہ جس پایہ کے شاعر تھے، اسی درجہ اور معیار کے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اور اب بھی دو کتابیں زیرِ اشاعت ہیں۔ ہم اپنے بزرگ اور مشفق حضرت موسیٰ کلیم برق آشیانوی کے انتقال پر اپنے قلبی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ خدائے عز و جل انھیں جنت کی اعلیٰ منزلوں سے سرفراز کرے۔ اور ان کے پسماندگان کو صبر سے نوازے۔

شگوفہ کے آئندہ شمارہ کے ذریعہ نامور مزاح نگار برق آشیانوی کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا جائے گا۔

No. 15822/68 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd. No. H. HD 6
l. 19 Copy 8 August 1986 Phone : 567716

SEPTEMBER 1986 **Rs. 4-00**

WE PAY HOMAGE TO

BURQ AASHIANVI

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

بہ یادِ برق آشیانوی

جلد ۱۹ ○ شمارہ ۹

ستمبر ۱۹۸۶ء

تصویر سرورق:
برق آشیانوی

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جنرل منیجر:
سمیع جلیل

منیجر (اعزازی):
فیاض احمد فیضی (بمبئی)

کتابت: محمود سلیم، محمد عبدالرؤف، مسعود انور
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲-۵۰۰۰۰

قیمت فی پرچہ: ۴ روپے
زرِسالانہ: ۴۰ روپے بیرونِ ہند سے ۱۲۵ روپے

شگوفہ، ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد-۱
فون آفس 557716 رہائش 521064

اِس محفل کے چھوٹے بڑے (فہرست)

نریندر لوتھر

آشیانے کا برق

دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو مرنے سے پہلے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے تمام کام پورے کرلئے ہیں
…ن یہی حسرت لے کر مرتا ہے کہ کاش تھوڑا وقت اور ہوتا تو میں فلاں کام بھی پورا کر لیتا۔ علامہ اقبال نے تو
…خالق کو بڑا کھرا سا نوٹس دے دیا تھا کہ اس جہاں کے کام دراز ہیں۔ اگر یہ کام انجام دینے کیلئے بھیجا تھا تو ابھی
اور انتظار کر۔ لیکن یہ نظامِ قدرت ہے کہ کسی شخص کو کام ختم کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہماری حکومتیں بھی اسی
…ی کی تقلید کرتی ہیں۔ اسی لئے آئے دن افسروں کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں تاکہ حکومت کا کاروبار چلتا رہے۔

ایسا لگتا ہے کہ کچھ عرصے سے برق آشیانوی نے اپنا کاروبار سمیٹنا شروع کر دیا تھا اور جانے کیلئے کمر
…ھ کر بیٹھ گئے تھے لیکن پھر بھی ان کا کم از کم ایک کام ادھورا رہ گیا۔ ایک مضمون جو وہ لکھنا چاہتے تھے، جس
…کر ابھی آئے گا ___

ہم تقریباً تیرہ سال سے انہیں جانتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے میری دوسری کتاب کی رسم اجراء کے سلسلے
…ود ہی مجھ پر ایک مضمون لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ برق زندہ دلانِ حیدرآباد کے مقبول اور بزرگ ظریف
…اعروں میں شمار ہوتے تھے اور اس وقت تک ہمارے جلسوں اور مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے
…پر مضمون لکھنے کے تعلق سے جو چند دلچسپ واقعات ہوئے ان میں سے چند کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون میں بھی
تھا۔ یہ مضمون ۱۹۷۳ء میں ہی "شگوفہ" کے خاص نمبر میں چھپا تھا۔

مثلاً جب انہوں نے مجھ سے ملنے کیلئے میرے دفتر میں فون کیا تو میرے پی۔ اے نے جو صرف تیلگو ہی
…نتا تھا۔ ان کا نام پوچھا۔ اسے "برق" سمجھ میں نہ آیا تو اس نے مزید وضاحت چاہی۔ برق نے کہا۔ برق
…ے "بجلی"۔ میرے پی۔ اے نے مجھ سے کہا کہ بجلی کے دفتر کے کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جب
…قات ہوئی تو انہوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ آپ تو کھلی جیل میں کھلے ہاتھ گھومنے والے قیدیوں

کے ساتھ شب و روز گزارتے ہیں (برق صاحب جیلر تھے) آپ برق کیسے بن گئے ؟ انہوں نے کہا برق سے تعلق بچپن سے ہے کہ میرے والدین نے میرا نام موسیٰ کلیم رکھا تھا۔ آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بجلی کی کڑک کے ذریعہ ہی حضرت موسیٰ سے بات کی تھی۔ نام کی اس کوالیفکیشن کی بناء پر مجھے بجلی کے محکمہ میں ملازم ہونا چاہیئے تھا لیکن میں نے نام کے دوسرے جز کی مناسبت سے محکمہ جیل کو اپنے آب و دانہ کا آشیانہ بنایا۔

ان دنوں حیدرآباد میں جاگیرداری سسٹم تھا۔ مذہبی رواداری تھی۔ ابھی فسادات کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ جرائم بھی کم کم رونما ہوتے تھے سوچا کہ محکمۂ جیل ہی اچھا رہے گا۔ وہاں اچھی بھلی گذر رہی تھی کہ دفعتہً شاعری کی تحریک [illegible] ہوئی۔ اور وہ بھی مزاحیہ ! شاعری کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ ہے تخلص۔ باقی سب صفتیں یعنی شدت احساس، شعور، تغزل وغیرہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری میں برق اور آشیانہ کا، شمع اور پروانے کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے برق کو آشیانے میں بٹھادیا کیونکہ آخر کو اُسے وہیں گرنا ہے تو کیوں نہ اُس کا کام آسان کر دیا جائے۔ اس طرح برق آشیانوی کا جنم موسیٰ کلیم کی پیدائش کے تقریباً پچاس سال بعد ہوا۔ یہ تخلص اپنانے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ پرانے دوستوں اور افسرانِ بالا کو اس نئے روپ کا علم بھی نہ ہو کیونکہ شاعری کرنا سرکاری ملازم کے چلن کے مغائر سمجھا جاتا ہے۔ شروع شروع میں جیلر موسیٰ کلیم کو اُن کے کئی ادب دوست افسروں اور ماتحتوں نے بتایا کہ ہو بہو آپ کی شکل کا ایک شخص بڑے مزے کی مزاحیہ شاعری کرتا ہے۔ اُدھر شاعر برق آشیانوی کے ہمعصر شاعروں نے انھیں کہا کہ آپ ہی کی شکل کا ایک شخص ہم نے جیل کے محکمہ میں دیکھا ہے۔ برق نے اس صورتحال کا خوب مزہ لیا اور کافی دنوں تک طرفین کو اُلّو بناتے رہے حالانکہ اس کارِ خیر میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔

خیر۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ پر مضمون لکھنا اُن کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوا۔ ملازمت سے ریٹائر ہوگئے۔ قیدیوں کی صحبت سے چھٹکارا ملا۔ تو قیدِ حیات کے غم بُھلانے والوں کی ٹولی زندہ دلانِ حیدرآباد کے محبوس ہوگئے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا محکمہ جیل کی طرح اس ادارے سے بھی رہائی حاصل کرلی۔ انہوں نے ہماری محفلوں میں آنا پہلے کم اور پھر بالکل بند کردیا۔ سُنا ہے اُن کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہوگیا تھا اور وہ مہدوی فرقے کے امور میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ انہوں نے لکھنا بھی کم کردیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ برق اپنے آشیانے میں ہیں اور دونوں محفوظ ہیں۔

اُن کی ناگہانی موت مجھے ایک اور واقعہ کی یاد دلاتی ہے۔ کوئی دس بارہ برس کی بات ہے کہ میرے کچھ مضامین پڑھ کر ایک صاحب بنام سوامی حیدرآبادی نے جو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے، مجھے ایک ستائشی خط لکھا اور میرے چند مضامین کو تیلگو میں ترجمہ کرکے چھپوانے کی اجازت چاہی جو میں نے بخوشی دے دی۔ وہ مضامین گاہے بہ گاہے مختلف رسالوں میں چھپتے رہے۔ حالانکہ سوامی صاحب حیدرآباد میں ہی مقیم تھے لیکن ہم کبھی ملے نہیں۔ صرف خط وکتابت ہی ہوتی رہی۔ پھر میں دلی چلا گیا۔ وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ واپس حیدرآباد آیا تو بھی وہی مسلک۔ ایک دن مجھے اچانک خیال آیا کہ سوامی صاحب حیدرآباد میں رہتے ہیں اُن کے پاس فون بھی ہے، کیوں نہ اُن سے ملاقات کی جائے۔ ایک اتوار کو میں نے اُن کا فون ملایا۔

"کیا میں سوامی صاحب سے بات کر سکتا ہوں؟"

ایک حیران سی نسوانی آواز نے پوچھا۔
"آپ کون ہیں؟"
میں نے اپنا نام بتایا اور یہ بھی کہا کہ میں اُن کا دوست ہوں۔
جواب ملا۔ "آپ اُن کے دوست ہیں اور پھر بھی آپ کو معلوم نہیں کہ اُن کا انتقال ہوئے تین مہینے ہو چکے ہیں؟"
میرے منہ سے صرف 'اوہ' ہی نکل سکا۔

غالباً آٹھ اگست ۱۹۸۶ء کو میرے آفس میں برقی کا فون آیا۔ قدرے تفصیلی بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک اسکول شروع کیا تھا جو بڑی اچھی طرح چل رہا ہے۔ اپنے بچوں کے بارے میں بتایا اور آسودگیٔ حال کیلئے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے صحت کے بارے میں پوچھا۔ ایک خفیف سی ہنسی ہنسے۔ اور کہنے لگے بس یوں ہی چل رہا ہوں۔ تھک جاتا ہوں اس لئے باہر نہیں آتا جاتا۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں جس کیلئے مجھ کو آپکی کچھ تخلیقیں چاہئیں۔ میں نے کہا کب تک تو کہا 'ایک ہفتہ کے اندر۔ میں نے پوچھا پندرہ دن کی مہلت ملے گی۔ انہوں نے پھر اصرار کیا۔ ایک ہفتہ۔ ذرا جلدی ہے۔ آپ کو خط بھی لکھا ہے۔
اگلے دن اُن کا خط بھی آگیا۔ نقل نیچے درج ہے۔

محترمی!
تسلیم۔ پہلی بار خط لکھنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔
میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں جس کا عنوان ہے "اُردو کے ہندو ظریف شعراء" اس کے لئے آپ کے "مزاحیہ کلام" کی ضرورت ہے۔ گذارش ہے کہ اندرون ایک ہفتہ کم از کم دس مزاحیہ تخلیقات ارسال فرمائیں تو موجب امتنان و تشکر ہوگا۔ ذریعہ ہذا آپ کا ایک فیملی گروپ فوٹو مرسل خدمت ہے جو احقر نے آپ کے دولت خانے پر اُس وقت لی تھی جب کہ میں آپ پر مضمون لکھنے کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوا تھا۔ خدا کرے کہ آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔
اس عرصے میں آپ ناناجی یا داداجی بن چکے ہوں تو اس سے مطلع فرمائیے تاکہ ہدیہ تبریک پیش کرسکوں اور اُن کے لئے بھی دعائیں دوں۔ اکہتّر سال کی عمر میں دعاؤں کے سوا اور کون سا تحفہ پیش کرسکتا ہوں۔ اب اجازت ہو۔

آپ کا
موہنی کلیم - برقی آشیانوی

میں نے خط پڑھا۔ مجھے برقی ہندوؤں کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے تھے اور میں ہمیشہ ایسی صف بندی سے دور رہا ہوں۔ خاص طور پر زبان کے تعلق سے مذہبی تفریق بندی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ مذہب تو پیدائش کا حادثہ ہے جس پر کسی کو

کے لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ بیکٹ ہوگیا .... حالانکہ موت کے بعد انسان کا کوئی مذہب نہیں رہتا لیکن موت سے پہلے کا مذہب .... خیر اطمینان ہوا کہ برقی قیامت تک ایسے صاف ستھرے ماحول میں قیام کریں گے۔

قبر کے پاس کھڑے ہوئے، میری نظروں کے سامنے برقی کا مدتوں پہلے دیکھا ہوا چہرہ سامنے آگیا۔ حال ہی میں سنی ہوئی آواز بھی کانوں میں گونج اٹھی۔ اُن کی ہلکی سی مسکراہٹ، نحیف سی آواز اور بے پناہ خوش خلقی اور خلوص۔

مجھے لکھا ہوا شاید اُن کا آخری خط تھا۔ "دعاؤں کے سوا اور کون سا تحفہ پیش کر سکتا ہوں؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ اب میں نے بھی یہی سوال کیا اور برقی کے اللہ سے اُن کی پرزور سفارش کی کہ انہیں بے خطر جنت میں اپنے پاس جگہ دے۔ نفاست کے پتلے ہیں، شرافت کے پیکر ہیں، آپ کے پرستار رہے ہیں ـــــ لیکن زندہ دل ہیں! میری نظر میں ہر لحاظ سے جنت کے لئے موزوں ہیں اور اس کو اور بھی بہتر بنانے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

— —

یوسف ناظم

"ایک سجادہ نشین مزاح نگار کی یادیں"

'شگوفہ' کا اگست کا شمارہ ملا تو یہ خبر ملی کہ ۱۴ اگست کو برق آشیانوی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ عجیب اتفاق ہے پچھلے سال یعنی اگست ۱۹۸۵ء میں شاذ تمکنت کا انتقال ہوا تھا۔ یہ اگست کا مہینہ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے جان گسل بنتا جا رہا ہے۔ موت سے مفر ممکن نہیں ہے لیکن کیا اچھا ہو کہ ــــ جانے دیجیے موت کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے سال اگست ہی کے مہینے میں برق آشیانوی کا (جو اصل میں بلکہ بنیادی طور پر موسیٰ کلیم تھے) کتاب نما میں ایک مضمون (جو خاصا طویل اور ساتھ ساتھ ثقیل بھی تھا) شعور اور لاشعور سے متعلق چھپا۔ اور اس کے بعد پاکستان کے انور سدید نے اس مضمون پر ایک مضمون لکھا اور اس کے بعد موسیٰ کلیم نے اس جواب الجواب کا ایک خط لکھا۔ میں نے تو اگست ہی میں سوچا تھا کہ مضمون نگار کو خط لکھوں گا کہ آپ اچھے خاصے مزاح نگار اچھے خاصے مزاح گو اور اچھے خاصے شریف آدمی، کہاں نفسیات اور شعور و لاشعور کے چکر میں پڑ گئے۔ لیکن پھر سوچا یہ موسیٰ کلیم صاحب میری سُنیں گے نہیں کیوں کہ معاملہ علم و دانش کا ہے۔ وہ نفسیات کے طالب علم تھے اور نفسیات یا اس قسم کے دیگر مضامین سے شغف رکھنے والوں کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں جب ان کے خاص مضمون سے ذرا سا بھی تعلق رکھنے والا کوئی مسئلہ چھڑتا ہے تو وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے اور پھر موسیٰ کلیم تو زود قلم ادیب تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اپنے اس مضمون "گفتگو بر گفتگو" میں انھوں نے علمِ نفسیات کی دیگر علوم پر برتری اور اس کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہونے کی کئی دلیلیں پیش کی تھیں۔ کچھ نفس اور روح کی بحث کی تھی اور اپنے مضمون کو اتنا پُرمغز بنا دیا تھا کہ میں تو شاید صرف ایک ہی صفحہ پڑھ سکا۔ اس کے بعد جب انھوں نے مدیر کتاب نما کے نام خط لکھا تو اور بھی زیادہ پیچیدہ اور مغلق تھا۔ (میں تو مغلق ہو کر رہ گیا)

میں اس بیان سے صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ برق آشیانوی کتنے باخبر اور حاضر دماغ آدمی تھے۔ نفسیات پڑھی ہوگی انھوں نے کوئی ۵۰ سال پہلے لیکن ان کے علم اور حافظے پر سن و سال اور امتدادِ زمانہ نے ایک ہلکی سی

لکیر تک نہیں کھینچی۔ (ہم نے ایسے کتنے ہی فارغ التحصیل دیکھے ہیں جن میں ہم خود بھی شریک ہیں کہ ادھر کالج سے باہر نکلے نہیں کہ سب بھول بھال گئے)

برق آشیانوی سے میں اپنی پہلی ملاقات کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کرسکتا لیکن اتنا ضرور عرض کرسکتا ہوں کہ مجھے ان سے نیاز اس وقت حاصل ہوا تھا جب وہ برق آشیانوی نہیں بنے تھے صرف موسیٰ کلیم تھے ــ جیل کی زندگی نے انھیں بہت زیادہ سنجیدہ بنا رکھا تھا ــ جیل کی زندگی سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ چند دنوں کے لیے جیل گئے اور باہر آگئے بلکہ وہ تھے ہی محکمۂ جیل میں ملازم۔ (یہ حبس دوام سے بھی زیادہ لمبی مدت کی سزا ہوتی ہے) لیکن اس خشک بلکہ شق القلب ملازمت نے ان سے ان کی خوش مزاجی، خوش دلی اور خوش گوئی کے جوہر نہیں چھین لئے اور ان کی ذات میں جو شاعر اور ادیب چھپا تھا وہ آگے چل کر اتنا ہی زیادہ چھپا۔

برق آشیانوی بے حد خلیق اور بامروّت آدمی تھے اور چہرے مُہرے سے جتنے شریف نظر آتے تھے اتنے ہی شریف الطبع بھی تھے۔ میرا اُن سے بہت کم ربط رہا لیکن جتنا بھی رہا وہ کثیر التعداد نہ سہی کثیر المقدار تھا۔ ان کی منکسر المزاجی نے انھیں ایک مخصوص حد میں رکھا اور اسی لیے وہ جلب شہرت کی ہوس سے ملوث نہیں ہوئے۔ ان کی نفاست پسند طبیعت نے انھیں روشنیوں کے پیچھے بھاگنے سے مانع رکھا اور وہ جس جگہ تھے اسی جگہ قانع رہے۔

ان کی پہلی تصنیف "یہ ایک تبسم . . ." تھی۔ مجھے بھی عنایت ہوئی تھی۔ اب ڈھونڈتا ہوں تو ملتی نہیں ہے اور میرا حافظہ میرا حافظہ ہے، برق آشیانوی کی کتابیں کہ نصف صدی پہلے کی پڑھی ہوئی چیزیں یوں یاد ہیں جیسے کل رات ہی مطالعہ میں آئی تھیں۔ ہاں یہ البتہ مجھے یاد ہے کہ جب مرحوم سے ان کے برق آشیانوی ہونے کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو میں نے عرض کیا تھا آپ تو سعید شہیدی کا کلام ہو گئے (سعید شہیدی کے کلام سے برق اور شیخ کے اشعار حذف کر دئیے جائیں تو صرف ان کا تخلص بچتا ہے ــــ یہ بھی کافی دقیع ہے) برق آشیانوی، فرقت کاکوروی کے قبیل کے شاعر اور ادیب تھے۔ نثر بھی مزاحیہ اور شاعری بھی مزاحیہ ہمارے یہاں اس نوع کے لوگوں کی کمی ہے ظریف شاعروں نے نثر کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ (شاید اکبر الہ آبادی نے منع کر رکھا ہو)۔ نثر نگاروں نے بھی یہی رویّہ اپنایا اور شعر گوئی کی طرف راغب نہیں ہوئے۔ رشید احمد صدیقی نے شاید ہی کبھی شعر کہا ہو۔ نہ سنجیدہ نہ مزاحیہ۔ شوکت تھانوی نے البتہ مزاح گوئی سے بھی شوق فرمایا لیکن صرف منہ کا مزا بدلنے کے لیے۔ انھوں نے شاعری کی نہیں صرف چکھی۔ ابن انشاء تھے تو انھوں نے نثر اور شاعری دونوں میں بکثرت نام کمایا اور ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ وہ اچھے مزاح نگار تھے یا بہتر شاعر۔ (سنجیدہ) ان کا وہ شعر تو زبان زد خاص و عام ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ چودھویں کی رات کو کچھ عجیب گل بڑھتی کچھ نے کہا چاند ہے یہ کچھ نے کہا چہرا تیرا ــــ ہمارے ہم عصروں میں صرف فرقت کاکوروی تھے جو نثر اور شعر (مزاحیہ) دونوں میں اپنا کمال دکھانے کا حوصلہ رکھتے تھے اور یہی بات برق آشیانوی میں تھی۔ شاعری غالباً انھوں نے ترک کر دی تھی اور نثر زیادہ لکھنے لگے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے انھیں بہلا پھسلا کر شگوفہ کا مستقل کالم نگار بھی بنا دیا تھا۔ پابندی سے لکھنا الگ چیز ہے اور پابند ہو کر لکھنا الگ بات لیکن برق آشیانوی جانتے تھے کہ 'استاد بندی' کے درجے تک پہنچنے کے لیے پہلے 'پابندی' ضروری ہے ــــ انھوں نے آخر آخر میں علائق دنیا سے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا اس لیے میں انھیں اپنے وقت کا سجادہ نشین مزاح نگار کہنا پسند کروں گا۔ ان کا آخری مضمون شاید "رخت سفر" تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا

"ہماری زندگی اکثر سامان باندھنے میں گزری ہے اور ہم اس میں اتنا تجربہ حاصل کر چکے ہیں کہ اب تقریباً

مذکورہ احباب اور عزیز و اقارب کو سامان باندھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو ہماری خدمات سے مفت استفادہ کیا جاتا ہے :

اور آخر کار بہتی آشیانوی نے ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء کو اپنا رختِ سفر باندھ ہی لیا ـــ جو سامان وہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں وہ ان کے اعمال نامے ہیں جلی حروف میں درج ہے اور وہ مشتمل ہے ان کی دینداری پر۔ اور خدا کرے کہ ایسا ہو کہ ان سے یہ بھی نہ پوچھا جائے کہ بتا تیری رضا کیا ہے ۔ □□

مجتبیٰ حسین

برق بنام مجتبیٰ — مجتبیٰ بنام برق

خط جو پوسٹ نہ ہو سکا

۲۴ اگست ۱۹۸۶ء

ڈیر کمال

السلام علیکم

قدرت بھی عجیب ستم ظریف ہے۔ ۱۲ اگست کو برق آشیانوی صاحب (جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے ...) کا ایک خط مجھے ملا تھا۔ میں اس خط کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا تھا اور خوشی بھی ہوئی تھی۔ حیرت اس لیے کہ ادھر اس بارہ برس سے ان سے کوئی خط و کتابت نہیں تھی۔ خوشی اس بات کی کہ ایک پرانا رشتہ پھر سے سانس لینے لگا تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ میں خطوں کے جواب بہت کم دیتا ہوں لیکن ایک تارک الدنیا شخص کے خط کا جواب دینے کی مجھے بے چینی سی تھی۔ اس میں شاید میرا یہ جذبہ بھی کار فرما تھا کہ چلو خط لکھ کر اس تارک الدنیا شخص کو پھر سے اس دنیا میں واپس لے آؤں۔ ۱۷ اگست کو اتوار تھا۔ اس دن میں نے برق آشیانوی صاحب کے نام ایک خط لکھا جو اب میں تمھارے پاس بھیج رہا ہوں۔ ۱۸ اگست کو یہ خط پوسٹ کرنے ہی والا تھا کہ "سیاست" میں یہ خبر پڑھی کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ دل و دماغ کو ایک دھکا سا لگا۔ ان کے انتقال سے یوں لگا جیسے اس دنیا میں شریفوں کی آبادی کچھ اور کم ہو گئی۔ وہ ایک نہایت مخلص، بے ریا اور شریف انسان تھے۔ ان کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں نے انھیں سترہ اٹھارہ برس پہلے مزاح نگاری کے جس راستے پر لگایا تھا اس پر وہ پوری صدق دلی کے ساتھ آخر وقت تک چلتے رہے حالانکہ وہ بہت اچھی سنجیدہ شاعری بھی کر لیتے تھے۔ صرف ہمارا پاس و لحاظ رکھنے کے لیے انھوں نے سنجیدہ شاعری کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس سے بڑی شرافت اور کیا ہو سکتی ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا۔ ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

یہ خط پچھلے ایک ہفتے سے میرے پاس رکھا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خط کا کیا کروں کیونکہ یہ خط جس کو لکھا گیا تھا اس کا اب پتہ ہی بدل گیا ہے۔ اسے پوسٹ کروں تو کہاں کروں؟ اب اسے تمھارے پاس بھیج رہا ہوں کہ تم مناسب سمجھو تو ان کا خط اور میرا جواب "شگوفہ" میں چھاپ دو تاکہ روزِ حشر برق آشیانوی مرحوم کو یہ شکایت نہ رہے کہ میں نے ان کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔

یار! قدرت سچ مچ بڑی ستم ظریف ہے۔

سارے احباب کو سلام کہو۔ مسیح انجم نے عرصہ سے نہ کوئی خط لکھا اور نہ ہی کوئی مضمون۔ لگتا ہے وہ بھی اب تارک الدنیا ہوگئے ہیں۔ حیدرآباد مجھے اس مہینے میں آنا تھا مگر اب اکتوبر میں آؤں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب حیدرآباد بھی دوستوں سے خالی ہوتا جارہا ہے۔ کچھ دوستوں کو موت کھا گئی۔ باقیوں کو زندگی کھا گئی۔ زندگی نے کئی احباب کو اتنا اُلجھا رکھا ہے کہ زندہ ہیں مگر اپنے زندہ رہنے کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

طالب خوندمیری تو اب علامہ اقبال کے شاہین بن گئے ہیں، کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اس پرندہ کی یہی تو خوبی ہے کہ اقبال کی شاعری کے سوا کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔ طالب سے کہو کہ وہ شاہین بننے کے چکر میں نہ پڑیں۔ سیدھے سیدھے شاعری کرتے رہیں۔

مخلص
مجتبیٰ حسین

۷/ اگست ۱۹۸۶ء

برادرم مجتبیٰ حسین صاحب

السلام علیکم۔ میں نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے "مرزا کی تلاش میں"۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ میرے دوست احباب نے مجھ سے کہا کہ "اکثر مزاح نگاروں کے پاس ایک مرزا ہوتا ہے۔ لیکن تمھارے کسی مضمون میں مرزا کا ذکر اب تک نہیں آیا۔ انھوں نے دھمکی دی کہ جب تک تمھارے کسی مضمون میں مرزا نہ ہوگا ہم تمھیں مزاح نگار نہیں مانتے۔ چنانچہ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد مجتبیٰ حسین کو لکھا کہ بھئی مجتبیٰ صاحب مجھے اپنے مضمون کے لیے مرزا کی سخت حاجت ہے۔ آپ اپنا مرزا مجھے مستعار عنایت فرمائیں۔ بعد رفع حاجت واپس کردیا جائے گا۔" مجتبیٰ حسین نے جواب دیا کہ میں بخوشی اپنا مرزا آپ کے حوالے کردوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اُسے واپس نہ کریں بلکہ اپنے پاس ہی رکھ لیں۔ اس لیے کہ میں اپنے مرزا سے بہت تنگ آگیا ہوں کیوں کہ وہ ظالم ہمیشہ میرے سر پر سوار رہتا ہے کہ ایک مضمون لکھ کر دو تاکہ میں اپنے نام سے شائع کرواؤں۔ اب تک کئی مضامین لکھ کر دے چکا ہوں، حتیٰ کہ "جاپان چلو" والی کتاب بھی وہ اپنے نام سے چھپوانا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ جاپان کے سفر میں میرے ساتھ نہ تھا۔" میں نے گھبرا کر لکھا کہ بھائی مجتبیٰ صاحب ایسا مرزا لے کر کیا کروں، وہ تو آپ ہی کا دل گردہ ہے کہ ایسے مرزا کو سنبھال رہے ہیں۔ مجھ سے سنبھل نہ سکے گا۔

مذکورۂ صدر تحریر میں آپ سے مخلصانہ تعلقات کی بنا پر لکھ سکا تاہم اس کے لیے معذرت خواہ ہوں، آدمی کس قدر خود غرض ہوتا ہے۔ جس کی زندہ مثال میں خود ہوں کہ غرض پیش آئی تو خط لکھ رہا ہوں۔ اگر فرصت ملے تو آپ بھی کوئی خط لکھ دیجئے۔ آپ سے اس لیے گلہ نہیں کہ آپ میری طرح فرصت میں نہیں ہیں (اگرچہ مجھے علالت کی وجہ سے اپنی فرصت سے کچھ زیادہ استفادہ بھی ممکن نہیں ہے) آپ نے [illegible] ساری بلائیں یعنی مصروفیتیں اپنے سر لے لی ہیں کہ کسی کو خط لکھنے کا وقت نکال لینا مشکل ہے۔ اس کا مجھے قوی احساس ہے۔

ایک بے جا حرکت یہ کر رہا ہوں کہ اپنا سنجیدہ کلام چھپوا رہا ہوں۔ میری شاعری کی ابتداء سنجیدہ کلام ہی سے ہوئی تھی۔ اسٹیج پر میں مذہبی کلام سے آیا یعنی میلاد النبیؐ کے جلسوں میں نظمیں سناتا تھا۔ ویسے ادبی مشاعروں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ ماہر القادری، مخدوم محی الدین، عبدالصمد ساز، میکش، سعید شہیدی وغیرہ کے ساتھ کلام سنایا تھا۔ ہاں مشاعروں میں نظام کالج کا مشاعرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے بعد عاملانہ خدمت پر مامور ہونے

کی وجہ سے ایک طویل عرصے تک ان صحبتوں سے محروم رہا، پھر پولیس ایکشن کے بعد کا دور جمود کا دور تھا۔ پھر جب زندہ دلانِ حیدرآباد سے وابستہ ہوا (وابستہ کرانے میں بھی غالباً آپ پیش پیش تھے۔ کیونکہ نائب معتمد منتخب کرکے آپنے مجھے خط لکھا تھا کہ قبول کروں) تو مزاحیہ شاعری شروع کی اور مزاح گو شاعر کی حیثیت سے پہچانا گیا۔

مذکورۂ صدر مجموعہ شائع ہوجانے کے بعد آپ کی خدمت میں ضرور روانہ کروں گا۔ دِلی میں اگر کچھ لوگوں نے مجھے یاد رکھا ہو تو انہیں سلام خلوص فرمایئے۔

فکر تونسوی صاحب کی خدمت میں تو مودبانہ سلام عرض ہے۔ پہنچا دیں۔ کیوں کہ اُن کا خلوصِ بیکراں میرے ساتھ ہے۔ فقط آپ کا

موسیٰ کلیم (برقؔ آشیانوی)

مزید۔ فی الحال چند الفاظ میں جواب دیجیے تو موجبِ تشکر ہوگا۔ تاکہ اس بات کا اطمینان ہو کہ خط آپ کو مل گیا۔

برادر مکرم ۱۷/ اگست ۱۹۸۶ء

السلام علیکم:

ایک مدت کے بعد آپ کی ہینڈ رائیٹنگ میں آپ کا خط پڑھنے کو ملا۔ آپ نے یاد کیا اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ مگر یہ اچانک آپ کو میری یاد کیوں آگئی؟ یادیں بھی بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ دھیرے دھیرے تو آہی نہیں سکتی۔ جب بھی آئے گی موت کی طرح اچانک آئے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ بھی مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ سال میں دو ایک پھیرے حیدرآباد کے لگ جاتے ہیں۔ دوستوں سے ملنے کو جی چاہتا ہے مگر مکروہاتِ زندگی میں اتنا اُلجھ جاتا ہوں کہ جن سے ملنا چاہتا ہوں مِل نہیں سکتا۔ عرصہ ہوا کہ آپ تارک الدنیا ہوچکے ہیں لیکن دنیا ترک کرنے کے باوجود آپ جس خوب صورتی سے دنیا سے اپنا رشتہ بنائے ہوئے ہیں ویسا رشتہ میں دُنیا کو ترک کئے بغیر نہیں بنا سکا۔ دُنیا ہے ہی ایسی جگہ کہ اس میں جتنا INVOLVE ہوتے جایئے یہ اُتنی ہی آپ سے دور ہوتی جائے گی۔ نئے رشتوں کو سنبھالنے کی کوشش کرو تو پُرانے رشتے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ پُرانے رشتوں کو جوڑنے کی کوشش کرو تو نئے رشتے بکھر جاتے ہیں۔ خیر۔

آپ نے "مرزا کی تلاش میں" والے مضمون کا ذکر کیا ہے۔ آپ شوق سے میرے بارے میں ذکر کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اب مرزا کی تلاش ہے کیونکہ عرصہ ہوا کہ میں نے بھی اپنے کسی مضمون میں اس کا استعمال نہیں کیا ہے میرا بھی اب ذاتی خیال ہے کہ اُردو مزاح نگاروں کو اب مرزا کی حاجت نہیں رہ گئی ہے۔ آپ کی چیزیں جب بھی آپ لکھتے ہیں اور وہ چھپتی ہیں، شوق سے پڑھتا ہوں۔ جی خوش ہوتا ہے۔

"زندہ دلانِ حیدرآباد" کی ابتدائی سرگرمیوں میں آپ نے جس لگن سے کام کیا تھا۔ کاش وہ لگن نئے لکھنے والوں میں بھی پیدا ہوسکے۔

دلی کی بے ہنگم زندگی میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ کئی سماجی تقاضوں اور خلوص کی ضرورتوں کی تکمیل نہیں کرسکتا۔ آپ جیسے احباب یاد کرلیتے ہیں تو جی کو یک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

فکر صاحب کی طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ اب ستر سال کے ہونے والے ہیں۔ اکثر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھار اُن سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ اگلی بار جب بھی جاؤں گا تو آپ کا سلام پہنچادوں گا۔ کسی دوست کا سلام پہنچے تو وہ بھی خوش ہونے لگے ہیں۔ ایک عمر میں آدمی کو سچ مچ سلاموں کی حاجت ہوجاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی پہلے ہی اُس کی مزاج پُرسی نہ کرے سلام ہی بھیج دیا کرے۔ زندہ رہنے کے لیے آدمی نے کیا کیا بہانے تراش کر رکھے ہیں ـــــ ایک مدت کے بعد آپ کا خط پاکر سچ مچ خوشی ہوئی۔ اِسی لیے جواب بھی فوراً دے رہا ہوں۔ ورنہ میں جواب دینے کے معاملے میں نہ صرف کاہل ہوں بلکہ جاہل بھی ہوں (جاہل اس لیے کہ جب لوگوں کو اُن کے خطوں کے جواب میری طرف سے نہیں ملتے تو سمجھتے ہیں کہ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اور نرا جاہل ہوں)۔

اس بار حیدرآباد آؤں گا تو آپ سے ضرور ملوں گا۔ پتہ نہیں کب آنا ہوتا ہے۔ ستمبر میں سوویت یونین جارہا ہوں، اُس کے بعد ہی یعنی اکتوبر میں کبھی حیدرآباد آؤں گا۔

آپ اپنے سنجیدہ کلام کا مجموعہ شائع کررہے ہیں۔ ضرور کرائیے مگر اب تو آپ کی شناخت ایک مزاح نگار کی حیثیت سے مسلّم ہوچکی ہے۔ اس شناخت میں کیوں ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ لوگ آپ کے سنجیدہ کلام کو کہیں مزاحیہ نہ سمجھ لیں۔ اس لیے کہ زمانہ شناخت سے ہی چلتا ہے۔ اسی لیے میں کوئی سنجیدہ بات کرنے سے ہمیشہ کتراتا ہوں کیونکہ لوگ اس پر بھی ہنس دیتے ہیں اور مجھے اندر ہی اندر کوفت ہوتی ہے۔ یُوں بھی مومنؔ نے کہہ رکھا ہے

؎ عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

یہ مَیں اپنی بات کررہا ہوں۔ پھر بھی آپ اپنے سنجیدہ کلام کو چھاپنے کے لیے سنجیدہ ہیں تو ضرور چھاپیے۔
میرے لائق کوئی خدمت ہو تو یاد فرمائیے۔

مخلص
مجتبیٰ حسین

مسیح انجم

برق آشیانوی

کچھ یادیں، کچھ باتیں

سن یاد نہیں رہا۔ غالباً تیرہ، چودہ برس پہلے کی بات ہے۔ "علی کالج" میں سلیمان ادیب مرحوم (ماہنامہ "صبا"
ایڈیٹر اور شاعر) کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ
موجود تھا۔ اور وقت پر پہنچنے کی اذیت سے گذر رہا تھا۔ شہر کے ادیب، شاعر و دانشور ایک ایک کر کے آنے لگے
۔ اتنے میں برق آشیانوی صاحب تشریف لائے۔ ہال میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی مانوس یا منوس دیکھا بھا
لا) چہرہ نظر آجائے تو اس کے قریب بیٹھ سکیں۔ کوئی مانوس چہرہ تو انھیں نظر نہ آیا۔ البتہ جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی
یرے قریب آئے اور بازو کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہال میں مکمل طور پر تعزیتی فضا موجود تھی۔ ہال میں موجود لوگ علیک سلیک
م رف اشاروں سے لے رہے تھے۔ برق صاحب کے بیٹھتے ہی ایک جانے پہچانے شاعر ہال میں داخل ہوئے علیک
ساک کے لیے جیسے ہی دو چار ہاتھ اُٹھے، برق صاحب نے مجھ سے پوچھا "یہ کون صاحب تھے؟" میں نے ان کا نام بتایا۔
ے بعد شہر کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہال میں داخل ہوئی۔ برق صاحب نے پھر پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" میں نے
ا نام بھی بتا دیا۔ پھر اس کے بعد تو میرا کام ہال میں داخل ہونے والے ہر شخص کا نام اور اس کے حدود اربعہ بتانا رہ گیا
۔ لیکن جب روزنامہ "سیاست" کے جوائنٹ ایڈیٹر جناب محبوب حسین جگر داخل ہوئے اور برق صاحب نے پھر وہی سوال
یا "یہ کون صاحب ہیں؟"
ی بار مجھ سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ آہستہ سے کہا "برق صاحب! ابھی میں ان کا نام بتاتا ہوں۔ لیکن اس کے بعد پلٹ کر مجھ
یہ نہ پوچھیں کہ جناب آپ کون ہیں؟"
ا صاحب کے لبوں پر برق لہرائی۔ اور پھر پوچھنے کا سلسلہ ترک کر دیا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ برق صاحب شہر کے کسی ادیب یا شاعر یا دانشور سے واقف نہیں تھے۔ واقف تو وہ سب سے
۔ لیکن ان کی واقفیت صرف تحریروں کی حد تک تھی۔ شخصی طور پر بہت کم لوگوں سے تعارف حاصل تھا۔ محفلوں میں بہت کم
ایا کرتے تھے۔ گو چھپتے چھپاتے بہت تھے۔ لیکن چھپے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ شاید ہی کوئی رسالہ یا اخبار بچا ہو
ان کی تحریروں کی نعمت سے محروم رہا ہو۔ یہاں مجھے ان کی ایک تحریر یاد آ رہی ہے جو روزنامہ "رہنمائے دکن" کے ادبی

صفحہ پر شائع ہوئی تھی جسے مصطفیٰ کمال نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مصطفیٰ کمال "رہنمائے دکن" کے ادبی صفحہ ترتیب دیا کرتے تھے۔ ان کو ایسی تحریریں شائع کرنے میں بڑا لطف آتا تھا جس میں ذرا "ڈِشُم، ڈِشُم" قسم کا مسالحہ ہو۔ برق صاحب کی تحریر کا عنوان تھا:

"ویمنس کالج کی طالبات اور بندر"

اتفاق سے اسی صفحہ پر میرا مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن ذرا نیچے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ برق صاحب کی تحریر پر کالج کی طالبات نے بہت ہی واویلا مچایا تھا۔ مضمون کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"یہ معلوم کر کے ہمیں سخت حیرت ہوئی بلکہ شدید رنج پہنچا کہ ویمنس کالج کی طالبات بندروں سے پریشان اور خوف زدہ ہیں۔ رنج اس بات کا ہے کہ طالبات تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی پریشان ہو رہی ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بندروں کا انسانوں سے اس قدر قریبی رشتہ ہے کہ کسی اور جانور کا نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی اور جانور کا انسان سے رشتہ ہی نہیں ہے... ... بندر سے انسان کا جو رشتہ ہے وہ ڈاروِن کے نظریہ سے واضح ہے... اگر کوئی جاہل انسان بندروں سے ڈرے یا گھبرائے تو پھر بھی قابل معافی ہے۔ لیکن کسی تعلیم یافتہ شخص کا بندروں سے ڈرنا ۔۔۔ تعلیم یافتہ لوگوں کو بندروں سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیئے......" وغیرہ

آگے چل کر اسی مضمون میں برق صاحب نے طالبات کو چند مفید مشورے بھی دیئے تھے:

"... بندروں سے اس طرح پیش آئیں جس طرح "برخوردار" قسم کی مخلوق "بزرگ" قسم کی مخلوق سے پیش آتی ہے۔ یعنی یہ کہ ان کا ادب و احترام کریں.... ادب و احترام میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ بس ذرا جھک کر سلام کر لیا کریں اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جائیں۔ رہا خاطر تواضع کا معاملہ۔ تو یہ بھی زیادہ مشکل نہیں۔ طالبات اپنا ٹیفن تو ساتھ لیجاتی ہوں گی... طالبات کو چاہیئے کہ بندروں کی حرکات کو نظر انداز کر دیں: بچپن میں انسان بندر سے بہت زیادہ مشابہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بچپن میں انسان بھی بندر ہی ہوتا ہے..." وغیرہ وغیرہ

برق صاحب کی تحریر تو آپ نے پڑھ لی۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ تحریر کیا کہہ رہی ہے اور بین السطور میں کیا کہا جا رہا ہے؟ لیکن طالبات نے اس کا بہت برا مانا اور مراسلے لکھے۔ مزاح نگاری میں یہی کچھ تو ہوتا آیا ہے۔ مزاح نگار کہتا کسی کو ہے اور آستینیں کوئی اور چڑھاتا ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر شعر بھی کہے اور مطلب بھی سمجھائے!

جب مزاح نگاری کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں برق صاحب کی مزاح نگاری کا بھی ذکر کروں ۔۔۔ برق صاحب نے اپنی پہلی کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ مزاح نگاری کے لیے چار عناصر ضروری ہیں:

ایک، زبان۔ دوسرے، زندگی کی عکاسی۔ تیسرے، قوتِ مشاہدہ۔ چوتھے، نفسیاتی تجزیہ۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مزاح وہ ہے جو قاری کے لبوں پر تبسم بکھیر دے۔ (چنانچہ اسی مناسبت سے انھوں نے اپنی پہلی کتاب کا نام "... یہ ایک تبسم" ہی رکھا تھا۔

برق صاحب کی مزاح نگاری کی بنیاد انھیں چار عناصر پر قائم ہے۔ مجھے تو برق صاحب کے مشاہدہ پر حیرت ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کے مضامین پڑھیں تو پتہ چلے گا کہ برق صاحب کا مشاہدہ کتنا تیز تھا۔ حالانکہ وہ ان مزاح نگاروں میں سے

نہیں تھے جو محض مشاہدہ اور تجربہ کی خاطر بے اعتدال زندگی گزارتے ہیں۔ ان کا شمار ان ادیبوں اور شاعروں میں بھی نہیں کیا جا سکتا جو "مقاماتِ آہ و فغاں" پر اکثر و بیشتر نظر آتے اور لڑکھڑاتے ہیں۔ وہ ایک نہایت ہی شریف، نیک نفس اور منکسر المزاج انسان تھے۔ ان کی ذات کے اطراف شرافت، وضع داری، سنجیدگی، متانت و بردباری کا ایک حصار کھنچا ہوا رہتا تھا۔ وہ اس بات کا موقع ہی نہیں دیتے تھے کہ کوئی ادیب یا شاعر اس حصار کو توڑے۔ اور وہ خود بھی اس حصار سے باہر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ان سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی عمر کی نصف سنچری پار کر چکے تھے۔ سر اور پیشانی کی حدِ فاصل اٹھ کر سر کے اس حصے میں جا چکی تھی جہاں سے دماغ کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ سُرخ و سپید رنگت۔ جب کسی سے ملاقات کرتے تو چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔ اور پھر چہرے کی سپیدی پر سُرخی غالب آ جاتی تھی۔ ستواں ناک۔ جس پر لیڈی کٹ عینک بڑی بھلی لگتی تھی۔ چہرہ پر مختصر سی فرنچ کٹ داڑھی۔ جس کی قطع و برید میں سلیقہ مندی کو دخل تھا۔ لیکن گوشہ نشینی کے بعد داڑھی کو مزید بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ داڑھی بالکل شرعی حدود میں آ گئی تھی۔ آخری دنوں میں سر کے بالوں کی جگہ سفید پگڑی نے لے لی تھی۔ سفید داڑھی اور سفید پگڑی ـــــ سرتاپا بالکل مولانا برق آشیانوی بن گئے تھے۔ قد واجبی سا پایا تھا۔ ٹھنگنوں میں کھڑے ہوتے تو اوسط قد کے معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ اکہرے بدن کے تھے اور گوشت پوست، سے لدے پھندے نہیں تھے، اس لیے "ٹھنگنا" یا "پست قد" کی تہمت سے بری تھے۔ ہمیشہ شیروانی اور ڈھیلے ڈھالے پاجامہ میں ڈھلے رہتے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ لیکن نفاست پسندی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

وہ ایک عرصے تک زندہ دلانِ حیدرآباد کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ زندہ دلان کی میٹنگوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ مجھے کوئی ایسی میٹنگ یاد نہیں جس میں برق صاحب نے اختلافِ رائے کیا ہو۔ ہمارے برق آشیانوی ایک ایسی برق کے حامل تھے جس نے انسانوں سے شریفانہ معاہدہ کر رکھا ہو۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ برق گرم ہوتی ہے یا ٹھنڈی۔ میں نے کبھی اپنے اوپر برق کو گروا کر کوئی تجربہ نہیں کیا۔ البتہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے مجھے برق صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہی نہیں ان کے ساتھ ریل کا ایک سفر تو یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈسمبر ۴، ۱۹۷ء میں بھوپال میں ایک کل ہند مزاحیہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ جس کے پیچھے میرے مزاح نگار دوست مجتبیٰ حسین کا ہاتھ تھا۔ مزاحیہ کانفرنسیں مجتبیٰ حسین کی کمزوری ہیں۔ اور میری کمزوری مجتبیٰ حسین ہیں۔ چنانچہ دلی سے مجتبیٰ حسین نے تخلص بھوپالی کو لکھا کہ حیدرآباد کے مزاح نگاروں کو بھوپال لانے کی ذمہ داری مسیح انجم پر ڈال دیں۔ اس طرح یہ ذمہ داری بالواسطہ طور پر مجھ پر آ پڑی تھی۔ ادیبوں کو جمع کرنا تو آسان کام ہے۔ لیکن شاعروں کا جمع کرنا، اللہ کی پناہ! ـــــ ایک کو منا کر لاتے تک دوسرا بھڑک کر نکل جاتا ہے۔ دوسرے کو گھیر گھار کر لانے تک تیسرا بھڑک کر چل دیتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے کرہ بڑ حیدرآبادی، مصطفےٰ علی بیگ، طالب خوندمیری اور لیڈگن حیدرآبادی کو راضی کیا۔ سوچ رہا تھا کہ برق صاحب کو کس طرح راضی کروں؟ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ وہ ریل کے لمبے سفر سے گھبراتے ہیں لیکن جب میں نے ان سے درخواست کی تو کچھ عذر کیا نہ حیلہ ـــــ فوراً رضامندی دے دی۔ یہ ان کی عالی ظرفی تھی۔ حالانکہ ایک تو تنہا بڑھاپا تھا دوسرے ریل کا لمبا سفر ہونے کے ناطے ان کو ملنا اور چلنے کا ڈبل چانس تھا۔ [illegible] برق صاحب جو توشہ لائے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ زادِ راہ توشہ دان سے نہیں، مطلب کہ ایک وقت تین وقت

آدمی سیر ہوکر کھا سکتے تھے ۔ اور ڈشیں بھی ایسی کہ بس انگلیاں چاٹتے رہ جائیے۔ مرحوم میں خاص وصف یہ تھا کہ وہ کھلاکر خوش ہوتے تھے ۔ اس سفر میں برق صاحب نے کھایا کم اور کھلایا بہت ۔ سفر سے واپس ہوئے تو بہت خوش تھے ۔ بھوپال کے کل ہند مزاحیہ مشاعرے میں انھیں بے پناہ داد ملی تھی ۔ اس قطعہ پر تو ہال کی چھت قہقہوں سے اڑتے اڑتے رہ گئی تھی :

سیکس ایجوکیشن شریک درس ہونا چاہیئے
لیکن اس میں احتیاط اس بات کی فرمایئے
جس قدر تعلیم ہو اسکول ہی میں دیجیئے
"ہوم ورک" اس کا مگر بچوں سے مت کروایئے

ان سے آخری ملاقات آج سے تقریباً دس بارہ مہینے پہلے ہوئی جبکہ کراچی (پاکستان) سے پروفیسر حمید اللہ شاہد حیدرآباد تشریف لائے تھے ۔ برق صاحب نے شاہد صاحب کے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک مخصوص ادبی نشست کا اہتمام کیا تھا ۔ جس میں حمایت اللہ ، مصطفیٰ علی بیگ اور طالب خوندمیری مدعو تھے ۔ مجھے اس محفل میں مزاحیہ مضمون سنانا تھا ۔ اس محفل میں جب برق صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر نقاہت کے آثار نمایاں تھے ۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی لمبے سفر کے بعد تھک سے گئے ہیں ۔ پچھلے کئی سال سے تو وہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے ۔ بالکل تارک الدنیا ہو چکے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود ادب سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا تھا ۔ جب کبھی تخلص سرا جاتا کوئی نہ کوئی چیز نظم یا مضمون کی شکل میں "شگوفہ" کو بھیج دیتے تھے ۔ یہ ان کا خیریت نامہ بھی ہوتا تھا اور تبسّم بھی ۔ اس طرح برق صاحب نے آخری وقت تک "شگوفہ" کے توسط سے مزاح اور مسکراہٹ سے اپنا تعلق برابر برقرار رکھا ۔ لیکن ان کا یہ تعلق ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا ۔ اور وہ برق آشیانہ سے فلک آشیانوی ہو گئے ۔

▭▭

سید موسیٰ کاظم
پرنسپل اورینٹل اردو کالج، حیدرآباد

پیکرِ خلوص

بزرگوں کی شفقت اور محبت اس زمانہ میں ایک جنسِ گراں کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیار، محبت کے الفاظ ہمارے گیتوں میں ہی رہ گئے ہیں عملی زندگی میں ان کی جگہ نفرت، اور دشمنی نے لے لی ہے۔ اب وہ پہلا سا خلوص، پہلا سا پیار، پہلی سی محبت ہمارے سماج میں کہاں؟

برق آشیانوی صاحب محبت اور شفقت کے پیکر تھے جس سے ملتے اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے، پہلے پہل ملاقات میں ان کی علمی ادبی شخصیت کا رعب مخاطب پر نہ پڑے مگر شرافت اور خلوص کا سکہ ضرور نئے آدمی پر بیٹھ جاتا تھا ــــ وہ ایک عالم فاضل انسان ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب ماہرِ تعلیم بھی تھے MARTINET H. SCHOOL ان ہی کا قائم کردہ ہے اس اسکول کی شاندار عمارت ان کی مجاہدانہ زندگی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔

سادات مہدویہ میں برق صاحب کو متوسل سید کہلانے کا شرف حاصل تھا ــــ کبھی وہ نظام سرکار کے زمانہ میں جیلز کی خدمات انجام دیتے رہے۔ کبھی سنجیدہ، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ کبھی مذہبی، ادبی، مزاحیہ شاعری کی کبھی مہرِ ولایت کی ادارت سنبھالی۔ کبھی دائرہ مہدویہ گمٹ کیسر میں خلافت کے فرائض انجام دیئے ــــ غرض جو کام بھی اپنے سر لیا اُسے پورا کر کے چھوڑا۔ ساری زندگی معروفیت میں گزری وہ نچلا بیٹھنے کے قائل نہ تھے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی اُمنگ اور لگن ان کے دل میں رہی۔ لکھنا پڑھنا تو ان کا معمول تھا ــــ وہ ۱۹۳۶ء سے لکھ رہے تھے ان کا شمار حیدرآباد کے کہنہ مشق ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ بے شمار مضامین کے علاوہ ایک ناول بھی چھپ چکا ہے "یہ ایک تبسم" ان کے مزاحیہ مضامین کا مقبول عام مجموعہ ہے۔ "ورق ورق" ان کے سنجیدہ کلام کا مجموعہ ہے جو عنقریب شائع ہوگا ــــ اردو ادب کی خدمت انگریزی ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے اصحاب نے جدید انداز سے خوب کی ہے۔ فیض احمد فیض، آل احمد سرور۔ مجنوں گورکھپوری۔ فراق گورکھپوری، قرۃ العین حیدر وغیرہ وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ برق صاحب نے بھی انگریز کے دور میں انگریزی ذریعہ تعلیم سے میٹرک کرنے کے بعد عثمانیہ ٹیچرس ٹریننگ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ پنجاب اورینٹل کالج سے بی۔ اے (اورینٹ) پاس کیا۔ انھیں انگریزی ادب کے ساتھ نفسیات اور تدریس کے علم سے خاص دلچسپی رہی۔ ان علوم سے انھوں نے کما حقہٗ استفادہ بھی کیا، نہ صرف اپنے بچوں کی بہتر

تربیت کی بلکہ ایک اسکول قائم کر کے عام طلبہ کو بھی اپنے تجربوں سے مستفید کیا۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کا ان پر اس درجہ اثر تھا کہ جب وہ چھٹی جماعت کے ہونہار طالب علم تھے، اپنے والد بزرگوار کے سامنے مسجد کو چرچ کہہ گئے جس کی پاداش میں انھیں مشن اسکول سے نکلوا دیا گیا اور اسلامیہ اسکول سکندرآباد میں شریک کروادیا گیا۔ وہ انگریزی شاعری کے رموز سے بھی واقف تھے چنانچہ انھوں نے بچوں کے لیے بعض چھوٹی چھوٹی مترنم نظمیں انگریزی میں کہی ہیں۔ ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہندوستانی ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں۔

ہنسنا ہنسانا پیٹ کی دوزخ بھرنے کے بعد ہی بھلا لگتا ہے حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں نے مزاحیہ ادب کی طرف غالباً اس لیے توجہ نہیں دی تھی کہ ان کے پیٹ بھرے ہوئے تھے بلکہ انھوں نے اپنی محرومیوں، ناکامیوں کو بھلانے کے لیے ہنس ہنس کر جینے کو بطور "فیشن" قبول کیا تھا۔ یوں بھی ریاکاری تصنع اور بناوٹ جاگیردارانہ نظام کی خاص لوازمات ہوتی رہی ہیں۔ شاعر یا ادیب کو داد بھی نہ ملے تو وہ کاہے کو اپنا جی جلائے؟ ہمارے شعرا اور ادیبوں کو داد پانے کا ذریعہ بھی یہی مزاحیہ ادب نظر آیا۔ یہ دوسری وجہ تھی۔ برق صاحب گو بڑے متین انسان تھے مگر انھوں نے بھی یہی راہ اپنائی ان کا کہنا ہے کہ "طنز و مزاح کے میدان میں بہت کم فن کار ہیں چنانچہ اس فن کی اپنی پوری لو بھی اسی میں لگادی شاعری سے زیادہ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہو گیا" (ورق۔ ورق ص۱۳)

مزاحیہ ادب میں برق صاحب نے اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے حیدرآباد کے طنز و مزاح لکھنے والوں میں ان کا مقام صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔

برق آشیانوی صاحب سے میری ملاقات انجمن ترقی اردو کے ایک اجلاس میں ہوئی تھی۔ وہ ساری مبارکباد یاں اور تعریفیں، جو انھیں غلط فہمی کی بناء پر میرے ایک مضمون پر ملی تھیں لوٹاتے ہوئے کہا تھا "حق بحق دار رسید" ۔۔۔ ہوا یہ تھا کہ میرا ایک مضمون "مجلہ عثمانیہ" میں شائع ہوا تھا۔ نام کی مماثلت کے باعث اس مضمون کا سارا کریڈٹ سید موسیٰ کلیم صاحب کو دیا جارہا تھا کہ اس وقت موسیٰ کلیم صاحب ہی صاحب طرز ادیب تھے۔ یہ سمجھا گیا کہ کلیم کی بجائے کاتب نے غلطی سے کاظم لکھ دیا ہے۔ مگر کلیم صاحب کو علم تھا کہ کاظم کون ہے؟ چنانچہ ملاقات ہوتے ہی میرا حق مجھ تک پہنچا دیا۔ اور احتیاطاً یہ برق کہ برق آشیانوی کو ہی اپنے ملک اور بیرون ملک چمکنے دیا سنجیدہ اور مذہبی کلام کی حد تک سید موسیٰ کلیم رہنے دیا کہ سید موسیٰ کاظم سے اس میدان میں سابقہ پڑنے کا خدشہ ہی نہ تھا۔

گاہے گاہے ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی جب بھی ملتے اپنے خلوص سے دل موہ لیا کرتے ایک مرتبہ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے "غالباً آپ حسینی شاہد صاحب کی جگہ کام کر رہے ہیں" میں نے ہامی بھری تو بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ دوسرے دن اخبار "سیاست" میں ایک تہنیتی جلسے کا اعلان یہ کہہ کر کردا دیا کہ میں اردو آرٹس کالج کا پرنسپل بنادیا گیا ہوں۔ شاہد صاحب نہ صرف اردو آرٹس کالج کے پرنسپل تھے بلکہ وہ اورینٹل اردو کالج کے بھی پرنسپل تھے گفتگو کے دوران کسی کالج کا نام نہیں آیا تھا اس لیے ان سے غلط فہمی ہو گئی۔ بات لبوں سے نکلی کوٹھوں تک چلی گئی۔ اس طرح دوسروں کی ترقی اور کامیابی پر خوش ہونے والے اب کہاں؟ حیدرآباد کی قدیم تہذیب کے علم بردار برق آشیانوی صاحب کا یہی وصف انھیں عام انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے۔ اور انھیں اپنے دیدار سے مشرف کرے۔

آمین ثم آمین!

شمیم نفرتی

حضرت برق آشیانوی

(شخصیت و فن)

کوئی بیس سال کا عرصہ ہوا ہوگا کہ میں کسی مقامی رسالہ میں ایک مزاحیہ مضمون پڑھ رہا تھا۔ چونکہ مضمون معیاری اور ستھرے مزاح کی چاشنی لیے ہوئے تھا۔ اس لیے میری نظریں مضمون نگار کے نام برق آشیانوی پر جم گئیں۔ دوبارہ غور سے نام پڑھا اور جب یقین ہوگیا کہ مضمون نگار کا نام برق آشیانوی ہی ہے تو مجھے بے تحاشہ ہنسی آئی اور میں یہ سمجھا کہ موصوف کسی ایسے مقام کے رہنے والے ہیں جہاں کے آشیانوں کو حکومت وقت نے شاک پروف کردیا ہے تاکہ برق اپنی کم مائیگی اور بے بساطی پر سدا ماتم کرتی رہے۔ میں برق آشیانوی کی ترکیب پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتا رہا مگر کبھی بھی میرے ذہن میں کوئی معقول وجہ ظاہر نہ ہوئی جو مجھے مطمئن کرسکے اور کچھ ہی عرصہ میں برق آشیانوی صاحب تمام مقامی روزناموں ماہناموں میں اس طرح نمودار ہونے لگے جس طرح برقی رو پوری سرکٹ میں آناً فاناً پھیل جاتی ہے مضامین کے ساتھ ساتھ موصوف کی مزاحیہ نظمیں بھی شائع ہونے لگیں۔ ابتداء میں یہ گمان ہوا کہ کسی غالب شکن نے تشریح کلام غالب کے بہانے غالب کا مذاق اڑانے کی ٹھان رکھی ہے۔ مگر برق آشیانوی صاحب نے اس موضوع پر وہ گلکاریاں کی ہیں کہ غالب کی روح بھی یقیناً لطف اندوز ہوئی ہوگی۔ جب حیدرآباد کی ادبی محافل میں تشریح کلام غالب اور دیگر مزاحیہ مضامین اور نظموں کا خوب چرچا ہوا تو خیال آیا کہ موصوف کا اتا پتہ ڈھونڈوں۔ چنانچہ احباب سے پوچھ گچھ شروع کی اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب احباب نے ایک انتہائی سنجیدہ، سلیم الطبع اور وضعدار شخصیت کی نشان دہی کی جو اپنے اعلیٰ کردار اور علمی صلاحیتوں کی وجہ سے بڑی ہی خوبیوں کے حامل اور احباب میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے اور جو ادب دوستوں میں سید موسیٰ کلیم ید اللّٰہی کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ مجھے دوستوں کی باتوں پر یقین نہ آیا اور میں یہ سمجھا کہ لوگ ان پر خواہ مخواہ برق آشیانوی بن جانے کا الزام لگا رہے ہیں۔ میں برق آشیانوی اور موسیٰ کلیم ید اللّٰہی میں باہم تقابل کرتا رہا۔ مگر دونوں میں کسی بھی رخ سے کوئی مطابقت نظر نہ آئی۔ مگر کچھ ہی دن میں یہ گل کھلا کہ موصوف احباب کے الزام مفروضہ سے بری نہ ہوسکے۔

برق آشیانوی صاحب اپنی وضع قطع سے اگلے وقتوں کی نشانی، چہرے مہرے سے راشد الخیری کا ناول کا کردار

سے خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ دکھائی دیتے تھے اور اپنے قلم سے فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ برق آشیانوی صاحب اردو ادب کے مزاح نگاروں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہندو پاک کے تمام ادبی رسائل میں انھیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ برق صاحب کی تخلیقات نہایت دل کش اور زبان و بیان کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ انھیں اردو زبان خصوصاً شاعری پر کافی عبور تھا طنز و مزاح میں معیاری تخلیقات بہت کم شعراء کے پاس ملتی ہیں۔ لیکن برق آشیانوی کی مزاحیہ شاعری اور مضامین طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ نظم و نثر کا اعلیٰ نمونہ بھی ہیں۔

سید موسیٰ سلیم مدظلہٗ کو بڑے ہی معصوم نظر آتے تھے مگر موقع پاتے ہی برق آشیانوی کے روپ میں قارئین کے احساسات پر اپنے طنز و مزاح کی چاشنی سے غائبانہ قبضہ جما لیتے تھے اور سماج کی برائیوں کو اپنے مشاہدات و محسوسات کی روشنی میں انتہائی موثر انداز میں واضح کرتے تھے برق صاحب انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے حامل اور انسانی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے معمولی معمولی واقعات پر ان کی گہری نظر تھی اور ان کے مشاہدات اور محسوسات کا دائرہ نہایت وسیع تھا جو ان کے رفعت تخیل اور فکر بلند کا مظہر ہے۔ برق صاحب کی نثر اور نظم میں برجستگی معنی کا اعتبار سے بڑی گہرائی اور تخیل کی بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ برق صاحب چودہ کتابوں کے مصنف ہیں جو سنجیدہ، مزاحیہ اور مذہبی کتب پر مشتمل ہیں اور ان کا سنجیدہ مجموعۂ کلام "ورق ورق" جلد بندی کے مرحلے میں تھا کہ وہ اس عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔

برق آشیانوی کا شمار اردو ادب کے نامور مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ نثری تخلیقات کے ساتھ ساتھ منظومات بھی تمام معیاری رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے مضمون "ناس" میں اس طرح رقمطراز ہیں:
"یہ بڑے قادر الناس واقع ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ نہ کبھی چھینکتے نظر آتے ہیں نہ کھانستے ان کو دیکھ کر ہمیں اپنی مغلوب الناسی پر کوفت ہوتی بلکہ رونا آتا ہے کہ ادھر ناس لی اور ادھر چھینکنا شروع کیا اور جیب سے کپڑے کا چیتھڑا نکال لیتے ہیں جو اپنی پوری کثافت الناسی کے ساتھ صاف ستھرے جیب میں جا بیٹھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ابھی تک تلمیذ الناس ہیں۔ استاد الناس نہیں بن سکے۔ آخر میں ہم عوام الناس سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔"

برق صاحب واقعہ نگاری یا قصہ گوئی سے طنز و مزاح تخلیق نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی برجستگی، شیرینی، سلاست اور بندش کی دلکشی کے سہارے طنز و مزاح پیدا کرتے ہیں جو نہایت مشکل فن ہے۔

اردو ادب میں کرشن چندر کے "گدھے کی سرگزشت" کو جو مقام حاصل ہے اس سے قطعی انکار نہیں ادب دوستوں نے کرشن چندر کے گدھے کو ملاحظہ فرمایا اور اب برق آشیانوی صاحب کے گدھے کو ان کی نظم "دھوبی کی درخواست اقتدار کے نام" میں ملاحظہ فرمائیں جو اس ترقی یافتہ جمہوری دور کے سماجی کارکنوں، اقتدار کے بھوکے لیڈروں خود ساختہ فنکاروں، جھوٹی شہرت کے پجاریوں اور حکومت وقت کے ذمہ داروں پر بھرپور طنز ہے۔

دھوبی نے اقتدار میں درخواست دی ہے آج میرا گدھا جو مر گیا تھا عام ساج۔ محنت میں بے مثال مشقت میں فرد تھا۔ سینے میں اس کے سارے زمانہ کا درد تھا۔ شانوں پہ اس کے خلق کی خدمت کا بوجھ تھا۔ سر پر برادری کی قیادت کا بوجھ تھا اوڑھے ہوئے جنوں پہ خرد کا لبادہ تھا۔ اہل چندہ داروں کی مانند سادہ تھا خوش گو تھا خوش مزاج تھا اور

باتمیز تھا۔ قانون ورکروں میں وہ ہردلعزیز تھا۔ شعر و سخن میں مشق و ریاضت بھی کرتا تھا۔ اکثر مشاعروں کی صدارت بھی کرتا تھا۔ المختصر گدھا تھا اک مرد نیک تھا۔ اس سے زیادہ کیا کہوں لاکھوں میں ایک تھا۔ طنز و مزاح کے علاوہ برق آشیانوی صاحب سنجیدہ نظم و نثر پر بھی کافی عبور رکھتے تھے۔ ان کے سنجیدہ شعری مجموعۂ "ورق ورق" سے اقتباس پیش قارئین ہے :-

آج پھر خوں میں نہایا ہوا سورج نکلا ! قتل دیوانے اُفق پار ہوئے ہیں شاید
جو سفینے کو بچالائے تھے طوفانوں سے ووش ساحل پہ وہی بار ہوئے ہیں شاید
وقت کی دھوپ میں جھلسے ہیں جو ایام حیات سرو آہوں کے طلبگار ہوئے ہیں شاید
قہقہے بانٹتے پھرتے تھے جو کل شہروں میں اک تبسم کے خریدار ہوئے ہیں شاید

برق آشیانوی صاحب کی زبان و بیان کے چند نمونے آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ ان کے انداز بیان کے تعلق سے جناب بھارت چند کھنہ صاحب کے لکھے ہوئے پیش لفظ سے اقتباس برق صاحب کے مجموعۂ "یہ یک تبسم" سے پیش خدمت ہے :-

عبارت سلیس جگہ جگہ برجستہ محاورے فقروں میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے الفاظ کی بندش دلکش جس مصنف کو اس قدر زبان پر عبور حاصل ہے۔ اس لیے ایسے حضرات کو جو کسی کتاب کے پڑھنے سے پہلے دوربین لے کر اپنا شیطانی شوق پورا کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ لکھنے والے کی غلطیاں نکال کر ہی چھوڑیں گے۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ براہ کرم زحمت نہ فرمائیں ورنہ الیکشن میں ہارے ہوئے امیدوار کی طرح صرف رونا ہی پڑے گا۔

حضرت برق آشیانوی صاحب ۱۸ راپریل ۱۹۱۸ء کو سکندرآباد میں پیدا ہوئے چونکہ شعر و ہدایت خاندانی وصف تھا اور وضعداری اس خاندان کو ورثہ میں ملی تھی۔ اس لیے برق صاحب بھی خاندانی روایات کی جیتی جاگتی تصویر تھے جو موجودہ بحرانی دور میں موصوف کی وضعداری استقلال و کردار کا جامع ثبوت ہے۔ حضرت برق نہایت ہی صلح پسند فطرت کے حامل تھے مصلحت کوشی ابن الوقتی اور خوشامد پسندی سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس لیے ایک عرصہ دراز تک غیر معروف رہے۔ وہ اپنے انتقال ۱۴ راگست ۱۹۸۶ء تک بھی صحت مند رہے اور لمحۂ آخر تک دین کی خدمت انجام دیتے رہے اس لیے کہ وہ آخری ایام میں ترک دنیا کر کے دین احمد کی خدمت میں اپنے اوقات بسر کر رہے تھے۔ موصوف نے اپنی ستر سالہ زندگی میں اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے حضرت برق کے کئی شعری و نثری مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر مقبولیت عام حاصل کر چکے ہیں اور انھیں ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں کافی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جن میں ۱۔ جھوٹ کرنا تھا (ناول) ۲۔ یہ یک تبسم ۳۔ گلدارشت (مزاحیہ شعری مجموعہ) ۴۔ ہنستے ہنستے ۵۔ پتے کی بات ۶۔ ورق ورق قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ غیر مطبوعہ تخلیقات کا کافی ذخیرہ موجود ہے جن کی طباعت سے باذوق قارئین کو ستھرا اور تعمیری ادب پڑھنے کا موقع مل سکے گا۔

رشید عبدالسمیع جلیل

برقِ آشیانوی

موسیٰ کلیم، برق نوا، آشیانوی
وہ برق جس نے کچھ بھی جلایا نہیں کبھی
وہ برق جو چمن میں شگوفے بکھیر دے
اہلِ چمن کو جس نے رُلایا نہیں کبھی
وہ برق جس کے پاس تھی ریشم کی آب و تاب
ہر لمحہ جس کی ذات تھی اک سیلِ ماہتاب
وہ برق جو کہ رونقِ طنز و مزاح تھی
منظور جس کو صرف سماجی فلاح تھی
معصوم اس قدر کہ فرشتے دعا کریں
بندے کا حق بھی اپنی طرف سے ادا کریں
شام و سحر "بہ ایک تبسم" کی تھی لکیر
شوخی مزاج میں تھی طبیعت نہ تھی شریر
لکھا جوابِ شکوۂ اُردو بجا درست
مانے گا جس کو حلقۂ اُردو بجا درست
"ارشاد" اپنی بات "مکرر" کیا سدا
بزمِ سخن کو جس نے منور کیا سدا

وہ برق آشیاں سے جُدا ہو گئی ہے آج
دشتِ ادب میں ایک صدا ہو گئی ہے آج

اقبال ہاشمی

آہ برق

طنز کی روح گئی، شستہ ظرافت بھی گئی
حضرتِ برق گئے، اگلی شرافت بھی گئی
آشیاں اپنی جگہ اور پرندہ غائب
کیا کہیں چھوڑا ہے اس نے کوئی اپنا نائب
اڈے بچوں پہ کہیں اپنی شبیہ چھوڑی ؟
کیا کسی پاؤں میں باندھی ہے ادب کی ڈوری؟
جس کھنے پیڑ پہ ہوتی تھیں "پتے کی باتیں"
سونی سونی سی نظر آتی ہیں اسکی شاخیں
وہ جو ارشاد پہ کرتا تھا "مکرر ارشاد"
کردیا اس نے کسی اور جہاں کو آباد
اب تو سنجیدہ ظرافت کے پڑے ہیں لالے
کسطرح پھوڑے کوئی دل کے پھپھولے چھالے
اب تو ماحول میں سردی بھی ہے تاریکی بھی
بھولنے کو ہیں سبھی طنز کی باریکی بھی
برق جو تو نے اٹھالی ہے گرا دے مولا
ہر نشیمن میں نئی آگ لگا دے مولا

ہاشمی طور کو پھر سے کوئی روشن کردے
طنز کے حسن سے دامن مرا کوئی بھر دے

سید جعفر رشید
(فرزند دوم جناب برق آشیانوی مرحوم)

برق آشیانوی

گھریلو زندگی کی چند جھلکیاں

والد مرحوم حضرت الحاج سید موسیٰ کلیم ید اللہیؔ "برق آشیانوی" کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا کام ان کے ہمعصر ادیب و شاعر اور اہلِ قلم حضرات بحسن و خوبی انجام دیتے رہیں گے۔ اس لیے کہ حضرت مرحوم کی ادبی کاوشوں کو شاعرانہ صلاحیتوں اور ہمہ گیریت سے وہی بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ راقم الحروف مرحوم کا زیر عاطفت فرزند ہونے کے ناطے آپ کی گھریلو زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے جو شاید اہلِ قلم حضرات کے احاطۂ قلم میں نہ آسکتا ہو۔

والد صاحب ۸ار اپریل ۱۹۱۸ء کو سکندرآباد میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک ایک مشن اسکول میں تعلیم پائی اور اسلامیہ ہائی اسکول میں انگریزی میڈیم سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد ٹیچرس ٹریننگ کا کورس مکمل کیا اور کچھ عرصہ پیشۂ تدریس بھی اپنایا۔ اس کے بعد محکمہ محابس میں ملازمت اختیار کی۔ پیشۂ تدریس میں تجربہ کی بناء پر ۱۹۶۴ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہو کر اسکول قائم کیا جو اب مارٹی نٹ ہائی اسکول کے نام سے کامیابی کے ۲۲ سال تکمیل کر رہا ہے۔

میرے دادا حضرت سید امیر الدین ید اللہیؔ بھی اپنے وقت کے عالم تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ والد صاحب اور ان کے دونوں بڑے بھائیوں نے اپنے والد سے ہی اردو کے ساتھ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ یہ ایک اتفاق کی بات ہے کہ والد صاحب کے دونوں بڑے بھائی بھی شاعر تھے۔ بڑے بھائی سید شہاب اللہ ید اللہیؔ، ثاقبؔ تخلص فرماتے تھے اور منجھلے بھائی سید عبداللہ ید اللہیؔ' یداللہ' کے تخلص سے جانے جاتے تھے لیکن پاکستان چلے جانے سے یہاں متعارف نہیں ہوئے۔

حضرت والد ماجد نے ۱۹۳۶ء سے شاعری شروع کی۔ جلسۂ میلاد النبیؐ کے توسط سے منظر عام پر آئے اس کے بعد ادبی محفلوں میں شرکت کی اور اس وقت کے مشہور و معروف اخبارات و رسائل میں ان کی منظومات اور مضامین شائع ہونے لگے۔ ملازمت کے دوران کا کچھ عرصہ جمود کا گزرا محکمہ محابس کی ملازمت میں بھی انہوں نے منفرد مقام حاصل کیا ان کی قابلیت اور ثقاہت کا محکمہ میں شہرہ تھا۔

ابتداء ہی سے انھیں اپنے آپ کو نمایاں اور منفرد ظاہر کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیک وقت وہ اردو کے

مزاحیہ، سنجیدہ اور مذہبی شاعر، سنجیدہ و مزاحیہ نثر نگار، ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ناول نگار بھی تھے۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی ان کی نظموں کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔

حضرت والدِ مرحوم و مغفور ایک کنبہ پرور انسان بھی تھے۔ یہ ان کی شخصیت کی خوبی تھی کہ ان کے انتقال پُر ملال پر ان کے بڑے بھائیوں کے فرزندوں (یعنی میرے تایہ زاد بھائیوں) نے جو پاکستان اور عرب ممالک میں قیام پذیر ہیں، لکھا ہے کہ "خود ان کے والدِ ماجد کے انتقال کے بعد بھی وہ یہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ وہ ابھی یتیم ہوئے ہیں۔ لیکن اپنے چچا جان، حضرت سید موسیٰ کلیم کی وفات پر وہ اب اپنے آپ کو واقعی یتیم محسوس کر رہے ہیں"

ہم پسماندگانِ مرحوم میں پانچ بہنیں اور تین بھائی شامل ہیں۔ پانچوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ بڑے بھائی دُبئی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر پچھلے گیارہ سال سے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ منجھلا میں ہوں جو مذکورہ مدرسہ اسکول کی ذمہ داری سنبھال رہا ہوں۔ چھوٹے بھائی (B.E) کے سالِ دوم میں میرٹ میں کامیابی حاصل کر کے تیسرے سال میں عثمانیہ یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے قیام کے ساتھ ہی والد صاحب اس کے رکن بن گئے اور ۱۹۷۱ء میں آپ بلامقابلہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے نائب معتمد چُنے گئے۔ حیدرآباد کے سالانہ مشاعروں کے علاوہ ورنگل، ظہیر آباد، بیدر، لکھنؤ، دہلی، بھوپال اور جونپور کے مشاعروں میں آپ نے شرکت فرمائی اور اپنا لوہا منوالیا۔ ۱۹۷۲ء کے زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ مشاعرہ میں کنوینر کے فرائض اس منفرد انداز میں انجام دیئے کہ تمام چوبیس شعراء کا منظوم تعارف کر دیا۔

چال ڈھال، رہن سہن، خلوص، خوش کلامی اور حُسنِ سلوک سے آپ ہر چھوٹے بڑے اور اہلِ علم کا دل جیت لیتے تھے۔ اس ضمن میں فکر تونسوی فرماتے ہیں کہ "میں برق صاحب کو ایک معیاری شاعر اور مزاح نگار سمجھتا تھا لیکن شخصی طور پر ملکر مجھے یہ لگا کہ موصوف کا شمار معیاری شرفاء میں بھی ہوتا ہے۔ پدم شری جناب سلام مچھلی شہری مرحوم آپ کو ریسپکٹڈ (RESPECTED) برق آشیانوی سے مخاطب کرتے تھے۔ اور حضرت نسیم انہونوی آپ کو اپنے سگے بھائی کی طرح مانتے ہیں۔

ہمارا تعلق مہدویہ فرقہ سے ہے اور سلسلہ ارشادی ہے۔ والدِ مرحوم نے مئی ۱۹۷۵ء میں ترکِ دنیا کا فرض پورا کیا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ عقیدۂ مہدویہ میں ترکِ دنیا سے مراد دنیاوی زندگی کو علائقِ دنیا سے پاک رکھتے ہوئے اپنے دل سے ماسوا اللہ جلال اللہ کے' ہر چیز کی الفت کو ترک کر دینا ہے۔ لہٰذا اس مسلک کو اپنانے کے بعد تعلیم و تدریسِ دینی اور عبادت و عشقِ ربّ العالمین آپ کا آخری مشغلہ ٹھہرا۔ اور اسی پر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ گیارہ سالہ ترکِ دنیا کی زندگی میں آپ نے چند مذہبی کتابیں تحریر فرمائیں جن میں قابلِ ذکر "برقِ تکلم" (حمد، نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ) اور درس تعلیم دینی کی چار کتابیں شامل ہیں۔ اس دوران آپ نے کئی مقامات کے تبلیغی دورے بھی کئے اور بندگانِ کریم کو عشقِ خدا کی دعوت دی۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ دوسری مرتبہ جب والدہ محترمہ کے ساتھ فریضۂ حج پر تھے تب منیٰ میں آگ لگ گئی تھی اور ان کے ڈیرے بھی جل کر خاکستر ہو گئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رحم و کرم سے انہیں معجزاتی طور پر بچالیا۔ چونکہ مرحوم نے اس حادثہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے آپ نے بعنوان "منیٰ میں آگ" سارے حادثہ کو مضمون کی شکل دیکر اخبار "سیاست" کو ارسال کیا جسے محبوب حسین جگر صاحب نے شائع کیا۔

آپ کی موجودگی سے گھر میں ہمیشہ علمی ماحول رہتا تھا اور گھر کی فضا ادبی و مذہبی گفتگو و مذاکرات سے معطر رہتی تھی

جس کی آج ہم شدت سے کمی محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن ایک نیک اور بزرگ سرپرست کی حیثیت سے ایک متبرک فریضہ جو ایک نیک صفت انسان کا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اولاد و لواحقین کو دین متین کے اسرار و رموز سے واقف کراتا ہے مجھے یہ کہنے میں قطعی تامل نہیں کہ حضرت والد مرحوم نے اس فریضۂ دینی کو کمال خوبی سے انجام دیا۔ اور ہمارے لیے عشق الٰہی اور اُلفتِ خاتمین کا ایک ایسا ماحول عطا فرمایا جو کسی بھی صالح انسان کا متاع دین و دنیا ہو سکتا ہے۔

▭ ▭

ممتاز مزاح نگار برق آشیانوی کے انتقال پر ملال پر حسب ذیل اداروں نے تعزیتی قرارداروں کے ذریعہ ان کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ ان مذہبی، ادبی و ثقافتی اداروں کے علاوہ کئی حضرات نے انفرادی طور پر پسماندگان کو پرسہ دیا۔ مرحوم کے فرزندان سید عبدالقادر، سید جعفر رشید، اور سید محمود متین نے پرسہ دینے والوں کے خلوص و محبت کے لیے اظہار ممنونیت کیا ہے۔

انجمن ترقی اردو، حیدرآباد
زندہ دلانِ حیدرآباد
فائن آرٹس اکیڈمی حیدرآباد
ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد
بزم کہکشاں، حیدرآباد
نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
سینئر سٹیزنس لیگ آف انڈیا، حیدرآباد
بزم ادب، جدہ، سعودی عرب
ہفتہ روزہ شہپر (SHAHPAR)، جونپور
ٹرسٹی بورڈ، مہدویہ کلب، مشیرآباد حیدرآباد
مرکزی انجمن مہدویہ، حیدرآباد
انجمن مہدویہ گھٹ کیسر، اے پی
انجمن مہدویہ، گوکاک، کرناٹک
انجمن مہدویہ چن پٹن، کرناٹک
روزنامہ "سیاست" حیدرآباد
روزنامہ "منصف" حیدرآباد

بھارت چند کھنہ

"پیش لفظ"

جب پہلی مرتبہ برق آشیانوی صاحب کا نام میں نے سنا تو میں نے ان کو حیدرآباد کے ہوٹل آشیانہ کے برقی سسٹم کا کوئی ایسا تجربہ کار عہدہ دار سمجھا تھا، جن کو یہ خطاب ہوٹل والوں نے ان کی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر عطا کردیا ہو۔ بعد میں جب یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تو اس سے ایک اور شعری احساس حاصل ہوا کہ میرے بہتر بولنے والے "بٹرہاف" (BETTER HALF) کا یہ نظریہ بالکل ٹھیک ہے کہ خاکسار سمجھ بوجھ کے اعتبار سے اس دھرتی پر ایک بوجھ ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کرنے کے باوجود بھی جب برق آشیانوی صاحب ہاتھ دھوئے بغیر میرے پیچھے اس طرح پڑ گئے جس طرح ان کے پیچھے بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کا ڈاکٹر ان کا طبی معائنہ کرنے کے لیے پڑ گیا تھا کہ میں ہی ان کی کتاب کا پیش لفظ لکھوں تو اس کام کو بلائے ناگہانی سمجھ کر انجام دینے کی کوشش کررہا ہوں اور اس کا انجام جو مصنف کو بھگتنا پڑے گا اس کے لیے بالکلیہ وہ خود ذمہ دار ہوں گے!

اگر اس ردی پیش لفظ کے پڑھنے کے بعد بھی ردِعمل کے طور پر آپ اس کتاب کو نہ پڑھنے کا ارادہ نہ کریں تو پھر شاید ضرور پڑھیں گے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا حلیہ پہلے بیان کردیا جائے تاکہ لکھنے والے کے خیالات کے ساتھ ساتھ ان کی تصویر بھی پیش نظر رہے۔

موصوف ایک نہایت مختصر مفید قسم کے انسان ہیں۔ بسوں کی کھڑکیوں میں سے بس کے اندر داخل ہوجانے کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اگر اسی مناسبت سے جسم بھی دبلا ہوتا تو دوسروں کے گھروں میں روشندانوں کے ذریعہ داخل ہونے کی بھی سہولت رہتی، اور چہرہ کو چھپا کر موصوف ریل گاڑی میں ہاف ٹکٹ سے ہی سفر کرسکتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکا اور ریل والے موصوف کے ہاتھوں دھوکہ کھانے سے بال بال بچ گئے۔ پھر بھی موصوف کو اپنے پہننے کے کپڑے خریدنے کے معاملے میں کافی بچت ہوتی ہوگی۔ اس بارے میں اس کتاب کے مصنف مجھ سے وعدہ لے چکے ہیں کہ میں اس نقطہ کی تشہیر نہ کروں کیونکہ ان کو ڈر ہے کہ اس بات کو سمجھ کر کہیں ٹیکس لگانے والے ان کے سائز کی برادری پر زائد ٹیکس عائد کرنے کا ارادہ نہ کر بیٹھیں۔ بہرحال شکل وصورت نہایت شریفانہ۔ چہرہ پر فرنچ کٹ داڑھی

مزاج میں بیحد انکساری۔ آواز نہایت دھیمی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لیڈری کے دائرہ سے باہر اور گھر سے باہر نکل کر نعرے لگانے اور احتجاج کرنے والوں کے لیے بالکل بیکار ہیں۔ اکثر شیروانی اور ڈھیلا پاجامہ زیب تن رہتا ہے اور وہ اس میں تنے رہتے ہیں۔ نہ معلوم لکھتے وقت کون سا پوز اختیار کرتے ہیں۔ گر موصوف بھی بعض لکھنے والوں کی طرح اگر اوندھے لیٹ کر اور پیٹ کے نیچے تکیہ رکھ کر لکھنے کے عادی ہوں تو دور سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک تکیے کے اوپر آڑا رکھا ہوا ایک گاؤ تکیہ ہے!

نام سید موسیٰ والدین کی دین ہے جسے وہ بموجب گزارش احوال واقعی سنجیدہ تخلیقات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب سنجیدہ ہوتے ہیں تو کلیم تخلص کرتے ہیں ورنہ اکثر و بیشتر جب سنجیدگی کے موڈ میں نہیں ہوتے تو برق آشیانوی بن جاتے ہیں اس لیے اس کتاب میں جو برق آشیانوی کے ٹریڈ مارک اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے لیبل کے تحت شائع ہو رہی ہے آپ کو طنز و مزاح کے بے حساب خزانے دستیاب ہوں گے۔

" یہ ایک تبسم" سترہ مزاحیہ مضامین پر مشتمل ایک ہلکی پھلکی کتاب ہے جس کو پڑھتے وقت نہ تو لغات اور نہ ہی بڑے صاحبزادے سے الفاظ کے معنی دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ موضوع ایسے ہیں جن سے ہر شخص کو روزمرہ کی زندگی میں سابقہ پڑتا رہتا ہے اور مصنف کے نظریے ان مسائل کے متعلق ایسے ہیں کہ معشوق کی نگاہ کی طرح دل سے جگر تک اتر جاتے ہیں۔ دل میں گدگدی سی ہوتی ہے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے بے اختیار ہو کر ہنسنے کو جی چاہتا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ طنز کا ایسا بھرپور وار ہوتا ہے کہ پڑھنے والا چونک اٹھتا ہے اور سماج کے عیب، بہت سی چیزوں کی برائیاں اور ان کا کھوکھلا پن اجاگر ہونے لگتا ہے۔ مثلاً پابندیِ وقت سے بے نیازی کے متعلق لکھتے ہیں کہ پانچ بجے کے وقت پر بلائے گئے مہمانوں کے "ساڑھے پانچ بجے سے جو پانچ بجنا شروع ہوئے تو چھ بجے تک پانچ بجتے رہے۔"

اس کتاب کے ہر مضمون میں مصنف نے ایسی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے کہ پڑھنے والا اس پیغام کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو لکھنے والا قاری تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس سے اگر قاری عبرت حاصل نہیں کرتا تو یہ ملک کی بدقسمتی ہے۔ " ایک گھر کا جغرافیہ" ایک عام گھر کی تصویر پیش کرتا ہے۔ برسات کے موسم میں اس کے در و دیوار پر سبزہ اگتا ہے اور گھر کی کھیتی سرسبز و شاداب رہتی ہے۔ گھر والوں کی آنکھیں نم۔ کپڑے و بستر تر اور رونگٹے کھڑے رہتے ہیں۔ مالکِ مکان سے مرمت کرانے کے لیے اس لیے زبان نہیں کھول سکتے کہ وہ کرایہ دار کی مرمت کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتا ہے۔ گھر میں میاں بیوی، ایک اور میاں بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ جو پہلے میاں کے ماں باپ ہیں۔ پہلے میاں کے نو عدد بچے ہیں جن کی ماں ابھی تک دلہن کہلاتی ہے گو دلہن کی پسلی کی ہڈیاں شوہر کو غلط نمبر کی سستی عینک میں سے بھی بخوبی نظر آجاتی ہیں، پھر بھی اس کا شوہر سے پیار اور دلہن ہونے کا وقار ابھی تک قائم ہے جس کے ثبوت میں ہر سال نئے بچے کو جنم دیتی ہے۔ شوہر زندہ درگور ہے مگر ابھی مرا نہیں! —— ہمارے سماج کی یہ کوئی انوکھی تصویر نہیں مگر پھر بھی لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے کہ کنبہ بڑھانا نہ صرف اپنے لیے بلکہ خود کنبہ اور ملک کی فلاح اور بہبود کے لیے سمِ قاتل ہے۔

اگر آپ کو زبان کا چٹخارہ چاہیے تو اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ وکالت کی ڈگری لے کر وکالت کی۔ جب نہیں چلی تو حجامت کرتے چلا۔ بیوی نے اعتراض کیا تو اطاعت کی۔ چنانچہ اب پیشہ اطاعت گزاری

کر رہے ہیں۔ پھر جب طبی معائنہ کرنے کے لیے بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر بکر ڈکر سے گیا اور کہنے لگا کہ کپڑے اتاریئے تو جواب دیا کہ "یہ کپڑے تو میرے ہیں" دل دیکھنے لگا تو کہا "یہ تو ہے ہی نہیں۔ اسے کھو بیٹھے اور اس سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں"۔

اگرچہ زندگی کی مجبوریوں کی وجہ سے غلط نمبر کی سستی عینک لگانے کے باعث آنکھوں کی بینائی آ ئی گئی ہو گئی لیکن اس کے باوجود مصنف کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے۔ بس اسٹینڈ پر ان کو تیکھے لفظ آتے ہیں جنھوں نے چست لباس غلافوں کی طرح جسم پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ یہ طالبہ ہیں۔ پاس ہی چوڑی دار پتلون اور چونچدار جوتے پہنے طلبا کھڑے ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون طالبہ ہے اور کون طالب ہے ان میں البتہ ایک عدد طالب علم ایسا بھی ہے جو تیکھیوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ بڑا بد ذوق اور نرا گنوار معلوم ہوتا ہے۔ نہ صرف نہیں دیکھتا بلکہ مخصوص قسم کی آوازیں بھی نہیں نکالتا ـــــ یعنی حسن کی نمائش کی توہین کرتا ہے! بس میں جب بس کنڈاکٹر پاس مانگتا ہے تو تکمیہ کہتا ہے کہ پاس تو اس وقت اس کے پاس نہیں ـــــ اور پھر ایک اور جگہ مصنف فرماتے ہیں کہ بس اسٹاپ پر بس میں چڑھنے کے راستہ سے لوگ اتر رہے تھے کیونکہ بعض ایسی فضول باتوں کی ہمارے دیس میں اہمیت نہیں!!

اور پھر اگر آپ ہنسنا چاہتے ہیں تو رونے کے یہ اقسام ملاحظہ فرمایئے:- بچے فی البدیہہ روتے ہیں۔ یہ بچپن کا رونا ہے اس کے بعد جوانی کا رونا۔ بیوی کا میکے جانے کے لیے رونا اور شاعری مستقل رونا ہے۔

"چمپو جیم" اپنے عنوان کی طرح اچھوتا مضمون ہے۔ غذائی قلت پر جس مقام پر ایک سمپوزیم منعقد ہے وہاں کا چوکیدار اس کو "چمپو جیم" کہتا ہے۔ ایک بہت بڑا آدمی جو کسی زمانے میں چوکیدار کا ساتھی تھا، اس کی صدارت کرتا ہے۔ یہ بہت بڑا آدمی بڑے ہونے سے پہلے ایک جھونپڑی میں رہتا ہے البتہ جھونپڑی کے اردگرد بڑی زمین پر قبضہ کر کے اس میں خوشنما چمن کشادہ صحن اور برقی و پانی کا انتظام اس نے کر لیا ہے۔ بچے کان وینٹ میں پڑھتے ہیں۔ بڑا لڑکا تعلیم کے لیے امریکہ میں ہے مگر بڑے آدمی کو یورپی معاشرت سے بڑی نفرت ہے اور انگریزی زبان کا سخت مخالف ہے۔ در حقیقت وہ ہر زبان کا مخالف ہے سوائے اس زبان کے جو اس نے ماں کی گود میں سیکھی تھی۔

غذائی قلت پر سمپوزیم شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے جملہ حاضرین کو غذا تقسیم کی جاتی ہے۔ اور پھر جب نائب صدر صاحب سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لیے درخواست کی جاتی ہے تو موصوف افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں کیا خاک روشنی ڈال سکتا ہوں جبکہ اپنے ساتھ ٹارچ لانا ہی بھول گیا۔ غرض مسئلہ اندھیرے میں رہتا ہے اور یہ محفل ایک ٹھوس کام یعنی تقسیم کی گئی غذا کو پیٹ میں اتارنے کے بعد نشستند و گفتند و برخاستند ثابت ہوتی ہے۔ البتہ یہ بات جدا ہے کہ اخباروں میں چمپو جیم میں کی گئی جو تقاریر شائع ہوتی ہیں وہ بڑی مدلل اور بصیرت افروز ہوتی ہیں!

اس کتاب میں شامل کئے ہوئے مضامین جن کو علمی حلقوں میں طنزیے اور ریڈیو والوں کی زبان میں خاکے کہتے ہیں ان کے کچھ اقتباسات بطور مشتے از خروارے آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ مصنف کے مشاہدات کس قدر گہرے ان کا مزاح کیا شگفتہ اور ان کے طنز کے نشتر کس قدر تیکھے ہیں۔ ان سے آپ اور مصنف صاحب اس بات کا بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ میں نے پیش لفظ لکھتے وقت محض قیاس کے گھوڑے نہیں دوڑائے بلکہ مضامین کو پڑھا بھی ہے۔ اس سے ایک اور حقیقت جو واضح ہو جاتی ہے یہ ہے کہ پیش لفظ لکھنے والا کوئی "بڑا آدمی" نہیں۔

زیرِ نظر مضامین کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان ٹکسالی ہے۔ عبارت سلیس جگہ جگہ برجستہ محاورے فقروں میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ الفاظ کی بندشیں دلکش ہیں۔ مصنف کو اس ظالم زبان پر عبور حاصل ہے اس لیے ایسے حضرات کو جو کسی کتاب کو پڑھنے سے پہلے دوربین لے کر اپنے اس شیطانی شوق کو پورا کرنے کی غرض سے بیٹھ جاتے ہیں کہ لکھنے والے کی غلطیاں نکال کر ہی چھوڑیں گے، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ براہ کرم زحمت نہ فرمائیں ورنہ الیکشن میں ہارے ہوئے امیدوار کی طرح رونا پڑے گا۔ البتہ اگر اپنے شوق کو پورا ہی کرنا ہے تو پھر خدا کا نام لیکر اس پیش لفظ کو تختۂ مشق بنالیں۔ اس میں ان کو زبان اور محاورے کی غلطیاں اس آسانی سے مل جائیں گی جس طرح مطلوبہ دام دینے پر ووٹ یا کالی منڈی میں نایاب اشیاء۔ قابل مصنف کی تحریروں میں املا کی غلطیوں کی بھی ہرگز ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی غلطیاں کتاب میں نظر آئیں تو اس کے لیے مصنف کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا تھا بلکہ قصور وار وہ حضرات ہو سکتے ہیں جن کا ذکر دلاور فگار بڑی خوبی سے اس طرح کرتے ہیں۔

کاتبو! ہاں یوں ہی اصلاح کرو شعروں پر
یہ خطا وہ ہے کہ جس کی کوئی تعزیر نہیں
جانے کس کس کے گنہ ہم کو بھگتنے ہوتے
خیریت ہوگئی تم کاتبِ تقدیر نہیں!

لیجئے خدا خدا کر کے پیش لفظ ختم ہوا (اور میرے سر پڑی بلا جس کو میں نے آپ کے سر تھوپ دیا ہے بالآخر اپنے کفرِ کردار کو جا پہنچی ہے) ورق الٹیے اور برق آشیانوی صاحب کی داستانِ حیات اور ان کی اچھوتی تخلیقات سے لطف اندوز ہونے کے لیے تیار ہو جائیے۔ مصنف کے اپنے الفاظ میں، جب ڈاکٹر نے طبی معائنہ کے دوران ان کو زبان دکھانے کے لیے کہا تو موصوف نے جواب دیا کہ اگر زبان دیکھنا ہے تو میرے مضامین پڑھیئے۔ مجھے ان کے مشورے سے پورا پورا اتفاق ہے!

۵۵

(جناب برق آشیانوی کی کتاب "یہ ایک تبسم" میں شامل)

برق آشیانوی

(سرگذشت)

خودستائی

خودستائی جو کسی کو جز خدا پھبتی نہیں
آکے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوشنما

میرا "بڑا نام" سید موسیٰ تخلص کلیم خاندان یداللہی ہے۔ اور "چھوٹا نام" برق آشیانوی۔ بڑا نام سنجیدہ تخلیقات میں استعمال کرتا ہوں اور چھوٹا نام مزاحیہ تخلیقات میں۔

سُنا ہے کہ ۸ اپریل ۱۹۱۸ء کو سکندرآباد میں پیدا ہوا۔ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن میں نے اس لیے یقین کر لیا کہ یہ بات میں نے اپنے والدین سے سنی تھی۔ والدین کوئی بات غلط نہیں کہتے (یہ اور بات ہے کہ آج کل کے والدین مدارس میں اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش غلط لکھواتے ہیں۔ اگر کبھی غلطی سے صحیح لکھوادیتے ہیں تو آگے چل کر اپنی غلطی کی اصلاح کر لیتے ہیں) والدین کی کسی بات کو غلط نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اسی کا نام سعادتمندی ہے۔ میں نے والدین کی بات کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ میں سعادت مند ہوں۔ گیارہ سال کی عمر میں سکندرآباد چھوٹا تو مشیرآباد میں آکر آباد ہو گیا۔ اُس زمانے میں مشیرآباد کی آبادی بہت کم تھی پھر جب یہاں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تو میں نے بھی فراخدلی کے ساتھ اپنا حصہ ادا کیا۔

اُن دنوں مدارس میں شرکت کے لیے عمر کا معیار مختلف تھا۔ والدین اپنے بچوں کو سات آٹھ سال کی عمر سے پہلے اسکول بھیجنے کے بارے میں سوچتے تک نہ تھے۔ لیکن میرے ساتھ زمانے نے روزِ اول سے ناانصافی کی ہے۔ چنانچہ پانچ سال کی عمر میں مجھے ایک "انگلش اسکول" میں جھونک دیا گیا۔ حالانکہ مادری زبان اردو تھی۔ اس کے بعد چھ سال خیریت سے گزر گئے اور کوئی خاص واقعہ ظہور میں نہ آیا۔ چھٹی جماعت میں آنے کے بعد میں نے ایک روز مسجد کو چرچ کہدیا تو والد صاحب نے گھبرا کر مجھے اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد میں بند کروا دیا۔ اسکول کے احاطہ میں ایک مسجد تھی۔ جہاں ایک نامور استاد مولوی ابومسعود صاحب ہمیں پابندی سے نماز پڑھوایا کرتے تھے۔ لیکن بعض اخوان الشیاطین اُن کو بھی چکمے دیتے تھے۔

اس اسکول میں بھی تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔ اردو کی صرف ایک درسی کتاب ورناکولر (VERNACULAR) کے نام سے پڑھائی جاتی تھی۔ میرے اسکول کے ماحول کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے

دسویں جماعت میں میرے ایک کرسچین ساتھی نے، جو اس دور میں اردو کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیشِ نظر اردو ورناکیولر اختیار کی تھی گھوڑے پر مضمون اس طرح لکھنا شروع کیا: "گھوڑا کو چار پاؤں ہوتی ہے" اور وہ میٹرک کامیاب ہوگیا تھا۔

گھر کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ والد صاحب فارسی زبان کے مسلمہ استاد تھے۔ لوگ ان سے فارسی پڑھنے آتے تھے۔ وہ زبان کے لب و لہجہ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ "فارسی زبان کو فارسی میں بولنا چاہیئے — اردو میں نہیں" ان کی زیردستی میں نے بھی فارسی پڑھ لی۔ اور فارسی زبان نہایت صاف اور شستہ اردو میں بولنے لگا۔

ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان میں صلاحیتیں اور جبلتیں پیدائش کے وقت سے ہی موجود رہتی ہیں جن کے ظہور اور نشو و نما کا ادوارِ حیات میں ایک ایک خاص وقت مقرر ہوتا ہے۔ مثلاً لڑنے جھگڑنے، مارنے پیٹنے، گالیاں دینے ہڑتالیں کرنے، پتھراؤ کرنے، بسیں جلانے بازار لوٹنے وغیرہ وغیرہ کی صلاحیتیں تو پیدائش کے وقت ہی سے انسان کے لاشعور میں رہتی ہیں لیکن عمر کے مختلف ادوار میں سطحِ شعور پر آتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ شعر و ادب کے جراثیم پیدائش کے وقت سے ہی میرے خون میں موجود تھے۔ لڑکپن ہی سے مطالعہ کی بیماری شروع ہوگئی۔ وسطانی جماعتوں میں فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی وغیرہ کی تخلیقات بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی کو بعد میں پڑھا اور سمجھا۔ فوقانی جماعتوں میں نہ جانے علامہ راشد الخیری کیوں اتنے پسند آگئے کہ ان کی جتنی تصانیف منظرِ عام پر آچکی تھیں پڑھ ڈالیں۔ میں ان کی زبان اور زورِ قلم کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ اُن کی تصانیف غیر محسوس طریقے پر "اردو زبان" کو میرے ذہن و فکر میں گھولتی چلی گئیں اور مجھے یہ احساس دلانے لگیں کہ ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں برقؔ ∴ سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

آپ کہیں گے یہ شعر نواب مرزا خاں داغؔ کا ہے۔ یقین مانئے ایسا نہیں ہے۔ یہ شعر میرا ہے جس کو داغؔ صاحب نے چپکے سے اپنے دیوان میں شامل کرلیا۔ یہ دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا اور کچھ نہ کہہ سکا، کہتا بھی کیسے۔ ابھی میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اب بھی کہہ رہا ہوں تو کون ہے جو میرے اس دعوے کو تسلیم کرے۔ خیر جانے دیجئے شعرا ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے خود میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں داغؔ صاحب نے کیا تو کیا بُرا کیا۔ اسی دور میں ایک اور "بیماری" نمودار ہوئی۔ میں نے لکھنا شروع کردیا۔ شاعری، مضمون نگاری، افسانہ نویسی، ڈرامہ نویسی وغیرہ پر قلم صاف کرنے لگا۔ دسویں جماعت میں یہ بیماری اپنا کچھ اثر دکھانے لگی۔ میری پہلی تخلیق "حسن کار" جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ میٹرک پاس ہوتے ہی عالمگیر ستمبر ۱۹۳۶ء میں ایک اور تخلیق شائع ہوئی۔ پھر ساقی، اور ادب لطیف نے میری تخلیقات کو شائع کرکے اور "چار سو گیارہ میٹر پر نشر گاہِ حیدرآباد" نے میرا ڈرامہ نشر کرکے میرا دماغ خراب کردیا اور میں خود کو ملک کا "ممتاز ادیب" تصور کرنے لگا۔ (شکر ہے آج ایسا نہیں سمجھتا) دسویں جماعت میں ہمارے برہمن استاد مسٹر ہیرالنگم نے انگریزی اس انداز سے پڑھائی کہ نثر نگاری ہی نہیں بلکہ شاعری تک سکھا کر چھوڑ دی۔ میرے فطری ذوق نے اُن کے حسنِ تدریس سے اتنا استفادہ کیا کہ میری اس کتاب کی اشاعت سے بہت پہلے ہی میری انگریزی نظموں کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے جو میں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ غیر مطبوعہ گناہوں کا حساب مت پوچھئے ورنہ داغؔ ہائے دل کا شمار یاد آجائے گا۔

سکندرآباد کے محکمہ تعلیمات میں پیشہ تدریس سے منسلک ہوکر میں نے عثمانیہ ٹریننگ کالج سے ٹریننگ پاس کرلی۔ ٹریننگ میں نفسیات (PSYCHOLOG) پڑھائی گئی۔ یہ مضمون میں نے انتہائی دلچسپی سے پڑھا اس وجہ سے

نہیں کہ اس میں ایک انڈے کے دو انڈے ہو جاتے ہیں جن میں سے ایک تو دسترخوان پر ہوتا ہے اور دوسرا ذہن میں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اس سے ذہن میں ایک نئی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ادیب کے لیے نفسیات کا مطالعہ مفید ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد حیدرآباد سے روزنامہ "میزان" بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا۔ اس کی ادبی اشاعتوں میں میری منظومات اور مزاحیہ مضامین شائع ہوئے۔

ٹیچر کی حیثیت سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شاندار ناکامی کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ میں نے پیشۂ تدریس چھوڑ دیا۔ اور جب جیل ڈپارٹمنٹ میں اکزیکیوٹیو آفیسر ہو گیا تو یکلخت میں نے قلم رکھ دیا۔ اور ایسا سو گیا جیسے طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوا ہوں۔ ایک ضلع میں ایک کہنہ مشق شاعر سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے میرے چند اشعار سن کر مجھ پر زور دیا کہ شعر گوئی کی صلاحیت کو ضائع نہ کروں جب وہ دھمکیاں دینے لگے تو قلم اٹھایا۔ ذرا سی بدپرہیزی سے وہ تمام بیماریاں جن سے صحت ہو چکی تھی عود کر آئیں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے اور مضامین نمودار ہو گئے۔ ان سب میں طنز و مزاح بہت مہلک ثابت ہوا۔ اپنی تخلیقات کو ٹھکانے لگانے کی فکر سوار ہوئی۔ تو میں نے روزنامہ ملاپ کے ادبی اڈیشن کو دینا شروع کیا اس میں بہ کثرت میرے مضامین شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں میرے ایک قدیم دوست ایک ماہ نامے کے ایڈیٹر بن گئے وہ میری تمام ادبی رگوں سے واقف تھے۔ انھوں نے میری دکھتی رگ یعنی مزاح نگاری پر ہاتھ رکھا۔ اور مضامین لکھوانے لگے۔ برسوں کا رکا ہوا سیلاب ٹوٹا تو اتنے مضامین بہہ نکلے کہ آج تک انھیں شائع کروا رہا ہوں اور بعض تقاضوں پر نئے مضامین بھی لکھتا رہتا ہوں۔

" میری تمام ادیبانہ حرکتوں پر زندہ دلانِ حیدرآباد نے کڑی نظر رکھی تھی اور میری تلاش میں تھے۔ ایک روز علاء الدین حبیب صاحب کی مدد سے ان کے ہاتھ لگ گیا پہلے تو ان لوگوں نے مجھے آل انڈیا مشاعروں میں گھسیٹا۔ پھر ماہنامہ "شگوفہ" میں کھینچا۔ اس کے بعد زندہ دلانِ حیدرآباد کا نائب معتمد بنا کر چھوڑا۔" طنز و مزاح میں نثر ہو یا شاعری میں نے اپنے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ نثر میں سب سے پہلے جیتی جاگتی چلتی پھرتی زندگی دوسرے نفسیاتی مطالعہ اور تیسرے عمیق مشاہدے کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ مبالغہ کو حدود میں رکھتا ہوں۔ زیادہ تر مغربی اندازِ فکر پسند ہے جہاں (LIGHTER VEIN) کو ادبِ عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ مارک ٹوین (MARK. TWAIN) اور کے جیروم میرے پسندیدہ مزاح نگار ہیں محفلوں میں مضامین پڑھ کر سرکس کے جوکر کی طرح ہنسانے کی کوشش میری کسی تحریر میں نہیں ہے ویسے بعض اوقات چند حقائق کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ لوگ قہقہہ مار کر ہنس دینے پر مجبور ہو گئے لیکن اکثر تبسم زیرِ لب یا ہلکی سی ہنسی بعد پر بکھر جاتی ہے میرے کئی مزاحیہ مضامین، مزاحیہ نظمیں سنجیدہ افسانے اور سنجیدہ ڈرامے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں۔ بالخصوص ڈرامے ملک کے دوسرے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیے جا چکے ہیں۔

اب تک پانچ کتابیں شائع ہو گئی ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ "یہ ایک تبسم..." مزاحیہ مضامین کا مجموعہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے شائع کیا۔

۲۔ "مکرر ارشاد..." مزاحیہ کلام کا مجموعہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے شائع کیا۔

۳۔ "پتے کی بات..." نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۴۔ "جونہ کرنا تھا۔۔۔" سنجیدہ ناول نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔
۵۔ "ہنستے ہنستے۔۔۔" مزاحیہ مضامین کی۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی اعانت سے اشاعت عمل میں آئی۔

ان کتابوں پر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش سے ایوارڈز بھی دیئے گئے۔ علاوہ ازیں (K.G) کے جی کلاس کے بچوں کے لیے انگریزی نظموں کا ایک مجموعہ (LITTLES' RHYMES) بھی شائع ہوا جو خود مارٹی نٹ اسکول کے علاوہ شہر حیدرآباد کے بعض انگلش میڈیم مدارس میں شریکِ نصاب ہے۔

۱۹۷۰ء میں محکمہ جیل سے ریٹائرڈ ہونے سے قبل ہی میں نے ایک پرائمری انگلش میڈیم مارٹی نٹ اسکول کی بنیاد رکھی جو اب مارٹی نٹ ہائی اسکول (MARTINET HIGH SCHOOL) بن چکا ہے جس کو احقر زادے سید جعفر بی اے۔ بی۔ ایڈ کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ننھیال کے سلسلہ ارشاد سے متعلق دائرہ مہدویہ گھٹ کیسر (شہر حیدرآباد سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر) کی خلافت کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ دو مرتبہ حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۶ء میں تنہا اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۰ء میں اہلیہ کے ساتھ۔

میرے آبا و اجداد کا ارشادی گھرانے سے تعلق تھا جو خاندانِ ید اللہی کہلاتا تھا۔ دادا حضرت کے بعد میرے والد کے بڑے بھائی سجادہ نشین ہوئے تو ارشاد ان کی اولاد میں چلا گیا۔ میرے ننھیال کا تعلق بھی ارشادی گھرانے سے تھا جو میرے نانا کے چچا زاد بھائی کی اولاد میں یہ محمودی خاندان کہلاتا ہے۔ میرے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ اپنے اپنے گھروں میں خوشحال ہیں۔ بڑے لڑکے سید عبد القادر بی کام دبئی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ میں ملازم ہیں۔ انہیں فوٹو گرافی میں بھی بدرجہ کمال مہارت حاصل ہے انھوں نے عالمی سطح پر فوٹو گرافی میں درجہ اول کے انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ دوسرے سید جعفر بی اے۔ بی ایڈ مارٹی نٹ ہائی اسکول مشیرآباد میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ تیسرے سید محمود متین انجینیرنگ کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔

○ برق آشیانوی

عاشقوں کی کانفرنس

ملک میں ہونے لگیں جب کانفرنسیں پے بہ پے
تو کیا اک روز سب عُشّاق نے مل کر یہ طے

کانفرنس عُشّاق کی بھی ایک ہونی چاہیئے
داستاں اک دن ہمیں اپنی بھی رونی چاہیئے

اک بیاباں کا کیا سب عاشقوں نے انتخاب
شہ نشیں اک بن گیا کانٹوں کا مسند لاجواب

ملک کا اک عاشقِ ترانٹ بلوایا گیا
صدر کے مسند پہ اس کو لا کے چپکایا گیا

ہار اس کے واسطے گل ہائے خودرو کا بنا
اور سنگِ آستانِ یار کا تکیہ بنا

طبع میں آوارگی تعلیم میں جاہل تھا وہ
لیکن اپنے وقت کا اک عاشقِ کامل تھا وہ

اور اک عاشق بنا اس کانفرنس کا معتمد
خانہ ویرانی میں اُلّو شکل و صورت میں چغد

عاشقانِ چند رکنِ انتظامی بن گئے
سینکڑوں عشاق رکنِ عام کی صف میں رہے

صورتوں پر سب کی وحشت جسم پر گرد و غبار
بال سر کے خاک آلودہ تھے کپڑے تار تار

دل میں دھڑکن چشم پرنم لب پہ آہیں سرد سرد
جس کو دیکھو وہ نظر آتا تھا اک تصویرِ درد

یوں نظر آیا کہ شعرا کا نگیٹو ہیں یہ سب
شاعروں کے دور کے کوئی ریلیٹو ہیں یہ سب

معتمد نے جب پڑھا اک خطبۂ استقبالیہ
عاشقوں کا کھینچ ڈالا ایک نقشہ حالیہ

ریزولیوشن پاس سب عشّاق نے مل کر کیا
اولیں منزل کو گویا کانفرنس کی سر کیا

سب سے پہلے قیس اور فرہاد کا ماتم ہوا
ہیر رانجھا اور ششی پنّوں کا رنج و غم ہوا

یاد میں سارے جہاں کے کشتگانِ عشق کی
ہو کے استادہ منائی دو منٹ کی خامشی

پھر بتایا ہیں بہت مشکل مراحل سامنے
عاشقوں کے رکھے پیچیدہ مسائل سامنے

کیا بیاں کیجئے زباں سے عاشقوں کا حالِ زار
عاشقانِ باوفا ہیں ملک کے بے روزگار

کچھ توجہ عاشقوں کے حال پر فرمائیے
پانچویں منصوبے میں ان کے مسائل لائیے

تاکہ یہ پورا کریں سب اپنا فرضِ منصبی
اور زوروں پر چلائیں کاروبارِ عاشقی

ہم جمیع عشاق کی یہ مشترک اک مانگ ہے
غور کر کے دیکھئے یہ رائٹ ہے یا رانگ ہے

دفعہ [illegible] سی کو فوراً کالعدم کر دیجئے
کتنی ہے توہین اس میں عاشقوں کی دیکھئے

راہ میں محبوب کو ہے چھیڑ لینا کیا بُرا
چھیڑ گویا نام ہے اک حسرتِ ناکام کا

چھیڑ غالب نے کہا ہے حسرتِ شامِ وصال
وصل جب ہوتا نہیں تو لیجئے حسرت نکال

کالجوں میں عام ہو طلبا میں رسمِ عاشقی
حیثیت اس کی رہے کمپلسری سبجکٹ کی

طالبانِ علم درسِ عاشقی میں طاق ہوں
ملک میں سارے فقط عشّاق ہی عشّاق ہوں

عزت و عظمت میں ان کو دیجیے جائز مقام
نام پر عشاق کے رکھوائیے سڑکوں کے نام

جیسے شیریں پارک، مجنوں روڈ، لیلیٰ اسٹریٹ
ہیر رانجھا مارگ، رومیو کراس، جولیٹ مارکٹ

ملک چاہے بھوک اور غربت کے دورا ہے یہ ہو
ایک اسٹیچو ہر اک عاشق کا چورا ہے پہ ہو

ان کا مستقبل درخشاں اور تابندہ بھی ہو
پارلیمنٹ میں عاشقوں کا اک نمائندہ بھی ہو

دور آبادی سے ان کا ایک خطہ چاہیئے
بلکہ ان کی اک ریاست ہی علٰحدہ چاہیئے

زخمِ دل کے واسطے مرہم بھی ہونا چاہیئے
عاشقوں کا اپنا ایک پرچم بھی ہونا چاہیئے

آؤ اک نعرہ لگائیں عاشقانِ نامراد
اے محبت زندہ باد اے عاشقی پائندہ باد

نیا سال مبارک ۱۹۷۳ء

پھر جھومتا آیا ہے نیا سال مبارک
کیا نعمتیں لایا ہے نیا سال مبارک

پھر دیش میں سوکھا ہے نیا سال مبارک
ہر آدمی بھوکا ہے نیا سال مبارک

ریلوں نے ستایا ہے نیا سال مبارک
اک حادثہ تازہ ہے نیا سال مبارک

روزی کا سہارا ہے نہ رہنے کو مکاں ہے
روٹی ہے نہ کپڑا ہے نیا سال مبارک

جینے کا تو کیا ذکر کہ مرنا بھی ہے مشکل
اب زہر بھی مہنگا ہے نیا سال مبارک

لیڈر ہو منسٹر ہو کہ افسر کہ گورنر!
ترقیے اڑاتا ہے نیا سال مبارک

کھانے کو ترسنے کا پرانا ہے یہ قصہ
پانی کو ترسنا ہے نیا سال مبارک

پہلے تو فقط بھوک سے مرتی تھی رعایا
اب پیاس سے مرنا ہے نیا سال مبارک[1]

سن ساٹھ میں شادی ہوئی ہر سال اک اِشو[2]
یہ بارھواں بچہ ہے نیا سال مبارک

قحط اور گرانی تو بہانے ہیں کہ انساں
موت آئی تو مرتا ہے نیا سال مبارک

اب ملک میں ہر سمت فقط سوشلزم کا
بجتا ہوا ڈنکا ہے نیا سال مبارک

فریاد سنی برقؔ کی تو سیٹھ یہ بولا
شاعر[3] یوں ہی روتا ہے نیا سال مبارک

[1] اس سال پانی کا سخت قحط پڑا تھا۔ [2] Issue [3] شاعر

ایک شاعر بجھاتا ہے شعر — تلملا کر پکارتا ہے شعر
شعر کرتا ہے عرض یوں احوال — ہائے یہ کس نے کر دیا پامال
ایک دن تھا ہرا بھرا تھا میں — ساری آفات سے بچا تھا میں
قصر شاہی تھا میرا گہوارا — وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
میں نے قلعوں میں پرورش پائی — تھی میسر سریر آرائی
شاہی دربار تھا مقام مرا — تھا زمانے میں شہرہ عام مرا
تاجدار وطن بھی شاعر تھا — فنِ شعر و سخن میں تھا یکتا
شاعر عالم پناہ ہوتا تھا — شاعر استادِ شاہ ہوتا تھا
شاعری کے اساتذہ بھی تھے — اور ان کے تلامذہ بھی تھے
دلّی، پنجاب، لکھنؤ، دکنّ — عظمتِ شاعری کے تھے مسکن

گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ
شاعری ہوگئی ہے سب چوپٹ

اتنا بگڑا ہے آج رنگ مرا — قافیہ ہوگیا ہے تنگ مرا
شعر کو ایسے چھانٹ ڈالا ہے — جیسے ٹکڑوں میں بانٹ ڈالا ہے
ایک مصرعہ ہے سینٹی میٹر کا — دوسرا مصرعہ کیلو میٹر کا
بک رہا ہوں میں اب سرِ بازار — میرا ہونے لگا ہے اب بیوپار
اب کہاں لاڈ اور چاؤ مرا — ایک روپیہ میں دس ہے بھاؤ مرا
ملک میں بے شمار شاعر ہیں — نئے پیسے کے چار شاعر ہیں
جن کو آتی نہیں ہے الف بے تے — وہ بھی ہیں آج شعر کہہ لیتے
جن کو دنیا میں کچھ نہیں ہے کام — تھام لیتے ہیں شاعری کی لگام
شاعری میں نہ کوئی تاجر ہے — نہ تو برلا نہ ٹاٹا شاعر ہے
کوئی زردار بھی نہیں شاعر — فلم اسٹار بھی نہیں شاعر
کوئی شاعر نہیں گورنر بھی — اور نہ شاعر ہے چیف منسٹر بھی
نہ تو وزرائے مرکزی شاعر — نہ تو پردھان منتری شاعر
حاکم بحریہ نہیں شاعر — صدر جمہوریہ نہیں شاعر
سُن کے یہ ماجرائے جسیّت — بولا اک شاعرِ جدیدیّت

میں تو رتبہ ترا بڑھاتا ہوں
تجھ کو روٹی سمجھ کے کھاتا ہوں

قطعات

جب میں کنوارا تھا تو پریشان تھا بہت
احباب طعنہ دیتے تھے شوہر نہیں ہوں میں

شادی ہوئی تو میں نے اکڑ کر یہ کہہ دیا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

●

شب کو بس اسٹانڈ پر اک نوجواں نے یہ کہا
صبح دم آیا تھا میں شب کا اندھیرا ہو گیا

ایک مردِ پیر نے یہ سن کے فرمایا میاں
میں جوانی میں یہاں آیا تھا بوڑھا ہو گیا

●

سیکس ایجوکیشن شریکِ درس ہونا چاہیئے
لیکن اس میں احتیاط اس بات کی فرمایئے

جس قدر تعلیم ہو اسکول ہی میں دیجئے
ہوم ورک اس کا مگر بچوں سے مت کروایئے

غزل

الطاف و عنایت ہے مگر ایک بٹہ چار
اخلاص و محبت ہے مگر ایک بٹہ چار

صورت پہ ملاحت ہے مگر ایک بٹہ چار
حوروں کی شباہت ہے مگر ایک بٹہ چار

گفتار میں حلاوت ہے مگر ایک بٹہ چار
لہجے میں صداقت ہے مگر ایک بٹہ چار

اقرار کی امید تو اُن سے نہیں لیکن
انکار میں لذت ہے مگر ایک بٹہ چار

مہنگائی کے بھتے میں اضافہ تو ہوا ہے
تنخواہ میں برکت ہے مگر ایک بٹہ چار

بیمارِ محبت کو جو دیکھا تو یہ بولے
بچنے کی تو صورت ہے مگر ایک بٹہ چار

رکھنے کو تو رکھتے ہیں سند بی۔ اے کی لیکن
صاحب کی لیاقت ہے مگر ایک بٹہ چار

مانا کہ انہیں مجھ سے محبت تو نہیں ہے
البتہ مروّت ہے مگر ایک بٹہ چار

کچھ وضع کے پابند ابھی لوگ ہیں باقی
دنیا میں شرافت ہے مگر ایک بٹہ چار

پوچھا کہ میں آ سکتا ہوں محفل میں تمہاری
بولے کہ اجازت ہے مگر ایک بٹہ چار

جب برقؔ سے پوچھا کہ ہے شعر و ادب کیا؟
بولے کہ حجامت ہے مگر ایک بٹہ چار

برق آشیانوی

طبّی معائنہ

پیچھا چھڑانے کے جتنے بہانے ہوسکتے تھے ہم نے کرڈالے مگر حقیقت یہ ہے کہ کون سورما انشورنش کمپنی کے ایجنٹ سے پیچھا چھڑا سکتا ہے جو ہم یہ بہادری دکھا سکتے۔ بالخصوص ان حالات میں کہ ایسا ایک ایجنٹ اپنا دوست بھی ہو۔ تھک ہار کر راضی ہونا پڑا کہ ہم ایک پالیسی لے لیں گے ہم نے کہا بھی کہ بھائی صاحب ہم سات بچوں کے باپ ہو گئے ہیں (البتہ یہ نہیں بتایا کہ آٹھویں کی تیاری ہے اب کیوں آپ یہ بکھیڑا خود مول لیتے ہیں اور کیوں ہماری جان کے پیچھے یہ دکھڑا لگا رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ آپ شادی کی پالیسی لے لیجئے ہم نے معصومیت کے ساتھ کہا کہ الحمدللہ ہماری شادی بھی ہو چکی ہے۔ اس پر وہ ہنس پڑے اور وضاحت کی کہ ہم اپنے بچوں کی شادی کی پالیسی لے لیں۔ غرض انہوں نے اپنی پوری کوشش کرلی اور آخر ہمیں پھانس کر رہے۔ اس سلسلے میں ہم کو ایک خاص مرحلے سے گزرنا پڑا اور وہ تھا ہمارا طبّی معائنہ یہی وہ دلچسپ مشغلہ تھا جس کو ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ غالبًا قارئین کے لیے بھی اس میں تفریح طبع کا سامان موجود ہو۔

ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس طبّی معائنہ کی غرض سے رجوع ہوں۔ چنانچہ مقررہ تاریخ اور وقت پر ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں اپنے سامنے ایک کرسی نما اسٹول پر بٹھایا اور کچھ دیر تک غور سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ہمارا نام پوچھا ہم نے بتا دیا۔ پھر پوچھا والد صاحب کا نام بتاؤ۔ یہ بھی ہم نے شرافت کے ساتھ بتا دیا۔ اس کے بعد دریافت کیا۔

"آپ کی عمر کیا ہے؟"

ہم نے کہا — "ستر سال"

"ہائیں! آپ مذاق کرتے ہیں"

"جی نہیں بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں"

لیکن آپ تو چالیس سال کے بھی مشکل سے دکھائی دیتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب جہاں تک دکھائی دینے کا سوال ہے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آج کل لڑکے لڑکیاں

دکھائی دیتے ہیں اور لڑکیاں لڑکے دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن صرف دکھائی دینے سے نہ لڑکے لڑکیاں ہو جاتے ہیں اور نہ لڑکیاں لڑکے ہو جاتی ہیں۔

"لیکن یہ مثال عمر کے بارے میں صادق نہیں آتی"۔

"تو لیجئے ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔ کل ہمارے گھر میں ایسے چاول آئے ہیں جو گیہوں دکھائی دیتے ہیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ چاول کا رنگ بالکل گیہوں کا سا ہے اور دیکھنے میں گیہوں نظر آتے ہیں۔ البتہ گرنی میں صاف روائے جائیں تو اندر سے چاول نکل آتے ہیں"۔

"آپ آدمی دلچسپ ہیں"۔

"جی۔ ہماکسار کی بیوی کی بھی یہی رائے ہے"۔

"آپ مذاق چھوڑیئے۔ اور . . . . . ."

ہم نے مداخلت کی ۔ "جی وہ تو میں نے پیدا ہوتے ہی چھوڑ دیا۔ یقین مانیئے کہ والدین کا کہنا ہے کہ پیدا ہوتے ہی میں نے رونا شروع کر دیا تھا اور جب سے ہوش سنبھالا ہے روتے ہی گزری ہے"۔

"آپ تو کوئی ادیب قسم کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں"۔

"جی ہاں اس زمرہ میں شمار تو ہوتا ہے ۔۔۔"

اب آپ ادیبانہ حرکتیں چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ سوالات کے جوابات دیں"۔

"یعنی ادیبانہ حرکتیں غیر سنجیدہ ہوتی ہیں"۔

"جناب! اب میں آپ سے زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا۔ مہربانی فرما کر آپ میرے سوالوں کا صحیح صحیح جواب دیجئے تاکہ میرا اور آپ کا وقت ضائع نہ ہو"۔

"میری حد تک تو آپ فکر نہ کیجئے البتہ آپ کا وقت ضائع کرنا تو میں بھی نہیں چاہتا لیکن گزارش ہے کہ آپ میرے جوابوں کو غیر صحیح نہ تصور فرمائیں"۔

"اب آپ بتایئے کہ آپ کی عمر کیا ہے؟"

"یہی تو مشکل ہے ڈاکٹر صاحب کہ مجھے اپنی عمر کے بارے میں خود پتہ نہیں کہ کیا ہے۔ البتہ ایک اندازے کے مطابق میں نے کہا تھا کہ ستر سال ہوگی لیکن آپ اس کو غیر صحیح سمجھتے ہیں"۔

"آپ اپنی تاریخ پیدائش بتایئے"۔

"میری پیدائش کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں رات کے ٹھیک بارہ بجے پیدا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے آج تک میری پیدائش کی صحیح تاریخ کا تعین ہی نہ ہو سکا۔ ایک تاریخ تو غروب آفتاب کے ساتھ گزر چکی تھی۔ اور دوسری تاریخ صبح سے شروع ہونے والی تھی"۔

لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رات کے بارہ بجے تک گزرے ہوئے دن کی تاریخ شمار کی جاتی ہے اور بارہ بجے کے بعد آنے والے دن کی تاریخ کا شمار ہوتا ہے"۔

"جی ہاں اس طرح بھی غور کیا گیا ۔۔۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ میں نہ تو بارہ بجے سے پہلے اور نہ بارہ بجے کے بعد پیدا ہوا بلکہ ٹھیک بارہ بجے . . . چونکہ ٹھیک بارہ بجے کی تاریخ کے بارے میں کوئی تصفیہ نہ ہوا تھا کہ کونسی تاریخ شمار کی جائے اس لیے یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔"

"خیر تو اس گزرے ہوئے دن کی تاریخ شمار کرلیں۔ لہذا یہ بتائیے۔"

"جی نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا غضب نہ کیجئے گا۔"

"اس میں غضب کی کیا بات ہے ۔۔۔ ؟"

"حقیقت میں غضب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ گزرنے والی تاریخ تیرہ (۱۳) تھی اور تیرہ تاریخ کو پیدا ہونا انتہائی منحوس حرکت ہے۔ اب تو مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا ۔۔۔"

"ارے صاحب آپ کو اب پیدا ہونے کو کون کہتا ہے۔ پیدا ہونا تھا تو ہو چکے . . . اور آپ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے نحوست جیسے منحوس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ دیتے ہیں۔"

"مشکل یہ ہے کہ اگر یہ بات میری بیوی کو معلوم ہو جائے گی تو صبح و شام طعنہ دیں گی کہ منحوس تاریخ کی پیدائش ہے۔ ویسے اب بھی وہ منحوس گھڑی کی پیدائش کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔"

"تو آپ کی بیوی سے اس بات کو چھپایا جائے گا۔"

"انشورنس کی پالیسی میں تو انھیں نیک بخت کی وراثت درج ہوگی اور پالیسی میں تاریخ پیدائش بھی درج ہوگی جس پر ان کی نظر پڑ ہی جائے گی۔"

"تو ایسا کیجئے کہ آنے والے دن کی جو تاریخ تھی وہ شمار کر لیجئے۔"

"لیکن اس میں بھی ایک مشکل ہے۔"

"وہ کیا ؟"

"آنے والا دن منحوس تھا !"

"بڑی مشکل ہے۔"

"انہی تمام مشکلات کی بنا پر میں نے چاہا تھا کہ اپنی زندگی کا بیمہ ہی نہ کراؤں لیکن میرے دوست ایجنٹ میرے سر ہو گئے ۔۔۔ کم از کم آپ اس مصیبت سے نجات دلائیے تو مہربانی ہوگی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا کام تو صرف آپ کا طبی معائنہ کر کے اپنی رپورٹ پیش کرنا ہے۔ دیگر باتوں سے مجھے سروکار نہیں۔"

"اسی لیے تو میں نے اپنی صحیح عمر بتا دی تھی کہ آپ رپورٹ لکھ دیں گے کہ ایک ستر سال کے بوڑھے کی زندگی کا بیمہ لینا خطرے سے خالی نہیں سال چھ مہینے کے اندر ہی راہی عدم ہو جائے تو بلا وجہ بیمہ کمپنی کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"اب معلوم ہوا کہ آپ پالیسی لینے سے کتراتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے کوئی بات صحیح بتانے سے گریز کر رہے ہیں، خیر ۔۔۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ آپ کے طبی معائنہ سے آپ کی صحیح عمر کا پتہ لگا لوں گا۔ آپ اپنے دانت دکھائیے۔"
ہم نے اعتراض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب دانت تو بیل گھوڑے اور دیگر جانوروں کے دیکھے جاتے ہیں ۔۔۔"

"میں آپ کو ان سے الگ نہیں سمجھتا"۔
ہم نے طیش میں آکر کہا ۔۔۔ "آپ میری توہین کر رہے ہیں"۔
"ہرگز نہیں بہ حیثیت ایک ڈاکٹر کے مجھے اتنی مہارت ہے کہ میں دانت دیکھ کر آپ کی صحیح عمر بتا سکتا ہوں۔ چاہے آپ انسان ہوں یا حیوان"۔
ہم نے بحث کی گنجائش نہ پا کر دانت دکھا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ہوں کار (یہ ہوں کار ہماری ہی اصطلاح ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک نہایت ہی لمبی "ہوں" کے) پھر کہا ۔۔۔ "آپ کی عمر تیس سال ہے"۔
ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا ۔۔۔ "ارے نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا غضب نہ کیجئے۔ میری عمر تو چالیس سال ہے اور آپ کہتے ہیں تیس سال یہ سن کر تو لوگ ہنسیں گے"۔
"اب آئے آپ راستے پر ۔۔۔ کیوں جناب ہیں نا آپ چالیس سال کے"۔
اس کے بعد تو ہمیں اپنی تاریخ پیدائش بتاتے ہی بن پڑی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے طبی معائنہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا ۔۔۔ "کیا کام کرتے ہیں آپ"؟
"آج تک تو کوئی کام سلیقہ کا نہیں کیا ۔۔۔ حتیٰ کہ گھر کا سودا لانے کا بھی ڈھنگ نہیں"۔
"میرا مطلب ہے آپ کا پیشہ کیا ہے ۔۔۔"؟
"سو پشت اوپر تو ہمارا پیشہ سپہ گری تھا۔ البتہ تین چار پشت اوپر کا پیشہ زراعت تھا لیکن میرا ارادہ تھا کہ تجارت کروں مگر ڈگری لے کر وکالت کی اور جب اس کا اہل ثابت نہ ہوا تو چاہا کہ حجامت ہی کروں ۔۔۔ لیکن بیوی نے مخالفت کی تو اطاعت قبول کرلی"۔
"کس کی اطاعت ۔۔۔"؟
"بیوی کی ۔۔۔"
"مہربانی کر کے آپ صحیح جواب دیں۔ اس طرح وقت ضائع کرنے سے فائدہ نہیں"۔
"اس کا تو مجھے بھی احساس ہے لیکن چونکہ میرے آنے سے پہلے کا تو علم نہیں البتہ بعد سے اب تک کوئی مریض آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا چنانچہ میں نے خیال کیا کہ آپ کا غم غلط کیا جائے"۔
ڈاکٹر صاحب کو یہ بات ناگوار گزری۔ غالباً اس میں صداقت تھی اور صداقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے کہا "دیکھئے جناب آپ صرف ضروری باتیں کیجئے یہ وقت میرے مریضوں کو دیکھنے کے لیے جانے کا ہے۔ آپ فضول قسم کی باتیں نہ کیجئے"۔
"اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے کونسی بات فضول کہی ہے۔ تاہم کوشش کروں گا کہ صرف غیر فضول باتیں ہی کروں ۔۔۔ فرمائیے کیا عرض کروں ۔۔۔ اگر ارشاد ہو تو کوئی اچھا سا شعر سناؤں"۔
"میں شاعر نہیں ہوں ۔۔۔"
"اسی لیے تو میں نے آپ سے کچھ سنانے کی فرمائش نہیں کی۔ البتہ شعر سننے کی خواہش کی ہے۔ لہٰذا سنئے مرزا غالب کا شعر ہے ۔۔۔"
"رہنے دیجئے آپ کی شاعری ۔۔۔"

"جی نہیں یہ میری شاعری نہیں ہے ـــــ"

کسی کی بھی ہو میں سننا نہیں چاہتا ـــــ آپ طبی معائنہ کی طرف آیئے. جلدی کیجئے ـــ"

"فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں"

"کپڑے اتار دیجئے ـــــ"

"لیکن یہ کپڑے تو میرے ہیں ـــ"

"جی ہاں آپ ہی کے ہیں اور آپ ہی کے رہیں گے. میں چھین نہ لوں گا."

"مگر کپڑے اتارنا تو تہذیب کے خلاف ہے. میں یہ کیسے کر سکتا ہوں"

"جی نہیں، خلافِ تہذیب کی حد تک نہیں. بلکہ آپ اپنا بشرٹ اور پتلون علحدہ کیجئے. باقی کپڑے رہنے دیجئے."

"مشکل یہ ہے کہ پتلون کے علاوہ باقی کی قسم سے کوئی چیز نہیں ہے"

"آپ انڈر ویر نہیں پہنتے ؟"

"پہنا تو کرتا ہوں لیکن آج آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہیبت میں بھول گیا"

"تو صرف بشرٹ اتار دیجئے ـــ"

ہم نے نہایت اطاعت گزاری کے انداز میں بُش شرٹ اتار دیا بشرٹ اتارتے ہی ہماری نظر انڈر ویر کے نیچے پر پڑی جو پتلون میں سے جھانک کر ہمارے خلاف شہادت دے رہا تھا. ہم نے چھپانا چاہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی. اور انھوں نے کہا.

"دیکھئے آپ نے جھوٹ کہا تھا. انڈر ویر موجود ہے"

ہم نے کہا ـــ "ڈاکٹر صاحب مجھے تو اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے انڈر ویر نہیں پہنا تھا. نہیں معلوم کس نے غفلت میں پہنا دیا."

اس پر ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے اور کہنے لگے ـــ "میں آپ کی باتیں سمجھ چکا ہوں. آپ راہِ فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں. مگر یاد رکھیئے کہ آپ کی جان کا بیمہ تو ہو کر رہے گا"

اگر میرے دوست نے آپ کو بھی اپنی سازش میں شریک کر لیا ہے تو پھر یہی سہی"

پھر جیسے اچانک ڈاکٹر صاحب کو یاد آ گیا ـــ اور انھوں نے پینترا بدل کر سوال کیا. ہاں یہ تو بتایئے کہ آپ کے والدین بقیدِ حیات ہیں ـــ"

ہم نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں جواب دیا ـــ "جی ہاں"

"والد صاحب کی عمر کیا ہے ـــــ؟"

کیوں کیا ان کا بھی بیمہ کروانا ہے ؟

"جی نہیں"

"ڈاکٹر صاحب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ایک بات عرض کروں."

"فرمایئے"

"کیوں نہ میرے بجائے حضرت والد صاحب قبلہ کی جان کا بیمہ کروالیا جائے. اس میں کچھ ہمارا فائدہ

ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا ــــ "اچھا اس پر بعد میں غور کیا جائے گا۔ فی الحال یہ بتایئے کہ آپ کو۔۔۔ بُرا نہ مانئے۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ کوئی بیماری تو نہیں ــــ؟"

"آپ ایک بیماری کی کہتے ہیں۔۔۔ یقین مانئے میں تو کئی ایک بیماریوں میں مبتلا ہوں۔"

"مثلاً ــــ؟"

"مثلاً شاعری، افسانہ نویسی، مضمون نگاری، ڈرامہ نویسی وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اور کچھ عرصے سے ایک نئی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہوں ــــ اور وہ ہے انشورنس ولو لینا۔"

"ارے نہیں صاحب آپ نے سمجھا نہیں ــــ میرا مطلب یہ ہے کہ۔۔۔ خیر جانے دیجئے کیونکہ آپ صورت شکل سے ہی معصوم معلوم ہوتے ہیں ــــ البتہ یہ بتلایئے کہ آپ کے خاندان میں کوئی۔۔۔ خدانخواستہ۔۔۔ دق سل وغیرہ میں مبتلا تو نہیں؟"

"کسی اور کا ذکر کیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ یہ ناچیز خود ان تمام بیماریوں میں خطرناک حد تک مبتلا ہے۔ دق کے بارے میں تو ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ تیسرا درجہ ہے اور اب تو میں سمجھتا ہوں کہ چوتھے بلکہ پانچویں درجہ میں ہوگا۔"

"دق کا مرض چوتھے یا پانچویں درجے میں کیا ہو سکتا ہے البتہ آپ مجھے درجہ اول کے۔۔۔ وہ معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ یعنی کہ مریض۔۔۔ آپ کے علاوہ بھی کوئی فرد خاندان اس مرض میں مبتلا ہوا ہے"؟

"کئی ایک ــــ پرسوں ہی یعنی کوئی پانچ سال ہی کی بات ہے کہ ہمارے ایک رشتے کے سالے کے بھائی کا نوزائیدہ بچہ اسی دق کے مرض سے انتقال کر گیا۔ اور میری اہلیہ کے دادا جان صاحب کے چچازاد بھائی صاحب صرف اسی سال کی عمر میں اسی موذی مرض سے جاں بحق۔۔۔"

"رہنے دیجئے، آپ کی زبان دیکھیں ــــ"

"ڈاکٹر صاحب زبان کا لطف اٹھانا ہو تو میرے مضامین پڑھیئے ــــ"

"اجی وہ زبان نہیں جناب ــــ منہ کی زبان ــــ یعنی جیب ــــ"

"اوہ۔ معاف فرمایئے ڈاکٹر صاحب ــــ ملاحظہ فرمایئے۔"

یہ کہہ کر ہم نے اپنی زبان باہر نکال دی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ــــ "آپ کا دل دیکھیں ــــ" یہ کہتے ہوئے انھوں نے اسٹیتھسکوپ سنبھال لیا ــــ ہم نے ایک یاس انگیز لہجے میں کہا۔

"دل کہاں ہے ڈاکٹر صاحب جس کو آپ دیکھیں گے۔ وہ تو عنفوان شباب ہی میں ایک ظالم کی نذر ہو گیا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے اپنی جان بھی اسی پر نثار کر دی۔ اب یوں سمجھئے کہ ہم ایک چلتی پھرتی لاش۔۔۔" "تو یہ ہے اجی جناب آپ شاعری چھوڑیئے اور چت لیٹ جایئے۔" ــــ ہم چت لیٹ گئے ــــ ڈاکٹر صاحب نے دل جگر پھیپھڑے غالباً سب ہی چیزیں دیکھ ڈالیں کیوں کہ انھوں نے فیصلہ صادر فرمایا۔ ــــ ماشاءاللہ آپ بالکل تندرست ہیں۔ جایئے آپ کی جان کا بیمہ ہو جائے گا۔" ــــ اور ہم اپنے مقصد میں ناکام ہو کر منہ لٹکائے ہوئے گھر لوٹے اور یہ منحوس خبر بیوی کو سنائی تو ان کا دل باغ باغ ہو گیا اور چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھا۔

(انتخاب از "میرا ایک تبسم") ▭▭

برق آشیانوی

★

بیمار اور تیمارداری

بیمار وہ زندہ اور جیتی جاگتی مخلوق ہے جس کے ساتھ بعض اوقات زندگی ہی میں مُردوں کا سا سلوک کیا جاسکتا ہے۔ یا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر کی ہدایت کو چار سے ضرب دے کر بیوی اس پر عمل کروانے لگتی ہے مثلاً اگر ڈاکٹر کہے کہ مریض آرام کرے تو بیوی کہے گی کہ شوہر بستر پہ لیٹ جائے۔ حتیٰ کہ کروٹ بھی نہ بدلے بلکہ چت لیٹا رہے ہاتھ پاؤں کو حرکت نہ دے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھے بلکہ ہو سکے تو آنکھیں بند کرلے۔ بالخصوص اُس وقت جبکہ اس کی سہیلیاں مزاج پرسی کے لیے آئی ہوئی ہوں۔ اگر ممکن ہوتا تو سانس بند کرلینے کی بھی ہدایت دیتی۔ اس پر ایک قطعہ یاد آیا۔ عرض کیا ہے۔

(عرض کیا ہے ہم نے اس لئے لکھا ہے کہ یہ خود ہماری بلا شرکت غیرے ذاتی ملکیت ہے)

قطعہ

گئی جب تربتِ شوہر پہ بیوی فاتحہ پڑھنے
سُنی آواز بیوی کی تو وہ گھبرا کے اُٹھ بیٹھا
کہا بیوی نے جھلا کر "عجب بے چین مُردہ ہو
تمہیں تو قبر میں بھی چین سے سونا نہیں آتا

یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بیمار اس شخص کو نہیں کہتے جس کو تنخواہ ملنے کے دوسرے ہی دن دردِ سر کا عارضہ لاحق ہو جائے۔ یا بیوی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے سے دو چار اجابتیں کھل کر ہو جائیں یا کسی محفلِ شعر میں رات زیادہ دیر تک جاگتے رہنے سے نزلہ ہو جائے۔ یا یہ کہ اِن میں سے کچھ بھی نہ ہو، محض ایک [illegible]ن کی رخصتِ اتفاقی حاصل کرنے کے لیے بخار کا بہانہ بنایا جائے۔ اگرچہ سوائے ایک کے باقی تمام تکالیف بیماری [illegible]یف میں آتی ہیں۔ اگر ان کی شروع ہی میں روک تھام نہ کی جائے تو لاڈ پیار میں پلی ہوئی نافرمان اولاد کی طرح جوان [illegible]ئے بے درمان بن جاتی ہیں۔ بخار ہر قسم کا خواہ وہ محبت کا ہو یا ٹائیفائیڈ کا، بیماری کی تعریف میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں [illegible]عدے، قلب، دماغ وغیرہ کی خرابیوں کو بیماری کہا جا سکتا ہے۔ البتہ دماغ کی اس خرابی کو جس کی وجہ سے آدمی شاعر یا ادیب بن جاتا ہے، بیماریوں کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تنقید وہ نزلہ ہے جو [illegible] پر پڑتا ہے جو نہ صرف بیمار کے لیے عذاب بن جاتا ہے بلکہ کسی مصنف کے لیے باعثِ ہلاکت ثابت ہوتا ہے۔

بیمار خود تو ایک تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے لیکن دوسروں کو کئی تکالیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خصوصاً وہ لوگ خود بیمار سے زیادہ پریشان رہتے ہیں جو تیمار داری کرتے ہیں۔ تیمار داری پر ایک بات یاد آگئی کہ یہ لفظ "بیمار" اور "بیماری" کے معاملے میں کیسے وضع ہو گیا۔ لغت میں تیمار داری کے معنے ہمدردی و غمخواری کے لکھے ہیں۔ لیکن رواجاً تیمار داری اس ہولناک خدمت کا نام ہے جو کسی بیمار کی دیکھ بھال کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ ہماری رائے میں اس لفظ کو بدل دینے کی سخت ضرورت ہے۔ اور فوراً اس کو "بیمار داری" بنا دینا چاہیئے۔ یا پھر بیمار کے لفظ کو بدل کر "تیمار" کر دینا چاہیئے تاکہ دونوں لفظوں میں صوتیاتی ربط اور معنی و مطلب میں ہم آہنگی ہو۔ لیکن ہم اس کے مجاز نہیں ہیں یہ کام تو ان لوگوں کا ہے جو زبان کے پیچھے ادھیڑتے رہتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ بیمار اور تیمار داری کی بحث کو ایک مراسلے کے ذریعہ کسی اخبار یا رسالے کے حوالے کر کے ان لوگوں کا تماشہ دیکھیں جو اس اکھاڑے میں اتر کر دو چار سال تک کشتیاں لڑتے رہنے کے بعد بیزار ہو کر بغیر کسی نتیجے کے میدان سے ہٹ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ بحث پرانی ہو جاتی ہے اور کسی نئی بحث کے لیے ایک نیا اکھاڑہ تیار ہو جاتا ہے۔ جس میں یہ قوت آزمائی کے لیے اتر جاتے ہیں۔ مثلاً خواتین کو "جنابہ" لکھنا صحیح ہے یا غلط، یا یہ کہ "پتنگ" مذکر ہے یا مونث (حالانکہ مرزا غالب کے ایک تصفیہ کے بموجب اس کا فیصلہ آسانی کے ساتھ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اگر "پتنگ" مرد اڑائے تو مذکر ہے اور عورت اڑائے تو "مونث" ہے) یا پھر یہ کہ لفظ غالِب ہے یا غالَب یا غائب۔ ان نئی بحثوں میں "بیمار" اور "تیمارداری" کی پرانی بحث بغیر کسی تصفیہ یا صحت کے ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ لیجئے ہم بھی ان لوگوں کے پیچھے بھاگنے لگے کہ چند جملوں کی حد تک خواہ کسی انداز سے ہو بحث میں اُلجھ گئے۔ آخر میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ "بیمار" اور "تیمار داری" دونوں جہنم میں جائیں ہمیں کیا لینا دینا ہے۔ ان دونوں میں ربط و معنی پیدا کرنا تو ان کا کام ہے جو زبان کو پہلے بناتے ہیں اور بعد میں بگاڑتے ہیں۔ پھر اس کو درست کرنے کے لیے اور زیادہ بگاڑ دیتے ہیں۔ ہم تو زبان کو اسی حد تک دیکھتے ہیں کہ "نہاری" میں موجود ہے یا نہیں یا صرف "پائے" ہیں۔ اور جب بیرے سے شکایت کرتے ہیں کہ نہاری میں زبان موجود نہیں ہے تو وہ صاف جواب دیتا ہے۔ حضور۔ بکرا ایک "بے زبان" جانور ہوتا ہے۔ نہاری سے قطع نظر ہم نے بعض کتابیں ایسی بھی پڑھی ہیں کہ جن میں "زبان" کے بجائے صرف "پائے" نظر آئے۔ البتہ ان میں گرم گرم نہاری کی لذت ضرور پائی جاتی ہے ایسی کتابوں کو احتیاط کے طور پر کمرہ بند کر کے پڑھ لیا جاتا ہے کیونکہ نوجوانوں کے لیے یہ مضامین معجون ملذّذ ہوتے ہیں لیکن مُمسِک نہیں ہوتے۔

آدمی بیمار ہوتا ہے تو بعض وقت خود بیمار کو خوشی ہوتی ہے۔ اور تیمار دار کو رنج ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بیمار کو کئی ایک مسائل بلکہ تکالیف سے نجات مل جاتی ہے۔ مثلاً گھر کا سودا سلف اور میونسپلٹی کے نل سے پانی لانا بیوی بچوں کے کپڑے دھونا۔ گھر کی صفائی کرنا۔ برتن دھونا اور کھانا پکانا۔ غرض کئی کاموں سے چھٹی مل جاتی ہے۔ چونکہ ان کاموں میں سے اکثر بیوی کو کرنے پڑتے ہیں اس لیے وہ شوہر کی بیماری سے ایک آفت ناگہانی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بیمار ہو کر خود ایک تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ بیمار جب بستر پر سکون اور آرام سے لیٹ جاتا ہے۔ یا ڈاکٹر کے مشورے سے اس کو زبردستی لٹا دیا جاتا ہے تو وہ اوسط کا سر کھانے، بات بات میں دخل دینے، اور ہر کام میں روڑے اٹکانے کے قابل نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے گھر کے اکثر و بیشتر کام نہایت سکون و اطمینان اور خوش اسلوبی کے ساتھ بروقت انجام پاتے ہیں۔

چنانچہ لوگ خوشی خوشی اس کی تیمارداری کرنے لگتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں دعا کرتے ہیں کہ اے معبود اس کی بیماری کو زلفِ محبوب سے زیادہ درازی عطا کر اور اگر ہو سکے تو بیمار کی عمر کو محبوب کی کمر کی طرح مختصر سے مختصر یا بعض شاعروں کے خیال کی طرح معدوم ہی کر دے۔

کسی شخص کے بیمار ہونے پر سب سے زیادہ خوشی ڈاکٹر کو ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی تمنا تو یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص بیمار ہو اور تا قیامت بیمار رہے۔ وہ ہر بیمار اور بیماری کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کرتا ہے۔ تندرست لوگوں کو ایسی حریص نظروں سے دیکھتا ہے کہ کب یہ کمبخت بیمار ہوں اور کب انھیں میرے ہاتھوں بیماری میں طوالت اور بیمار کی عمر میں درازی نصیب ہو۔ بیمار کے معاملے میں قرض خواہوں کا رویہ کچھ ادھر ہی ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی مقروض آدمی بیمار ہو جائے تو قرض خواہ بیمار کے بیوی بچوں سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ بیوی کو تو فیملی پنشن مل جائے گی اور بیمہ کی رقم ہاتھ لگے گی اور بچے سرکاری وظائف حاصل کر کے تعلیم پالیں گے لیکن قرض خواہ کا قرض کوئی ادا نہ کرے گا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مقروض آدمی بیمار ہوا تو قرض خواہ سیدھے ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور اس سے التجا کرنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب مریض کا علاج مکمل دلچسپی سے کیجیے۔ وجہ پوچھی گئی تو بولا "ڈاکٹر صاحب مریض میرا قرضدار ہے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا "میاں تم سے زیادہ فکر مجھے ہے کہ مریض کو صحت ہو جائے اور جتنا ہو سکے دیر ہو جائے کیونکہ اس کی صحت یابی پر ہی اپنی فیس اور دواؤں کا بل مجھے ملے گا"۔ اس سے قرض خواہ کو تسلی ہو گئی۔ لیکن مریض کی تنخواہ ملجانے کے بعد قرض خواہ ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔ کچھ دنوں بعد اتفاقاً ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ اس کا قرضدار مریض قریب المرگ ہے تو قرض خواہ نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب پہلی تاریخ کے بعد میں مریض سے اس لیے نہیں مل سکا کہ اس نے پہلی تاریخ کو میرا قرض ادا کر دیا تھا۔ اب آپ اس کا علاج 'دل کھول کر' کیجیے۔ کیوں کہ اب میری دکان پر تجہیز و تکفین کا سامان مل سکتا ہے۔

بعض نوجوانوں کو "جوانی" کا بخار آجاتا ہے۔ تو والدین فرزند کی بیماری سے سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ جب اس بیماری کا علاج ڈاکٹر اور طبیب کی دواؤں سے نہیں ہوتا تو والدین ملا جمرالیہود کی "دعاؤں" کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ملا جمرالیہود کی دواؤں کے مختلف طریقے ہیں جن میں تعویذ گنڈے تو عام ہیں اگر فائدہ نہ ہو تو جھاڑ پھونک اور "نہاون" سے بھی علاج کیا جاتا ہے۔ ان تمام حربوں کو آزمانے کے بعد کسی اسپتال میں شریک کروا دیا جاتا ہے تجربہ شاہد ہے کہ اسپتال میں شریک کرواتے کے بعد دو مختلف یا متضاد نتائج برآمد ہوتے ہیں ایک یہ کہ نرسیں حسین اور نوجوان ہوں تو بیماری بہت طویل پکڑتی ہے۔ صاحبزادے اسپتال سے گھر واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔ اگر خوش قسمتی (والدین کی) سے نرسیں نہ صرف کالی کلوٹی بلکہ بدصورت بھی ہوں تو صاحبزادے دو تین دن کے اندر تندرست ہو کر گھر آ جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابتداء میں کہا ہے کہ بیمار اور تیمارداری دو ایسے الفاظ ہیں جن میں اگرچہ زبان و بیان کے لحاظ سے نہ کوئی ربط ہے نہ ہم آہنگی۔ اس کے باوجود دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن مرزا غالب کا خیال کچھ ادھر ہی ہے۔ وہ بیماری کے زمانے میں ایسی جگہ رہنا چاہتے ہیں جہاں ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار ؎ اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(ہمارا خیال ہے کہ اگر مرزا غالب زندہ ہوتے اور آج کل کے کسی سرکاری اسپتال میں شریک ہوتے تو

ان کی یہ تمنا بآسانی پوری ہو جاتی)

یہ مرزا صاحب کی اپنی پسند تھی۔ جس کے بارے میں آج ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن عام حالات میں جہاں بیمار ہوتا ہے وہاں تیمار دار ہوتا ہے۔ اور جہاں بیماری ہوتی ہے۔ وہاں تیمار داری لازم و ملزوم ہیں۔ تیمار داری ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ کیوں کہ تیمار دار خود اپنی جگہ ایک لحاظ سے بیمار ہوتا ہے۔ جس کی بیماری کی دوا سوائے اصل بیمار کی صحت کے اور کوئی نہیں ہوتی تیمارداری کے معنی اگر وقت پہ دوا دینا، غذا دینا، صفائی کا خیال رکھنا بیمار کو آرام پہنچانے کی جتنی ہدایتیں ڈاکٹر دے اُن پر عمل کرنا وغیرہ کی حد تک محدود ہوتے تو دنیا میں کوئی ایسا تیمار دار نہ ہوتا جو بیمار کے بجائے خود اپنی زندگی سے تنگ آکر موت کی دعائیں مانگنے لگے۔ لیکن یہ کام اس وقت انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ جب بیمار کی بدمزاجیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں اور کسی نا اہل عہدیدار کی طرح جو اپنی ہر غلطی کو ماتحت کے سر تھوپ کر ماتحت پر برس پڑتا ہے۔ بیمار بھی ہر صحیح کام کو غلط ٹھہرا کر تیمار دار کی جان عذاب میں ڈال دیتا ہے۔ اس مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر اسپتالوں میں نرسوں کو مریضوں کی تیمار داری کے لیے مامور کیا جاتا ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ بیماروں کی بدمزاجیوں کو برداشت کریں گے لیکن آج کل اسپتالوں میں نرسوں کا یہ حال ہے کہ خود بیماروں کو نرسوں کی تیمار داری (یعنی بدمزاجی کو برداشت کرنا) کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ کسی نرس کی شکایت پر ڈاکٹر بھی بدمزاج یا بعض صورتوں میں بدگمان ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو نرسیں مریض کی بدمزاجی کا بدلہ لینے کے لیے اپنی صنف کا حربہ استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ یہ صورتِ حال بالخصوص کسی شریف قسم کے بیمار کے لیے بڑی پریشان کن ہوتی ہے۔ اور وہ بیماری کو بلائے طاق رکھ کر اسپتال سے بھاگ نکلتا ہے۔ اگر کوئی بیمار نرس سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تو پھر نرس کے رازہائے پوشیدہ کا انکشاف کرنے کی دھمکی دے کر نرس کو اتنا راہِ راست پر لاتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں مریض کی "تیمار داری" شروع کر دیتی ہے کسی نرس کو ہم نے آج تک ان اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو مس نائٹ انگیل نے وضع کیے تھے۔

غرض لوگ دعا کرتے ہیں کہ خدا بیماری سے بچائے۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا بیمار سے۔ بچائے مطلب کہ اس تیمار دار کلاس سے بچائے!

(انتخاب از "ہنستے ہنستے")

برق آشیانوی

ہمارا خیر مقدمی جلسہ

خیر مقدمی جلسے اور تعزیتی جلسے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا. سوائے اس کے کہ تعزیتی جلسے میں کسی خوش نصیب کے مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے جبکہ خیر مقدمی جلسے میں کسی بدنصیب کے مرنے کا بھی انتظار نہیں ہوتا. اس لحاظ سے تعزیتی جلسے کے مقابلے میں خیر مقدمی جلسہ آسان ہوتا ہے. اگر کسی اتفاق سے ان دونوں جلسوں کو ایک ساتھ کرنے کا موقع مل جائے تو بہت کم خرچ میں کام چل جاتا ہے. ایک مقامی انجمن نے ہماری کتاب شائع ہونے کے بعد پورے ایک سال تک انتظار کیا کہ اگر اس دوران میں ہمارا انتقال ہو جائے تو خیر مقدمی جلسہ اور تعزیتی جلسہ دونوں ایک ساتھ کریں گے تاکہ دو علیحدہ جلسوں کے بجائے ایک ہی جلسہ سے نصف اخراجات میں کام چلالیں چنانچہ کارکنان انجمن نے ایک سال بڑی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں گزارا. ہماری خرابی صحت سے توی امید تھی کہ دو چار سال پہلے ہی یا اس کے کچھ بعد ہمارا انتقال ہو جاتا. اور جب ہماری کتاب چھپ گئی تو ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب ہمارا انتقال ہو جانا نہایت ضروری ہے. کیونکہ کتاب چھپوانے کے بعد جو حالات پیدا ہوتے ہیں ان میں کسی شریف اور غیرتمند ادیب کے بقید حیات رہنے کی بہت کم توقع رہتی ہے. وہ ادیب بے وقوف یا بے غیرت ہوتا ہے جو کتاب چھپوانے کے بعد بھی زندہ رہے اور پورے ایک سال تک زندہ رہے. کتاب شائع ہونے کے بعد اراکین انجمن نے ہم پر کڑی نظر رکھنی شروع کی دو چار روز اگر ہم نظر نہ آتے تو خوش ہو جاتے کہ دو ایک روز میں ان کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی. اگر ایک ہفتہ گزر جاتا تو ہمارے بچوں سے بار بار دریافت کرتے کہ ہمارا انتقال ہونے میں ابھی کتنا عرصہ باقی ہے. بلکہ بعض وقت یہ بھی پوچھ لیتے کہ کیا رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے تاکہ اس کار خیر میں خود بھی ہاتھ بٹائیں. ہفتے عشرے کے بعد جب ہم انھیں اچانک بازار میں نظر آ جاتے تو ان پر ایک المناک مایوسی چھا جاتی. بعض حضرات تو نہایت قہر آلود نظروں سے ہمیں دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں "ظالم تو ابھی کب تک زندہ رہے گا؟"

تقریباً چھ ماہ قبل کا واقعہ ہے کہ ہم حقیقت میں بیمار ہو گئے تو محلے کی ایک سن رسیدہ خاتون نے رائے دی کہ ہمارے انتقال کی افواہ پھیلا دی جائے. کیونکہ یہ ایک قسم کا ٹونا ہے جس سے نہ صرف بیماری سے صحت ہو جاتی ہے بلکہ عمر میں بھی سو دو سو سال کا اضافہ ہو جاتا ہے. انہوں نے نہ صرف رائے دی بلکہ اپنے طور پر اسی شام کو ہمارے انتقال

کی خبر نشر فرما دی۔ دوسرے روز شام کے وقت ہم باہر نکلے تو دیوار پر ایک بڑا سا پوسٹر لگا ہوا دیکھا جس کا عنوان تھا "برقؔ آشیانوی کا جلسہ تعزیت"۔ ابھی ہم پوسٹر پڑھ ہی رہے تھے کہ ایک صاحب آکے ہمارے بازو کھڑے ہوگئے اور پوسٹر کا عنوان پڑھ کر نہایت سادگی کے ساتھ پوچھا "برقؔ صاحب۔ آپ کا انتقال کب ہوگیا!" ہم نے کہا، "بھائی صاحب۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرا انتقال کب ہوا ہے۔ پورا پوسٹر پڑھ لوں تو بتاؤں" پوسٹر کو شروع سے آخر تک پڑھ لینے کے بعد بھی ہمیں یہ راز معلوم نہ ہوسکا کہ ہم نے کون سے مبارک دن اور کون سی تاریخ کو انتقال فرمایا اس لیے کہ پورے پوسٹر میں ہمارے انتقال کی تاریخ کہیں بھی درج نہ تھی۔ البتہ ہمارے تعزیتی جلسے کا دن اور تاریخ ہی نہیں بلکہ وقت مقررہ اور مقام بھی درج تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہمارے انتقال سے کسی کو کوئی ہمدردی نہ تھی البتہ دلچسپی ضرور تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ ہمارا تعزیتی جلسہ کر ڈالیں۔ پوسٹر دیکھ کر خاموشی کے ساتھ ہم اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔ اس لیے کہ اب ہمارا انتقال ہوچکا تھا اور کم از کم تعزیتی جلسے کے خیر و خوبی کے ساتھ انجام پانے تک ہمارا گھر کے باہر نظر آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیوں کہ اراکین انجمن میں سے اگر کوئی ہمیں زندہ دیکھ لیتا تو اسی وقت ہمارا گلا گھونٹ کر ہمیں مار ڈالنے سے دریغ نہ کرتا تاکہ تعزیتی جلسے کے انعقاد میں ہم کسی رکاوٹ کا سبب نہ بن سکیں۔

گھر میں داخل ہونے کے بعد ہمیں اپنے انتقال سے بیحد صدمہ ہوا۔ کچھ دیر تک تو بیٹھے اپنے آپ پر آنسو بہاتے رہے۔ اگر اس طرح بے موت مرنا تھا تو پیدا ہی کیوں ہوئے تھے۔ قاعدہ ہے اگر کسی پر آنسو بہانا ہو تو اس کی نیکیاں یاد کیجاتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم نے اپنی نیکیاں یاد کرنے کا ارادہ کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ دور دور تک کہیں کسی نیکی کا پتا نہ تھا ساری زندگی صحرائے بے آب و گیاہ کی طرح نیکی سے خالی نظر آئی۔ البتہ سراب کی طرح دھوکے اور فریب کا چمکتا ہوا ریگزار معلوم ہوئی۔ اسی فریبی چمک کو ہم اپنی زندگی میں نیکی سمجھ کر خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ پھر ہم نے طے کیا کہ نیکیاں نہ سہی برائیاں ہی یاد کریں۔ جب برائیوں پر نظر ڈالنے کی کوشش کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہم نے کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی۔ اب ہم نے یہ کہہ کر دل کو بہلایا کہ "دنیا میں سب سے بڑی نیکی یہی ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی برائی نہ کی جائے۔ اس خیال سے ایک گونہ تسلی ہوئی تو ہم نے کھل کر رونا شروع کردیا۔ چوں کہ ہم شاعر بھی تھے اس لیے رونے کے لیے مرزا غالبؔ کا وہ انداز اختیار کیا جو انہوں نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

جب ہم نے بستیوں کو ویران کردینے کی ٹھان لی تو سب سے پہلے اپنا ہی گھر ویران ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس لیے کہ گھر میں آنسوؤں کے سیلاب کی سطح خطرناک حد تک اونچی ہوگئی۔ بیوی دوڑی دوڑی آئیں اور کہنے لگیں کہ "اٹھیئے موسیٰ ندی (اتفاق سے ہمارا نام بھی موسیٰ ہے اور موسیٰ ندی ہمارے شہر کے عین وسط میں سے گزرتی ہے) میں سیلاب آگیا ہے اور پانی ہمارے گھر میں داخل ہوگیا ہے۔ جب ہم نے دیکھا سب سے پہلے ہمارے ہی گھر کے زیر آب ہوجانے کا خطرہ ہے یا یوں کہیئے کہ ہمارا ہی بیڑا غرق ہونے والا ہے تو ہم نے بستیوں کو ویران کرنے کا ارادہ ترک کردیا یعنی یہ کہ فوراً رونا بند کردیا سیلاب کی سطح کم ہوتے ہوتے خطرے کی حد سے نیچے اتر گئی اور رفتہ رفتہ پوری طرح اعتدال پر آگئی تو ہم نے بیوی کو سمجھایا کہ سیلاب ویلاب کچھ نہ تھا بلکہ یہ ہمارے رونے اور آنسو بہانے کا کرشمہ تھا۔ یہ سنتے ہی بیوی پریشان ہوگئیں اور کہنے لگیں "خدا کے واسطے یہ بتایئے کہ آپ کیوں رو رہے تھے"؟ ہم نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا انتقال ہوگیا ہے" یہ خوشخبری سنتے ہی وہ خوشی سے پھول گئیں۔ لیکن ظاہرداری کے لیے رونی صورت

بنا کر کہا" خدا کے واسطے ایسا مذاق نہ کیجئے" ہم نے کہا "یہ مذاق نہیں حقیقت ہے" "تم ہماری بات کو ہمیشہ مذاق ہی سمجھتی ہو۔ یقین نہ آئے تو باہر جا کر دیوار پر ہمارے انتقال پُر ملال اور تعزیتی جلسے کا پوسٹر دیکھ لو۔ پوسٹر دیکھ کر واپس آئیں تو ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگیں کیونکہ ان کو ہمارے مقابلہ میں پوسٹر پہ زیادہ اعتبار آ گیا تھا ہم نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ ہم زندہ ہیں تو انھوں نے بادلِ ناخواستہ یقین کر لیا۔

اب ہم یہ سوچنے لگے کہ کسی طرح ہم بھی اپنے تعزیتی جلسے میں شریک ہوں۔ اگر یہ جلسہ دلّی میں ہوتا جہاں ہمیں شخصی طور پر کوئی نہیں جانتا، لوگ صرف ہمارے نام سے واقف ہیں تو ہم بلاتکلف جلسے میں شریک ہو جاتے مشکل یہ تھی کہ اپنے ہی محلے کا معاملہ تھا جہاں ایک سے ایک پرانا شناسا موجود تھا جو ہمیں ہر رنگ میں دیکھ چکا ہے۔ بہت دیر تک غور کرنے کے بعد ایک ترکیب سمجھ میں آئی کہ کیوں نہ ہم اپنی داڑھی مونڈھ لیں تاکہ لوگ ہمیں پہچان نہ سکیں یہ طے کر کے ہم نے اپنا پُرانا زنگ آلود شیونگ سیٹ نکالا اور چہرے پر پھیر کر اسنو اور پاؤڈر لگا لیا۔ آئینہ میں دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی کہ سر کے کالے کالے بالوں کے ساتھ گورے گورے گالوں نے ہمیں ساٹھے سے پاٹھا بنا دیا۔

غرض لباس میں بھی ضروری تبدیلیاں کر کے شام کو ہم گھر سے نکلے اور چند قدم کا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک صاحب نے آواز دی "میاں السلام علیکم" ہم بہت گھبرائے اور دل ہی دل میں کہا "ہائے رے پکڑے گئے" مری ہوئی آواز میں جواب دیا "وعلیکم السلام" اتنے میں وہ صاحب قریب آ گئے اور دریافت کیا "آپ برق آشیانوی کے صاحبزادے ہیں۔ نا ؟" اب ہماری سمجھ میں بات آ گئی، چنانچہ ہم نے اور مری ہوئی آواز میں جواب دیا "جی ہاں" انھوں نے کہا "میں نے صورت دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میاں تم تو والد کا بالکل مثنیٰ ہو۔ بس ذرا سی سفید داڑھی لگا دی جائے تو پورے برق آشیانوی نظر آؤ گے" کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئے پھر درد بھری آواز میں کہا "میاں۔ مجھے انتقال کی اطلاع ہی نہ ملی ورنہ میں ضرور میت میں شریک ہوتا۔ آج پوسٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ برق آشیانوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ہاں یہ بتاؤ۔ کب اور کیسے ہوا ؟" ہماری زبان سے بے خیالی میں نکلا "جی۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ میرا انتقال ..." ہم آگے کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ انھوں نے ٹوک دیا "کیا کہہ رہے ہو میاں" ؟ اور ہم "جی۔ جی میرا مطلب ہے کہ والد صاحب ..." کہہ کر خاموش ہو گئے۔ انھوں نے کہا "ہاں۔ ہاں۔ والد صاحب کہو" تب ہم نے سنبھل کر کہا "جی ہاں"۔ جی ہاں۔ والد کا انتقال . . . یوں سمجھئے کہ بس پرسوں ہی ہو گیا" کچھ دیر کے لیے رک کر انھوں نے کہا "میاں ایک بات عرض کروں" ہم نے کہا "فرمایئے" تو فرمایا "آپ کے والد صاحب نے مجھ سے پچاس روپے قرض لیے تھے۔ اگر آپ لوٹا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی" ہمیں اس پر بے حد غصہ آیا ہم نے اس نامعقول آدمی سے کوئی قرض نہیں لیا تھا۔ ہم نے چل کر کہا "لیکن قبلہ والد صاحب نے تو یہ فرمایا تھا کہ آپ پر ان کے دو سو روپے باقی ہیں۔ یہ سن کر وہ گھبرائے۔ اور کہا "خیر جانے دو میاں۔ اب کیا لینا دینا ہے۔ خدا حافظ" اور آگے بڑھ گئے۔

ہم نے جلسہ گاہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچے تو گیٹ پر مہمانوں کے استقبال کے لیے معتمدِ انجمن کھڑے ہوئے تھے۔ اتفاق سے وہ ہمارے قریبی عزیز بھی تھے۔ ہمیں پہچان لیا اور ہماری گردن میں ہاتھ دے کر ہمیں باہر لے آئے اور کچھ دور لے جا کر کہا "محترم آپ کو چاہیئے تھا کہ کم از کم جلسۂ تعزیت ختم ہونے تک تو آپ گھر ہی میں بیٹھے رہتے" ہم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو وہ خوشامد پر اُتر آئے اور صاف صاف یہ بات بتا دی کہ آج کے جلسۂ تعزیت میں کم از کم پانچ ہزار روپیہ ہمارے اہل و عیال کو کیسۂ زر پیش کرنے کے لیے جمع کیے جا رہے ہیں جس میں سے

پانچ سو ہمارے اہل و عیال کو دیئے جاکر باقی دو، لوگ آپس میں بانٹ لیں گے اس پر ہمیں طیش آگیا اور ہم نے بگڑ کر کہا۔ پانچ ہزار میں سے صرف پانچ سو دیں گے آپ؟" انہوں نے کہا۔ "اور نہیں تو کیا پورے پانچ ہزار آپ کی نذر کر دیں؟" ہم نے کہا "نہیں کم از کم ففٹی ففٹی!" بڑی مشکل سے دو ہزار روپے میں سودا طے ہوا اور ہم واپس آگئے۔ اس واقعہ کو چھ ماہ گزر گئے اور کتاب شائع ہونے کے بعد پورا ایک سال گزر گیا تو انجمن کے کارکنان کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہم میں شرافت ہے نہ غیرت۔ جو شخص کتاب چھپوا کر ایک سال تک زندہ رہ جائے اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں انتقال کرے گا۔ چنانچہ بے زار ہو کر انہوں نے طے کیا کہ ہمارا خیر مقدمی جلسہ کر ہی ڈالیں۔

ایک روز صبح کے وقت ہم کام و دہن کی آزمائش میں مصروف تھے کہ مردانے سے کال بل بجنے کی آواز آئی۔ ہم نے عجلت میں دو چار نوالے زیادہ ہی کھا لیے اور باہر نکل کر دیکھا تو معتمد انجمن موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی مسکرا دیا۔ مسکرانے کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مرد آپ کو دیکھ کر مسکرائے تو آپ کے جیب کی خیر نہیں اور اگر کوئی عورت آپ کو دیکھ کر مسکرائے تو پھر جیب کے ساتھ جان کی بھی خیر نہیں۔ چونکہ بعض زندہ شہادتوں کی بناء پر ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ معتمد صاحب مرد ہیں اور اسی بنا پر انجمن کے معتمد منتخب ہوئے ہیں انہوں نے بلا کسی تمہید کے فرمایا "میں ایک کار خیر کے لیے حاضر ہوا ہوں" ہم نے کہا فرمائیے۔ تو فرمایا "ہم آپ کا خیر مقدمی جلسہ کرنا چاہتے ہیں"۔ ہم نے کہا "ضرور کیجئے"۔ یہ سنتے ہی انھوں نے کہا "سو روپے نکالیئے" ہم نے گھبرا کر پوچھا "سو روپے کس بات کے"؟ تو انھوں نے کہا "اور نہیں تو کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کا خیر مقدمی جلسہ مفت ہو جائے گا؟" ہم نے کہا "خیر مقدمی جلسے کے اخراجات تو آپ کو برداشت کرنے چاہئیں۔ مجھ سے آپ یہ رقم کیوں مانگ رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑے اور کہا "برق صاحب! آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ جو بڑے بڑے خیر مقدمی جلسے ہوتے ہیں تو کیا کوئی انجمن ان کے اخراجات برداشت کرتی ہے۔ اجی حضرت پورے اخراجات خود اسی شخص کو برداشت کرنے پڑتے ہیں جس کا خیر مقدمی جلسہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ ہم نے تو بعض ایسے خیر مقدمی جلسے بھی کئے ہیں کہ نہ صرف اخراجات پورے ہوئے ہیں بلکہ دو چار سو روپے کی بچت بھی ہوئی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ سستے چھوٹ رہے ہیں۔ اس لیے کہ نہ صرف پورے سو روپے خرچ ہو جائیں گے بلکہ ہمیں بھی اپنی جیب سے کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔" اس پر ہم سنجیدہ ہو گئے اور کچھ اپنے خانگی و غیر خانگی حالات پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "اب میں اس قابل نہیں ہوں کہ سو روپے کا بار برداشت کر سکوں"۔ ہمارا مرثیہ سننے کے بعد معتمد صاحب نے کہا "اچھا خیر پچاس روپے دیجئے" ہم نے دیکھا کہ اب بھاجی ترکاری کی طرح مول تول شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم نے جواب دیا "بھائی صاحب! پچاس روپے دینا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ سو روپے۔" انھوں نے کہا "کم از کم پچیس تو دیجیے۔" اب ہم نے ایکٹنگ شروع کر دی اور رونی صورت بنا کر کہا "میاں پچیس روپے دینا بھی محال ہے۔ ابھی ابھی اہلیہ نے چاول کے لیے پچیس روپے مانگے اور ہم نے اپنی ساری پونجی جو صرف پانچ روپے پر مشتمل تھی انھیں بتلادی تو وہ پیر پٹکتی ہوئی چلی گئیں ہیں اور ہم اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ آج دوپہر میں کھانا بھی ملے گا یا نہیں۔ اگر نہ ملے تو آپ ہی کے گھر مہمان ہوں گے۔" [illegible] ہوئے ہم نے جیب میں رکھے ہوئے دس دس کے نوٹوں کے درمیان سے پانچ روپے کا نوٹ احتیاط کے ساتھ نکالا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ معتمد صاحب نے فوراً وہ پانچ روپے کا نوٹ اٹھا لیا اور کہا "چلئے پانچ روپے ہی سہی"۔ پانچ روپے لیکر جب وہ باہر نکلے تو ان کے ساتھی جو منتظر کھڑے تھے، دریافت کیا

کیا دیا؟" یہ سوال ہمیں صاف سنائی دیا۔ ہم جواب سننے کے لیے متوجہ ہو گئے معتمد صاحب نے کہا "صرف پانچ روپے" ایک صاحب نے کہا "چلو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی"۔ یہ سن کر ہم دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ لنگوٹی پر بلا ٹلی ورنہ معتمد صاحب تو پاجامہ ہی اتار لینا چاہتے تھے۔

غرض جب پورے تزک و احتشام کے ساتھ ہمارا خیر مقدمی جلسہ منایا گیا تو نہ صرف ہمیں اپنی شادی کی تقریب یاد آگئی بلکہ اپنی کتاب چھپوانے کا غم دور ہو گیا اور دوسری کتاب چھپوانے کے لیے سر کھجانے لگے۔

(انتخاب از "پتے کی بات")

==

سید عزیز محمد عزیز مہدوی

برق آشیانوی مرحوم

اے مفکر اے مدبر اے بہی خواہِ زماں
موت نے لوٹا ہے تیری حسرتوں کا کارواں
ہے درخشاں رفعتوں میں طالعِ حضرت سلیم
ذکر ہوتا ہے اب ان کا آسماں در آسماں

اس لیے چھایا ہوا ہے قوم پر رنج و ملال
حضرتِ موسیٰ ید اللہی کا بھی ہے انتقال
وہ نہیں ہیں لیکن ان کا نام زندہ رہ گیا
کام ایسے تھے کہ ان کا نام زندہ رہ گیا
آیئے ہم اک زباں ہو کر دعا مانگیں سبھی
رحمتیں نازل ہوں اُن پر تیری اے ربِ غنی
خُلد میں ان کو عطا کر نعمتیں ربِ جلیل
اے خدا پسماندگاں کو کر عطا صبرِ جمیل

بر سانحۂ ارتحال فقیر حضرت الحاج سید موسیٰ کلیم یداللّٰہی المعروف بہ برقؔ آشیانوی مرحوم

عہدِ گُل کے بعد

اہلِ چمن سے کل یوں مخاطب ہوئی بہار
اِنسانیت کے باغ کا ہر گُل ہے داغ دار

سُنبل کی زُلف بکھری ہے نرگس ہے اشکبار
نسرین آبدیدہ تو جوہی ہے سوگوار

کس کو مفر ہے موت سے اور کس کو ہے قرار
ہر اک نفس کو موت سے ہوتا ہے ہمکنار

کس کو بتاؤ سانس پہ اپنی ہے اختیار
بے کس ہو بے نوا ہو کوئی یا ہو شہریار

آنکھیں ملا سکا نہ کوئی فرد موت سے
بے معنی اِس کے روبرو ہے سب کا اقتدار

اِس دورِ بے ثبات میں کچھ ایسے بھی ہیں لوگ
کرتے ہیں زندگی سے زیادہ اجل سے پیار

ہر سانس جن کو موت سے اُلفت تھی ہم نشیں
اہلِ جہاں نے برقؔ کا اُن میں کیا شمار

مصداقِ باقیات تھی فطرت کلیمؔ کی
اعمالِ نیک بن گئے خود اُس کی یادگار

یہ ایک تبسم ہو کہ ارشادِ[1] مکرر
دکھلا رہے ہیں ندرتِ تخییل کی بہار

گل ہائے عقیدت کا چمن برقِ قلم
سیرت شہِ نصرتؒ کی ہے ایمان کا گلزار

دیکھے تو کوئی عشق کی آگ اُس کی حقیقت
ایثار و محبت کے ہے جذبات سے سرشار

اِک اور شاہکارِ قلم ہے "ہنسنے کی بات"
طنز و مزاح میں آئی ہے جس سے نئی بہار

وہ جس نے، ہنستے ہنستے دیا درسِ حوصلہ
ملت کے پاس جس سے بڑھا برقؔ کا وقار

تحریر، جو نہ کرنا تھا، اُس میں بلا کی ہے
اہلِ قلم نے مان لیا جس کو شاہکار

دیکھو ورق ورق پہ ہے فردوسِ فکر و فن
اردو زبان کی اس سے حقیقت ہے آشکار

اُس پر پڑی جو مہرِ ولایت کی روشنی
گیسوئے فکر جس سے ہوئے اور تابدار

وہ تذکرہ کہ جس سے ہے نسبت کا سلسلہ
شانِ یداللّٰہی کا ہے غماز بار بار

تعلیمِ دینِ مہدیؑ کی درسی کتب ہیں کیا
حسنِ نگارشات کی تمثیل خوشگوار

تصنیف ہے جو سیرتِ مہدی علیہ السلام
اُس سے کھلا ہے عقدۂ دیدارِ کردگار

دیدار جن کا جلوۂ دیدارِ ذات ہے
وابستہ اُن سے ہو گیا برقِ وفا شعار

اِس گلستاں میں کیا ہے مجیبؔ عہدِ گل کے بعد
تنہا سِسک رہی ہے ہر اک شاخِ مشکبار

مجیب عارفی (حیدرآباد)

---

[1] بہ اعتبارِ ضرورتِ شعری مکررِ ارشاد کو ارشادِ مکرر باندھا گیا۔

برق آشیانوی

جوابِ شکوہ (اردو کا)

بہ جواب "شکوہ" از طالب خوندمیری

حُسنِ گویائی ہے فطرت کا پُرانا دستور   گر شکایت ہے تو لہجہ بھی ہو سنجیدہ ضرور
شکوہ اُردو کا کرے کوئی تو لازم ہے شعور   گاتے ہیں راگ مرا سب ہی بہ صد شان و غرور
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی اُردو سے محبت کا تمہیں پاس نہیں

اُردو والو! یہ بتاؤ کہ تمہارے بچّے   شہر کے کون سے اسکول میں ہیں سب پڑھتے
یہ بتاؤ تو مجھے میڈیم اُن کا کیا ہے   کیا اُنہیں آتی ہے اُردو کی الف بے تے ثے
تم ہی جب مجھ سے ہو غافل تو یہ شکوہ کیسا
میری ہی ذات پہ یہ ظلم، یہ رونا کیسا؟

مشن اسکول چھڑاؤ تو کرو پھر شکوہ   اردو بچوں کو پڑھاؤ تو کرو پھر شکوہ!
آگے اُردو کو بڑھاؤ تو کرو پھر شکوہ   پرچم اُردو کا اُٹھاؤ تو کرو پھر شکوہ
تم میں تو کوئی مرا چاہنے والا ہی نہیں
مدرسے اردو کے موجود ہیں طلباء ہی نہیں

میرے اسکولوں میں پڑھتے ہیں تو بیچارے غریب   جن کی بگڑی ہوئی تقدیر ہے پھوٹے ہیں نصیب
اہلِ ثروت تو نہیں آتے مرے گھر کے قریب   مشن اسکول پہ مرتے ہیں اردو کے حبیب
امراء نشۂ دولت میں ہیں میرے دشمن
دے کے اک موٹی رقم لیتے ہیں "واں اڈمیشن"

نام میرا ہے زبانوں پہ مگر دل ہی نہیں   اردو سکھلائیں کسے آپ تو مائل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں   جس سے تعمیر ہو اُردو کی یہ وہ گل ہی نہیں
اردو، سکھ ہندو، مسلماں کی نہ عیسائی کی
اس کا حق دار ہے بھارت کا تو ہر اک شہری

مجھ سے کب پیار ہے انگلش ہی تمہیں پیاری ہے   نام سے اُردو کے ہر گام پہ بیزاری ہے
میرا جو بوجھ ہے ہر شانے پہ اب بھاری ہے   سب ریاکاری ہے میری یہ جو دل داری ہے
ویسے تم سب نے بنایا مجھے اپنی لیلا
رنگ ہوتا ہی چلا جاتا ہے میرا میلا

تم ہی اب مجھ سے بچا لیتے ہو دامن اپنا　　میری شاخوں سے اٹھایا ہے نشیمن اپنا
اپنے ہاتھوں سے جلا ڈالا ہے خرمن اپنا　　تم نے خود کر دیا ویران یہ گلشن اپنا
تم تو ہندو بھی ہو سکھ بھی ہو مسلمان بھی ہو
کیا کوئی تم میں ہے اردو کا پرستار؟ کہو

چند اخبار ہیں اور چند رسالے جاری　　لیکن ان کی بھی خریداری ہے تم پہ بھاری
ذہن پر سب کے فرنگی کا ہے جادو طاری　　سب کو انگریزی کے اخبار کی ہے بیماری
لب پہ اُردو ہے مگر کرتے ہیں انگلش گھاتیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی ہیں باتیں

وہ بھی کیا دن تھے کہ میں پیکرِ رعنائی تھی　　نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھی
اتحادِ دلی اور رشتۂ یکتائی تھی　　جو بھی ملت تھی، مرے نام کی شیدائی تھی
تم نے ہی چھوڑ دیا تھام کے دامن میرا
دیکھتے دیکھتے ویراں کیا گلشن میرا

میں تو بازار میں پیدا ہوئی پروان چڑھی　　سرپرستی کسی سرکار کی حاصل نہ ہوئی
خود ہی چلتی ہوئی درباروں میں بھی جا پہنچی　　نکلی بازاروں سے اور شاہوں کے سر پہ بیٹھی
وقت و ماحول نے کتنوں کا بھرم توڑ دیا
کیسے کیسوں نے مرے آتے ہی دم توڑ دیا

اپنی خود داری کو بھولوں، کوئی امکان نہیں　　ہاتھ پھیلاؤں کہیں اتنی میں نادان نہیں
بھیک مانگوں میں کسی سے یہ مری شان نہیں　　جل گئی بان تو کیا اب بھی مٹی "آن" نہیں
کسی صورت نہیں دامن میں سمٹنے والی
میں زباں وہ ہوں مٹائے نہیں مٹنے والی

سامنے ہاتھ کسی کے نہ کبھی پھیلایا　　"حق" جتا کر کبھی میں نے نہ کسی سے "مانگا"
اپنے شیدائیوں کے دل پہ بٹھایا سکہ　　دونوں ہاتھوں سے لٹایا ہے خزانہ اپنا
شاہ و راجہ ہو کہ محتاج و غنی ایک ہوئے
میرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

میں تو صرف ایک زباں ٹھہری مری کیا ہے مجال　　میری کیا حیثیت آجاتا ہے قوموں کو زوال
اس میں کچھ شک نہیں ہے آج ہوں تھوڑی سی نڈھال　　اب بھی دنیا میں ہے پھیلا ہوا میرا ہی جال
کون سا خطہ ہے دنیا میں جہاں اردو نہیں
غور کر کے یہ بتاؤ کہ کہاں اردو نہیں

اب بھی ہر ایک کے دل پر ہے حکومت میری　　آج کے دور میں بھی ہے وہی حالت میری
چہرے ہو جاتے ہیں فق دیکھ کے صورت میری　　چاٹنے لگتے ہیں لب اتنی ہے لذت میری
شکوہ میں تم سے کروں یہ تو مری شان نہیں
یہ مری شان نہیں ہے مرے شایان نہیں

پہلے تم نام پہ اردو کے تو مرنا سیکھو　　تیرتے ہو تو سمندر میں ابھرنا سیکھو
کون سے وقت پہ کیا کرنا ہے کرنا سیکھو　　اپنا خونِ جگر اس جام میں بھرنا سیکھو
جنگ جاری ہے، سنبھالے رہو تم میرا علم
میں تمہاری ہوں، تمہارے ہیں مرے لوح و قلم

▲▲

ڈاکٹر مجاہد شاہد وشت

[تبصرہ]

مُسکراہٹ ہی مُسکراہٹ

مرتب : اندر جیت لال
سنہ اشاعت : ۱۹۸۶ء
صفحات : ۱۳۶ سائز : ۱۸×۲۲/۸ آفسٹ چھپائی، رنگین دیدہ زیب گرد پوش
قیمت : ۴۰ روپے
پبلشر : سادھنا پبلی کیشنز D-41 گل مہر پارک، نئی دہلی 110049
ملنے کا پتہ : ۱. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔ ۶
۲. ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولہ مارکٹ، دریا گنج نئی دہلی۔ ۲
۳. انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۔

"مسکراہٹ ہی مسکراہٹ" میں اکیس[؟] "مزاحیے" شامل ہیں۔ "اپنی بات" میں اندر جیت لال نے مجموعہ کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے۔ "مسکراہٹ ہی مسکراہٹ" میں مرتب نے بھگوان بدھ کے مجسمہ اور مونا لیزا کی مسکان کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے فطرت انسانی اور تبسم کا جائزہ لیا ہے اور شیکسپیر، سوامی وویکانند، ہومر، گولڈ اسمتھ کے اقوال کے حوالے سے اہمیت تبسم پر روشنی ڈالی ہے۔ لوکمانیہ بال گنگادھر تلک کے ایک واقعہ کو پیش کیا ہے جس میں تلک نے مسکراتے ہوئے اپنے وارنٹ گرفتاری کا سواگت کیا تھا۔

پطرس کے "کتے" "مشاعرہ منعقد کرتے ہیں"۔ "کل ہی کی بات ہے کہ رات گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر "طرح" کا ایک مصرع دے دیا۔۔۔ ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔۔ ایک کہنہ مشق استاد۔۔۔ پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔۔۔ ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔۔۔"

خواجہ حسن نظامی نے "ماڈرن معشوق" کا حلیہ پیش کیا ہے: "قد ایسا جیسا اخبار کا کالم، بال ایسے جیسے تنخواہ

ن تحنیف، پیشانی ایسی جیسے وہائٹ پیپر، بھویں ایسی جیسے اسمبلی ہال، پلکیں جیسے کا بلیک بُک، آنکھیں ایکشا نمبرون کے نغمے منے دو گلاس، نگاہیں کنزرویٹو گورنمنٹ کی پالیسی، رخسار بالشویک یا سرحدی سرخ پوش، ٹھوڑی برٹش ڈپلومیسی۔ ہونٹ ریزی کھانے کی لعل جیلی، دانت کانگریسی زبان کا جیل خانہ، گردن جودھ پوری برجس، چھاتیاں پنیر کی چکتیاں، کمر ہندوستان کا اتفاق، بالوں کی کتر شاہانہ کی جھاڑ، بالوں کا تیل جیسے بندر کے آنسو، چہرہ کا پاؤڈر ملکی ہمدردی، ایسا نازک جیسے خطاب پرست کا دل، ایسا ضدی جیسے پولیس کا سپاہی، ایسا بے وفا جیسے دیسی لیڈر، اور ایسا ہرجائی جیسے تنباکو اور ایسا منہ چڑھا جیسے چلنے کا پانی. چلتا ہے تو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا۔ دیکھتا ہے تو خوردبین ن جاتا ہے. بولتا ہے تو پیانو معلوم ہوتا ہے۔"

مشتاق احمد یوسفی نے "چارپائی اور کلچر" میں چارپائی کی قسمیں، اس کی افادیت، اس کا کلچر مزاح کی چاشنی میں ڈال کر پُرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔ چارپائی کی مرکزیت اور مشرقیت بھی خوب ہے۔

کنھیا لال کپور کا مزاحیہ "دوست رہنما فلسفی"، چچا افلاطون کے گرد بنے ہوئے چند لطیفوں کا گلدستہ ہے۔ چچا افلاطون تقریباً بوجہ جھگڑو سے ملتے جلتے ہیں ان کے پُرخلوص احمقانہ مشورے مزا دیتے ہیں۔ فکر تونسوی کا "گھر کا چور" نفسیاتی اُدھیڑ بُن پر مبنی مزاحیہ ہے۔ راجپوتی بیک گراؤنڈ کے باوجود خیال "دُزد" سے ہی خوف زدہ ہونا، الیوژن چور کی جگہ بیوی یعنی گھر کا چور فکر کے مخصوص انداز بیان نے مزیدار بنا دیا ہے۔

ابن انشاء نے "احوال خاندانِ مغلیہ" میں تاریخی واقعات کو مزاحیہ انداز میں پُرلطف بنا کر پیش کیا ہے ہمیوں اقبال کو موسٹے دایاں کہنا دلچسپ ہے۔ ابن انشاء نے کہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کو بابر کا شعر کہا ہے حالانکہ یہ بابر تخلص کسی شاعر کا ہے۔ فرقت کاکوروی نے "اور جب ہم بی اے پاس ہوتے" میں بے روزگار بی اے پاس کی ڈگری کا خوب مذاق اڑایا ہے۔ "بلکہ چاہیئے یہ کہ شادی کرتے ہی پہلے کھٹا کھٹ بچے پیدا کر ڈالیں۔" ایسے جملوں کی پھلجھڑیاں جگہ جگہ چھوٹتی نظر آتی ہیں۔ شوکت تھانوی کا مزاحیہ "سودیشی ریل" مزاحیہ سے زیادہ طنزیہ ہے۔ اس میں انڈین ریلوے کی خوب کھنچائی کی گئی ہے۔ شفیق الرحمٰن نے "ریڈیو" میں ریڈیو کا حلیہ بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ مگر بات کچھ بنی نہیں البتہ اول نے "تکیہ کلام" میں تکیہ کلام کی ایک لمبی فہرست پیش کی ہے جو پُرلطف ہے اور مزاح پیدا کرتی ہے۔

حضرت آوارہ کا مزاحیہ "مونچھیں" بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس میں طرح طرح کے انداز کی مونچھیں رکھنے کا شوق مونچھوں کی پابندی کا تذکرہ دلچسپ انداز میں کیا ہے "اور پھر مونچھوں نے بچہ دیا" تک بات پہنچتی ہے۔ حضرت آوارہ کی مونچھیں قابل دید ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے "ایڈیٹر" میں سقراط کے مکالمہ کے ذریعہ سے ایڈیٹر کا خاکہ اڑایا ہے۔ "راستے میں ایک بزرگ شکل سقراط کی، جثہ فانوس کا، بات بھٹیاروں جیسی، بحیثیت مجموعی ایسے کہ انھیں دیکھ کر نوجوان آمادۂ فساد ہوں۔" صدیقی صاحب کا مخصوص لب و لہجہ اور انداز بیان 'ایڈیٹر' کی مٹی پلید کر کے رکھ دیتا ہے۔ کرشن چندر "پرہیزی" میں ڈاکٹروں کی خوب خبر لیتے ہیں کہ "وہ ہر حال میں فیس طلب کر لیتے ہیں اور پرہیز کی آڑ میں مریض کو مارنا چاہتے ہیں۔"
یوسف ناظم اپنے مزاحیہ "ذرا مسکرایئے" میں فوٹوگرافر اور شاعر کا مطالعہ، شوقیہ و جبریہ تصویریں، تصویروں کی اہمیت کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین "قصہ داڑھ کے درد کا" میں یہ انکشاف کرتے ہیں کہ "جدید شاعری اصل میں داڑھ کے درد کی شاعری ہے۔"

راجندر سنگھ بیدی "بیوی یا بیماری" میں رقمطراز ہیں: "ہر شوہر بھائیوں کی [illegible]

سے جسے بیوی کہتے ہیں محبت کرتے چلے جاتے ہیں۔" وجاہت علی سندیلوی "شکر خدا کا" میں لکھتے ہیں ـــــ "ہمارے قصبے میں بجلی نہیں صرف بجلی کے بل آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر جو تارے نظر آنے لگتے ہیں انہیں سے کچھ روشنی میسر آجاتی ہے۔" سندیلوی صاحب نے ان مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے جہاں "شکر خدا کا" کہنا پڑتا ہے۔ پُرلطف مزاحیہ ہے۔ احمد جمال پاشا نے "جائیں تو جائیں کہاں" میں یہ وارننگ دی ہے "کوئی صاحب برائے مہربانی اس مضمون کو بآواز بلند نہ پڑھیں۔ ورنہ ان کے کسی بھی پڑوسی، رشتے دار یا دوست کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ خطرہ ہے کہ طیش میں سامع کو خوفِ خدا نہ رہے۔" راقم الحروف کا انشائیہ "تو سوچو ہے بلّی اور رنج" ایک سنجیدہ انشائیہ ہے۔ کہیں کہیں زیرِ لب تبسّم کی کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ انشائیہ میں مزاح کا پُٹ بھی ہوتا ہے۔ دلیپ سنگھ نے "معذرت نامہ" میں تبصرہ کے ذومعنی مطالب کا دلچسپ تجزیہ کیا ہے۔ آخری مزاحیہ اندرجیت لال کا ہے بعنوان "بھول گئے جب"۔ بھول جانا بھی ایک نعمت ہے۔ مضمون بھولکڑوں کے لطائف و ظرائف کا مجموعہ ہے جو واقعی بشاشت دیتا ہے۔

"مسکراہٹ ہی مسکراہٹ" کی مذکورہ بالا جھلکیاں ہی دل میں گدگدی پیدا کر دیتی ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مزاحیوں کا یہ مجموعہ قاری کو ہنسی کا گول گپّا بنانے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے ورنہ بقول شخصے ؎

یا تو دیوانہ ہنسے، یا تُو جسے توفیق دے
ورنہ اِس دنیا میں رہ کر مسکرا سکتا ہے کون؟

○○

اداریہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کے سابق نائب معتمد اور ممتاز مزاح نگار جناب برق آشیانوی مرحوم کے لیے ہم نے یہ شمارہ وقف کیا ہے۔ اس خصوصی شمارہ کے ذریعہ برق صاحب کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی شعری و نثری تصانیف کا انتخاب بھی اس شمارہ میں شریک ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے نامور مزاح نگاروں نے مرحوم کو اپنے خاص انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک ماہ کی قلیل مدت میں برق صاحب پر خصوصی شمارہ شائع کرنے کی جو جسارت کی گئی ہے، اس مساعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

برق صاحب کے انتقال کے دوسرے ہی دن زندہ دلانِ حیدرآباد کی تشکیل کے زمانہ سے وابستہ قدیم و سینیئر رکن رگھوبنسی نرل بھی ہم سے جُدا ہو گئے۔ [illegible] اکیڈیمی کا جب ادبی شعبہ قائم کیا گیا تو نرل اس کے کنوینر مقرر ہوئے تھے۔ رگھوبنسی نرل نے [illegible] پر منعقدہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے ابتدائی مزاحیہ مشاعروں کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ وہ بڑی خوبصورت غزلیں کہتے تھے۔ طبیعت کا لاابالی پن ان کی شہرت و شاعری کی ترقی میں مانع رہا۔ ادارہ شگوفہ ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

R. No. 15822/68
SHUGOOFA Hyderabad-1
Postal Regd. No. H. HD 6
Vol. 19 Copy 9
September 1986 Phone : 557716

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان
شگوفہ
ماہنامہ
جلد ۱۹
اکتوبر ۱۹۸۶ء
شمارہ ۱۰
ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین
کتابت: محمد سلیم، محمد عبداللطیف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
جنرل منیجر:
سمیع جلیل
قیمت فی پرچہ: ۴ روپے
زرِ سالانہ: ۴۰ روپے، بیرونِ ہند: ۱۲۵ روپے
منیجر (اعزازی):
فیاض احمد فیضی (بمبئی)
شگوفہ: ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۱
سرورق: طالب خوندمیری

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ
کشمیری قوام
تیار کنندگان:
پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس
گلزار حوض ۔ حیدرآباد
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

ایسی کی تیسی (نقد و نظر)

مالِ مفت (انشائیے)

مرا شہر لوگاں سوں . . . (شہر حیدرآباد)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چوُرن (منظومات)

زندہ دلانِ حیدرآباد کی
۱۷ ویں سالانہ تقاریب

۷ر اور ۸ر نومبر ۱۹۸۶ء بمقام نمائش میدان حیدرآباد
منعقد ہوں گی۔

اس موقع پر

نامور طنز و مزاح نگاروں کی نثری و شعری تخلیقات، کارٹون اور
لطیفوں سے مزین

ماہنامہ "شگوفہ" کا

سووینیر

شائع ہوگا۔
(دو رنگی سرِ ورق)

قیمت ۵ روپے * صفحات ۸۰

باپو کا مذہب
میرے مذہب کی کوئی جغرافیائی حدود نہیں ہیں۔
میرے مذہب کی بنیاد سچ اور عدم تشدد ہے۔
میرا مذہب مجھے کسی سے نفرت کرنے سے منع کرتا ہے۔
مذہب لوگوں کو جدا کرنے کے نہیں — اُن کو باہم جوڑنے کے لئے ہے۔
یہ تھا مہاتما کا مذہب
محبت اور بُردباری کا مذہب

رشید قریشی

قصّہ پیش لفظ لکھنے والوں کا

[رشید قریشی کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ "مزاحِ لطیف" سید ہاشم علی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پیش لفظ کے ساتھ زندہ دلانِ حیدرآباد کی جانب سے شائع ہو رہا ہے۔ پیش لفظ سے پہلے پیش لفظ لکھنے والے کا قصّہ بھی ہے۔ جو "شگوفہ" کے قارئین کے لیے بطور ٹریلر پیش ہے۔]

"مزاحِ شریف" میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس کا پیش لفظ (جائزہ) حنیف قتیل نے لکھا۔ مزاح فہمی اور مزاح سے فوری اثر پذیر ہونے کی صلاحیت کے باوجود قتیل صاحب نے سنجیدہ اور بلند پایہ ادب کے مقابلہ میں مزاحیہ کاوشوں کو کبھی قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ میرا ان کا معاملہ ایک الگ ہی سطح پر تھا۔ مزاجوں کے تضاد کے باوجود، ہم ایک دوسرے کے دوست، ہم جماعت اور ہوسٹل میں ایک ہی کمرہ کے مکین رہے تھے۔ میری ہر بات سے وہ محظوظ ہوتے۔ لیکن میری مزاحیہ تحریروں کو ادب کی کسوٹی پر جانچنے کا سوال آیا تو حامی بھرنے کے باوجود، یہ کام سرانجام ہی نہ ہو پاتا۔ میں روز ان کے گھر جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹہ خوش گپیوں کے بعد خالی ہاتھ لوٹ آتا۔

ایک دن انھوں نے کہا "میری بات مانو، ہاشم علی سے پیش لفظ لکھوا لو۔ مزاح نگاری کے میدان میں وہ بھی اُتر آیا ہے۔ ریڈیو پر میں نے اس کا ایک مضمون سُنا۔ ایسا شستہ، جامع اور پُرتکلف مزاح جیسے کلیاں کِھل رہی ہیں، خوشبو پھیل رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے بھی یہ مضمون سُنا۔ عزیز قریشی نے یہ مضمون ریڈیو کے لیے اُن سے زبردستی لکھوایا۔ اور اُن کا یہ جوہر بھی سورج کی روشنی میں آیا۔ لیکن میں اپنی اِس کتاب کا پیش لفظ، تمہارے جیتے جی کسی اور سے نہیں لکھواؤں گا۔" قتیل صاحب نے ہار مانتے ہوئے کہا۔۔۔ "اچھا بابا، میں ہی لکھ دوں گا، لیکن یہ اپنا ہاشم علی ایک ہی زندہ دل اور مہم پسند ہے۔ ایک مرتبہ اس کی باتوں میں آکر، میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔"

قتیل صاحب پیٹ کو ہاتھ سے دباتے ہوئے ہنسنے لگے۔ (دبا دکی ہنسی کو تھامنے کے لیے ان کا یہ خاص انداز تھا) اور مجھے اندازہ ہوگیا، یہ مصیبت بہت مزیدار رہی ہوگی۔ قتیل صاحب اس مصیبت کی رودادِ سنانے لگے۔ "ہاشم علی نے تخلص کی رعایت سے شاعری شروع کی تو مجھ سے اصلاح لینے لگے۔ یہ شخص شعر کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتا ہے لیکن شاعری اس کے بس کا روگ نہیں۔ رمضان کے دن تھے۔ ہم دونوں روزہ

افطار کے لیے [illegible] ۔ اِدھر اُدھر کچھ روزہ دار بھی [illegible] تھے۔
ہم بھی ایک کونے میں جا بیٹھے۔ افطار کی توپ دغی اور ہم پانی سے افطار کر کے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پیش امام صاحب
لاِ یکلف سُنا رہے تھے اور ہم اللہ میاں سے کہہ رہے تھے "یا اللہ روزہ خاص تیری عبادت ہے۔ تو ہی اِس کی جزا
دینے والا ہے۔ افطار تو جوں توں ہو گیا، اب کھانے کا کیا ہوگا؟ ... یا رزاق آج کا کھانا تیرے ذمے ہے۔ اللہ اکبر"
نماز ختم ہوئی تو سب نمازی تیز تیز رخصت ہو گئے۔ ہم دونوں ہی رہ گئے اور ایک صاحب بھی تھے جو مسجد کی دیوار سے ٹیک
لگائے ہمیں گھورتے کھڑے تھے ..... ہم بیٹھے کے بیٹھے ہی رہے اور ہم جاتے بھی کہاں۔ طعام خانہ کا کھانا تو منسوخ
کر آئے تھے۔ اب خانۂ خدا کے سوا ہمارا ٹھکانہ ہی کہاں تھا؟ وہ صاحب آہستہ آہستہ ہمارے قریب آئے۔ "کیوں صاحب
آپ لوگ کیا شمال سے آئے مسافر ہیں؟" میں نے کہا "نہیں صاحب ہم یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔" ہاشم علی نے پوچھا "اور
آپ کون صاحب ہیں؟" انھوں نے کہا "میں اس مسجد کا معتقد ہوں۔ آپ لوگ چونکہ نو وارد نظر آئے اس لیے یہیں ٹھیر گیا۔
ایسا ہے کہ رمضان کے سلسلے میں مسجد کے لیے نئی جا نمازیں بچھائی گئی ہیں۔" ہاشم علی سے نہ رہا گیا "جناب والا! یہ جو صاحب میرے
بازو میں، ان کا نام عبدالحفیظ اور تخلص قتیل ہے۔ ایم اے کے طالب علم ہیں اور خاکسار کو ہاشم علی کہتے ہیں اور تخلص اختر ہے
میں ایم ایس سی کا طالب علم ہوں۔" اس تعارف نے ان صاحب کو جیسے زمین سے اچھال دیا۔ لپک کر مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔
"قتیل صاحب مجھے معاف کیجیے۔ میں نے آپ کو شاعر نہیں پہچانا، پہچانتا بھی کس طرح؟ کیوں کہ شاعر بزرگو ہوتا ہے، اس قدر
بزرگوشت نہیں ہوتا اور جناب اختر صاحب، آپ بھی مجھے معاف فرمائیں۔ آپ کو میں نے ایک شریف طالب علم سمجھا۔ شاعر بالکل
نہیں۔ شاعر کو شاعر نظر بھی آنا چاہیے۔ ہے نا؟ چلیے۔ اب آپ لوگوں سے پردہ بے سود ہے۔ آپ دونوں میرے جانِ من ہیں
میں بھی شاعر ہوں لیکن پہلے یہ بتلائیے کہ یہاں کس کے انتظار میں بیٹھے ہیں آپ۔ ہاشم علی نے مختصر طور پر اپنی بپتا سنائی تو
انھوں نے کہا "ارے بھائی ایسی خوش قسمتی تو شاذ و نادر ہی واقع ہوتی ہے کہ ایک شاعر کو بیک وقت دو شاعر ہاتھ
لگیں اور دونوں روزہ دار، چلیے غریب خانہ چلیے اور طعام و کلام ماحضر سے ممنون و مشکور و ماجور کیجیے۔"

ہم دونوں اپنے میزبان کے ساتھ ... اُدھر ہی میں، ایک گھر میں داخل ہوئے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو جان
میں جان آئی لیکن صاحبِ خانہ اندر سے آئے تو ان کے ہاتھ میں، ایک ضخیم بیاض کو دیکھ کر، جان سے جان نکل گئی۔
چائے کے ایک دور کے بعد بیاض کھلی۔

حمد، نعت اور منقبت سے ابتدا ہوئی ..... چائے کا دوسرا دور ہوا۔ اس کے بعد غزل کا نمبر آیا۔ ہاشم تو
سہ غزلہ، کسی طرح سہہ گیا لیکن پھر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ اور جب شاعر نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "اختر صاحب اس
شعر پر آپ سے داد چاہوں گا" تو ان کو داد ملی ... خر خر ... خر۔ رات کے دو بجے نشست برخاست ہوئی
..... اور وہ اس ترکیب سے کہ شاعر صاحب دوسری بیاض لانے کے لیے اندر گئے اور میں ہاشم علی کو جگا کر [illegible]
میں نے بھی اجازت چاہی تو قتیل صاحب نے وعدہ کیا کہ کل تمھارا پیش لفظ تحسین دے دوں گا اور یہ وعدہ
انھوں نے پورا کیا۔

اب قتیل صاحب کے بیان کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کے ساتھ زندہ نہ سکوں اور مجھے یاد آگیا یہ وہی ہمارا میزبان شاعر ہے، جس نے ایک سخت آزمائش کے وقت ہمارے سامنے اپنا دسترخوان پھیلا دیا تھا۔ آج بھی میں اس سوچ کو لذت خیز بنانے کے قابل نہیں تھا کہ اگر یہ شخص نہ ملتا تو ہمارا کیا ہوتا؟

میں وہ درخواست لے کر گورنر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ درخواست کا مضمون سنایا اور ان کی شاعر نوازی کے واسطہ سے مناسب وظیفہ کی سفارش کی۔ گورنر صاحب نے پوچھا "کیا میں اس بدقسمت شاعر کے لیے کچھ کرسکتا ہوں" میں نے کہا "شاعر نے اپنی درخواست کے آخر میں یہ شعر لکھا ہے۔

اُس کی قسمت کو کیوں بُرا کہیئے
آپ چاہیں تو کیا نہیں ہوتا

گورنر صاحب کے ہونٹوں پر سمجھداری مسکرا اٹھی۔ انھوں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اختیاری فنڈ سے اس قابلِ رحم شاعر کو ڈھائی سو روپے ماہانہ تاحیات وظیفہ مقرر کیا جائے"

اور میں نے اس کی بھی اجازت لے لی کہ وظیفہ کی منظوری کا حکم اور چار مہینوں کی پیشگی رقم، میں شخصی طور پر شاعر کو دے آؤں۔

جب میں شاعر کے گھر پہنچا تو ۔ ۔ ۔ ۔ وہ وہی گھر تھا جہاں میں نے اور حفیظ صاحب نے رات کا کھانا کھایا تھا اور رات کے دو بجے تک اپنے شاعر میزبان کا پورا پورا دیوان زہر مار کیا تھا۔ جب میں اندر بُلایا گیا تو میں نے دیکھا، ہمارا وہی میزبان، خستہ حالی میں اپنی بے نُور آنکھوں سے مجھے دیکھنے کے لیے بیکل ہو رہا تھا۔ جب میں نے وظیفہ کے حکم کے ساتھ رقم اُس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بصارت اس کی آنکھوں سے چھن چکی تھی لیکن آنسوؤں کا چشمہ ابھی پورا سوکھا نہ تھا۔ اندھی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں تو بڑا درد انگیز منظر ہوتا ہے، ایسا نظر آتا ہے جیسے بصارت بہتی جا رہی ہے۔ میں نے باتوں کا سلسلہ چھیڑا "آپ کو یاد ہے یونیورسٹی کے دو روزہ دار طالب علموں کو آپ نے بیس سال پہلے اپنے دسترخوان پر کھانا کھلایا تھا" وہ سوچنے لگا ــــ

"ہاں ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ دو لڑکے ۔ ایک عینکی موٹا ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوسرا سانولا، دُبلا ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے کہا "آپ کے حافظے کی داد دیتا ہوں۔ خوب یاد رکھا آپ نے، اب سنئے میں وہ سانولا، دُبلا لڑکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔" شاعر نے اپنے بیٹے کو آواز دی "ارے بیٹے، کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔ یہ تو اپنے پُرانے مہمان ہیں۔ آج بھی ان کی مدارات ہونی چاہیئے۔ اس رات تو وہ سحر کئے بغیر ہی چلے گئے تھے"۔ لیکن میں نے معذرت چاہی اور چلا آیا۔

یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ اُس وقت، ایک احسان سے سبکدوش ہونے والا زیادہ خوش تھا یا ایک احسان سے لادا جانے والا! ــــ

یہ میرے پیش لفظ لکھنے والے کی کرداری عظمت کا واقعاتی نقش ہے جو تحریر میں اُترنے سے پہلے میرے دل پر مرتسم رہا ہے۔

احسان کو یاد رکھنا لازمی نہیں۔ اور یہ بھی آدابِ میزبانی میں شامل نہیں کہ راج بھون کے شاندار گیٹ سے لگی ہوئی سڑک اُپل تک کے ٹوٹے پھوٹے راستے سے گذر کر ایک چھوٹے سے بے رونق مکان کو اپنی منزل بنالے لیکن جامعہ عثمانیہ کے ایک سپوت نے اخلاقی شرافت کے اس تقاضے کو فرض کی

راح انجام دیا اور اس علمی تربیت گاہ کا نام روشن کر دیا جہاں سے نورتن کو آفتاب بنا کر نکالا گیا۔
میں نے ہاشم علی صاحب کو لکھا۔ ابھی تک پیش لفظ نہیں آیا ہے۔
میری بار کیوں دیر بھئی سافورے ؟ —— اور ——
ہاشم علی صاحب نے جواب دیا "یہ پہلی دفعہ ہے کہ میرے گھر سے ایک کتاب (مزاح لطیف) غائب ہوئی۔ شاید کوئی مزاح شناس چور آ گیا تھا۔ بہرحال تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ پیش لفظ حاضر ہے۔"
وائس چانسلر کے گھر سے کوئی خالی ہاتھ نہیں گیا۔ کسی کو کتاب ملی۔ کسی کو پیش لفظ۔

▲▲

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

★

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵	روپے
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹	"
قصہ مختصر	"	مضامین	۱۲	"
بالآخر	"	"	۱۴	"
تکلف برطرف	"	"	۱۴	"
قطع کلام	"	"	۱۲	"
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰	"
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸	"
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵	"
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲	"
سنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰	"
گویم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲	"
غبار حاضر	رؤف خوشتر	"	۱۲	"
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰	"
مطلع عرض ہے	ڈاور فگار	مجموعۂ کلام	۱۲	"
مزاح لطیف	رشید قریشی	مضامین	۲۰	"

علامہ زنج زہریلا
(حیدرآباد)

ہے قبض اگر تجھے تو دوا کر، دعا نہ مانگ
گر تجھ کو ہے یقینِ "اجابت" دوا نہ مانگ

کرنا پڑے گا تجھ کو دولتی کا سامنا
سروس میں اپنی افسرِ اعلیٰ گدھا نہ مانگ

پٹ جائے گا رقیبوں کے ہاتھوں بری طرح
گھر اُس کا آپ ڈھونڈ، کسی سے پتہ نہ مانگ

کچھ تو لپ اسٹک اور لبِ لعلیں میں فرق کر
یعنی ادائے کار سے حسنِ ادا نہ مانگ

گرنے لگیں جو بال تو لازم ہے احتیاط
ناخن کی بھول کر بھی خدا سے دعا نہ مانگ

جغرافیے کا جبر زبردست جبر ہے
اُپو گوڑے سے موسم دارالشفا نہ مانگ

پانی ہی کتنا آتا ہے نل میں عزیزِ من
کافی ہیں اک دو پیالیاں پیالے گھڑا نہ مانگ

صرصر ہے، لُو ہے، سوز ہے، شعلہ ہے آگ ہے
سرکارِ ین۔ٹی۔آر سے ٹھنڈی ہوا نہ مانگ

جگنو سے نغمہ مانگ نہ بلبل سے روشنی
اے زنج "لتا" سے بوٹی سوہن لتا نہ مانگ

نسیم سحر (جدہ)

تنہائیوں سے اتنا ڈری۔ ساتھ لے گئی
محبوب کو بھی جب وہ مری۔ ساتھ لے گئی

شوہر پہ کیس بھی یہ چلایا اُسی نے تھا
زچ نے کیا جب اُس کو بری ساتھ لے گئی

چمچوں کی چمکینوں کی ضرورت نہیں رہی
بیگم فنِ سیاہ گری۔ ساتھ لے گئی

تا عمر مرنے والی کو مجھ پہ شبہ رہا
اب اپنی ساری دیدہ وری ساتھ لے گئی

اندھی فقیرنی کو ملی تھی چونّیاں
کھوٹی گرا دیں اُس نے، کھری ساتھ لے گئی

خود تو جہیز لائی ہی کب تھی دولہن، مگر
دولہا کی بھی اُٹھا کے بری ساتھ لے گئی

تلاش کر کے لائے گی میرے رقیب کو
اچھا ہے گر وہ اُس کو مری ساتھ لے گئی

وہ تو بلا سے جاتی مگر یہ غضب ہوا
بچوں کو بھی وہ بھاگ بھری ساتھ لے گئی

عینک یہیں پہ چھوڑ کے وہ فوت ہو گئی
اور صرف اپنی بے بصری ساتھ لے گئی

ماضی سے وہ میاں کا تعارف کرائے گی
صندوقچی خطوں سے بھری ساتھ لے گئی

قالین کہہ کے گھر میں اُسے وہ بچھائے گی
لڑنے سے جو پرانی دری ساتھ لے گئی

اب یہ غمِ جدائی کے ٹانکے سئے گا کون
وہ جانِ جاں تو بخیہ گری ساتھ لے گئی

جاگا تو اِک چڑیل کو پایا ہے ہم سفر
دیکھا تھا میں نے خواب پری ساتھ لے گئی

بس اِک مجھے ہی چھوڑ گئی ہے دگرنہ وہ
جو چیز تھی جہاں بھی دھری ساتھ لے گئی

اُس نے نسیم پچھلا زمانہ بھلا دیا
جس دوست کو بھی تا عمری ساتھ لے گئی

میں بھی کچھ دخل در معقولات رکھتے۔ اُن کی سمع خراشی کام آگئی اور اعضل نے مجھے فون کیا تھا، ایک صاحب غالب کے اس مصرع کی تفسیر بنے ہوئے ہیں ؎ ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے۔ ساری کالونی کو شبن میاں، شبن میاں کی بے ہنگم صداؤں سے بیدار کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہ آخر شبن میاں ہیں کون ذات شریف؟ آپ کا خانساماں [illegible] جلدی سے دروازہ کھلوا کر ان صاحب کو جن کی حلق میں کسی کتے کا گلا اُترا ہوا ہے اگر بند غم سے نہیں تو پھر قید حیات سے نجات دلوا لیجیے۔"

ہم ٹیلیفون کا ریسیور رکھ کر کئی دروازے کھولتے ہوئے باہر پہنچے تو ملیشیا کے تازہ استری کیے ہوئے سفاری سوٹ میں ملبوس آتما رام کو مسکراتے ہوئے پایا۔ اُس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک چھوٹا ڈبا تھا اور اس نے مجھے دیکھتے ہی شکایت کی۔ "خوب گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں آپ؟ یہاں چیختے چیختے گلا بیٹھ گیا۔"

"اور یہ کال بیل کیوں نہیں بجائی تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے سوچا کہ اب آپ کو اتنے سویرے ڈسٹرب کون کرے؟ اور لیجیے اس ڈبے میں گرم گرم جلیبیاں ابھی تلوا کر لایا ہوں۔ بچوں کو جا کر فوراً دے دیجیے ورنہ یہ بھی ماسٹر پیارے لال کا کدو ہو جائیں گی۔"

اور پھر آدھ گھنٹے تک میرے ڈرائنگ روم میں میرا بچپن لوٹ آیا۔ ناشتے اور چائے کے درمیان آتما رام اور میں اپنی پچھلی شرارتوں اور حماقتوں پر دل کھول کر ہنستے رہے اور جب اس نے ماسٹر پیارے لال کا ایک واقعہ اپنے مخصوص انداز اور لہجے میں بیان کرنا شروع کیا تو میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی کئی مرتبہ چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

"ایش وہ گھاسی رام نہیں تھا، حقے کی طرح بیٹھ رہا جس کا کھیت تالاب کے کنارے اسکول کے راستے میں پڑتا۔ وہ کچھ سٹھیا گیا تھا اور اکثر جھوٹ موٹ واویلا مچایا کرتا کہ اسکول کے لڑکے میرا نقصان کرتے ہیں۔ ایک روز اُسے سبق پڑھانے کی نیت سے اندھیرے میں شاکر اور بسنت اس کے کھیت پر پہنچے اور تین کدو توڑ کر جھولوں میں رکھ لیے۔ خیال تھا کہ اُن کو لے جا کر اسکول کی فیلڈ میں پھینک دیں گے اور پھر انجان بن کر دن بھر ان کے متعلق ماسٹروں اور لڑکوں کی چہ میگوئیاں سُنیں گے۔

نالے والی پلی تک پہنچے تھے کہ دیکھا کہ ماسٹر پیارے لال اپنے گھر سے نکل رہے ہیں۔ جان ہی تو نکل گئی کہ اگر انہوں نے ہم لوگوں کو مالِ مسروقہ کے ساتھ پکڑ لیا تو مارے جانے کے علاوہ سارے اسکول کے سامنے مُرغا بھی بنائے جائیں گے۔ ہم لوگ پلیا کے نیچے دبک گئے لیکن پیارے لال جی اپنی چھڑی کو چرخے کی طرح گھماتے ٹیوشن پڑھانے دوسری طرف مڑ گئے۔ جان میں جان آئی تو ہمیں ایک دوسری شرارت سوجھی۔ جا کر تینوں کدو پیارے لال جی کے برآمدے میں رکھ دیئے اور بسنت نے پکار کر کہا، 'ماسٹر صاحب کے لیے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے کھیت کے کدو بھیجے ہیں' اور پھر ہم لوگ سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

آتما رام نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ پی کر پُر لطف ڈرامائی انداز میں اپنی داستان جاری رکھی۔ "اس روز پیارے لال جی مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے۔ گھر سے اسکول جاتے ہوئے انہوں نے پچاسوں راہ چلتوں اور خصوصاً جلانے کے لیے اپنے ساتھی ٹیچروں کو بڑے فخر کے ساتھ یہ خبر سنا ڈالی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے آج اُن کو تحفے میں تین کدو بھیجے اور ساتھ ہی ساتھ یہ تبصرہ بھی لگاتے جاتے 'انگلش کا ٹیچر ہوں نا! اور آپ جانتے ہیں کہ انگلش از دی موسٹ ڈفیکلٹ سبجیکٹ'۔ جھومتے جھامتے وہ اسکول پہنچے تو دندناتے سیدھے ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں 'مے آئی کم ان سر۔ یس سر۔ گڈ مارننگ سر' کہتے ہوئے گھس گئے۔ اُنہیں کیا خبر تھی کہ گھاسی رام اپنے کدوؤں کا دکھڑا [illegible]

اور وہ غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ انھوں نے جاتے ہی اپنی گوراشاہی انگریزی فل اسپیڈ سے چھوڑ دی۔
"سر آپ کا بہت بہت تھینک یو! آپ کے پریزنٹ کیے ہوئے کدو اکسٹرا آرڈنری مزیدار، میوا مطلب ٹیسٹ فل یعنی ڈیلی شش تھے۔ میں آدھے کدو کو تو ابھی لنچ یعنی آئی ایم سوری بریک فاسٹ میں کھا کر آ رہا ہوں جی ہاں آئی ٹک اٹ جسٹ ناؤ۔"
جوگندر پال سنگھ ہیڈ ماسٹر کا شیر جیسا چہرہ مارے غصے کے تمتما اٹھا اور وہ دھاڑتے ہوئے چیخے "نان سنس۔ میں نے آپ کو کدو پریزنٹ کیے؟ آپ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ میں ابھی آپ کے خلاف منیجر کو رپورٹ بھیج رہا ہوں۔"
"نو سر، یس سر، نو نو سر" پیارے لال ہکلانے لگے وہ ہیڈ ماسٹر سے بہت ڈرتے اور آج محض کدوؤں کے بل بوتے پر وہ ان سے اس طرح براہ راست گفتگو کرتے آئے تھے۔ ڈرتے کانپتے انھوں نے بات کا رخ پلٹنا چاہا "سر میں نے ہاف کی سمجھیا کھائی ہے اور شام کو میری مسز ریننگ ہاف کو چنے کی دال میں گھونٹ کر پکائیں گی۔" ہیڈ ماسٹر کے چہرے پہ انھوں نے غیض و غضب کی بجلیاں لہراتی دیکھیں تو ان کے اور بھی ہوش اڑ گئے اور وہ کہنے لگے: سر ڈیو کانٹ لائک تو ٹیسٹ اٹ؟"
"شٹ اپ" ہیڈ ماسٹر صاحب تلملاتے ہوئے چیخے "آپ کیا بکواس کرتے ہیں۔ میں چوری کا کدو کھاؤں۔ شیم فل۔ جائیے گھاسی رام کو اس کے کدو فوراً واپس کیجیے۔"
پیارے لال فوراً سٹ پٹا کر جانے کے لیے مڑے لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر ان کے پیٹ کے کدو نے انھیں پھر ورغلایا اور انھوں نے پلٹ کر پوچھا "اینڈ سر واٹ اباؤٹ ہاف جو میں کھا چکا ہوں؟"
"اس کے آپ گھاسی رام کو دام دیجیے۔ فوراً۔ ابھی۔ اسی وقت" ہیڈ ماسٹر گرجے۔
آتما رام تھوڑی دیر اور ایسی ہی باتیں کر کے چلا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے اپنے ساتھ میرا بچپن بھی سمیٹ لے گیا۔ وہ میرا بچپن کا دوست، ساتھی اور پڑوسی تھا۔ مولوی صاحب کے مکتب سے لے کر ہائی اسکول تک وہ میرے ساتھ پڑھا تھا۔ میں نے قصبے کی گلیوں میں اس کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا تھا۔ پتنگ لڑائے تھے۔ دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے مار پیٹ کی تھی اور بھائیوں کی طرح ٹوٹ کر محبت بھی۔ مجھے عرصے سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ میرا بحیثیت اڈیشنل جج یہاں جب تبادلہ ہوا تو پتا چلا کہ وہ بھی وطن کو خیرباد کہہ کر یہیں ایک کباڑی کی دکان کھولے ہوئے ہے۔ وہ مجھے پہلی بار جب ملنے آیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا وطن میرا بچپن لے کر میرے پاس آ گیا ہو۔ اور پھر وہ میرے ہی کہنے پر اکثر میرے یہاں آنے لگا۔
آتما رام کے جانے کے بعد میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے سنسان صحن ہی سے بارود کی بو سونگھ لی۔ بیگم، مسز بھاسکر کے یہاں مسز شرما کے ساتھ کسی تقریب میں جانے کی تیاریاں کرنے کے ساتھ ہی ساتھ میرے خلاف بری طرح بھری بیٹھی تھیں "یہ آپ کبھی اپنا خوب تماشا بنواتے ہیں اور آپ کی وجہ سے ناحق مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ آتما رام کے ساتھ آپ ڈرائنگ روم میں کیسے بھیانک قہقہے لگا رہے تھے۔ اور میں اس بدتمیز کو کیا کہوں وہ تو ہے ہی منوا کباڑیا۔ ساری کالونی میں اپنی چیخ پکار سے آج سات ہی بجے سویرا کر دیا۔ پاس پڑوس کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی غریب گھر کے یا نیچی ذات کے لوگ ہیں تبھی تو ایسے لوگ ہم سے ملنے آتے ہیں۔ لوگ اپنے ملنے والوں ہی سے تو پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کو اپنے سوشل اسٹیٹس [illegible] مسز بھاسکر کے یہاں نہ جانے کیا کچھ سننے کو ملے گا"؟

اب بھا آتما علم سے چھپ گیا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ شام کو ایک کلاس کے سامنے سنسان سڑک پر تھوڑی دیر کے لیے اپنی موٹر سائیکل روک کر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرلیتا۔ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگا "شیکھر میاں آپ ایک موٹر کیوں نہیں لے لیتے؟ دیکھیے میں آپ کے لیے موٹر بنانے کے لیے کئی مہینوں سے پارٹس جمع کر رہا ہوں۔ باڈی بھی مل گئی ہے اور انجن بھی۔ بس تھوڑی ہی سی کسر باقی ہے۔ پھر دیکھیے گا تماشا!"

"میرے پاس موٹر نہ ہونے سے تیرے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"بتاؤں؟" وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر سنجیدگی سے بولا "آپ کی موٹر سائیکل کی آواز سن کر جب میری دکان میں بیٹھے لوگ کہتے ہیں، چاچا بھتیجا مجسٹریٹ آگیا۔ وہ دھتی بھی کی تو کسی سے اسے تیری دکان کے سامنے ایک چھوٹی سی کار آ رکتی! لیکن مجھے تو اپنے سوشل اسٹیٹس کی کوئی فکر ہی نہیں، تو مجھے بہت برا لگتا ہے"

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامۂ لاہور

اعتباری: لاہور میں قیام کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں لوگ بعض صورتوں میں مرحوم کی میت غائب کرادیتے ہیں تاہم رفعِ شک سے بچنے کے لیے اگلے روز اخبارات میں یہ خبر شائع کرادی جاتی ہے کہ مرحوم کو دیا گیا ہے چنانچہ بیشتر لوگ اس الزام سے بچنے کے لیے بطورِ خاص خبر کے آخر میں یہ جملہ ضرور شامل کراتے ہیں حوم کو سینکڑوں افراد کی موجودگی میں سپردِ خاک کردیا گیا۔ ممکن ہے خبر میں دفناتے وقت سینکڑوں افراد کی "موجودگی" ور دینے میں کوئی اور مصلحت پوشیدہ ہو تاہم دھیان اس خدشے کی طرف ضرور جاتا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر ہے۔

ازوں کے مہمانِ خصوصی: موت وغیرہ کے سلسلے میں اخباری خبروں سے مجھے ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ یہاں عام تقریبات کے علاوہ جنازوں میں بھی مہمانِ خصوصی کا معقول بندوبست کیا جاتا اور یہ "چیف گیسٹ" مرنے والے کے سٹیٹس کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ خبر میں دیگر تفصیلات بیان کرنے بعد آخر میں اس "مہمانِ خصوصی" کا بطورِ خاص ذکر ہوتا ہے کہ جنازے میں فلاں وزیر، جج یا افسر نے بھی شرکت کی۔ نے والا اگر زیادہ بڑا آدمی ہو تو مہمانِ خصوصی ایک سے زیادہ ہو جاتے ہیں چنانچہ اس صورت میں خبر میں بتایا جاتا کہ جنازے میں معززین شہر کے علاوہ وزرا، ججوں اور افسروں نے شرکت کی۔ مجھے اس نوع کی خبروں میں صرف "علاوہ" کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔

مرحوم کی مقبولیت: یہاں مجھے ایک ایسے جنازے میں شرکت کا اتفاق ہوا جس میں مرحوم کے بیٹے اور دیگر ورثہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ لوگ انہیں دلاسہ دیتے لیکن گریان کے آنسو رکتے میں نہیں آتے تھے۔ میں نے زندگی میں بہت سوگوار خاندان دیکھے ہیں لیکن اس قدر دل دوز آہیں اس پہلے کبھی نہیں سنیں۔ حیرت انگیز امر یہ تھا کہ آہ و بکا کرنے والوں میں صرف مرحوم کے ورثہ ہی شامل نہ تھے دو تواح کے دوکاندار بھی اس ماتم میں برابر کے شریک تھے اپنوں اور غیروں میں اس قدر مقبولیت بلکہ محبوبیت ظاہرہ یقیناً میرے لیے قابلِ رشک تھا تاہم ایک شخص نے مجھے بتایا کہ دراصل مرحوم بہت مقروض ہو کر فوت ہوئے ا

کلمۂ شہادت: یہاں جنازوں میں ایک رسم یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ کندھا دینے والا ہر شخص زور سے کلمۂ شہادت کا نعرہ لگاتا ہے اور ایسا کرتے وقت جواب کی کوئی توقع نہیں رکھتا۔ کندھا دینے کے بعد وہ جنازے کے پیچھے چلنے والے احباب میں دوبارہ شامل ہو جاتا ہے جبکہ وہ بیچ ہی میں چھوڑ کر چلا گیا تو پھر ان میں سے کوئی دوسرا شخص کندھا دینے کے لیے "ایکسکیوز می" کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے احباب سے اجازت چاہتا ہے اور کلمۂ شہادت کہہ کر کندھا دینے لگتا ہے۔ ایک جنازے میں لوگ اس طرح مصروفِ گفتگو تھے۔ ایک پُرجوش شخص ایک جماعتی حکومت کی حمایت میں بڑے شد و مد سے گفتگو کر رہا تھا۔ "ون پارٹی گورنمنٹ ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ ہم لوگ جمہوریت افورڈ نہیں کر سکتے اور تم دیکھنا یہاں ایک جماعتی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ اس وقت تم سب وہی کہو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔ کلمۂ شہادت!"

زندہ درگور: مجھے قبرستان جانے کا اتفاق بھی ہوا اور ان قبرستانوں کی حالت دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ یہاں لوگ سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟ تاہم صاحبِ حیثیت لوگ یہاں بھی اپنے لیے خصوصی بند و بست کروا لیتے ہیں، چنانچہ میں نے یہاں ایک ایک کنال کے رقبہ میں چھ سات فٹ کی قبریں بھی دیکھی ہیں۔ بعض قبروں میں میں نے روشن دان بھی دیکھے اور ان کے ساتھ وسیع و عریض لان بھی پایا جہاں رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ اکثر قبروں پر میں نے مرحوم کے نام کے ساتھ ان کا عہدہ بھی درج پایا۔ یہ سب اہتمام دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے مرحوم فوت نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے صرف کوٹھی تبدیل کر لی ہے..!

تشخیص کا کمال: لاہور میں قیام کے دوران جب ایک بار میں بیمار ہوا تو طبِ مشرق کی شہرت سن کر میں ایک طبیب کے پاس گیا تھا اور مایوس ہوا تھا۔ اس کا احوال میں بیان کر چکا ہوں چنانچہ جب دوسری بار میں بیمار ہوا تو میں نے طبیب کے بجائے ڈاکٹر کے کلینک کا رُخ کیا۔ ڈاکٹر نے زبان نکلوا کر "غوں غاں" کروانے کے بعد مجھے نسخہ لکھ دیا۔ نسخے میں کم از کم دس پندرہ دوائیوں کے نام درج تھے میں نے اپنے ایک شناسا میڈیکل ریپریزنٹیٹو کو یہ نسخہ دکھایا اور ایک بخار کے لیے اتنی ساری دوائیاں تجویز کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ نسخہ تجویز کرتے ہوئے خاصی احتیاط سے کام لیا ہے اور تمام ممکنہ امراض کا سدِّباب کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ اس نسخہ میں ٹی بی، پیچش، اسہال، لقوہ، بواسیر اور دیگر امراض کے لیے ایک ایک دوا تجویز کر دی ہے تاکہ ان میں سے جس بیماری کا بھی آپ شکار ہوں وہ رفع ہو جائے۔ آخر میں احتیاطاً انہوں نے خللِ دماغ کی بھی دوا لکھ دی ہے کہ جسمانی نظام بہت پیچیدہ چیز ہے ممکن ہے آپ کو بیماری ویماری کچھ نہ ہو بلکہ محض خللِ دماغ کے باعث محسوس کرتے ہوں کہ آپ بیمار ہیں۔

جنگی تربیت: میں نے محسوس کیا ہے کہ لاہور کے عوام بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی تربیت پر بہت دھیان دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہاں ایک بار اپنے گھر پر مدعو کیا تو [illegible] بخوبی احساس ہوا۔ ڈرائنگ روم میں میزبان کا چار سالہ بچہ بھی موجود تھا بہت کیوٹ، میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔ میزبان نے مجھے بتایا کہ یہ بہت شریر ہے اور اس کا ثبوت دینے کے لیے انھوں نے بچے کو حکم دیا "انکل کو چپت مارو"۔ پیشتر اس کے کہ میں اس ضمن میں حفاظتی اقدامات کرتا، منے نے ہاتھ گھما کر میری عینک توڑ کر پھینک دی۔ اس پر میزبان ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے اور منے کو گود میں اٹھا کر چومنے لگے۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو بہادر دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے شروع ہی سے ان کی تربیت جنگی بنیادوں پر کرتے ہیں۔

مقفع و مسجع گالیاں: ایک عرصے تک یہ خیال عام رہا ہے کہ گالی دینا ایک ناپسندیدہ حرکت ہے چنانچہ آج تک وکٹورین عہد میں زندہ رہنے والے ثقہ لوگ ہمیشہ اس سے بچتے تھے حالانکہ کتھارسز کے لیے یہ ایک انتہائی ضروری فعل ہے۔ اب نہ صرف یہ کہ یورپ میں یہ "ٹیبو" (TABOO) توڑ دیا گیا ہے بلکہ لاہور کے گلی کوچوں میں خاص و عام کی محفلوں میں میں نے اس رجحان کو خاصا مضبوط پایا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ اہالیانِ لاہور نے ایک صنفِ نازک کو اپنی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ اس محفل میں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے میزبان نے اپنے بیٹے کی زبانی بہت پیاری پیاری گالیاں سنوائیں۔ آخر میں انہوں نے کہا: "منے ایک گالی انکل کو بھی دو، وہ والی"! اور منے نے جو گالی دی، میزبان سے اس کا ترجمہ سن کر میں عش عش کر اٹھا اس میں تہہ در تہہ معانی پوشیدہ تھے اور اس کی زد میں مخاطب کی سات پشتیں آتی تھیں۔

سراپا محبت: جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا کہ لاہور کے لوگ بچوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اس کا ثبوت مجھے اس محفل میں بارہا ملا۔ میں نے اپنے اس دوست کے پاس دو گھنٹے گزارے جن میں سے صرف دو چار منٹ ہم نے آپس میں گفتگو کی ہوگی ورنہ بقیہ وقت منے کی باتیں سننے اور اس کی سرگرمیاں دیکھنے میں صرف ہوا۔ اپنے والد کی فرمائش پر اس نے ہمیں نظمیں سنائیں۔ قالین پر الٹ بازی کے کرتب دکھائے۔ دو دفعہ اس نے میرے گھٹنوں پر پاؤں جما کر میرے کاندھوں پر چڑھنے کی کوشش کی۔ ایک گلدان توڑا۔ کوکا کولا کی بوتل اپنے ابو کے سر پر انڈیل دی میرے سامنے جو بسکٹ رکھے گئے تھے وہ سب کے سب ایک ایک کرکے اپنی جیب میں ٹھونس لیے لکڑی کی [illegible] سر پر میرے دوست کے ماتھے پر بل نہ آیا (میرے ماتھے پر بھی نہیں آیا) واقعی لاہور کے لوگ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں ان کے ہاں آنے والے مہمان بھی انہیں بہت پیار کرتے ہیں۔

بعض نامانوس لفظ: لاہور میں قیام کے دوران دو ایک لفظ میں نے ایسے بھی سنے جو میرے لیے بالکل نئے تھے۔ مقامی لوگوں نے جب مجھے سمجھانے کی غرض سے ان لفظوں کو انگریزی میں ادا کرنا چاہا تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان میں ایک لفظ "غیرت" بھی تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی گفتگو میں یہ لفظ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس موضوع پر یہاں بے شمار فلمیں بھی بنی ہیں اور سنا ہے۔ اس مسئلے پر آئے دن قتل بھی ہوتے رہتے ہیں میں نے جب ایک دوست سے اس لفظ کا مطلب جاننے کی کوشش کی تو اس نے ذہن پر زور دے کر کہا ریسپیکٹ RESPECT مگر دوسرے ہی لمحے کہنے لگا۔ نہیں نہیں اس کا ترجمہ ریسپیکٹ نہیں۔ ریسپیکٹ کا مطلب تو عزت ہوتا ہے۔ غیرت کچھ اور چیز ہے"! پھر اس نے غیرت کے متبادل دو اور لفظ "آنر" اور "موڈیسٹی" وغیرہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالے مگر ہر بار خود ہی انہیں غلط قرار دے ڈالا۔ میری الجھن بھی بڑھتی جا رہی تھی اور خود وہ بھی خاصا پریشان نظر آنے لگا تھا۔ بالآخر کہنے لگا "اگر تم اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ ملوث دیکھو تو اس موقع پر تمہیں کیا آئے گا!"

میں نے جواب دیا "غصہ" جز بز ہو کر بولا "غیرت نہیں آئے گی؟" میں نے جھنجھلا کر کہا "وہ کیا ہوتی ہے؟ یہی تو جاننا چاہتا ہوں"۔ اس پر اس نے فوراً ڈکشنری منگوائی اور جلدی جلدی ورق الٹنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے ڈکشنری بند کرکے ایک طرف رکھ دی اور کہا۔

"تمہاری ڈکشنری میں غیرت کا لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ یہ [illegible]!"

کہتا ہے یہ کوئی مقامی مسئلہ ہے اور ہم مغرب والے اس سے واقف نہیں ہیں۔ یہ یقیناً کوئی دلچسپ چیز ہوگا۔

لباس: میں نے یہاں لوگوں کو ملکی اور غیر ملکی دونوں لباسوں میں ملبوس دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ غیر ملکی لباس پہنتے ہیں اور جو ان پڑھ ہیں وہ اپنے ملک کے لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے طبقے کے لوگوں میں دھوتی ایک بہت مقبول لباس ہے یہ ایک ان سلے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے جسے لوگ اپنی کمر کے گرد باندھ لیتے ہیں۔ کئی لوگ رات کو سوتے وقت بھی دھوتی باندھ کر سوتے ہیں اور بہت ہی گہری نیند سوتے ہیں۔ میں ایک دوست کے گھر مہمان گیا تو اس نے سوتے وقت مجھے بھی ایک دھوتی باندھنے کے لیے دی جب صبح میری آنکھ کھلی تو یہ دھوتی میں نے اوپر لی ہوئی تھی !!

تھان اور تھانہ: مقامی زبان میں تھان کپڑے کے اجتماع کے علاوہ اس جگہ کو بھی کہا جاتا ہے جہاں جانور باندھے جاتے ہیں اور "تھانہ" پولیس اسٹیشن کو کہا جاتا ہے۔ ایک محقق نے مجھے بتایا کہ یہ تھانہ تھان ہی سے نکلا ہے کیوں کہ تھان میں جانور اور تھانے میں انسان باندھے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ تھانے سے بہت زیادہ خوف زدہ نظر آئے۔ چنانچہ اس کے بارے میں بہت سے مقولے بھی یہاں مشہور ہیں۔ ایک تھانیدار سے اس مسئلہ پر میری بات چیت ہوئی تو اس نے عوام کے تمام الزامات بے بنیاد قرار دیا اور کہا "ہم عوام کے خادم ہیں وہ توہم سے یونہی خوف زدہ ہیں۔ آپ میرے ساتھ تھانے چلیں وہاں جاکر آپ اگر میری باتوں کے قائل نہ ہو جائیں تو کہئے"۔ میں تو ساتھ چلنے کو تیار تھا مگر لوگوں نے مجھے روک دیا۔ انھوں نے کہا "وہاں جاکر آپ واقعی قائل ہو جائیں گے"۔

بجلی کی آمد و رفت: پاکستان میں قیام کے دوران میرے لیے سب سے دلچسپ تجربہ بجلی کی آمد و رفت کا تھا۔ لوگ بیٹھے بیٹھے چلانے لگتے تھے "چلی گئی" اور کبھی ایکدم پکار اٹھتے تھے "آگئی" یہ دلچسپ ڈرامہ دن میں کئی بار کھیلا جاتا تھا اور مجھے معلوم ہوا کہ اس ڈرامہ کی پروڈکشن اور ڈائرکشن "واپڈا" کے سپرد ہے۔ "واپڈا" ایک ادارہ ہے جس کے ذمہ بجلی کی فراہمی کا فریضہ ہے تاہم وہ عوام کی تفریح طبع کے لیے اس قسم کے چھوٹے موٹے پروگرام بھی پیش کرتا رہتا ہے۔ نیویارک میں برسہا برس کے بعد ایک دفعہ چند گھنٹوں کے لیے بجلی چلی گئی تھی جس سے تمام سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں اور اعداد و شمار کے مطابق اس برس بچوں کی پیدائش کی شرح میں اضافہ ہو گیا۔ سنا ہے کہ پاکستان میں آبادی کی صورتحال بھی تشویش ناک ہے۔

حیرت انگیز: پاکستان کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ یہ صنعتی طور پر بھی خاصا پسماندہ ملک ہے، چنانچہ ابھی تک اس معاملے میں پوری طرح خود کفیل نہیں ہو سکا مگر لاہور میں چند روز قیام کے دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ پاکستان میں صنعتوں کا جال بچھا ہوا ہے بلکہ یہاں ایسی ایسی صنعتیں موجود ہیں جو ابھی تک تمام تر ترقی کے باوجود یورپ وغیرہ میں بھی قائم نہیں ہو سکیں۔ مثلاً ایک دوست نے ان کی تفصیل بتاتے ہوئے صنعت اشتقاق، صنعت شبہ اشتقاق اور صنعت طباق وغیرہ کا نام لیا۔ ان بڑی صنعتوں سے منسلک اس نے اسمال انڈسٹریز کی تفصیل بھی بتائی جو ایک اور صنعت، صنعت تجنیس کے تحت قائم ہیں، مثلاً تجنیس تام، تجنیس تام مماثل اور تجنیس تام متوفی وغیرہ۔ یہ [illegible] صنعتیں تھیں۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست سے اس ضمن میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ صنعت اشتقاق سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا جمع ہونا ہے جو ایک ہی مادہ یا مصدر سے مشتق ہوں۔ اسی طرح اس نے دیگر [illegible] تفصیل سے بتایا لیکن اس کے باوجود میں ان صنعتوں کی اصل نوعیت نہ سمجھ سکا تاہم میں نے

اس سے پوچھا کہ ان صنعتوں کی بدولت کتنے لوگوں کو روزگار حاصل ہوا ہے، تو دوست نے کہا کہ ان صنعتوں سے ہزاروں شاعر منسلک ہے مگر بیروزگار ہیں۔ مجھے اپنے اس دوست کی یہ بات بھی چنداں سمجھ میں نہ آئی۔ میرا یہ دوست خود بھی شاعر تھا۔

شو بزنس: میرا یہی شاعر دوست مجھے ایک محفل میں لے گیا جہاں بے شمار لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک اسٹیج تھا جہاں سے تھوڑی دیر بعد کوئی شخص اٹھتا اور راسٹم پر آکر گانا سناتا، یہ گانا آلاتِ موسیقی کے بغیر تھا، مگر گانے والا بہت لہک لہک کر گاتا تھا اور بسا اوقات تو اس کے حلق کی رگیں پھول کر پھٹنے کے قریب ہو جاتی تھیں، کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے "پک اپ" کرتے تھے۔ جواباً وہ شخص جلدی جلدی اپنا دایاں ہاتھ ہلانے لگتا تھا۔ وہ یہ ہاتھ اتنی تیزی سے ہلاتا تھا لگتا تھا اس کی کہنی میں کمانی فٹ ہے، لوگ اس کی پرفارمنس سے بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ میرے دوست نے بتایا اس قسم کی محفلوں کو یہاں "مشاعرہ" کہا جاتا ہے اور اسٹیج پر جو شخص چیخ رہا ہے اسے شاعر کہتے ہیں۔ میرے دوست نے یہ بھی بتایا کہ ایسی محفلوں میں شرکت کے لیے عموماً کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارے ہاں شو بزنس سے منسلک افراد خاصے بھاری معاوضے لیتے ہیں اور ان کے شو میں شرکت کے لیے ٹکٹ خاصی مہنگی ہوتی ہے۔

آخری آدمی: میں یہاں ایک ریستوران میں بھی گیا جس کے متعلق میرے دوست نے بتایا کہ یہاں زیادہ تر وہ ادیب شاعر اور دانشور بیٹھتے ہیں جو ادب کی جدید قدروں کے علمبردار ہیں۔ انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہیں اور بین الاقوامیت کے پرچارک ہیں۔ نیز یہ کہ دنیا میں امن، محبت اور رواداری کا دور دورہ چاہتے ہیں، مگر میں نے دیکھا کہ وہ خود مختلف میزوں پر مختلف گروہوں کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے بلکہ ایک میز پر بیٹھنے والے بھی ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے لگتے تھے ہم یہاں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اب رات ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے جانا شروع ہو گئے تھے، ہماری میز پر صرف دو ادیب رہ گئے تھے اور وہ میرے دوست کے ساتھ انتہائی محبت اور یگانگت کے رویے کا اظہار کر رہے تھے۔ مجھے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی، چنانچہ میں نے اپنے دوست سے واپس چلنے کے لیے کہا۔ یہ سن کر وہ اپنا منہ میرے کان کے قریب لایا اور آہستگی سے بولا: "تم صورت حال کو نہیں سمجھتے اس میز سے جو اٹھ کر جاتا ہے باقی لوگ اس کے خلاف گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے تہیہ کیا ہے کہ میں آج سب سے آخر میں یہاں سے جاؤں گا۔"

پتنگیں لوٹنے کا شوق: یہاں کے لوگوں کو پتنگیں لوٹنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بیسیوں فٹ بلند چھتوں کی پتلی اور کمزور سی منڈیر پر "ڈھانگا" (پتنگ لوٹنے میں آسانی پیدا کرنے والا ایک آلہ) لیے کھڑے رہتے ہیں اور پھر کٹی ہوئی پتنگ دیکھ کر وہ اس پر اتنے فریفتہ ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے اور وہ اس کا پیچھا کرتے کرتے بلندی سے نیچے سڑک پر آن گرتے ہیں۔ مگر یہ پتنگیں لوٹنے کا شوق ایسا ہے کہ اگلے روز ان کے پسماندگان ایک بار پھر ہاتھ میں "ڈھانگا" لیے وہیں کھڑے نظر آتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ لوٹ مار کا یہ شوق یہاں کے سیاستدانوں میں بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ وہ بھی ہاتھوں میں "ڈھانگا" اٹھائے بلند و بالا چھتوں کی منڈیروں پر کھڑے رہتے ہیں اور جب اس کے نتیجے میں کسی المناک حادثہ کا شکار ہو جاتے ہیں تو اگلے روز ان کے پسماندگان کٹی ہوئی پتنگیں لوٹنے کے شوق میں ایک بار پھر اسی منڈیر پر ہاتھ میں "ڈھانگا" لیے کھڑے

لگا دیتے ہیں۔

تیسری دنیا: لاہور میں قیام کے دوران میں نے سیاستدانوں اور عوام کو تیسری دنیا کے مسئلے پر بہت گرما گرم بحثیں کرتے دیکھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنے خشک موضوع پر بھی میں نے ان کی دلچسپی زندہ دلی میں کوئی کمی محسوس نہیں کی۔ ایک رہنما نے تیسری دنیا کے نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے جلسۂ عام میں کہا: "ایک دنیا تو یہ ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ دوسری دنیا وہ ہے جہاں ہم نے جانا ہے۔ میں پوچھتا ہوں لیکن یہ تیسری دنیا کہاں سے آگئی؟" اگلے روز اسی مقام پر ایک جماعت کے رہنما نے پورے جوش و خروش سے تقریر کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ پوچھتے ہیں تیسری دنیا کیا ہے؟ ارے سنو! میں بتاتا ہوں ایک دنیا وہ ہے جہاں ہم رہتے ہیں، دوسری دنیا وہ ہے جہاں ہم نے جانا ہے اور تیسری دنیا وہ ہے جہاں انہوں نے جانا ہے!"

پچھلا دروازہ: یہاں رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دکانیں شام تک بند رہتی ہیں۔ ایک روز شہر میں گھومتے پھرتے مجھے جب بھوک محسوس ہوئی تو میں نے اپنے ایک مقامی دوست کو جو اس وقت میرے ہمراہ تھا، اس ہنگامی صورت حال سے آگاہ کیا۔ چنانچہ وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا اور ایک بند دکان کے باہر آویزاں تختے پر لکھی عبارت پڑھنے لگا۔ میں نے پوچھا کیا لکھا ہے؟ بولا لکھا ہے "رمضان المبارک کے احترام میں ہوٹل بند ہے۔" ہم کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور کھانا کھا کر پچھلے دروازے سے باہر آگئے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں پچھلے دروازے کا استعمال بہت عام ہے۔ لوگ سیاست اور اقتدار میں بھی پچھلے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور پھر ایک روز ان کی واپسی بھی پچھلے دروازے ہی سے ہوتی ہے!

مقبول ترین آلۂ موسیقی: رمضان کے مہینے میں میں نے ایک عجیب و غریب چیز کا مشاہدہ کیا۔ یہاں کچھ لوگ آدھی رات کو گلوں میں ڈھول لٹکائے اور ہاتھوں میں چمٹا پکڑے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آجاتے ہیں اور خوب اودھم مچاتے ہیں۔ جن کے پاس ڈھول نہیں ہوتا وہ کوئی ٹین وغیرہ کھڑکاتے ہیں۔ میں نے ابھی ڈھول (وغیرہ) اور چمٹے کا ذکر کیا تھا تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر یہ بتاتا چلوں کہ چمٹا یہاں کا ایک مقبول ترین آلۂ موسیقی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ یہ ساز پاکستان کے قریباً ہر گھر میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ کثیر الاستعمال بھی ہے۔ کئی مائیں اس سے بچوں کو پیٹنے کا کام بھی لیتی ہیں اور کچھ لوگوں کو تو میں نے اس آلے سے دہکتے ہوئے کوئلے بھی پکڑتے دیکھا ہے۔

OO

یوسفی —

یوسف (ناظم) کی نظر میں

اردو ادب میں جن لوگوں کا نام ادب سے لیا جاتا ہے اُن میں ایک مشتاق احمد یوسفی بھی ہیں۔ یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ یوسفی کیوں ہیں لیکن ہیں اور اکثر لوگ تو انھیں صرف یوسفی ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ادب میں صوفی تو خیر بہت ہیں لیکن یوسفی بھی ایک ہیں اور ان کی شناخت طنز و مزاح ہے جو آج سے ۳۰، ۴۰ برس پہلے تک صرف چند ہی لوگ لکھا کرتے تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے طنز و مزاح لکھنے والوں کی تعداد میں کافی بلکہ کافی سے زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن جس وقت مشتاق احمد یوسفی نے لکھنا شروع کیا اُس وقت مزاحیہ ادب تخلیق کرنے والوں کی تعداد بمشکل پانچ سات ہوگی اور اُن کا کمال یہ ہے انھوں نے اپنا ادبی کیریر شروع بھی کیا تو بڑی بلندی سے۔ جس نے بھی ان کی طرف دیکھنا چاہا اُسے پہلے اپنے سر سے ٹوپی اُتارنی پڑی کہ کہیں یہ نہ گر جائے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنے آپ کو عوامی شہرت سے محفوظ رکھا، اخباروں اور رسالوں کی فرمائشیں ان کے قلم کو گمراہ نہ کرسکیں اور نہ اَدبی جلسوں اور محفلوں کی چکا چوند نے ان کے استغنا کو ڈانواں ڈول کیا۔ وہ زمین پر بھی اس طرح رہے۔ جیسے مریخ پر رہ رہے ہوں انھیں بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا اور اگر آج اتفاق سے وہ اردو کے کسی سیمینار یا جلسہ میں چلے آئیں تو شاید کوئی انھیں پہچان بھی نہ سکے۔ انھوں نے صرف اپنی تحریریں چھپوائی ہیں تصویریں نہیں ورنہ ہم تو کتنے ہی ایسے ادیبوں کو جانتے ہیں جو صرف روزانہ اپنا نام اور تصویر چھپوانے کی خاطر صحافی بن گئے — کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ایڈیٹروں اور عورتوں کی نفسیات میں بس تھوڑا ہی سا فرق ہوتا ہے —

مشتاق احمد یوسفی نے زندگی بھر اپنے کام سے کام رکھا بلکہ کام کی خاطر اپنا وطن چھوڑ دیا۔ جملہ ۴ کتابیں اُن کے نام پر ہیں۔ چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور اب حویلی — کون سی کتاب کس سے بہتر ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت زیرِ بحث نہیں ہے یہ چاروں کتابیں، ان چار ستونوں کی طرح ہیں جن پر عمارت کھڑی ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ ان چاروں ستونوں کا طرزِ تعمیر ایک دوسرے سے کہیں قدرے اور کہیں بہت زیادہ مختلف ہے۔

"چراغ تلے" جیسا کہ کتاب کے صفحہ اول پر چھپا ہے کھٹ مٹھے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں اُس پھل کا ذائقہ ہے جسے ہم سب اننانس کہتے ہیں۔ اننانس کی قاشیں، نہایت خوش رنگ رسیلی اور کنگورے دار ہوتی ہیں۔ دیکھنے میں زہرہ جبیں اور کھاتے میں ترش و شیریں۔ "چراغ تلے" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں چھپا۔ آج سے ٹھیک ۲۵-۲۶ برس پہلے۔

اور اپنی سلور جوبلی کے موقع پر بھی یہ کتاب آج ہی کی طرح تر و تازہ اور شاداب ہے جتنی کہ ۱۹۶۱ء میں تھی۔ اچھی کتابوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ سالخوردہ نہیں ہوتیں۔ ورنہ ۲۵ سال پرانے شادی شدہ جوڑے بھی اپنی سلور جوبلی کے موقع پر کتنے ستم رسیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس کتاب میں جملہ ایک درجن مضامین ہیں۔ تعداد کم معلوم ہوتی ہے لیکن مشتاق احمد یوسفی اپنے کسی مضمون کو تشنہ نہیں چھوڑتے اس لیے یہ ۱۲ عدد مضامین قارئین کو فرحت و انبساط اور لطف و نشاط کی ایک ایسی سوغات فراہم کرتے ہیں کہ وہ فرطِ مسرت میں کتاب ہی کو چوم لیتے ہیں۔ داد دینے کا یہ بھی ایک مہذب طریقہ ہے۔ اس قسم کا بوس و کنار تہذیب و اخلاق [illegible] نہیں سمجھا جاتا۔ اس کتاب میں یوسفی کا ایک پیش لفظ بلکہ مقدمہ بھی شامل ہے جس کا عنوان انھوں نے پہلا پتھر رکھا ہے۔ چونکہ پہلا پتھر بنیاد کا پتھر ہوتا ہے اس لیے یوسفی نے بنیاد کے لیے استعمال کیا کسی کی طرف پھینکا نہیں۔ یوں بھی مزاح نگار پتھر نہیں پھول پھینکتے ہیں بلکہ پھل بھی اسی لیے شاعر کہتا ہے

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ۔ ؟

ذرا دیکھیں تو سہی وہ اس مقدمے میں اپنے بارے میں کہتے کیا ہیں۔ سوال آپ کا جواب ان کا۔

سوال: یوسفی صاحب۔ آپ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟

جواب: سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ گری کے علاوہ سب کچھ رہا ہے۔

سوال: آپ کی تاریخ پیدائش؟

جواب: عمر کی اس منزل پر آ پہنچا ہوں کہ اگر کوئی سنہ ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگا لیتا ہوں۔

سوال: آپ کا پیشہ؟

جواب: گو کہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اول آیا لیکن اسکول میں حساب سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی اور حساب میں فیل ہونے کو ایک عرصے تک اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتا رہا۔ اب وہی ذریعہ معاش ہے حساب کتاب میں اصولاً دو اور دو چار کا قائل ہوں مگر تاجروں کی دل سے عزت کرتا ہوں کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے دو اور دو کو پانچ کر لیتے ہیں۔

سوال: یوسفی صاحب آپ کی تصویریں اخباروں میں کم چھپی ہیں۔ کیا آپ اپنا حلیہ بیان کرنا پسند فرمائیں گے؟

جواب: [illegible] پیشانی اور سر کی حد فاصل اڑ چکی ہے۔ لہٰذا منہ دھوتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ناک میں بظاہر کوئی نقص نہیں ہے۔ مگر بعض دوستوں کا خیال ہے کہ بہت چھوٹے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔

سوال: کیا آپ سے یہ بھی دریافت کر لوں کہ آپ لکھتے کیوں ہیں؟

جواب: ڈزرائیلی نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جب میرا جی عمدہ تحریر پڑھنے کو چاہتا ہے تو ایک کتاب لکھ ڈالتا ہوں۔ رہا یہ سوال کہ یہ کمبخت بیٹھے بٹھائے طنزیہ میں یا مزاحیہ یا اس سے بھی ایک قدم آگے۔ یعنی صرف مضامین تو یہاں صرف اتنا عرض کرنے پہ اکتفا کروں گا کہ ذرا اوچھا پڑے یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ مزاح۔

ہاتھ آئے تو بت ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

تو یہ ہے جناب۔ حضرت مشتاق احمد یوسفی کا تعارف ان کی اپنی زبانی۔ سوالوں کے سارے جواب خود ان کے اپنے الفاظ میں ہیں۔ یقین نہ ہو تو "چراغ تلے" اٹھا کر دیکھ لیجیے لیکن چراغ کے سامنے رکھ کر پڑھیے گا چراغ کے نیچے تو اندھیرا ہوتا ہے۔ یاد رکھیے مشتاق احمد یوسفی کلاسیکی ادب لکھتے ہیں۔ یہ تو خود کتاب کے نام سے ظاہر ہے ورنہ

اب جو بلب اور ٹیوب آپ دیکھتے ہیں ان کے نیچے اندھیرا کہاں ہوتا ہے ہاں یہ بات اور ہے کہ کہیں کہیں ان کے نیچے جو کام ہوتے ہیں وہ پہلے اندھیرے میں بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔

چونکہ مصنف نے خود مقدمے ہی میں یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ اُن کے مضامین طنزیہ ہیں یا مزاحیہ تو کیوں نہ اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔

اپنے مضمون "پڑئیے گر بیمار" میں وہ لکھتے ہیں۔

"میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمۂ علالت ہے۔ لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر انیٹی انجکشن مریض کے بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔" اس چھوٹے سے اقتباس کے بعد وہ مکالمے سن لیجئے جو مصنف اور اس کے ایک عیادت گزار شخص کے درمیان ہوئے۔ مصنف کی بائیں آنکھ میں گوہانجنی نکل آئی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں چھوٹتے ہی بولے:

حکیم: "فم معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھائیے۔ دافع نفخ و محلل ورم ہے۔"

مریض: "آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی ہے جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟"

حکیم: "کیا مطلب؟"

مریض: دو چار دن مونگ کی دال کھا لیتا ہوں تو اردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشہ تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس صورت میں خدانخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟

حکیم: آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں۔ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھی،

مریض: اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی۔"

ان مکالموں میں یوسفی، مزاح سے طنز کی طرف قدم — قدم کہیے یا قلم بڑھا رہے تھے کہ یکایک رک گئے۔ مزاح میں بہت سی باتیں قاری کو خود سمجھنی پڑتی ہیں۔ یوسفی اپنے ایک اور عیادت کرنے والے صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں

"کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے انداز پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں صاحب فراش ہو گیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہیں تھے کرۂ علالت میں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لاکر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے بھی سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی اور کو نہیں پہنچتا۔" اس مزاح کو مزاح لطیف کہتے ہیں اور مشتاق یوسفی سے، اس کے مخصوص بیوپاری ہیں۔ ایک مریض اور اس کے ایک ملاقاتی کا ایک مکالمہ اور سن لیجیے۔ — ملاقاتی کہتا ہے۔

ملاقاتی: ماشاءاللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔ مریض جواب میں عرض کرتا ہے۔

مریض: جی ہاں آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی: آواز میں کرارا پن ہے۔

مریض : ڈاکٹر نے صبح سے ساگو دانہ کھلا بند کر رکھا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی مکالمے لکھنے کے لیے ماہر ہیں۔ بمبئی جیسے شہر میں ہوتے جو ہندوستان کا ہالی ووڈ ہے تو وہ ریزرو بینک میں نہیں کسی فلم کمپنی میں ہوتے اور ان کے مکالموں کے کیسٹ خستہ بسکٹوں کی طرح بکا کرتے۔ مکالمہ پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ یوسفی، کافی کو بے مد بڑا مشروب سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں معلوم نہیں کافی کیوں کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ میں نے کافی کو شراب سے بدرجہا بدتر پایا۔ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دم نزع حلق میں پانی چوانے کی بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیئے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے۔ بخدا مجھے اس تجویز پر اعتراض نہ ہوگا کہ گناہ گاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔" یہ ہیں ان کے خیالات کافی سے متعلق اور یہ ہے مکالمہ :

مصنف نے پوچھا   مصنف : آپ کافی کیوں پیتے ہیں ؟

وہ : آپ کیوں نہیں پیتے ؟

مصنف : مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔

وہ : اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوت شامہ کی کوتاہی ہے۔

مصنف : تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی مہک آتی ہے مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کو لگایا کریں۔"

وہ : میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگار سے رائتے میں ہوتا ہے۔"

مصنف : کھرچن اور دھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔"

وہ : تعجب ہے! یوپی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

مصنف : "میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔"

تو یہ تھے۔ تھے نہیں بلکہ ہیں مشتاق احمد یوسفی اپنی کتاب "چراغ تلے" کی روشنی میں۔! ▭▭

شاعر سینا

پروفیسر حفیظ بنارسی
(آرہ)

شاعروں کی اک سبھا تھی کل عظیم آباد میں
جمع تھے اک ہال میں بستی کے سب آزاد مرد
ایک صاحب عمر تھی جن کی پچاسی کے قریب
کھانسنے کے بعد وہ ارشاد فرمانے لگے
اک جواں شاعر اٹھا پھر زلف لہراتا ہوا
پھر ہوا گویا بہ اندازِ کلام میر انیس
اس کا کہنا تھا کہ ہر شاعر ہو اب مردِ جری
فیض ہونا چاہیئے سردار ہونا چاہیئے
لشکرِ باطل سے ٹکرانا اب اپنا کام ہو
فرض کا اپنے ہمیں عرفان ہونا چاہیئے
کرلیں وردی زیبِ تن ہم شیروانی چھوڑ دیں
ہم کو بھی اپنی الگ "سینا" بنانا چاہیئے
اس کی اس تقریر سے ہر شخص کو ہوش آگیا
سب نے فرمایا کہ یہ تجویز ہے اچھی بہت
لیکن اس کے بعد کچھ محفل کا نقشہ اور تھا
ایک شاعر تھا جو وائی کی طرح اہلِ نظر
اس کی خاطر سوچنے کی کچھ ضرورت ہی نہیں
یہ نئی تجویز اپنے واسطے بے سود ہے
ہر گلی کوچے میں ان کی ٹکڑیاں مل جائینگی
قافیہ پیمائی کرتے رہتے ہیں سب صبح و شام
ہے مناسب یہ کہ ان کو بھیجئے پنجاب میں
شعر پڑھ پڑھ کر یہ واں امن واماں قائم کریں
چھوڑ دیں سب کاروبارِ ادرعشق فرمانے لگیں
سن کے یہ تجویز سب شاعروں کو غش آنے لگا
کوچۂ جاناں سے اٹھنا ان کو نامنظور تھا

شاد تھا ہر ایک شاعر سرزمینِ شاد میں
بال تھے بکھرے ہوئے چہرے تھے سب کے زرد زرد
صدرِ محفل تھے وہی اور تھے وہی اسکے نقیب
مقصدِ جلسہ ہے کیا؟ سب کو یہ بتلانے لگے
شعر کی صورت میں نثری نظم فرماتا ہوا
خوش ہوئے جس پر سب اس کے ہم نشین و ہم جلیس
کیا ضرورت ہے کہ حاصل ہو اُسے دانشوری
ظالموں سے برسرِ پیکار ہونا چاہیئے
ہاتھ میں تلوار ہو یا کوئی ٹوٹا جام ہو
دیش کی دہلیز پر قربان ہونا چاہیئے
سرفروشی سیکھ لیں اب نغمہ خوانی چھوڑ دیں
ہم بھی لڑ سکتے ہیں، دنیا کو دکھانا چاہیئے
خون جو ٹھنڈا تھا اس میں دفعتاً جوش آگیا
سامنے جو بات آئی ہے وہ ٹیڑھی ہے بہت
اک نیا ہی مسئلہ تھا اب جو زیرِ غور تھا
اُس نے فرمایا کہ یہ تجویز ہے اچھی مگر
ہو ہماری کوئی "سینا" اس کی حاجت ہی نہیں
شاعروں کی فوج تو پہلے ہی سے موجود ہے
جیب و داماں کی ہزاروں دھجیاں مل جائینگی
ہے یہی اُن کی پریڈ اور ہے یہی بس اُن کا کام
تاکہ واں دہشت پسندوں سے لڑیں یہ خواب میں
تاکہ جو بہکے ہوئے ہیں نیک رستے پر چلیں
گیت اپنی اپنی محبوبہ کے سب گانے لگیں
چھوڑ کر جلسے کو ہر اک شخص گھر جانے لگا
ان کی خاطر یہ عمل دانشوری سے دور تھا

سب نے رخصت کی طلب ہاتھوں کو اپنے جوڑ کر
سب چلے محفل میں صدرِ محترم کو چھوڑ کر

اندرجیت لال (دہلی)

ناشر بنام شاعر

جب سے آپ اپنا مسودہ زخم جگر دے گئے تھے تب سے آپ کے خط یاددہانی کے لیے برابر آتے رہے کہ جلد از جلد منظر عام پر لانے کا اہتمام کیا جائے دوسرے حسن طباعت جلد بندی کتابت. تصاویر وغیرہ پر پوری پوری دی جائے. آپ کی اس طرح کی تاکید اور یاددہانی ایک اعتبار سے قدرتی تھی اور ضروری بھی. کسی فلسفی نے سچ ہے کہ ہر مصنف کی تحریر اس کو اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے. اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذہن کی اختراعی یا پیداوار مصنف کی تحریر ہی ہوسکتی ہے. اسے اس پر ناز بھی ہوتا ہے. جیسا کہ ایسا ناز اس کو بھی ہوگا کیونکہ نے تو اس کا عنوان ہی زخم جگر رکھ دیا ہے. کتنا خون جگر آپ نے اسے لکھنے. ترتیب دینے. اس کے نوک پلک نے اور اسے دلچسپ بنانے میں صرف کیا ہوگا. یہ تو آپ ہی جانتے ہیں. اور یہ مصنف کا فرض بھی ہے کہ وہ اپنی تخلیق نرالا انداز و رنگ میں پیش کرے.

ہمارا قیاس ہے کہ آپ نے ہیئت اور مواد یعنی دونوں جہتوں میں پوری پوری لگن اور استعداد سے اپنی تخلیق پیش کیا ہوگا. اسی طرح بڑے جذبے اور انہماک سے ہم نے بھی آپ کی کتاب کو پیش کرتے ہیں اس کی حسن کاری عت وغیرہ پر بھرپور توجہ دی ہے اب جب کتاب قارئین کے ہاتھوں پہنچی ہے. تو ہمیں بڑا تاسف ہو رہا ہے اری سب قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوتی جا رہی ہیں. زیادہ تر اس وجہ سے کہ آج کا قاری بڑا نکتہ بین اور باریک بین ہے. محاسن و عیوب پرکھنے کی عقل رکھتا ہے. اور کھری کھری بات کہنے سے بالکل نہیں جھجکتا. جو آج ہمیں اپنے تجربے ثابت ہو رہا ہے. ہمارا اندازہ تھا کہ آپ اپنا کلام ہندوستان بھر کے بڑے بڑے شہروں میں مشاعروں میں سناتے ہیں. آپ نے بڑے فخر سے از خود یہ فرمایا تھا کہ جہاں بھی آپ قدم رنجہ فرماتے ہیں بس مشاعرہ ہی لوٹ لیتے ہیں. ظاہر ہے شاعر کی حیثیت سے مقامی امراء آپ کو دعوتیں دیتے ہوں گے. آنے جانے کا کرایہ بھاڑہ بھی ملتا ہوگا. کبھی کبھار تحائف بھی مل جاتا ہوگا. کلام مکرر پڑھنے کے لیے اصرار کیا جاتا ہوگا اور اس طرح کی مسلسل ملاقات سے شرفاء و حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہوگا. یہ بھی اغلب ہے کہ آپ اپنے آپ کو کچھ بڑا آدمی کچھ عظیم آدمی ضرور محسوس کرتے لگے. اس طرح کی عزت افزائی سے کچھ خوش فہمی ہو ہی جاتی ہے. اور یہ عین قدرتی ہے کیونکہ جب انسانوں کی بھیڑ

کی بھیڑ آپ کی مدح سرائی پہ اتر آئے تو آپ کو اپنی بڑائی کا احساس نہ ہو یہ ممکن نہیں۔

ماشاء اللہ آپ کی آواز میں بڑا ترنم ہے، جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ ترنم کا جادو سامعین کو بہالے جاتا ہے لیکن آپ کی کتاب میں یہ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے کہ یہ کوئی میرؔ و اقبالؔ کا کلام تو نہیں کہ ادب کی کسوٹی پر بھی پاسے کا سونا نکلے۔ ہم ٹھہرے کاروباری آدمی اس لیے آپ کی باتوں میں آگئے یہ قیاس کر کے کہ جلتی پیاری آواز پائی ہے آپ نے اتنا پیارا آپ کا کلام بھی ہوگا۔ لیکن اب جب تبصرہ نگاروں اور سنجیدہ قارئین نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا تو ہم بوکھلا گئے ہیں اور اب احساس ہو رہا ہے کہ آپ کا کلام سنانے یا سننے کے لیے تو فٹ ہے۔ سامعین جھوم جاتے ہوں گے تالیاں بھی بجاتے ہوں گے۔ یقیناً آپ کی شاعری سنانے کی اور اسٹیج کی شاعری ہے اسی لیے یہ شاعری ادبی سطح پر پذیرائی حاصل نہیں کر رہی۔ یوں بڑا عجیب لگتا ہے کہ لوگ بعض شاعروں کا کلام سن کر سر دھنتے ہیں۔ واہ واہ کرتے ہیں اور جب یہ صفحۂ قرطاس پر آ جاتا ہے تو اسے خریدتے نہیں۔ رہی آپ کی کتاب پر تبصروں کی بات کہ اسے سارے ملک کے اردو اخبارات و رسائل کو بھیج دیا جائے۔ تاکہ تبصرہ نگاروں کی بیش قیمت آراء کے سہارے کتاب کی بکری میں کچھ اضافہ ہو سکے اور اس سے اس کی توقیر بھی ادبی حلقوں میں کچھ بڑھ جائے۔ تو صاحب ان گنتے چنے اخبارات کو دو دو کتابیں بھیج کر جو شکستہ دل ہم ہوئے جو تنقید ہم نے خریدلی اس سے ہم نے کان پکڑ لیے اسی کا شاخسانہ سمجھ کر مزید کتابیں تبصرے کیلئے نہ بھیجی جائیں۔

جب مسودہ شائع کرنے کی آپ سے بات چیت ہوئی تھی اس لمحہ آپ نے فرمایا تھا کہ اس کتاب کی نکاسی میں آپ ہماری امداد فرمائیں گے یعنی اپنے حلقۂ ارباب میں یا جہاں آپ کا اثر و رسوخ چلتا ہے اس کی بکری میں کچھ معاونت کریں گے لیکن آپ اب اس معاملہ میں اس نکتہ پر بالکل خاموشی اختیار کر گئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل اردو میں قاری کم ملتے ہیں یعنی ایسے قاری جو کتاب نقد دام دے کر اسے پڑھیں زیادہ تر قاری (خواہ وہ اردو کے ادیب و شاعر ہوں یا اساتذہ، سرکاری افسر ہوں یا سیاسی رہنما) یہی شوق اور خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں اردو کی ہر کتاب بالکل مفت یعنی اعزازی طور پر پہنچتی رہے اور وہ اردو کی اس طرح سرپرستی فرماتے رہیں۔ اب بھلا آپ ہی قیاس کیجیے۔ کہ اگر اس برصغیر میں بیشتر قاری مفت میں کتاب ہتیانے کے درپے ہوں تو ہم نے جو ہزاروں روپے آپ کی کتاب پر خرچ کیے ہیں، وہ خرچہ کہاں سے پورا ہوگا۔ کمائی کہاں سے کریں گے۔ ہم تو منافع کی بجائے خسارہ میں چلے جائیں گے۔ آپ کو رائلٹی کہاں سے دیں گے۔ آپ ہی غور فرمائیں کتنا سنجیدہ معاملہ ہے۔

رائلٹی کے لیے تو یہ بڑی معقول تجویز ہوگی کہ آپ اپنی دس اعزازی کتابوں کے علاوہ کم از کم دو سو نسخے ادارہ ہم سے خریدلیں۔ ۲۰۰ سو نسخے اسی لاگت پر دے دیے جائیں گے۔ کتاب کی مطبوعہ قیمت تو آپ کو ادا کرنی ہوگی، لاگت ہی لی جائے گی۔ اس تجویز سے ہمارے ادارے کا خرچہ تو کچھ نہ کچھ نکل آئے گا۔ دوسرے ہم تو تاجر لوگ ہیں کسی ادبی حلقوں کے قائل نہیں، انھیں آپ ہی سنبھالیے۔ ادھر اردو میں ہر قاری ادیب ہے شاعر ہے یا نقاد۔ آپ ان سب کا شوق پورا کر سکیں گے کہ حسبِ توفیق ان کو اپنی کتاب کا ایک نسخہ اپنے مبارک دستخطوں سے پیش کر سکیں گے اس طرح ان کی دعائیں اور نیک خواہشات حاصل کر سکیں گے۔ اس سے آپ کی مقبولیت بھی ہوگی خیر سگالی سے آپ کے احباب و قدردانوں کا حلقہ کچھ اور وسیع ہو جائے گا ہاں ہمارے تلخ تجربے کے باوجود اگر آپ اپنے وسیلے سے تبصرے لکھوانا چاہیں تو اپنے کھاتے سے کتابیں بھیج کر یہ شوق بھی پورا کر لیجیے گا۔

رائٹر کے لیے اس سے بڑا کوئی اطمینان نہیں کہ اسے اپنی کتاب کا صحیح قاری مل گیا۔ بلکہ آپ آرشمیدس کی طرح کہیے

"مل گیا قاری میری تخلیق کا"۔ ہمارا خیال ہے کہ مصنف کو ہر قیمت پر اپنے قاری اور اپنے قدر دان کا دل موہ لینا چاہیئے اس کے لیے اس کا کتنا ہی روپیہ پیسہ یا وقت ضائع ہو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ سچ مانیئے اردو کے قاری بھلا ملتے کہاں ہیں آج زیادہ تر فکشن یعنی ناول یا افسانہ پڑھتے ہیں۔ طالب علم تنقید و تحقیق کی کتابیں مطالعہ فرماتے ہیں عام آدمی صرف اخبار ہی سے تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ اور رہی شاعری تو آج کے زمانے میں تو یہ بکاؤ مال نہیں۔ یوں پانچ دس شعر ہر اردو داں یاد کر لیتا ہے۔ کبھی اداس ہو تو ان اشعار کو گنگنا لیتا ہے اور اگر گفتگو میں ضرورت پڑ جائے تو ادھر اُدھر حوالہ دے کر اس کے سہارے اپنی گفتگو کو ذرا آگے سرکا دیتا ہے اسے جاندار بنا دیتا ہے اور کچھ گفتگو میں دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔

ایک اور بات بھی آپ کو کہنا ضروری ہے کہ آپ نے اپنی کتاب کے لیے پیش لفظ فوراً بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ ہم دو تین ماہ اس کی خاطر انتظار کرتے رہے۔ لیکن آپ نے پیش لفظ نہیں بھیجا، دو تین خط یاد دہانی کے لیے بھی لکھے گئے لیکن آپ بالکل خاموش رہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصنیف میں ہماری اور آپ دونوں کی عزت اور قدر دانی کا معاملہ ہے چنانچہ ہم نے اپنے وسیلے اور رسوخ سے اردو کے ایک معتبر اور مستند نقاد جو پیش لفظ لکھنے میں بڑے ماہر تسلیم کیئے جاتے ہیں سے آپ کی تخلیق کے لیے ایک مختصر مگر گول مول پیش لفظ لکھوا کر کتاب میں شامل کرا دیا ہے۔ اس سے اس کتاب کی سیل میں تو کوئی منافع کی امید نہیں، ہاں ادبی حلقوں میں آپ اس پیش لفظ کے منتخب جملے سنا سکتے ہیں کوئی مبصر آپ پر کچھ لکھنا چاہیئے تو اس پیش لفظ کے جملے ضرورتاً بطور حوالہ دے سکتا ہے اس طرح ایک اچھی خاصی البم آپ کے پاس تیار ہو سکتی ہے دوستوں کو دکھانے کے لیے۔

آپ کی اس عزت افزائی میں بھی ہمیں کچھ احسان مند ہونا پڑا۔ ان نقاد صاحب کا۔ خدا معلوم اس احسان کے چکانے میں بھی ابھی ہمیں کیا کچھ خرچ کرنا پڑے یعنی انھیں اپنی مطبوعات کا سٹ اعزازی طور پر پیش کرنا ہوگا یا پھر ان کی کوئی کتاب چھاپنا پڑے گا۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ چونہ کتنا اور کس وقت لگتا ہے۔

امید ہے کہ آپ باور کریں گے کہ آپ سے دوستی کوئی منفعت بخش نہیں ثابت ہوئی خیر کوئی بات نہیں یہ بیوپار میں منافع گھاٹا سب ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہم ایسے تاجر خسارہ برداشت کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، آخر میں آپ سے یہ عرض کرنا ہے بلکہ امید ہے کہ آپ ہماری اس صاف گوئی کو کسی غلط معنوں سے محمول نہیں کریں گے۔ اس کے لیے یہی موزوں ہوگا کہ آپ یہ خط پڑھنے کے بعد اسے تلف کر دیں یا جلا ڈالیں تاکہ کوئی غیر آدمی اسے پڑھ کر ہمارے درمیان غلط فہمی نہ پیدا کر سکے۔ بے تکلفی کی یہ سب باتیں آپ کو اپنا سمجھ کر لکھ دی ہیں کسی حوالے کے لیے نہیں۔ اگر ناشر دل کی بات اپنے مصنف سے نہ کہے تو اور کس سے کہے۔ کسی اور سے کہنے کو شکایت تصور کیا جاتا ہے اور اپنوں سے دل کی بات چھپانا کوئی دانشمندی کی بات نہیں۔ اور بات تو اتنی سی ہے کہ آپ کی خوش فہمی اور ہماری غلط فہمی سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچ

"اے معتبر فقیرو"

رحمت بُخاری

(حیدرآباد)

لٰلہ نے عقل دی ہے
یں دست و پا سلامت
بی دعا یہی ہے
کھئے خدا سلامت
یکن یہ پوچھتا ہوں
بوں بھیک مانگتے ہو ؟

ں نے دیا ہے تم کو
کاسۂ گدائی
ب تک چلے گی آخر
ہ بھیک میرے بھائی
ب تک بٹہ لگا کرو گے
دا کی بیٹیوں کو ؟

، غیرتی سے آخر
ب تک لٹکا کرو گے
وڑے کی رقم لے کر
حق ادا کرو گے
دانیت کو گھائل
ب تک کرو گے بولو ؟

یا میں صنف نازک
ہ اِک حسین سہارا
رت نے اپنے ہاتھوں
کو ہے سنوارا
تا میں زہر اُسکی
کیلئے نہ گھولو ؟

ہوگا ملن اُدھورا
کا مِل نہ مِل سکیں گے
دو جسم تو مِلیں گے
دو دل نہ مل سکیں گے
اپنی خودی کو سمجھو
اپنی خودی کو تولو ؟

بدظن ہے صنفِ نازک
اِس نوع کے ہر جواں سے
شادی نہ کیوں کرے پھر ؟
جا کر بڑے میاں سے
کب تک تنے رہو گے
بے درد بے ضمیرو
اے معتبر فقیرو !

■ نعیف شیخ ■

قیسی قمر نگری (کرنول)

قطعات

هر شخص کو ہر فن کا استاد بنا دینا
ہاں کوہِ ترقی کا فرہاد بنا دینا
پر مجھ کو مرے مولا تو اپنی نوازش سے
اک چیف منسٹر کا داماد بنا دینا

(۲)

ترقی کس طرح کر پائے اُردو
بتادے لے کرم فرمائے اُردو
تجھے سمجھا تھا میں بابائے اُردو
مگر تو ہے علی بابائے اُردو

(۳)

دگرگوں میرا غصّہ ہو نہ جائے
کہیں بیوی سے جھگڑا ہو نہ جائے
جو ہاتھا پائی تک آجائے نوبت
تو پھر بیوی ہی بیوہ ہو نہ جائے

غزل

تمہیں بامِ امارت سے گرا سکتا ہوں کیا کیجے ؟
یکایک معتبر شاعر بنا سکتا ہوں کیا کیجے ؟
مری طبعِ نزاکت کیش سے مشکوک مت ہونا
میں ہر اک دیگ سے ڈھکن ہٹا سکتا ہوں کیا کیجے ؟
میں سچا بھارتی ہوں یا نہیں ہوں کہہ نہیں سکتا
میں رشوت کھا نہیں سکتا کھلا سکتا ہوں کیا کیجے ؟
وہ ہو مغموم قیسی اکم سے کم تو ل کشی ہی میں
تمہیں میں غالبِ ثانی بنا سکتا ہوں کیا کیجے ؟

پریم شنکر سریواستو (جودھپور)

جو ہم حسین ہوتے!! ہوتیں؟؟

کبھی کبھی تو صاحب، خدا کی انصاف پسندی پر ہمیں بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ ثبوت کے طور پر، یہ حسن و خوبصورتی والی بات ہی لے لیجئے۔ کچھ انصاف نظر آتا ہے کہیں آپ کو؟ یعنی اب دیکھئے نہ، بعض صورتیں تو، مردوں اور عورتوں کی، وہ اس قدر فرصت اور اطمینان سے تراش تراش کر گڑھتا ہے، ان میں کچھ ایسی کشش انگیز خوبصورتی بھرتا ہے، کہ آپ اور ہم اگر سے

دیکھیں جو ان کا حسن تو بس دیکھتے رہیں!

لیکن جناب ان گنے چنے حسن کے مجسموں کے برعکس زیادہ بھرمار تو اس دنیا میں ایسی ہی صورتوں کی ملتی ہے، جنھیں دیکھ کر ہمیں یہ لگتا ہے کہ کسی بڑے، لیکن لاپرواہ قسم کے کمہار کی طرح خدا نے بھی مٹی کے ان انسانی پتلوں کو تھوک میں جلدی جلدی چاک پر گڑھا، اور ان کی کھیپ کی کھیپ اُٹھا کر دھرتی پہ ڈال دی۔

خدا کے کرم سے اور اپنی ہی بدقسمتی سے، ہم بھی تھوک میں گڑھے ہوئے، اِنھیں مٹی کے انسانی پتلوں میں سے ایک ہیں۔ جس کی بھی نظر ہم پر پڑتی ہے، بس منہ پھیر لیتا ہے۔

رشک ہوتا ہے، صاحب، ہمیں تو ان حضرت یوسفؑ پر جن کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے دنیا کا تین چوتھائی حسن ان میں بھر دیا تھا۔ تبھی تو مصر کی رانی زلیخا اُن پر دل و جان سے فدا ہو گئی تھی۔ یاد ہے نہ آپ کو وہ قصہ کہ جب زلیخا کی سہیلیوں نے اُسے طعنہ دیا: "ارے جانا تو ہی اتنی تعریف کرتی ہے یوسفؑ کی۔ تیرا یوسف تو مصر کے بازار میں سرِعام بکا ہوا ایک غلام ہے!" تو زلیخا نے اپنی سہیلیوں سے کہا: "اچھا! تو یہ لو تم سب کی سب اپنے ہاتھ میں ایک ایک چاقو اور ایک ایک لیمو۔ جیسے ہی یوسف اِدھر سے گزر رہے، تم چاقو سے لیمو کاٹ لینا۔" اور صاحب، ہوا یہ کہ جب یوسفؑ اِدھر سے گزرے تو اُن کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر زلیخا کی وہ سب سہیلیاں کچھ ایسے سکتے میں آگئیں، کہ بجائے لیمو کاٹنے کے سب نے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں!!

کچھ ایسا ہی حسن خدا نے انگلینڈ کے اُس مشہور شاعر لارڈ بائرن کو دیا تھا۔ کہتے ہیں، کہ جب بھی کہیں لارڈ بائرن

گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی سڑکوں یا گلیوں سے گزرتا تھا، تو حسین دوشیزاؤں کے والدین اپنے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیا کرتے تھے کیوں کہ انھیں یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ بائرن کے حسن کا جادو جو اُن کی لڑکی پر چل گیا، تو بیچاری دیوانگی محبت میں گھل گھل کے خودکشی کر لے گی! لڑکیوں کے والدین اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ محبتیں ٹھکرانا لارڈ بائرن کی خاص ادا ہے۔ اور پھر اکیلا ایک لارڈ بائرن بھلا کتنی دوشیزاؤں کو سنبھالتا! یعنی گویا وہی "ایک انار اور سو بیمار والا مضمون"!

اسی طرح صاحب، ہمارے کالج کے زمانے میں، ایک بڑا سجیلا کشمیری نوجوان ہماری کلاس میں پڑھتا تھا۔ پڑھائی میں! تو وہ خیر جیسا تھا ویسا تھا، لیکن شکل و صورت خدا نے اسے ایسی دی تھی کہ بس کسی پرستان کا شہزادہ لگتا تھا وہ۔ اس کے لب و لہجے میں، اس کی چال ڈھال میں، اس کے کپڑے پہننے کے انداز میں، گویا اس کی مجسم پرسنلٹی (PERSONALITY) میں بلا کی کشش تھی۔ اونچے اونچے گھروں کی رئیس زادیاں اکثر اُسے گھیرے رہتی تھیں، کبھی کالج کینٹین (CANTEEN) میں اور کبھی شہر کے بڑے کافی ہاؤس میں۔ کبھی اس کی خاطر پکچر کا پروگرام بنا رہی ہیں، یا پکنک رکھ رہی ہیں، یا اپنی برتھ ڈے پارٹی میں اسے مدعو کر رہی ہیں! ... یعنی اچھا خاصہ ہیرو یا پرنس چارمنگ (PRINCE CHARMING) بنا ہوا تھا ہمارا وہ کشمیری دوست، اِن رئیس زادی ہیروئینوں کے بیچ ... یا یوں کہہ لیجئے اتنی گوپیوں کا وہی تو ایک کنہیا تھا"!

... اور پھر کچھ سال گزرنے کے بعد ایک اخباری اشتہار سے ہمیں معلوم ہوا، کہ گوپیوں کا یہ سجیلا کشمیری کنہیا ایک فلم کمپنی کی نئی پکچر میں سچ مچ کا ہیرو بن کر آرہا ہے۔ اور پھر تو متواتر کئی برس تک ہم فلمی پردے پر اپنے اُس دوست ہیرو کو دیکھتے رہے۔ فلمی پردے کے پیچھے اس کی حسین شخصیت نے اور کیسے کیسے کرشمے دکھائے ہوں گے، کیسے کیسے گرم جیتے ہوں گے۔ اس کا تصور ہم آپ پر ہی چھوڑے دیتے ہیں۔ بس تصور کرتے رہیئے اور رشک کرتے رہیئے صاحبان آپ اُس کی خوش قسمتی پر۔ خدا کی بھید بھاؤ والی نیتی کے آگے آپ اور ہم جیسے مٹی کے پتلے بھلا اور کر بھی کیا سکتے ہیں! آخر کیا کھا کر برابری کریں گے آپ اور ہم اس PRINCE CHARMING کی، گوپیوں کے اس کنہیا کی!! اجی جناب ؎

"یہ بھی قسمت کسی کسی کی ہے"!

یوں صاحب، آپ اور ہم جیسے کچھ سر پھرے قسم کے مرد کتنی ہی تمنا پالے رہیں حسین ہونے کی، اور کتنے ہی کوستے رہیں اپنی قسمت کو، یا اپنے خدا کو، کہ ہمیں حسین نہیں بنایا، لیکن حقیقت تو یہ ہے جناب، کہ حسن تو دراصل عورت کو ہی زیب دیتا ہے۔ اسی کا زیور ہے۔

تو جناب، حسن جب عورت کا ہی خاصہ ہے، تو ہم مرد لوگ کیوں پریشان ہوں خواہ مخواہ اس کے لئے اور کیوں شکایت کریں قسمت سے یا خدا سے: "ہائے ہم حسین نہ ہوئے"؟ ہمیں اپنے حسن کا کوئی مینا بازار تو لگانا ہے نہیں۔ اور پھر فانی حسن کو ہی لیے ہم اُسے آخر کب تک اوڑھتے یا بچھاتے رہیں گے!

یونان کا وہ عظیم دانشور، وہ مہان گیانی اور دِچارک سقراط (SOCRATES) کیا وہ جسمانی لحاظ سے حسین تھا؟ ... پستہ قد، چھوٹی بھدی سی ناک، ڈھول جیسا پیٹ، جھکے ہوئے کندھے .. لیکن دماغی خوبیاں اس میں ایسی تھیں کہ ساری دنیا لوہا مانتی ہے اس کا آج تک اور مانتی رہے گی روز قیامت تک۔

امریکہ کے اس مشہور پریزیڈینٹ ابراہم لنکن (ABRAHAM LINCOLN) کی بھی تصویر تو دیکھی ہی ہوگی آپ نے۔ [illegible] دبلا پتلا، ڈھیلا، ڈھالا جسم، چہرہ پہ دھنسی ہوئی آنکھیں، پھیلے پھیلے سے ... [illegible] ... لیکن کس قابلیت سے اس نے اپنے دیش کے اندرونی

سکلٹ کا مقابلہ کیا اور اُس کی تقسیم کی نوبت نہیں آنے دی۔ کتنی محبت تھی اُسے اپنے دیش سے، اور کیا درد تھا اُس کے دل میں اپنے دیش واسیوں کے لیے!

کیوں، گاندھی جی کی یاد آ گئی نہ آپ کو؟ ہاں، یوں دیکھنے میں گاندھی جی ہی کون سے حسین تھے۔ پھر بھی اپنے آتمک بل سے پولیس ہلا کر رکھ دیں انھوں نے برطانوی حکومت کی!

تو بھائی جان، یاد رکھیے، آپ کی صورت خدا نے چاہے کتنی ہی لاپرواہی سے کیوں نہ بنائی ہو، لیکن آپ میں اگر صلاحیت ہے، تو یقین جانیے، تو اچھے اچھے حسن کے شہزادے پانی بھریں گے آپ کے آگے۔ ان کا حسن تو وقت کے تقاضوں کے آگے جلدی ہی گھٹنے ٹیک دے گا، لیکن آپ کے سنہرے کارنامے صدیوں تک وقت کی فضاؤں کو مہکاتے رہیں گے۔

تو میرے حضور، یہ حسین بننے کی تمنا تو آپ لڑکیوں اور عورتوں کے حصے میں ہی رہنے دیجیے۔ وہ چاہیں تو مصر کی کلیوپیٹرا بنیں یا TROY کی ہیلن، دُشینت کی شکنتلا بنیں، یا الہ دین والی پدمنی، چاند بن کر دھرتی پر چمکیں، یا ستارہ بن کر فلمی دنیا میں جگمگائیں، اپنے ہی ملک کی بیوٹی کوئین (BEAUTY QUEEN) بنیں، یا مس یونیورس MISS UNIVERSE اور اگر زیادہ نہیں تو چاہے ایئر ہوسٹس (AIR HOSTESS) بنیں، ماڈل گرل بنیں، یا پھر کسی بڑی کمپنی میں سیلس گرل (SALES GIRL) یا کسی فائیو اسٹار ہوٹل (FIVE STAR HOTEL) میں ریسپشنسٹ (RECEPTIONIST)!

حسن کی خواہشمند، جو صاحبزادیاں یا محترمائیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ قدرت نے یا خدا نے، حسن کے بٹوارے کے معاملے میں، ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، تو انھیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے شہروں کے بیوٹی پارلرس (BEAUTY PARLOURS) آخر کس لیے کھلے ہیں! ان میں جائیے، اور ملکۂ حسن بن کر باہر آئیے!

لیجیے، چلتے چلتے، اسی سلسلے میں ایک خوشخبری بھی سن لیجیے۔ لیکن ہے یہ خوشخبری صرف عورتوں کے لیے۔ مرد حضرات ہمارے اگلے اعلان کا انتظار کریں! خوشخبری یہ ہے کہ ہمارے کچھ SCIENTISTS بہت جلدی ہی ایک WOMEN'S BEAUTY COMPUTER ۔ ویمنس بیوٹی کمپیوٹر کی ایجاد کرنے والے ہیں۔

خدا نے آپ کو، چاہے کیسی ہی شکل و صورت دے کر اس دنیا میں بھیجا ہو لیکن یہ BEAUTY COMPUTER صرف پندرہ منٹ میں آپ کو ایکدم بالکل اسی حسن کے سانچے میں ڈھال دے گا جس کی کہ آپ فرمائش کریں گی: ....

... کیا کلیوپیٹرا والی ناک چاہیے آپ کو؟ ضرور ملے گی... ہرنی جیسی آنکھیں چاہتی ہیں آپ ایکدم ویسی ہی ملیں گی!... گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ؟ ہاں وہ بھی ملیں گے آپ کو!... چکنے گالوں پہ ہلکی سی لالی؟ ایک کالا تل؟ اور جب ہنسیں تو ایک ہلکا سا گڈھا بھی پڑے آپ کے گالوں پر؟... ہاں، ہاں، یہ سب ہو جائے گا... صراحی دار گردن لیجیے، مرمریں بانہیں لیجیے، نازک سی مخروطی انگلیاں لیجیے، ناگن سی لہراتی سیاہ زلفیں لیجیے، پتلی بل کھاتی کمر لیجیے... گویا، سر سے لیکر پاؤں تک اپنے جسم کا جو بھی حصہ آپ حسین اور جاذبِ نظر بنوانا چاہیں گی، ایکدم ویسا ہی بن جائے گا... اور اگر آپ چاہیں گی کہ پورا جسم ہی آپ کا ہیلن آف ٹرائے کے سانچے میں ڈھل جائے، یا اس میں عمر خیام والے ساقی کی بات پیدا ہو جائے یا آپ بغداد کی حور نظر آئیں، یا رنبھا، مینکا، اُروشی جیسی اپسراؤں کا حسن آپ کے جسم میں اتر جائے.... یا اگر آپ چاہیں کہ آپ کی سب سے پسندیدہ فلمی ایکٹریس کی ساری کی ساری خوبصورتی آپ میں سما جائے، تو وہ سب بھی ہو جائے گا۔

ہمارے SCIENTISTS کے اس کراماتی WOMEN'S BEAUTY COMPUTER کا یہی تو سب سے بڑا کرشمہ ہوگا!!

لیکن... صاحبزادیو اور محترماؤ! حسین سے حسین تر بننے کی آرزو پالنے سے پہلے ایک مشہور اردو شاعر کا یہ شعر بطور ہدایت کے ضرور یاد رکھیئے

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی!

ہمیں ڈر ہے کہ اس "بری نظر" کے طفیل کہیں آپ کے حسن پر وہ قیامت نہ ٹوٹ پڑے، جو ہیلن پر کلیو پیٹرا پر اور پدمنی پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اگر ایسا کچھ ہو گیا، تو آپ خود ہی اپنے حسن سے تنگ آکر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گی:

"بڑی حسین سے گزرتی
جو ہم حسین نہ ہوتے!!"

□□

غزلیں

مجیب الرحمٰن بزمی (دلاچی)

ہاتھوں میں ان کا ہاتھ غزل کہہ رہا ہوں میں
پہلو میں کائنات غزل کہہ رہا ہوں میں

ٹھنڈک کے باوجود نہ کمبل کی فکر ہے
کٹ جائے گی یہ رات غزل کہہ رہا ہوں میں

گھر کی ضروریات کا رونا نہ رو ابھی
اے میری کائنات غزل کہہ رہا ہوں میں

لفظوں کے پیرہن سے سراپا کو ڈھانپ دوں
روٹھو نہ آج رات غزل کہہ رہا ہوں میں

بچوں کے شور و غل میں بھٹک جائے گا خیال
رو کو یہ واہیات غزل کہہ رہا ہوں میں

شاہ حسین نہری (بیڑ)

بہت پامال ہو کر رہ گیا ہے
کہ گھر اب جال ہو کر رہ گیا ہے

سدا سورج چھپا کرتے ہیں اس سے
مکاں غربال ہو کر رہ گیا ہے

ہر روزن میں آنکھیں حال مخفی
کھلا احوال ہو کر رہ گیا ہے

سیاست بازیوں میں ابن آدم
بڑا فٹ بال ہو کر رہ گیا ہے

سید عباس متقی (حیدرآباد)

ہمارا گھر

کبھی کبھی ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہمارا گھر، گھر ہے یا گھونسلہ، پھڑپھڑاتے ہوئے جب ہم اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ فوراً ہی خارج بھی ہو جائیں، قسمت سے ہم ایک شاعر ہیں اور عادت سے نفاست پسند بھی مگر یہاں دیکھتے ہیں کہ ادھر بیٹ ادھر تھوک ہر چیز اپنے محور سے ہٹی ہوئی بچوں کا اُدھم، بیوی کی پکار تو آپ خود سوچئے کہ ایک سلیم السمع پر کیا گزرے گی، جب ہم مدرسے پڑھا پڑھا کر گھر لوٹتے ہیں تو بیگم ہمیں پڑھنے لگتی ہیں۔ ہم جو بجائے خود ایک بوسیدہ کتاب ہو چکے ہیں مزید جگہ جگہ سے پھٹنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات تو ہمارا شیرازہ ہی بکھر جاتا ہے اور ہم باہر کے چبوترے پر بیٹھ کر خود کو یکجا کرنے میں مشغول ہو جاتے رہتا۔

گھر اگر صاف ستھرا سلیقہ مندی کا نمونہ ہو اور خوب صورت بھی ہو تو گھر کہنے کو جی چاہتا ہے ورنہ گھاؤ خانہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ کبھی کبھی موڈ میں آکر گرمیوں کے دنوں میں ہم باہر ٹاٹ بچھا کر سازِ غربت پر سہگل کا یہ گیت الاپنے لگتے ہیں۔

اک بنگلہ بنے نیارا

اور ہماری یہ تمنا اس طرح پوری ہوتی ہے کہ سامنے ہی ایک بنگلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں فقط ایک کمی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ اپنا نہیں ہوتا، سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی فقط اپنی چیز سے ہی لگاؤ کیوں رکھتا ہے دوسرے کی چیز سے کیوں دلچسپی نہیں رہتی ہم نے ایک ترکیب سوچ لی ہے کہ سارے ہندوستان کو اپنا کہہ لیں اس طرح ہم مفت میں شہنشاہِ بابر بنے رہیں گے اگرچہ کہ ملکیت میں میری گلی میں کوئی چبوترہ بھی نہ ہو۔

گھر والی سے گھر ہوتا ہے یہ مقولہ سننے میں آیا ہوگا لیکن ہمارے یہاں بات ذرا برعکس ہے۔ گھر والی ہی سے گھر نہیں ورنہ اگر ہم اکیلے ہوتے تو ہر چیز سلیقے سے لگی ہوتی اگر کوئی اور چیز نہیں تو کم از کم ہم تو کہیں سلیقے سے لگے ہوتے مگر ہم نے گھر بسا کر گھر برباد کر لیا سارے ارمان دو، چار بچوں کی آمد کے بعد رفو چکر ہو گئے اور اب ہم چکراتے پھر رہے ہیں، گھر میں غربت نہ ہو تو گھر جنت کا نمونہ ہوتا ہے لیکن جب غربت کا گھیرا ہو گیا تو اس گھر کا اب خدا ہی حافظ ہے۔

زمانہ دراز بعد ایک صاحب کو ہم نے بدقت تمام مدعو کیا تھا پتہ بتلایا تھا کہ سرکاری بیت الخلاء کے اختتام پر ایک کچرے کی کنڈی ہے وہاں سے آگے جانے کے بعد ایک بہت بڑا گڑھا آتا ہے جس میں شہر کے حجام اپنا کچرا لا ڈالتے ہیں اس کے دو چار قدم کے بعد ہی ہمارا گھر ہے۔ گھر کی نشاندہی کے لیے بتایا تھا کہ جس دروازے پر کوئلے سے کوئی نادر الوجود گالی لکھی ہوگی وہی اپنا دولت کدہ ہے۔ زنجیر کسی احمق نے چرالی ہے۔ ایک آدھ ٹھیکری سے دروازہ بجا لیجیے گا۔

ہمارے گھر کا جغرافیہ بھی عجیب و غریب ہے، گھر میں داخل ہونے کے بعد نکلنے کا راستہ دریافت کرنا پڑتا ہے مگر افسوس کہ نو وارد اسی چکر میں باب الداخلہ سمجھ کر بیت الخلاء میں گھس جاتا ہے۔ پیچھے کا دروازہ ذرا چھوٹا واقع ہوا ہے یہ ہمارا فرار کا ذریعہ ہے کہ اکثر کھاتے والوں کو اس دروازے کا اندازہ نہیں کیونکہ دونوں دروازے الگ الگ محلے میں کھلتے ہیں اور ہم دونوں ہی کو استعمال کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رات کے کوئی ڈھائی بج رہے ہوں گے کہ ایک روتی صورت ناآشنا نے آکر ہمیں جگایا ہم سمجھے کہ ہمارا سالا ہوگا مگر سالا چور نکلا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا صاحب! چوری کرنے آیا تھا مال کچھ بھی نہیں گھر بھوت خانہ ہے آپ کی چرائی ہوئی شیروانی آپ کو مبارک۔ خدا کے لیے نکلنے کا راستہ بتا دیجیے، کئی بار کھل جا سم سم بھی کہہ چکا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے اس بھوت خانے میں آیا ہی کیوں اور آیا بھی تو کدھر سے۔ ہم نے جھٹ سے شیروانی لے لی اور پورے بٹن گن لیے بعد اس کم نصیب کو راہ فرار دکھا دی۔

ہمارے گھر کی چھت فرش سے بہت قریب ہے۔ اگر ہمیں باورچی خانے سے گھر کے دوسرے کمرے میں جانا ہوتا ہے تو دالان کا حصہ بیٹھ کر سر کرتے ہیں اور یوں بھی ہم اپنے گھر چلنے سے زیادہ رینگنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں چھت اتنی جگہ سے ٹپکتی ہے کہ بچے حمام میں نہیں نہاتے۔ ہمارے گھر کے اکثر دروازے پٹوں سے بے نیاز ہیں۔ اگر قسمت سے ایک آدھ دروازہ مکمل ہو تو زنجیر کی غیر موجودگی ناگزیر ہے۔

ہمارے گھر میں سب سے زیادہ تکلیف دہ ہمارا بیت الخلاء ہے اس کے تصور ہی سے بعض کی اجابتیں شروع ہو جاتی ہیں اور بعض کی تہہ تنگ و تاریک درے سے گزر کر منزل مقصود تک پہنچنا پڑتا ہے۔ ہم یہ راستہ ٹٹول کر طے کرتے ہیں۔ آتے جاتے تالو کا زخمی ہونا ضروری ہے۔ نہ جانے کیوں ہمیں شاعری کچھ ایسے ہی موقع پر سوجھتی ہے اور یک بیک گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم مرغانہ بن بیٹھے ہوں۔ آس پاس اس قدر تاریکی رہتی ہے کہ کارہائے بیگراں خو سے کہنہ کے محتاج رہتے ہیں۔

ہم نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک تختی لگا رکھی ہے کہ "لمبے آدمی کا داخلہ منع ہے" لیکن اس کے باوجود اکثر ہم نے سالوں کو دیوان خانے میں پایا ہے۔ محلے کے شریر بچے ہمارے گھر کے دروازے کو کینوس تصور کرتے ہوئے مختلف ڈیزائن کی لچر تصاویر، پختہ گالیاں اور رکیک فقرے لکھ دیتے ہیں۔ ایک دن کسی نے لکھ دیا "احمق گھر پر نہیں ہے"۔ ہم جھنجھلاتے ہوئے گھر میں گھسے سیکل پونچھنے کا کپڑا لیکر باہر نکلے تو لکھا دیکھا "اب آچکا ہے"۔

وو ٹینگ کے زمانے میں ہماری مرحوم جانے بغیرا حمقوں کے نمائندے ہمارے گھر کی مختصر دیوار کو اشتہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عجیب احمق ہیں ابھی سیٹ ملی نہیں اور اپنی چلا رہے ہیں۔ اور یہ کام رات بجے کوئی تین بجے ہوتا ہے جبکہ ہم خواب خرگوش یے گوشہ میں محو ہوتے ہیں۔

ہمارے گھر میں ایک عدد حمام بھی ہے۔ اس حمام میں سب کچھ تو کیا جاسکتا ہے لیکن نہایا نہیں جاسکتا۔ اگر کبھی کوئی غلطی سے نہا لیتا ہے تو پھر اسے تیرتے ہوئے نکلنا پڑتا ہے۔ ہم غریب ہیں اس لیے زیادہ نہیں نہاتے۔

ایک دن ہمارے گھر کوئی مہمان تشریف لے آئے۔ اکثر مہمان ہمارے ہاں غلطی ہی سے آتے ہیں اور شاید پہلی بار ہی آتے ہیں کیونکہ ناشتہ کا بار ان ہی کے سر ہوتا ہے۔ ہم نے انھیں سونے کے لیے چارپائی پیش کی اور دالان میں انتظام کر دیا۔ آدھی رات گئے ہم نے اپنی رضائی میں کسی کو گھستا ہوا پایا ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ گھسنے والا ہمارا نووارد مہمان تھا کہنے لگا! مولانا! — ناٹ ٹرٹکی ہوئی ہے۔ مزید براں چوں چرچرا کی آوازوں سے بہت خوف ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب گرا چاہتی ہے۔ ہم نے انھیں دلاسہ دیا کہ صاحب! ہم ذاکر آدمی ہیں ہماری چھت بھی رات دیر گئے ذکر کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب ذکر کرلے لیکن مجھے سجدہ کا خدشہ ہے۔ ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور اپنا کلام سنا سنا کر صبح کر دی۔

ہمارا گھر کافی چھوٹا ہے لیکن بحمد للہ دل بہت بڑا ہے۔ کتنی تعجب خیز بات ہے کہ جن لوگوں کے دل بڑے ہوتے ہیں ان کے گھر بڑے نہیں ہوتے اور جن کے گھر بڑے ہوتے ہیں ان کے دل بڑے نہیں ہوتے مگر یہ کلیہ علی الکل بھی نہیں ہر نکتہ میں استثنائی صورتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ گھر ہو یا گھروندہ مٹنے ہی والا ہوتا ہے۔ مگر لوگ گھروندے کو فنا اور گھر کو بقا کا درجہ دیتے ہیں اس میں ان کا قصور نہیں بلکہ ان کی ناتجربہ کار نظر کا قصور ہوتا ہے کیونکہ گھروندہ اُن کے آگے اور گھر اُن کے بعد فنا ہوتا ہے لیکن عقلمند ہمیشہ اپنے گھر کو گھروندہ ہی سمجھتے ہیں اسی لیے وہ اپنے گھر کو سراہتے بھی نہیں۔ حمقا چونکہ اُمید کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اِس لیے انھیں ہر وعید میں واؤ مفقود نظر آتا ہے۔

بہرحال ہم اپنے گھر کو زیادہ نہیں سراہتے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم اپنے گھر کو نہیں گھروندہ ہی سمجھتے ہیں۔!

غزلیں

غلام مسکین ادیبؔ سندیلوی

کیسے لیڈر بنائیں کوئی اس قابل نہیں ملتا
یہاں بدھو میاں ہیں سب کوئی عاقل نہیں ملتا

عمل پڑھ کر ملا دے جو مرے محبوب سے مجھ کو
مجھے اس دور میں ایسا کوئی عامل نہیں ملتا

اعزّہ خونِ ناحق کا مرے دعویٰ کریں کس پر
پولیس کو شک ہے جس پر حیف وہ قاتل نہیں ملتا

حسینانِ جہاں سے دل لگانا بھی قیامت ہے
کسی کو دل اگر دے دو تو واپس دل نہیں ملتا

سیاست داں نہ جسکو کر سکیں حل روزِ آخر تک
معلّم کو سوال ایسا کوئی مشکل نہیں ملتا

حسین و مہ جبیں جسکی دعا سے ہوں مرے تابع
مجھے دنیا میں ایسا صوفیِ کامل نہیں ملتا

سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کیوں لڑتے ہیں آپس میں
بظاہر دیش میں اب ایک بھی جاہل نہیں ملتا

بلا رشوت کرے جو فیصلہ میرے مقدمے کا
ادیبؔ اس دیش میں ایسا کوئی عادل نہیں ملتا

تھپیڑؔ عادل آبادی

کھٹمل جگہ جگہ ہیں تو مچھر جگہ جگہ
ڈر سے بدلتے رہتا ہوں بستر جگہ جگہ

پھرتا ہوں نوٹ لیکے برابر جگہ جگہ
ملتا نہیں ہے دوستو چلر جگہ جگہ

ہر سمت عاشقوں کی ہے بھرمار ان دنوں
کھلنے لگے ہیں عشق کے سنٹر جگہ جگہ

سیزن جو آگیا ہے الیکشن کا ٹاپ پر
کرتے ہیں دورہ ان دنوں لیڈر جگہ جگہ

تہذیب کو ہماری خدا جانے کیا ہوا!
شرفاء بھی اب تو بن گئے ہوٹر جگہ جگہ

لگتا ہے میکدے میں ہوئی پھر سے کوئی جنگ
ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و ساغر جگہ جگہ

ہنڈی پیلا! جن کا مقدّر تھا دوستو!
پھرتے ہیں لیکے ان دنوں موٹر جگہ جگہ

جہلا کے سر پہ تاج ہے ان کا ہی راج ہے
پھرتے ہیں مارے مارے سخن ور جگہ جگہ

تھپیڑؔ ہمارے دیش کو کس کی نظر لگی
گولی جگہ جگہ ہے تو خنجر جگہ جگہ

عابد معز (حیدرآباد)

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

شہر حیدرآباد پر مضامین کا سلسلہ

انوکھا احتجاج

بچپن میں پڑھی اور سُنی ہوئی کہانیاں اکثر ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ جب بھی کوئی مِلتا جُلتا واقعہ در پیش ہوتا ہے تو وہ کہانی یاد آتی ہے۔ ایک ایسی ہی کہانی ہمیں یاد آ رہی ہے۔ حضرت شیطان کو اپنی کارستانی دکھانا مقصود تھا۔ وہ اٹھے اور مٹھائی کی دکان گئے۔ وہاں کڑھائی میں تازہ مٹھائی تیار ہو رہی تھی۔ حضرت شیطان دیوار پر شہد کی ایک بوند چپکا کر ایک کونے میں معصومیت سے بیٹھ گئے۔ شہد تناول کرنے کچھ چیونٹیاں اور مکھیاں اکٹھا ہونے لگیں۔ چیونٹیوں اور مکھیوں کو اپنی غذا بنانے کے لیے کہیں سے چھپکلی آ دھمکی۔ چھپکلی کو دیکھ کر بلی اس پر جھپٹی۔ بلی کی تیزی کو دیکھ کر مٹھائی والے کا کتا جو اُونگھتے بیٹھا تھا ہڑبڑا کر اُٹھا اور بلی کے پیچھے لپکا اپنا اپنا مقصد حاصل کرنے کی اس دوڑ میں دکان کی کئی چیزیں اِدھر اُدھر گریں اور بالآخر بلی شیرینی کی کڑھائی میں جا گری ـــــ کچھ ایسی ہی افراتفری اور بھونچال ہمارے شہر میں آیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن معمول کے مطابق رات کو آرام سے سو کر اُٹھے اور اخبار دیکھنے پر پتہ چلا کہ "تحفظات" میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور پھر جناب تحفظات میں اضافہ کے خلاف احتجاج شروع ہوا۔

ھڑتال کے نام سے ہمارا روم روم لرز اُٹھتا ہے۔ احتجاج کے دوران سرکاری اور خانگی املاک کو جلایا جاتا ہے۔ فائرنگ ہوتی ہے تعلیمی ادارے اور دفاتر بند رہتے ہیں۔ لاکھوں اور کروڑوں روپیوں کا نقصان ہوتا ہے عوام اور پولیس میں ٹھن جاتی ہے۔ انسانوں کی جانیں الگ تلف ہوتی ہیں۔ ۱۹۶۹ء کے تاریخی تلنگانہ ایجی ٹیشن اور گجرات میں مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کو یاد کر کے ہم حواس باختہ ہو گئے۔ کلیجہ الگ منہ کو آ رہا تھا خدایا اب کی بار کیا ہوگا۔ خدا کے فضل و کرم سے پہلی مرتبہ ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ مخالف تحفظات ایجی ٹیشن اپنی طرز کا انوکھا، انفرادی اور پرامن ایجی ٹیشن رہا۔ ہمارے ایک بزرگ نے فرمایا "میاں ہمارا ملک اسی طرز کے ہنگاموں کے لیے مشہور ہے۔ آہنسا وادی اور ستیہ گرہی احتجاج کے ذریعہ ہم نے آزادی حاصل کی تھی"۔ یہ بات نہیں کہ مخالف تحفظات احتجاج میں کچھ نہیں ہوا۔ نت نئے انداز سے عوام کو اپنے مسائل سے آگاہ کیا گیا۔ احتجاج کے دوران ہر دن کچھ نیا گل کھلتا۔ حیدرآبادی شہری تجسس اور خوشی سے انتظار کرنے لگے کہ آج کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ شہریوں کو مایوسی نہیں ہوتی۔ ہر روز کچھ نئے انداز اور نئے ڈھنگ سے احتجاج

جاری رہا۔

ہر احتجاج کی بنیاد جلوس پر ہوتی ہے۔ جتنا شاندار جلوس ہوگا اتنا ہی موثر احتجاج۔ جلوس میں لوگ حلق پھاڑ کر زندہ باد مُردہ باد، ڈاؤن ڈاؤن، ظلم بند کرو، ہمارے مطالبات تسلیم کرو وغیرہ وغیرہ نعرے لگاتے ہیں۔ آس پاس سے گزرنے والی سواریوں کو پتھروں کا نشانہ بناتے ہیں۔ دکانوں کو بند کرواتے اور پولیس سے ہاتھاپائی کرتے ہیں۔ نتیجتاً پولیس لاٹھیاں اور گولیاں چلاتی ہے۔ لیکن جناب مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کے جلوس روایتی جلوسوں سے مختلف تھے۔ کوئی نعرہ نہیں لگایا گیا۔ جلوسی خاموشی سے اپنے اپنے ہاتھوں میں پہلے کارڈس، پوسٹرس اور بیانرس اُٹھائے چل رہے تھے کہ بھائی آپ چاہتے ہیں تو پڑھ لیجئے، جلوس کی وجہ کیا ہے۔ ہم کیوں آپ کی ساعت خراشی کریں۔ پاس سے گزرتے والی سواریوں کو ہٹ کر راستہ دیا گیا کہ بھائی ہم نہ آپ کا راستہ کاٹیں اور نہ آپ ہمارا راستہ روکیں نتیجتاً عوام نے جلوسیوں کا استقبال کیا اور جلوسیوں کو شیرینی پیش کی۔ ٹھنڈا پانی پلایا اور تازہ دم ہونے کے لیے پھل تک دیئے۔ جلوسیوں میں جو خشوع وخضوع تھا ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عوام کی توجہ مبذول کروانے کے لیے چند جلوسی مختلف روپ دھارے گئے تھے۔ ہمارے شہر کی سیاست میں پہلے دل بدلی اور منسٹر بدلی کے مناظر تو ہم نے دیکھے تھے اب احتجاجیوں نے روپ بدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جانوروں کا جلوس بھی نکالا اس جلوس کی قیادت ایک گدھا کر رہا تھا اور اس گدھے کے پیچھے بھیڑیں چل رہی تھیں لیکن چونکہ علامتی جلوس تھا اس لیے آپ چاہیں تو اسے "جدیدیت پسند" جلوس کا نام دے سکتے ہیں۔

مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کے دوران دیگر روایتی طریقے بھی اپنائے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بغیر ٹکٹ بسوں میں سفر اور ریلوے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کی گئی۔ سڑکوں پر اپنی مرضی کے مطابق سواریوں کو چلایا اور "نو پارکنگ" جیسے مقامات پر ٹھہرایا گیا۔ بھوک لگنے پر سرکاری ہوٹلوں، کینٹین اور دودھ کی دکانوں پر بغیر پیسے ادا کیے شکم سیر ہو کر کھایا اور پیا گیا۔ دل بہلانے کے لیے بلا ٹکٹ فلمیں بھی دیکھی گئیں شکر ہے بات یہیں ختم ہوئی!

"بند" احتجاج کرنے کا ایک لازمی جزو بنتا جا رہا ہے۔ احتجاجاً اپنے آپ کو بند کرنے سے لیکر شہر اور ریاست گیر بند تک منایا جاتا ہے۔ بند منانے کے بعد شہر خود بخود تشدد اور کرفیو کی وجہ سے کئی دن بند ہو جاتا ہے لیکن جناب مخالف تحفظات احتجاج کے دوران جس دن بند کے لیے کہا گیا صرف اسی دن شہر بند رہا اور جس مقام پر بند منایا گیا صرف وہی علاقہ بند رہا، ورنہ اکثر اوقات کبھی نیم بند تو کبھی برائے نام بند ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ صرف "اخباری بند" ہوتا ہے۔

احتجاج میں پہلا نشانہ بسوں کو بنایا جاتا ہے۔ ٹائیروں سے ہوا خارج کی جاتی ہے۔ آئینے پھوڑے جاتے ہیں سیٹوں کو پھاڑا جاتا ہے اور آخر میں بس کو جلایا جاتا ہے اس کے برخلاف مخالف تحفظات احتجاج میں بسوں کو صاف کیا گیا۔ ٹائیروں کی ہوا چیک کی گئی۔ اور آئینوں کو چمکایا گیا۔ کبھی کبھار احتجاجیوں نے بسوں میں بیٹھ کر اُسے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچایا جسے اغوا کا نام دیا گیا۔

مخالف تحفظات احتجاج اس نوعیت سے بھی منفرد رہا کہ اس میں ایجی ٹیشن کرنے کے چند نئے طریقوں کو روشناس کیا۔ احتجاجیوں نے خون کا عطیہ دیا۔ کسی کی روشنی کے لیے اپنی آنکھیں دان کیں، سڑکوں پر جھاڑو دی، پودے لگائے، گلی کوچے صاف کئے، عریاں پوسٹر نکال پھینکے، مریضوں میں دودھ اور پھل تقسیم کیے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اچھے کام کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا اور یہ کہ نیکی احتجاجاً نہیں خوشی خوشی کی جاتی ہے۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ اچھے کام اسی وقت انجام پاتے ہیں جب آبگینوں کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

کہتے ہیں تحفظات میں اضافہ سے میرٹ کا قتل عام ہوا۔ ہوشیار، محنتی اور ہونہار طالب علم کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ مایوس ہو کر احتجاجیوں نے اپنے صداقت نامہ جات کی کاپیاں نذر آتش کیں اور چھوٹے موٹے کام کرنے لگے۔ ڈاکٹروں نے جوتے پالش کرنے کی دکان لگائی۔ ہم نے اپنا جوتا ایک سرجن سے پالش کروایا تھا۔ صاحب موصوف نے سفید کوٹ پہنے گلے میں آلہ لٹکائے ہمارے جوتوں کو خوب چمکایا۔ وہ دن اور آج کا دن ہم نے ان جوتوں کو احتیاط سے اٹھائے رکھا ہے۔ پڑھے لکھے لڑکے اور لڑکیوں نے قلی کا کام انجام دیا، پھل پھلاری اور پھولوں کے گجرے بیچے ہماری بیوی نے چوٹی کے لیے پھول لٹریچر سے ایم اے کرنے والی طالبہ سے خریدا تھا۔ سوکھے پھولوں کو آج بھی وہ سنبھال کر رکھتی ہے اس لیے کہ اس طالبہ نے پھولوں کو سہاگ کی نشانی قرار دی تھی۔ طالب علموں نے موٹر اور موٹر سیکلوں کی صفائی کی، چائے اور بسکٹ کی دوکانیں قائم کیں۔ ابھی بھی ہمیں "تحفظات زدہ" چائے اور کافی کا مزہ یاد آتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو جوتے پالش کرتے، میوہ اور پھل بیچتے، کینٹین میں چائے بناتے، سڑکیں صاف کرتے اور ایسے ہی دوسرے کام کرتے ہوئے دیکھ کر ایک صاحب نے کہا "کیا وقت آن پڑا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو کیسے کیسے کام کرنے پڑ رہے ہیں۔ یہی ہوتا ہے جب اداکار، فیکٹری ورکر، پہلوان اور دوسرے ایسے ہی لوگ سیاست میں بے خطر کود پڑتے ہیں۔ کل جگ ہے کل جگ۔ کوّے موتی کھاتے اور ہنس دانہ دنکا چگتے ہیں۔

مخالف تحفظات احتجاج کرنے والوں نے اپنے مطالبات حکام پر عیاں کرنے کے بعد اوپر والے سے مدد چاہی۔ ایک دن "یوم دعا" منایا گیا۔ مساجد، مندر، چرچ اور گردوارہ میں احتجاجیوں نے اپنی فتح و کامرانی اور انصاف کے لیے دعا کی۔ یہ عمل ہمیں اچھا لگا۔ سیاست میں شاید پہلی مرتبہ ایک اچھے مقصد کے لیے عوام اوپر والے سے رجوع ہوئے ورنہ اکثر و بیشتر سیاست میں اوپر والے کو عوام کا استحصال کرنے کے لیے بیچ میں لایا جاتا ہے۔ خدا سے مدد طلب کرنے کے بعد احتجاجیوں نے اس کے بندوں کو مسئلہ تحفظات سمجھانا شروع کیا۔ پد یاترا کرتے ہوئے گھر گھر پہنچ کر عوام کو تحفظات میں اضافہ سے لاحق خطرات سے آگاہ کیا گیا۔ یہ مہم اس حد تک کامیاب رہی کہ جب ہم نے ایک رکشہ والے سے کرایہ کی بات چیت کی تو اس نے جواب دیا اگر آپ کو سرکاری تحفظات حاصل نہیں ہیں تو میرا رکشہ حاضر ہے ورنہ میں آپ کی سواری سے باز آیا۔

احتجاجیوں نے مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کو منفرد اور یادگار بنانے کے لیے دلچسپ حرکتیں بھی کیں۔ محکمہ تعلیمات کے کھاتے میں پانچ پیسے کی [illegible] کثیر رقم جمع کی۔ ایک اور خوبی یہ تھی کہ پانچ پیسوں کے لیے احتجاجیوں نے دس، بیس، پچاس اور سو روپے کے نوٹ پیش کیے۔ شہر کے سب سے بڑے بینک میں ڈھائی ہزار چالان وصول ہونے پر خزانے میں صرف ایک سو اکتالیس روپیوں کا اضافہ ہوا۔ میرٹ ایڈ دوڑ منعقد ہوئی۔ میرٹ کی مشعل لیکر دوڑ لگائی گئی۔ ایک جلوس میں میرٹ کا جنازہ اٹھایا گیا۔

جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں میں حصہ لینے سے ہر امن پسند شہری گریز کرتا ہے۔ والدین اپنی اولاد پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں کہ کہیں وہ جلسوں میں شرکت کرکے ان کے نام کو بٹہ نہ لگا دیں۔ لیکن جناب مخالف تحفظات احتجاج کے لیے والدین نے اپنے بچوں کو حصہ لینے کی بخوشی اجازت دی۔ انہیں اسکول اور کالجوں میں بھیجنے کے بجائے پر امن احتجاج کرنے کی تلقین کی۔ بچوں کو احتجاج کرنے کے لیے بھیج کر والدین کو تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے خود ایک سرپرستوں کا فورم تشکیل دیا اس فورم نے جلسے کیے، جلوس نکالے، بھوک ہڑتال کی

ریائی بکالی اور کام سے بائیکاٹ کیا۔ حالیہ عرصے میں شاید یہی ایک موقع تھا جب نوجوان نسل اور ان کے بزرگ صد فیصد متفق تھے۔ ان کے درمیان GENERATION GAP نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کی چند خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت اچھا تال میل اور میل ملاپ تھا۔ لڑکیاں، لڑکوں کے شانہ بہ شانہ احتجاج میں حصہ لے رہی تھیں۔ اس میل ملاپ کو دیکھ کر ہمارے ایک روشن خیال دوست نے اپنی خواہش کا اظہار کیا "نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں اس قسم کا تال میل اگر جہیز اور گھوڑے جوڑے کی لعنت کے خلاف بھی ہو تو ہمارا سماج اس برائی سے پاک ہو جائے گا" یہ سن کر ہمارے ایک دوسرے دوست نے جواب دیا "سماج سدھار ہوگا یا نہیں یہ الگ بات ہے لیکن جو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں- مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کے دوران ایک دوسرے کے قریب ہوئے ان کے نزدیک جہیز اور لین دین کی یقیناً کوئی اہمیت نہیں ہوگی"۔

مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کو سماج کے ہر طبقہ کی تائید حاصل تھی حتیٰ کہ ہمارے شہر کے آٹو رکشہ ڈرائیور جن کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی، انھوں نے بھی احتجاج کیا۔ "ہفتہ خوش اخلاقی" منایا گیا۔ اس ہفتہ میں سواریوں سے سیدھے منہ بات کی گئی اور انھیں سفر کا لطف اٹھانے دیا گیا۔ مزید یہ کہ آٹو رکشہ ڈرائیوروں نے اسپیڈ بریکر پر لکیریں کھینچیں تاکہ راہ گیر انھیں دور سے دیکھ کر ہوشیار ہو جائیں اور اس پر سے گذرتے وقت اچھل کر اپنی سواری یا اپنی لائف بریک نہ کریں۔

جس طرح سے مخالف تحفظات ایجی ٹیشن اپنے طرز کا منفرد احتجاج رہا اسی طرح سے ہوشیاری اور محنت سے نئے دلچسپ اور منفرد نعرے وضع کئے گئے سڑکوں کی صفائی کی مہم کو ایم سی ایچ یعنی میرٹ کارپوریشن آف حیدرآباد کا نام دیا گیا جوتے پالش کرتے وقت ایک نعرہ لکھا تھا "اپنا مستقبل آپ کے جوتوں کی طرح چمکانے کے لئے۔" مختلف دلچسپ نعرے وضع کرتے کے علاوہ چھوٹے بچوں نے نظمیں موضوع کیں۔ "بابا بلیک شیپ سے ایک چھوٹے بچے نے پوچھا" بابا میرے لیے کوئی سیٹ ہے؟ بابا بلیک شیپ نے جواب دیا "میرے پاس تین کرسے بھر سیٹیں ہیں۔ ایک کو ایس۔ سی۔ اور ایس۔ ٹی۔ کے لیے اور دوسرے دو بی سی کے لیے ہے۔ تمہارے لیے میرے کوٹہ میں کوئی سیٹ نہیں ہے"۔

مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کے دوران راکھی کا تہوار آیا تھا۔ احتجاجیوں بالخصوص لڑکیوں نے میرٹ کی حفاظت کے لیے کلائیوں پر راکھی باندھی سیاسی قائدین کی کلائیوں پر راکھی باندھنے سے گریز کیا گیا۔ جبکہ اخبار اور پولیس والوں کو بعد شوق راکھی باندھی گئی۔ احتجاجی لڑکیوں کو پولیس والوں کی کلائیوں پر راکھی باندھنے کا اقدام جلد ہی مل بھی گیا۔ ایک دن سکریٹریٹ کے سامنے پولیس والوں نے دھرنا دینے والی لڑکیوں کو مارا اور پیٹا۔ پولیس والوں کی اس حرکت کو دیکھ کر سکریٹریٹ کے ملازمین نعرے لگائے اور پھر پولیس والوں پر پتھر اور چپل پھینک کر مصرعہ طرح موزوں کیا۔ پولیس والوں نے بھی جواباً پتھر پھینکے اور پھر تو دو بدو پتھروں، جوتوں اور چپلوں کا مشاعرہ شروع ہوا۔ تشدد کا دور دورہ اور پولس کا بول بالا ہوا۔ یوں بھی ہماری پولیس اسی طرح کی EXTRA CURRICULAR حرکات کی وجہ سے مشہور ہے۔ مخالف تحفظات ایجی ٹیشن کے دوران یہی ایک واقعہ ہے جس میں تشدد ملوث تھا۔ یہ بھی پولیس والوں کی مہربانی تھی۔ بے چارے کچھ کم دو ماہ کے طویل عرصہ کے دوران صرف تماشائی بنے رہے تھے انھیں احتجاجیوں کے حریف بننے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس مرحلہ پر عدالت العالیہ نے حکومت کے احکام کو کالعدم قرار دے کر اس الو کھے ایجی ٹیشن کو فل اسٹاپ لگانے پر مجبور کر دیا ——!

بابو آر کے (مہاراشٹرا)

قِلّت کی ارزانی

ہمارا اور قِلت کا ساتھ اِتنا ہی دیرینہ اور مخلصانہ ہے جتنا کہ خلال کا دانتوں سے اور محکمہ موسمیات کا جھوٹ سے یا ہندوستانی خواتین کی ناک کا ساڑی کے پلو سے۔ انسان ہر دَور میں اس قِلّت کے عذاب کو جھیلتا آیا ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل گاندھیائی دَور میں نمک کی قِلّت نے ہر کسی کو چونکا کے رکھ دیا تھا، پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ شکر کی قِلّت نے ہمارے ذہنوں سے مٹھاس کا تصوّر بھی چھین لیا۔ اور کبھی گھاسلیٹ کی قِلّت نے ہاہاکار مچائی تو کبھی سمنٹ کی قِلّت نے قیامت ڈھائی۔ ویسے سمنٹ اور قِلّت کا عرصہ دراز سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور صحیح معنوں میں قِلّت کو استحکام اور مقبولیت سمنٹ ہی نے بخشی ہے۔ اس کی قِلّت نے ادنیٰ بیوپاری سے لیکر سرکاری افسروں اور وزیراعلیٰ تک کو ناکوں چنے چبوا دیئے اور ساتھ ہی ایک عالم پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ جمہوریت میں سمنٹ سے بھی پختہ اور مضبوط جکڑ رکھنے کی صفت والی شئے "اپوزیشن" ہے یا دوسرے الفاظ میں سمنٹ نے پختگی اور جکڑ رکھنے کی خو حزبِ مخالف سے مستعار لی ہے۔

آج قِلّت کی ریشہ دوانیاں سماج کے ہر طبقہ میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ بیوپاری طبقے میں جس طرح ایمانداری کی قِلّت ہے ویسے ہی وکلاء کے طبقے میں سچائی کی قِلّت۔ جہاں نوکری پیشہ طبقے میں فرض شناسی، نیک نیتی اور انصاف پسندی کی قِلّت ہے وہیں سیاسی طبقے میں ووٹر کے اغراض و مقاصد کی پاسداری اور جذبۂ ایفائے وعدہ کی قِلّت ہے۔ الغرض قِلّت کو اگر حکمت خداوندی کے طفیل انسانی پیکر یا مادّی وجود بخش دیا جاتا تو آج اِسے روئے زمین پہ مشکل سمانے کے لیے کم و بیش پورے ایک ہندوستان کے رقبے کی جگہ یقیناً درکار ہوتی۔ چونکہ بات قِلّت کی ہورہی ہے اس لیے ۱۹۸۵ء میں ریزگاری کی قِلّت کا ذکر نہ کرنا ایسا ہی تعجب خیز ہوگا جیسے کہ پولیس کے عملے میں ایمانداری کا پایا جانا یا اعلیٰ محکماتی افسران کی رشوت سے دُوری یا انتولے صاحب کی سمنٹ کے معاملے میں اپوزیشن سے رہائی۔

آج سارے دیش میں بھوک کا بے روزگاری کا لا اینڈ آرڈر کے مسئلے سے بھی پیچیدہ اور

لاینحل معمہ قلتِ ریزگاری کا مسئلہ ہے۔ جہاں اس سے ملک کا ہر ذی نفس پریشان ہے وہیں اس کی
ضربِ شدید براہِ راست فقراء کی معاشی کمر پر بھی پڑی ہے۔ ماضی میں بھارت واسیوں نے وہ بھی رنگین
دن دیکھے ہیں کہ پانچ دس کے نوٹ کو بھنواؤ اور تین نہیں تو دو جیبیں پانچ دس پیسوں کے سکوں سے ٹھونس
ٹھونس کر بھر لو۔ لیکن آج نوٹوں کی گڈیاں جیبوں میں اڑس کر بھی ریزگاری سے محرومی کا ملال ہے۔ ویسے
ادبی اصطلاح میں ریزگاری (یعنی چلر) بے وقعت کے معنوں میں مستعمل رہی ہے۔ لیکن سنہ ۸۴ء اور ۸۵ء
میں اس نے امتیازی صورت اختیار کر لی اور نادر و نایاب محبوبہ کی سند پالی ہے۔ آج ہمارے ملک کا کوئی بھی
شخص بھوانی تلوار اپنے ہاتھ میں اور کوہِ نور ہیرا ماتھے پر بہ آسانی چمکا سکتا ہے لیکن ریزگاری کی دستیابی
کے متعلق سوچنے کا تصور بھی امکانی دسترس میں نہیں۔ اس مسئلے کے وجود میں آتے ہی کتنی ہنستی کھیلتی ازدواجی
زندگیوں میں دراڑیں پڑنے لگیں کیونکہ شوہر کی جیب میں پڑی ریزگاری کے جملہ حقوق ابتدائے آفرینش سے
ہی بیویوں کے نام محفوظ رہے ہیں۔ اس ریزگاری کو بیویاں غصب کرتی آئی ہیں۔ من چاہے طریقے سے اسے
استعمال میں بالکل یوں لاتی ہیں جس طرح حکمراں جماعتیں اقلیتوں کو۔ یوں بھی جمہوری اصطلاح میں اقلیت
کو چلّر یا ریزگاری سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ خیر اب قلتِ ریزگاری کے روح فرسا حالات ملاحظہ کیجیے:۔

دوپہر کے وقت کڑی دھوپ میں بنی بگڑی کا ہر ٹک اسٹرک کے بنے رہنے کی اصل وجہ جہاں آدی باسی
مزدوروں کے مضبوط کالے بازوؤں کا مخلص پسینہ ہے وہیں بگڑنے کا واضح سبب مکار انجینئر کی بے حلق لے پانی)
کے پگھلتے تارکول پہ کھڑے، رکشے والے اور اس میں بیٹھ کر آئے مسافر کے مابین تو تو میں میں جاری ہے۔ مسافر
منزل پہ آکر محنتانہ کے روپ میں ڈیڑھ روپیہ دینے کے لیے دو روپیہ کا نوٹ آگے بڑھاتا ہے۔ اب ریزگاری کی
عدم دستیابی رکشہ مزدور کے جسم پہ آئے پسینے کے ریلوں کو ایسڈ کی دھاروں میں بدل دیتی ہے۔ وہ طیش میں آکر
نوٹ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ صاحب۔ آپ کتنی ہی گالیاں مجھے دے لو یا گھونسے
لاتیں برساؤ لیکن یہ نوٹ بھگوان کے واسطے مجھے نہ دکھاؤ۔ مجھے ڈیڑھ روپیہ پورے دو صاحب۔ ملک میں اچھے
اچھوں کے پاس ریزگاری نہیں صاحب تو پھر۔۔۔ مجھ غریب پھیچھڑ کے پاس یہ کہاں — اب مسافر کی تیوریاں
چڑھ گئیں۔ تو کیا سمجھتا ہے میں ریزگاری تجھے دے کر اپنے بھارتیہ نہ ہونے کا جواز خود پیدا کر لوں۔ ارے
بے وقوف آج ملکی اور غیر ملکی کی شناخت ویزا سے نہیں ہوتی بلکہ ریزگاری کی دستیابی یا عدم دستیابی ہی اصل
پہچان ہے۔ یہ گرما گرم گفتگو راہ گیروں کے ساتھ ہی ٹرافک پولیس کو متوجہ کر گئی۔ وہ سیٹی بجاتے ہوئے ٹرافک
چوکی سے نیچے اترنے لگا۔ اسے آتا دیکھ کر رکشے والے نے ہتھیار ڈال دیئے اور مسافر کا گریبان چھوڑ کر اپنا
منہ اس کے کان میں ڈال کر سرگوشی کی کہ بھائی! اس سے پہلے کہ یہ دو کا نوٹ خواہ مخواہ سپاہی کی تھیلے نما
جیب میں جاکر اپنا نحیف وجود کھو دے یا تو تم مجھے پچاس پیسے کی چھوٹ دے ڈالو یا پھر ڈیڑھ روپیہ پورا پورا
دینے کا بندوبست کرو۔ یا پھر نہیں تو اس اونٹ کے کروٹ بیٹھنے کی آخری صورت بس یہی بچ رہتی ہے کہ اب تم
رکشے میں مجھے بٹھا کر خود اسے چلاؤ اور۔۔۔ جہاں جس مقام پر یہ کھڑا اور میں بیٹھا تھا وہاں چھوڑ آؤ —
اب جوں ہی مسافر رکشہ چلانے کی پوزیشن میں ہوا تو سپاہی اس کی گردن دبوچنے کے ساتھ ہی دھاڑا۔ ابے
اے مردود جاتا کدھر ہے؟ دو کا نوٹ دکھا کر تو دو گیارہ ہو رہا ہے؟ حرامی کیا تجھے خبر نہیں کہ ہر پولیس والے کی طرح

میں نے بھی عہد کر رکھا ہے کہ میں قانون کی حفاظت کے لیے اپنا ایمان تک بیچ دوں گا۔ چل نکال وہ دو روپے کا نوٹ جس کے لیے تم نے لا اینڈ آرڈر کو ٹھوکر پہ رکھا اور شہر کی پُرامن فضا کو برباد کر کے پولیس عملے کو للکارا۔ اب سپاہی نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو PLIER بنا کر مسافر کی جیب میں ڈال دیا اور دو کا نوٹ اچک لیا اور اپنے شرٹ کی کم زیادہ گز بھر طویل جیب کی بے کراں وسعتوں میں اُسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ اور تھوڑے توقف کے بعد اپنے ہاتھ میں سیٹی (WHISTLE) کو اپنے پیلے یونیفارم سے رگڑتے ہوئے اپنے انتہائی پیلے دانتوں کو کالی زبان کی تیز نوک سے مانجھتے ہوئے رخصت ہونے لگا۔

دو روپے سے یوں ہی محرومی کا احساس مسافر کے لیے تکلیف دہ تھا کہ آخر ان دو روپیوں کا کچھ تو مصرف ہوتا۔ اس لیے اس نے سپاہی کو چھیڑنے کے لیے یوں ہی استفسار کیا۔ کیوں تھانیدار صاحب میں کچھ پوچھوں آپ سے؟ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟ سپاہی تھانیداری کے سرور میں نہایا ہوا تھا اس لیے مسرور ہو کر کہا پوچھو۔ اب مسافر کہنے لگا۔ صاحب میں نے اپنی زندگی میں ایک سے ایک گندے کالے پیلے دانت دیکھے ہیں لیکن جو بات آپ کے دانتوں میں پائی جاتی ہے نا آپ یقین جانیئے اس کی بس ایک [illegible] ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روگ پیلیا کے جدا مجد یہی دانت ہیں۔ اور تمام کائنات کا جملہ پیلا رنگ ان کا ہلکا سا پرتو۔ اب سپاہی جیسے کاٹ کھانے کو دوڑ پڑا۔ ابے اُلّو۔ میرے دانت پیلے اس لیے ہیں کہ سونا پیلا ہوتا ہے اور جس طرح سونے کو پیلا رنگ مرغوب ہے اسی طرح سونا مجھے محبوب ہے۔"

"تو گویا آپ کے دانت واقعی سونے کے ہیں"؟ مسافر نے استفسار کیا۔ سپاہی دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اثبات میں مسکرایا۔ ——— خیر مسافر نے سپاہی سے اس سونے کے حصول کے متعلق دریافت کیا تو عقدہ یہ کھلا کہ . . . . آج سے قریب ایک سال قبل شہر کے جنوبی علاقے میں گونڈی لوگ تاریخی قلعہ کے قریب ناہموار جگہ کو سڑک کے لیے ہموار کرنے میں مشغول تھے کہ اسی دوران سخت مٹی کا ڈھیر قدیم بہمنی دور کے طلائی سکوں کو جیسے اگلنے لگا تھا۔ ان آدی باسی مزدوروں کے بھیجے میں دماغ اور دماغوں میں سوچ اگر ہوتی تو . . . . نہ ان کے شانوں پہ تھیلے ہوتے نہ ہاتھوں میں چھالے۔ شانوں سے تیشوں کا اور ہاتھوں سے چھالوں کا، جسم سے پسینے کا اور زندگی سے مفلسی کا ساتھ دیرینہ تھا اس لیے ان کا لٹنا جھگڑنا لازمی تھا اور . . . . وہ ان طلائی سکوں کے لیے لٹے بھڑے۔ پھر اس جگہ پولیس تعینات ہوئی۔ ان میں بھی بڑے شاطر طریقے سے چھینا جھپٹی ہوئی اور اس شدید گھمسان کے رن میں مذکورہ سپاہی اپنے نیچے اوپر کے چھ دانت مع مسوڑھوں کے گنوا بیٹھا۔ اس لیے جہاں کھویا وہیں پایا کے مصداق سپاہی نے ان طلائی سکوں کو توڑ کر ان سے دانت بنوا لیے اور بتیس کی گنتی بہر حال مکمل کر کے اپنے منہ کو پوپلے پن سے نجات دے ڈالی۔ الغرض ان تمام حالات کا اقرار سپاہی نے بہ نفسِ نفیس مسافر کے روبرو خود کیا۔ اب حالات کو کروٹ لینی تھی اور کروٹ اس لیے بھی ضروری تھی کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی آئی ہے۔ تو صاحب مسافر نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر سپاہی کی تعمیل پہ رکھا اور دوسرا ہاتھ سپاہی کے منہ میں ڈال طلائی دانتوں کا چوکا نوچ کر خود کو . . .

... دنداں شکن ثابت کیا۔ سپاہی کا چہرہ فق اور منہ کھلا تھا۔ منہ کھلا حیرت سے تھا یا دانتوں کی غیر موجودگی منہ کی ساخت کو یوں بگاڑ گئی تھی بہر کیف سپاہی کھلے منہ کے ساتھ ہتھیلی پہ رکھے کارڈ کو بغور پڑھنے لگا۔ "انسپکٹر جادھو اینٹی کرپشن" سپاہی کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہر سُو اندھیرا چھا گیا۔ ان اندھیروں کے عقب میں ریزگاری کی قلت اپنی کرم فرمائیوں کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ وہ سوچنے لگا . . . کاش ملک میں ریزگاری کی قلت نہ ہوتی تو رکشے والا اور مُسافر لڑتے ہی کیوں اور مُسافر کے سراپے سے انسپکٹر جادھو کا روپ جنم ہی نہ لیتا۔ ریزگاری کی قلت کے باعث میرے منہ میں دانتوں کی قلت تو ہوئی ہی اب نوکری بھی گئی اور زندگی میں خوشیوں کی قلت اپنا رنگ دکھا کر جینا دوبھر کر دے گی۔ سپاہی قلت ریزگاری کی قیامت خیزیوں پر سوچ سوچ کر لہو پانی کرتے ہوئے انسپکٹر کے ساتھ محوِ سفر تھا کہ اسی دوران ایک پریشان راہ گیر نے سپاہی کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور انتہائی عاجزانہ انداز میں دو کا نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ پلیز! جمعدار صاحب آپ کے پاس دو روپے کی ریزگاری ہوگی؟ سپاہی بے بس ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ ریزگاری کے نام پر اشکوں سے آنکھیں جھلملا اٹھیں اور مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ▭ ▭

قیصر علی قیصر

غزلیں

پاس اُس کے وفا کا پاس کہاں
چیل کے گھونسلہ میں ماس کہاں

اُس کو گلرد کہیں تو کیسے کہیں
بو کہاں اس میں گل سی باس کہاں

یوں تو خوشیاں ہیں دہر میں لاکھوں
مجھکو آئیں بھلا وہ راس کہاں

جس سے دنیا کو زیر کرتے تھے
اب وہ اخلاق کی اساس کہاں

چَر کے کھائے بہت حسینوں سے
پھر بھی قیصرؔ کا دل اداس کہاں

"کاٹ لے گا دور ہو جینے سے کیوں بیزار ہے"
بولی لیلیٰ دیکھ کر مجنوں کو کیمل کے قریب
CAMEL

دیکھنا ہے فرق زر داری و ناداری اگر
جھونپڑے دیکھو نظر آتے ہیں کچھ مل کے قریب
MILL

ہم بلا نوشوں کا دو اک جام سے کیا ہو بھلا
دے اگر ممکن ہو ساقی ہم کو بیرل کے قریب

سو پیالو قیصرؔ لگے بٹّہ نہ عزت کو کہیں
لے کے بٹّہ وہ کھڑے ہیں آج ہر بل کے قریب

محمد شاہد عظیم
حیدرآباد

احمد شاہ بخاری پطرس

احمد شاہ بخاری پطرس کا شمار اُردو کے ان گنے چُنے ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی ذہانت اور اہم ادبی کارگزاریاں انمٹ اور مُسلّم ہیں وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اور بلاشبہ ایک عظیم المرتبت انسان اور ایک غیر معمولی ادیب۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں جو مضامین لکھے تھے ان سے ارباب علم کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ ان کے ادبی سفر کی ابتدا ر تقریباً ۲۰ سال کی عمر سے ہوتی ہے۔ پطرس نے زندگی کے جس گوشہ میں چاہا خواہ وہ ادب کا ہو یا سیاست کا اپنا ایک الگ رنگ اور مستقل نقش چھوڑا ہے۔ وہ ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ اس صدی کے ابتدائی بیس اور تیس برسوں کے دوران چھ سال انھوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت وہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ پطرس ادب کی دنیا سے سیاست کے آسمان پر پہونچ گئے۔

پطرس اُردو کے واحد ادیب ہیں جنھوں نے بہت کم لکھا لیکن شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ انھوں نے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ مقدار کے لحاظ سے تھوڑا مگر معیار کے لحاظ سے بڑا ہے۔ کبھی کبھی آڑی ترچھی لکیروں میں کوئی بڑا مصور ایسی روح پھونک دیتا ہے کہ بہت سے فنکاروں کے پورے نگارخانے ماند پڑجاتے ہیں۔ پطرس کے مضامین، گالز وردی، جارج برناڈ شاہ اور اسٹیونسن کے ترجمے، چند افسانے اور دوستوں کے نام چند خط، یہ ہے پطرس کی کل کائنات۔ پطرس نے جبکہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ادب کے استاد اور پرنسپل تھے۔ کالج کے تجرباتی تھیٹر کیلئے شکیسپیر کے بہت سے ڈرامے اُردو میں منتقل کئے۔ انھوں نے برطانیہ اور امریکہ کی غیر افسانوی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ اردو کا ایک مزاحیہ رسالہ بھی مرتب کرتے رہے۔ انگریزی اور اردو میں ادبی تنقیدیں بھی لکھی ہیں۔ مزاح نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت کئی مضامین پر پھیلی ہوئی ہے جو انھوں نے پطرس کے قلمی نام سے لکھے تھے۔ پطرس نے پہلا جو مجموعہ شائع کیا اس میں شائد گیارہ مضامین ہیں۔ بعد کے ایڈیشنوں میں ان میں اضافہ ہوتا گیا۔

" مضامین پطرس " بخاری صاحب کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بظاہر بڑی ہلکی پھلکی شئے ہے لیکن طنز نگاری کی طرح ایک لطیف شئے کو پیدا کرنے کیلئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرز بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں بن سکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ہر انسانی آنکھ انھیں نمایاں طور پر نہیں دیکھتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان انھیں بروئے کار لاتا ہے اور ان کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں اس طرح کرتا ہے کہ وہ تحت الشعور سے اُبھر کر اُجاگر ہوجاتی ہیں اور ہم ان انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ پطرس

لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کُتّے طبیعت جو ذرا گدگدائی تو اس نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ بعد سامنے بنگلہ سے ایک کُتّے نے مطلع عرض کیا، اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا تو ایک حلوائی کے چولھے میں۔ باہر نکلے اور بھنّا کر پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس نے زوروں کی داد اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے بعض کمبخت تو دو غزلے اور سہ غزلے لکھ لائے تھے، کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔

سینما کا عشق میں پطرس نے کچھ دل کے داغ دکھائے ہیں۔ یہ مضمون اپنی روانی اور تسلسل کے لحاظ سے بڑا ہی تیکھا اور مزے دار ہے۔ اس میں انسانی جھنجھلاہٹ کے سارے پہلو نمایاں کئے گئے ہیں اور سینما دیکھنے والوں کی حرکات و سکنات پر بڑا ہی لطیف طنز کیا گیا ہے۔ یہ طنز جتنا گہرا ہے اتنا ہی لطیف اور اسی قدر واقعاتی ہے۔

"مرحوم کی یاد میں" کسی کا مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں کسی واقعی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی پطرس کے دوست مرزا کی سادہ لوحی کا ایک نقش جمیل ہے۔ اس مضمون میں پطرس نے سماجیات، ثقافت، تہذیب و تمدن، روزمرہ زندگی اور فطرت انسانی کے بڑے بڑے نکتے حل کر دیئے ہیں، تمہید میں لکھا ہے کہ "جب دوستی پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

پیروڈی جسے اُردو میں تحریف کہتے ہیں، ایک ایسا حربہ ہے جسے مزاح نگار بھی استعمال کرتا ہے اور طنز نگار بھی۔ مزاح نگار اس سے آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور طنز نگار اس کا سہارا لے کر معاشرہ کی ناہمواریوں کو ہدف بناتا ہے۔ پطرس کے ہاں تحریف کے یہ دونوں رُخ ملتے ہیں۔ اردو نثر میں پیروڈی کے سلسلہ میں پطرس کو ایک اہم او نمایاں مقام حاصل ہے۔ پطرس نے غالباً سب سے پہلے نثر میں پیروڈی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ پطرس سے قبل، اُردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے تو ملتے ہیں لیکن نثر میں پطرس سے قبل اول تو پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں۔ پطرس کی پیروڈی "اُردو کی آخری کتاب" سے یہ چند نمونے دیکھئے۔

"دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہیں، دراصل یہ کام میاں کا ہے۔

ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن صندوق پر چنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں، کسی میں دال ہے۔ کسی میں آٹا اور کسی میں چوہے۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلالے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے!

ایک اور حصہ ملاحظہ کریں . . .

ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے اور ماں محبت بھری نظروں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے پوچھتی ہے۔ وہ کب بڑا ہوگا، دولہا کب بنے گا، اور دلہن کب بیاہ لائے گا کب کما ئے گا وغیرہ بچہ مسکراتا ہے اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پطرس نے گو کبھی اردو ادب کے لیوکاس اور مارک ٹوین ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن وہ حقیقتاً ان مغربی مزاح نگاروں کے مقابل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شوکت تھانوی اپنی فروتنی کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"غضب خدا کا پطرس ایسے پہاڑ سے مجھ جانِ ناتواں کو ٹکرادیا۔" اپنی کتاب "سیلاب تبسم" کے مقدمہ میں شوکت تھانوی نے پطرس سے مقابلہ کو "مزاحیہ کفر" قرار دیا۔

وے کے خط....
(مراسلے)

کمال صاحب

شگوفہ تو ہنسنے ہنسانے اور فکر کا سامان مہیا کرتا تھا۔ آخری صفحہ کا اداریہ پڑھ کر خشک آنکھوں کے آنسو نکل پڑے۔

برق صاحب سے ہم غیر حیدرآبادیوں کا تعلق بھی اتنا پرانا ہے کہ کبھی اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہوا ویسے ان کی شخصیت کی تعمیر میں خلوص محبت اور اپنائیت کے عناصر تھے ہی اس شدت سے کہ پہلی ملاقات میں بھی کسی تکلف کا احساس نہیں ہوا

طنز و مزاح کی دنیا میں وہ واقعی برق تھے اغیار، جبر و تشدد اور ظلم پر گرنے والی۔ ادھر سال دو سال سے وہ کچھ زیادہ تیزی سے لکھ رہے تھے۔ اور قلم میں دھار اور نشتریت بھی تیز ہوگئی تھی۔ اور مزاح کی پھلجھڑیاں بھی کچھ زیادہ تابناک۔

شفیقہ فرحت، بھوپال

محترم مصطفیٰ کمال، تسلیم!

"شگوفہ" محترم برق آشیانوی کی موت کی خبر لیکر آیا۔ جتنا افسوس کیا جائے وہ کم ہے۔ کیا خبر تھی کہ اب اُن سے ملاقات نہیں ہوگی۔ مرحوم بہت اچھے شاعر تھے۔ زود گو بھی تھے۔ یاد ہے حیدرآباد میں ایک بار انہوں نے مشاعرے کی نظامت کی تھی اور ہر شاعر کے لیے ایک قطعہ کہا تھا۔

مقرب حسین، رتلام

مکرمی سید مصطفیٰ کمال صاحب۔

"شگوفہ" کے تازہ شمارے سے جناب برق آشیانوی کے سانحۂ ارتحال کی خبر وحشت اثر خرمنِ صبر و قرار پر برق تپاں بن کر گری۔ مرحوم فی الواقعی ایک منفرد مزاح نگار تھے۔ اردو ادب کے اس عظیم خسارے پر میں خاص طور پر آپ کے بشمول مزاح نگاروں اور شگوفہ کے ان گنت قارئین کے غم میں شریک ہوں!

"شگوفہ" کا یہ شمارہ آپ نے برق آشیانوی کی یادوں کے لیے وقف کیا ہے۔ مختلف مزاح نگاروں نے اپنی تخلیقات اور دیگر احباب نے اپنی نگارشات کے ذریعے برق مرحوم کو شایانِ شان خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ سب قلم کاروں نے برق آشیانوی کی شخصی اور ذاتی خوبیوں کو اُجاگر کرنے اور ان کی مختلف مزاحیہ اور ادبی تخلیقات کا جائزہ جس خلوص آمیز انداز میں کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

جملہ مشمولہ مضامین کی ایک مشترک خوبی یہ ہے کہ ان میں سنجیدہ نگاری کے باوصف مزاح و تبسم کی ایک زیریں لہر رواں دواں ہے۔ حزن و ملال (کہ اس زیستِ فانی کا جزو لازم ہے) کے اظہار کے موقع پر زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی لیے بے حد پسند آئی۔ بذلہ سنجی کا یہ انوکھا انداز مزاح نگاری کی قابلِ ذکر تخصیص ہے۔

فکر تونسوی کا خط چھاپ کر آپ نے اختصار نویسی کی ایک مثال پیش کی ہے جس میں اس برگزیدہ مزاح نگار نے اپنے ہمعصر سربرآوردہ مزاح نگار برق آشیانوی (مرحوم) کی نجی اور ادبی صفات بیان کر کے کوزے کو دریا میں بند کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے اپنے ایک خط کے توسط سے جو بہ وجہ برق آشیانوی کو سپردِ ڈاک نہ کیا جا سکا، مرحوم کی دنیوی اور ادبی زندگی کی مکمل تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ اس دور کے مزاحیہ ادب میں مجتبیٰ حسین بہرکیف ایک عہد ساز شخصیت کے حامل ہیں ـــ یوسف ناظم، مسیح انجم، نریندر لوتھر، سید موسیٰ کاظم، بھارت چند کھنہ وغیرہ سب کے مضامین اس خصوصی شمارے کی خاصے کی چیزیں اور اردو کے مزاحیہ ادب میں قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ـــ اور اس سونے پر سہاگہ مرحوم برق آشیانوی مرحوم کی اپنی نثری اور شعری تخلیقات ہیں جو مزاح کی جان اور اردو ادب کی شان ہیں۔ "خیر مقدمی جلسہ" اور "طبی معائنہ" مزاح کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ "شگوفہ" کی اس اشاعتِ خاص کی صورت میں آپ نے جس طرح برق آشیانوی مرحوم کو اپنے جذباتِ امتنان پیش کئے ہیں اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

راز سنتوکھ سری،
(چنڈی گڑھ)

o. 15822/68
SHUGOOFA Hyderabad-1
19 Copy 10
October 1986 Phone : 557716

سوونیر
Talib
308

سوونیر، ۱۷ویں سالانہ تقاریب

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
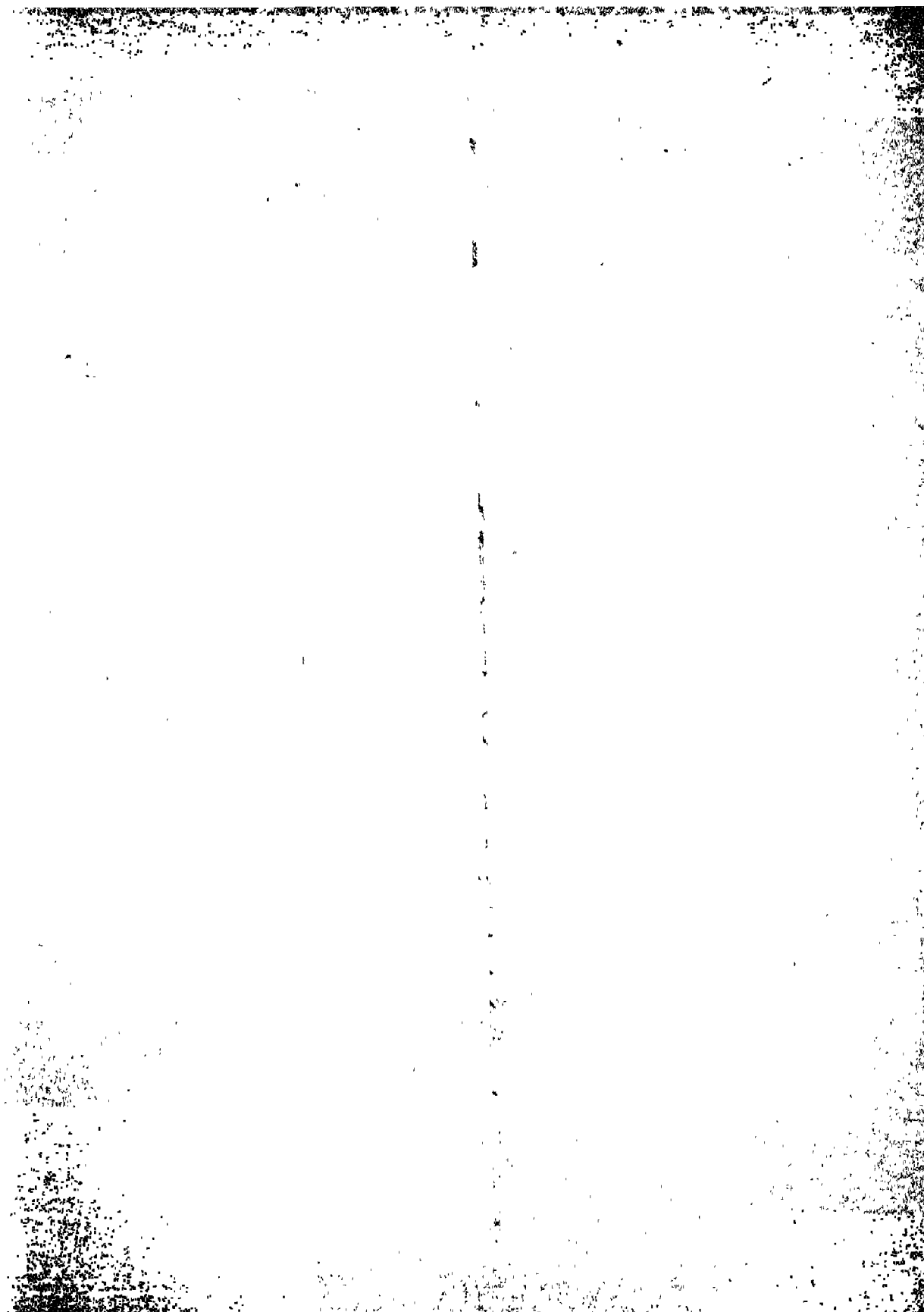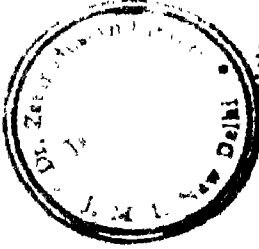
جلد: ۱۹
شمارہ: ۱۱
نومبر ۱۹۸۶ء

سرورق:
طالب خوندمیری

فی پرچہ: -/5 روپے
زرِ سالانہ: چالیس روپے
عرب ممالک سے: ایک سو پچیس روپے

کتابت:
محمود سلیم، محمد عبدالرؤف، مسعود انور

طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ، ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز،
معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس: 557716
فون مکان: 521064

سینیٹری، زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے
اور
اسٹینڈرڈ سینیٹری ہوم
(ڈسٹری بیوٹرس اینڈ اسٹاکسٹس)
شہر حیدرآباد کا اہم مرکز
جہاں
سینیٹری ویر اور بمبئی ٹائیلس دستیاب اور سپلائی کی جاتی ہیں۔
سی۔پی۔ باتھ روم فٹنگس کا انتظام ہے
سی۔آئی، جی۔آئی، اے۔سی پائپس اور فٹنگس
ای۔آئی۔ڈی۔پیاری ویر انڈیا لمیٹیڈ
گورنمنٹ سپلائرز اور کنٹراکٹرس
پتہ: 577-1-4 ترپ بازار
حیدرآباد 500001 فون: 553829

کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

گئے دنوں کا سراغ (قدیم شعراء کا انتخاب)

چوں چرا (منظومات)

زندہ دلانِ حیدرآباد

۷ ویں کل ہند دو روزہ سالانہ تقاریب

مجلس عاملہ زندہ دلانِ حیدرآباد

صدر : جناب نریندر لوتھر
نائب صدر : جناب رشید قریشی
جناب حمایت اللہ
معتمد : جناب مصطفیٰ علی بیگ
شریک معتمدین :
جناب مسیح انجم
جناب یوگس حیدرآبادی
خازن : جناب محمد سلیمان
اراکین :
ڈاکٹر مصطفیٰ کمال
جناب طالب خوندمیری
ڈاکٹر حبیب ضیاء
ڈاکٹر عابد معز
جناب اسلم فرشوری
جناب یوسف شریف

زندہ دلانِ حیدرآباد کی دو نئی مطبوعات

الف تحاشہ (مصنف جناب نریندر لوتھر)

کاغذی ہے پیرہن (مصنف ڈاکٹر رشید موسوی)

کی رسم اجراء ۸ نومبر کو شریمتی کمود بین جوشی عزت مآب گورنر آندھراپردیش انجام دیں گی!

کنوینرس برائے سالانہ تقاریب

ادبی اجلاس : جناب عابد معز
محفل لطیفہ : محترمہ افشاں جبیں
مشاعرہ : جناب ا
طباعت : جناب ف
نشرواشاعت : جناب ان پی مونگری؛ جناب معین امر بمبو
بکنگ : جناب محمد سلیمان
رابطہ : جناب فضل بیگ ؛ جناب جعفر رشید
اسٹیج : جناب سعادت ملیمان ؛ جناب سید مقصد حسین
خواتین کمیٹی : محترمہ مقبول فاطمہ
انتظامی کمیٹی : جناب عبدالقدیر صابر؛ جناب ڈاکٹر بیگ احساس،
جناب مظفر مجاز ؛ جناب رحمت یوسف زئی ؛ جناب نصرت مہدی
جناب فضل محمود ؛ جناب محمد بھائی.

کل ہند ادبی اجلاس

مقام : نمائش کلب ؛ ۷ نومبر ۸۶ء ، ۵ ۱/۲ بجے شام
صدارت : جناب یوسف ناظم
مہمان خصوصی : جی. نارائن راؤ، اسپیکر لیجسلیٹو اسمبلی، آندھراپردیش.
مزاح نگار : جناب سعادت خان کھنگر ؛ جناب نریندر لوتھر،
جناب دلیپ سنگھ ، جناب مجتبیٰ حسین
جناب رشید قریشی، جناب مسیح انجم، جناب پرویز ید اللہ مہدی،
محترمہ ڈاکٹر بانو سرتاج، جناب فیاض احمد فیضی،
جناب برہان حسین، کنوینر : جناب عابد معز

محفل لطیفہ

مقام : نمائش کلب ۸ ر نومبر ۸۶ء ۱۰½ بجے صبح
صدارت : جناب مجتبیٰ حسین
لطیفہ گو :
جناب رشید قریشی، جناب مصطفیٰ علی بیگ، جناب حمایت اللہ،
جناب محمد سلیمان، جناب حفیظ خان مذاق، جناب کلیم صدیقی،
جناب دولت رام، جناب موہن پرشاد، جناب اظہر افسر،
جناب طالب خوندمیری، جناب عرفان خوندمیری، جناب ذہانت علی بیگ
جناب حامد کمال، جناب ملک معراج، جناب عابد علی
کنوینر : محترمہ افشاں جبیں۔

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

مقام : نمائش میدان ۸ ر نومبر ۸۶ء ۸½ بجے شب
افتتاح : شریمتی کمود بین جوشی، عزت مآب گورنر آندھرا پردیش
صدارت : جناب نریندر لوتھر
مہمان خصوصی : جناب شراون کمار، چیف سکریٹری آندھرا پردیش
مہمان شعراء : جناب ساغر خیامی (دہلی)
جناب مقرب حسین (رتلام، مدھیہ پردیش) جناب خواہ مخواہ (دکن)
جناب عادل لکھنوی، جناب جاہل سلطان پوری،
جناب گرگٹ گورکھپوری، جناب پاپولر میرٹھی،
جناب مختار یوسفی (مالیگاؤں) جناب اسمٰعیل آذر (کٹک)
جناب پاگل عادل آبادی، جناب سلیم نظام آبادی، جناب سراج نرملی
جناب چکر نظام آبادی۔

میزبان شعراء

جناب علی صائب میاں، جناب محمد حمایت اللہ،
جناب طالب خوندمیری، جناب مصطفیٰ علی بیگ،
جناب اسمٰعیل ظریف، جناب اشرف خوندمیری،
جناب سرپٹ حیدرآبادی، جناب بوگس حیدرآبادی،
جناب قادر حیدرآبادی، جناب حفیظ خاں مذاق
جناب صبغتہ اللہ سبحانی، جناب ان پڑھ بھونگیری،
جناب اقبال ہاشمی، جناب رؤف رحیم،
جناب معین امر بمبو اور جناب دیوگوپال سعید (دہلی)
کنوینر : جناب احمد سلطان

کارٹون ـــ طالب خوندمیری

ع اتنا نہ زندگی میں کسی کی خلل پڑے
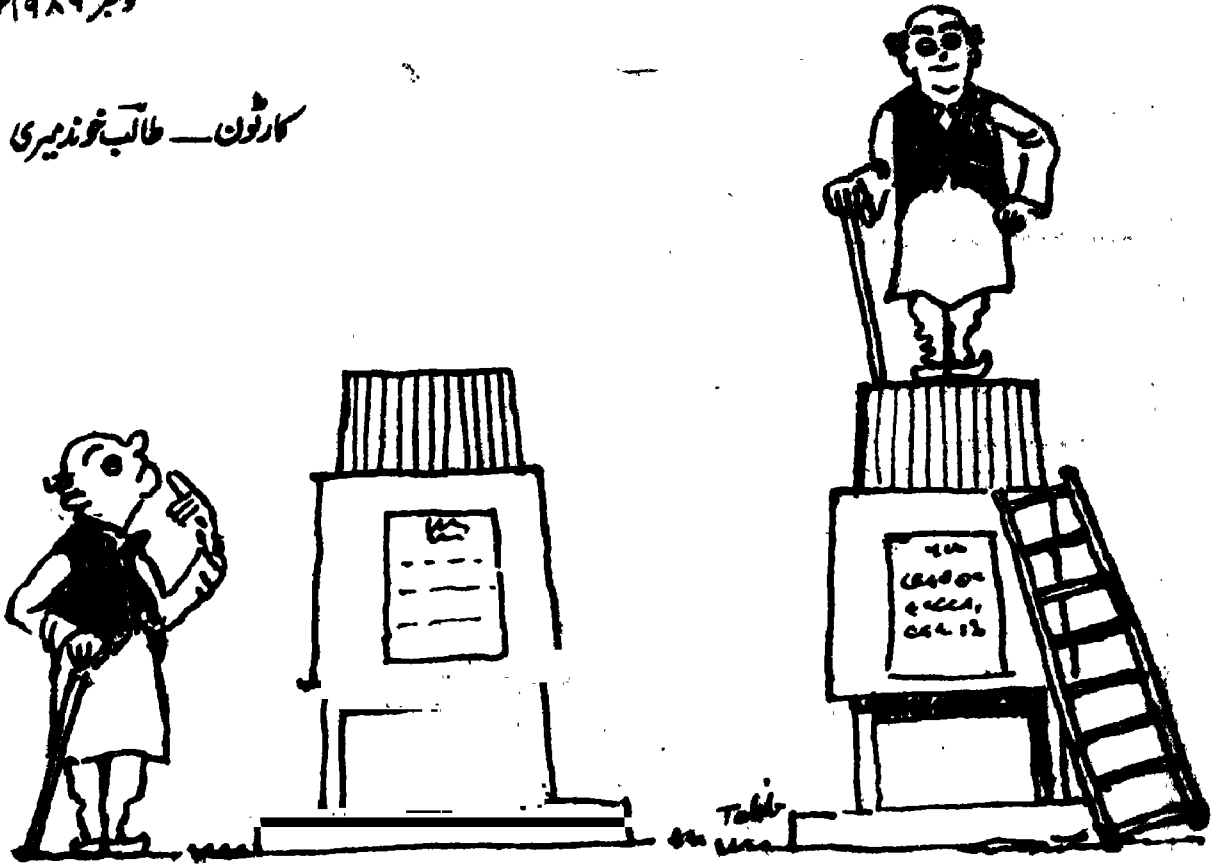
ع اتنا مجبور بھی انسان کو خدا نہ کرے

کارٹون ـــــ طالب خوندمیری

کارٹون ـــــ طالب خوندمیری
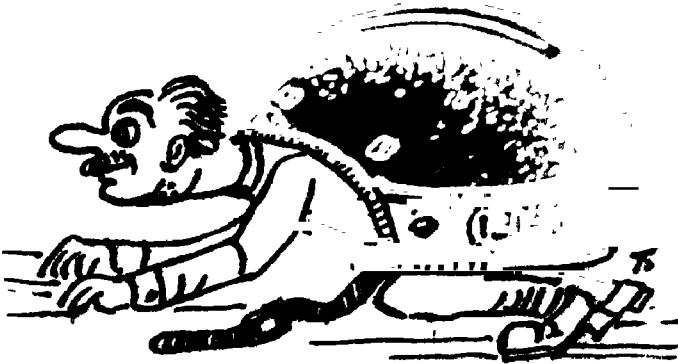
ع ہلمٹ نہ ملا کوئی مرے سر کے برابر
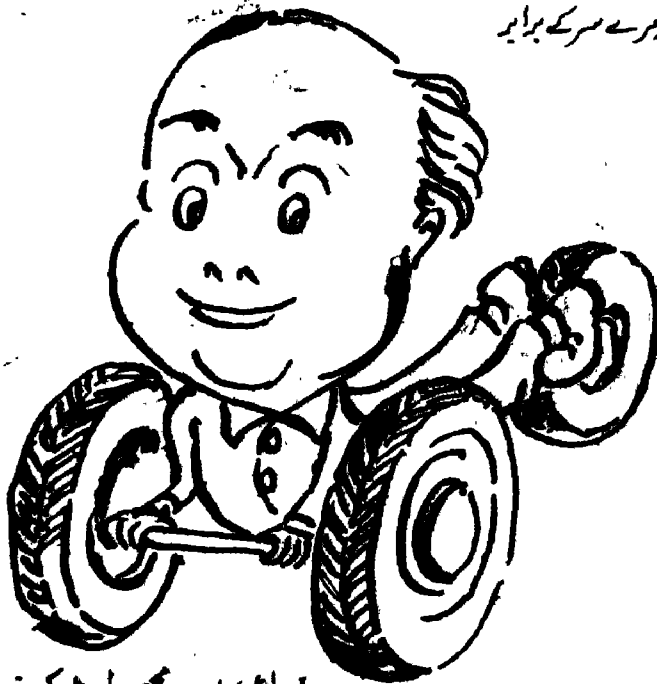
بولٹ، اب مجھے ہلمٹ کی ضرورت کیا ہے؟

یوسف ناظم

گول میز

*

انگریزوں کی ذہانت کے
ہم ہمیشہ سے قائل رہے ہیں۔ اوّل تو یہ
ذہانت خداداد ہے (جیسے حُسن وغیرہ ہوا کرتا
ہے) دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے اپنی طرف سے بھی
اس ذہانت میں اچھا خاصا اضافہ کیا ہے۔ یہ صرف
شاعرانہ باتیں ہیں کہ تکلّف سے بری ہے حُسنِ ذاتی۔ حُسن کو
سنبھال کر رکھنے کا سلیقہ بھی بہت ضروری چیز ہے۔ یہی
معاملہ ذہانت کا بھی ہے۔ اس کی قدر کرنی پڑتی ہے۔
ورنہ بہت سی قومیں ایسی گزری ہیں (بلکہ گزر بھی رہی
ہیں) جنھیں قدرت نے معقول مقدار میں ذہانت عطا
کی تھی لیکن مذکورہ قوموں نے اِسے یا تو استعمال نہیں
کیا یا اسے کچھ ایسے کاموں میں ضائع کر دیا جن کا
ذکر کم سے کم کسی ادبی محفل میں مناسب نہیں معلوم
ہوتا۔ بہر حال ان قوموں کی غفلت کہیئے یا خصلت، اس
کا نتیجہ یہ نکلا — یوں سمجھئے بُرا نتیجہ نکلا، اس کے برعکس
یہ انگریز ہیں جن کی صورت ہی سے ذہانت ٹپکتی رہتی
ہے۔ اُنھوں نے اِسے بہت سنبھال کر رکھا۔ بڑے
چاؤ سے اس کی نگہداشت کی اور اپنی ذہانت
کے بَل بُوتے ہم جیسے سمجھ دار اور ذی فہم
لوگوں کو برسوں اپنا مطیع و فرمانبردار
بنائے رکھا۔ جب تک
وہ ہندوستان میں رہے
صرف ذہانت کے سہارے رہے —
فوج تو اُن کے پاس بہت ہی مختصر سی تھی۔
— لیکن انگریزوں کی ذہانت کے قائل ہونے میں
ہماری اس ذہنیت کو دخل نہیں ہے جو ان دنوں پیدا
ہوئی تھی جب یہ لوگ ہمارے وطنِ عزیز میں مقیم و فروکش
تھے۔ ہماری وہ ذہنیت تو کب کی رفع دفع ہو چکی کیونکہ
اب ہم ایک عرصے سے نہ صرف آزاد ہیں بلکہ بہت زیادہ آ
ہیں (اور ہماری اس آزادی میں مزید اضافہ ہو
توقع ہے)۔ انگریزوں کی ذہانت کے لیے
صرف ایک معمولی سی مثال پیش کرنا کافی ہے
انگریز ہی تھے جنھوں نے گول میز جیسی نادر
چیز ایجاد کی۔ ان کی آمد سے پہلے یہاں گول
تو ایک طرف رہی، کوئی چوکور میز بھی نہیں تھی
اگر تھی بھی تو اسے وہ وقار اور رتبہ حاصل نہیں ہوا تھا
جو اسے انگریزوں کی سرپرستی کے طفیل حاصل ہوا — وہ
فرنیچر ہو یا ادب، حکمرانوں کی سرپرستی کے بغیر اس کی
ترقی ممکن نہیں — فرنیچر کی طرح جن ادیبوں کو
حکمرانوں کی سرپرستی (خود بخود یا ذاتی کوشش سے)
حاصل ہو جاتی ہے وہ عوام میں بے حد
مقبول اور کچھ کچھ آسودہ حال
ہو جاتے ہیں —

یہ میز کرسی کا فرنیچر انگریزوں ہی کی دین ہے۔ ان سے پہلے ہمارے راجے مہاراجے بادشاہ، شہنشاہ اور شہزادے سب تخت پر بیٹھا کرتے تھے (ویسے وہ کبھی کبھی جھولوں پر بھی بیٹھتے تھے) تخت پر بیٹھنے میں سہولت یہ تھی کہ بادشاہ سلامت پاؤں اٹھا کر انھیں تخت پر جس طرح چاہیں سجا سکتے تھے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں حکمرانوں کا کرسیوں پر پاؤں لٹکا کر بیٹھنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ حکمرانوں کے پاؤں زمین پر ٹکنے چاہئیں۔ صرف حکمرانوں ہی کے کیوں؟ ان سے قریب رہنے والوں کے پاؤں بھی زمین پر نہیں ٹکنے چاہئیں۔ اسی لیے ہمارے یہاں کسی بھی حکمران کی کرسی نشینی ہوئی۔ جب بھی ہوئی تخت نشینی ہوئی۔ انگریزی میں اسے یوں کہیں گے کہ ہی واز تھروں آن تھرون (HE WAS THROWN ON THRONE) اُسے پہلے تخت پر بٹھایا جاتا تھا اور اُس کے کئی منٹ بعد اُس کے سر پر تاج رکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہم اس تخت نشینی کو گدی نشینی بھی کہتے تھے۔ راجے مہاراجے تو اب نہیں رہے لیکن ہمارے سیٹھ ساہوکار آج بھی گدی پر بیٹھتے ہیں تاج تو فروعی چیز تھی۔ اصل اہمیت اسی گدی کی تھی —— ہم اصل میں انگریزوں کی ایجاد کردہ گول میز کا ذکر کر رہے تھے۔ اُس زمانے کی گول میز کانفرنسیں آج بھی مشہور ہیں۔ جب بھی انگریز یہ طے کر لیتے تھے کہ یہ مسئلہ طے نہیں کرنا ہے، ایک گول میز کانفرنس منعقد کرتے تھے۔ دُور دُور سے لوگوں کو بُلاتے۔ انھیں گول میز کے گرد بٹھاتے، گول مول باتیں کرتے اور وہی بات گول کر جاتے جس کے لیے اس "محفلِ سخن" کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ انگریزوں کو یُوں بھی یہ لفظ "راونڈ" بہت پسند ہے۔ اِن کے پاس گفتگو کے لیے بھی کئی راونڈ ہوتے ہیں۔ گفتگو میں جب تک دو چار راؤنڈ منعقد نہ ہوں وہ گفتگو نہیں معلوم ہوتی (صرف گفت معلوم ہوتی ہے)۔ گھونسہ بازی کے مقابلے میں ہار جیت کا تصفیہ راؤنڈ ہی کے حساب سے ہوتا ہے۔ گولی بھی چلانی پڑتی ہے تو راؤنڈ کے حساب سے چلائی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جلیان والا باغ میں جب گولی چلی تھی تو اُس وقت راؤنڈ گنے نہیں گئے تھے۔ اِتنا وقت ہی نہیں تھا۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی اوب جاتا ہے تو ایک راؤنڈ لگانے باہر چلا جاتا ہے۔ اس راونڈ سے اس کا موڈ درست ہوجاتا ہے (جسے مزاج درست ہونا بھی کہا جاتا ہے) —— انگریزوں کی زندگی میں خواہ وہ سماجی زندگی ہو یا سیاسی، عوامی زندگی ہو یا نجی۔ اِس میں راؤنڈ کی بڑی اہمیت ہے۔ انگریزوں کو یہاں سے گئے زمانہ ہوگیا لیکن جو انگریز یہاں کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔ وہ راؤنڈ دی ورلڈ کی سیاحت کے سلسلے میں نظر آتے ہیں۔ ہماری اِتنی بڑی آبادی میں بمشکل ہی دو یا تین لوگ ہوں گے جن کے دماغ میں راؤنڈ دی ورلڈ سیاحت کا سودا سمایا ہو اور ایک وہ انگریز ہیں جن کی آبادی میں صرف دو یا تین لوگ ایسے ہوں گے جن کے دماغ میں عالمی سیاحت کا فتور نہ ہو —— لیکن اس وقت ہمارا مقصد صرف گول میز کی افادیت اور اس کی جمالیات پر غور کرنا ہے۔

اب گول میزیں عام ہیں۔ یہ اتنی ہی مقبول ہیں جتنی ہماری وہ اداکارائیں ہیں جو اداکاری سے تو ناواقف ہوتی ہیں لیکن اُن کے پاس بکثرت ایسا سامان ہوتا ہے جس کی وہ وقتاً فوقتاً نہیں بلکہ ہمیشہ نمائش کراتی ہیں۔ گول میزوں کی جمالیات بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے۔ خاص طور پر کھانے کی گول میز کھانوں کے ذائقے میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔ جب بھی کھانا بدمزہ پکا ہو اِسے گول میز پر رکھ کر کھانا چاہیئے۔ لذت پیدا ہوجاتی ہے۔ گول میز پر بیٹھ کر عجیب قسم کی قربت کا احساس ہوتا ہے اور ہر شخص خود کو شمع اور اِردگرد بیٹھے ہوئے ہم نشینوں کو پروانہ سمجھتا ہے۔ لطفِ ہم طعامی اِسے ہی کہتے ہیں ورنہ مستطیل میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے صرف شرفِ ہم طعامی حاصل ہوتا ہے لطفِ ہم طعامی نہیں۔ خاص طور پر مستطیل میز کے دو مختلف سروں پر بیٹھے ہوئے دو حضرات تو ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا دو فریق اپنا اپنا محاذ سنبھالے بیٹھے ہیں۔ یہ بھی کوئی

کھانا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ اسے جنگِ ہم طعامی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ سرد جنگ اسے اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ میز پر آتش دان تک رکھے ہوتے ہیں جن میں پکا ہوا کھانا مزید پکتا رہتا ہے (کھچڑی بھی اسی طرح پکتی ہے)

کھانے کی گول میز کی جمالیات میں مزید حسن یہ پیدا کیا گیا ہے کہ خود کھانے کی ڈشیں بھی گھومتی رہتی ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت دو ہم نشین اس حصۂ میز کو دو متضاد سمتوں میں گھمانے کا قصد کرتے ہیں اور فوراً ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھنے اور خوش اخلاقی کے مظاہرے کی فکر و تردد میں دونوں اپنی اپنی پسند کی قاب سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک چکر ہی ہوتا ہے اور اس چکر کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کھانے کی میز صرف گول نہیں ہوتی گول در گول ہوتی ہے۔

مستطیل اور مربع میزوں سے لوگوں کو زخمی بھی ہوتے دیکھا گیا ہے۔ اِن میزوں کے کونے خنجرِ آب دار کی طرح تیز اور نکیلے تو نہیں ہوتے لیکن آدمی کو زخمی ہونے کی سہولت بہرحال بہم پہنچاتے ہیں اور یہ زخم کہاں پہنچتا ہے آدمی کے قد پر منحصر ہے۔ گول میز میں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ بیضوی میزیں بھی ایجاد ہوئی ہیں جو قدرے بہتر ہوتی ہیں لیکن یہ میزیں بھی گول میزوں کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ گول میز تو سکۂ رائج الوقت ہے۔ سکہ بھی گول ہی ہوتا ہے ساورن ہو یا اشرفی۔ آج تک کسی نے اسے بشکلِ مربع یا بطور مستطیل بنانے کی جراءت نہیں کی۔ (کاغذی نوٹوں کی بات اور ہے) اصلی سکہ تو وہ ہوتا ہے جو کسی دھات سے بنا ہو۔ سکے کو کاغذی پیراہن دینا، سکے کی بے حرمتی ہے لیکن کیا کیا جائے یہ ہے ہی کاغذی دور۔ اور کاغذ جتنا ارزاں اور عام ہوتا جائے گا، اتنا ہی جھوٹ بھی لکھا جائے گا —— (لیکن ہم جو لکھ رہے ہیں وہ جھوٹ نہیں ہے)

ہر گھر میں اب ایک گول میز ضروری ہے خواہ وہ تپائی ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو۔ تپائی میں ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ٹانگ بچتی ہے۔ تین ٹانگوں کی اس چھوٹی سی میز یعنی تپائی کے دیگر فوائد بھی بکثرت ہیں۔ اس پر آپ ٹانگیں بھی رکھ سکتے ہیں۔ اخبار پڑھنے کا بہترین آسن یہی ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر تپائی پر ٹانگیں پھیلا دی جائیں۔ خبریں تو خبریں، اداریہ تک سمجھ میں آجاتا ہے۔ میز کی جگہ تو مقرر ہوتی ہے لیکن تپائی اُس نئی نویلی بہو کی طرح ہوتی ہے جو گھر کے ہر فرد کے اشارے پر اِدھر سے اُدھر ہوتی رہتی ہے۔ تپائی کرسی کا بھی کام دیتی ہے جب کہ میز میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی (سرکاری دفتروں کے میز البتہ کبھی کبھی پلنگ کا بھی کام انجام دیتے ہیں) تپائی کی مثال دے کر ہم بہتوں کو یہ بات بھی سمجھا سکتے ہیں کہ چھوٹوں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے —— شاعر کہتا ہے: یوں تو چھوٹی ہے بات بکری کی:

اور یہ بات تو ہم نے برسبیلِ تذکرہ کہہ دی ورنہ ہم تو صرف انگریزوں کی ذہانت کے موضوع پر کچھ عرض کرنا چاہتے تھے۔ گول میز کی بات بس یونہی چھڑ گئی —— جہاں تک ان کی ذہانت کا سوال ہے اس کی داستان، ہماری داستانِ عشق کی طرح ہر طرف بکھری ہوئی ہے۔

گول میز، مساوات کا روشن سمبل ہے۔ اس کے گرد بیٹھ کر ہر آدمی اپنے آپ کو صدر نشیں اور مہمانِ خصوصی محسوس کرتا ہے۔ آدمی میں احساسِ برتری پیدا کرنا ہو تو اسے کچھ دیر اپنے ساتھ گول میز پر بٹھانا چاہیئے یہ خودی کو بلند کرنے کا پہلا زینہ ہے۔

یہ کہنا تو ہم بھول ہی گئے کہ ہماری روٹی بھی گول ہوتی ہے۔ جو لڑکیاں نہایت خوبصورت گول روٹیاں

بن سکتی ہیں سگھڑ کہلاتی ہیں ——— لیکن اب لڑکیاں کھانا پکاتی ہی کب ہیں۔ اب تو مرد سگھڑ اور سلیقہ مند ہونے لگے ہیں ——— یہ لوگ بَر دکھاوے کے لیے کہیں جاتے ہیں تو اِن سے پہلو سوال یہی پوچھا جاتا ہے کہ آپ کھانا پکانا جانتے ہیں؟

میز کا گول ہونا اس لیے بھی ضروری تھا کہ جب زمین گول ہے، چاند گول ہے، سورج گول ہے تو ہماری میزیں کیوں نہ گول ہوں ——— ہمارے مقدر کی طرح۔

نریندر لوتھر

خوشامد

تعریف اور خوشامد دو جڑواں بہنیں ہیں. ایک سادہ اور سیدھی سادھی ہے، دوسری بڑی چنچل اور شوخ،
ے سگھڑ ہے، دوسری چالو. ایک سادگی سے رہتی ہے تو دوسری بڑی بن ٹھن کے نکلتی ہے. ایک سچ بولتی ہے
. دوسری جھوٹ. ایک آپ کے منہ پر صاف صاف بات کرتی ہے. دوسری آپ کے منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ
.. ایک کھری کھری سناتی ہے تو دوسری صرف وہی بات جو آپ سننا پسند کریں.

آپ یقیناً کہیں گے کہ آپ 'تعریف' کو پسند کرتے ہیں لیکن عام طور پر جسے آپ 'تعریف' سمجھتے ہیں وہ دراصل
رشامد ہی ہوتی ہے. کیا آپ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ تعریف کے قابل ہی نہیں؟

ہر تعریف خوشامد ہوتی ہے لیکن ہر خوشامد تعریف نہیں ہوتی. لیکن خوشامد ایسا بھیس بدلتی ہے کہ بالکل
رہی نہیں چلتا کہ جو ابھی ابھی کی گئی وہ خوشامد تھی تعریف نہیں.

ہم نے الف لیلہ اور پنچ تنترا کی کہانیاں، شیخ سعدی کی حکایتیں اور ایسپ کی کتھائیں پڑھ کے یہ سبق حاصل
کہ خوشامد سے سب کام ہو جاتے ہیں اور یہ بھی پلے باندھ لیا کہ خوشامد سے کوئی نہیں بچ سکتا. اس کے باوجود ہم
ر بار خوشامد کا شکار ہوئے ہیں. بعد میں پچھتاتے بھی ہیں لیکن پھر اس جال میں پھنس جاتے ہیں. آپ بھی جب
ہیں آزما کے دیکھ سکتے ہیں. ہم کسی بھی وقت، کسی بھی حالت میں خوشامد کا شکار ہو سکتے ہیں. کبھی کبھی ہم سمجھتے
ہ کہ جو چند خوبیاں ہم میں اور بڑے لوگوں میں سانجھی ہیں ان میں خوشامد سے متاثر ہونا ایک ہے. ستم ظریفی تو یہ
ہے کہ بارہا ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ہماری خوشامد کرنے والا ہے اور ہم ہوشیار اور خبردار ہو جاتے ہیں. اکثر
رشامد کے دوران بھی ہم باخبر اور چوکنا ہو جاتے ہیں کہ اب ہماری خوشامد ہو رہی ہے. لیکن اس کے باوجود بھی
رشامدی ٹٹو نہایت کامیابی سے اپنا کام کر لیتا ہے اور ہمیں تب ہوش آتا ہے جب کہ اس کی لگائی ہوئی دولتی
د رد محسوس ہونے لگتا ہے.

بھونڈی قسم کی خوشامد کی مثالیں تو ہر روز پیش آتی ہیں. خوشامد کے ذریعہ ایک لومڑی کا کوے کو یہ یقین
ادینا کہ وہ بہت اچھا گاتا ہے. اور اس طرح اس کے منہ سے پنیر کا ٹکڑا گروا لینا تو بہت معمولی سی بات ہے.
لیے یہ کہانی صرف بچوں کی کتابوں میں ملتی ہے. ہمیں وہ کہانی بھی زیادہ پسند نہیں جس میں ایک صاحب ایک کتاب کے

خوشامد کرتا ہے۔ ایک دن نواب صاحب کو بیگن کی سبزی بہت پسند آئی اور اُس نے بیگن کی تعریف میں کچھ کہا۔ مصاحب نے بیگن کی تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ حضور بیگن واقعی سب سے بہترین سبزی ہے تبھی تو خدا نے اس کے سر پر تاج رکھا ہے۔ دوسرے دن نواب صاحب کو بیگن کا بھرتہ پسند نہ آیا تو انھوں نے بیگن کے خلاف بہت کچھ کہا۔ مصاحب نے بھی فوراً اپنا پینترا بدلا اور گویا ہوا کہ یہ بدترین ترکاری ہے۔ اِسی لیے تو قدرت نے اس کا منہ کالا کیا ہے۔

لیکن ہم نے بہت اعلیٰ معیار کی خوشامدیں دیکھی ہیں۔ اُن کو سن کر کانوں میں گویا شہد گھلنے لگتا ہے اور دماغ عش عش کرنے لگتا ہے۔ اُس وقت ہمارے دل میں بھی خوشامد کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن خوشامد کرنا تو ایک آرٹ ہے جو ان ایک آدھ پیڑھی میں نہیں سیکھ پاتا۔ بھونڈی خوشامد کرنے والے کو بجا طور پر "ٹٹو" کہا جاتا ہے، لیکن نفیس اور اعلیٰ پایہ کی خوشامد کرنے والے کو عربی گھوڑا کہا جانا چاہیئے۔

ایک ایسے ہی ماہر خوشامد جو صاحب غرض بھی تھے ہمارے پاس آئے۔ اُس وقت ہمارا کتا ہمارے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ہم اکثر جب انسانوں سے تنگ آجاتے ہیں تو کتے کو اپنے پاس بٹھا کر اُسے سہلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارا کتا بھی جب دوسرے کتوں سے عاجز ہو جاتا ہے تو ہمارے پاس آجاتا ہے اور ہمیں کئی طریقوں سے چومنا چاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم دونوں کو اکٹھے دیکھ کر ہی شاید کسی منچلے نے کہا تھا "خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو"۔

یقیناً انھوں نے ہمارے کتے کے بارے میں بیشتر معلومات حاصل کر لی تھیں۔ کیونکہ کتوں کے ہمارے شوق کا شہر کے تمام کتوں کو علم ہے۔

آتے ہی وہ کتے کو بڑے پیار سے دیکھ کر بولے "کیا غضب کا کتا ہے! میں نے اپنی زندگی میں بہت کتے دیکھے ہیں، لیکن ایسا خوبصورت، اتنا اصیل، اتنا سمجھدار، اتنا با ادب کتا۔۔۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ کتے کو دیکھ کر اُس کے مالک کی خاندانی وجاہت کا پتہ لگ جاتا ہے۔"

ہم نے ادب کر جواب دیا "یہ کسی خاص نسل کا کتا نہیں۔ ویسے ہی پکڑ کر پال لیا ہے۔"

وہ کب ٹلنے والے تھے "یہی تو کمال ہے۔ نسلی کتے کو تو سب پال سکتے ہیں۔ اس میں کیا خاص بات ہوئی ہم بات تو یہ ہے کہ ایک عام کتے کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ نسلی کتوں کو شرمندہ کرے۔ یہی تو آپ کے شوق کا دلیل ہے"! اتنے میں کتے نے اپنا کان کھجلایا۔ ہم نے کہا "بڑا گندہ کتا ہے اس کو پسو بہت چمٹ جاتے ہیں"۔

انھوں نے کتے کے کان کو پکڑ کر اس کے اندر جھانکا اور جھوم کے بولے "واہ صاحب کیا کمال کا پسو ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت پسو دیکھے ہیں لیکن اتنا پلا ہوا موٹا پسو کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھئے نا۔ یہ بھی کتے کی تربیت کا ثبوت ہے۔ پسو کے لیے کتنی قربانی دے رہا ہے۔ اپنے خون سے اس کی پرورش کر رہا ہے۔"

ہم جان گئے کہ ہمارا پالا کسی عام خوشامدی ٹٹو سے نہیں بلکہ ہاتھی سے پڑا ہے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھ کر ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔

آج تک ہم جب کبھی ڈپریشن محسوس کرتے ہیں تو انہیں صاحب کو بُلا لیتے ہیں۔ وہ آن کی آن میں ہماری پست مفرح کر دیتے ہیں۔

کئی لوگ ایسے خوشامد کرتے ہیں جیسے وہ بظاہر آزادانہ رائے دے رہے ہوں اور خوشامد الیہ کو خبر

بھی شبہ نہیں ہوتا کہ اُس کی خوشامد ہو رہی ہے ۔ ایک وزیر کی اس طرح خوشامد ہوتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی کانوں سے سنی اور تہ دل سے محسوس کی خوشامدی کہہ رہا تھا ۔

"یہ جو فیصلہ آپ نے کیا ہے، اس کے خلاف کافی لوگ اپنی رائے کا اظہار کریں گے ۔ ہر دلیر فیصلے کے خلاف ہمیشہ شدید ردِّ عمل ہوتا ہے ۔ اب لوگ دیکھ رہے ہیں کہ آپ میں اتنی ہمت ہے کہ نہیں کہ اس فیصلہ پر اٹل رہیں ۔ کئی لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ آپ دباؤ کے تحت ایک دو دن میں یہ فیصلہ بدل دیں گے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کا مقابلہ کیسے مرد سے ہے "

یہ سنتے ہی وزیر نے اپنی چھاتی اتنی پھیلائی کہ وہ اُس کی توند کے برابر ہونے کو آئی ۔ اور پھر وہ بڑے زعم سے گویا ہوا " آپ دیکھتے رہیئے " ظاہر ہے وہ فیصلہ ایسا تھا جس میں خوشامد کرنے والے کا فائدہ تھا ۔

ایک فریادی کی اپیل ہم نے منظور کرلی ۔ وہ حکم نامہ لے کر ہمارے پاس آیا ایک لمبی سانس لے کر پہلے حکم نامہ کو اور پھر ہمیں بغور دیکھنے کے بعد گویا خود ہی اپنے آپ سے مخاطب ہوا " یقین نہیں آتا کہ آج کل کے زمانے میں بھی ایسے انصاف پسند اور بے باک اہلکار موجود ہیں ! یہ فیصلہ صرف آپ جیسا ہی جوانمرد اور شیر دل افسر کرسکتا تھا میں کہتا ہوں، بلکہ سارا شہر کہتا ہے کہ اگر ہندوستان میں آپ جیسے ایک درجن افسر بھی ہوں تو اس ملک کو جنت نشان بنایا جاسکتا ہے "

کتنا صحیح شخص تھا وہ ! کتنا انصاف پسند اور دلیر افسر تھا میں ! شہر میں کتنا ہر دلعزیز ! اُس دن سے آج تک میں اپنے جیسے گیارہ اور افسروں کی تلاش میں سرگرداں ہوں تاکہ ایک قومی جنت کا اہتمام کیا جا سکے لیکن افسوس آج تک ایک اور افسر بھی ایسا نہ ملا جس میں وہ تمام جوہر اور صلاحیتیں پھلی جھڑی جو ناچیز میں بکثرت پائی جاتی ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے چند افسرانِ بالا اور حکام اس رائے سے متفق نہیں ۔ یہ تو اس ملک کی بدقسمتی ہے ۔ لوگ ایسی واضح باتوں پر بھی اختلاف رائے رکھتے ہیں ۔ ایک طرف وہ راست گو، شخص شناس عربی گھوڑا اور ہم اور دوسری طرف باقی لوگ کون کہتا ہے کہ اکثریت ہمیشہ صحیح ہوتی ہے !

جہاں ہم نے دوسروں سے خوشامد کروانی سیکھ لی ہے، بلکہ اُسے پسند بھی کرتے ہیں، وہیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم دوسروں کی خوشامد کرنے کے آرٹ سے بالکل عاری ہیں ۔ ہم نے ایسا کرنے کی کئی بار پُر خلوص اور پُر زور کوشش بھی کی ہے لیکن عین منجدھار میں خوشامد کا ہمارا ٹٹو اڑیل بن جاتا ہے آگے جانے سے انکار کر دیتا ہے ۔ اور ہمیں چار و ناچار ناکام ہو کر واپس ہونا پڑتا ہے ۔ کئی بار تو ہمیں شک ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ٹٹو، ٹٹو نہیں بلکہ گدھا ہے جو عین وقت پر اپنی ڈھیچوں ڈھیچوں سے سارا کام خراب کر دیتا ہے ۔

ہمارا ایک افسر ہمیں بہت چاہتا تھا ۔ اس نے ایک شام ہمیں اپنے گھر چائے پر بلایا ۔ وہ ایک نیا سوٹ پہنا ہوا تھا اور کافی دیر تک منتظر رہا کہ میں سوٹ کا نوٹس کروں لیکن جب ہم سوٹ کے بارے میں کوئی تعریفی جملہ کہنے کی بجائے کیک اور پیسٹریوں پر ہی ہاتھ صاف کرتے رہے، تو بالآخر اُس نے خود ہی پوچھا " ارے بھئی ہمارے نئے سوٹ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے "؟

ہم نے پیسٹری کا ٹکڑا نگلتے ہوئے کہا " جی ۔ سوٹ تو بہت اچھا ہے لیکن اگر آپ کی توند ذرا کم ہو تو واقعی اچھا لگے گا "

اس واقعہ کے بعد نہ جانے کیوں وہ افسر ہم پر اتنا مہربان نہیں رہا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک اہم اعتبار سے ہماری تعلیم اور تربیت دونوں ادھورے رہ گئے ہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ دونوں غلط ہوئے ہیں۔ ہمیں بچپن میں یہ سمجھایا گیا تھا کہ صرف کمزور اور نا اہل لوگ ہی چاپلوسی اور خوشامد کرتے ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنی قابلیت اور لیاقت کی بناء پر ہی آگے بڑھنا چاہیئے۔ شیر کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتا۔ صرف لومڑی جیسے کمزور اور ریاکار جانور ایسا کام کرتے ہیں اس لیے لومڑی آج تک کتنی بدنام ہے۔ اگر شیر ہو یا شیر بننا چاہتے ہو تو خوشامد کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ہم حقیقی دنیا کی طرف دیکھتے ہیں تو ہر طرف خوشامد کا بازار گرم پاتے ہیں۔ شیر جو خوشامد نہیں کرتا، سرکس کے جنگلوں میں بند ہو جاتا ہے اور اُسے کئی قسم کے کرتب دکھلانے پڑتے ہیں۔ لومڑی آزاد پھرتی ہے۔ غریب لوگ امیروں کی خوشامد کرتے ہیں، کلرک افسر کی، افسر وزیر کی، وزیر حکومت کے سربراہ کی اور سربراہ جنتا کی۔ اس چاپلوسی کے چکر سے چھٹکارا کیسے ممکن ہے ؟

دنیا میں قسم قسم کی چیزوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ہر شہر میں بیشتر قسم کی منڈیاں پائی جاتی ہیں۔ سبزی منڈی، پھل منڈی، گھاس منڈی، دال منڈی، کپڑے کی منڈی، چوڑیوں کی منڈی، آپ کسی چیز کا نام لیں، اُس کی منڈی مل جائے گی۔ بلکہ کئی ایسی اشیاء جن کا نام لینے میں آپ کو ہچکچاہٹ ہو، اُن کی منڈی بھی مل جائے گی۔ لیکن دُنیا بجائے خود خوشامد کی منڈی ہے۔ ایسی منڈی جس میں خوشامد کا سکہ چلتا ہے اور اُسی کے ذریعہ ہر چیز بکتی ہے اور خریدی جاسکتی ہے۔ ہماری جیب میں تو ہمیشہ سکوں کی کمی رہی۔ یہ قیمتی سکہ کیسے ملے گا ؟

اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم بھی خوشامد کرنا سیکھ لیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ خوشامد سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ خوشامد سے نہیں خوشامد کرنے کے کسی خاص طریقے سے نفرت کرتے ہیں، جولیس سیزر کے قتل کے سازشی گروہ میں سے ایک شخص نے اُسے اُس جگہ لانے کی ذمہ داری لی تھی جہاں پر اُسے قتل کرنے کا منصوبہ تھا۔ اس نے کہا کہ جب میں جولیس سیزر سے کہتا ہوں کہ آپ کو خوشامد سے نفرت ہے تو وہ میری رائے سے متفق ہوتا ہے کیوں کہ اس میں بھی اس کی خوشامد ہوتی ہے۔ جولیس سیزر جیسا شخص خوشامد کی وجہ سے بخوشی قتل ہونے کو تیار ہو گیا۔ اور ہوا۔

ہم سب خوشامد سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم خوشامد کیے جانے کے قابل ہیں۔ ایک بڑے مشکل سے نام والے فرانسیسی فلاسفر نے کہا تھا کہ ہمیں دوسروں کی خوشامد سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا بشرطیکہ ہم خود اپنی خوشامد نہ کریں۔ لیکن اُسکا فلاسفر نے دوسری سانس میں یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہم خود اپنی خوشامد نہ کریں تو پھر زندگی میں رہ جایا جائے گا!

"گئے دنوں کے سراغ ...."۔ ۱

مرتبہ: مضطر مجاز

"مطائباتِ شبلی نعمانیؒ"

عطیہ بیگم (فیضی) کی شادی پر

(بمبئی کی مشہور مسلمان خاتون عطیہ بیگم (فیضی) کی شادی ایک نو مسلم یہودی نقاش و مصوّر سے ہوئی اس پر شاعر نے نئے نئے مضامین پیدا کر کے عطیہ بیگم کو تحفہ بھیجا ـــــ)

(مرتب کلیاتِ شبلی؛ مولانا سلیمان ندوی)

"کھینچ" سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لیے ننگِ قرابت سے مجھے دوری تھی

آپ "نقاش ہیں" اور حسن کی تصویر ہوں میں!
آپ نے مجھ کو جو "کھینچا" تو یہ مجبوری تھی

حضرت الہ آبادی کے رقعۂ دعوت کا جواب

(پاؤں کے حادثے کے بعد جس میں مولانا شبلی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی ـــــ)

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پھرا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے "معذور" ہوں میں (یعنی لنگ)

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلیؔ!
جیتے جی مُردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

قطعہ

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک
یہ تو کہیے کہ عمل کی بھی بناء ڈالی ہے
ایک صاحب نے کہا "آپ گھبرائیں ابھی؟
حال" بھی آئے گا ابتک تو "یہ قوالی" ہے

سوٹیبل سیلف گورنمنٹ

کل کہہ رہی تھی لیگ یہ احرارِ قوم سے
جو جو بلائیں مجھ پہ پڑی تھیں وہ ہٹ گئیں
اب قیدِ "سوٹیبل" سے ہو کب دیکھیے نجات
وہ بیڑیاں تو خیر کسی طرح کٹ گئیں

افسونِ حریت

لاکھ آزادیٔ افکار کو روکا لیکن
یہ وہ افسون ہے کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے
غیر کم بخت تو گستاخ تھے مدت سے، مگر
اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے

مسلم لیگ کی صدارت

لیگ نے سیلف گورنمنٹ کی جو خواہش کی
وہ سمجھتی تھی کہ یہ طرزِ بدیع اچھا ہے
لیکن اب اس نے یہ سمجھا کہ غلط تھا وہ خیال
کہ ملازم وہی اچھا جو مطیع اچھا ہے
اب کی ہو جائے گا اس جرأتِ بے جا کا علاج
لیگ مجرم ہے تو ہونے دو "شفیع" اچھا ہے

[بیرسٹر محمد شفیع (لاہور) جو انگریز حکومت کی نظر میں محبوب تھے۔ جن کو مسلم لیگ کا صدر بنانا تجویز کیا گیا تھا مسلم لیگ پر طنز کیا ہے کہ لیگ سے مطالبۂ آزادی کے جو جرائم ہوئے تھے وہ بیرسٹر صاحب کے اثر و رسوخ سے معاف ہو سکیں]

جنگ یورپ اور ہندوستانی

[پہلی جنگ عظیم اگست ۱۹۱۴ء کے موقع پر یہ نظم لکھی گئی تھی غالباً یہ مولانا کی آخری نظم تھی کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں وفات پائی]

○

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں

برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطیفہ ہے کہ تیار بھی نہیں

باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل
آئین شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں

میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٔ غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

○

رشید قریشی

دوستی کی خاطر

یکطرفہ دوستی سے دو طرفہ دشمنی بہتر ہوتی ہے اس طرح کہ پہلی
رت میں ایک ہی فریق کو دوستی کے سارے تقاضوں کو بھگتنا پڑتا ہے
دوسری صورت میں دونوں دشمن اپنی اپنی حصار بندیوں میں ایک دوسرے
محفوظ رہتے ہیں۔ کبھی ایک دشمن کی بھول چوک سے فائدہ اُٹھاکر دوسرا
ن ضرر پہنچا بھی دے تو دشمنی کی روشنی میں اُسے قابلِ برداشت بنا لیا
تا ہے لیکن جو وار دوستی کی آڑ میں کیا جاتا ہے اس کے زخم کے لئے دوست
دشمنی سیخ کے کباب کے نیچے دہکنے والی آگ بن جاتی ہے۔ اس حقیقت
ے میری رسائی کسی شخصی تجربہ کے توسط سے نہیں ہوئی ہے۔ میں تو نہ کسی کا
دوست ہوں نہ کسی کا دشمن، دوست کی طلب ہوتی ہے تو خود اپنا دوست
بن جاتا ہوں۔ دشمن کی تلاش ہوتی ہے تو خود اپنا دشمن بن جاتا ہوں۔
سبق تو مجھے میرے پڑوسی شکور کی زندگی سے ملا ہے جس کے گھر کے لئے
ن مضمون کا کتبہ تیار ہو رہا ہے۔ یہاں دفن ہونا تھا شفیق کو لیکن اس میں
تر گیا ہے اُس کا دوست شکور۔

عام رواج کے مطابق شکور کی زندگی جوانی سے شروع ہوئی اور
کھلکھلاتی کلیوں کے ہجوم میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ دیوانگی دیوانگی کو
اکساتی ہے لیکن یہاں وہ ایک ہی طرف زور انداز تھی۔ کیونکہ شکور کا جسم
اپنی منحنی تشکیل میں نظرگیر ہی نہ ہوتا۔ اور چہرہ پر نظر جمتی تو صاف ظاہر
ہوتا کہ آنکھیں صرف دیکھنے کے لئے ہیں، خوبصورت نظر آنے کے لیے نہیں۔
ناک کا سامنے کا حصہ آگے نکل کر طوطے کی چونچ کی طرح مڑ گیا تو سارا چہرہ
طوطے سے مشابہ ہوگیا۔ اوپر کے دانت اُبھرے تو ایک چھجہ بنتا گیا اور ہونٹ اور ناک کے اتصال سے ایک دوسرا لب بستہ
منہ وجود پذیر ہوگیا۔ اس ہیئت کے شکور سے، مردانہ وجاہت میں زنانہ خد و خال ڈھونڈنے والی آہو چشموں کو کیا دلچسپی ہو سکتی
تھی؟ لیکن شکور قلم کا بڑا قادر سوار تھا اور اسی لیے اکثر لڑکیاں اس کے آٹوگراف کی طلب گار ہوتیں اور اپنی آٹوگراف بک
کے ساتھ اپنے بیگ نشین ہمراہی آئینہ کو بھی اس کے سامنے کر دیتیں۔ شکور بہت موزوں آٹوگراف لکھتا اور آئینہ سے نظر
بچاکر سامنے کے چہرے ہی میں اپنی صورت دیکھتا۔ شکور کے اس ادبی شغف نے شفیق کو اس کی طرف کھینچا اور وہ اپنے
کالج کے ساتھی کی طرف دوستی کا ہاتھ پھیلائے، چھلانگیں لگاتا بڑھ آیا۔ شکور اس مظاہرۂ خلوص سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس

نے ساری احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے دل کے دروازے کھول دیئے اور شفیق جوتوں سمیت اندر داخل ہو گیا
شکور کا ایک آٹو گرافی مقولہ تھا "ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا" لیکن شفیق کے معاملہ میں سادہ لوح جذباتیت
سفارشی ہوئی تو شکور کی مردم شناسی نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ اُدھر شفیق نے اپنے خلوص کی بے لوثی کو منوانے کے
لئے یہ پینترا کاٹا کہ شکور کو اپنی محبت کا راز دار بنا لیا اور اپنی محبوبہ کا خط، جواب لکھنے کی عاجزانہ درخواست کے ساتھ حوالے
کر دیا۔ شکور کو یقین ہو گیا، سچا اور بڑا دل رکھنے والا ہی، دوست کو شریکِ محبت بنا سکتا ہے۔

اس کے بعد، پیامِ شوق کا اب پوچھنا کیا، برابر آ رہا ہے جا رہا ہے اور یا پھر یہی خط کا پیامِ شوق تو ایسا فیصلہ کن
تھا کہ اگر یہ خط محبوبہ کے ہاتھ لگ جاتا تو شفیق اس جنت کو پا لیتا جسے حضرتِ آدم نے کھو دیا تھا۔ لیکن خطوں کی ترسیل
سے جو گڑبڑ وابستہ ہوتی ہے وہ واقع ہو گئی اور محبت نامہ محبوبہ کے ہاتھوں میں جانے کے بجائے محبوبہ کے بھائی کے
قبضہ میں چلا گیا، بھائی جو وزن اُٹھانے اور مُکّہ بازی میں سونے چاندی کے تمغے جیت چکا تھا۔

شفیق اس المیہ پر پریشان تھا اور اس کی محبوبہ حواس باختہ ——— دونوں ملے تو پریشانی ایک طرف اور حواس باختگی
دوسری طرف۔ محبوبہ نے پوچھا "اب میں کیا کروں؟" شفیق نے چھوٹتے ہی کہا۔ "میرے خط مجھے واپس دے دو۔"
محبوبہ نے پھر پوچھا "مجھے نہیں، اپنے خط واپس چاہتے ہو؟"

شفیق کا جواب تھا "ہاں . . . . اب دوسری لڑکی کو اور کہاں خط لکھتا بیٹھوں . . . " محبوبہ کچھ دیر سوچتی
رہی اور پھر گلوگیر آواز میں کہہ اُٹھی۔ "شام گھر آ جاؤ اور خط لیتے جاؤ . . . . لیکن مجھے نہ پاؤ گے . . . . خیال رہے۔"

شفیق خطرہ کو بھانپ گیا اور اس نے دوستی کا واسطہ دے کر شکور کو خطوط واپس لانے کے لیے محبوبہ کے گھر بھیج دیا۔
شکور نے جب "منزلِ مقصود" کی اطلاعی گھنٹی بجائی تو اندر گھنٹی بجنے لگی اور اس کے ساتھ اس کی بائیں آنکھ بھی پھڑکنے
لگی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک پہلوان نما شخص نے پھاٹک کھول کر شکور کو اندر کھینچ لیا۔

"یہ خط آپ نے لکھے ہیں؟"

"جی ہاں . . . . جی نہیں . . . . دوست کے لیے . . . . میں نے . . . . مگر نہیں . . . میں نے۔"

"یہ خط آپ کو واپس چاہئیں؟"

"جی ہاں . . . . "

"لیکن میرا دل نہیں چاہتا کہ واپس کروں۔ دل میں قلم ڈبو کر لکھتے ہیں آپ، یقین کیجئے آپ کے خط پڑھ
کر، خود مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

"جی . . . وہ . . . اگر آپ ازراہِ کرم، یہ خط واپس کر دیں تو . . . . ورنہ میں ان کے بغیر بھی چلا جاؤں گا۔
خدا حافظ۔"

"ٹھیرئیے . . . . . ذرا ہم سے ملتے تو جائیے ذرا قریب سے۔ مجھے پہچانیئے۔ آپ نے یہ خط جس لڑکی کے نام لکھے
ہیں، میں اس کا بھائی ہوں . . . . ہونے والا سالا۔"

"جی . . . . بھائی . . . . بڑے بھائی آپ کے رشتہ کا علم اسی وقت ہوا۔ ابھی ابھی، میرا ہاتھ چھوڑ دیئے۔
اگر میں پہلے سے واقف ہوتا تو . . . . ہاتھ مت توڑیئے۔ خدا گواہ ہے . . . . ہرگز ہرگز . . . . یہ حرکت نہ ہوتی . . ."

"اب یہ حرکت ہو ہی گئی ہے اور خط آپ کو مطلوب ہیں ... تو ... لیجئے .... یہ رہے آپ کے خط"
محبوبہ کے بھائی نے پانچوں خط شکور کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیئے۔ شکور نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا دیا۔
"آپ ان خطوں کو اس طرح نہیں لے جا سکتے" .... محبوبہ کے بھائی نے ایک خط کو پھاڑ دیا "منہ کھولئے .... کھولئے منہ!"
"کیا کروں؟" شکور بلبلایا۔
"اسے کھائیے" محبوبہ کا بھائی للکارا۔
شکور نے چہرے سے کراہیت کا اظہار کیا تو .... ایک مکہ اس کے منہ پر اترا اور اوپر کے ابھرے دانتوں کا بچھا ٹوٹ گیا۔
شکور نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ میں بی۔ اے سال دوم کا طالب علم ہوں"
"تو یہ لو ایک اور" اور دوسرا مکہ ناک کی پھننگ پر پڑا اور ناک کے اگلے حصہ پر طوطے کی چونچ جو پیچ تھی اس نے پچکے ہوئے مینڈک کے دھڑ کی شکل اختیار کر لی۔ شکور کا منہ کھل گیا اور جب خط کے پرزے اس کے منہ میں ٹھونس دیئے گئے، وہ انہیں آہستہ آہستہ چبانے لگا۔ "نگلو" .... محبوبہ کا بھائی چنگھاڑا۔ شکور کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ... "پانی" اس کی آواز میں پیاسے بھکاری کی ترستی گڑگڑاہٹ تھی ... پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا تو اس نے پانچوں خطوں کے ٹکڑوں کو ایک ایک گھونٹ پانی کی مدد سے حلق کے نیچے اتار دیا۔
"مزیدار تھے نا یہ ... خط ... ؟" محبوبہ کے بھائی نے تلخ لہجے میں پوچھا .... شکور نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
"اب پھر کبھی کسی لڑکی کے بھائی کی اجازت کے بغیر اسے خط لکھو گے؟" شکور نے نفی میں گردن ہلا دی اور اس کی گردن دیر تک اسی طرح ہلتی رہی۔

شفیق نے محبت سے توبہ کر لی اور شکور نے وہ قلم توڑ دیا جو محبت نویس تھا۔ کہتے ہیں محبت میں ناکام ہونے والا شادی کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی کام شفیق نے بھی کیا۔ اس کے ماں باپ نے پچاس ہزار لے کر ایک لڑکی سے اس کا رشتہ طے کرنا چاہا تو اس نے قربانی کے بکرے کی طرح گردن ڈال دی۔ البتہ لڑکی کی صحتمندی کے تعلق سے کچھ سرگوشیاں اس کے کانوں تک بھی پہنچیں تو اس نے یہ شرط لگا دی کہ وہ دلہن کو دیکھے بغیر شادی نہیں کرے گا۔
شادی سے ایک دن پہلے اسے سسرال بلایا گیا اور جب اس کا سامنا اس کی دلہن سے ہوا اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ گھر واپس ہوتے ہوئے اسے مخالف سمت سے دو موٹر سیکلوں کی روشنیاں ایک معین فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے اس کی طرف آتی نظر آئیں۔ ان دو موٹر سیکلوں کے بیچ میں سے نکل جانے کے ارادہ سے اس نے اپنا اسکوٹر تیز کر دیا اور سیدھا سامنے سے آنے والی ایک موٹر سے ٹکرا گیا۔

شکور دوسرے دن شفیق کی عیادت کے لیے نرسنگ ہوم گیا جہاں سر کی چوٹ اور ہاتھ کی ہڈی کے ٹوٹ جانے کے علاج کے لیے اسے شریک کیا گیا تھا۔ اس نرسنگ ہوم کے ڈاکٹروں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے مریض کے دل سے اپنے دل کو جوڑ دیتے ہیں اور اسے کبھی گھر واپس نہیں ہونے دیتے۔ ان کی ہمدردی کا یہ عالم رہتا ہے کہ مریض کو وقتاً فوقتاً دیکھے بغیر ان کو چین نہیں پڑتا اور بے لوثی کا یہ حال کہ ان کو ذرہ برابر پرداہ نہیں ہوتی کہ ان کے معائنوں کی فیس دگنی تعداد کے حساب سے ان کو مل رہی ہے۔

شکور، شفیق کے کمرہ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا ایک برقعہ پوش شفیق کے سرہانے ہچکیاں لیتی کھڑی ہے۔ شفیق قریب المرگ لہجہ میں اُسے دلاسہ دے رہا تھا۔ صبر کرو۔ میں نہ رہا تو کیا۔ کوئی اور تمہیں اپنی دلہن بنالے گا۔ ہر لڑکی دلہن بننے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ تم بھی لڑکی ہی ہو؟ لڑکی نے اپنا سر پیٹ لیا" یہ ساری نحوست میری ہے۔ میری ہی نحوست نے پہلے بھی مجھے شادی سے ایک دن پہلے بیوہ بنادیا۔ اب کون مجھ سے شادی کرے گا۔ میری نحوست نے میری قسمت پر مہر لگادی۔ میں کنواری بیوہ مروں گی۔ اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ شفیق کی نظر شکور پر پڑی تو اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیا" شکور میرے دوست۔ میرے جانی دوست وقت پر آئے۔ میرے آخری وقت آئے۔ میرے قریب آؤ۔ آؤ۔ اور میری اس آخری خواہش کو بھی پورا کرو۔ شفیق نے شکور کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے برقعہ پوش خاتون کے ہاتھ میں تھمادیا۔" وعدہ کرو کہ تم اسے اپنی دلہن بناؤ گے۔ یہ حادثہ نہ ہوتا تو۔ یہ لڑکی آج میری دلہن بنتی۔ سنو اگر تم نے اس سے شادی نہیں کی تو اس کو منحوس سمجھ کر کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ لولو۔ میری خاطر۔ ایک دوست کی خاطر تم اس سے شادی کرلوگے نا؟ کہو ہاں۔ کہو ہاں!! میں تو چلا۔ شفیق پر غشی طاری ہوگئی۔ اور شکور بھی تیورا کر گرنے کو تھا کہ برقعہ پوش خاتون نے پھرتی سے اسے اپنے دونوں ہاتوں پر اٹھالیا۔

مضمون کی ابتداء میں، میں نے ایک کتبہ کا حوالہ دیا تھا جس پر یہ مضمون کندہ ہونے والا تھا یہاں دفن ہوتا تھا شفیق کو۔ لیکن اس میں دفن ہوگیا اس کا دوست شکور۔ یہ کتبہ تیار ہوگیا ہے اور چونکہ شفیق معذور زندہ رہ گیا ہے اس لیے اس کتبہ کو شکور کے گھر پہ نصب کر دیا گیا ہے۔

طالب خوندمیری

پانی

ہے مرے شہر میں جس روز سے عنقا پانی
ہو گیا کھوج میں پانی کی کلیجہ، پانی

صرف دو بوند پڑوسی سے جو مانگا پانی
اُس کی آنکھوں میں اچانک اُمڈ آیا پانی

اپنے وعدوں کا پلاتے رہے نیتا پانی
اُن کے بھاشن میں بہت زور سے برسا پانی

پہلے ہوتی تھی یہ بہتے ہوئے دریا کی طرح
اب سیاست بھی ہے ٹھہرا ہوا گندہ پانی

حکمرانی میں تعصّب بھی ہے، من مانی بھی
اب تو لگتا ہے ہُوا سر سے بھی اونچا پانی

اس کے سینہ پہ کسی کے جو پڑے سبز قدم
بس اُسی روز سے اس شہر میں سوکھا پانی

صرف پانی پہ تھا دن رات گزارا جن کا!
اب تو اُن سے بھی مرے شہر میں روٹھا پانی

اِک مسافر کے لیے شہر تھا صحرا جیسا!
پیاس جب حد سے بڑھی ریت پہ لکھا پانی

اِک مفکّر نے نئی نسل کے بارے میں کہا
ہوتی نایاب جو آنکھوں کا نہ مرتا پانی

آج اس شہر میں ہوتا کوئی فرہاد اگر
گھر میں شیریں کے شب و روز وہ بھرتا پانی

ایک سیلاب سا محسوس ہوا ہے سب کو
بعد مدّت کے ذرا نل سے جو ٹپکا پانی

سوکھے حسرت زدہ چہروں پہ لکھا لگتا ہے
"پانی ملتا تو، ذرا مُنہ پہ بھی آتا پانی"

"یاد آیا اُسے پانی کا ہوا ہو جانا"
جب سے طالب نے کسی نل میں نہ دیکھا پانی!

قطعہ

اپنی اسکوٹر پہ ہم تھے ایک دوشیزہ کے ساتھ
یہ تو سچّا واقعہ ہے کوئی افسانہ نہیں
دندناتے ہم گئے اپنی گلی میں بھی مگر
سر پہ ہلمٹ تھی تو بیگم نے بھی پہچانا نہیں

نمکین غزلیں

نیاز سواتی
(پاکستان)

مرغ اور حلوہ تر ہو تو غزل ہوتی ہے
کچھ پلاؤ بھی اگر ہو تو غزل ہوتی ہے

شب کلب میں جو بسر ہو تو غزل ہوتی ہے
دل میں بیگم کا نہ ڈر ہو تو غزل ہوتی ہے

پیش اک لمبا سفر ہو تو غزل ہوتی ہے
ساتھ اک رشکِ قمر ہو تو غزل ہوتی ہے

بیل گاڑی میں غزل ہو بھی تو وہ کیا ہوگی
نئی موٹر میں سفر ہو تو غزل ہوتی ہے

خفیہ رومان بھی دیتے ہیں غزل کی دعوت
پر، نہ بیگم کو خبر ہو تو غزل ہوتی ہے

گھر میں اپنے ہو تو لکھتا نہیں اک حرف نیاز!
بیوی ماں باپ کے گھر ہو تو غزل ہوتی ہے

شاعری کا شغل گو ہر آن ہونا چاہیئے
گھر میں کھانے کا بھی کچھ سامان ہونا چاہیئے

میرا بیٹا بات سچی کوئی بھی کرتا نہیں
میرے بیٹے کو سیاستدان ہونا چاہیئے

جس جگہ کرتے ہیں قائم ڈاکٹر سنٹر، وہاں
ساتھ ہی سنٹر کے قبرستان ہونا چاہیئے

ایک درجن دیکھ کر بچے کہا رہگیر نے
آپ کو تو ٹیم کا کپتان ہونا چاہیئے

جو غزل پر لاد کر لائے پچاس اشعار کو
ایسے شاعر کا بھی اب چالان ہونا چاہیئے

باپ کے دشمن سے لیتے ہیں بہادر انتقام
آدمی کو دشمنِ شیطان ہونا چاہیئے

گھر پہ حل کرتے ہیں پرچہ پھر بھی کہتے ہیں یہی
امتحان یہ اور بھی آسان ہونا چاہیئے

نام اُس کوٹھی کا کیوں رکھا ہے کُٹیا سیٹھ جی!
نام جس کا قصر عالی شان ہونا چاہیئے

خود بھی کوئی کارنامہ کرکے دکھلائیں گے آپ
یا ہمیشہ باپ دادا ہی کے گن گائیں گے آپ

کیا منسٹر بن کے کچھ میرے بھی کام آئیں گے آپ
یا کہ اوروں کی طرح مجھ کو بھی ٹرخائیں گے آپ

آپ کے میں گھر گیا تو آپ کیا دیں گے مجھے
میرے گھر آئے تو اپنے ساتھ کیا لائیں گے آپ

قبر میں تنہا ہی جائیں گے جناب سیٹھ جی!
یا کہ یہ دولت بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے آپ

پانچ سو سے کم نہیں لیتے سلائی کوٹ کی
کس طرح درزی سے پورا سوٹ سلوائیں گے آپ

ساتھ دینا ہی پڑے گا اب زمانے کا نیاز!
ورنہ سارے شہر میں بُدھو کہلائیں گے آپ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مسیح انجم

ہماری زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا برس گزرا ہوگا جب کہ ہم بیمار نہ پڑے ہوں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بیماری ہمارے تعاقب میں لگی رہتی ہے۔ خدا نے ہمارا دفاعی نظام ہی کچھ ایسا پیچیدہ اور کمزور بنایا ہے کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بیماری کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ ہمارے جسم میں پائے جانے والے سفید جسیمے جنھیں جراثیم کے حملوں کو پسپا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، انتہائی کاہل اور کام چور واقع ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ اپنے فرائضِ منصبی کو بھول کر کہاں پڑے سوتے رہتے ہیں۔ اُن کے فرائض منصبی اور ہمارے محکمۂ پولیس کی کارکردگی میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی موسم کے تیور ذرا بدل جاتے ہیں تو مختلف قسم کے جراثیم وزیٹنگ ویزا کے بغیر ہی ہمارے جسم میں داخل ہوجاتے ہیں اور اپنا پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔

اب تو ہمارے گھر والوں نے ہمارے مزاج اور موسم میں اس حد تک مطابقت پیدا کرلی ہے کہ اگر ہم چھینک دیں تو یہ اعلان کر دیں گے کہ مطلع ابر آلود ہونے والا ہے۔ اگر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجائیں تو یہ منادی کروی جائے گی کہ جاڑے کی آمد آمد ہے۔ اگر ہماری جلد پر پھنسیاں نمودار ہوں تو اڑوس پڑوس کو آگاہ کردیا جائے گا کہ وہ نئی اور کوری صراحیوں کا انتظام کرلیں، اس طرح ہمارے گھر کے سارے افراد ہمیں موسموں کی پیش قیاسی کا آلہ سمجھنے لگے ہیں۔ جب صورتحال اتنی عجیب وغریب ہو تو غور فرمایئے کہ پیدائش سے لے کر آج تک ہم نے کتنی بیماریوں کا مزا نہ چکھا ہوگا اور کتنے ہی ڈاکٹروں سے سابقہ نہ پڑا ہوگا!؟

پچھلے برس کی بات ہے کہ ہماری ٹانگوں میں کچھ درد سا ہونے لگا تھا۔ اور اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرنے وقت جوڑوں سے کچھ عجیب قسم کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اِن

آوازوں کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل ہے۔ ایسی آوازیں عموماً ان سیکلوں سے آتی ہیں جن کے بولٹ اور نٹ ڈھیلے پڑ گئے ہوں اور چھرّے مار کھا گئے ہوں۔ گمان ہوا کہ ہمارے اعصابی نظام میں کہیں خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ معائنہ کروانے کے لیے ایک لندن رٹرن ڈاکٹر کے کلینک کو پہنچے جو اعصابی نظام اور جوڑوں کے علاج کے اسپیشلسٹ سمجھے جاتے تھے (ان کے کلینک کے بورڈ پر تو یہی لکھا ہوا تھا) اسپیشلسٹ (SPECIALIST) کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے! —— اسپیشلسٹ اُس کو کہتے ہیں جو کم سے کم مرض کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا ہو۔ ہاں تو بات اعصابی علاج کے اسپیشلسٹ کی ہو رہی تھی۔ ان کا طریقِ علاج یہ تھا کہ مریض سے فیس مشورہ وصول کرنے کے بعد اس کو مختلف معائنوں اور امتحانوں سے گزارتے تھے۔ جب تک معائنوں کی رپورٹیں وصول نہ ہوتیں، مریض کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے البتہ وٹامن کی گولیوں سے مرض کے جراثیم کو بہلا اور پھسلاتے تھے۔ جب معائنوں کی رپورٹیں وصول ہو جاتیں اور ان کے مطالعے کے بعد کوئی مرض ان کے ہاتھ لگ جاتا تو باضابطہ علاج شروع کر دیتے تھے۔ جب اتنے سارے ڈاکٹروں کے تعاون کے باوجود بھی مریض بچ جاتا تو اس کا سارا کریڈیٹ اپنے سر لیتے تھے اور اگر دورانِ علاج، مریض مر جاتا تو معائنہ کنندگان کو قصوروار ٹھیرا کر خود بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ ہاں تو ہم جیسے ہی ان کے کلینک کو پہنچے، اپنے آپ کو ان کے حوالے کیا۔ عرضِ حال سُن کر ایک خاص قسم کی ہتھوڑی سے ہمارے گھٹنوں، ٹخنوں اور کہنیوں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اِن ماروں اور "ٹھونکوں" سے ان کی تشفی نہ ہوئی تو مزید اطمینان کے لیے آٹھ، دس اُٹھک بیٹھک کروائے۔ جب ہماری کمر نے جواب دے دیا تو فرمایا "ایکسرے کرواؤ!" ایکسرے رپورٹ پیش کی تو حکم دیا "خون کا معائنہ کرواؤ!" اس سے بھی تشفی نہ ہوئی تو "بلڈ کلچر" کروانے کا حکم دیا۔ غرض اتنے سارے معائنے کروائے کہ ایلوپیتھی طریقِ علاج پر سے ہمارا اعتقاد اُٹھ گیا۔ یوں بھی اتنے سارے معائنوں کے بعد ہم بالکل قلاش ہو گئے تھے۔

اِس ڈاکٹر سے مایوس ہونے کے بعد ہم نے ایک ایسے ڈاکٹر کی ڈسپنسری کا رُخ کیا جو مرض کے بارے میں مریض سے کچھ بھی نہیں چھپاتے تھے بلکہ صاف صاف بتا دیتے تھے۔ مثلاً مریض کو کون سا مہلک مرض لاحق ہے۔ مریض کا اس دُنیا میں کتنے دن کا دانہ پانی باقی ہے۔ کتنے فی صد مریض اس مہلک مرض سے مر جاتے ہیں اور بھارت میں مرنے والوں کا PERCENTAGE کتنا زیادہ ہے۔ مریض کے لیے کون سا دن یا کون سی رات بھاری ہو سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایسے انکشافات سے مریض کی حالت کتنی اَبتر ہو سکتی ہے۔ قوتِ ارادی کی کمی اور کم حوصلہ رکھنے والا مریض تو وہیں پھڑ پھڑا کر ڈاکٹر کے قدموں میں دَم توڑ دے گا۔ چونکہ ہم کو اس قسم کے ڈاکٹر سے سابقہ نہیں پڑا تھا، اس لیے جان ہتھیلی پہ لیے ان کی ڈسپنسری کو پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے چہرے پر ہوائیاں اُڑتیں دیکھ کر بلڈ پریشر چک کیا اور پھر اپنے آلہ کو بڑی احتیاط سے بند کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا "کیا آپ چل کر آئے ہیں؟"

ہم نے عرض کیا "جی نہیں ڈاکٹر صاحب! سیکل پہ آیا ہوں!"

فرمایا "حیرت ہے آپ کے سیکل پہ آنے پر۔ آپ کو تو راستہ ہی میں کہیں گر جانا چاہیئے تھا۔ آپ کا بلڈ پریشر انتہائی LOW ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کا ہارٹ فیل کیوں نہیں ہوا؟ اس قسم کے مریض کو تو اسٹریچر پہ لایا جاتا ہے!"

اب آپ ہی غور فرمایئے کہ مریض کے مُنہ پر اس طرح بے ساختہ کہنا داد کی تعریف میں آتا ہے یا بیداد کی! وہ تو ہم ہی تھے جو قوتِ ارادی کے بل بوتے پر موت کے مُنہ سے نکل آئے۔ اگر کوئی کمزور دل کا مریض ہوتا تو وہیں غش کھاکے گر جاتا اور آنِ واحد میں اس کی روح وہیں پرواز کر جاتی۔ ہم آج تک کوئی نتیجہ اخذ نہ کرسکے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے مُنہ پر فی الفور اور فی البدیہہ قسم کے جو کلمات کہے تھے ان سے ہماری حوصلہ افزائی مقصود تھی یا ہُوٹنگ۔

ایلوپیتھی طریقِ علاج سے فرار حاصل کرکے ہم نے ایک حکیم یُونانی کے مَطب کا رُخ کیا کہ دیکھیں وہاں ہمارے علاج کے لیے کیا اہتمام ہے۔ ہمارے مرض کے بارے میں سُننے سے پہلے ذرا حکیم صاحب کے بارے میں سُن لیجے ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور ذرا اونچا بھی سُنتے تھے (بھلا ان کے اونچا سننے میں ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے) نام اُن کا بُرہان الدین تھا۔ ڈاکٹروں کے علاج اور انگریزی دواؤں کو سِرے سے مانتے ہی نہیں تھے۔ اور اپنے سوا دیگر یونانی اطباء کے نسخوں کو رَد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہمیشہ "قاطع برہان" بنے بیٹھے رہتے تھے۔ چونکہ ذرا اونچا سنتے تھے، اس لیے مریض کو حاضرینِ محفل کے روبرو ببانگِ دہل یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ وہ کس پیچیدہ مرض میں مبتلا ہے چاہے وہ مرض "امراضِ پوشیدہ" کی فہرست ہی میں کیوں نہ آتا ہو؟ شرمیلے اور پڑھے لکھے مریض اپنے مرض کی تفصیلات کاغذ پر بتانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ تفصیلات لکھتے وقت املا اور اِنشاء کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اگر مریض اَن پڑھ ہو تو اُس کے لیے یہ ضروری ہوجاتا تھا کہ وہ ایک عدد منشی کو بھی اپنے ساتھ رکھے۔ جس دن ہم حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوئے وہاں ایک ایسا نیا مریض بھی آیا ہوا تھا جو گنوار اور اَن پڑھ تھا۔ چونکہ وہ حکیم صاحب کی صفتِ ثقلِ سماعت سے ناواقف تھا اس لیے اپنے ساتھ ایک عدد منشی کو نہیں لایا تھا۔ اپنی باری آنے پر اُس نے اپنا مرض بتایا

"مجھے اجابت ہے!"

حکیم صاحب نے جھٹ فرمایا "اچھا تو اجازت ہے!"۔

یہ سنتے ہی وہ مریض اُلٹے پاؤں لَوٹ گیا۔

اُس کے بعد ہماری باری آئی۔

ہم نے کاغذ پر لکھ دیا "گیس ستاتی ہیں!"

حکیم صاحب نے مُسکراتے ہُوئے فرمایا "گیس، پریسیڈنٹ ریگن کو بھی ستایا کرتی ہیں، آپ کس شمار میں ہیں؟"

پھر اُس کے بعد حکیم صاحب نے ہماری نَبض پر اپنا ہاتھ رکھا۔ آنکھوں کے پَپوٹے چیر چیر کر اس حد تک آنکھوں کا معائنہ کیا کہ آنسو نکل پڑے۔ زبان کو اس حَد تک نکالنے کو کہا کہ رال ٹپک پڑی۔ پھر اُس کے بعد ہماری ذات میں اتنے سارے امراض تشخیص کئے کہ اپنے آپ پر "مجموعۂ امراض" کا گمان ہونے لگا۔ یہ سچ ہے کہ عمارت جب ذرا پُرانی ہوجاتی ہے تو MINOR REPAIRS کی مرمت کے وقت اچانک MAJOR REPAIRS بھی منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔ ویسے ہم اتنی پرانی اور مخدوش عمارت تو نہیں تھے کہ حکیم صاحب ہماری ایک ذات میں اتنی ساری بیماریاں تلاش کرتے۔ وہ تو ہمارا ہی ظرف تھا کہ اتنے سارے امراض کی تفصیل خندہ پیشانی سے سماعت کی۔ اگر کوئی دوسرا مریض ہوتا تو اُس کی آنکھوں

میں خون اُتر آتا اور وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا جو قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہو۔ تاہم ہم نے حکیم صاحب سے علاج کروانے کی ٹھان لی۔

حکیم صاحب ہمیں روزانہ میٹھے میٹھے معجون دیتے جو ہم فلاقند سمجھ کر کھا لیا کرتے تھے۔ اُن کی دی ہوئی جوارشیں اور معجون کھا کر جی یہی چاہتا کہ ہم شفایاب نہ ہوں۔ غرض علاج کا جو سلسلہ شروع ہوا تو بس چلتا ہی رہا اور ہم حکیم صاحب کے مطب کے چکر کاٹتے ہی رہے۔ ہمارے ان چکروں کو دیکھ کر دوسرے مریض یہ سمجھ بیٹھے کہ حکیم صاحب کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مریضوں کا رجوع کم ہوتا گیا۔ بالآخر حکیم صاحب سے رہا نہ گیا۔ ایک دن ہاتھ جوڑ کر فرمایا "میں باز آیا آپ کے علاج سے۔ آج سے آپ نہ میرے مریض اور نہ میں آپ کا طبیب۔ پھر کبھی اِدھر کا رُخ کیا تو دواؤں کے ٹب میں غوطے دوں گا۔"

حکیم صاحب کے پاس سے نکالے ہوئے دو دن ہی گزرے تھے کہ اچانک ہماری شہادت کی اُنگلی میں کچھ ٹیس سی شروع ہو گئی۔ جب درد نے شدّت اختیار کی تو ہم صاحبِ فراش ہو گئے۔ ہمارے دشمن خوش ہو گئے کہ دوسروں پر اُنگلی اُٹھانے اور غلطیوں کی نشان دہی کرنے کی سزا ہمیں مل گئی ہے۔ پھر تو عیادت کرنے والوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم بیماری سے اِتنا نہیں گھبراتے جتنا کہ عیادت کو آنے والوں سے گھبراتے ہیں۔ کیوں کہ دوست احباب مریض کی عیادت کم کرتے ہیں اور پھل اور بسکٹ زیادہ کھا جاتے ہیں بلکہ بعض تو صرف پھل اور بسکٹ ہی کھانے کے لیے آتے ہیں۔ چنانچہ اسی اندیشہ کے پیشِ نظر ہم اپنی علالت کی نیوز اخبار میں نہیں چھپواتے۔ ہمیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہماری علالت کی نیوز ہمارے دوستوں کے حق میں INVITATION CARD ثابت ہوگی اور ہمارا دیوالیہ نکل جائے گا!

▲▲

غزل

خوش خواہ مخواہ
(بمبئی)

رکیا ہے مجھ کو میری شاعری نے گھر بدر دیکھو
میرا گھر ہے مگر میں پھر رہا ہوں در بہ در دیکھو

تمہی تم ہو ہمیشہ میری آنکھوں میں اگر دیکھو
جو چاہو تو کھڑے ہو کر یا چاہے بیٹھ کر دیکھو

جواں تھے تم تو نظروں کو نظر لگنے کا خدشہ تھا
بڑھاپا آگیا ہے اب جدھر چاہو ادھر دیکھو

وہ پہلی بار شادی کر رہا ہے اس لیے شاید
پسینے میں ہوا جاتا ہے دولہا تر بتر دیکھو

میری بیگم کو میری شاعری سوکن سی لگتی ہے
وہ مجھ سے ایک دن کہنے لگیں با چشم تر دیکھو

تمہاری شاعری کم بخت میرا جی جلاتی ہے
تم اس کو چھوڑ دو تو معاف کر دوں گی مہر دیکھو

غریبی کو ہٹانے وہ مٹاتی ہے غریبوں کو!!
غریبوں پہ ہی ٹوٹا ہے حکومت کا قہر دیکھو

دغا بازی فریب و جھوٹ میں جو ماہر فن ہیں
وہ صورت سے نظر آتے ہیں کتنے معتبر دیکھو

یہی ڈر ہے کہ خود بیمار نہ ہو جائیں بے چارے
مریضوں سے زیادہ ہو گئے ہیں چارہ گر دیکھو

ہوا ٹی۔وی و وی سی آر کا جب سے چلن گھر گھر
ہوئی ہیں عورتیں مردوں سے اپنے بے خبر دیکھو

کبھی شاعر کی جیبیں گرم رہتی ہیں تو خوش ہو کر
کسی بھٹیار خانے میں وہ کھائے گا ڈنر دیکھو

گزر اوقات میری خواہ مخواہ اب شاعری پہ ہے
جسے سب عیب کہتے تھے وہی نکلا ہنر دیکھو

گرگٹ گورکھپوری

جامے سے بہر حال وہ باہر نہیں ہوتا
پانی جو نہانے کو میسر نہیں ہوتا

ہم دیکھنے والوں کو نچاتے ہیں مداری
اب کھیل کا ہیرو کوئی بندر نہیں ہوتا

بے پر کی اڑانوں کے سوا ہم بھی کریں کیا
پر ہوئے تو پھر پاؤں زمیں پر نہیں ہوتا

جلنا ہو تو کٹیا میں جلو جانِ تمنا
محتاج چراغوں کا بڑا گھر نہیں ہوتا

مٹتی ہے کوئی بھوک، پنپتی ہے کوئی بھوک
کھانے سے کوئی شخص تونگر نہیں ہوتا

گرگٹ سے کہو رنگ چڑھائے نہ تو بے پر
مشکور چمیلی کا چھچھوندر نہیں ہوتا

— مقرب حسین مقرب
رتلام (مدھیہ پردیش)

یو۔ این۔ اُو (UNO)

(امن کے دیوتا)

پھر رہی ہے چیختی دم توڑتی انسانیت
ہنس رہی ہے یہ تماشہ دیکھ کر حیوانیت

زندگانی آجکل بیمار بن کر رہ گئی
آج خود انسانیت بھکار بن کر رہ گئی

یہ جو خود ماریں گے انسانوں کو کیا انسان ہیں؟
امن کے جو دیوتا ہیں جنگ کے شیطان ہیں

کون ہے شیطان یہ پہچاننا دشوار ہے
منہ پہ نعرہ امن کا ہے ہاتھ میں تلوار ہے

ایک یو۔ این۔ او بنائی بس دکھانے کے لئے
اپنی ہی طاقت کا کچھ سکّہ جمانے کے لئے

اِس کے سب بھائی ہیں ڈاکو یہ بہن ہے چور کی
یہ حفاظت کر نہیں سکتی کسی کمزور کی

اِس کے ممبر روس، امریکہ بہت شہ زور ہیں
ایک، دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے چور ہیں

خود کو بتلاتے ہیں ریگن شانتی کا دیوتا
سوچئے اِس دیوتا نے لیبیا میں کیا کیا

مصر میں اور ہنگری میں سوچئے تو کیا ہوا
روس، امریکہ ہیں پھر بھی شانتی کے دیوتا

بم گرائے اتنے کابل کو بنا ڈالا کھنڈر
یہ سبھی کچھ ہو رہا ہے امن ہی کے نام پر

کون تھا بتلاؤ کس نے مصر پر حملہ کیا
اور ہوتا کون سب تھے امن ہی کے دیوتا

یاد ہے کشمیر میں تھی فوج پاکستان کی
ٹینک امریکہ کے تھے بارود انگلستان کی

آتما بھوتوں کی ہے اور جسم انسانوں کے ہیں
صرف نعرے امن کے ہیں کام شیطانوں کے ہیں

خود تو ظالم ہیں مگر اوروں کو کہتے ہیں بُرا
ہے زباں پر شانتی اور آستیں میں ہے چھُرا

راستے جو امن کے ہیں کس طرح ہموار ہوں
چوریاں پھر کیوں نہ ہوں جب چور تھانیدار ہوں

ظالموں پر اب یہ دنیا تنگ ہونی چاہیئے
اَے مقرّب ایک ایسی جنگ ہونی چاہیئے

— جھانسٹر ناگپوری

دُو شعر

بہتی ہے اس کے گھر میں ہر وقت اُلٹی گنگا
غیروں سے میٹھی باتیں، اپنوں سے مار دنگا

محفل میں صرف اپنی کیوں مارتا ہے ڈینگیں
تُو شمعِ حُسن ہے تو جھانسٹر بھی ہے پتنگا

* پرویز یداللہ مہدی

فلمی کُتّے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پالتو اور پیشہ ور ـــ پالتو کُتّے بالخصوص فلمی کلاکاروں کے "لے پالک" ہوتے ہیں اور انتہائی ناز و نعم میں پالے جاتے ہیں جبکہ پیشہ ور کُتّے بالعموم پردۂ فلم پر جلوہ افروز ہو کر اپنے ساتھ اپنے مالک کا بھی پیٹ پالتے ہیں۔ اول الذکر کے نصیب میں آرام ہی آرام ہوتا ہے تو آخر الذکر کے مقدر میں صرف کام ہی کام۔ ایک ہمہ وقت ٹھنڈی چھاؤں میں نرم گرم گودوں میں ہمکتا مچلتا رہتا ہے تو دوسرا اسٹوڈیو کی جھلسا دینے والی روشنیوں یا آؤٹ ڈور کی کڑی دھوپ میں اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے۔ سُپر اسٹار کلاکاروں کے کُتّے بھی سُپر اسٹار ہوتے ہیں یعنی ہر جگہ وی۔آئی۔پی ٹریٹمنٹ (V.I.P. Treatment) کے حقدار ہوتے ہیں۔ کامیاب فلمی ستارے جو خود زمین پر بہت کم چلتے ہیں اس لئے ان کے کُتّے بھی زمین پر نہیں چلتے بلکہ اپنے آقاؤں کی طرح غریب پروڈیوسر کی جیتی جاگتی لاش پر چلتے ہیں۔ جو لوگ فلمی ستاروں کے قدموں میں اپنی آنکھیں بچھاتے ہیں وہ ان کے چہیتے کُتّوں کو بھی خوشی خوشی سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ فلمی ستارے اپنے کُتّوں کا جس قدر خیال رکھتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی اگر پروڈیوسر کے حصے میں آجائے تو اس کی فلم برسوں کی جگہ ہفتوں میں مکمل ہو جائے لیکن پروڈیوسر بھلا کُتّے کے مقدر سے بازی نہیں لے جا سکتا اس لئے ہمیشہ "بھاؤ" ہیرو یا ہیروئن کے پیر اور اس کے کُتّے کے تلوے چاٹتا رہتا ہے اسی اُمید پر کہ شاید اسکی "کُتّا پروری" سے خوش ہو کر ہی اس کا مطلوب ہیرو یا ہیروئن اسے شوٹنگ کے لئے دو چار تاریخیں عنایت کر دے۔

فلم اسٹار کی مارکیٹ جتنی اعلیٰ سطح کی ہوتی ہے کُتّا بھی اتنی ہی اعلیٰ نسل کا پالتا ہے۔ چنانچہ بڑے اداکاروں کے کُتّے یورپ، امریکہ، جرمنی، فرانس، اٹلی وغیرہ سے برآمد کئے جاتے ہیں۔ خاص طور سے جن فلمی ستاروں کی اپنی "ذات" کا بلکہ "باپ" کا بھی پتہ نہیں ہوتا وہ "کُتّوں کی ذات" اور ان کی "ہڈی" کی چھان بین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے کیونکہ آگے چل کر "کُتّے کی ذات" ہی

ان سپر اسٹاروں کی ذات" کی پہچان کا ذریعہ ٹھہرتی ہے ـــــ اس انتخاب میں اگر ذرا سی بھول چوک ہو جائے تو نہ صرف ان کا "کیریر" (Carrier) متاثر ہوتا ہے بلکہ ان کی "ذات پات" کا پول بھی کھل جاتا ہے۔ بقول شاعر ؎

کھلتا کسی پہ کیوں میرا "ذاتی" معاملہ
کتوں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بڑے بڑے سپر اسٹاروں کی دیکھا دیکھی "چھوٹے موٹے فلمی ستارے بھی اس "کتا نوازی" میں ملوث نظر آتے ہیں تاہم ان کے کتے "ولایتی" نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے ان کے محدود مالی "وسائل" ایمپورٹیڈ "کتوں کی ناز برداریاں اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے چنانچہ یہ صرف "اینگلو انڈین" کتوں پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اینگلو انڈین کتے اصل میں "دوغلی نسل" کے ہوتے ہیں آدھے انگریز آدھے ہندستانی ـــ یہ ہندستانی میں بھونکتے اور انگریزی میں کاٹتے ہیں۔ ہم ایک فلمی کیبرے ڈانسر کے اینگلو انڈین کتے سے واقف ہیں جس کی خونخوار انگریزی دانی کا دوسطری نمونہ پھوڈیو سر شری دھتورا چند دھتورا چند گھاس منڈی والا کی داہنی ٹانگ پہ کسی نادر "قطوطے" کی شکل میں دیکھ چکے ہیں ـــــ واقعہ یوں ہے کہ سیٹھ جی اپنی زیرِ تکمیل فلم کے اگلے "شیڈول" (Schedule) کے لئے تاریخیں لینے مذکورہ ڈانسر کے پاس پہنچے اور حسبِ سابق اپنی مالی پریشانیوں کا دکھڑا رو کر اُسے ایک بار پھر "دھرم کھاتے" میں کام کرنے پر آمادہ کرنا چاہا لیکن ڈانسر موصوفہ اس بار معاوضہ کی جگہ "معروضہ" سننے کو ہرگز تیار نہیں تھی چنانچہ غصے اور جھنجھلاہٹ میں اس نے اپنے کتے کو سیٹھ جی پر چھوڑ دیا۔ کتا چونکہ ڈانسر کا تھا لہٰذا پہلے تو اس نے سیٹھ جی کو "کیبرے ڈانس" کروایا بالکل اسی طرح جیسے سیٹھ جی اپنی فلم کے رائٹر کو معاوضے کی حقیر قسطوں کے سلسلے میں ڈانس کروایا کرتے تھے۔ کل آؤ، پرسوں آؤ، دس تاریخ کو آؤ، اگلے مہینے آؤ ـــــ کتے کے ساتھ "راک اینڈ رول" کرتے کرتے جب سیٹھ جی نڈھال ہو کر کسی پتھر کی طرح زمین پر "رول" گئے تب کتے نے ان کی مذکورہ ٹانگ پکڑی اور پھر اس وقت تک نہیں چھوڑی جب تک کہ اپنے نوکیلے دانتوں سے اس پر بہ زبان انگریزی اپنے "آٹو گراف" ثبت نہیں کر دیئے ـــ سلوک کی اس خونخوار منزل سے گذرنے کے بعد ظاہر ہے کتوں سے سیٹھ جی کی روح فنا ہونے لگی چنانچہ جب بھی کوئی ازراہِ مذاق ان کے آگے ڈانسر کے کتے کا ذکر چھیڑ دیتا تو فوراً آگ بگولہ ہو کر پہلے تو مذکورہ کتے کی سات پشتوں کی شان میں "مغلظات" کے کشتوں کے پشتے لگا دیتے پھر بے بسی لاچاری کے آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہوئے اپنی متاثرہ ٹانگ "آٹو گراف بک" کی طرح ملاحظہ بلکہ مطالعے کیلئے پیش کر دیتے کہ ؎

نقش فریادی ہے اسکی "خونی تحریر" کا

فلمی ستاروں کے کتے اپنے آقاؤں کے مزاج میں اس قدر دخیل ہوتے ہیں کہ اکثر یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کتے کا وجود کہاں ختم ہوتا ہے اور فلمی ستارے کی ذات" کہاں سے شروع ہوتی ہے چنانچہ بر وقت ایک دوسرے کی "خو بو" بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ کتے ناز نخرے سہنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور فلمی ستارے بھونکنے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے کی خونخوار خصلتوں کا آئے دن مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ البتہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ان سارے "کتے چھاپ" اوصاف حمیدہ کو خوشی خوشی اپنا لینے والے فلمی ستارے "کتے" کی سب سے مشہور خصوصیت "صفتِ وفاداری" سے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں۔

بیشتر فلمی ستاروں کے چہیتے کتوں کا ماہانہ "بجٹ" ان کے متعلق ملازمین کی کل تنخواہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے بلکہ بعض فلمی اصحاب تو اپنی ساری کمائی صرف اس لئے کتوں پر لٹا دیتے ہیں کہ ان کا کوئی آگے پیچھے نہ رشتہ دار کوئی نہیں ـــ ہمارا ایک

ہی فلمی کومیڈین سے پڑچکا ہے جن کی کسی زمانے میں بڑی دھوم تھی لیکن فی الحال فلموں سے بنیاس لے کر کتوں پر ریسرچ
میں مصروف ہیں چنانچہ گھر میں بچوں سے زیادہ کتوں کی لائن لگا رکھی ہے۔ کتوں کے معاملے میں "فیملی پلاننگ" کے قائل
نہیں، ہر سائز، ہر رنگ اور ہر نسل کا کتا آپ کے 'سایۂ سگ نواز' میں دستیاب ہے۔ کتوں سے اس قدر والہانہ عشق ہے کہ
"فیملی ممبر" کا درجہ دے رکھا ہے اور فیملی ممبروں کو ——— ظاہر ہے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ کس کا درجہ
رکھا ہے۔ موصوف کی نظر میں "کتا پروری" کنبہ پروری سے کہیں زیادہ "پونیہ" کا کام ہے ——— ایک مرتبہ
ایک ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں موصوف کا انٹرویو کرنے ان کے 'کتا گھر' جانے کا اتفاق ہوا۔ واضح ہو کہ اس وقت
ہم نے ان کی کتا پروری کے مختصر قصے سن رکھے تھے، ان کی "آل اولاد" کو دیکھنے کی سعادت نہیں حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ
ہی ان کے "کلبۂ عافیت" میں داخل ہوئے، ہماری "خیر خیریت" کو خطرہ لاحق ہوگیا ——— موصوف اس طرح اپنے
میں گھرے ہوئے تھے جیسے مرغی اپنے "چوزوں" میں گھری ہوتی ہے یا پھر جیسے بیشتر ہندی فلموں میں، ہیروئین کو
کی گوری کے گٹ اپ یعنی گھٹنے سے اونچے گھاگرے اور نیم بیٹوں کے جنسی جذبات سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی بالشت
"چولی" کے باوجود انتہائی جدید اسٹائیل کے بالوں کے "جوڑے" پر "مٹکی" ٹکائے، پنگھٹ کے "تٹ" پر کم سے کم
میں ملبوس آٹھ دس "مٹکی" بردار سہیلیوں کے جھرمٹ میں بل کھاتے شرماتے ہوئے دکھایا جاتا ہے ——— البتہ
کی جگہ دو عدد جیبی سائز کے "پلے" موصوف کی دونوں بغلوں میں، اس طرح دبے ہوئے تھے جیسے محتاط اور
اندیش لوگ کسی فرشی نشست میں "حفظ ما تقدم" کے طور پر اپنے جوتے "بغل میں دبائے" "نعلین در بغلین" کی
بنے نشست برخاست ہونے تک بیٹھے رہتے ہیں ——— کتوں کی ایسی خونخوار "فوجِ ظفر موج" کو دیکھ کر ہمارے
سے پسینے چھوٹ گئے۔ موصوف نے مسکرا کر اور ان کی آل اولاد نے غرّا کر ہمارا سواگت کیا۔ اُدھر سواگت کے پردے
"دُرگت" کا پورا سامان موجود تھا۔ اور اِدھر ہمارے لئے نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن۔ ایک آدھ کتا ہوتا تو
کرکے بھاگ نکلتے، لیکن وہاں تو گوریلا چھاپہ ماروں کا پورے کا پورا دستہ ہماری مہمان نوازی پر کمربستہ تھا ———
نے ہتھیار ڈالتے ہوئے چور نظروں سے کوئی محفوظ کونا تلاش کیا مگر افسوس، کمرے میں جتنا بھی "فرنیچر" موجود تھا
پر موصوف کی "اُمت" براجمان تھی۔ ہمیں کشمکش و پیچ میں مبتلا دیکھ کر کتوں کے آقا نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ
لیکن وہاں بیٹھنے کی ہمت اس لئے نہیں ہوئی کہ جو لحیم شحیم "کتا اس تختِ طاؤس" پر شہنشاہ وقت کی طرح پھیلا ہوا تھا وہ
ہمیں خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے مسلسل رال ٹپکائے جا رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے سمٹ کر داہنی طرف والے صوفے کا
لیا۔ اتفاق سے اس پر بھی تھوڑی سی جگہ خالی تھی، البتہ بقیہ صوفے پر جو تابکار کتا قابض تھا، وہ ایک تو کتا اور
کم خونخوار نظر آرہا تھا، دوسرے خوش قسمتی سے اس وقت "قیلولہ" بھی فرما رہا تھا، لہٰذا ہم نے صوفہ پر دو کا
قدمی کی ہی تھی کہ موصوف نے ہمیں خبردار کیا ——— "اُدھر مت بیٹھئے جناب! بہت حرامی کتا ہے اس کی ...
مت جائیے۔ یہ وہ بادل ہے جو گرجتا نہیں، برستا ہے یعنی بھونکتا نہیں صرف کاٹتا ہے۔!" "کتا ثانی" کے پوشیدہ
——— "حرامی پن" پر روشنی ڈالنے کے بعد "کتا اوّل" کی شان میں قصیدہ خوانی فرماتے ہوئے بولے۔ "یہ صورت
ضرور حرامی لگتا ہے لیکن اصل میں ہے بڑا بے ضرر اور شریف اس لئے کاٹتا بالکل نہیں، صرف بھونکتا ہے!"
موصوف کا فقرہ ختم ہوتے ہی کتا اوّل نے بھونک کر اچھے بے ضرر اور شریف ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ الامان الحفیظ

دُم کی خیر مناتے ہوئے بمشکل تمام صوفہ نمبر ایک کے کونے پر ٹک گئے۔ ہمارے خوفزدہ وجود کو فلم کے " فریز شاٹ "
(Freez Shot) کی طرح منجمد دیکھ کر موصوف تسلی آمیز لہجے میں بولے ـــ "گھبرایئے مت، اطمینان اور
آرام سے بیٹھئے، میرا کالیہ بہت ہی ملنسار دوست کُتّا ہے۔" معلوم ہوا کہ ہمیں جس ناخلف کے پہلو میں بیٹھنے کی سعادت
نصیب ہوئی تھی اس کا اسم گرامی محترم کالیہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد موصوف نے مسمّی کالیہ کو پچکارتے ہوئے حکم صادر
فرمایا ـــ "چلو کالیہ، بھائی صاحب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ ـــ !" مسمّی کالیہ نے حکم کی تعمیل میں فوراً اپنا خطرناک
پنجہ آگے بڑھا دیا۔ لیکن بھائی صاحب چونکہ اس غیر متوقع معانقہ کے لئے بالکل تیار نہیں تھے اس لئے برادرم کالیہ معانقہ کی
بجائے "مصافحہ" پر اتر آئے یعنی سیدھے ہمارے سینے پر سوار ہو گئے ـــ موصوف ہنستے ہوئے بولے "دیکھا آپ نے کس
قدر سمجھ دار اور تمیز دار ہے میرا کالیہ۔"

ہم نے مسمّی کالیہ کی رال ٹپکاتی زبان کی زد سے اپنا چہرہ بچاتے ہوئے گھگیا کر گذارش کی "بالکل دیکھ لیا جناب
آپ کا کالیہ صرف سمجھدار اور تمیز دار ہی نہیں شہ سوار بھی ہے، اب اسے میری چھاتی پر سے اترنے کا حکم دیجئے پلیز!"
موصوف نے اسے دوبارہ پچکارتے ہوئے حکم صادر فرمایا ـــ "کم آن ـ (Come - on) کالیہ چھوڑ دو بھائی صاحب
کو، میرے بعد یہ تمہارا انٹرویو بھی لیں گے۔" اپنے آقا کے حکم سے زیادہ انٹرویو کے لالچ میں کالیہ صاحب ہمیں چھوڑ
کر الگ ہٹ گئے۔ موصوف نے آگے فرمایا۔ "اس سے پہلے کہ آپ اپنا انٹرویو شروع کریں، آئیے میں اپنے دیگر
فیملی ممبروں سے آپ کا "پریچے" کروا دوں۔ کالیہ سے تو آپ کا باقاعدہ تعارف ہو چکا ہے، یہ جو صورت حرام، صوفے پر
آنکھیں موندے لیٹا ہوا کسی گیانی دھیانی کی زبردست ایکٹنگ کر رہا ہے اس کا نام ہے "گبر سنگھ" ـــ اور یہ جو "چوربن"
پکوان میرے قدموں میں "لوٹن کبوتر" کی طرح لوٹیں لگا رہا ہے یہ "سانبھا" ہے اور یہ جو بالکل آپ کے سامنے
میز پر بیٹھی آپ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے اس حرافہ کا نام "بسنتی" ہے، اور یہ جو "ببلول" میری
بغلوں میں بیٹھ کر خوش فعلیوں میں مگن ہیں ان میں داہنی طرف والا "ویرو" ہے اور بائیں طرف والا "جے" اور وہ
جو وہاں ڈریسنگ ٹیبل کے روبرو بیٹھی شیشے میں اپنے آپ کو نہار رہی ہے وہ ہے ان سب کی ماتا، جنم داتا..."
ہم نے فوراً قطع کلام کرتے ہوئے برجستگی سے کہا۔ "اس کا نام یقیناً "شعلے" ہوگا ـــ!"
بولے ـــ "بالکل صحیح پہچانا آپ نے، یہ ساری چنگاریاں اسی شعلے سے پھوٹی ہیں۔" اتنا کہہ مسمّاۃ شعلے
کی طرف لگاوٹ آمیز نظروں سے دیکھا پھر ہماری طرف رجوع ہوئے اور ایسی دادطلب نظروں سے دیکھنے لگے
جیسے مسمّاۃ شعلے کے "تخلیقی عمل" میں موصوف کا بھی برابر کا حصہ رہا ہو، چنانچہ ہم نے سپٹا کر مسمّاۃ شعلے کی
طرف دیکھا جو اپنے جُثّے کے اعتبار سے واقعی فلم شعلے کی طرح سیونٹی ایم ایم (70 M.M) کی تعریف میں آتی
تھیں جبکہ بقیہ کُتّا برادری کی جسمانی پیمائش، سکسٹین (16) اور تھرٹی فائیو ایم ایم (35 M.M) تک محدود تھی!

اس سے پہلے کہ ہم انٹرویو کا آغاز کرتے موصوف اپنے بغلی کتوں کو نیچے چھوڑتے ہوئے بولے "اتفاق
سے اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے سب فلم دیکھنے گئے ہیں "کُتّا میرا ساتھی" آپ نے بھی دیکھی ہوگی۔ سپرہٹ
فلم ہے۔ خیر میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں تب تک آپ کتوں سے جی بہلائیے۔" قبل اس کے کہ ہم انہیں
روکتے، وہ کُتّے کی طرح چھلانگ لگا کر اندر غائب ہو گئے اور پھر جس وقت وہ چائے اور ناشتے کی ٹرے (Tray)

ما سے دوبارہ نمودار ہوئے، سارا منظر بدل چکا تھا، ان کی آل اولاد پوری طرح ہمارا "گھیراؤ" کرچکی تھی، یہاں بلکہ ان کے بعض بچے "بھی" بغلی گھونسوں" کی طرح ہماری بغلوں میں زبردستی گھس چکے تھے۔ ہمیں یوں "سگ بستہ" ہو کر نہ صرف ان کی ہنسی بلکہ چائے کی پڑے بھی ہاتھوں سے چھوٹ گئی، موقع غنیمت جان کر کتوں نے "مل مت" کی طرف اور ہم نے بیرونی دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔!!

چلتے چلتے فلمی کتوں کی سب سے خطرناک قسم کی طرف اشارہ کردیں، ان کا کاٹا نہ تو پانی مانگتا ہے اور نہ ہی ان کے زہر کا کوئی اُتارا، کوئی علاج ہے، البتہ اس قسم کے فلمی کتوں کی پہچان بڑی آسان ہے، ان کے دُم نہیں ہوتی چوپائے بھی نہیں ہوتے، یہ آپ کی ہماری طرح "دوپائے" ہوتے ہیں اور ہر پروڈکشن میں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مرزا غالب نے برسوں پہلے کتوں کی اسی خطرناک قسم کی طرف اپنے اس شعر میں کھلے طور پر اشارہ کیا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

--

غزلیں

پاپولر میرٹھی

○

زندگی کے لیے اور کیا چاہیئے
روز چندے کا اِک سلسلہ چاہیئے
باوفا چاہیئے بے وفا چاہیئے
کوئی ساتھی ہو اچھا بُرا چاہیئے
عشق کے واسطے عمر کی قید کیا
عشق کے واسطے حوصلہ چاہیئے
عمر کھولوں گا اپنی وہیں پر بسر
صرف اس کی گلی کا پتہ چاہیئے
جو دُلہن کے لیے خطرۂ جان ہو
ایسی لعنت کا اب خاتمہ چاہیئے
تکڑم سے جہاں کام بنتا نہ ہو
سکّہ و زر وہاں پھینکنا چاہیئے
زہد کی آڑ میں گُل کھلاتے ہیں کچھ
پیرہن اک مجھے گیروا چاہیئے
صرف باتوں سے جو مطمئن کر سکے
ایسا نیتا کوئی ڈھونڈنا چاہیئے
ہر طرف امن ہے ہر جگہ چین ہے
اب ڈھنڈورا یہی پیٹنا چاہیئے
اس بڑھاپے میں بھی فکر شادی کی ہے
آپ کو آئینہ دیکھنا چاہیئے
بزم میں آپ موجود ہیں سامنے
پاپولر کے لیے اور کیا چاہیئے

○

بس ایک ہفتہ میں ایسا مشاعرہ ہوگا
ہوا ہے بھائی کے بیٹا مشاعرہ ہوگا
نہ ساز و رقص کی محفل نہ بزم قوالی
ہماری شادی میں تنہا مشاعرہ ہوگا
تمھیں بتاؤ کہ بے باز شاعروں کے بغیر
اگر ہوا بھی تو کیسا مشاعرہ ہوگا
انھیں ہزار صدائیں مشاعرے کے خلاف
ہمارا دعویٰ ہے ہوگا مشاعرہ ہوگا
بلا سے بھی جو کہیں ہوگا مشاعرہ ہوگا
کسی کا ہوگا کہیں کا ہوا تو جاؤں گا
جو بدنصیبی سے کل کو مشاعرہ ہوگا
شمیم کا نہ ملازمت نہ دی
کسی کا اپنے سہارا مشاعرہ ہوگا
کسی کا جشن ولادت کسی کا یوم وفات
یوں ہی ہمیشہ ہمارا مشاعرہ ہوگا
ہمارے شہر میں پاپولر بہت شاعر
سب آئیں تو کئی دن کا مشاعرہ ہوگا

○

یوں ہوا پر سوار ہے بھیّا
آج کل تھانے دار ہے بھیّا
اب بھی بے تاج بادشاہ ہیں ہم
بول کتنا اُدھار ہے بھیّا
اُس نے وعدہ کیا تھا آنے کا
آج تک انتظار ہے بھیّا
جس کو جتنے پڑیں یہاں جوتے
اُس کا اُتنا وقار ہے بھیّا
کیا گزرتی ہے کیا گزرنی ہے
چہرے سے آشکار ہے بھیّا
کیسے واعظ نظر ملائے گا
وہ میرا قرض دار ہے بھیّا
اُس کو نیتا کا آئینہ کہہ لو
کیا کہوں کس سے پیار ہے بھیّا
آج کل تو ہر ایک نیتا پر
بس الیکشن سوار ہے بھیّا
تیس دن بعد جا کے اُترے گا
انتخابی بخار ہے بھیّا
شہر میں کتنی قدر ہے میری
ہر طرف گھیر گھار ہے بھیّا
بعد چھٹنے کے کیوں ہے فریادی
مار پیچھے پکار ہے بھیّا

سر تپٹ حیدرآبادی

حسن اُن کا ہے، نئے ڈھونگ رچانے والا

حسن اُن کا ہے، نئے ڈھونگ رچانے والا
جس پہ دل میرا ہے، ہر ڈھونگ مچانے والا

کم نظر آتا ہے مجھ سا نظر آنے والا
غم و اندوہ میں بھی ہنسنے ہنسانے والا

ایک اک کر کے ہوئے ختم سب اُن کے پیچھے
رہ گیا میں ہی فقط، ناز اٹھانے والا

پہلے کچھ دیر ٹھہر جائے مقابل اپنے
بالمقابل میرے جو کوئی ہو آنے والا

میں ہوں بے مثل، ملے گا نہ کہیں میرا جواب
اپنے کرتوتوں سے گت اپنی بنانے والا

میری نظروں میں فقط ایک ہے میرا محبوب
آنکھوں سے جانے، دل میں اُتر آنے والا

میرے نزدیک وہ خود آج کھسک آیا ہے
اپنے نزدیک کبھی مجھ کو نہ بٹھانے والا

میں کبھی ناز اٹھاتا نہیں اپنے دل کے
خود میرا دل ہے میرے ناز اٹھانے والا

عمر بھر ٹھوکروں نے میری سنبھالا ہے مجھے
میں ہوں مشہور مگر ٹھوکریں کھانے والا

شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے سرتپٹ کا جواب
ہر جگہ، خواہ مخواہ، ٹانگ اڑانے والا

مختار یوسفی

مرغ و ماہی اور گلگلے

گھر جنوائی کی لعنت اٹھاتے رہو
مار کھاتے رہو، مسکراتے رہو

آج اُس نے یہ نسخہ بتایا مجھے
میرے فادر کو مکھن لگاتے رہو

مرغ و ماہی ہو یا ہوں فقط گلگلے
مفت میں گر ملیں تو اڑاتے رہو

سر منڈاتے ہی اولے پڑیں بھی تو کیا
اُس گلی میں سدا آتے جاتے رہو

کھا کے تہذیبِ نو کی قسم دوستو
مُنہ پہ جی بھر کے کالک لگاتے رہو

اُنگلیاں گھی میں ہوں گی کڑاہی میں سر
شرط ہے قوم کو تم لڑاتے رہو

تم کو مختار اِس شاعری کی قسم
روز ہی تم نئے گل کھلاتے رہو

بانو سرتاج

نسخہ بلڈ پریشر کا

ابھی صبح کاذب بھی نمودار نہ ہوئی تھی کہ بیگم نے ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ ہم نے عادت کے مطابق سامنے دیوار پر نگاہ کی۔ موٹے موٹے حروف میں کیلنڈر کی پشت پر لکھا ہوا "اتوار" دیکھ کر ہم نے کروٹ لیتے ہوئے کہا "بھئی بیگم! آج اتوار ہے۔ سونے دیجیے ہمیں۔"

روز سویرے ہم پانچ بجے اُٹھتے ہیں نماز پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ سامنے نلکے پر سے پانی بھرنے کے لیے۔ اتوار کو بچوں نے البتہ اس ذمہ داری سے ہمیں بری الذمہ کر رکھا تھا۔ مگر اب اس عادت کو کیا کیجیے کہ اکثر اتوار کو بھی ہم الارم کی آواز سن کر اُٹھتے اور بالٹیاں اٹھا کر باہر دوڑ جاتے۔ تمام برتن پانی سے بھر چکتے تب بچے ہنس کر اطلاع دیتے کہ آج اتوار ہے۔ اس لیے ہم نے ایک ترکیب سوچی۔ ایک کیلنڈر کی پشت پر خوب موٹے موٹے حروف میں اتوار لکھ کر رکھ دیا۔ سنیچر کی رات کو بستر پر سوتے ہوئے کیلنڈر پلٹ دیئے۔ پھر صبح سویرے کیلنڈر پر نظر پہلے ڈالتے پلنگ سے بعد میں اترتے۔ بیگم آج تک ہمارے اس پروگرام میں حارج نہیں ہوئی تھیں۔

"اتوار تو ہے۔ ۔ ۔ مگر ایک دوسری بات بھی ہے۔" بیگم نے پھر ہمیں جھنجھوڑا۔

"آپ سنائیں۔ ہم سن رہے ہیں۔" بیگم کی تسلی کے لیے ہم نے آنکھیں کھولیں اور دوبارہ بند کر لیں۔ ہمیں بیگم پر غصہ تو بہت آ رہا تھا کہ یہ دوسری بات ذرا دو گھنٹے بعد نہیں کہی جا سکتی تھی۔ مگر ہم ٹھہرے بے چارے شوہر۔ بیگم کی کسی بات کو غیر اہم یا نسبتاً کم اہم ٹھہرا دیں تو خیر کہاں؟ اتوار کے دن تو کیا ہر دن شوہر بھی ایسی فاش غلطی نہیں کرتا۔ تمام دن جو غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔

"مجھے اسپتال جانا ہے طبی معائنے کے لیے۔"

"خیریت تو ہے بیگم؟ آپ کے دشمنوں کی طبیعت تو ناساز نہیں؟ کل تک تو اچھی بھلی تھیں آپ؟" ہماری آنکھیں اوپری طرح کھل گئیں۔ بلڈ پریشر کر کے دماغ کھانے والی بیوی کا بیمار ہونا ہے بہر حال بہتر ہوتا ہے۔

"ابھی تو کچھ ہوا نہیں۔ لیکن شاید ہو جائے۔" بیگم نہایت بشاشت سے بولیں۔

"کیا؟؟؟" ہم دھڑاک سے اٹھ بیٹھے۔ چلا کر کہا "بیگم! ماشاء اللہ ہمارے تین بچے پہلے سے موجود ہیں۔"

"اُف وہ! آپ کہاں چھلانگ لگا بیٹھے؟ بیگم کچھ شرمائیں کچھ جھنجلائیں۔" میرا کہنے کا مطلب ہے کہ طبّی معائنہ کرانا ہے مجھے: خواتین کے تمام ماہناموں میں لکھا ہوتا ہے کہ خواتین عمر کے چالیسویں سال کے گزرتے ہی ہوشیار ہوجائیں۔ اسی عمر کے بعد ان پر امراض کے حملے ہوتے ہیں۔ اس لیے وقفے وقفے سے انھیں ڈاکٹری معائنہ کراتے رہنا چاہیئے۔"

لاحول ولا قوۃ! ہمیں بے طرح غصہ آگیا۔ کیا یہ اطلاع ہمارے سو کر اُٹھنے کے بعد نہیں دی جاسکتی تھی ... مگر آواز کی نرمی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "بیگم! ابھی کل ہی تو ہم نے آپ کی چالیسویں سالگرہ منائی ہے ... اور ..."

"اسی لیے تو ... اسی لیے تو ..." بیگم نے ہماری بات درمیان میں اچک لی ... "طبّی معائنہ ضروری ہوگیا کہ نہیں؟" "لیکن بیگم!" ہم نے آنکھیں بند کرکے سونے کی نیت باندھتے ہوئے کہا "آپ نے کل ہی عمر کے چالیس برس تمام کئے اس کی خبر امراض کو اس قدر جلد کیسے ہوجائے گی؟ کیا آپ نے انھیں دعوت نامے بھیجے تھے؟ یعنی ہمارا مطلب ہے کہ کیا کل خواتین کے جملہ امراض آپ کی پارٹی میں موجود تھے؟ اور خدانخواستہ انھوں نے واپس جانے کا ارادہ ملتوی کرکے آپ سے ہم نشینی اختیار کرلی ہے؟"

"آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔ اُٹھیے بھی۔" ادھر بیگم کی آواز میں جھنجلاہٹ کا عنصر بڑھا ادھر ہمیں اپنی کچھ خطرے میں نظر آنے لگی۔ فوراً پینترا بدلتے ہوئے ہم نے کہا "ہماری کیا مجال کہ ہم مذاق کریں۔ خواتین کے ماہناموں میں لکھا ہوگا تو ٹھیک ہی لکھا ہوگا۔ کسی کے لکھے کو (اور وہ بھی خواتین کے لکھے کو) جھٹلانا (جب کہ ان کے کہے کو بھی نہیں جھٹلاسکتے) کم سے کم ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہم دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ چالیسواں پار کرنے کا مطلب اکتالیسویں سال کا پہلا دن ہی تھوڑا سے ہوتا ہے ... یعنی کہ ... ہمارا مطلب ہے ..."

"مطلب ... دراصل ... یعنی کہ ... کیا لگا رکھا ہے آپ نے؟" بیگم گرم ہوگئیں پھر اچانک پٹری بدلی "میں سمجھ گئی، آپ کو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں مرجاؤں تو دوسری کرلائیں۔" بیگم کی آنکھوں میں دو آنسو ان کی مدد کو آن پہنچے۔

"لاحول ولا قوۃ!" ہم رضائی پھینک کر اُٹھ بیٹھے۔ دل تو چاہا کہہ دیں کہ دوسری لانی ہوگی تو ابھی لاسکتے ہیں۔ آپ کے مرنے کے انتظار میں بوڑھے کیوں ہوں؟ مگر ہم کچھ کہتے اس سے پہلے ہی بیگم بولیں ... "میں کوئی شیطان ہوں جو لاحول پڑھ رہے ہیں ... یقیناً کوئی ہے جس سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔" الفاظ کیا تھے؟ آنسوؤں کی تازہ کمک کو بلاوا تھا۔ موسلا دھار آنسو بہانے لگیں بیگم۔

ہم نے پلنگ سے نیچے اُتر جانے ہی میں خیریت سمجھی۔ خوشامدانہ انداز میں کہا "اس عمر میں اب کون ہمیں لڑکی دے دے گا۔ کبھی تو وہ آپ جیسی حسین و جمیل کہاں ہوگی؟"

"یعنی ارادہ ہے شادی کا۔" بیگم نے بات پکڑلی۔

ہم نے لاچار ہوکر ہتھیار ڈال دیئے۔ "بیگم بھئی آپ جیتیں، ہم ہارے۔ لیجئے ہم اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ آپ بھی اُٹھ جائیے۔ کھانا بنا کر رکھ دیجئے۔ بچوں کو بھوک لگے گی تو کھا لیں گے۔ پتہ نہیں ہمیں کتنی دیر لگے۔"

ہم جاگ چکے تھے اس لیے پانچ بجے ہم نے صبح کی چائے پینے باورچی خانے میں پہنچے تو بیگم ناشتہ تیار کرکے ہمارا کھانا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ ہم نے بچوں کو بیدار کیا۔ وہ [illegible] ہوگئے۔ ہم سب ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے ساڑھے سات ہی بج پائے تھے مگر بیگم باورچی خانے کا تمام کام نمٹا چکی تھیں۔ ہم نے کہا "سمجھئے ہر ساں سے آدھا

گھنٹہ بعد بھی نکلیں تو کوئی اسپتال کھلا نہ ملے گا۔ آپ تیار ہو جیے تب تک ہم بیانی صاحب سے کسی اچھے ڈاکٹر کا پتہ پوچھ آتے ہیں"

"کیا مطلب؟" بیگم نے آنکھیں نکالیں۔ "ہم سرکاری اسپتال جائیں گے۔ ہم کوئی دھنا سیٹھ تو نہیں ہیں کہ پرائیوٹ اسپتال میں جائیں۔ لوٹتے ہیں یہ ڈاکٹر مریضوں کو۔ پہلی مرتبہ جاؤ تو بیس روپے۔ دوسری تیسری مرتبہ دس روپے ضرور۔ ہو نہ ہو تو زبردستی خرچ کرائیں گے۔ دس چکر کرائیں گے۔ ایک سے ایک قیمتی دوا تجویز کریں گے ..."

"محترمہ بیگم صاحبہ۔ کہہ چکی ہوں آپ! تو بندہ کو کچھ کہنے کی اجازت ہے؟" ہم نے دانت پر دانت جما کر کہا۔ جی تو ہمارا بوٹیاں (خود کی) نوچنے کو چاہ رہا تھا۔

"آپ کو میرا بولنا کبھی گوارا نہیں۔ اول تو میں بہت کم بولتی ہوں۔ دوسرے آپ سے نہ بولوں تو کس سے بولوں؟" بیگم نے بُرا مان کر کہا۔ "خیر بولیے کیا بولنا چاہتے ہیں؟"

"جان کی امان ملنی چاہیے۔" ہم نے مجسم عجز بنتے ہوئے کہا۔

"آپ کبھی سنجیدگی سے بھی بات کریں گے؟ کہہ بھی چکیے کیا کہنا ہے؟"

"بس یہی کہ ... آج اتوار ہے اور اتوار کو سرکاری اسپتال بند رہتے ہیں۔"

بیگم انتہائے حیرت سے مجسمہ کی طرح کھڑی رہ گئیں۔

ہم نے دبے الفاظ میں کہا "خواہ مخواہ ہیں پانچ بجے سے اٹھا کر بٹھا دیا ... خیر چلیے اب کسی پرائیوٹ ڈاکٹر کے پاس ہی چلتے ہیں۔"

"نہیں۔" بیگم اپنے گوشت پوست کے فارم میں واپس آ کر بولیں۔ "بہت روپیہ خرچ ہو جائے گا۔"

ہم نے ڈائیلاگ مارا۔ "روپیہ کیا آپ کی جان سے بڑھ کر ہے؟"

بولیں "نہیں اب کل ہی جائیں گے سرکاری اسپتال میں۔"

ہم نے کہا "کل ہمیں رخصت لینی پڑے گی۔"

"لے لینا۔" شانِ بے نیازی سے فرمایا گیا۔

ہم نے یاد دلایا۔ "اکتالیسویں سال کا دوسرا دن شروع ہو جائے گا۔"

کہا۔ "ہو جانے دیجئے۔ مجبوری ہے۔"

اتوار کی نیند پوری نا تمام پڑھ کر ہم خاموش ہو رہے۔ دوسرے دن دوبارہ تمام مرحلوں سے گزرے اور سویرے آٹھ بجے سے اسپتال جا کر بیٹھ گئے۔ کارڈ بنوایا۔ ڈاکٹر سے ملے قاعدہ سے اور خون جانچ کے لیے دیا۔ ای۔ سی۔ جی کروائی۔ گردوں کا ایکسرے کروایا۔ بلڈ پریشر کی جانچ کرائی اور لوٹ کے گھر آ گئے۔ تین دنوں تک گھر میں مکمل سکون تھا۔ چوتھے روز رپورٹس لیں۔ ڈاکٹر کو دکھائیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "کچھ نہیں سب نارمل ہے۔"

گھر لوٹتے وقت بیگم کے چہرے پر ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی جیسے وہ مکمل صحت مند نہیں بلکہ خدانخواستہ کسی موذی مرض کی شکار پائی گئی ہوں۔ گھر پہنچتے ہی پھٹ پڑیں۔ "کیا نامعقول اسپتال تھا۔ سب کچھ نارمل کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا دل زور زور سے دھڑکتا ہے۔ سیڑھیاں چڑھتے میں ہانپ جاتی ہوں۔ ایک بالٹی اٹھا کر تھک جاتی ہوں۔"

"محترمہ بیگم، دل کا کام ہی دھڑکنا ہے اب زور سے دھڑکے یا آہستہ سے۔ آپ ویسے بھی ہمالہ تیرتی سے

کرتی ہیں۔ آپ کا بیٹا آپ کے نقشِ قدم پہ چل رہا ہوگا۔ سیڑھیاں چڑھنے میں بھی ہانپتی ہیں۔ ماشاءاللہ آپ کافی صحت مند ہیں بالٹی اُٹھانے میں تھکنا بھی فطری ہی ہے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بلڈ پریشر نہ ہو" وہ ان سُنی کر کے بولیں۔

ہم نے کہا "کیا آپ چاہتی ہیں کہ وہ آپ کو بلڈ پریشر کی مریضہ بنا دیتا؟"

وہ سوال کو یکسر نظر انداز کر کے بولیں "مجھے ہر وقت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ آنکھوں میں جب تب اندھیرا چھا جاتا ہے اور وہ کہتا ہے شُگر کی بیماری نہیں۔ گردن ہمیشہ درد کرتی ہے مگر ایکسرے میں نکلا کچھ نہیں۔"

ہم نے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "چلیے۔ اسپتال کا کارڈ دیجئے۔ ہم ڈاکٹر سے جا کر کہتے ہیں کہ ہماری بیگم کو ذیابیطس، بلڈ پریشر وغیرہ بیماریاں بہت پسند ہیں۔ یہ بیماریاں انہیں الاٹ کر دیجئے۔ ان کے علاوہ ایک دو اور موٹی موٹی بیماریوں کا اضافہ ان کے نام کے آگے ڈگریوں کی طرح کر دیجئے۔ اسپتال میں بورڈ لگا دینے کی درخواست بھی اس سے کریں گے۔ اخبارات میں ہم شائع کرا دیں گے۔۔"

"پھر وہی مذاق!" بیگم نے تیوریاں چڑھائیں "خواتین کے رسائل میں ذیابیطس یا بلڈ پریشر وغیرہ کی جو علامات بتائی گئی ہیں وہ سب مجھے اکثر ہی سے محسوس ہو رہی ہیں۔"

"اکتالیسویں سال کی پہلی رات سے"؟ ہم نے لقمہ دیا۔

"ہاں" کہہ کر بیگم نے ایک تیر سے دو نشانے سادھے۔ [illegible] اسپتال والوں کو۔ "یہ سرکاری اسپتال والے کام چور ہوتے ہیں۔ ان کی کارکردگی قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔ مزید ان لوگوں نے تو ادورسے اور خون کی جانچ ٹھیک سے نہ کی ہوگی۔ ایکسرے کی پلیٹ بھی برابر نہ لگائی ہوگی۔ ای۔سی۔جی کے آلات صحیح مقامات پہ نہ لگائے ہوں گے۔"

"بلڈ پریشر کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟" ہم نے عاجزی سے کہا۔ "وہ تو ڈاکٹر نے لیا تھا۔"

"سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر بھی ناکارہ ہوتے ہیں۔" بیگم نے کچھ اس اعتماد کے ساتھ اعلان کیا کہ ہمارا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ ہم چاہ کر بھی انہیں اطلاع نہ دے سکے کہ جس ڈاکٹر کی شان میں انہوں نے یہ الفاظ ادا کئے ہیں اس کے پاس ہندوستان کی دو ڈگریوں کے علاوہ امریکہ کی بھی دو ڈگریاں ہیں۔

"چلئے۔ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے چلئے۔ تمام ٹیسٹ دوبارہ کراؤں گی۔" بیگم نے خواہش ظاہر کی۔

"روپیہ بہت خرچ ہوگا بیگم۔"

"روپیہ میری جان سے بڑھ کر نہیں ہے۔" وہ آنکھیں نکال کر غرائیں "کیوں؟ ہے کیا؟"

"جی نہیں، ہرگز نہیں لیکن ہمارا کہنا تھا ابھی تو اکتالیسویں سال کی شروعات ہوئی ہے کیوں نہ کچھ دن ٹھہر جائیں؟"

"یعنی تب تک۔ جب تک واقعی مجھے دو چار بیماریاں نہ ہو جائیں؟" بیگم نے تنتنے اچھالے۔

"کمال ہے آپ کی بھی۔ کوئی بیماری نہیں ہے اس پر بھی اطمینان نہیں۔ بیماری ہو جائے گی اس خیال سے الگ پریشاں۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟"

"فی الحال تو کسی اچھے ڈاکٹر سے معائنہ کرانا۔" بیگم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ سب تسلیم خم ہے۔ ہم مزاجاً بار بھی آ گئے۔ ہم ابھی رحمانی صاحب سے پوچھ آتے ہیں۔ ان کی بیگم ہمیشہ بیمار رہتی ہیں۔ وہ ضرور شہر کے اچھے ڈاکٹروں سے واقف ہوں گے۔"

ہم نے ربانی صاحب کے گھر پہنچ کر اُن سے اپنی مشکل بیان کی تو ہمیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا کہہ کر وہ درمیانی دروازے سے اندر جھانک آئے۔ پھر ہمارے نزدیک آکر سرگوشی میں بولے "کیا بہت بور کرتی ہیں؟"

ہم نے بدک کر کہا "کیا مطلب؟"

بولے "بُرا نہ مانئے یار، مجھ پر جو بیتی آپ کو سُنائے دیتے ہیں۔ آپ جو چاہیں نتیجہ اخذ کریں اور پھر فیصلہ کریں۔ میری بیگم کو بھی باتیں کرنے کا بے حد شوق تھا۔ دماغ چاٹ جاتی تھیں میرا۔ پانچ مرد مل کر پانچ دن میں جتنا بولتے ہوں گے ہماری بیگم ایک دن میں بول جاتی تھیں۔ جہاں ایک لفظ سے کام نکلتا ہو وہ پانچ الفاظ بولتی تھیں۔ جہاں پانچ جملوں میں کام چلتا ہو وہاں وہ پندرہ جملوں کی تقریر کرنا پسند کرتی تھیں۔ ایک بار بولنا شروع کرتیں تو کوئی بھی ان کی زد میں آنے سے نہیں بچ سکتا تھا۔ میں میرے بچے، اڑوسی پڑوسی، ملازمین، چرند پرند، زمین آسمان ... اللہ کے بنانے والے۔ غرض کہ کسی کو نہیں بخشتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آسمان سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ سونے پر سہاگہ دن رات کا یہ رونا کہ آج یہ دُکھ رہا ہے .. کل وہ دُکھ رہا ہے .. میں پریشان ہو گیا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے کہا آپ کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ آپ جتنا بولیں گی اور جتنی زور سے بولیں گی اتنی ہی سانسیں آپ کی کم ہوں گی آپ غصہ کرنا یکسر موقوف کر دیں۔ پُرسکون رہنے کی کوشش کریں۔" وغیرہ وغیرہ خوب ہوّا کھڑا کر دیا۔ بس وہ بالکل ہی بدل گئیں۔ اب گھر میں ادھر انھوں نے آواز بلند کی یا تان اسٹاپ کچھ شروع کیا، میں گھگھیا کر کہتا ہوں "بیگم! خدا کے لیے آہستہ ... نصیب دشمناں کہیں دل حرکت کرنا موقوف نہ کر دے۔" اُن کا غصہ اُن کا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

"مگر ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا کیا وہ سب حقیقت پر مبنی تھا؟" ہم نے دریافت کیا تو ربانی صاحب ہنس کر بولے ... "بس اتنا ہی کہ بلڈ پریشر واقعی تھوڑا سا زیادہ تھا۔ باقی پٹی میں نے اُسے پڑھائی تھی۔ وہ ڈاکٹر میرے پُرانے دوست ہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں فون کر دیتا ہوں کہ اپنے جگری دوست کو وہ اُن کی بیگم بھیج رہا ہوں وہی نسخہ تجویز کر دیجئے جو میری بیگم کے لیے کیا تھا۔ .."

"مگر ربانی صاحب! کہیں بیگم جان کو سچ مچ روگ نہ لگ جائیں" ہم نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اوّل تو ایسا ہوگا نہیں اور اگر آپ کی بیگم کو وہم ہو بھی گیا تو دس لے بلڈ پریشر۔ آخر جس نے بلڈ پریشر کہنے والا ڈاکٹر اپنا نظریہ تبدیل کر دے گا۔ یک بار اور معائنہ کر کے اُن کے پوری طرح صحت یاب ہونے کا اعلان کر دے گا۔ جب نہ ہونے پر بلڈ پریشر بتایا جا سکتا ہے تو اسی طرح اُس سے نجات بھی دلائی جا سکتی ہے۔"

ہم ربانی صاحب کے گھر سے چلے تو ہمارا جیب میں اُن کے دوست ڈاکٹر کا پتہ تھا اور ربانی صاحب اپنے دوست کو نسخہ دہرانے کے لیے فون کر رہے تھے۔

غزلیں

اسمٰعیل ظریف

تکمیل ہوئی جب اپنی غزل ہم گھر ہی میں آکو لیے ہیں
سنو داد پہ بھاری داد ہے وہ جو جانِ غزل سے پائے ہیں

پوشیدہ حقائق ہیں ان میں اشعار جو ہم فرماتے ہیں
کچھ باتیں تلخ سہی لیکن حالات کو ہم نظماتے ہیں

بازارِ ادب میں ویسے تو سرقہ بھی جائز ہے لیکن
مفہوم کا سرقہ ہو نہ سکا مصرعے اکثر ٹکراتے ہیں

گھر سے نکلے جلدی جلدی بس وقت پہ ہم کو مل نہ سکی
اس محفل میں شرکت کے لیے پیدل ہی ہانپتے آتے ہیں

مسند بھی ملی گل پوشی ہوئی یہ بات مگر وہ بھول گئے
پیسے دینے کا وعدہ تھا ہم پھول جنھیں پہناتے ہیں

صورت سے عیاں ہے حال ان کا بیٹھے ہیں یہاں جو افسردہ
کمپیوٹر یہ بتلاتا ہے بیوی سے لڑ کر آئے ہیں

تھی جیب ذرا اپنی ہلکی، شاپنگ کچھ ان کی ہو نہ سکی
بازار میں وہ خاموش رہے گھر آ کر دھوم مچاتے ہیں

ممکن ہے ایسے کچھ شوہر سنو میں اِک دو آجائیں نظر
جو قرضِ حسنہ بیوی سے حاصل کر کے لوٹاتے ہیں

سب چھوٹے بڑے اِک جا ہو کر گھر ہی میں دیکھتے ہیں پکچر
اِس ٹی۔ وی کی لعنت کو ہم خود گھر لا کے پچھتاتے ہیں

فہرستِ جہیز میں ٹی۔ وی ہے باہر کا بھی ہے لیکن
حجت کرکے بابا کے لیے موٹر سائیکل لکھواتے ہیں

ہے جان اگر پیاری تم کو [illegible] پر آپ نہ کرو
کچھ نکلے ہوئے میرے جیسے میدانِ ادب میں آئے ہیں

رہتی ہے نظر جس کی فن پر گھلتے ہیں نہیں جھلاتے اکثر
لگتا ہے ظریفؔ اس مصرعے میں تم نے بھی ٹھوکر کھائے ہیں

اقبال ہاشمی

وہ تو شیر ہی کب تھا رہتا جو جیالوں میں
وہ غزال جیسا تھا مل گیا غزالوں میں

بحرِ منجمد جیسا آپ کا سراپا ہے
خطِ استوا کیسے کھنچ گیا خیالوں میں

آئینے پہ وہ برہم آج اس قدر کیوں ہیں
جانے کیا نظر آیا اُن کو اپنے بالوں میں

آپ کا قصیدہ میں اس قدر ہی کہہ پایا
جس قدر نمک پایا آپ کے نوالوں میں

پڑھ کے فارسی میں نے جتنا تیل بیچا تھا
وہ گنوا کے آیا ہوں میں خلیج والوں میں

ہاتھ کی صفائی نے دولتیں دکھائی ہیں
کھیلتا ہے وہ ہر دم چابیوں میں تالوں میں

آپ خود کو دانشور لاکھ بار کہہ لیجے
آپ گھل چکے اپنے بے تکے سوالوں میں

جن کی کوئی کل سیدھی آج تک نہیں دیکھی
وہ شمار کرتے ہیں خود کو باکمالوں میں

ہاشمی پیرا دیوں ثانوی ہے اب گھر میں
بیوی اپنے گھر میں ہیں اپنے نونہالوں میں

★

- پاگل عادل آبادی

لے کے بی۔ اے کی ڈگری کہاں کیا میاں تم تو نالج میں پورے صفاچٹ لے
خالی ڈبّے و ڈھکن سے کیا فائدہ مغز بھی چاہیئے کھوپڑی کے لئے
اب یہ بکتے ہوئے شرم آتی تو ہے اُن کے باوا کے ہاتھوں تقرر ہوا
ڈیڑھ کنسٹل کی تلنگ سی گمنام سے عشق کرنا پڑا نوکری کے لئے
سوگ یکھ وقت تو اُس کا منا تے حضرت یہ تقاضہ بھی تھا اور دستور بھی
پہلی جورو کا دسواں ابھی دور ہے شیخ جی چل پڑے دوسری کے لئے
کوئی اس کو شریفوں میں کیسے گنے بات کیا ذات کیا اس کی اوقات کیا
دولہا صاحب سے ناراض ہوکر اُٹھا بس ایک بیکو گھڑی کیلئے
بولی لگنے لگی دولہے بکنے لگے شادی بھی ایک تجارت بنی آج کل
کچھ تو سوچو ذرا فاطمہؓ کے سوا کیا دیا تھا نبیؐ نے علیؓ کے لئے
پیٹ میں آنت تو ہے مگر دیکھنا اُس کے منہ میں بھی کچھ دانت ہیں یا نہیں
جس کو دیکھو کٹانے لگا ہے ٹکٹ وہ بھی کس کے لئے ووٹ ہی کے لئے

ہوسکے مایوس ہم نے تیرے عشق میں تیری سہیلی سے پڑھوالیا جب نکاح
تیرے باوا نے پاگل سے پوچھا بھی کب چھوکرا چاہیئے چھوکری کے لئے

٭٭٭

- چکر نظام آبادی

اب شریفوں میں یہ باجے نہیں اچھے لگتے
چھلّے چھنّی کے تماشے نہیں اچھے لگتے
اپنے ہی بارے میں چرچے نہیں اچھے لگتے
ایسی مہنگائی میں بچے نہیں اچھے لگتے
یوں تو شادی کی ہر اک رسم بھلی لگتی ہے
گھوڑے جوڑے کے یہ دھندے نہیں اچھے لگتے
وہ جوانی بھی نبھے جاتے تھے نخرے جن پہ تیرے
اب تو بیگم ترے نخرے نہیں اچھے لگتے
اوڑھنی اوڑھے ہوئے کتنے حسیں لگتے تھے
اب یہ بے رنگ لفافے نہیں اچھے لگتے
ہم بڑا لے یں پسند ہے ہمیں دیسی کشتی
یہ اچھل کود، کراٹے نہیں اچھے لگتے
میں ہوں شیدائی فقط مدحد کے حلوے کا جناب
مجھ کو شکر کے بتاشے نہیں اچھے لگتے
ووٹ دینا ہے بہرحال میں دیدوں گا مگر
مجھ کو لیڈر تیرے وعدے نہیں اچھے لگتے

---

* فیاض احمد فیضی

ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے

اُلّو ہمارے سماج کی بنیادی ضرورت ہے
عوام و خواص کی تندرستی اور خوشحالی کا بڑا سبب
اُلّوؤں کی موجودگی ہے۔ کسی بھی محفل میں اُلّو کی آمد حاضرین
کے لئے باعث مسرت و انبساط ہوتی ہے۔ آدمی کی خصلت ہے کہ
وہ اُلّو کی موجودگی میں خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور دانش مند کے سامنے
خون کے گھونٹ پیتا رہتا ہے۔
اُلّو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اُلّو ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اس لئے وہ کبھی بھی احساس کمتری
میں مبتلا نہیں ہوتا اور اپنی کھال میں مست رہتا ہے۔ احساس کمتری نہ ہونے کی وجہ سے اسے احساس برتری
کا لبادہ اوڑھنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ورنہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی خاطر کوئی
نہ کوئی فتنہ برپا کرتے رہتے ہیں۔ بلی کو دودھ کی جگہ دھتکار ملے تو وہ کھمبے سے جی بہلانے لگتی ہے۔
جب دو شریف آدمی آپس میں ملتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے ہیں کہ یہ تو مجھ سے بہا
چھوٹا آدمی ہے میں اسے کیوں پہلے سلام کروں لیکن جب دو اُلّو روبرو ہوتے ہیں تو ان کی یہی کوشش ہوتی ہ
کہ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہنے میں بازی لے جائیں۔ دونوں یہی سوچتے ہیں کہ سامنے والا اس سے بڑا اور بڑا
اُلّو ہے۔ جتنا انکسار اُلّوؤں میں پایا جاتا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکالنا
چاہیئے کہ جس آدمی میں حد درجہ انکسار ہوتا ہے، وہ اُلّو ہے۔ جی نہیں! ہمارے ہاں عقل مند لوگ عجز و انکسا
یہاں تک کہ ایمانداری کو بھی بطور پالیسی اختیار کرتے ہیں جب کہ اُلّوؤں کی عاجزی کے پیچھے کوئی غرض پوشیدہ
نہیں ہوتی ہے۔ دراصل اُلّو سود و زیاں کے معاملے میں سود کے مخالف اور زیاں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اُلّوؤ
کو جب نقصان ہوتا ہے تو وہ بغلیں بجاتے ہیں اور فایدے کا نام سنتے ہی رنجیدہ ہو جاتے ہیں جب کہ آد
دوسروں کو نقصان پہنچا کر فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے اور کسی کو لاٹری لگ جائے تو خود سینہ کوبی/ماتم کرتا۔
آدمی اور اُلّو میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اُلّوؤں کا قول ہے کہ اگر تم دنیا والوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے لئے

وغم کا سامان ڈھونڈ لو۔

سمجھ دار لوگ بندوق ہمیشہ اُلوؤں کے کاندھے پر رکھ کر چلاتے ہیں۔ خوش حال سماج میں اُلوؤں کی صحت پر پڑا دھیان دیا جاتا ہے اور ہر شخص کی یہی کوشش رہتی ہے کہ کم از کم اپنا اُلو سیدھا کر لے۔ جہاں کہیں اُلوؤں کی قلت ہو جاتی ہے وہاں لوگ بڑی محنت اور خلوص سے دوسروں کو اُلو بناتے ہیں۔ اُلوؤں کو ناکام لوگوں سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے۔ چنانچہ ناکام مشاعرے، سیاسی جلسے اور کلچرل پروگراموں میں ہمیشہ اُلو بولتے نظر آتے ہیں۔

ہر کامیاب انسان کے پیچھے کچھ اُلوؤں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام لیڈر اور ایکٹر اونچائی پر پہنچنے سے پہلے کئی عدد تجربہ کار اُلو پالتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے ہیں اپنے پالتو اُلوؤں کو آہستہ آہستہ آزاد کرتے جاتے ہیں اور جب انھیں اپنی منزلِ مقصود مل جاتی ہے اس وقت بمشکل ایک آدھ وفادار اُلو ان کے پاس رہ جاتا ہے۔ اُلوؤں کی بدولت نہ جانے کتنے نالائق لوگ حکمران بن گئے اور ان حکمرانوں کی بدولت نہ جانے کتنے اُلو آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اُلو صرف رات میں نکلتا ہے اور دن بھر گوشہ نشین رہتا ہے جب کہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ دن میں اُلو آسانی سے نظر نہیں آتا۔ رات میں وہ ذرا لاپرواہ ہو جاتا ہے اور اپنی حرکتوں سے صاف پہچانا لیا جاتا ہے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے کبھی بھی اُلو نہیں دیکھا، حالانکہ انھوں نے کئی اُلوؤں کو دیکھ رکھا ہے۔ آدمی آنکھیں کھلی رکھے تو اسے اُلو ہر جگہ، یہاں تک کہ پانی کے گلاس میں، پالش کئے ہوئے جوتے میں اور اسٹیل کی پلیٹ میں بھی صاف نظر آ سکتا ہے۔

اُلو ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ دنیا کے ماہر نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ عقل مند سے عقل مند آدمی کے اندر ایک اُلو چھپا ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بڑے سے بڑے اُلو میں بھی کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت آدمی ضرور موجود ہوگا۔ کچھ بیچ وچ کے عقل مند لوگ جو اپنے آپ کو ذرا زیادہ عقل مند سمجھتے ہیں، دنیا والے انھیں اُلو سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ خود بھی ساری دنیا کو اُلو سمجھتے ہیں اور اپنے جیسے عقل مند کی تلاش میں پریشان رہتے ہیں اور جس روز انھیں اپنی تلاش میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، وہ اور بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بہتر تو یہی ہے کہ آدمی تا عمر محض اُلو رہے یا اوسط درجے کا سمجھدار۔ اس سے اوپر آنے یا جانے میں سراسر خطرہ ہے۔

اُلو ہرگز منحوس پرندہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تعلیم یافتہ ماں باپ اپنے بچوں کو غصہ میں اُلو کا پٹھا جیسی مہذب گالی کیوں دیتے اور گالی بھی ہم اسی کو دیتے ہیں جسے پیار کرتے ہوں یا آئندہ پیار کرنے کی خواہش رکھتے ہوں۔ انسانوں کی طرح اُلوؤں میں بھی فلاسفر، دانشور، سیاست دان، وکیل، پروفیسر، تاجر، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، ڈاکٹر اور حکیم پائے جاتے ہیں۔ اُلو محنت کرے تو کیا نہیں بن سکتا لیکن اُلو کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُلوؤں میں نیم حکیم، نقلی ڈاکٹر، اسمگلر یا ڈاکو نہیں پائے جاتے۔ دراصل اُلوؤں کو ذہانت سے ازلی بیر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ذہانت اور بدمعاشی کا چولی دامن کا ساتھ ہوا کرتا ہے۔

عام طور پر اُلو اپنی طبعی موت مرتے ہیں انھیں مارنے کی حماقت کوئی نہیں کرتا۔ کہتے ہیں کہ اُلو کے جسم کا ہر حصہ بڑا کارآمد ہوتا ہے اور مختلف قسم کی طلسماتی دوائیں بنانے کے کام آتا ہے۔ اس قدر مفید اور فیض رساں ہونے

کے باوجود اُلّو کی موت پر کوئی اس کا مرثیہ نہیں لکھتا، اس کا سوگ کوئی نہیں مناتا۔ ہاں اگر کوئی دولت مند اُلّو مرجائے تو اس کے ورثاء اس کی میت پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہیں اور بہت شور مچاتے ہیں مگر ایسا شاذو نادر ہی ہوتا ہے کیوں کہ اُلّو عموماً دولت مند نہیں ہوا کرتے۔ آٹے میں نمک کے برابر جو اُلّو اتفاقاً امیر ہوجاتے ہیں وہ دولت آتے ہی اپنی برادری سے ناطہ توڑ لیتے ہیں اور بہت جلد حیرت انگیز طور پر اُلّو سے غیر اُلّو بن جاتے ہیں۔ دولت مند اُلّو عورتوں میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔

اُلّو کا مستقبل بڑا تابناک ہے۔ اگلی صدی میں اُلّو کا سماجی رتبہ اتنا بڑھ جائے گا کہ اس کے نام سے پہلے محترم معزز اور عالی جناب جیسے الفاظ لکھے جائیں گے۔ ادب اور شاعری میں اُلّوؤں کا بول بالا ہوگا۔ جیسے جیسے انسان مادی ترقی کی منزلیں طے کرتا جائے گا اور نت نئی مشینیں اور ہتھیار وجود میں آتے جائیں گے، اُلّوؤں کی آبادی بھی دنیا میں بڑھتی رہے گی اور ایک دن وہ بھی آئے گا جب دنیا میں ہم اور آپ نہیں ہوں گے، بس اُلّو ہی اُلّو رہے ہوں گے

-٭- -٭- -٭-

مصطفیٰ علی بیگ

کنٹی نیوس رُلا گیا پانی — CONTINUOUS
سب کو آنسو پلا گیا پانی

نل سے ٹپکا نہ ڈراپ واٹر کا — DROP
ساری بستی بہا گیا پانی

لیڈروں کا یہ بن گیا ٹاپک — TOPIC
اب سیاست پہ چھا گیا پانی

پانی پھرتے ہیں ڈیلی اُن کے گھر — DAILY
دال اپنی گلا گیا پانی

ہو کے سیلاب بھوکی بستی کو
صرف پانی پلا گیا پانی

میرے پیاسے امام کے صدقے
اہمیت کتنی پا گیا پانی

گھر مرا جل کے راکھ راکھ ہوا
راکھ کو پھر بہا گیا پانی

خون پی پی کے پیاسی پبلک کا — PUBLIC
مُنہ پہ لیڈر کے آگیا پانی

بھاری بھرکم وجود کا اُن کے
ریزہ ریزہ بہا گیا پانی

وَنس اِن اے ویک نیوز سُنتے ہیں — ONCE IN A WEEK
آج پھر نل میں آگیا پانی

عاشقوں کا ہجوم ہے نل پر
دِل کی دُنیا بسا گیا پانی

قطعہ

DEMANDS

مجھ کو ڈوری میں فریج اور ڈنر سٹ دیدو — DOWRY
ساتھ بنگلے کے سوا لاکھ روپے نٹ دیدو
آپ دلوائیں گے بے شک نئی اسکوٹر بھی
وُڈبی پتّا مجھے اڈوانس میں ہلمٹ دیدو — WOULD BE

قریب کھسکتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولیں " میں اور بھابی ان کی بھابی کے چچیرے بھائی کے سالے کی لڑکی کی شادی میں گئے تھے۔ آپ کو یاد ہے نا۔" ہم نے ناگواری سے جواب دیا "ہاں اکثر بیگانوں کی شادی میں آپ لوگ فیشن کی روش دیکھنے جاتی ہیں۔ کس نے کیسی ساڑی پہنی ہے۔ کس کا زیور کیسا ہے۔ کس نے کیسا میک اپ کیا ہے۔ پچھلی تقریب کے بعد سے کس نے کتنے نئے زیور اور کپڑے خریدے ہیں۔ گھر آکر شوہر سے مطالبہ کہ مجھے ایسی ساڑی ویسا زیور چاہیئے۔ آپ لوگوں کو ہر تقریب کے لئے نئے کپڑے اور زیور چاہیئے۔" ہمارا تیر صحیح نشانے پر لگا۔ بیوی ناراض ہوکر کہنے لگیں "ہاں ہمیں نے بیچارے شوہر کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہمارا منہ صرف فرمائشوں کے لئے کھلتا ہے۔ کبھی ہوٹلنگ نہیں کرتے، دوستوں کے ساتھ فلمیں نہیں دیکھتے۔ بے مقصد ادھر ادھر نہیں گھومتے۔ گاہے ماہے کپڑے اور زیور کی فرمائش کرتے ہیں سو وہ بھی ناگوار گذرتی ہے۔ اسی لئے آپ اس کے آتے ہی ہمیں چھوڑ چھاڑ کر غائب ہوجاتے ہیں"۔ ہمیں اعتراف کرنا پڑا "ہم کب کہتے ہیں کہ بیویاں بے جا فرمائشیں کرتی ہیں۔ آپ کی فرمائشیں حق بجانب ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر فرمائشیں ہم شوہروں کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔ شوہر بے چارہ کیا کرے۔ دن تمام کولھو کے بیل کی طرح کام کرکے شام گھر آیا نہیں کہ بیوی کے مطالبات پیش ہوئے۔ خوش کرنے کیلئے دو ایک پیار بھری باتیں کیں، چائے پلائی، پھر اپنا عرض مدعا۔ عید کے نئے ساڑی چاہیئے۔ آپا کے لڑکے کی شادی میں پہننے کے لئے جڑاوی لچھا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برخلاف وہ آتی ہے تو راحت ملتی ہے۔ پچھلے ہفتہ کی بات ہے ہم گرمی سے پریشان، پسینہ میں شرابور اور ہونٹ منہ خشک تھے وہ آئی اور ہمیں کشمیر کی وادیوں کی سیر کو لے گئی۔ برف سے ڈھکے پہاڑ، نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادل کے ٹکڑے تھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہم گرم کوٹ پہنے، ایک ہاتھ میں بلیک کافی کا مگ اور دوسرے ہاتھ میں روسٹیڈ تمباکو کا سگریٹ اور سر پر کن ٹوپ۔ دوسری طرف دوست احباب اسکیٹنگ کے لئے تیار . . . . . " بیوی نے ہمیں کشمیر کی وادیوں کا پورا لطف اٹھانے بھی نہ دیا۔ ٹوک کر پوچھا۔ "میں کہاں تھی" ہم نے کچھ دیر رک کر کہا "اجی آپ اپنے گھر میں تھیں۔ پڑوس کی عورتیں جمع تھیں۔ کپڑے سیتے، بٹن ٹانکتے اور ترکاری چنتے ہوئے ایک دوسرے کی شکایتوں میں مگن تھیں"۔ بیوی کو یوں ہمارا اکیلا تفریح کرنا پسند نہ آیا۔ روٹھتے ہوئے کہا۔ "اسی لئے مجھے وہ سوت لگتی ہے۔ جی جلانے روز آتی ہے کبھی کلب اور نائٹ کلب کیلئے بھی گئے ہوں گے"۔ ہم نے توبہ کرتے ہوئے اپنے کان پکڑ کر کہا۔ "نہیں بیگم وہ ہمیں ایسی جگہوں پر مطلق نہیں لے جاتی"۔ ہم نے سفید جھوٹ بولا حالانکہ اکثر وہ ہمیں کمسن اور خوبصورت حسیناؤں کے پاس لے جاتی ہے۔ ان حسیناؤں سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ ہم ان کا تقابل اپنی بیوی سے کرتے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے دفتر سے ہم بہ مثل پروانہ سیدھے شمع کے گھر پہنچے۔ سن سولہ کے قریب، کھلتا ہوا رنگ، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہمارا انتظار، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ جو ہم پر مسکرانے کیلئے بے چین تھے۔ شمع ہمارے استقبال کیلئے دروازے میں موجود تھی۔ جوش ملیح آبادی کے "ادائے سلام" قطعہ کی تفسیر بن اس نے ہمیں سلام کیا ؎

آنکھوں میں قصہ ہائے نوازش نچوڑ کر
سینے پہ دست شگفتہ کو نرمی سے جوڑ کر
ہونٹوں پہ نیم موج تبسم کو توڑ کر
میری طرف خفیف سا گردن کو موڑ کر

کل صبح راستے میں سہانی حیا کے ساتھ
اس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

ہاتھ سے اٹیچی لی اور ہمیں باتھ روم میں دھکیلا ۔ نہا دھو کر گلفام بنے باہر آئے ۔ شمع چائے کی میز پر ہمارا انتظار کر رہی تھی ۔ مخروطی انگلیوں سے چائے بنا کر پیش کی ۔ ہم نے چائے پی اور شمع کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر چہل قدمی کے لئے چل دیئے ۔ شمع کے برخلاف ہماری بیوی کا رویہ ملاحظہ فرمائیے ۔ ہر دن ہی تھکے ماندے دفتر سے لوٹتے ہیں ۔ ہر دن تھک اس لئے جاتے ہیں کہ ہمیں گھر سے لنچ میں ٹفن نہیں ملتا ۔ کینٹین کے سوکھے توس اور کڑوی کافی سے ہمارا لنچ ہوتا ہے ۔ گھر لوٹنے پر دروازہ کھلا ہوا ملتا ہے ۔ متوسط طبقہ کے گھرانوں میں چرانے کے لئے سوائے عزت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی ۔ قدموں کی آہٹ سن کر کہیں سے بیوی کی آواز آتی ہے " آ گئے " جیسے اُسے ہمارے آنے کی اُمید نہ تھی ۔ کچھ ہی لمحوں بعد بیوی برآمد ہو کر اپنے گود کے بچے کو ہماری گود میں منتقل کر کے " سنبھالئے اپنی اولاد کو " طنز کا تیر چلا کر یہ جا وہ جا ۔ مزید چند بچے آ کر ہمیں نرغے میں لے لیتے ہیں ۔ کوئی میووں کا طالب ہے تو کوئی بسکٹ کے لئے رو رہا ہے ۔ ڈرا دھمکا کر بچوں کو بھگایا اور گود کے بچہ کو واپس کرنے بیوی کی تلاش میں نکلے ۔ بیوی نل کے پاس کپڑوں کا ڈھیر لگائے بیٹھی ہے بچے کو بیوی کے پاس چھوڑا ، سانسیں درست کیں اور دو گھونٹ پانی پیا ۔ بیوی کہاں ٹکنے بیٹھنے والی ' ہاتھ میں تھیلی اور راشن کارڈ تھما کر فرمایا " جائیے راشن ختم ہو گیا ہے " ۔ بھلا یہ بھی کوئی شریک زندگی کا طرز حیات ہے ۔ کیا شوہر اور بیوی اس لئے بنے ہیں کہ راشن لایا جائے ، کپڑے دھویا جائے ۔ بچوں کو پیدا اور انہیں پالا پوسا جائے ۔ ہم اپنے آپ پر افسوس کا اظہار کر کے خاموش ہو رہے تھے ۔ بیوی کے سوال پر ہم چونکے " کیا کبھی میں بھی آپ کے ساتھ تھی ؟ " ہم نے سچ کہا کیوں نہیں بیگم آپ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہمارے ساتھ ہوتی ہیں ۔ آپ اور ہم شاپنگ کرتے ہیں ، یوں کہئے آپ شاپنگ کرتی ہیں اور ہم آپ کی خدمت کرتے ہیں ۔ صبح بازار کھلنے سے رات بند ہونے تک آپ شاپنگ کرتی ہیں ۔ آپ کی ہر خواہش پر ہمارا دم نکلنے کے بجائے اسے پوری کرنے کیلئے ہماری جیب میں ڈھیر سارے پیسے اور چند بلانک چیک ہوتے ہیں ۔ کپڑے خریدنے کے لئے ہم نے ہزاروں روپیے ادا کر دیئے اُف تک نہ کی ، کئی قسم کا زیور خریدا اور ہم نے خوشی خوشی بل ادا کر دیا ۔ بھاؤ تاؤ کرنے میں آپ نے وقت گنوایا ۔ ہم نے ٹوکا تو آپ نے اسراف پر لیکچر دیا ۔ کئی دکانیں گھوم پھر کر آپ نے وہی پہلی جگہ سے خریدی کی ۔ ہم نے شکایت کی تو آپ نے ٹھوک بجا کر خرید نے کا گر سکھایا ۔ غرض شام میں دوکان دوکان پھر کر ، پیکٹ اور تھیلیوں کا بوجھ اُٹھا کر تھکے ماندے گھر پہنچے ۔ گھر پہنچنے کے بعد تھکن اتارنے کی بجائے آپ نے پیکٹ کھول کر دیکھے ۔ زیور پہن کر خوش ہوئیں ، کپڑے دیکھے تو پتہ چلا کہ ایک ساڑی کا میچنگ بلاؤز لینا بھول گئیں ۔ ہمیں اُلٹے پیر دوڑایا گیا ۔ اس مرحلہ پر بیوی نے سوال کیا " کیا آپ سیدھے دوکان گئے " ۔ ہم نے بھی اُن سے ایک سوال کیا ۔ " سچ کہنے پر آپ خفا تو نہ ہوں گی " ۔ بیوی نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا " سچ کہنے پر پابندی نہیں ہے لیکن سچ سُننا کوئی گوارا نہیں کرتا " ۔ خیر صاحب ہم نے سچ بولا ۔ " ایمان کی بات یہ ہے کہ بیگم ہم ساڑی کا پیکٹ اٹھائے اپنے دوست کے یہاں پہنچے ۔ انھیں ساتھ لے کر ریسٹورنٹ گئے تھکن اتاری ۔ پیٹ بھرا ۔ گپ شپ کی اور واپس گھر آ کر آپ سے کہا کہ دکان بند ہو چکی ہے " ۔ سچ بات سن کر ہماری بیوی کو غصہ آیا کہنے لگیں ۔ " آپ کو بس ! دوست احباب اور وہ چاہیئے ۔ جب بھی موقع ملے ان کے ساتھ ہوا ہو جاتے ہیں " ۔

بیوی کا الزام ہم نے بخوشی قبول کر لیا ۔ یہ حقیقت بھی ہے ۔ دوستوں اور اس کے یہاں ہمارے مسائل کا حل کر

مسائل سے فرار ہے۔ دوستوں کے ساتھ اپنے مسئلوں کو بالائے طاق رکھ کر ادب، آرٹ اور سیاست جیسے موضوعات پر گھنٹوں بحث و مباحث میں اُلجھ جاتے ہیں۔ دوستوں سے زیادہ وہ، ہماری ہمدرد، غمگسار اور بہی خواہ ہے۔ جب بھی ہم پریشان ہوتے ہیں وہ ہمارا سر سہلاتے ہوئے آتی ہے۔ آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ پھر کوئی مسئلہ درپیش رہتا ہے نہ کوئی سوال۔ ہماری کیفیت بقول میرؔ ؂

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہو جاتی ہے۔ وہ بہت خوبصورت، میٹھی اور معصوم ہے۔ اس کی آغوش میں پہنچ کر ہم دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ہماری اپنی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ بستر سے اُٹھنے کے بعد ہی سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ بعض وقت جلد آجاتی ہے تو بعض وقت بہت انتظار کرواتی ہے۔ کبھی بے وفائی بھی کرتی ہے۔ نہیں آتی تو اس کی جدائی بے چین کر دیتی ہے۔ طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ گھنٹوں تڑپانے کے بعد جب وہ آتی ہے تو ایک نشہ طاری ہو جاتا ہے۔ ہماری کئی خواہشات اور ارمانوں کو اس نے حقیقت کا روپ دیا ہے۔ دن تمام ہم سیکل چلاتے اور پسینہ بہاتے ہیں لیکن اس کی آغوش میں پہنچ کر ایرکنڈیشنڈ امپالا کار میں گھومنے کا ارمان پورا کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک کئی صفحات کالے کرتے ہیں لیکن اس کی سنگت میں صرف چیک پر دستخط کرتے ہیں۔ کئی افسروں کی ماتحتی کرتے ہیں جبکہ اس کے بل بوتے پر نوکروں کی فوج پر حکم چلاتے ہیں۔ بھوکے پیٹ اس سے ملنے کے بعد عالیشان ہوٹل میں مرغ و ماہی تناول کرتے ہیں۔ کیا آپ نے اندازہ لگایا۔ ہماری "وہ" کون ہے؟ —— "نیند" — ہاں "وہ"۔ — یعنی "نیند" ہے۔ آج کے غم روزگار کا مداوا، ہمارے آپ کے مسائل کا حل 'نیند' ہی تو ہے۔ بیوی کی شکایت سننے کے بعد ہم نے ان سے سوال کیا۔ "بیگم کیوں ہم پر ہی اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا الزام رکھتی ہیں، جب وہ آپ کے پاس آتی ہے کیا آپ بھی اس کے پیچھے نہیں ہو جاتیں؟

* صبغتہ اللہ بمباٹ

"ریٹائرڈ محبوبہ کی اُوور ہالنگ"

وہ ایسے ملی جیسے کبھی کچھ نہ ہوا تھا — مرحوم کی خاطر مجھے چکمہ نہ دیا تھا
دیکھا اُسے یاد آگیا پھر عہد جوانی — گو بچوں کا دادا تھا میں وہ بچوں کی نانی
اس بار مگر اس میں [illegible] کی کمی تھی — زلفوں کی گھٹاؤں میں سحر گھلنے لگی تھی
وہ بولی کہ اس عمر میں ملنا بھی گراں ہے — شعلے کہاں اب شوق کے چولھے میں دھواں ہے
حاصل تھا جوانی میں جسے فرض کا درجہ — وہ عشق ہے اب شوقِ نوافل کے سوا کیا
میں نے کہا اب ہے روشِ چارہ گراں قدر — لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
جا پہنچے پھر اک چارہ گر نو کی دکاں پر — اعضائے بدن شیشوں میں رکھے تھے جہاں پر
نباض لگا ہوں سے یہیں اس نے ٹٹولا — ہر عضو ہے اب لائقِ تبدیل' وہ بولا
اک آنکھ میں ہے موتیا بند دوسری کمزور — بہتر ہے کہ دونوں کو بدل دیجئے فی الفور
ہوں گال ٹماٹر کی طرح لال ضروری — اعضائے رئیسہ کا اُوور ہال ضروری
کچھ بجلیاں شوخی کی ضروری ہیں نظر میں — تبدیل کیا جاتا ہے کمرے کو کمر میں
کی جائے گی انجکٹ توانائی بدن میں — بھرتی ہے نئی بجلیاں خاکسترِ تن میں
دس روز کی مدت ری نیویشن میں لگے گی — محبوبہ ہر طرح سے تیار ملے گی

ہر جھول نکل جائے گا ہر زخم رسے گا
ڈالر میں ہو پے منٹ تو ڈسکاؤنٹ ملے گا

غزل

ظافر زکی

سیٹھ قائل نہیں ملاوٹ کا — چائے دیتا ہے صرف پانی کی
ایک سے قافیہ ہے تنگ اپنا — کیسے جرأت ہو عقد ثانی کی
بھوت ہوگا کسی غرض کا وہاں — جس میں جھانکو ہو "بریانی" کی
رشتہ مطلوب ہے • کے کالم میں — فوٹو چھپوائیے جوانی کی
فائل کیسے پٹ آپ کریں یوں کی — بات ہو پہلے "چائے پانی" کی

ہو گئے ہم تو اور بھی [illegible]
دل جو [illegible] شہ [illegible]
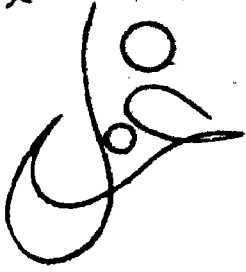
اسمٰعیل آذر
(کٹک)

دما دم مست مچھندر

انتر منتر سات سمندر
ہم ہیں بابا مست مچھندر
بارہ کنیاؤں کے والد، من موجی، آزاد قلندر
بیٹے کی اک مہم چلائی، کھلے بھاگ بن گئے سکندر

دما دم مست مچھندر .... دما دم

ہے کوئی بیاہ رچانے والا
جہیز پہ جان لٹانے والا
رکشا، سائیکل، تانگہ چھوڑ کے موٹر کار پہ چڑھنے والا
انتر منتر جل چھو منتر بیک ڈور سے گھس جا اندر

دما دم مست مچھندر .... دما دم

مل جائے جو بھی سانڈ چلے گا
ہیرو، ویلن بھانڈ چلے گا
بھوندو مل کا بیل ملے یا دکھیا رانڈ کا سانڈ چلے گا
بیچ، مولا، ہولا، بولا، مسٹنڈا، خرانٹ، مچھندر

دما دم مست مچھندر .... دما دم

دور کھڑا ابھر کیا کرتا ہے
مانگ لے بچہ کیا ڈرتا ہے
خاندان کی شان کی خاطر دیکھو یہ بابا کیا کرتا ہے
ملی گرہ ہلدی کی بن گئے پنساری بے شمار مچھندر

دما دم مست مچھندر .... دما دم

غزل

رؤف رحیم

یہ زبانی دل دہی تقریر ہی تقریر ہے
مسئلہ اُردو کا جیسے قضیۂ کشمیر ہے
کہنے کو آزاد ہیں ہم پاؤں میں زنجیر ہے
"کس قدر روشن ہمارے خواب کی تعبیر ہے"
گود میں بچے کبھی تو ہاتھ میں کفگیر ہے
ہر کسی شادی شدہ کی بس یہی تقدیر ہے
لے کے نذرانے بناتا ہے وہ جنت اپنا گھر
ہیں خسارے میں مریداں اور مزے میں پیر ہے
کاش میں زیور ہی بن جاتا مری محبوب کا
چومتی ہے، چھیڑتی ہے جو گلے تو جھیر ہے
خانقاہ کے ایک گوشے ہی میں دیدے ساقیا
میرا مے خانے کو آنا باعثِ تحقیر ہے
باغِ عامہ یا کوئی تھیٹر بلاتے ٹھیک تھا
ان کا اپنے گھر بلانا معاملہ گمبھیر ہے
تھا کنوارا جب تو میں شادی کی مجھ کو فکر تھی
کیسے نکلوں اِس تعلقہ سے فکر دامن گیر ہے
جو وفا ہوتے نہیں وعدے بیجا کرتا ہے وہ
چلئے چلئے یہ تو [illegible]پوش کی تقریر ہے
کیوں نہ چھونے لگے پیار کے چرچے ہمارے چار سو
ہیں جو ہیرو سڑکوں کا رانجھا وہ گلی کی ہیر ہے
بال لمبے، مونچھ غائب اور تھا میک اپ بہت
ہیں جسے تانیث سمجھا جائے وہ تذکیر ہے
غم چھپانا بھی بڑا فن ہے یہاں پر اے رحیم
تو ہنسانے کو ہنساتا ہے مگر دل گیر ہے

ڈاکٹر حبیب ضیاء (حیدرآباد)

حیدرآباد کی شادیاں

شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کے علاوہ قاضی اور دو گواہ کافی ہیں۔ دو دلوں کے اس میل کے لیے خاندان کے افراد، دوست احباب، پیشہ ور مشاطہ کے علاوہ اخبار بھی مددگار ثابت ہوسکتے ہیں لیکن آج کل حیدرآباد میں لفظ شادی کا مفہوم کچھ بدل سا گیا ہے۔ بیشتر شادیاں خالص کاروباری انداز میں انجام پا رہی ہیں۔ اشتہار بازی کیلئے اخباروں کے کالم مختص ہیں۔ اشتہار بازی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔ "ایک معزز خاندان کی ۲۳ سالہ خوبصورت نیک سیرت، صوم وصلوٰۃ کی پابند لڑکی کے لیے ڈاکٹر یا انجینیئر سے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی کے دو بھائی گرین کارڈ ہولڈر ہیں۔ بیروزگار لڑکے کو اندرون ایک ماہ باہر نوکری دلانے کا پورا ذمہ لیا جاتا ہے۔"

اس قسم کے اشتہار دے کر لڑکی والے ایک طرح سے لڑکے کو مکمل طور پر خرید لیتے ہیں۔ یعنی جوڑے گھوڑے کے نام پر کثیر رقم اور ملازمت دلانے کی ترغیب دے کر۔ لڑکی کے دو بھائی اگر گرین کارڈ ہولڈر ہیں تو لڑکا اسے دعا کیجئے تیسرا بھائی بھی جلد از جلد کسی اور رنگ کا کارڈ حاصل کرلے۔ اب آپ اس لڑکے کی غیرت کا عالم دیکھیے جو لڑکی سے بے حساب روپیہ پیسہ ہر قسم کا سامان لے کر اسی کے پیسے سے اور اس کا احسان اٹھا کر ملازمت کے لیے جاتا ہے!

ایسے دولھے جنھیں لڑکی والے بہت سارا روپیہ دے کر خریدتے ہیں ان کی بارات نکلتے وقت باجے والے اس گانے کی دھن بجاتے ہیں۔ "دولھا بکتا ہے بولو خریدو گے" یہ بکاؤ دولھا جب دیکھتا ہے کہ جہیز میں اس کی مانگی ہوئی چیزوں میں سے ایک دو کم ہیں تو وہ بارات کی واپسی کے وقت اس گانے کی دھن بجانے کی فرمائش کرتا ہے۔
"دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے"

حیدرآباد میں اکثر لڑکی والے جہیز کی رقم خود اپنی طرف سے مقرر کرکے لڑکے والوں کے دماغ خراب کر رہے ہیں۔ متوسط گھرانے کے ایک صاحب نے حماقت میں آکر اپنی لڑکی کی شادی پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا اعلان کردیا۔ اس ایک لاکھ کے بجٹ میں انھوں نے اپنے جہیز میں ملے ہوئے چالیس سال پرانے سماور، اگالدان اور تانبے کے دوسرے برتنوں اور دیگر سامان کی قیمت لگا کر رکھی تھی۔ لڑکے کی ماں بہت ہی ہوشیار، موقع پرست واقع ہوئی تھی۔ اس نے عین وقت پر قیمتی سامان کی فہرست شادی کے ذریعہ لڑکی کے گھر بھیج دی کہ اس ایک لاکھ روپئے میں سے آپ جوڑے کے ۲۵ ہزار روپئے الگ کر لیجئے رقم میں فریج، ٹی وی، گیزر، واشنگ مشین، ٹیپ [illegible]

کا فرنیچر اور الماس کا زیور لے لیں۔ لڑکی والے پریشان ہوگئے۔ لیکن عزت کا معاملہ تھا۔ نہ رشتہ توڑا جاسکتا تھا اور نہ بغیر مانگ پوری کئے رشتہ جوڑا جاسکتا تھا۔ رحم کی بھیک مانگ کر لڑکے کو کچھ کم رقم میں راضی کیا جائے تو لڑکی طعنوں کا شکار ہو کر زندہ رہنے پر مجبور رہتی ہے یا دوسری صورت میں ایسے جینے سے موت کو گلے لگا لینا بہتر سمجھتی ہے۔

شادیوں میں مہمانوں کی ضیافت مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ سردی کا موسم ہو تو چائے، گرمی کا موسم ہو تو آئسکریم۔ چائے سے بہت زیادہ لگاؤ رکھنے والے میزبان شدید گرمی میں بھی چائے ہی سے ضیافت کرنا پسند کرتے ہیں۔ چند دن قبل ہم نے سردی والی ایک شادی میں شرکت کی۔ میزبان کو ہم ڈھونڈ نکالنا چاہتے تھے کہ ایک ویٹر نے بغیر طشتری والی چائے کی پیالی ہاتھ میں تھما دی۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ گنجائش کے لحاظ سے کشتی میں صرف پیالیاں رکھی گئی ہیں۔ دوسرا ویٹر طشتری لا کر دے گا۔ اتنے میں ایک ضدی بچے نے دھکا جو مارا چائے چھلک گئی ابھی ہم کپڑوں پر گرتی ہوئی چائے کو سنبھالنے نہ پائے تھے کہ دوسرے ویٹر نے ایک ورقی سموسہ دوسرے ہاتھ میں تھما دیا۔ آج کل شادی کی دعوتوں میں ورقی سموسے بنانے والے باورچیوں میں ایک مقابلہ سا چل رہا ہے کہ کون باریک سے باریک پرت والے سموسے تیار کر سکتا ہے اور کس کے بنائے ہوئے سموسوں سے مہمانوں کے کپڑے زیادہ سے زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔

شادی کے رقعہ میں ایک چھوٹا سا کارڈ لگا ہوتا ہے جس پر "چوتھی یا ولیمہ ڈنر" لکھا ہوتا ہے۔ چند سال قبل تک یہ ڈنر کارڈ الگ الگ ہوتے تھے۔ دوستی اور رشتے کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کارڈ رقعہ کے ساتھ بھیجے جاتے۔ کسی کو دو کارڈ، کسی کو ایک کارڈ اور کسی کو ایک بھی نہیں۔ بہر حال آج کل یہ دو ڈنر کارڈ ایک ہوگئے ہیں۔

دیگ کے پاس عموماً دولہن کے باپ کا قریبی دوست بیٹھتا ہے جسے پکوان سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ ڈنر پر خرچ ہونے والی رقم دونوں سمدھی مساوی طور پر برداشت کرتے ہیں لیکن بچی ہوئی بریانی مرچ کا سالن اور ڈبل کا میٹھا منتظمین اپنے گھر لیکر چلے جاتے ہیں۔ کل زردہ بھی اس لیے نہیں بچتا کہ یہ بچوں بڑوں سبھی کا مرغوب میٹھا ہے۔ اور ڈٹ کر کنگال پن سے کھایا جاتا ہے۔ باسی بریانی گھر والوں کے علاوہ دو چار دن رہنے والے رشتہ داروں اور پاس پڑوس میں رہنے والے لوگوں کے ناشتے میں آتی ہے۔ ایک دو دن میں اس باسی بریانی کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں رنجش پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن جب اطلاع ملتی ہے کہ بغیر قلعی والے دیگوں کی کرامت ہے سارے لوگ متاثر ہوگئے تو دولہا والے اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

بعض شادیوں کے دعوت نامے بڑے دلچسپ مگر مصلحت آمیز ہوتے ہیں۔ رقعہ کے ساتھ چوتھی ولیمہ ڈنر کا کارڈ تو بھیج دیا جاتا ہے لیکن دو بچوں کے عقیقہ کی دعوت قریبی رشتے داروں اور دوستوں کو زبانی دی جاتی ہے عقیقہ کے بکروں کی بریانی منع ہے۔ کہنے کو تو شادی کی دعوت دی جاتی ہے لیکن ہوشیار میزبان ایک ڈنر دے کر تین تین تحفے وصول کرتے ہیں۔ چوتھی ولیمہ کا کارڈ دور کے رشتہ داروں کو نہیں دیا جاتا۔ شکایت کرنا حماقت ہے یہ دعوت دینے والے کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن ستم ظریف بعد میں ڈنر میں نہ آنے کی وجہ پوچھ بیٹھتے ہیں۔ جب انھیں سنجیدگی سے بتایا جاتا ہے کہ ایسا کوئی کارڈ نہیں بھیجا گیا تھا تو بنا وٹی اخلاق سے اپنے بچاؤ کے لیے کہہ دیتے ہیں۔ ہم نے کارڈ بھیجا تھا گر گیا ہوگا۔

غور طلب بات ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے رقعے کے کارڈ تو بیچ گئے ہوئے دیکھے گئے ہیں اور

دُور کے رشتہ داروں کے لیے یوں "پیش" کیا جاتا ہے کہ بیچارے رقعے لانے والے کو کارڈ کے گرنے کی خبر تک نہیں ہوتی ایسی دعوت دینے والوں کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ بعد میں اس قسم کے سوالات کرکے تعلقات کو خراب نہ ہونے دیں۔ مصروفیت اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے اس دور میں شادی کی ایک دن کی دعوت میں شریک ہونا بھی بہت بڑی بات ہے۔

حیدرآباد میں بڑے گھرانوں میں شادیاں بہت ہی شاندار پیمانے پر انجام پارہی ہیں لیکن اس بڑھتے ہوئے معیار کے ساتھ میزبانوں کی اخلاقی قدریں گرتی جارہی ہیں۔ اکثر شادیوں میں دولھا کی طرف سے دعوت دینے والی خواتین یعنی اس کی ماں اور بہن وغیرہ مقررہ وقت پر نہیں آتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہمان جب شادی خانے میں قدم رکھتے ہیں تو اجنبی چہروں سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ دلہن کی طرف کے فوٹوگرافر بیچے بیچ ویڈیو کے کیمرہ گلے میں ڈالے موڈ خیر مارتے پھرتے ہیں۔ بے جا لاڈ پیار میں پلے ہوئے بچے سجے سجائے منڈپ کے پھول توڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ دلہن کی سہیلیاں اپنے میک اپ کو درست کرنے میں مگن رہتی ہیں قریبی سہیلی کو اپنے بھاؤ بتانے کا بہترین موقع ہاتھ لگتا ہے۔ ایسے میزبانوں کے لیے ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ مہمانوں کو دیئے گئے وقت سے قبل ہی شادی خانے میں موجود رہیں۔ وقت کی پابندی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خواتین دو تین بجے سے تیاری شروع کر دیں۔ کسی کے رحم و کرم پر ملی ہوئی ایک سست رفتار موٹر کے دس چکر کی بجائے کرایہ کی ایک گاڑی کا انتظام کریں۔ شادی خانے میں آنے کے بعد ضیافت کے موقع پر سب مہمانوں کا یکساں خیال رکھیں۔ ورنہ اکثر شادیوں میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مہمان دو قسم کی آئسکریم کا دو مرتبہ ذائقہ چکھتا ہے اور بار بار بیٹھنے والا منہ میں پانی لاتے ہوئے میزبان کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہے۔ ایک دفعہ باہر سے آئے ہوئے ایک خاندان نے یہاں کی مشہور رسومات دیکھنے کی خاطر ہمارے ساتھ ایک شادی میں شرکت کی۔ دولھے کا منڈپ سجا ہوا تھا۔ زنانے اور مردانے میں چہل پہل کچھ زیادہ ہی بڑھتی نظر آئی۔ نکاح کا وقت آپہنچا۔ دولھا شان سے سہرے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ کچھ لوگ آگے بڑھے، انھوں نے اس کا سہرا کھینچنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر پھول بکھر گئے۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے مہمان اس رسم سے بہت محظوظ ہوئے۔ انھوں نے کہا "یہاں کی یہ رسم بڑی دلچسپ ہے۔ اسے کونسی رسم کہتے ہیں"؟ ہم نے کہا "یہ سہرے کی لڑیاں توڑنے کی رسم ہے اور صرف ان شادیوں میں اس کا اہتمام ہوتا ہے جہاں دولھا بیوی اور باشعور بچوں کی موجودگی میں عیاشی کی خاطر دوسری شادی رچاتا ہے۔

آج کل حیدرآباد میں جو شادیاں ہو رہی ہیں اُن سے متعلق ایک خوش آئند بات جو محسوس کی جارہی ہے وہ یہ کہ بعض گھرانے ایسے اُبھر رہے ہیں جو جوڑے گھوڑے کے نام پر ایک پیسہ بھی لینا نہیں چاہتے۔ وہ صرف نیک سیرت اور خاندانی لڑکی چاہتے ہیں۔ اس مبارک دن کا شدت سے انتظار ہے جب ایسے شریف گھرانے عام ہو جائیں گے۔

احمد سلطان

لو ۸۶

اپنی شادی میں میری جان بُلانا مجھ کو

ہاتھ میں میرے نہ فرہاد کا تیشہ ہوگا   شوخ نہ مجنوں کی طرح جانبِ صحرا ہوگا
سر پہ دشمن کے میرے پھولوں کا سہرا ہوگا   بھوک ہڑتال کروں گا نہ میں گھیرا ہوگا

پھر بھی پِٹیا جو رقیبوں نے چھڑانا مجھ کو
اپنی شادی میں میری جان بُلانا مجھ کو

لوگ کہتے ہیں کہ یرقان ہوا تھا مجھ کو   رنگ کالا تھا تیرا گورا لگا تھا مجھ کو
باپ خود تیرا ولین تھا نہ پتا تھا مجھ کو   ترچھی نظروں کا تیری تیر لگا تھا مجھ کو

اپنی نظروں کا وہی جام پلانا مجھ کو
اپنی شادی میں میری جان بُلانا مجھ کو

شوق سے آؤں گا منظور تیری مہمانی   پیٹ بھر کھاؤں گا شادی کی تیری بریانی
پی کے آؤں گا گر مِلے میں مثالِ پانی   ناچوں گا گاؤں گا میں خوش ہو کے جو ڈسکو جانی

ہاتھ سے میٹھا تو شادی کا کھلانا مجھ کو
اپنی شادی میں میری جان بُلانا مجھ کو

میں نے وعدہ جو کیا تھا وہ نبھاؤں گا سدا   تیری خدمت کے لیے گھر پہ میں آؤں گا سدا
تیرے شوہر کو بھی میں جام پلاؤں گا سدا   تیرے بچوں کو سنبھالوں گا کھلاؤں گا سدا

میں تو بے دام کا عاشق نہ بھلانا مجھ کو
اپنی شادی میں میری جان بُلانا مجھ کو

ہندی کا گالب

(اردو الفاظ — ہندی رسم الخط میں)

مُفت کی مہ کا یہ تالب کون ہے
ہم نے بھی اکثر سُنا ہے اُس کا نام
دِلّی کے ناشوک پر مَرتا رہا!
اُس کا ہُنر شاعری میں ذوک تھا
اونچا تبکہ کہتا تھا اُس کو ہکیر
کرز لے کر پیتا اور کھاتا رہا!
پھارسی اردو کا شاعر کھو گیا

پوچھتے ہیں وہ کہ گالب کون ہے
فلم میں دیکھا ہے ہم نے اُس کا کام
عمر بھر وہ شاعری کرتا رہا!
آم کھانے کا بھی اس کو شوک تھا
اُس کے گانے گاتے تھے سارے بھکیر
ریڈیو سیلون سے گاتا رہا!
چھپ کے ہندی میں وہ گالب ہو گیا

جاوید لطیف

ہلمٹ گزیدہ

موٹر سیکل چلانے والوں کے لیے ٹرافک پولس کی جانب سے "ہلمٹ" پہننے کا لزوم عاید کیا گیا ہے ہلمٹ سے جہاں بنیادی فائدہ ہے وہاں کچھ پریشانیاں بھی ہیں۔ ویسے اس عالمِ اسباب میں پریشانیاں کس کو نہیں ہیں گھر بار کی پریشانی ملازمت یا کاروبار کی پریشانی، غربت و امارت کی پریشانی، جینے اور مرنے کی پریشانی بہر کیف، کہیں بھی تو مفر نہیں، پھر بے چارے اس ہلمٹ کا ذکر ہی کیا ۔۔؟

ایک صاحب کی پریشانی تو اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب کہ وہ لفظ ہلمٹ زبان سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے منہ ہی منہ میں ریہرسل کر لیتے ہیں، اس لیے کہ پہلی بار جب موصوف نے ہلمٹ کہنے کے لیے لب کشائی کی تو بے ساختہ ان کی زبان سے ہلمٹ کی بجائے "ہملیٹ" نکل گیا اور پھر وہ۔۔۔ لفظ ہلمٹ اور اپنے مافی الضمیر کے "خون کا خون" ہوتا دیکھ کر بوکھلا کر رہ گئے تھے، اب جب کبھی وہ ہلمٹ کہنا چاہتے ہیں تو احتیاطاً منہ ہی منہ میں ریہرسل کر کے صحیح لفظ ہلمٹ ادا کرتے ہیں، ریہرسل کے دوران وہ ہر بار "ہلیٹ" "آملیٹ" اور "ہیملیٹ" کی گردان کے بعد صحیح لفظ ہلمٹ پر آتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہلمٹ پہننے سے "سرگرمی" بڑھ جاتی ہے جس کے سبب سرگرانی، درد سر اور گھبراہٹ کی شکایت ہو جاتی ہے یوں تو ان کی "سرگرمی" کی یہ بات سرسری نظر آتی ہے اور سر پر سے گزر جاتی ہے لیکن دانائی سے غور کرنے پر سرگرمی کا مطلب نکلتا ہے "سر کی گرمی"۔ سر میں درد ہونے لگتا ہے اور پسینہ ٹپکنے لگتا ہے ۔۔۔ ہلمٹ کے اندر حبس اور حرارت کے پیدا ہو جانے سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ سر حبسِ بیجا میں گرفتار ہے۔

دماغ کا کام کرنے والوں میں بسا اوقات کسی کو "غائب دماغی" کا عارضہ بھی لاحق ہو جاتا ہے، مثلاً پروفیسر ادیبوں اور وکیلوں کو۔ میں نے ایک وکیل صاحب کو دیکھا کہ انہوں نے ۔۔۔ عدالت پہنچ کر اپنی موٹر سیکل پارک کی، ہلمٹ اتارا، بیگ میں سے فائلیں نکالیں، فائلوں اور ہلمٹ کو سینے سے لگائے کورٹ روم تک پہنچ گئے ۔۔۔ اپنے مقدمے کا نمبر آیا ۔۔۔ جلدی جلدی فائلیں عدالت کی لمبی میز پر رکھ دیں اور ہلمٹ کو فائل سمجھ کر ہاتھوں میں تھامے جج کے روبرو پہنچ گئے ۔۔۔ پھر یکلخت پلٹے، ہلمٹ کو کلائی میں ٹانگ لیا، اور ٹیبل پر سے مطلوبہ فائل نکال کر جج کے سامنے پہنچ گئے۔

ہلمٹ کے لزوم سے، ہیرو اور فرہاد ٹائپ نوجوانوں کے سر پہ لہرانے والے اُن کے "خوبصورت د

خوشنما بال چھپ جاتے ہیں اور ہلمٹ اُتارنے پر بکھر جاتے ہیں ۔ ہلمٹ سے جانے بوجھے چہرے بھی بیک نظر پہچانے نہیں جاتے ۔ ہلمٹ زدہ سر "اسپیس کا سموناٹ" یعنی خلا نورد جیسا لگتا ہے ۔ ہلمٹ زدہ شخصیت کو بعض اوقات ان کی "ہیبت کذائی" کبھی "وحشت گردی" کا روپ دے دیتی ہے، جو آج کے نازک دور میں بڑے خطرے کی بات ہے اس کے برعکس ہلمٹ میں یہ صفت بھی ہے کہ وہ بدوضع اور گنجے سروں کی ستر پوشی کرتا ہے اور کوتاہ قامتوں کو سربلندی عطا کرتا ہے ۔!

ہلمٹ جہاں گنجوں کے لیے ایک "گنجینے" سے کم نہیں وہیں ان کے لیے اس وقت باعث پریشانی بن جاتا ہے جب وہ اپنا سر کھجانا چاہتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے ان کی ذاتی کھوپڑی پر کسی اور کی مُردہ کھوپڑی دھری ہوئی ہے ۔ اکثر مقروض، ان کی اپنی تلاش و جستجو میں سرگرداں،

"قرض خواہ سیاہ رُو" کے سامنے سے ہی ہلمٹ پہنے "سرخ رو" ہو کر دندناتے گزر جاتے ہیں ۔

کسی زمانے میں سیکل سواروں کے لیے رات کے وقت سیکل میں قندیل لگانے کا لزوم تھا اگر ٹرافک پولیس کبھی رات پکڑ دھکڑ کی مہم اختیار کرتی تھی تو بلا قندیل سیکل والوں کو ہمدرد راہ رو خبردار کرتے جاتے تھے کہ ۔

آگے قندیل پکڑ رہے ہیں ۔

جس طرح بعض لوگ "پابند صوم و صلوٰۃ" ہوتے ہیں اسی طرح بعض لوگ پابند "قانون" بھی ہوتے ہیں۔ ایک پابند قانون اور اصولی آدمی شمس الدین، قندیل پکڑنے کے دور میں رات کو تین بجے جب ایک پولس اسٹیشن کے سامنے پہنچے تو انہوں نے اپنی سیکل اسٹانڈ کر کے چوکی پر متعین سوئے ہوئے پولس والے کو جھنجھوڑ کر اور آوازیں دیکر جگایا اور معذرت کے ساتھ پوچھا تھا ۔

"جمعدار صاحب میری سیکل میں قندیل نہیں ہے گھر جا رہا ہوں، اجازت ہو تو آگے نکل جاؤں ۔"؟

شمس الدین صاحب کے اس عمل پر ان کا حشر کیا ہوا ہوگا یہ اظہر من الشمس ہے ۔

آج کے دور میں بالکل اسی طرح پکڑ دھکڑ کی خصوصی پولس مہم کے دوران ہمدرد لوگ موٹر سیکل پر سوار بلا ہلمٹ والوں کو خبردار کر دیتے ہیں ۔

"صاحب آگے پولس ہلمٹ پکڑ رہی ہے"!

یہ سنتے ہی متعلقہ موٹر سیکلیں فوراً اباؤٹ ٹرن ہو جاتی ہیں اور گلی کوچوں میں سے فرار ہو جاتی ہیں ۔

ہلمٹ سے استفادے کی دوسری صورتیں بھی سامنے آئی ہیں! ہمارے ایک واقف کار جن کا پیشہ ہی حوالن جاتا ہے ہلمٹ ہاتھ میں لیے پیدل پھرتے نظر آتے ہیں اور بغیر کچھ کہے یہ جتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی ایک عدد موٹر سیکل کے مالک ہیں، دریافت پر وہ کہہ دیتے ہیں کہ گاڑی ورکشاپ میں چھوڑ کر آ رہے ہیں، ان صاحب کے ہاتھوں میں پانچ سو پچپن نمبر کا فارن کے سگریٹ کا ٹن بھی رہتا ہے جو ملک بیرون سے آئی ہوئی شخصیت کا یا فل کا مظہر کہلاتا ہے ۔ اب یہ بات اور ہے کہ اس ٹن میں صرف دو تین سگریٹ اور باقی بیڑیاں بھری ہوتی ہیں تا قاجب بھید کھل جاتا ہے تو مسکرا کر کہہ دیتے ہیں ۔

"جی ہاں بیڑیاں ہیں ۔ فارن کی ۔"

"یہ حضرت دھولنسو! بقرعید کے موقع پر بھی یہ جتانے کے لیے کہ وہ بھی قربانی کرنے والے ہیں، محلے والوں

کو سنانے کے لیے اپنے گھر میں بکرے کی ٹیپ شدہ آواز کا ٹیپ ریکارڈ گاہ بگاہ بجاتے رہتے ہیں!

ہلمٹ سے استفادہ کی ایک صورت ہم نے بھی بھگتی۔ "بھگتنا" دید و شنید کے بعد کی واضح یقینی اور معتبر ترین شکل ہوتی ہے۔

... ایک بار ہم اپنے سالا اپنی "نصف بہتر"... نہیں نہیں بلکہ "سالم شریک حیات" کو موٹر سیکل کے پیچھے بٹھا کر لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ سستے انڈے بک رہے تھے پتہ نہیں سستے کیوں تھے۔ صدقے کے تھے، اتارے گئے تھے، چوری کے، یا سڑے۔ بیگم نے فوراً گاڑی رکوائی اور دیکھتے دیکھتے انڈے خرید لیے۔ پھر انڈوں کو محفوظ طریقے سے گھر لے جانے کا ایک ہی ذریعہ سمجھ میں آیا کہ انڈے ہلمٹ میں لے جائے جائیں۔ ہلمٹ کی اندرونی بناوٹ بڑی نرم و لطیف ہوتی ہے، ہلمٹ کو ناریل سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں اوپر سے سخت اور اندر سے نرم ——
بیگم کے حکم پر ہم نے سر پر سے ہلمٹ اتار دیا۔ "حکم بیگم"... حکم حاکم مرگ مفاجات سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ اس حکم کی صراحت حکم بھگتنے والوں سے بہتر اور کوئی نہیں جان سکتا) چنانچہ اس میں انڈے رکھ دیئے گئے۔ بیگم نے موٹر سیکل پر بیٹھ کر ہلمٹ اپنی گود میں یوں رکھ لی جیسے کسی "نومولود" کو سنبھالے ہوں۔ اب انڈے محفوظ تھے۔

بیگم کو "سبزی کے مائل" بے وقعت انڈے اسے سستے داموں خرید کر خوشی ہو رہی تھی اور ہمیں افسوس ہو رہا تھا کہ بیگم کو انڈوں کے مقابلے میں ان کے "شباب کے مائل" ہمارے "سر" کی قدر و قیمت کا کوئی احساس نہیں تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر کچھ عرصے تک انڈے مسلسل ہلمٹ میں کپڑے سے ڈھکے پڑے رہیں تو ان میں سے چوزے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہلمٹ کی "حرارت غریزی" والی اندرونی فضا کچھ ایسی ہی ہوتی ہے ـــ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ سر کو "[illegible]" حاصل ہے اور سر ہمیشہ سر ہی بنا رہتا ہے کبھی انڈا نہیں بن پاتا ورنہ سر میں کی مختلف کیفیات اور ہلمٹ کا اندرونی حرارت زدہ ماحول مل کر نہ جانے کیا کیا جنم دیتے!

بلدہ حیدرآباد میں موپڈ موٹر سیکل چلانے والوں کے لیے ہلمٹ کا لزوم نہیں۔ یہاں ان گاڑیوں کی رفتار اور پاور کا حال گھوڑے کے "ہارس پاور" سے بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتا ہے۔ یہ گاڑیاں دائیں بائیں سے کٹ مارتی اور سنسناتی یوں نکل جاتی ہیں جیسے باغوں یا جنگلوں میں اڑنے والا دو پیروں والا بے چارہ پنچھی۔ کبھی کبھی یہ ریلا کا پٹری کی مانند ایک ہی جگہ ٹھہر کر تھر تھراتا بھی رہتا ہے ہلمٹ کا لزوم تو موپڈ موٹر سیکل چلانے والوں کے لیے ہی زیادہ موزوں ہے اس لیے کہ یہ گاڑیاں موجودہ "ٹریفک" کے ٹریفک میں اپنی "وضع قطع" اور "حرکات و سکنات" سے حیدرآباد کی مقامی یعنی لوکل بسوں میں فوراً "گھس کے" آ سکتی ہیں۔

محمد برہان حسینی

قسمت کے پتھر

ایک مفید حکایت ہے کہ علم نجوم کے ایک ماہر نے اپنے گاؤں کے سب سے ناکارہ لڑکے کو اپنا شاگرد بنایا اور سارا علم اس کو سکھا دیا۔ شاگرد نے استاد سے اجازت مانگی کہ وہ خود "پرائیوٹ پریکٹس" شروع کرنا چاہتا ہے۔ استاد نے کہا کہ علم نجوم کو بطور پیشہ اختیار کرنے سے پہلے اس کو اپنی قابلیت کا ٹسٹ دینا ہوگا۔
(مورخ اس واقعہ کو پبلک سروس اکزامنیشن کی اولین مثال قرار دیتے ہیں)

استاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکال کر مٹھی بند کر کے شاگرد کے سامنے کر دی اور پوچھا "اب حساب کتاب کر کے بتا کہ اس میں کیا ہے" شاگرد نے حساب کتاب کیا اور سوچ کر کہا کہ "جی! حساب کا گیان تو بتاتا ہے کہ وہ چیز گول ہے اور اس کے بیچ میں سوراخ ہے۔ پس میرا خیال ہے وہ چکی کا پاٹ ہی ہوگا۔"

استاد نے سر پیٹ لیا کہ شاگرد فن میں پکا تھا تعلیم مکمل ہو چکی تھی سند تو اس کو دیدی لیکن کہا "تجھ میں کامن سنس" کی کمی ہے اگرچہ ڈگری رکھتا ہے لہٰذا تو [illegible] کیا کر۔ اور یہ دیکھ میری مٹھی میں گول چیز بیچ میں سوراخ والی انگوٹھی ہے۔"

انگوٹھی کو بطور امتحان کے پرچہ کے استعمال کرنے کا یہ [illegible] واقعہ ہوگا جو چینی سیاحوں کی نظر سے پوشیدہ رہ گیا۔ ویسے بھی تاریخ جس طرح یہ بتلانے سے قاصر ہے کہ سب سے پہلے انگوٹھی کس نے اور کیوں باندھی تھی اسی طرح اس میں یہ کہیں نہیں ظاہر ہوتا کہ سب سے پہلی انگوٹھی کس نے استعمال کی اور کیوں استعمال کی تھی۔

لیکن یہ تو ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ سے قبل ہندوستان میں انگوٹھی کو بطور منگنی کا نشان کے استعمال کیا جاتا تھا۔ چونکہ کالیداس کا ڈرامہ "شکنتلا" انگوٹھی کے اطراف گھومتا ہے۔ ہیرو راجہ دشینت، شکنتلا کو انگوٹھی دے کر شادی کر لیتا ہے اور اُسے پاسپورٹ اور [illegible] تیار ہونے تک وہیں چھوڑ کر اپنی ریاست کو لوٹ جاتا ہے لیکن تاکید کر دیتا ہے کہ وہ آتے وقت انگوٹھی [illegible] اسے ورنہ وہ اُسے پہچاننے سے قاصر رہیگا ... شکنتلا انگوٹھی کھو کر ڈرامہ [illegible] پیدا کرتی ہے [illegible] ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راجاؤں کے پاس بیویوں کا حساب انگوٹھیوں سے ہی ہوتا تھا۔

اکبر اعظم کے سالے راجہ مان سنگھ [illegible] سے انگوٹھی کو سلا بنایا تھا چنانچہ جب وہ مرا تو

اکبر سے لوگوں نے مداخلت کر کے رانیوں کی جان بچانے کہا تھا تو اس نے "ہندو پرسنل لا" میں مداخلت سے انکار کر دیا تھا ویسے بھی بیربل نے بادشاہ کو رپورٹ دے دی تھی کہ ان میں کوئی خوبصورت رانی نہیں تھی۔

اس دور کو چھوڑیے اس دور میں بھی لوگ بہوؤں کو انگوٹھیاں دیتے ہیں حتیٰ کہ مغربی ملکوں میں تو عورتیں انگوٹھیوں سے ہی شوہروں کا حساب رکھتی ہیں اگرچہ ہندوستان میں یہ بات نہیں ہے لیکن لوگ کسی عورت کے ہاتھ میں منگنی کی انگوٹھی دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس عورت سے دوستی کے لیے اس کے شوہر سے دوستی ضروری ہے۔ مغربی ملکوں میں عورتیں منگنی کی انگوٹھی کو طلاق تک پہنتی ہیں اور پھر اتار دیتی ہیں اور پھر سے پہن جاتی رہیں۔ لیکن ہندوستان میں اب عورتیں ایسا کوئی سائن بورڈ نہیں استعمال کرتیں۔ اور منگنی کی انگوٹھی تو شادی شدہ عورت پہن ہی نہیں سکتی کیونکہ انگلی کا ناپ ہی بدل جاتا ہے۔

ایک صاحب اپنی لڑکی کی شادی کی خریدی کرنے کے لیے اپنے ایک سیانے دوست شرفو میاں کو ساتھ لے گئے — وہ صاحب فرنیچر کے کپڑے خریدنے لگے تو شرفو میاں نے منع کیا "یار! بس دو چار ہی خریدو"

وہ سلوانے کے لیے درزی کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا "ارے یار! سلواؤ مت"

وہ لہنگے خریدنے لگے تو انھوں نے منع کیا "کپڑے خرید کر رکھ دو، لہنگے مت خریدو"

وہ تاشے خریدنے لگے تو شرفو میاں نے پھر ٹوکا۔ دوست! غیر ضروری شاپنگ مت کرو۔ پتہ نہیں شادی کے بعد تمہاری لڑکی کی کمر کا ناپ کیا ہو"

تنگ آکر انھوں نے کہا "ساڑیاں خرید لیا وہ بھی شادی کے بعد چھوٹی پڑ جائیں گی" تو شرفو میاں نے کہا "بھئی۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو"

انگوٹھیوں پر قیمتی پتھر جڑ کر پہننے کا عام رواج ہے۔ مالدار لوگ قیمتی پتھر جڑتے ہیں اور عام خیال یہ ہے کہ غریب لوگ معمولی پتھر جڑ کر پہنتے ہیں بعض اوقات مالدار لوگ معمولی پتھر جڑ کر پہنتے ہیں تو لوگ قیمتی اور اصلی سمجھ کر خوب تعریف کرتے ہیں جبکہ اگر کبھی غریب لوگ قیمتی پتھر پہنتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں" واہ استاد تمہارا پتھر تو اصلی کی طرح دمک رہا ہے"

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پتھر مبارک اور بعض منحوس ہوتے ہیں ایسے لوگ "کوہ نور" کی مثال ضرور دیتے ہیں جو گولکنڈہ قلعہ میں پہنچا تو "تانا شاہ" کی وہ درگت ہوئی کہ بے چارہ اپنے بنائے مقبرے میں تک دفن نہ ہو سکا اور محکمۂ آثار قدیمہ نے اس خالی مقبرے میں "داخلہ کا ٹکٹ گھر" کھول دیا کہ لوگ عبرت حاصل کریں جو ٹکٹ کے علاوہ مفت دی جاتی ہے اور اورنگ زیب اس ہیرے کو دہلی کے لال قلعہ میں لے گیا تو پھر سے مغلیہ سلطنت کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا۔ آخر محمد شاہ رنگیلے سے یہ نادر شاہ اسے ایران لے گیا تو اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ایران سے لندن پہنچا تو سلطنت برطانیہ جس میں سورج غروب نہیں ہوتا وہ خود غروب ہو گئی۔ . . . سنا ہے برطانیہ نے اس ہیرے کو ہندوستان کو واپس دینے کا پیش کش کیا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند نے یہ جان لیا ہے کہ اس پیش کش کے پیچھے برطانوی توسیع پسندی کے منصوبے ہیں اس لیے اس میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اور کہا کہ آپ کوہ نور رکھ لیجئے۔ اور ڈیگو گارشیا دے دیجئے۔

ہمارے نادان دوست مرزا علی مظہر کو ایسے کی کوشش رہی تھی۔ جو انھیں بغیر محنت کے دولت، شہرت

وہ بولے "واہ . وہ بیوہ ہو جانے کو ترجیح دیتیں"

پلاٹینا انگوٹھی کا بھی تصور کیجئے کہ ایک حسین شہزادی کو اس کا کم حیثیت محبوب نہیں ملتا تھا اور وہ ایک خوبصورت خوابگاہ میں جس میں مخمل کے فرش اور ریشم کے پردے ہوتے ہیں . یہ پردے طوفانی ہوا سے اُڑ رہے ہیں لیکن شمعیں جل رہی ہیں . نرم بستر پر لیٹی آنسو بہا رہی تھی . پھر اس نے انگوٹھی کا نگینہ ہٹایا اور اس میں سے ایک سفوف نکال کر منہ میں ڈال لیا اور لمبی پلنگ پر لیٹ گئی . بڑے آرام سے کیونکہ وہ نیند لانے والا سفوف تھا . وہ آرام سے رات گزارنا چاہتی تھی جو غلط فہمی سے دور دشمن کو شبہ کہ ایک شہزادہ سے ہونے والی تھی . آخر وہ بھی تو اس کم حیثیت آدمی کی قسمت پر بہار ہی تھی تاکہ وفا کی لاج رہ جائے . ■■

وہ بچ سکتی تھی اگر آپ بس میں سفر کرتے !

○
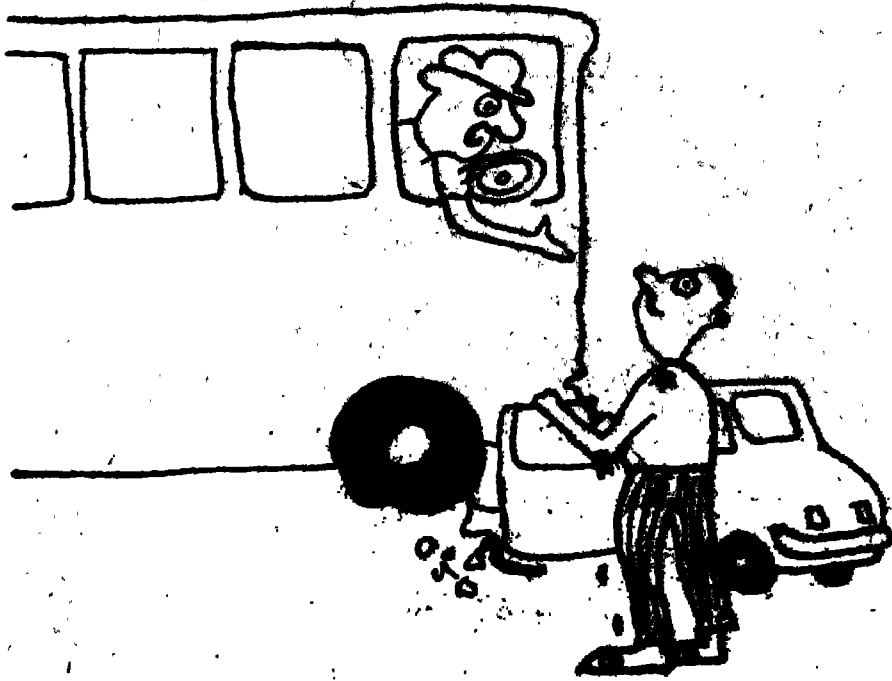
آپ نے وعاؤں کی داد مجھ کو کیا دی ہے
میرے گھر میں بچوں کی لائن سی لگا دی ہے

اُن کو اپنی اُستادی ہم نے یوں دکھا دی ہے
اُن کی ہی غزل ہم نے ٹھاٹ سے سُنا دی ہے

حال غیر تھا اس کا، میں نے خیریت پوچھی
مُنہ بسور کر بولا، آج میری شادی ہے

ڈاکٹر کا بل دینا ہم کو تو نہیں بھاتا
ایک نے دوا دی ہے، ایک نے دُعا دی ہے

قوم کا جنھیں غم ہے اُن کی سادگی دیکھو
ٹیری کاٹ سے مہنگی اُن کے تن پہ کھادی ہے

رات دن کی چخ چخ سے بور ہو کے بیگم کو
ہم نے نیند کی گولی دن میں بھی کھلا دی ہے

قرض لے گئے بیکلؔ جو بھی، بن گئے بہرے
جب بھی دی صدا اُن کو چیخ کر صدا دی ہے

بیکلؔ نظام آبادی

○

جھنڈے یا قوتوں کے ہر طور گاڑ دیجئے
گر کچھ نہ ہو سکے تو تقریر جھاڑ دیجئے

آجائے جب بھی قوم کی خدمت کا مرحلہ
سو گز جو دار یئے بھی تو دو گز نہ پھاڑ دیجئے

لوگوں نے یہ کہا تھا ترنم سے کچھ حضور
کس نے کہا تھا آپ سے یوں مُنہ بگاڑ دیجئے

سُن کر وہ آ گیا تھا کہ آنکھیں ہیں میکدہ
تاڑی کا شوق اُسے ہے نگاہوں سے تاڑ دیجئے

ماہانہ سو روپے کا ہے بیکلؔ کرایہ دار
گھر اس کا آپ شوق سے آکر اُجاڑ دیجئے

○

گھر بلا سے ہوا آباد خدا خیر کرے
زندگی ہوگئی برباد، خدا خیر کرے

حال اب یہ ہے کہ کس کس سے لیے تھے قرضے
ہم کو یہ بھی نہ رہا یاد خدا خیر کرے

میرا شاگرد سُنا دیتا ہے میری ہی غزل
وہ تو میرا بھی ہے اُستاد خدا خیر کرے

تم نے چھیڑا بھی تو کس شخص کو چھیڑا بیکلؔ
منتری کا ہے وہ داماد خدا خیر کرے

○

زخم کو پھول سے تشبیہ یہ کیا دی تم نے
سو جتن ہم نے کئے زخم سے لالی نہ گئی

وہ بھی محفل کوئی محفل ہے کہ جس میں تیرے ساتھ
جام کا ذکر ہوا، چائے کی پیالی نہ گئی

آندھرا پردیش اسٹیٹ ویر ہاؤسنگ کارپوریشن

"ویرہاؤزنگ بھون"
سکریٹریٹ روڈ، عقب گاندھی بھون
نامپلی - حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

سربراہ کرتے ہیں :

خدمات	تفصیل
۱۔ سائنٹیفک اسٹوریج	ساری ریاست میں ویرہاؤز زنجیر کے ذریعہ۔
۲۔ کریڈٹ سہولتیں	معاملتی عہد نامہ بذریعہ ویرہاؤز رسید۔
۳۔ دیکھ بھال اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں	جمع کرنے والوں کو ان کی درخواست پر حقیقی اور عام اخراجات نگرانی۔
۴۔ آنڈرلی مارکٹنگ (اتفاقی کاروبار)	جمع کنندگان کی طرف سے دیکھ بھال، درجہ بندی، ذخیرہ اندوزی اور اشیائے یا اجناس کی تقسیم کی سہولتیں۔
۵۔ اسٹاک کا بیمہ	آگ یا سیلاب سے نقصان کی صورت میں ضمانت
۶۔ ڈس انفسٹیشن اکسٹنشن سروس	معمولی اخراجات پر کسانوں، تاجروں، کوآپریٹیوز اور سرکاری اداروں کے دروازوں پر۔
۷۔ ذخیرہ اندوزوں کے لیے مقام کا ریزرویشن	ڈپازٹرز کی خواہش پر ذخیرہ اندوزی کے لیے مقام کی گیارنٹی کے ساتھ فراہمی
۸۔ اخراجاتِ ذخیرہ اندوزی پر چھوٹ	کوآپریٹیوز کو 12% ، پروڈیوسرس کو 75% تا بحدِ 20 کنٹل اناج اور تجارتی فصلوں پر چھوٹ۔

شرح دستخط برائے مینجنگ ڈائرکٹر

کہیے تو بونا پارٹ کا شجرہ بتا دوں۔ اس کا سلسلۂ نسب نپولین کے تاریخی بیٹے سے جا ملتا ہے۔ آپ کا دیسی نیم انگریزی بیٹی جس کا شجرہ نہ چھپا۔

ہم : دیکھیے میں آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ بھی کبھی سودیشی تحریک کے سرگرم رکن رہے ہیں۔ آپ رشتہ باہر ڈھونڈنے کی بجائے اگر آپس میں ہی طے کر لیں تو کتنا اچھا ہوگا۔ ویسے بھی اب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے ہیں، اور ہمارے اس رشتے سے مزید خوشگوار ہوں گے جس کا سہرا ہم دونوں کے سر ہوگا جب کہ آپ اپنے بیٹے کو سہرا باندھ کر ہمارے یہاں لائیں، اور سودیشی تحریک کو پھر سے تقویت ملے گی۔

جواد : میاں وہ وقت وقت کی بات ہے۔ سودیشی تحریک گاندھی جی کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ اب جو دیکھو بیرونی ممالک کی اشیاء کا رسیا دکھتا ہے۔ پچھلے دنوں سودیشی تحریک کے شیدائی در آمد شدہ کپڑوں کا بائیکاٹ کیا کرتے تھے۔ وہ سرِ راہ چلتے راہ گیروں کو روکتے اور [illegible] کپڑوں کو دیکھ کر بلیڈ سے کاٹتے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں [illegible] بلیڈ تھے۔ ہم نے پوچھا تو جواب ملا کہ دیسی بلیڈ سے بھلا کب کپڑے پھٹتے ہیں۔

ہم : دیکھیے ہمارے بلیڈ کتنے امن پسند ہیں کہ وہ کاٹنے اور پھاڑنے سے کتراتے ہیں اور تخریبی کارروائیوں میں ان کا دخل نہیں ہوتا۔

جواد : برخوردار۔ اگر بلیڈ اتنے امن پسند ہوں تو پھر جیب کتروں کا اللہ ہی حافظ ہے۔ سنو میرے بونا پارٹ کے لیے بڑے بڑے خاندانوں کی بیٹیوں کے رشتے آ رہے ہیں۔ خدا کے گھوڑے جوڑے کے لیے ہزاروں دینے کے لیے کئی سو لوگ تیار ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ رشتہ نجیب الطرفین میں ہو، عجیب الطرفین میں نہیں۔

ہم : شادی میں لین دین تو نہیں ہونا چاہیے۔ پھر آپ کے بونا پارٹ کے لیے کس بات کی کمی ہے؟

جواد : دیکھو میاں سادگی پرکاری صرف شاعری ہی میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ عملی زندگی میں نہیں۔ میں نے بونا پارٹ کی تربیت کے لیے اسے فرانس کا اتالیق مقرر کیا ہوں۔ میرا بیٹا چاندی کے پلنگ پر سوتا اور سونے کی پیالی میں پیتا ہے۔ کیا میں بدلے میں کچھ نہیں چاہوں گا۔ ظاہر ہے یہ تلافی اس کی شریکِ حیات پوری کرے گی۔ دلہن وہی جو پیا کو دھن لائے۔

ہم : دیکھیے فلاں صاحب کی بیٹی اور بونا اکثر ملتے رہتے ہیں دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں اور . . . .

جواد : یہ سب جھوٹ ہے۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ جال بچھا کر میرے بونا کو پھانس لیا ہے۔ میرا بونا پارٹ کبھی انگریزوں کے نرغے میں نہ آیا تھا اور نہ آئے گا۔ وہ خودکشی کو ترجیح دے گا۔

ہم : چونکہ آپ بیٹے والے ہیں اس لیے اتنی زور سے باتیں کر رہے ہیں اور میں بیٹی والا ہوں اس لیے سب سننا پڑ رہا ہے لیکن . . . . . .

جواد : ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے۔ بیٹے والے زور سے باتیں کرتے ہیں اور بیٹی والے ہمیشہ سنتے رہتے ہیں۔ بیٹی والے دیتے اور بیٹے والے لیتے رہتے ہیں یہ تو دنیا کی ریت ہے۔

ہم : دیکھیے ہم ہندوستانی ہمیشہ بیرونی باشندوں کے لیے دل اور دروازے کھلے رکھتے ہیں یہاں فرانسیسی اور انگریز آتے لیکن ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے کیوں نہ اب اس روایت سے ہٹ کر ایک کام یوں کیا جائے کہ یہ دونوں قوم کے نمائندے ہمیشہ مل کر رہیں اور نئی تاریخ ترتیب دیں۔ بیٹی اور موسیو کے رشتے کے ذریعے ایک نئے [illegible]

موڑ سا آنا نہ ہوگا۔ پھر آپ کو جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم لینے میں خدا اور قانون کا ڈر نہیں ہے؟

جوّاد : جہیز کون مانگ رہا ہے۔ آپ نقدی دیجیے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے آپ کو رشتہ منظور ہو تو رقم لیجیے ورنہ دوسرا دروازہ دیکھیے۔

ہم : دیکھئے میں آپ کو آخری بار کہہ رہا ہوں۔ دو معصوم دلوں کے بیچ آپ چاندی کی دیوار مت اٹھائیے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے کہیں آپ دولت کی حرص میں اپنے اکلوتے بونا پارٹ سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔

جوّاد : میرے بونا پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ میں جہاں اس کا رشتہ طے کروں گا بلا چوں و چرا وہ مان جائے گا۔ وہ بڑا وفادار ہے۔ پھر میں نے اسے سنہری زنجیر میں ایسا باندھا ہے کہ وہ مشکل سے چھٹکارا پائے گا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ موسیو بونا پارٹ کو بسکٹ کھلانا ہے جنھیں وہ اپنے ساتھ سونے کے بسکٹ لائے گا۔

ہم جوّاد کے مکان سے نکل کر سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچے اور انسپکٹر کو ریکارڈ کردہ ٹیپ بجا کر سنایا۔ جو ہم نے تھیلی میں چھپا کر جوّاد صاحب کے یہاں لے گئے تھے۔

تمام گفتگو سن کر انسپکٹر ہمارے ہمراہ پتے والے کے یہاں پہنچے اور پھر پولیس اسٹیشن میں ہماری پنکی اور بونا پارٹ کی شادی بڑی سادگی سے بنا گھوڑے جوڑے اور فضول رسومات کے بغیر ہوئی۔ اس لیے کہ ہمارے معاشرے اور سماج کی فضول اور بے جا رسومات سے بہت نقصان ہو رہا ہے۔

بولتیں جب بت تو [illegible] جز لے ایمان ہو گئیں

سنا ہے ادھر جوّاد اپنے اسٹیشن پتے کی گردن میں باہیں ڈالے رو رہے ہیں اور کوس رہے ہیں کہ پتا تو بے وفا نکلا بیٹے تو اچھا نکلے۔

تو صاحبو یوں ہم نے پتے کو جوّاد صاحب کی سنہری زنجیر سے آزاد کروا کے اسے ازدواجی زنجیر میں باندھ دیا اور یوں ہم قانون کی مدد سے لے آئے۔ [illegible] !

زندہ دلانِ حیدرآباد

کی

۱۷ ویں سالانہ تقاریب کے موقع پر

نیک تمناؤں کے ساتھ

اے۔ ایچ۔ زری والا

لاڈ بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ (انڈیا)

A.H. ZARIWALA

ہمہ اقسام کی دیدہ زیب [illegible] اصل بنارسی و امبرائڈری ساڑیوں کا

[illegible] شو روم

CABLE : "ZARIWALA" Phone : 525232

(یونانی دوا)
زندہ طلسمات
کامیاب اور
بے ضرر علاج!
جس سے ضمنی
اور مضر اثرات
بالکل نہیں ہوتے
ZINDA TILISMATH
MUST BE IN EVERY HOUSE
TRADE MARK 57
Registered No 178
زندہ طلسمات سر درد، کھانسی، زکام سے فوراً
آرام دیتا ہے ___ اور کئی امراض مثلاً پیچش، ہیضہ
فلو وغیرہ کے لئے ___ کامیاب علاج!
تیار کردہ:
کارخانہ زندہ طلسمات
حیدرآباد ۵۰۰۰۱۳

شگوفہ

DECEMBER 1986
Rs. 4-00

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان
ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد
جلد: ۱۹
شمارہ: ۱۲
دسمبر ۱۹۸۶ء
ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم
مینیجر:
سمیع جلیل
مینیجر اعزازی (بمبئی)
فیاض احمد فیضی
سرورق: غوث
کتابت: محمد سلیم، محمد عبدالرؤف
فی پرچہ: -/4 روپے
زرِ سالانہ: چالیس روپے
بیرونی ممالک سے: ایک سو پچیس روپے
طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد۔
خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ، ۱۳۱ چیمبرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس: 557716 فون مکان: 521064

کشمیری قوام

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

شگوفہ کا اگلا شمارہ

سالنامہ

ہوگا

جس میں ہندوپاک کے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کی نثری و شعری تخلیقات شامل ہوں گی۔

- کارٹون ○ لطیفے
- سہ رنگا خوبصورت سرورق
- ضخامت : ۱۱۲ صفحات ○ قیمت : چھ روپے

مجتبیٰ حسین

(سفرنامہ سوویت یونین)

دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ ۔؟

غفور جہاں گستری ہمارے چار روزہ دورۂ ازبکستان میں ہمارے مترجم، منتظم، میزبان ترجمان اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کی خوشگوار صبح کو ان سے ہماری ملاقات ہوٹل ازبکستان کی لابی میں یوں ہوئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے۔ معلوم ہوا کہ سوویت یونین کے سب سے بڑے ادبی اشاعتی مرکز "رادوگا" میں اردو کے ایڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ تعارف کے بعد جب ہم نے ان کا نام پوچھا تو بولے "یہ ہیچمدان اور کمترین عوام الناس میں رخصت اللائیو غفور جہاں گستری کے نام سے شناخت پذیر ہے"۔ سخن گستری سے چونکہ ہمارا پرانا تعلق ہے اسی لیے جہاں گستری کی بات تو سمجھ میں آ گئی لیکن "رخصت اللائیو" کا معمہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ پوچھا "یہ رخصت اللائیو کیا ہے؟" بولے "علم و دانش اور اردو زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے اس ہیچمدان کو ودیعت ہوا ہے اس کی مدد سے خاکسار نے بھی اس "رخصت اللائیو" کے سرچشمہ کی تحقیق و تدقیق کرنے کی سعی و کاوش کی ہے لیکن ناکام و نامراد رہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مشتق کیا ہے؟"

ہم نے کہا "علم و دانش اور زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے ہمیں عطا ہوا ہے اس کے مطابق یہ "رخصت اللائیو" یا تو "رخصت اللہ" یا "رخصت الٰہی" ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ازبک زبان میں رخصت کے کیا معنی ہوتے ہیں ہمارے ہاں رخصت بہت اچھی چیز ہوتی ہے جیسے رخصت اتفاقیہ۔ اور رخصت خاص وغیرہ۔ ہمارے سرکاری ملازمین میں بہت مقبول ہے بلکہ ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ عام فہم زبان میں اسے چھٹی کہتے ہیں لیکن علم فہم زبان تو آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی کیسے آپ کو سمجھائیں۔ ہماری دانست میں رخصت اللہ یا رخصت الٰہی کا عام سا مفہوم یہی ہے کہ یا تو اللہ نے آپ کو چھٹی دے رکھی ہے یا آپ نے اللہ کو ـــــ"

بولے "مہمان گرامی قدر! اس حقیر فقیر بندہ پر تقصیر کے نام کے اسرار و رموز کو جاننے میں آپ اپنی حیات جاوداں کی عزیز ساعتیں اور بیش بہا ذہانتیں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ناچیز کو صرف غفور کہیے۔ آپ کے ہاں بھی یہ چیز ہوتی ہے۔"

ہم نے کہا "غفور نہ صرف ہمارے ہاں ہوتے ہیں بلکہ سارا دنیا میں پائے جاتے ہیں ہمارے حیدرآباد دکن میں

تو غفوروں کی ایک الگ قسم بھی پائی جاتی ہے جسے "ڈبل غفور" کہتے ہیں۔ اس کی توضیح و تشریح ہم نہیں کریں گے کیونکہ ہمیں نہ صرف آپ کی دوستی بلکہ ہند روس دوستی بہت عزیز ہے۔ اس دنیا میں کوئی ساٹھ غفور تو خالص ہمارے دوست ہیں آپ اکسٹھویں غفور ہیں۔ یوروپ میں پانچ غفور ایسے ہیں جو ہمارے دوست ہیں امریکہ میں بھی دو غفور ہمارے دوست ہیں باقی کے غفور سے ہندوستان میں ہیں۔ وسط ایشیاء میں کوئی غفور ہمارا دوست نہیں تھا اب خدا نے آپ کو اس منصب جلیلہ پر فائز کیا ہے۔"

ہماری بات کو سن کر غفور جہاں گستری نے خالص لکھنوی انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا "آپ کی ذرہ نوازی، غفور شناسی اور غفور پروری کا شکریہ مگر ہم اصل موضوع سے روگردانی کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے آپ کا رسمی طور پر استقبال اور خیر مقدم کرنے کا زرین اور نادر موقع عنایت کیجئے آپ نے ازبکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت و توقیر میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لیے میں سالم و کامل صمیم قلب کے ساتھ آپ کی خدمت اقدس میں اپنے شخصی اور ازبک عوام کے عمومی جذبات تہنیت و تشکر و تبریک پیش کرتا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف" ہمارے ہندوستانی ہمسفر پروفیسر اشتیاق عابدی نے دبی زبان میں ہم سے پوچھا:

"مجتبیٰ بھائی! یہ غفور صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "بڑی تکلیف کے ساتھ کتابی اردو میں ہمارا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔" اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ اگر ازبکی زبان میں کوئی ہم سے بات کرتا تو غفور جہاں گستری "طلسم ہوشربا" والی اردو میں اس کا ترجمہ ہمارے لیے کرتے اور بعد میں ہم غفور گستری کی اردو کا ترجمہ خود اپنی اردو میں اشتیاق عابدی کے لیے کرتے تھے۔ پتہ نہیں غفور گستری نے یہ اردو کہاں سے سیکھی اور کیسے سیکھی۔ اردو کے ایسے مشکل، ثقیل اور متروک الفاظ جنہیں پچھلے چالیس برس میں ہم نے نہ کہیں سنا نہ پڑھا نہ لکھا، انہیں غفور جہاں گستری کی وساطت سے ازبکستان میں سننے اور برتنے کا موقع ملا۔ ان سے مل کر نہ صرف اردو کا مستقبل روشن نظر آیا بلکہ اس کا ماضی تو اتنا روشن نظر آیا کہ ہماری بصارت اور بصیرت دونوں چکا چوند ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف فیض احمد فیض سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ ان سے گھنٹوں اپنی مخصوص اردو میں تبادلہ خیال بھی کیا ہے۔ ہم نے کہا "ہمیں پتہ ہے کہ آپ فیض احمد فیض سے مل چکے ہیں۔"

گہرے تجسس کے ساتھ پوچھا "آپ پر یہ حقیقت کیسے منکشف ہوئی کہ خاکسار فیض احمد فیض کی دلنواز صحبت خاص سے مستفیض و فیضیاب ہو چکا ہے؟" ہم نے کہا "فیض کی شاعری پر آپ کی اردو کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ آخر عمر میں بڑی مشکل شاعری کرنے لگے تھے آپ سے نہ ملتے تو ان کی شاعری میں یہ موڑ کہاں سے آتا۔"

نظریں جھکا کر اور قدرے شرما کر بولے "آپ کی غفور نوازی کا شکریہ۔"

چار دن ازبکستان میں ان کے اور ان کی اردو کے ساتھ ایسے گزرے کہ ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ پہلے دن تاشقند کی سیر کرا کے رات کو وہ اپنے گھر چلے گئے تو اشتیاق عابدی نے ہم سے کہا "اب آپ اپنے بستر استراحت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں تاکہ نیند آپ کو اپنی پرسکون آغوش میں سمیٹ لے اور آپ اس جہان فانی کے آلام و مصائب و نیز افکار و حوادث سے عرصہ مختصر کے لیے ہی سہی رستگاری حاصل کر سکیں۔"

ہم نے ہنس کر کہا "فیض کی شاعری کے بعد اب آپ کی نثر بھی غفور جہاں گستری کی اردو سے متاثر ہونے لگی

ہے۔ عابدی صاحب سچ تو یہ ہے کہ غفور جہاں گستری سے مل کر ہمیں بے ساختہ بیل کی والدہ کا یاد آرہا ہے۔"

اشتیاق عابدی نے حیرت سے پوچھا "بیل کی والدہ! یہ کیا قصہ ہے؟" ہم نے کہا "یہ قصہ نہیں بلکہ برسوں پرانا ہے آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تلگو کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اس کام کے لیے ایک تلگو ادیب کا انتخاب کیا گیا جو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے جب ترجمہ ہو گیا تو اس کا مسودہ نظر ثانی کے لیے ہمارے پاس آیا۔ نہایت فصیح و بلیغ ترجمہ تھا۔ ایک المیہ افسانہ تھا جس میں ایک غریب کسان کی زندگی کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کہانی میں کسان کا نوجوان بیل مر جاتا ہے۔ منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ نوجوان بیل مر چکا ہے۔ ایک طرف بیل کی نعش پڑی ہے۔ دوسری طرف کسان اداس بیٹھا ہے اور تیسری طرف گائے بھی اداس کھڑی ہے جس نے اس بیل کو جنم دیا تھا۔ افسانے کا یہ موڑ نہایت متاثر کن تھا لیکن مترجم نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اس منظر کو اپنی عالمانہ اردو میں یوں بیان کیا تھا "ایک طرف تو نوجوان اور نوخیز بیل کی نعش بے گور و کفن پڑی تھی، دوسری طرف رنجور و ملول کسان بیٹھا تھا اور تیسری طرف بیل کی والدہ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔" دوسرے دن مترجم موصوف مکتہ ترجمہ کے بارے میں ہماری رائے جاننے کے لیے آئے تو ہم نے کہا "ترجمہ تو نہایت فصیح و بلیغ ہے پسند آیا لیکن ایک افسانہ میں بیل کی والدہ کا ذکر ہے اس طرز تخاطب پر ذرا نظر ثانی کرلیں تو مناسب ہے۔"

تیسرے دن وہ ترجمہ پر نظر ثانی کرکے ہمارے پاس آئے ہم نے بیل کی والدہ والا صفحہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب کی بار فاضل مترجم نے "بیل کی والدہ" کو کاٹ کر "بیل کی والدۂ محترمہ و معظمہ" بنا دیا تھا۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ بات غفور جہاں گستری کی ہو رہی تھی۔ جتنی مشکل اردو وہ بولتے تھے اتنے ہی سادہ انسان وہ ہمیں نظر آئے جیسا کہ عام طور پر سارے غفور ہوتے ہیں۔ نہایت معصوم، مخلص بے ریا، ملنسار اور شریف تاشقند جاکر ہمیں یہ پتہ چلا کہ غفور چاہے ہندوستان میں رہیں یا یورپ میں یا وسط ایشیاء میں سب ایک جیسے ہوتے ہیں اسی لیے تو ہم مذاق مذاق میں انہیں یہ نیا نعرہ دے آئے ہیں کہ "دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ۔"

ان کی پابندی وقت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ صبح ۸ بجے آنے کے لیے کہا جائے تو ٹھیک ۷ بجکر ۵۹ منٹ پر دروازے پر ان کی دستک سنائی دیتی تھی چونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم ادیب ہیں اسی لیے ایسی جگہوں پر لے جاتے تھے جو ادیبوں کی دلچسپی کا سبب بنیں۔

پہلے دن لینن چوک کی سیر کرا چکے تو کہنے لگے کہ اب میں آپ کو باغ شعراء لے چلتا ہوں جو علی شیر نوائی تھیٹر کے آگے واقع ہے۔"

ہم نے کہا "غفور صاحب! مانا کہ ہم ادیب ہیں لیکن شاعروں سے نہ صرف گھبراتے ہیں بلکہ ان سے [illegible] بچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں سوویت یونین کا دورہ بھی اسی لیے کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لیے ہی سہی اپنے وطن کے شاعروں سے ہماری جان چھوٹے اور ہم مکرر ارشاد اور سبحان اللہ کہنے سے بچے رہیں۔ آپ تو ہمیں [illegible] "باغ شعراء" میں لے جا رہے ہیں کہیں کوئی شاعر نے ہمیں کلام سنا دیا تو؟ اور اگر اس کا کوئی شعر غلطی سے سمجھ میں آگیا تو؟"

غفور جہاں گستری بولے "آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ میں آپ کو ان مردہ شاعروں کے پاس لے جا رہا ہوں [illegible]"

ہم نے پوچھا "کیا مطلب؟"

بولے "باغ شعراء" میں آپ کو زندہ شاعر نہیں ملیں گے اس باغ میں تو ازبکستان کے [illegible]

شاعروں کے مجسمے آپ کو دیکھنے کو ملیں گے۔"

ہم نے کہا "کیا آپ کے ہاں بھی پانی کی اتنی قلت ہوتی ہے کہ حکومت ہم جیسے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے نصب کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے؟"

بولے "ازبکستان میں فی الحال تو پانی کی قلت نہیں ہے لیکن کسی زمانے میں ازبکستان میں پانی اتنا نایاب ہوا کرتا تھا کہ ہمارے لوک ادب میں پانی کے ایک قطرہ کو موتی کے ایک دانہ سے زیادہ قیمتی بتایا جاتا تھا۔ لیکن مجتبیٰ صاحب میری سمجھ میں ایک بات نہ آئی پانی کی قلت سے ادیبوں کے مجسموں کا کیا تعلق ہے؟"

ہم نے کہا "بہت گہرا تعلق ہے ہمارے ہاں جب بھی پانی کی قلت ہو جاتی ہے تو حکومت عوام کی پیاس بجھانے اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے کھڑے کر دیتی ہے چنانچہ ہندوستان میں ہمارا تعلق جس ریاست سے ہے وہاں لوگ بوند بوند پانی کے لیے ترس رہے ہیں اور حکومت عوام پر فنکاروں کے مجسموں کی بارش برسا رہی ہے۔ ہماری ریاستی حکومت کا خیال ہے کہ جب سارے فنکاروں کے مجسمے نصب ہو جائیں گے تو ان حساس فنکاروں کے مجسموں کی آنکھوں سے عوام کی بے بسی اور مجبوری پر اتنے آنسو بہہ نکلیں گے کہ ساری ریاست میں سیلاب آ جائے گا۔"

غفور جہاں گستری کی کچھ سمجھ میں نہ آیا آسان بات یوں بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بولے "ہماری حکومت عوام کا کلیجہ اس طرح ٹھنڈا نہیں کرتی۔ خیر میں آپ کے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا ہو سکتا ہے کہ آپ کی ریاستی سرکار ٹھیک ہی کر رہی ہو۔"

خیر تھوڑی دیر بعد ہم "باغ شعراء" میں تھے ایسی خوبصورت اور پُر فضا جگہ ہے کہ ہم جیسے شاعر دشمن کا جی بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہونے لگا۔ شاعروں کے کیسے باوقار اور پُر شکوہ مجسمے ہیں۔ علی شیر نوائی۔ لطفی۔ نادرہ۔ مولانا مقیمی۔ ظہیر الدین فرقت۔ حکیم زادہ نیازی۔ عبداللہ قادری۔ حمید عالم جان۔ غفور غلام اور موسیٰ ایک اپنے اپنے ڈھنگ سے کھڑے فکر شعر میں محو ہیں۔ ایک گوشہ میں بڑی سی پگڑی باندھے ایک مجسمہ کھڑا تھا ہم نے پوچھا "آپ کی تعریف ــــ؟"

غفور جہاں گستری بولے "یہ بابر ہے بابر۔ ازبکستان کا عالم اور شاعر۔ اس کے "بابر نامہ" کا ذکر آپ نے سنا ہوگا؟"

یہ سنتے ہی ہمارا سر تعظیماً جھک گیا اور ہم نے غفور جہاں گستری سے کہا "غفور صاحب! خبردار! با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔ آپ جس بابر کا یوں سرسری ذکر کر رہے ہیں وہ ہمارے سلطان ابن سلطان، خاقان ابن خاقان، بانیٔ سلطنت مغلیہ، گیتی پناہ شہنشاہ ہندوستان ظلِ سبحانی اعلیٰحضرت ظہیر الدین محمد بابر ہیں۔ کم از کم ان کا نام تو احترام سے لیجئے یہ ہمارے حکمراں رہ چکے ہیں۔"

غفور جہاں گستری بولے "ہوں گے آپ کے حکمراں مگر یہاں تو بابر دلوں پر حکمرانی کرتا ہے اس کے شعر کا سکہ چلتا ہے اور اس کے علم کا ڈنکا بجتا ہے۔"

سوویت یونین میں ادیبوں اور فنکاروں کی جو عزت ہے اسے دیکھ کر ہم کچھ اور بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں شاہراہیں ان کے نام سے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں فنکاروں کے نام سے منسوب ہیں۔ تاشقند کے کئی

اسٹیشنوں کے نام شاعروں اور ادیبوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ہم نے غفور جہاں گستری سے پوچھا "اتنے ویڈیکل اور ثقافتی مجسموں کی تیاری پر کتنا خرچ آتا ہوگا؟" بولے "ایک ایک مجسمہ پر کئی کئی ہزار روبل خرچ آتا ہے"۔

ہم نے کہا "اگر آپ از راہِ ادب نوازی ہمیں بھی روزانہ صرف دس روبل دیا کریں تو ہم خود بہ نفسِ نفیس بطورِ مجسمہ آپ کے باغ شعراء میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں اتنا سستا مجسمہ آپ کو نہیں ملے گا۔"

ہمیں غفور جہاں گستری پر اُس وقت غصّہ آیا جب اُنھوں نے ہماری پیشکش کو ہنس کر ٹال دیا۔ بولے: "اپنے ملک میں پانی کی قلت کی دُعا کیجیے، ہوسکتا ہے کہ ایک دن خود آپ کے شہر میں آپ کا مجسمہ کھڑا ہو جائے"۔ اور ہم نے بات کو کاٹ کر کہا "جس پر تھکے ماندے پرندے بیٹھ کر بیٹ کرتے رہیں گے"۔

اس بار اشتیاق عابدی کو اور ہمیں ایک بڑے ڈبل بیڈ کمرہ میں ٹھیرایا گیا ہم تو حسبِ عادت گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ صبح ۵ بجے ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اشتیاق عابدی اپنے بستر میں پڑے ہند روس دوستی کے موضوع پر بہ آوازِ بلند تقریر کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا ہمیں یہ بھوتا جان کر یہ چوری چوری اپنی تقریر کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں بڑی آہستگی کے ساتھ میز پر سے قلم اور کاغذ اٹھایا اور لگے ان کی تقریر کے اہم نکات کو نوٹ کرنے۔ اشتیاق عابدی کہے چلے جا رہے تھے: "ہند روس دوستی کے بغیر عالمی امن کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ روس کی دوستی وقت کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی دوستی ہے۔ سوویٹ یونین نے کب کب اور کہاں کہاں اور کیسے کیسے کٹھن وقتوں میں ہماری مدد کی ہے ——— میری اماں۔ میری اماں" (کراہنے کی آواز)۔

"——— سوویت یونین ہمارا سب سے گہرا دوست ہے۔ میری اماں۔ میری اماں" تقریر تو ان کی بہت مدلل اور اثر انگیز تھی مگر یہ درمیان میں میری اماں میری اماں کی تکرار سے ہمیں تشویش سی ہوئی دبے پاؤں اُن کے قریب جاکر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے ہم نے جلتے ہوئے توے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہم نے انھیں جگانے کی کوشش کی تو ایک عجیب سی بحرانی کیفیت میں پوچھا "کون ہے؟"

ہم نے کہا "آپ کا دوست ہوں مجتبیٰ ———؟"

کروٹ بدلتے ہوئے بولے "کوئی مجتبیٰ میرا دوست نہیں ہے سوویت یونین ہی میرا واحد دوست ہے۔ مجھے سوویت یونین کی دوستی پر فخر ہے میری اماں ——— میری اماں"۔

ہم نے تاڑ لیا کہ معاملہ سنگین ہوگیا ہے۔ دیارِ غیر میں کس سے مدد طلب کریں اور طلب کریں بھی تو کس زبان میں۔ ہم جس زبان میں اپنا مدعا یا مرض کی کیفیتیں بیان کرتے ہیں اس کے جاننے والے تو غفور جہاں گستری ہی تھے جو دو ڈھائی گھنٹوں بعد آئیں گے۔ ہندوستان سے ہم مختلف النوع امراض کی جو دوائیں اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ اشتیاق عابدی کو دیں مگر ان کی ہند روس دوستی میں کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ آخر میں تو امریکہ کو کھلم کھلا گالیاں تک دینے لگے۔ ٹھیک سات بج کر اٹھ منٹ پر غفور جہاں گستری آئے تو ہم نے انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ سنتے ہی غفور جہاں گستری پسینہ میں شرابور ہوگئے چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ ہم نے انھیں تھام لیا اور کہا "ہمارے ہاں آداب بیمار داری ایسے نہیں ہوتے بیمار کو کمفرٹ دینا چاہیے"۔ غفور جہاں گستری ہمارے ہماری کوئی بات سنے بغیر اچانک کمرہ سے چلے گئے۔ پانچ ہی منٹ بعد ۔۔۔ عالمہ لیڈی ڈاکٹروں تین عدد مردوں اور ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے اشتیاق عابدی کا معائنہ شروع کردیا تو یہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولے:

میں نے سارے انتظامات کر لیے ہیں۔ نیچے ایمبولنس گاڑی بھی ایستادہ ہے۔"

ہم نے کہا "اور اس کے بعد کے انتظامات کے بارے میں بھی کہہ دیا ہوگا؟" انھوں نے ہماری بات سنی ان سنی کردی۔ انھیں ہماری بات سننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ اشتیاق عابدی سے [illegible] لیڈی ڈاکٹروں نے ان کے دونوں کولہوں پر دو انجکشن داغ دیئے اور کہا کہ دو گھنٹے کے اندر اندر اگر انھیں پسینہ آگیا تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پروگرام کے مطابق دس بجے ادارۂ شرقیات میں ہمارا خیر مقدم تھا۔ نرس کو اشتیاق عابدی کے پاس چھوڑ کر ہم اکیلے ہی سوئے مقتل چلے۔ اشتیاق عابدی سے کہا "آپ فکر نہ کریں ہم سنبھال لیں گے ہندوستان کی طرف سے اچھی سی تقریر بھی کر دیں گے رات کو آپ کی تقریر تو ہم نے سن ہی لی ہے۔ اس میں سے میری اماں میری اماں۔ کو نکال کر باقی تقریر کر دیں گے۔

دو گھنٹے بعد ہم واپس آئے تو اشتیاق عابدی بدستور تقریر کیے جا رہے تھے اور پسینہ کا دور دور تک پتہ نہیں تھا اب غفور جہاں گستری کی پریشانی بے قابو ہو گئی اور وہ پسینہ میں شرابور ہونے لگے وحشت سے بولے "شومیٔ قسمت سے یہ بہت برا ہو رہا ہے ہم تاشقند میں ہندوستانی مہمانوں کے تعلق سے بہت فکرمند رہتے ہیں اگر عابدی صاحب کو فوراً پسینہ نہ آیا تو ہم انھیں ماسکو نہیں جانے دیں گے یہیں ہسپتال میں داخل کر دیں گے آپ ماسکو چلے جائیے یوں بھی ان کا تاشقند سے ہندوستان واپس جانا زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان کے ماسکو سے ہندوستان جانے کے۔"

یہ سنتے ہی اشتیاق عابدی رضائی پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے جسم سے پسینہ کا وہ سیلاب امڈا کہ اسی سے غسل صحت فرمانے لگے۔ معصومیت میں لپٹی ہوئی غفور جہاں گستری کی سچ بات کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اشتیاق عابدی کو پسینہ میں شرابور دیکھ کر غفور جہاں گستری کے چہرے پر سکون و مسرت کے وہ آثار دکھائی دیئے جو عموماً ایک بچہ کو جنم دینے کے بعد ماں کے چہرے پر دکھائی دیتے ہیں۔

[زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا]

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

(قسط ۵)

ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور

ابنارمل لوگ: یہاں میں نے سینکڑوں لوگوں سے بھرے ہوئے ایک ہال میں دیکھا کہ اسٹیج پر دو شخص چوکڑی مار کر بیٹھے تھے اور وہ لوگوں کو طبلے کی تھاپ پر آہ و زاری کرکے دکھاتے تھے۔ ان بیچاروں کے چہرے کرب سے کھنچے ہوئے تھے اور وہ حلق سے ایسی آوازیں نکال رہے تھے جیسی آوازیں بکرے کو ذبح کرتے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہیں میرے لیے زیادہ افسوسناک امر یہ تھا کہ ان اذیت پسند ناظرین کے لیے یہ آہ و بکا شِل موسیقی کے تھی اور وہ اسے "پکا راگ" کا نام دیتے تھے۔ مجھے یہ لوگ خاصے ابنارمل لگے!

دیدہ دلیری: یہاں ایک دانشور نے ایک دوست کے حوالے سے اپنی ایک کتاب مجھے عنایت کی اور کہا کہ اس اردو داں دوست کی مدد سے میں اسے انگریزی میں ترجمہ کر دوں۔ اس کھاتے پیتے دانشور نے متذکرہ کام کے لیے مجھے خاصی معقول رقم کی پیشکش کی اور ظاہر ہے میں نے یہ پیش کش قبول کرلی کیونکہ مجھے پردیس میں پیسے کی ضرورت تھی، مگر چند ابواب کے مطالعے کے بعد میں نے یہ کتاب بصد معذرت واپس کردی اور اپنے اس معاون دوست کو بتایا کہ اس کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کتاب پہلے ہی انگریزی سے ترجمہ شدہ ہے۔ میں متذکرہ دانشور کی اس دیدہ دلیری پر بہت پریشان تھا تاہم مجھے بتایا گیا کہ ایسی صورتِ حال کو یہاں "توارد" کہا جاتا ہے۔

جینے کا قرینہ: میرے نزدیک لاہوریوں کی شخصیت کا خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ان کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ کے پھول کھلے رہتے ہیں۔ میں نے انھیں کبھی منہ بسورے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی اس قومی خصوصیت کو بڑے سے بڑے سانحے پر بھی برقرار رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں کے ایک اخبار میں کسی بڑے المیے پر ایک احتجاجی جلوس کی تصویر دیکھی جس کے نیچے یہ کیپشن درج تھا کہ "غیظ و غضب سے بھرے ہوئے عوام اپنے غم و غصّہ کا اظہار کر رہے ہیں"، اور تصویر میں جو لوگ نظر آ رہے تھے ان میں سے بیشتر کیمرے کی طرف منہ کرکے ہنس رہے تھے۔ جس قوم کے افراد بڑے سے بڑے صدمے کو یوں ہنسی خوشی برداشت کرنے کا قرینہ جانتے ہوں اسے کبھی زوال نہیں آ سکتا۔

نظریاتی جھگڑا: ایلوس پریسلے اتنا مقبول فنکار تھا کہ ایک بار وہ اپنی سفید کار باہر کھڑی کر کے شاپنگ کے لیے ایک دکان میں گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کی پرستار لڑکیوں نے اس کی سفید کار چوم چوم کر لپ اسٹک سے سُرخ کر دی تھی۔ میں نے یہ واقعہ دورانِ گفتگو یہاں کے ایک مقبول فنکار کو سنایا تو اس نے بتایا کہ یہاں بھی فنکاروں سے ان کے پرستاروں کی محبت کا یہی عالم ہے چنانچہ اس ضمن میں اس نے اپنا حوالہ دیا اور بتایا کہ ایک بار وہ اپنی سُرخ کار باہر کھڑی کر کے شاپنگ کے لیے ایک دکان میں گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے پرستاروں نے اس کی سُرخ کار کھرچ کھرچ کر سفید کر دی تھی۔ ممکن ہے یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہو، مگر یہ فنکار اس واقعہ سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا میں اس سے متفق نہیں ہوں کہ میرے خیال میں یہاں بھی لوگ فنکاروں کی پوری طرح قدر کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ واقعہ کسی نظریاتی گروہ کے [illegible] کے نتیجے میں عمل میں آیا ہو کیونکہ یہاں کسی کے سُرخ یا سبز ہونے کا اندازہ اس کی کار کے سُرخ یا سبز ہونے سے لگایا جاتا ہے۔

قائد سے والہانہ محبت: یہاں کے لوگ اپنے عظیم قائد مسٹر جناح سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ اپنی اس عقیدت کے اظہار کے طور پر انہوں نے ایک روپے سے لے کر سو روپے کے کرنسی نوٹ پر قائد کی تصویر چھاپ رکھی ہے اور وہ "قائد کی تصویروں والے ان کرنسی نوٹوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں چنانچہ میں نے انہیں اس کے حصول کے لیے پانی کی طرح ایک دوسرے کا خون بہاتے دیکھا۔

آرٹ کے گراں قدر نمونے: لاہور تہذیب و فن کا مرکز ہے، چنانچہ ملک بھر سے مختلف فنون کے ماہر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ آرٹ کے جن نمونوں کو ہمارے ہاں قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں ناقدین زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ لاہور میں اس آرٹ کے ماہرین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور اس ضمن میں زیادہ عجیب پہلو یہ ہے کہ اس کے لیے یہ لوگ رنگ، برش یا کینوس استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے انہوں نے ایک انوکھا طریقہ دریافت کیا ہے، وہ درخت کا ایک پتہ منہ میں رکھتے ہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد چلتے چلتے سڑک پر پچکاری سی مارتے ہیں جس سے چشم زدن میں خوبصورت بیل بوٹے بن جاتے ہیں ان لوگوں کو اپنے اس فن کے ساتھ اس قدر وابستگی اور اتنی شدید محبت ہے کہ انہیں خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ بسا اوقات وہ موٹر سائیکل پر سوار یا چلتی کار کی کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر پچکاری مار دیتے ہیں، جس سے کسی راہ گیر کی سفید قمیص پر خوبصورت گل بوٹے بن جاتے ہیں۔ میں نے آرٹ کے یہ گرانقدر نمونے سڑکوں اور دیواروں کے علاوہ بلند و بالا عمارتوں کے زینوں اور ان کے کونے کھدروں میں خصوصاً بہت دیکھے!

شراب پر پابندی: میں جن دنوں پاکستان میں تھا وہاں شراب پر پابندی تھی، البتہ میرے لیے یہ امر انتہائی حیرت انگیز تھا کہ اس پابندی سے بیئر نہ صرف یہ کہ مستثنیٰ تھی بلکہ یہ کھلے بندوں فروخت ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے بعض پادری بھی اسے پیتے تھے اور پھر سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرتے تھے، میں نے پہلی بار سخت گرمیوں کے موسم میں لاہور کے ایک مشہور علاقے بھاٹی گیٹ میں اس بیئر کا ایک گلاس پیا۔ بیئر سفید رنگ کی ہوتی ہے، دہی سے تیار ہوتی ہے اور اسے گاہک کے سامنے کشید کیا جاتا ہے۔ دنیا کی یہ واحد

بیئر ہے جس میں پانی حل ہو جاتا ہے تاہم میں نے اسے نشے میں ہر بیئر سے بہتر پایا۔ اس کا ایک گلاس پینے سے جسم ڈھیلا پڑنا شروع ہو جاتا ہے اور ایک عجیب طرح کی غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ لاہوریے صبح شام یہ بیئر پیتے ہیں، چنانچہ صبح سے شام تک اونگھتے رہتے ہیں!

ایک روشن پہلو: لاہور والوں کی زندگی کا ایک اور پہلو مجھے بہت روشن لگا اور وہ ان کا ایک دوسرے کے لیے زبردست گرم جوشی اور محبت کا جذبہ ہے۔ اپنے اس جذبے کو برقرار اور مستحکم رکھنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ میں نے متعدد بار دیکھا کہ کار میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے اپنے کسی دوست کو قریب سے اوورٹیک کرتے دیکھا تو اس نے ہارن بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر ان دونوں نے بے پناہ ٹریفک کے باوجود اپنی کاروں کو وہیں بریک لگائی اور دروازہ کھول کر سڑک کے بیچ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے! اس کے نتیجے میں میں نے بعض اوقات بہت ہولناک حادثے بھی ہوتے دیکھے۔ پیچھے آنے والے لوگوں کو بڑبڑاتے بھی دیکھا، مگر لاہوریے ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ افسوس ہم لوگ ان جذبوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں!

صحافت کی آزادی: اپنے دورۂ لاہور کے دوران میں نے ایک صحافی سے آزادیٔ صحافت کے بارے میں بات کی تو اس نے کہا اللہ کا فضل ہے، پاکستان میں صحافیوں کو بہت سہولتیں حاصل ہیں۔ میں نے اس کی تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ "ہمیں ریلوے ٹکٹ میں ساٹھ فیصد تک رعایت دی گئی تھی، پی آئی اے والے پچاس فیصد رعایت دیتے ہیں، سینما کی ٹکٹ میں بھی خاصی رعایت ہے بلکہ اس کے فری پاس آسانی مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت گاہے گاہے مختلف رہائشی اسکیموں میں ہمیں پلاٹ الاٹ کرتی رہتی ہے۔ نیز صحافیوں کے لیے غیر ملکی دوروں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے، غرض یہ کہ اللہ کا فضل ہے ہمیں یہاں خاصی سہولتیں حاصل ہیں۔"

تصویر کا دوسرا رخ: تاہم اس صحافی کی ان باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی کیونکہ مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان میں صحافیوں کی معاشی حالت بھی تسلی بخش نہیں ہے ان میں سے بیشتر تو تنگی ترشی میں گزارہ کر لیتے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں اخبار کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی دھندہ کرنا پڑتا ہے، چنانچہ کوئی فیکٹری چلاتا ہے کسی نے پریس لگایا ہوا ہے، کوئی ٹھیکیداری کرتا ہے اور کوئی اپنے پیشے کی حدود ہی میں رہنے کے خیال سے شائع ہونے والی خبریں اپنے اخبار میں دے دیتا ہے اور باقی سی آئی ڈی والوں کو دے دیتا ہے۔

تصویر کا ایک اور رخ: اس ضمن میں تصویر کا ایک اور رُخ یہ بھی ہے کہ کچھ صحافی آزادیٔ صحافت کے لیے سر دھڑ کی بازی بھی لگاتے ہیں اور اس قسم کے جانباز حکومت کے زیرِ اہتمام چلنے والے اخباروں میں بھی موجود ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس طرح کے ایک حریت پسند کو انتظامیہ نے سزا کے طور پر کوئی اخباری ذمہ داری سونپنے کی بجائے اسے ایک طرح سے فالتو قرار دے دیا اور یوں اس سے صحافتی کام لینا ترک کر دیا۔ چنانچہ وہ پہلی تاریخ کو صرف تنخواہ وصول کرنے دفتر آتا تھا۔ ایک دفعہ اس صحافی کے ایک دوست نے اسے تنخواہ کے ساتھ اوور ٹائم بھی وصول کرتے پایا تو وہ بہت حیران ہوا اور اس نے پوچھا "یار یہ تم اوور ٹائم کس چیز کا لیتے ہو؟" اس پر اس حریت پسند صحافی نے جواب دیا "جس چیز کی تنخواہ لیتا ہوں۔"

ڈسمبر ۸۲ء

ایک انکشاف : پاکستان میں قیام کے دوران مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا وہ یہ کہ نیوز ویک، ٹائم گارڈ اور اس طرح کے بڑے بڑے ہفت روزوں اور روزناموں میں لکھنے والے مغربی صحافی پاکستان کے مختلف اخبارات میں بھی قلمی ناموں سے مضامین اور سیاسی تبصرے لکھتے ہیں۔ یہ راز مجھ پر اس وقت منکشف ہوا جب میں نے یہاں کے اردو اخبارات میں شائع ہونے والے سیاسی تبصرے اور بعض دیگر مضامین ایک مقامی دوست سے ترجمہ کرواکر سنے۔ اس پر میں انگشت بدنداں رہ گیا اور میں نے مضمون نگاروں کے نام پوچھے تو اس نے سب پاکستانی نام بتائے جو یقیناً ان مغربی صحافیوں کے قلمی نام ہوں گے کیونکہ میں ہوبہو یہی مضامین ان کے اصلی ناموں کے ساتھ مغربی پرچوں میں پڑھ چکا تھا۔ خدا جانے انھیں یہاں ان کا ترجمہ اپنے قلمی ناموں کے ساتھ چھپوانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ میرے لیے انتہائی حیرت انگیز امر یہ بھی تھا کہ بسا اوقات یہاں کے اخبارات میں بین الاقوامی صورت حال پر شائع ہونے والے اداریے بھی انہی کے لکھے ہوئے تھے۔ سرپرائزنگ ویری سرپرائزنگ!

بین الاقوامی بھائی چارہ : مجھے یہاں کے صحافیوں کے ایک طبقے میں بلکہ بعض ادیبوں اور دانشوروں میں بھی جو ایک انتہائی خوش آئند چیز نظر آئی وہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی بھائی چارے، امن دوستی اور بقائے باہمی کے اصولوں پر بہت پختہ ایمان رکھتے ہیں اور صرف ایمان ہی نہیں رکھتے ان زریں اصولوں پر کاربند بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے انہیں مختلف سفارت خانوں میں آتے جاتے دیکھا اور سفارت کاروں سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار پائے۔ خیرسگالی کی یہ فضا ایک طرفہ نہیں تھی بلکہ یہ سفارت کار بھی ان کے گھروں میں آتے جاتے تھے اور ان کے لیے بوتلیں اور ان کے بچوں کے لیے چوسنیاں اور تحفے تحائف لاتے تھے۔ یہ فضا اتنی خوشگوار تھی کہ پاکستانی صحافی ادیب اور دانشور بھی جب چاہتے ان کے ہاں چلے جاتے اور سگریٹ یا شراب میں سے جس چیز کی طلب ہوتی بلا تکلف بیان کرتے اور کارٹنوں اور کریٹوں کے حساب سے اپنے ساتھ بھی لاتے۔ پاکستانی صحافیوں اور ادیبوں کے اس مخصوص طبقے اور مختلف سفارت کاروں کے مابین خوشگوار تعلقات کا یہ عالم تھا کہ یہ سفارت کار بین الاقوامی بھائی چارے، امن، دوستی اور عوام سے تعلقات مستحکم کرنے والے منصوبوں میں ان کا ہاتھ بٹانے اور دامے، درمے اور سخنے بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ یہ عظیم لوگ ہیں یا تھنگ آف فاریم۔

کیش کی وصولی : لاہور کے بینکوں میں کیش کی وصولی کے دو طریقے ہیں۔ ایک چیک دے کر دوسرا کیشیر کو پستول دکھا کر! دوسرا طریقہ عوام میں زیادہ مقبول ہے کیوں کہ یہاں کے بینکوں میں چیک دے کر رقم کیش کرانے میں خاصا وقت لگتا ہے۔

غربت کی ایک مثال : پاکستان میں غربت اور افلاس بہت زیادہ ہے۔ اتنی سائنسی ترقی کے باوجود ہزاروں لوگ درختوں کی چھال کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ یہ میں کوئی سنی سنائی بات نہیں کر رہا بلکہ اس طرح کے بیسیوں مناظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ لاہور میں قیام کے دوران میں روزانہ ایک قریبی پارک میں صبح کی سیر کے لیے جایا کرتا تھا وہاں میں نے بے شمار لوگوں کو دیکھا کہ وہ کسی درخت کی ایک شاخ کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک مقامی دوست سے میں نے اس کا ذکر کیا تو اس نے ملک میں ... نے والی غربت پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا کہ یہ لوگ درخت کی شاخ نہیں کھا رہے بلکہ اس سے مسواک (ٹوتھ برش) ... تھے۔ یہ سن کر میں مصلحتاً خاموش ہوگیا ورنہ مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا کیونکہ میں نے صبح کی سیر کے دوران

کئی لوگ ایسے بھی دیکھے تھے جو ہاتھ میں پکڑی ہوئی آدھی سے زیادہ شاخ کھا چکے تھے اور باقی بس تھوڑی سی رہ گئی تھی۔

ایک انڈو پاک مشاعرہ : میں نے یہاں ایک انڈو پاک مشاعرے میں بھی شرکت کی جس میں پاکستان کے علاوہ بھارت کے بہت سے شعراء نے بھی اپنا کلام سنایا جس سے مجھے احساس ہوا کہ دونوں ملکوں میں ثقافتی تعاون روزافزوں ہے تاہم مشاعرے کے بعد جب میں نے اپنے اس دوست کے سامنے (جو مجھے یہاں لایا تھا) متذکرہ خیال کا اظہار کیا تو وہ بہت ہنسا اور اس نے کہا 'یہ جو تم مختلف شاعروں کے ناموں کے آخر میں امروہوی، مرادآبادی، جالندھری، لکھنوی، دہلوی اور امرتسری وغیرہ کے الفاظ سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ یہ شعراء اس مشاعرے میں شرکت کے لیے انڈیا سے آئے ہیں تو معاملہ یوں نہیں ہے، دراصل ان شعراء نے دہلوی اور لکھنوی وغیرہ کے الفاظ یونہی شو، شا کے لیے اپنے ساتھ ٹانکے ہوئے ہیں، ورنہ یہ سب پاکستانی ہیں اور ۱۹۴۷ء میں بھارت سے مستقلاً ہجرت کر کے یہیں آباد ہو چکے ہیں۔

ناک چھدوانا، دانت نکلوانا : لاہور اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں لڑکیاں اپنے کان اور ناک چھدواتی ہیں۔ لاہور کے ایک مشہور تجارتی مرکز بانو بازار میں سے گزرتے ہوئے میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، ایک بہت خوبصورت لڑکی اپنی ناک چھدوا رہی تھی اور مارے درد کے آنسو اس کی آنکھ سے بہہ کر خاموشی سے اس کے رخساروں پر پھیلتے جا رہے تھے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر کوفت ہوئی مگر میرا گائیڈ اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میں نے اس بے موقع ہنسی کی وجہ پوچھی تو اس نے دکان میں آویزاں ایک تختی کی عبارت کا ترجمہ مجھے سنایا۔ اس تختی پر لکھا تھا "یہاں ناک اور کان بغیر درد کے چھیدے جاتے ہیں"۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ یہاں ٹرینوں اور بسوں میں کئی لوگ انگشتِ شہادت (دائیں ہاتھ کی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی) سے بغیر درد کے دانت بھی نکالتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ یہ منظر بھی دیکھا تھا مگر آخر میں دانت نکلوانے والے نے تنگ آکر دانت نکالنے والے کے دانت نکال دیئے تھے۔

ایک مہم جو نوجوان : یہ جس بانو بازار کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے یہ بازار بالکل نہیں ہے بلکہ ایک تنگ سی گلی ہے جس میں سے گزرنا محال ہو جاتا ہے اور اس میں عموماً خواتین ہی شاپنگ کے لیے آتی ہیں جن میں سے بیشتر نے یہاں کی روایت کے مطابق چوٹیاں (بالوں کو بل دے کر باندھنا) کی ہوتی ہیں تاہم میں نے چند نوجوانوں کو بھی یہاں گھومتے دیکھا لیکن میں نے انہیں خریداری کرتے نہیں پایا۔ بس وہ عورتوں کے ہجوم میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے گزرتے چلے جاتے تھے۔ یہ غالباً مہم جو نوجوان ہیں اور یہاں چوٹیاں سر کرنے کے لیے آتے ہیں!

غزلیں

رشید عبدالسمیع جلیل

یہ سوچا ہی نہیں ہم نے کہ دیوانی کا کیا ہوگا؟
ہمیشہ جینس ہی پہنیں تو شیروانی کا کیا ہوگا؟

نگاہیں بولتی دیکھیں، زبانیں چپ سی سنیں ہم نے
رہا یہ سلسلہ قائم تو جنبانی کا کیا ہوگا؟

خبر یہ ہے کہ بعد از عقد غائب ہے کہیں نوشہ
ولیمہ ملتوی ٹھیرا تو بریانی کا کیا ہوگا؟

ستم اس کو نہیں کہتے توازن اس کو کہتے ہیں
اُدھر سیلاب آیا ہے اِدھر پانی کا کیا ہوگا؟

حکومت بھی ظرافت میں نظر آتی ہے اب یکتا
ذرا سی یم سے یہ پوچھیں کہ اسرانی کا کیا ہوگا؟

نئی نسلیں کریں قبضہ اگر کہنہ اداروں پر
تو پہلے فیصلہ ہو موسس دیانی کا کیا ہوگا؟

ملازم ہی ہوا بیٹا نہ رشتہ ہی ہوا کچھ طے
پڑی ہے فکر اماں کو میاں جانی کا کیا ہوگا؟

کمشنر پے روِیژن ہیز ریکمنڈڈ دی نیو اسکیلس
نہ ہو گر فائدہ کچھ بھی تو "بورانی" کا کیا ہوگا؟

نہ بھولو ہم، نہ دارا سنگھ، فقط اک سخنی مچھر
جو ہم میدان میں اُتریں پہلوانی کا کیا ہوگا؟

سیاست میں جلیل اک دن ہر اک مہرے کو پٹنا ہے
یہ جب طے ہے تو غیرت ہائے انسانی کا کیا ہوگا؟

○

فرید سحر

کس قدر آج ہے چمچوں کی ضرورت سمجھو
چاپلوسی میں نہاں کتنی ہے عزت سمجھو

مثل مشہور ہے بیکاری سے بیگار بھلی
ایسی بیگار کو ہر حال غنیمت سمجھو

زندگی میں تم اگر نام کمانا چاہو
چمچہ بننے ہی کو اب خوبیٔ قسمت سمجھو

کون چمچہ نہیں اس شعرۂ عالم پہ میاں
چمچہ بننے کو مگر زیست کی قیمت سمجھو

کوئی لیڈر کا ہے چمچہ تو کوئی لیڈی کا
نوکری کرتے ہوئے اس کو حقیقت سمجھو

کوئی چمچوں پہ اگر طنز کرے تو یارو!
کم نظر سمجھو اُسے قابلِ نفرت سمجھو

سحر ہو جائے گا ہر دیکھنے والے پہ سحر
چاپلوسی میں نہاں کتنی ہے قوت سمجھو

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار

اقبال کے مردِ مومن سے انٹرویو

چند روز ہوئے کڑاھی گوشت کھانے ایک مشہور معروف ہوٹل گئے۔ کاؤنٹر کے نزدیک ہی ایک میز پر بیٹھے اور آرڈر دے دیا۔ ہال کو ایک نظر دیکھا۔ بہت سے گوشت خور لوگ بیٹھے تھے۔ بڑی بڑی توندوں والے۔ جسموں پر بڑھیا سوٹ چڑھائے۔ بڑے بڑے آفیسراں۔ چھوٹے چھوٹے دفتروں میں کام کرنے والے اور "بڑی کمائیاں" کرنے والے کلرک۔ پولیس کے سپاہی اور اس ہجوم میں یقیناً کچھ واپڈا کے بدعنوان اہلکار بھی ہوں گے جو ابھی تک جبری ریٹائر نہ ہوئے ہوں۔ انہی سوچوں میں مگن تھے کہ کسی نے پوچھا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں" ایک ادھیڑ عمر صاحب کھڑے تھے ہاتھ میں سیمو نائٹ بریف کیس سا روشن چہرہ طبیعت میں بلا کا سکون۔

"بسر و چشم" ہم نے کہا۔ تو بلا تکلف بیٹھ گئے۔

"آپ کی تعریف" ہم سے پوچھا

"ایک دردِ دل رکھنے والا کثیر القومی پاکستانی" ہم نے بوٹی کی بجائے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

"اور آپ کا تعارف"

"میں اکثر اوقات اپنی اصل کسی کو نہیں بتاتا لیکن آپ ایک محبِ وطن جوان ہیں اس لیے بتائے دیتا ہوں۔ اقبال کے مردِ مومن کا نام تو سنا ہوگا"

"ہاں جی! پڑھا بھی ہے"

"خاکسار کو آپ اقبال کا مردِ مومن کہہ سکتے ہیں"

"ہاں! یہ کیا کہہ رہے ہیں" ہمارا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور جھجکتے اُن کا حدود اربعہ پوچھنے لگے۔

"آپ کے والد کا نام"

"پیرِ مغاں"

"والدہ کا کیا نام ہے"

"اُمتِ مرحوم"

اب تو آنکھیں بھی حیرت سے پھیل چکی تھیں اور اسی عالم میں سوال کیا۔

"کتنے بچے ہیں"

"ایک ہی بچہ ہے۔ میں اُسے بچہ ارجمند کہتا ہوں جو مُغل سے کسی طرح کمتر نہیں۔"

"یہ آپ ہاتھ میں بڑا فیشن ایبل بریف کیس پکڑے ہوئے ہیں اس میں کیا ہے؟"

"اس میں میرا سازو سامان ہے یعنی رختِ سفر۔ اقبالؒ کے زمانے میں تو میرا سامان صرف ایک پوٹلی میں آجاتا تھا۔ بڑی آسانی رہتی تھی کبھی طرابلس کے شہیدوں کے پاس جانا کبھی فلسطین کبھی خلافتِ عثمانیہ کے سلسلے میں سفر در سفر کبھی قائدِ اعظم کے ساتھ ساتھ جلسے جلوسوں میں شرکت۔ آج کل اکثر مجھے بڑے بڑے لوگوں کے خبثِ باطن کو سٹڈی کرنے کے لیے ھلٹن یا انٹرکانٹی نینٹل جانا ہوتا ہے پھر پچھلے دنوں ٹی وی پر سمیسونائٹ کا اچھا سا اشتہار بھی نظر پڑا تو میں نے پوٹلی کی جگہ یہ بریف کیس خرید لیا۔"

ہم نے انھیں کڑاھی گوشت کھانے کی دعوت دی جو کمال بے نیازی سے رد کر دی گئی۔ فرمانے لگے۔

"میرا کھانا تم عامی لوگوں سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ ایک پیکٹ سا بریف کیس سے نکالا جس میں سے ٹکی سی چیز برآمد ہوئی۔ اشتیاق سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے حضرت!"

کہنے لگے "یہ نانِ جویں ہے میں اکثر یہی کھاتا ہوں بعد میں ذرا سی آبِ جو کی مقدار نوش کرتا ہوں۔"

بریف کیس ابھی تک ادھ کھلا میز پر پڑا تھا کچھ عجیب و غریب سی چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہمارے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ یہ اُن کے انواع و اقسام کے اوزار ہیں جو فرائضِ منصبی سرانجام دینے میں مددگار رہتے ہیں۔

ڈرتے ڈرتے ہم نے فرمائش کی "یہ اوزار دکھائیں گے؟"

بڑی شفقت آمیز مسکراہٹ جس میں خلوص کی بھی کافی ملاوٹ تھی بکھیرتے ہوئے۔ ایک ایک چیز نکال کر دکھانا شروع کیا۔ ایک لمبا سا شیشے کا آلہ تھا جس پر کئی کالم بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے یہ رشوتو میٹر ہے۔ یہ کسی ایسے آدمی کی بغل میں لگاؤ جو وہاں چھُری نہ رکھتا ہو تو اس میں پارے کے اُتار چڑھاؤ سے فوراً پتہ چل جائے گا کہ آج اس نے دفتر میں "چائے پانی" کے نام سے کتنے نوٹ وصول کئے۔"

"یہ میرے پاس ایک کیلکولیٹر ہے۔"

"اس سے کیا کرتے ہیں"

"آدمیوں کے سر پر چپکاتا ہوں تو" اس کی سکرین پر اعداد و شمار روشن ہو جاتے ہیں جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ زیرِ مشاہدہ آدمی کی عقل پر کتنے پردے پڑے ہوئے ہیں۔"

ہم نے ذرا آگے جھانک کر دیکھا بریف کیس کے ایک کونے میں سوئیوں کا بنڈل پڑا تھا۔

انھوں نے ایک سوئی اُٹھائی اور ساتھ گلاس سلائیڈ پکڑ دی۔ کہنے لگے جس شخص کے عادات و اطوار کا تجزیہ کرنا چاہوں اس سوئی کو انگشت میں چبھوتا ہوں اور خون کا سیمپل بھر لیتا ہوں پھر قیصر سلطانی کے گنبد پر بیٹھ کر اپنی عقابی نگاہوں سے نیابتِ الٰہی والی خوردبین میں خون کے اجزاء کا مطالعہ کرتا ہوں بلکہ گہرا مطالعہ کرتا ہوں۔

کہ اس میں فراڈ بازی کے کتنے ذرّات موجود ہیں کیوں کہ فریب اور جھوٹ اب ہمارے دورانِ خون میں شامل ہو گیا ہے۔"

"اور جناب وہ سُرخ سی چوکور ڈبیا کس مقصد کے لیے ہے؟"

"ہاں! 'یہ آلۂ احساسِ زیاں' ہے اس کو بڑی رازداری اور چابکدستی سے استعمال کرتا ہوں جس سے بھی گلے ملوں اس آلے کو اپنے مقابل کے سینے سے مَس کر کے خوب بھینچتا ہوں بعد ازاں اس پر ریڈنگ دیکھ لیتا ہوں کہ اُس شخص کے دل میں قومی انحطاط کا کتنا احساس ہے؟"

"آپ کتنے بھائی ہیں" ہم نے اُن کے خاندان کے بارے میں پوچھا۔

میرے دو بھائی اور ہیں۔ مردِ ناداں اور مردِ فقیر۔"

"کیا کرتے ہیں" ہم نے انھیں پھر کُریدا۔

"مردِ ناداں تو کرتا کماتا کچھ نہیں تھا۔ میں پیار سے سمجھاتا رہتا تھا لیکن کلامِ نرم و نازک اُس پر بے اثر رہتا تھا آخر روز روز کی چیخ پکار سن کر وہ تنگ آ گیا اور کسی کمپنی کی وساطت سے دوبئی چلا گیا۔"

"آپ کے دوسرے بھائی مردِ فقیر کیا کرتے ہیں؟"

"وہ آج کل ایک منصوبے پر ریسرچ کر رہے ہیں پہلے وہ بھی نکھٹو تھے ایک صبح میرے پاس آئے۔ بڑے دلبرداشتہ تھے کہنے لگے کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر جا رہا ہوں۔ کہ طویل بے روزگاری سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور یاد دلایا کہ آ قبالؔ تو آپ کو داراو سکندر سے اولیٰ بلکہ اولیٰ تر خیال کرتے تھے چلیے میں آپ کو تیار کرتا ہوں انھیں اچھا سا بھڑکیلا سوٹ پہنایا سفوفِ گرمیِ قلب و جگر کھلایا کئی قسموں کے پرفیوم اُن پر چھڑکے اور دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیا۔

وہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے مینجر سے ملے کوئی صاحب دل آدمی تھا۔ بڑے تپاک سے ملا انھیں چاروں طرف سے سونگھتا رہا پھر سوچ سوچ کر کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے (اپنی کنپٹی پر) بولا:

"آپ کہیں مَردِ فقیر تو نہیں ہیں۔ آپ میں سے بوئے اسداللہی آ رہی ہے۔"

"ہاں ہاں آپ نے صحیح پہچانا"

"پھر مجھے کام مل جائے گا نا"

مینجر نے ایک آہِ سرد بھری اور کہا "یہ تو مشکل ہے۔"

"کیوں"؟

"اس لیے کہ عقابوں کے نشیمن میں کچھ جگہیں خالی تھیں وہاں زاغوں نے سیٹ سنبھال کر میزوں پر فائلیں رکھیں اور اپنے دفتری اوقات میں کام شروع کر دیا ہے۔ گو جرانوالہ شہر میں بھی کچھ سیٹیں خالی تھیں۔ ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کی سفارش پر اُن جگہوں کے لیے شیخِ مکتب اور پیرانِ حرم کو تعینات کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔"

"اچھا پھر کیا ہوا" ہم نے تجسّس سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ میرا دلبرِ گفور دستی مَردِ فقیر صاحب تھکے ماندے گھر آئے اور کلاہِ فقر اتار کر کھونٹے پر ٹانگ دیا۔ پھر سوچ سوچ کر ایک منصوبہ پر کام شروع کیا۔

"وہ کیا؟"

"آج کل اُن پردہ نشینوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں جو ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے رہتے ہیں۔"

"ہم اگر انھیں ملنا چاہیں تو کہاں پائیں گے۔"

"وہ محلہ قلزمِ افکار میں ضربِ کلیمی والی گلی میں رہتے ہیں۔"

ابھی اُن سے کچھ اور پوچھنے والے تھے کہ ایک خوش پوش نوجوان ہماری میز کے پاس سے باہر کی طرف جاتے ہوئے گزرے۔ مردِ مومن صاحب نے بریف کیس ایک جھٹکے سے بند کیا۔ رشوتو میٹر ہاتھ میں لیا اور اُن کے پیچھے لپکے پیچھے سے آواز دینا خلافِ ادب تھا۔ ہم نے جلدی جلدی بل ادا کیا اور بقایا وصول کرنے کو موقوف کرتے ہوئے باہر دوڑے لیکن وہ کہیں بھی نہ مل سکے۔ اب ہاتھ ملنے سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا کاش اُن سے اُن کی رہائش کا پتہ ہی پوچھ لیتے۔ اچانک ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ مردِ فقیر کا پتہ تو وہ بتا گئے تھے۔

دوسرے ہی روز اپنے سبھی کام اُلٹے سیدھے سمیٹ کر محلہ قلزمِ افکار پہنچ گئے۔ گھر کا بھی آسانی سے پتہ چل گیا لیکن صدر دروازے پر کال بیل نہیں تھی ہاں نوٹ لکھا ہوا تھا، "مردِ فقیر سے ملنے کے لیے کال بیل کی بجائے تھوڑی سی آہ و فغاں کیجیے۔"

بے یقینی کی کیفیت میں دو تین بار سرد آہ بھری تو اندر کہیں میوزک بیل بجنے کی آواز آئی۔ کچھ توقف کے بعد ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ سفید کرتہ پاجامہ پہنے سوکھا مڑا چہرہ لیکن آنکھوں میں اک انجانی چمک۔

"مجھے مردِ فقیر صاحب سے ملنا ہے۔"

"آیئے تشریف لایئے" اور میرا ہاتھ مصافحہ کے لیے دبایا تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی معاً یاد آیا کہ مردِ فقیر میں سیرتِ فولاد بھی تو ہوگی اسی لیے ہاتھ سخت محسوس ہوا۔

ہم نے چھوٹتے ہی کہا، "مردِ مومن صاحب کہاں ملیں گے؟"

"صبر کریں۔ ملاقات ہو جائے گی۔ میرا کمرۂ تحقیق و تفتیش نہیں دیکھیے گا؟"

"ضرور ضرور،" ہم نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"پہلے پیپسی کولا پیئیں پھر آپ کو لیبارٹری لے چلوں گا۔"

کچھ دیر بعد ہی ہم اُن کی لیبارٹری میں رکھی الماریوں کو دیکھ رہے تھے۔ بہت سی بوتلیں ایک قطار میں تھیں جن پر لیبل لگے ہوئے تھے جیسے اسرارِ جہانگیری، میراثِ سلمانی، سرمایۂ ملت اور گرمیِ احرار وغیرہ۔

ایک طرف بڑی سی کمان پڑی تھی۔ مردِ فقیر نے بتایا کہ جب سالہا سال پیشتر وہ ایک جوانِ رعنا تھے اور اُن [illegible] حضرتِ اقبال بھی حیات تھے تو ستاروں پر اسی کمان سے تیر پھینکا تھا اور یہ جو پاس کشکول نظر آ رہا ہے [illegible] ستاروں پہ ڈالا کرتا تھا جو مجھے اقبال کی محبت کی وجہ بنی۔ چلتے چلتے ٹھوکر سی لگی تو دیکھا فرش اُس [illegible] سے اکھڑا ہوا تھا بعد میں پتہ چلا کہ مردِ فقیر نے اسی جگہ ایک دن زور سے ضربِ کلیم لگائی تھی۔

مردِ فقیر ایک دراز میں سے پڑیا نکال کر لائے کوئی مٹی سے ملتی جلتی چیز تھی بتلانے لگے [illegible] خاک [illegible] جس کا ذرہ ذرہ معصوم ہے۔ دائیں طرف دیوار پر کئی رنگوں کے لباس لٹکے ہوئے تھے اُن کے متعلق کہنے

تھے کہ دراصل وہ اقبال کے خیالات کو عملی جامہ بلکہ عملی پاجامہ پہنانا چاہتے تھے اس لیے یہ اودے اودے نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن گارمنٹس کی ایک فرم سے منگواکر رکھے ہوئے ہیں، اُسی وقت کہیں سے ایک لنگڑاتا ہوا مُرغا برآمد ہوا۔

ہم نے کہا " اس مرغک بے چارہ کا یہ جانے کونسا گناہ ہے جس کی مکافات بھگت رہا ہے؟"

بتایا گیا کہ اسے شاہین بنانا چاہتے تھے کچھ دن اس نے بڑی اونچی اُڑان بھی کی اچھا بھلا مرغِ صحرا بن گیا تھا لیکن لذت پرواز حق نہ سہہ سکا۔ شاید کم ظرف تھا۔ انہی دنوں نشاط سینما میں پنجابی فلم فندی کی کامیاب نمائش جاری تھی۔ مٹی شو دیکھنے چلا گیا پھر ایسا چسکا پڑا کہ " مولا جٹ" بھی دیکھی اور " وحشی جٹ" بھی۔ افسوس صد افسوس ہوا کہ یہ سلطان راہی کی فلک شگاف بڑھکیں تو سُنتا رہا لیکن فطرت کے اشارات نہ دیکھ سکا۔

لیبارٹری سے واپس ڈرائنگ روم کی طرف چلے تو مردِ فقیر نے ایک زقند بھری اور سامنے والے دروازے میں پہنچ گئے۔ اس حرکت کے متعلق پوچھا تو فرمانے لگے۔

" یہ عشق کی ایک جست تھی۔ اقبال اکثر مجھ سے یہ جست قصہ تمام طے کرنے کے ضمن میں مروا تے تھے اب وہ تو نہیں رہے لیکن مجھے یہ جست لگانے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

اُن سے رخصت ہوتے وقت پھر اصرار کیا کہ مردِ مومن کہاں ملیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سارا دن ہوش وخرد اور قلب ونظر شکار کرنے کے بعد مقامِ شوق والے بس اسٹاپ پر مل سکیں گے جہاں سے وہ گھر کو لوٹتے ہیں۔

آتشِ ملاقات اس قدر تند وتیز تھی کہ اُسی دن سرِ شام مقامِ شوق والے بس اسٹاپ پر پہنچ گئے۔ کافی دیر انتظار کرتے گزر گئی کہ اچانک وہ سامنے سے باوقار چال چلتے نظر آئے۔ میں محبت سے آگے بڑھا وہ بھی خوشی سے ملے۔ جلدی میں تھے۔ گھر کا پتہ دریافت کیا تو کہنے لگے

کوچہ پیچ وتابِ رازی پوچھ لینا اس میں گلی سوز وسازِ رومی ہے وہاں مکان نمبر چار کی طرف بے خطر کود پڑنا۔ راستے میں پڑنے والے سبھی گھروں کے سامنے سے سیلِ تندرو کی مانند گزرتے جانا۔ راستے میں ایک جگہ قیدِ مقام آئے گا وہاں سے بھی جوئے نغمہ خواں کی طرح خراٹے بھرتے ہوئے بھاگ لینا۔

" لیکن جوئے نغمہ خواں تو ہلکی رفتار سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گزرتی تھی" ہم نے درمیان میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

" نہیں میری مُراد اقبالؒ کے زمانے والے نغمے نہیں جو دھیمے سُروں میں آہستہ آہستہ گائے جاتے تھے۔ جب میں نغمہ خواں کہتا ہوں تو مُراد جدید دور کے نغمے ہوتے ہیں جیسے ڈسکو گانے اور پوپ میوزک وغیرہ۔ ہاں تو مکان نمبر چار کے ساتھ ہی ہمارا دو منزلہ گھر ہے۔ جہاں میں پچھلے سو سال سے موجود ہوں اُس پر بورڈ لگا ہوا دیکھ لینا۔ سفید روشنائی سے لکھا ہے گا " خودی کی منزل"۔

صاف وخوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھی جانے والی تخلیقات ہی اشاعت کے لیے قابلِ غور ہوسکیں گی۔

مفلس قاردنی

لفنگوں کو نوازا جارہا ہے
ہمیں ٹھینگا دِکھایا جارہا ہے
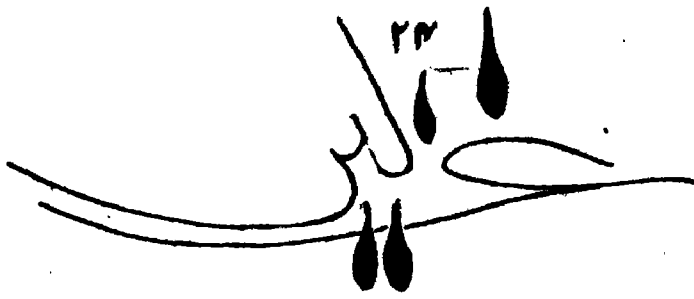
مسلسل مُنہ چِڑایا جارہا ہے
مجھے غصّہ دِلایا جارہا ہے

تھما کر ڈگڈگی بندر کے ہاتھوں
مداری کو نچایا جارہا ہے

ملن کا مجھ سے وعدہ کر رہے ہو
مجھے اُلّو بنایا جارہا ہے

اناج اُگتا ہے جتنا کھیتوں میں
بڑی توندوں پہ لادا جارہا ہے

نکموں کو بٹھا کر مسندوں پر
ہمیں نیچا دِکھایا جارہا ہے

سیاست ایک کرتب ہے کہ ہر پل
نیا کرتب دِکھایا جارہا ہے

بہ فیضِ چاپلوسی ہر جگہ اب
ہمارا رنگ جمتا جارہا ہے

یہ کیا شے ہے ذرا ہم بھی تو دیکھیں
وہ کیا ہے جو چھپایا جارہا ہے

چڑھی ہیں ہر طرف بحثوں کی دیگیں
سیاست کو بگھارا جارہا ہے

مزے خود لُوٹ کے جنّت کے ہم کو
جہنم سے ڈرایا جارہا ہے

کہیں دھریت کوی سمّیلنوں میں
کہیں ملہار گایا جارہا ہے

○

شاطر گورکھپوری

آج کل اہلِ سخن کی اس قدر بھرمار ہے
دیکھئے جس کو وہی غالب کا برخوردار ہے

لاکھ کوئی ماہرِ فن ہو مگر بے کار ہے
ریڈیو پر جو غزل گائے وہی فن کار ہے

میں نے جب شکوہ کیا بڑھتی ہوئی مہنگائی کا
ڈانٹ کر بولے 'ایبے چپ' اپنی ہی سرکار ہے

وہ "اشک" کہنے لگے ہیں عشق کو بھی ان دنوں
شاید ان کا چاہنے والا کوئی سردار ہے

اس لیے میں کھا رہا ہوں دربدر کی ٹھوکریں
اپنی قسمت کا ستارہ آج کل دمدار ہے

دِل کا سودا کیجئے گا اُس سے اتنا سوچ کر
کاروبارِ عشق میں شاطر بڑا ہشیار ہے

ڈاکٹر لئیق صلاح (گلبرگہ)

بے فکری سے "سونا" بھی بڑی دولت ہے!

لوگوں نے "جاگو" "جاگو" کہہ کر خواہ مخواہ ہمیں پریشان کیا۔ شاید انھیں اس کا پتہ نہیں کہ "جاگو" کے بعد "بھاگو" "بھاگو" کی نوبت آتی ہے۔ اس خطرے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سوتے رہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ سونے کے کتنے فائدے ہیں؟ "سونا" کتنا قیمتی لفظ ہے؟ اسے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہ جانے کس قدر مصیبتوں سے نمٹتے ہیں؟ قابلِ رحم ہیں وہ افراد جنھوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر "ہائے میرا لنگ نیست، ملکِ خدا تنگ نیست" کو سچ کر دکھایا ہے، نہ زبان سے واقفیت اور نہ ماحول و تہذیب کا انداز۔ بس اسی قدر جانتے ہیں کہ وہاں "سونا" ہے۔ اور اپنے دیش کی مٹی کے "سونا" اگلنے والی بات کو غلط ٹھہرا گئے ہیں۔

ہم کو سوچنے کی فرصت ملی تو خیال ہوا کہ کہیں سچ مچ "الہ دین کا چراغ" ایک عرصے بعد وجود میں تو نہیں آگیا؟ اپنی بستی میں، شاید اب اسی لیے کوئی "گھرڈو ساب" اور "مدھار ساب" ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتے۔ اور نہ ہی وہ کھپریل کی چھت اور مٹی سے لیپے ہوئے فرش (جن سے سوندھی سوندھی خوشبوئیں نکلا کرتی تھیں) ہی نظر آتے ہیں۔ ہمارا مکان جو کبھی لاتے میں ماڈرن (جرمن ڈزائن) کہلاتا تھا۔ اب ان آر سی سی کے نئے مکانوں کے سامنے دقیانوسی دکھائی دینے لگا۔ پتہ نہیں وہ "گھرڈو ساب" اور "مدھار ساب" کہاں روپوش ہو گئے؟ یہاں تو صرف شیخ یا سید ہیں۔ ہم "علی بابا اور چالیس چور" کے قاسم کی طرح، بس اسی فکر میں لگے رہے کہ "گھرڈو ساب" اور "مدھار ساب" کی دولت کا راز پائیں۔ ہماری پوچھ گچھ پر کسی نے کہا کہ یہ سب "سونے" کا کرشمہ ہے۔

بہر حال! ہم "سونے" کی کرامت کے قائل ہو گئے۔ اور غور کرنے لگے "سونا" یعنی دھات اور "سونا" یعنی استراحت میں کون واقعی قابلِ ترجیح ہے؟ بزرگوں نے لفظ "سونا" کے تعلق سے کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ لغات کا جائزہ لیا تو "خوابِ شیریں" اور "خوابِ خرگوش" والی ترکیبیں نظر آئیں۔ اور پھر ذہن کی مختلف پرتوں سے کچھ حکایتیں بھی تاک جھانک کرنے لگیں۔ مثلاً "کچھوا اور خرگوش" کی حکایت۔ جس میں کچھوا باوجود آہستہ خرامی کے آگے بڑھ گیا۔ اس کی تعریف تو صرف بچوں کی نصیحت کی خاطر کی جاتی ہے۔ دراصل خرگوش نے شہرت پائی اور "خوابِ خرگوش" مشہورِ زمانہ ہو گیا۔ یہ تو ادنیٰ سی مثال ہے۔ "اصحابِ کہف" کے واقعے پر غور فرمائیے۔ اگر وہ طویل عرصے تک سوئے نہ ہوتے تو پیغمبروں کے ساتھ اُن کا ذکرِ خیر کیسے ہوتا؟

ہم تاریخ کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچے کہ قدیم دَور میں "ہندوستان کو "سونے" کی چڑیا کہا جاتا تھا" اور سومناتھ کے مندر میں "سونے" کا بت بھی تھا۔ غالباً اسی لیے کالے اور گورے کا فرق کیے بغیر، لوگ ترکِ وطن پر آمادہ ہوئے اور یہاں آکر ایسے بسے کہ ہندوستانی اپنے آپ کو غریب الوطن سمجھنے لگے۔ اور اب ان تمام واقعات کا شمار بھولی بسری یادوں میں ہونے لگا ہے۔

"سونے" کا ذکر "KING MIDAS" کی کہانی کے بغیر کچھ ادھورا سا لگتا ہے اُس نے بس ایک ہی خواہش کی تھی کہ جس چیز کو چھو لے "سونا" ہو جائے۔ وہ طلوع اور غروب کے وقت آفتاب کی کرنیں دیکھ کر کہتا "کاش! یہ بھی "سونا" ہوتیں۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں "ایسی ہی تمنا ہمارے دل میں بھی کروٹیں بلکہ "کلا ٹیں" لینے لگی بچپن میں جن کہانیوں کو سُنا کرتے تھے، وہ اس دَور میں بالکل فطری محسوس ہوتی تھیں ان میں "GOLDEN KING" کی کہانی ہماری من پسند کہانی تھی۔ جس میں "سونے کی چڑیا" اور "سونے کے سیب" کا ذکر تھا۔ کہانی جب آگے بڑھتی تو پتہ چلتا کہ "سونے کے گھوڑے" کی زین بھی سونے کی تھی اور ہاں "سونے کی چڑیا" کا پنجرہ بھی "سونے" کا تھا۔ کہانی کار نے اپنی جدت کے مظاہرہ کے لیے ایک شرط یہ رکھی کہ سونے کی چڑیا کو سونے کے پنجرے کے ساتھ لیجائیں، ورنہ چڑیا شور مچائے گی۔ (چور مچائے شور نہیں) اور لے جانے والا پکڑا جائے گا۔ اسی طرح بے جان "سونے" کا گھوڑا، "سونے" کی زین استعمال کرتے ہی اپنے اصلی روپ کو ظاہر کر دے گا۔ ادب کے گمبھیر نقاد، بھی جو کہ اس کہانی کا تجزیہ کرنا چاہیں تو ممکن ہے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔ کیونکہ چڑیا اور گھوڑے کی نفسیات بڑی مبہم ہے۔ اس کہانی نے غور و فکر کے رُخ کو ایک نئی راہ دکھائی یعنی یہ کہ رشتے ناتے کے تعلق سے لڑکی اور لڑکے والوں کے درمیان چند شرائط اسی طرح کی ہوا کرتی ہیں۔ لڑکی خوب رو ہو تو جہیز کم دیا جائے اور قبول صورت نہ ہو تو، روٹی، کپڑا اور مکان کی نعمتیں بھی مہیا کی جائیں۔ یعنی لڑکی ملازم صاحبِ جائداد ہو تو معقول (یا حسب خواہش) جوڑے کی رقم دی جائے۔ اندھا چاہے دو آنکھ والا محاورہ سمجھنے میں اب کوئی دشواری نہ ہوئی۔

ہاں! "سونا" یعنی "خواب" کے بارے میں، عظیم نقاد فرائڈ کے نظریئے کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ جس نے کافی تحقیق و جستجو کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "خواب" ہماری نامکمل خواہشات کی تفسیر و تعبیر ہے ہم تو ایسے بنا پیسوں کی فلم کہتے رہیں۔ اور اس نعمت کے میسر آنے پر یقیناً خوش ہونا چاہیئے۔ کیونکہ چند ایسے بھی ہستیاں ہیں جنھیں "خواب" نظر نہیں آتے۔ اُن کی پراگندہ مزاجی اپنی زندگی ہی کو دیوانے کا خواب سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ویسے اب فلم سے لطف اندوز ہونے کے لیے تھیٹر جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ وہ قابلِ قدر نعمت T.V. کی شکل میں میسر آ گئی ہے۔ مگر اس دور کے لوگ پہلے کے ان لوں کی طرح فراخ دل نہیں رہے۔ پچھلے زمانے میں اگر کسی کے یہاں اس قسم کی تفریح کا اہتمام ہوتا، تو اہلِ خانہ تماشا بینوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے بناء ستائش ہی کو وہ صلہ سمجھتے۔ لیکن آج حالات بدل گئے ہیں ٹی وی فلموں کا نرخ مقرر ہو گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ دیکھنے والے بھی بڑے باذوق ہیں، ان شرائط سے اُن کی حوصلہ شکنی نہیں ہوئی ٹکٹ کی ادائیگی تو معمولی بات ہے وہ بیٹھنے جگہ نہ ہو تو کھڑکی اور دریچے کے مختلف گوشوں سے تاک جھانک کر دیکھنا بھی غنیمت جانتے ہیں۔ اب ایسے افراد کو مفت فلم دیکھنے کے لیے مل جائے تو اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ وہ فلم "خواب" ہی کی صورت میں نظر آتا ہے۔

پچھلے چند سالوں سے، اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ جو باتیں بڑے، بوڑھوں سے سنا کرتے تھے اور جن کے بارے میں کچھ وہم ہوا کرتا تھا بقول شخصے ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں۔ وہ خواب حقیقت بن کر ہماری دید کے منتظر ہو گئے ہیں۔ خدا نے باہر کے ملکوں میں کمانے والوں کی آمدنی میں اس قدر برکت دی ہے کہ وہ بزرگوں کی پیروی، کسی اور بات میں نہ سہی، تقاریب منعقد کرنے کے سلسلے میں تو ضرور کرنے لگے ہیں۔ یہ اگر کہیں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ بڑوں کی روحیں عالم بالا میں، نہ صرف تہ و بالا، بلکہ پھڑکنے لگی ہیں کہ کاش! دوسرا جنم ملتا تو ہم ان کے مقابل ہوتے، اور مسابقت کا بازار گرم کرتے۔ ان تقاریب کی وجہ سے خدا کی اس مخلوق کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے جنھیں ہم سپلائینگ کمپنی والوں، زیور اور ملبوسات کے تاجروں، پھول والوں، مراثنوں اور نوبت والوں کے بھیس میں دیکھتے ہیں۔ وہ حیدرآباد جہاں ہم نے اپنی زندگی کے مشرق سے ابھرتے ہوئے پہلے سورج کو دیکھا تھا، وہ کتنے نشیب و فراز سے گزر چکا ہے آباؤ اجداد کی ڈیوڑھیاں، آج شادی خانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اب یہ نہ صرف "شادی خانے" ہیں بلکہ سپلائینگ کمپنی کا مرکز بن گئے ہیں۔ تقریب سے متعلق تمام سامان یہاں دستیاب ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تجہیز و تکفین کے مرکز پر جانے کے بعد کہیں اور جانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ شادی خانے اس کثرت سے ہیں کہ ساتھ میں رقعہ نہ ہو تو بجائے ایک شادی کے دوسری شادی میں پہنچنے کا امکان یقینی ہے۔ آج کل شادی خانوں کی اہمیت اس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ دولہا، دلہن کے والدین اپنی قدر و قیمت کھو چکے ہیں۔ شادی کی تاریخ دونوں فریقین کی طرف سے نہیں بلکہ شادی خانے کے مالک کی طرف سے طے پاتی ہے۔ شادی خانے کا مالک جب یہ بتلاتا ہے کہ فلاں تاریخ اور فلاں دن شادی خانہ مل سکتا ہے تو اسی تاریخ پر شادی منعقد کی جاتی ہے۔ ابھی تو معاملہ دن اور تاریخ کا ہے آگے تو وقت کا تعین بھی وہی کریں گے اور شبھ گھڑی کی طرح کسی کو صبح چار بجے کا وقت دیا جائے گا تو دوسروں کو رات بارہ بجے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رئیس نے کسی مزدور کو بے فکری سے سوتے دیکھ کر، یہ تمنا کی تھی کہ کاش! وہ اس کی تمام دولت لے لے اور اپنی نیند اسے دے دے۔ لیکن وہ "سونا" جو دھات نہیں وہ بھی قدر و قیمت میں کم نہیں۔ جب امتحانات کا موسم ہوتا ہے یا کسی پریشانی اور مرض کے سبب نیند ہم سے روٹھ جاتی ہے، تو ایسے وقت انسان کے علاوہ کسی جانور کو نیند پر بھی رشک آنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں یہ صرف قیاس ہے یا حقیقت کہ "دار" اور کانٹوں کی سیج پر بھی نیند آتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض لوگوں کو فٹ پاتھ پر، ریلوے اسٹیشن پر، چوکیداری کرتے ہوئے، اور کبھی ٹھہرے ہوئے رکشا میں، مختلف ہنگامہ آرائیوں، بلکہ قیامت کے شور و شر کے درمیان سوتے دیکھا گیا ہے۔ وہ نیک نفس انسان جو اکثر جاگنے کی راتوں میں خشوع و خضوع سے عبادت کرتے ہیں انھیں مصلے پر خراٹے لیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔!

"شب فراق" کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل ہے کہ واقعی اختر شماری ہوتی ہوگی یا نہیں؟
اس ذو معنی لفظ کے تعلق سے غالب نے بڑا تیکھا طنز کیا ہے۔

ع لیتا ہوں بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے

لاغر نرملی

امرتا سنگھ میں جان ہے سو ہے
گھر میں بیٹی جوان ہے سو ہے

کتنے بیمار کنگ کانگ ہوئے
ڈاکٹر ناتوان ہے سو ہے

آج بھی مرد اور عورت کے
جنس اک درمیان ہے سو ہے

عیش کرتا ہوا مہاجن ہے
بھوکا پیاسا کسان ہے سو ہے

کام ہے اُس کا پٹنا بیوی سے
نام تو شیر خان ہے سو ہے

چوتھی شادی کی ضد نہیں جاتی
پیٹھ جھک کو کمان ہے سو ہے

سازشیں کی گئیں بہت لیکن
زندہ اُردو زبان ہے سو ہے

اصل بے باق ہوگیا لاغر
پھر بھی گروی مکان ہے سو ہے

ظہیرالدین ظہیر لکھیم پوری

عشق کرکے آپ سے ہم چلبلے ہوں گے ضرور
جب ہوا پانی میں ہوگی بلبلے ہوں گے ضرور

جب بھی تم نے ذکر چھیڑا ہوگا حسن و عشق کا
درمیاں میں کچھ مرے جوہر کھلے ہوں گے ضرور

حضرتِ ناصح کے دل کا حال مجھ سے پوچھئے
یوں تو ان کے جسم پہ کپڑے دھلے ہوں گے ضرور

بننا پڑا ہے عشق میں لیور کبھی کبھی
بدلے ہیں یوں بھی حسن کے تیور کبھی کبھی

ہم یوں تو ان بتوں کے طرف دار کچھ نہیں
مجبور ہو کے کرتے ہیں فیور کبھی کبھی

فرمائشیں عجیب ہیں بیگم کی رات دن
ہم رہن رکھ کے آئے ہیں زیور کبھی کبھی

اللہ رے باتوں کی طرح چائے میں تلخی
لگتا ہے ملانے کو شکر بھول گئے ہیں

کیوں شیخ بھی محفل میں فرد کش ہیں اے ساقی
آئے ہیں کہ مسجد کی ڈگر بھول گئے ہیں

یوں گھر میاں بیگم نے کھلائی ہیں نہ پوچھو
بازار کی ہم چاٹ مٹر بھول گئے ہیں

بیگم کی نگاہوں کے جو دیکھے ہیں شرارے
ہم دبدبۂ برق و شرر بھول گئے ہیں

ڈاکٹر جاتل ناگپوری

خاکہ

شری پیدل رام

"دیکھا ! وہ آج بھی پیدل گھومتے ہیں"

ہاں بھائی ۔ مان گئے ۔ وضعدار آدمی ہی ایسے ہوا کرتے ہیں یعنی اپنی لکشمن ریکھا سے ایک انچ ادھر نہ اُدھر۔ پھر یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ۔ وہ تو شروع سے پیدل ہیں ۔ ماشاء اللہ! ہزار ڈیڑھ ہزار ماہانہ کماتے ہیں لیکن مجال ہے جو کبھی سائیکل بھی چلائی ہو ۔ ماٹر گاؤں میں پیدا ہوئے پلے بڑھے وہاں موٹر کشتی کا رواج نہ تھا یا تو کھیت جاؤ، گھاس چھیلو، روزی کماؤ، کھاؤ پیو اور سو جاؤ ۔ یا پھر مکتب میں مولوی صاحب کے پیر دباؤ، نہیں تو اسکول جاکر "ماس صاحب" کا بھیجہ چاٹو، کچھ لکھنا پڑھنا سیکھو ۔

وہاں ہر کام پیدل چل کر ہی کرنا پڑتا تھا ۔ اس لیے انہیں گاؤں سے ہی پیدل چلنے کی عادت پڑی ہوئی ہے ۔ اس عادت سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ کتنا بھی چل لیں، کہیں ہانپتے نہیں، کہیں رکتے نہیں ۔ بس چلتے ہی چلتے جاتے ہیں اور جہاں پہنچنا ہے وہیں پہنچ کر دم لیتے ہیں ۔

بڑی مشکلوں سے دسویں تک پہنچے اور میٹرک کا سرٹیفکٹ لے کر گھر واپس آئے تو ماں باپ کی باچھیں کھل گئیں ۔ گاؤں کا لڑکا میٹرک بھی کرے تو اس کے ماں باپ یہی سمجھتے ہیں کہ بیٹے نے بڑا تیر مار لیا اور جب تیر مار چکا تو جلدی سے گھوڑا چڑھاؤ اور دلہن بیاہ لاؤ ۔ حسنِ اتفاق سے وہ دلہن کے گھر بھی پیدل ہی پہنچے تھے ۔ پیدل باراتیوں کے ساتھ ۔ اور دلہن بھی پیدل ہی آئی تھی ۔ تب سے آج تک دونوں پیدل چل رہے ہیں ۔ بزرگوں نے غلط تھوڑے ہی کہا ہے کہ جیسی نیت ویسی برکت !

بیوی آئی تو خاندان بڑا ہونے لگا ۔ اللہ نے سب کی روزی روٹی کا ذمہ لے رکھا ہے ۔ چاہے سوار ہو چاہے پیدل ۔ وہ بھوکا اٹھاتا ہے مگر بھوکا نہیں سلاتا ۔ ہمارے پیدل رام کا بھی یہی عقیدہ تھا اور اس عقیدے میں اس دن اور پختگی آگئی جب ضلع پریشد نے انھیں ماسٹری عنایت کردی ۔

ضلع پریشدوں کی عنایت سے ہوتا یہ ہے کہ اپنے بیچارہ مدرس، ضلع کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے بارے میں جان لیتا ہے اور ضلع بھر کے دیہاتی اسے پہچان جاتے ہیں ۔ گاؤں تو گاؤں ہوتا ہے چاہے دس گھروں کا

کیوں نہ ہو اور اسکول آخر اسکول ہوتا ہے چاہے دس بیس بچے کیوں نہ آتے ہو۔

تو شری پیدل رام "ماسابوں" کر لاکھوں واڑہ چلے آئے یعنی ایک ایسے گاؤں میں جہاں کوئی پکی سڑک نہ تھی۔ آس پاس کوئی بڑا گاؤں یا چھوٹا شہر بھی نہیں تھا۔ پھر اب کیا کیا جائے؟ جی لگا کر بچوں کو پڑھانا ہی پڑے گا اور یوں پڑھانے کے لیے خود بھی کچھ پڑھنا پڑے گا۔ تو شری پیدل رام نے پڑھنا شروع کیا۔

پیدل چلتے چلتے جو طاقت پیروں میں سما گئی تھی وہ مسلسل نقل و حرکت سے تھوڑی اوپر اٹھ کر دل دماغ تک بھی پہنچی اور یہاں تک پہنچا تھا کہ خود بخود کئی راہیں کھل گئیں۔ شری پیدل رام نے سجدۂ شکر ادا کیا کہ انھیں خدا کا حکیم و قدیر ہونا بھی یاد آ گیا تھا۔

اب تو وہ اور بھی سپاٹے سے چل پڑے۔ کبھی اس راہ سے کبھی اس راہ سے۔ کبھی چلتے چلتے آدھی راہ سے لوٹ بھی آئے۔ ہم نے ان کی بھرپور آدک جادک دیکھی تو فیصلہ کیا کہ انھیں شری پیدل رام کہہ کر بلانا ان کے ذوقِ سفر کی تضحیک کرنا ہے۔ انھیں کوئی اچھا سا نام دینا چاہیے۔

اسکولی بچوں کو نظمیں رٹاتے رٹاتے انھوں نے اپنی طبیعت بھی موزوں کر لی تھی اور ٹوٹی پھوٹی ہی سہی کچھ نظمیں بھی کہہ لی تھیں اس لیے بہتر معلوم ہوا کہ اچھا سا نام نہیں بلکہ اچھا سا تخلص تجویز کر دیا جائے۔ سو چالوگوں کی متفقہ رائے کے بعد ان کی شخصیت، مزاج، طبیعت اور کد و کاوش کو دیکھتے ہوئے خان صاحب کا تخلص "راہی" تجویز بھی ہوا اور قبول بھی!

اور جس دن سے وہ راہی بنے اُس دن سے ان کی کایا پلٹ گئی۔ یعنی اوّل تو لاکھوں واڑہ سے پیچھا چھوٹا کر کھیت، جنگل اور پہاڑیاں گھومتے گھومتے طبیعت ادب گئی تھی۔ اب انھیں کھام گاؤں سے قریب پیپل گاؤں راجہ میں جگہ ملی۔ پیپل تو مشہور و قدیم اور تاریخی بزرگ ہے اس کی چھاؤں میں کوئی چلتا پھرتا دم لینے ٹھہرا تو وہ اسے سکون، شانتی ضرور پروان کرتا ہے۔ تو راہی صاحب کو پیپل گاؤں ہی نے انقلاب دکھایا۔ یعنی وہ اخبار جو کبھی کسی پیدل کی چلتی پھرتی نظمیں بھی چھاپ دیتا تھا۔ اب تو گویا راہی صاحب بالکل جم گئے۔ پکی روشنائی میں چھپا ہوا نام صرف درونِ خانہ ہی نہیں بلکہ بیرونِ گاؤں بھی دیکھا گیا اور مبارکباد دی گئی۔

اس دن سے آج تک وہ کسی نہ کسی بہانے مبارکبادیاں سمیٹتے چلے آ رہے ہیں۔ پہلے محض راہی تھے اب راہبر ہیں مگر طبیعت کی انکساری اب بھی سلامت ہے۔ بہت سی منزلیں لپیٹ لیں لیکن چلنا نہیں چھوڑا۔ قمیص پتلون اور کرتا پاجامہ ڈٹائے، بیگ در بغل وہ اول جلول چلتے چلے جا رہے ہیں۔ نہ کبھی دھول کی پرواہ کی نہ کسی غبار سے ڈرے۔ دیکھتے دیکھتے سات آٹھ کتابیں چھاپ لیں اور اتنے ہی ایوارڈ پائے۔ چھپنے پر آئے تو نہ کوئی اخبار چھوڑا نہ کوئی رسالہ فلمی، غیر فلمی۔ ادبی، غیر ادبی! ہر کاغذ پر راہی کا نقشِ قدم موجود ہے اور اس بار تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔ اسٹیٹ اکیڈمی ہر سال گرانٹ دیتے دیتے دیوالیہ قرار پائی اب پرائی اسٹیٹ سے ہزاروں کی مالی اعانت ہتھیا کر ہمیں دشمنوں اور حاسدوں کو بارہ بجے گولی۔ لوگ دم بدم میدان مارنے سے ہمدموں اور ہم جلیسوں کا کلیجہ بھی منہ کو آتا ہے۔ اور پھر اطراف کا حال تو آپ کو معلوم ہے کہ اب بیشتر لوگ "بائگ" نہیں سے ہاتھ مگر آستین رکھتے ہیں، خدانخواستہ کہیں کسی کی آستین پٹ گئی یا جھپٹ گئی تو ہاتھ کیا وہ تو بس کھلکھلا دیں گے قمیص جھاڑیں گے اور جوتیاں بجاتے ہوئے پھر چلتے نظر آئیں گے۔ آخر راہی جو ٹھہرے! انھوں نے شطرنج کبھی نہیں کھیلا لیکن پیدل مہرے سے ہاتھی گھوڑے اور وزیر و شاہ کو پٹتے ہوئے دیکھا ہے اور کیا پتہ کہ زندگی کی بساط پر وہ خود بھی ایسا ہی کوئی پیدل مہرہ ثابت ہوں!

"قصہ گرین کارڈ کا"

(اُتر پردیش سرکار نے گرین کارڈ ۱۹۸۶ء سے جاری کیا ہے)

کرکٹ گورکھپوری

ہاتھ میں اخبار، چہرے پر خوشی بے انتہا
جیسے مجھ کو مل گیا ہو غیب سے اندوختا
سر اُٹھائے گھر میں پہلی بار میں داخل ہوا
اور کہا بیگم سے سنئے آج کی تازہ خبر
سبز کارڈ مل رہا ہے اک ذرا سی بات پر
صرف یہ کارڈ نہیں بیگم، ہری جھنڈی ہے یہ
مفت ہاتھ آئے جہاں ہر مال وہ منڈی ہے یہ
کوہ کی چوٹی تلک جانے کی پگڈنڈی ہے یہ
اب بڑے دن آ یہ سمجھو جلد ہی اُٹھ جائیں گے
ہم بھی بس دو چار دن میں لکھ پتی کہلائیں گے
بولیں بیگم آپ تو ہر وقت بکتے ہیں فضول
یہ "موا" کارڈ کوئی حلوہ ہے یا گولر کا پھول
یا کہ پھر سے آپ پر دیوانگی کا ہے نزول
خوش ہیں جیسے آپ کو کوئی خزانہ مل گیا
طائرِ بے بال و پر کو آب و دانہ مل گیا
میں نے بیگم سے کہا کیا فائدہ تکرار میں
صرف سچائی ہے میری جرأتِ اظہار میں
معجزہ کارڈ کا سب لکھا ہے اس اخبار میں
سبز کارڈ ہو تو دیجئے ٹھاٹھ سے آدھا لگان
بعد میں درخواست دیجئے پایئے پہلے مکان

یہ ہرا کارڈ اگر ہے پاس تو کیا مسئلہ
آپ کے بچوں کا اب مشکل نہیں ہے داخلہ
مفت ہے انٹر تلک تعلیم کا بھی سلسلہ
پڑیئے گر بیمار تو مل جائے آسانی سے وارڈ
ہاں اگر ہو آپ کی تحویل میں اک سبز کارڈ
یہ موا کارڈ نہیں بیگم یہ اک پہچان ہے
قرض لینا اس کو دکھلا کر بڑا آسان ہے
یوں تو ہے نازک سا اک پرزہ مگر طوفان ہے
یہ ہرا کارڈ دیا جائے گا اس جوڑے کو [illegible]
شرط ہے کہ ان کے بچے بھی اگر ہوں ایک [illegible]
جل کے بیگم نے کہا کیوں ہو رہی ہے یہ حسد
اپنے بچے آج ہیں اللہ رکھے نو عدد
جن میں شامل آپکی شاید ہے تھوڑی سی مدد
لوگ کہتے ہیں جب چلا کے ابا آپ کو
سبز کارڈ کون دے گا نو عدد بچوں کے باپ کو

مختار ٹونکی

غزلیں

مجھے لگتا ہے یوں محبوب کا چیچک زدہ چہرہ
منقش جس طرح ظرفِ مرادآباد ہوتا ہے

کبھی بھی ساس سے پوچھو کہے گی وہ یہی فوراً
بہت ہی لالچی اب تو ہر اک داماد ہوتا ہے

ترنم جس کا اچھا ہو اُسی کا نام ہے شاعر
چرا کر جو غزل پڑھ دے وہی اُستاد ہوتا ہے

اگر دو چار بچے ہوں گرانی مار دیتی ہے
بڑی مشکل میں یارو صاحبِ اولاد ہوتا ہے

فسانہ عاشقی کا مختصر مختار ہے اتنا
کوئی برباد کرتا ہے کوئی برباد ہوتا ہے

★

محمد حفیظ الدین فردوس کورٹلوی
(کریم نگر)

اُنوں میری شادی کراتیں کتے
جہیز میں کھٹارا دلاتیں کتے

چپا بیل باٹم سلاتیں کتے
بچانی نئی ایک رلاتیں کتے

اُنوں جاکو دوبئی کماتیں کتے
کورٹلے میں بنگلے بناتیں کتے

اُنوں اِسنو پوڈر لگاتیں کتے
کھٹارے کی آئیلنگ کراتیں کتے

کٹورے میں کھرچن بھی باقی نہیں
مگر پھر کبھی چمچہ ہلاتیں کتے

ہے آواز بھونڈی مگر آں جناب
ترنم میں غزلاں سناتیں کتے

کرے اب تو مرشد بھی ڈسکو سدا
جو گھر میں ہے ڈھول اب بجاتیں کتے

ہے اکلوتا لڑکا نکما مگر!!
اُنوں اس کو لیڈر بناتیں کتے

اے فردوس سنتے ہیں مجنوں میاں
الگ "عشقِ دیشم" بناتیں کتے

★

بیکش نما
(بالاپیٹھ)

جوانی میں نہ جانے چھوکرے کیا گُل کھلائیں گے
جو کم عمری میں پینے کے لیے گانجہ چلم نکلے

سُنا ہے شیخ جی کے گھر پہ جب مارا گیا چھاپہ
نشیلی پوڑیاں، اور دیسی دارو کے ڈرم نکلے

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر۔!
(شہر حیدرآباد پہ مضامین کا سلسلہ)

مجسمے ہی مجسمے

عابد معز

پچھلے چند سال سے ہماری حکومت جو بھی قدم اُٹھاتی ہے اس پر اختلافی بحث شروع ہوجاتی ہے۔
بیشتر بحث موافق اور مخالف احتجاج کی شکل اختیار کرجاتی ہے۔ وظیفہ پر سبکدوشی کی عمر میں کمی، تحفظات
اضافہ، پانچ دن کا ہفتہ اور ہلمٹ کا لزوم چند واضح مثالیں ہیں۔ اور اس کی ایک کڑی حسین ساگر کٹہ پر مجسموں
نصیب ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑ ہا روپیوں کی لاگت سے حسین ساگر کٹہ کو کشادہ کرنے اور سڑک کے ایک کنارے
نصب کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی عوام میں اختلافی بحث و مباحثہ کا آغاز ہوا۔ کوئی مجسموں
نصیب کا حامی ہے تو کوئی مخالف۔ کہتے ہیں اختلافی بحث اور پھر اکثریت کا فیصلہ جمہوریت کی شان ہے۔
ور بات ہے کہ غلط فیصلہ کرنے پر عدالت انصاف کرتی ہے۔

رہنماؤں کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ تہذیب نو کے زیرِ اثر نئی نسل قدیم تہذیب کے ورثہ سے نابلد
ہی جارہی ہے۔ نت نیا فیشن، ڈسکو، فلموں اور دوسری ایسی ہی لہروں کے زیرِ اثر آج کل کا نوجوان تہذیبی لُٹیا
نے کے درپے ہے لہٰذا تلگو تہذیب کو زندہ جاوید رکھنے کے لیے نمائندہ شخصیتوں کے مجسمے نصب کئے جانے
یں تاکہ نئی نسل اپنی تاریخ، تہذیب، فنونِ لطیفہ سے واقف ہوسکے۔ ابتدا ہی غلط ہوئی۔ تلگو تہذیب کو
ے شہر میں اجاگر کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی تہذیب ملی جلی، مشترکہ، کاسموپولیٹن اور ایک نمونہ تہذیب ہے۔
مجسمے نصب کرنے سے تہذیبی شناخت محفوظ ہوجاتی تو پھر ادیب و شعراء دانشور و سخنور عقل و فہم کی باتیں
نے کے بجائے اپنے اپنے مجسمے بنانے میں لگ جاتے اور آنے والی نسل کے لیے ہمہ اقسام کے مجسمے چھوڑ جاتے
تے۔ آج ہم غالب اور اقبال کے کلام کو پڑھنے کے بجائے ان کے مجسموں کو دیکھتے کھڑے ہوتے اور ان کا کلام
نشین ہوجاتا۔ کاش اتنی آسانی سے تہذیبی ورثہ کی حفاظت ہوسکتی!

مجسموں کے نصب کرنے پر چہار طرف سے اعتراض کیا جارہا ہے کہ یہ مناسب وقت نہیں ہے۔ شہر میں قحط
۔ پانی کا کال ہے۔ پچھلے ایک سال سے شہریوں کو دو دن میں ایک مرتبہ چند بوند پانی مہیا کیا جارہا ہے مہنگائی
ھ رہی ہے۔ دماغی بخار سے الگ اموات ہورہی ہیں ریاست کے بعض علاقے سیلاب سے دوچار ہیں۔ کسی نے

کہا مجسموں کی قطار کے بجائے نلوں کی قطار لگتی تو اچھا تھا۔ ایک اور تجویز تھی کہ مجسموں کی تعمیر میں خرچ ہونے والے اینٹ سمنٹ لوہے اور پتھر کے بدلے سے بھوکوں کا پیٹ بھرا جا سکتا تھا۔ لیکن جناب ہماری دانست میں مجسموں کی تنصیب کا اس سے بہتر وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ آرٹ اور کلچر، بھوک اور پیاس ہی میں سمجھ میں آتا ہے اور بھوک اور پیاس کے ساتھ ہی فروغ پاتا ہے۔ آرام میسّر آنے کے بعد انسان کو [illegible] آتی ہے۔

بعض شہریوں کو اتنے سارے مجسمے ایک مقام پر نصب کرنے پر بھی اعتراض [illegible] ہیں انھیں ایک وقت میں اتنے سارے معززین کو خراج پیش کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے سبھی مجسمے ایک جیسے نظر آتے ہیں، طویل سڑک پر مجسموں کو دیکھتے اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے گزرنا زندہ راہگیروں کو ان کے بہت قریب پہنچا دیتا ہے۔ ہر پل خدشہ لگا رہتا ہے کہ شاعر کے مجسمے کے پاس سے گزرتے وقت اس کے کلام میں کھو کر کہیں سامنے سے آتی ہوئی سواری سے گلے نہ مل لیں۔ اسی لیے مطالبہ ہوا کہ مجسموں کو الگ الگ مقامات پر نصب کیا جائے تاکہ وقتِ واحد میں ایک ہی فرد کی خدمات کو سراہا جا سکے۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض برائے اعتراض ہے۔ اتنے سارے مجسموں کی ایک جگہ تنصیب سے ندرت پیدا ہوگئی ہے۔ لوگوں نے کہیں نہیں دیکھا اور ہم نے کبھی نہیں سنا کہ اتنے ڈھیر سارے مجسمے ایک سڑک کے کنارے نصب کیے گئے ہوں۔ ایک طرح سے ہمارے شہر کے لیے یہ ایک اعزاز بنے گا۔ گینیز بک آف ریکارڈس میں نام آ سکتا ہے۔ اس ریکارڈ کے علاوہ اتنے سارے مجسموں کو ایک جگہ نصب کرنے میں ایک نفسیاتی نکتہ پوشیدہ ہے جیتے جی اتنے دانشور کبھی ایک مقام پر اکٹھا نہیں ہو سکتے تھے۔ نظریاتی اختلافات کی بدولت مختلف اوقات میں تنہا پیدا ہوئے اور تنہا وفات پائی۔ اگر دانشوروں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے تو وہ یہی ایک طریقہ تھا جسے ہمارے حکام نے روبہ عمل لایا ہے۔

نومبر کے پہلے دہے میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی تقاریب منعقد ہوئیں۔ چند مزاح نگاروں کی تخلیق کا موضوع یہی مجسمے تھے۔ جناب مجتبیٰ حسین کے خیال میں حکومت اس اُمید پر مجسمے نصب کروا رہی ہے کہ ان حساس فنکاروں کے مجسموں کی آنکھوں سے عوام کی بے بسی اور مجبوری پر اتنے آنسو بہہ نکلیں گے کہ ریاست میں سیلاب آ جائے گا اور اس طرح پانی کی قلت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہمارے ایک دوست نے اس خیال کو انشائیے "میں اُمید کی کرن" کا عنوان دیا ہے۔ جناب مسیح انجم نے مجسموں کی تنصیب پر کیے گئے خرچ کا تخمینہ لیا۔ چار کروڑ سے زائد روپیوں میں ۳۴ مجسمے نصب ہوئے فی مجسمہ بارہ لاکھ روپیوں سے زائد کا خرچ آیا۔ بارہ لاکھ روپیوں کو دیکھ کر مسیح انجم صاحب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور انھوں نے پیشکش کی کہ اگر اتنے روپے انھیں دے دیئے جائیں تو وہ خود مجسمہ بن کر کھڑے ہونے تیار ہیں۔ ایک مجسمہ کی لاگت میں خود مجسمہ بنے رہنے کی ہم بھی غیر مشروط پیشکش کرتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ بمبئی سے آئے مہمان مزاح نگار نیاز احمد فیضی نے مجسموں کی ایک بنیادی خوبی پر روشنی ڈالی کہ پرندوں کی شرارت پر مجسمے کچھ نہیں کرتے بلکہ فضا میں گھورتے رہتے ہیں۔ اس خوبی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری تجویز ہے کہ مجسموں کے پاس ایک چوکیدار کا تقرر کیا جائے جو پرندوں کو مجسموں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے سے باز رکھے۔

مجسموں کی تنصیب، ہمارے شہر کے قابلِ دید مقامات میں ایک اضافہ ہے۔ فخر سے جہاں ہم چارمینار

مکہ مسجد، قلعہ گولکنڈہ، گورستان، قطب شاہی، عثمان ساگر، جامعہ عثمانیہ، سالار جنگ میوزیم، برلا مندر، ہائی کورٹ، دواخانہ عثمانیہ اور نہ دکھاتے ہیں اب ہم حسین ساگر دکھا کر سیاحوں سے کہیں گے کہ ندو کیا ہمارے سائنسی آبا و اجداد جنھیں ڈارون نے دریافت کیا تھا بستے ہیں تو ہمارے تہذیبی آبا و اجداد کنارِ حسین ساگر پر براجمان ہیں۔ اس طرح سے حیدرآبادیوں کی شناخت مکمل ہوتی ہے۔ جب کبھی ہم غمِ روزگار اور غمِ زندگی میں کھو کر اپنے آپ کو بھول جائیں گے تو ان دو مقامات کی سیر کر کے خود کو پہچان لیا کریں گے۔

اب تو مجسمے لگ چکے اور ان کی نقاب کشائی بھی ہو چکی ہے اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے رہ گئے۔ احتجاج کی دھمکی دینے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اپنی اپنی پسند کی شخصیتوں ~~کے مجسمے~~ نصب کرنے کے مطالبے بھی ہوئے مزید مجسمے نصب ہونے کے بعد ہو سکتا ہے کہ اس علاقہ کا نام مجسمہ نگر یا مجسموں کا ساگر رکھنے کی تجویز بھی پیش ہو۔ ویسے بعض لوگ اپنی دانست میں حسین ساگر کا نام بدل بھی چکے ہیں۔ خیر مجسمے لگنے کے بعد ہمارا گزر کنارۂ حسین ساگر پر سے ہوا تو دیکھا کہ بانیٔ شہر محمد قلی قطب شاہ کا مجسمہ نہیں ہے۔ بہت تکلیف ہوئی ہونی بھی چاہیئے اگر قلی قطب شاہ شہر حیدرآباد نہ بساتا اور "مرا شہر لوگاں سوں معمور کر" دعا نہ مانگتا تو ہمیں ہر ماہ مضمون لکھنے کا موقع کہاں سے ہاتھ آتا۔ قلی قطب شاہ کا مجسمہ اس حساب سے بھی نصب ہونا چاہیئے تھا کہ وہ نہ صرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا بلکہ تلگو میں بھی اس نے شعر کہے۔ معلوم نہیں مجسموں کے انتخاب میں کیا راہنما اصول بنائے گئے ہیں کہ قلی قطب شاہ کے مجسمے کے ساتھ ہمارے شہر کی تہذیب کا ایک اہم پہلو اردو کا مجسمہ بھی غائب ہے۔ تلگو تلی کے ساتھ اردو کا مجسمہ بھی ہونا چاہیئے تھا۔ ضعیف، نحیف و ناتواں قریب المرگ اردو جسے اس کے اپنے ہی ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مجسموں کی تہذیب میں یقیناً ان دو مجسموں کا حق بنتا ہے۔ حسین ساگر کنارے پر ابھی بہت سے مجسمے نصب کئے جا سکتے ہیں۔ کافی جگہ ہے۔ ارباب مجسموں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ ہماری تجویز پر غور کریں —!

رحمٰن ربانی
(کاپلی)

کُتّے

اگرچہ شہر میں ملتے ہیں کو بہ کو کُتّے
سبھی تو ان میں نہیں ہوں گے پالتو کُتّے

جو ناسمجھ ہیں سمجھتے ہیں ان کو آوارہ
کسی کی کھوج میں پھرتے ہیں چارسو کُتّے

وفا کا نام تو دنیا سے مٹ گیا ہوتا
مگر بچائے رہے اس کی آبرو کُتّے

بشر کی بات سمجھتا نہیں بشر لیکن
سمجھتے خوب ہیں کتّوں کی گفتگو کُتّے

یہ پیٹھ پیچھے تو کہتے نہیں کسی کو بُرا
ہر ایک بات کو کہتے ہیں روبرو کُتّے

یہ دوڑ کر اُسے فوراً بھنبھوڑ ڈالیں گے
جس اجنبی میں نہ پائیں وفا کی بُو کُتّے

یہ چند ٹکڑوں کی خاطر تو لڑ پڑیں گے مگر
کبھی فضول بہاتے نہیں لہو کُتّے

زمانہ لاکھ بدلتا رہے مگر رحمٰن
کبھی بدل نہیں سکتے ہیں اپنی خُو کُتّے

گدھے

جس طرف دیکھئے اُدھر ہیں گدھے
کیا بتائیں کہ کس قدر ہیں گدھے؟

"خر" کہو یا "دراز گوش" کہو
کچھ بھی کہہ لو گدھے مگر ہیں گدھے؟

یہ گدھے اور ان کے باپ گدھے
باپ کے باپ کے پدر ہیں گدھے؟

دیکھئے، ان کے رشتہ داروں کو
جتنے بھی ہیں تمام تر ہیں گدھے؟

ان کی محنت کی دھاک ہے سب پر
بوجھ ڈھونے میں نامور ہیں گدھے؟

وقت پر آدمی بنالے باپ
فائدہ مند اس قدر ہیں گدھے؟

اعتبارِ بشر نہیں لیکن
ساری دُنیا میں معتبر ہیں گدھے؟

باکمالوں کی قدر ہوتی ہے
اور رحمٰن بے ہُنر ہیں گدھے

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

"میاں اڑنچھو کا پیار"

میاں اڑنچھو کی مبالغہ سے لبریز بالغ رائے یہ ہے کہ بچپن یا چھٹپن سے ہی پرورش پانے والا حسن و عشق والا پیار سراسر افواہ ہے چونکہ میاں اڑنچھو کا بچپن کا پہلا پہلا متوالا یادگار پیار تو ان کے والد کی خریدی ہوئی ایک عدد مرغی سے ہوا تھا — میاں اڑنچھو بھورے رنگ پر سفید چھینٹوں والی مرغی اپنی چھوٹی سی بغل میں دابے دابے گھوم رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں۔ بہلا رہے ہیں پھسلا رہے ہیں۔ اس لیے ان کا یہ پیار کافی مشہور ہوا ان کے گھر آنے جانے والے اور مستقل قیام پذیر سینکڑوں افراد میں مقبول عام و خاص رہا۔

کسی بھی پیار کی پیاری خصوصیت یہ ہے کہ پیار کرنے والا لاکھوں بلکہ کروڑوں پیار بھرے محبوبوں میں سے ایک کو کھوج نکالتا ہے اور اس سے پیار جتاتا ہے۔ یہ کبھی خیالی سر حدوں تک محدود ہوتا ہے یا پھر ساری حدیں توڑ کر بغل کے قریب تک چلا آتا ہے جو بغل کی گرمی نرمی سے بڑھ کر نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ تلاشِ پیار، تلاشِ معاش اور تلاشِ یار کی طرح اردو کے "ذاتی الفاظ" کی تلاش بھی جوکھم کا کام ہے۔ لفظ "مرغ" کو ہی لیجئے فارسی اصیل ہے بمعنی "پرند" لیکن یہ لفظ اڑتے اڑتے ہندستان سونے کی کان کے آنگن میں اتر کر پھدکنے لگا تو ایسے پرندے تک محدود ہو گیا جو پرواز میں کوتاہی محسوس کرتا ہے بلکہ پرواز کا قائل ہی نہیں۔ لفظ "مرغ" کو ایک عدد مؤنث لفظ سے بھی سرفراز کر دیا گیا یعنی "مرغی" اور یہ سو فی صدی اصیل اردو کا لفظ ہے۔ اس طرح خالص اردو کے الفاظ گنتی کے ہیں۔

— میاں اڑنچھو کی پہلی محبوبہ کی بات چل رہی تھی جب وہ ان کی بغل میں نہ ہو تو ان سے چند قدم کے فاصلے پر ضرور مل جائے گی اور اڑنچھو کے ہاتھ میں لمبی، کالی، میلی، کچیلی، بدبو بھری ڈوری ہو گی، اڑنچھو کا انہماک پتنگ بازوں کی طرح نظر آئے گا۔ فرق اتنا ہو گا کہ پتنگ اوپر اُٹھتی ہے لیکن مرغی ہمیشہ زمین پر رہتی ہے اور ڈور ہمیشہ "پیٹا" چھوٹتی ہے۔ "پیٹا چھوٹنا" یہ پتنگ بازوں کی اصطلاح ہے۔ اڑنچھو نے کبھی پتنگ بازی نہیں کی بلکہ ڈور کے "لچھے" ہی مارے ہیں۔ "لچھا مارنا" بھی "حیدرآبادی اردو بولی" کی مشہور اصطلاح ہے۔ "لچھا مارنا" کبھی کبھی جھوٹ بولنے والوں کے منہ پر ہی ان کو جھوٹا کہنے کے لیے "کوڑودڑا" کی طرح مستعمل ہے کہ جھوٹا اپنی ذلت بھی برداشت کرے اور کچھ کہہ بھی نہ سکے۔ اڑنچھو دونوں اصطلاحوں پر نہ صرف پورے اترتے ہیں بلکہ مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اس لیے پتنگ سے

پیار کرنے والوں اور سچ سے پیار کرنے والوں کی نظروں میں "کُڑک مرغی" کی طرح کھٹکتے رہے۔ "وسیع القلب" حضرات کی نظروں میں اس لیے کھٹکتے رہے کہ وہ "کنجوس مکھی چوس" واقع ہوئے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کبھی پتنگ بازی نہیں کی اور دلی حسرت چھپاتے رہے۔ یعنی پتنگوں سے پیار نہیں جتایا۔ بالغ ہوئے تو اصنافِ ادب کو تو سینے کی گرمی بخشی لیکن صنفِ مخالف یعنی صنفِ نازک سے کنارہ کیا۔ اصنافِ ادب کو اس لیے پیار دیا کہ اس میں خرچ ایک دھیلے ایک دمڑی کا بھی نہ تھا۔ حالانکہ جب پیار ہو جاتا ہے تو جیب کی فکر کون کرتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میاں اڑنچھو کی جیب ہمیشہ ہی خالی رہی۔ اس لیے انہیں پیار کے لیے چاہیئے مفت کی مرغی اور مفت کے اصنافِ ادب۔ حسینان اور پتنگ پر پیار جتانا ان کے بس کا روگ نہ تھا لیکن جب وہ دیکھتے کہ ان کے بھائیاں پتنگ بازی پر بے تحاشہ خرچ کر رہے ہیں تو انہیں شک ہوتا کہ وہ جو بھاگ بھاگ کر سودا ترکاری لاتے تو اس میں سے کچھ اڑا جاتے ہوں گے بلکہ بہت کچھ اڑا جاتے ہوں گے۔ اڑنچھو بھوتے، کنجوس مکھی چوس سہی لیکن توکل پرست ضرور ہیں چاہے اناڑی اور کاہل کے القاب سے نوازیں کہ اس اناڑی پن کی وجہ سے پتنگ بازی سے بھی محروم رہے بالغ ہوئے تو اپنے پُرشباب دورِ حیات کے مشہور ترین "سپنے کا گن" "پیار کیا تو ڈرنا کیا" سے بھی سبق حاصل نہ کر سکے۔

کہتے ہیں کہ ہر پیار کی داستان میں ایک عدد رقیب روسیہ ضرور زبردستی داخل ہو جاتا ہے اور پیار کے گلستان یعنی "گلشنِ عشق" کی تباہی کے ہر پل ہر لمحہ درپے ہوتا ہے۔ اڑنچھو کے پہلے پیار کے رقیب نکلے ان کے پدرِ محترم جس طرح "داستانِ مغلِ اعظم" میں جہانگیر کے باپ۔ پدرِ محترم 7'O'CLOCK بلیڈ سے ٹھیک سات بجے صبح شیونگ کا شغل بڑے اہتمام سے فرماتے۔ ایک دن صبح سات بجے اڑنچھو کے پہلے پیار کا کلائمکس نمودار ہوا یعنی اڑنچھو کی پیاری مرغی نے اپنی ایک عدد ٹانگ سے پدرِ محترم کی صابن کی کٹوری جو ہوا میں اڑا دی تو پدرِ محترم نے اپنی پون درجن اولادِ نرینہ میں سے (پاؤ درجن اولادِ نسواں کے الگ سے مالک تھے) سب سے بڑی اولادِ عظم کو حکم دیا کہ "میاں! چھری لے اور اس کا کام تمام کر دے"۔ میاں تو منتظر تھے ہی فوری چھری لے آئے فرش پر قصابوں تک سے ماہرانہ انداز میں پتھر پر پھیرایا اور اڑنچھو کی جانِ بہار دلگداز حسینۂ طرحدار پیاری مرغی کے حلق میں زبردستی نل کی ٹونٹی سے پانی داخل کرنے کم اور اس کا اشنان کا زیادہ اہتمام کر کے کن انکھیوں سے اڑنچھو کی طرف دیکھا اور پھر اللہ اکبر ـــــ اڑنچھو کو یقینِ کامل ہے کہ ان کی پیاری دُلاری لاڈلی مرغی آوا گان کے اصول کے تحت مر کر جی اٹھے تو اڑنچھو جہانگیر کی طرح جس نے کبوتر کے اڑ جانے والا واقعہ نور جہان سے پوچھا تھا اسی طرح پوچھتے اور ان کی پیاری مرغی ضرور پدرِ محترم کی صابن کی کٹوری دوبارہ ضرور اچھال کر دکھا دیتی لیکن اڑنچھو بے چارے قسمت کے مارے کیا کرتے دل مسوس کر "کُڑک مرغی" کی طرح کُڑکڑا کر رہ گئے۔

ان کی محبوبہ کے قتل کی رات اس کا یعنی مرغی کا سالن تیار ہوا سب مزے لے لے کر کھا رہے تھے اڑنچھو نے ان کی "پدرنی محترمہ" نے (مرغی کی طرح "پدرنی" کا نیا لفظ اڑنچھو کا تراشا ہوا ہے یہ ان کے اصنافِ ادب سے لگاؤ کا نتیجہ ہے اور وہ اردو کو یہ لفظ دے کر اتنا ہی مسرور و شادماں ہیں جتنا اپنی محبوبہ یعنی پیاری مرغی کے انڈے کو سیکتے ہوتے تھے۔ دونوں نے سالن چکھا ہی نہیں اڑنچھو کی "پدرنی" جانتی تھیں کہ اڑنچھو کیا ہے اور اس کا پیار کیا ہے۔ "پدرنی محترمہ" نے اس رات اڑنچھو کو اپنے بستر پر ساتھ سونے کو کہا اور اس رات دونوں ماں بیٹے مل کر روئے پیاری مرغی کے تذکرے کرتے رات کے نہ جانے کتنے پہر ڈھل گئے اور جب نیند سی آنے لگی تو فوراً اپنے

اپنے کلیجوں میں دبا کر دونوں بستر پر اُٹھ کھڑے ہوئے "اَدرشیل سانگ" بتر عقری راگ میں گایا اور لحافوں میں دھنس گئے۔ پدرتی محترمہ کا خیال ہے کہ اہم مواقع پر نیشنل انتھم ضرور گا لینا چاہیئے وہ کہتی ہیں کہ جب دل بھر آئے تو ضرور بہ ضرور گانا چاہیئے۔ اڑیچھو کا بھی خیال ہے کہ قومی ترانے کی اہمیت دن بدن گھٹتی ہی جا رہی ہے ان کی پدرتی کے سوا کون ماں اپنے بچّوں کو اس طرح کی تاکید کرتی ہے۔ قومی ترانے کی اہمیت کی تنزل پذیری کو وہ اقدار کی تنزلی کا نام دیتے ہیں تو ادب میں پدر کو فرزند کا رقیب بنا کر پیش کرنے کو اَدبی اقدار کی تنزلی قرار دیتے ہیں اور اس تنزلی کا منبع وہ فلموں کو قرار دیتے ہیں کہ فلموں میں زیادہ سے زیادہ انہونیاں دکھلانے کی کوشش کی جاتی ہے اور جسے "ناولسٹک اپروچ" سمجھا جاتا ہے جس کے نتیجے میں فلم دیکھنے والی عوام اور ادیب و شاعر حضرات عملی زندگی اور ادبی دنیا میں بطور فیشن اُن انہونیوں کو عملی جامہ بشکل پنجابی پائجامہ زیب کرتے ہیں لگے ہیں۔

اڑیچھو کا دوسرا لڑکھڑاتا پیار فلموں ہی سے ہوا۔ یہ ایسے وقت کا پیار ہے جب اڑیچھو بچپن اور جوانی کے درمیان لٹکے ہوئے آصفیہ لائیبریری حیدرآباد (جسے اب بہت ہی لاڈ پیار دلار سے "اے پی اسٹیٹ سنٹرل لائبریری" کہا جانے لگا ہے) میں بچوں کے لیے مخصوص لائبریری میں داخل ہونے لگے تو وہاں سے یہ کہہ کر گردن میں ہاتھ دیکر بڑھا دیا گیا کہ اڑیچھو اب بچے نہیں رہے۔ وہاں سے گردن سہلاتے "بڑوں" والی لائبریری کی طرف چلے تو یہ کہہ کر دور سے ہی ڈنڈے سے ہنکا دیئے گئے کہ یہ بچّوں کے لیے نہیں ہے۔ اڑیچھو نے ایک نگاہِ حسرت دونوں لائبریریوں پہ ڈالی اور یہ فلمی گانا گاتے ہوئے ؎

میری حسرتوں کی دُنیا تو ملے کہیں جو مجھ کو . . .

سیدھے سینما ہال کا رُخ کیا جہاں صرف "بالغوں" والی فلم چل رہی تھی اس طرح "مطالعہ" ایک کنارے پر رہ گیا ورنہ وہ کبھی کے ادبی سمندر میں غوطہ لگا چکے ہوتے بجائے اس کے فلم بینی ان کا محبوب مشغلہ بن گیا اور فلموں سے پیار ہوگیا۔ مرغی کے پیار اور فلم کے پیار میں بہت بڑا فرق ہے۔ مرغی سے پیار میں بہت کم کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے جیسے ایک نیلی پیلی ڈوری رقیب اور قصاب نما بھائی لیکن فلم کی باضابطہ "فلمالوجی" ہوتی ہے۔ کئی ہیروئنوں سے کئی ہیروز سے موسیقاروں سے گلوکاروں سے ٹکٹ لینے والوں کی لمبی قطاروں سے بلاک کرنے والی بد قماشوں سے بہرحال بے شمار کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ فلم سے پیار کا لُطف نرالا بلکہ مکمل ہے۔ جس میں انتظار ہے پیار کے عمل کو طئے کرنے والی منازل ہیں مقام طئے ہیں وقت معین ہیں۔ رقیب موجود ہیں۔ سب سے بڑا رقیب تو سامنے والی سیٹ پر ہر بیٹھنے والا چاند کا ٹکڑا ہے۔ جس کا کالا سر اڑیچھو کی عینک کی زد میں رہتا ہے اس کے علاوہ دودھ پیتے بچے بھی بہت ہی خطرناک رقیب ثابت ہوتے ہیں۔ فلموں کے اس پیار کے دوران سارے اعصاب پر پیار ہی پیار چھا جاتا ہے اور غائبانہ طور پر ذہن و جسم میں جادو جگانے لگتا ہے بالآخر اڑیچھو نے تین بار "قبول کیا" کہا اور فلسفاتی دنیا سے حقیقی دنیا میں چلے آئے۔

اڑیچھو نے اپنے پیار کی تین قسمیں اور تین ادوار بتلائے ہیں۔ پہلا پیار لاشعور کی کارستانی ہے جس کا دور سارے لڑکپن پر حاوی ہے جو مرغی تک محدود ہے۔ دوسرا پیار سحر خیز فلسفاتی ہے جو خیالوں خوابوں کی آماجگاہ ہے۔ یہ دور مونچھ کی کونپلیں پھوٹنے والا بچپن دور ہے تیسرا دور "قبول کیا" کہنے کے ساتھ ہی پیچھے "بڑی مرغی" کے چلے آنے کے بعد کا دور ہے۔ اڑیچھو ابھی اسی دور میں سانس لے رہے ہیں۔!

محمد ابراہیم عزیز

ہلمٹ

گوہا کی شامیں ویسے ہی سہانی ہوتی ہیں۔ اور اتوار کی شام تو سہانی بھی ہوتی ہے۔ اور رومانی بھی۔ ایک
ایسی ہی رومانی شام، ہم کچھ زیادہ ہی رومانی ہو رہے تھے۔ اور "گرازِ ولیانہ" میں مصروف تھے۔ یعنی وہی "تو تو میں میں"
(تحریری نوعیت کی) چل رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ عملی مظاہرہ بھی ہو جاتا، خدا مرزا کنوارے کی عمر دراز کرے جن
کو حال ہی میں (خفیہ طور سے) "سستی لیڈری" کا اعزاز ملا ہے، عین وقت پر چار عدد ہلمٹ کے ساتھ نازل ہوئے۔
(عقل کو ڈھانکنے کے اس اہتمام کو دیکھ کر ہم چوکنے ہو گئے) اور موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے،
بڑے حاکمانہ انداز میں جو خاص کر ایسے ہی موقعوں کے لیے ہوتا ہے۔ شربت کا آرڈر دیا۔ بیگم خشمگیں نگاہوں
سے گھورتی ہوئی جیسے کہہ رہی ہوں "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی" اندر چلی گئیں۔

ادھر ادھر کی ہانکنے کے دوران مرزا نے دو عدد ہلمٹ ہماری طرف بڑھا دیئے۔ باقی سائڈ ٹیبل پر رکھتے
ہوئے صوفے میں دھنس گئے۔ ہم نے پوچھا مرزا "یہ پارٹ ٹائم کام کب سے؟" ہتھے سے اکھڑ گئے، کہنے لگے "اماں
یار فی زمانہ کسی سے ہمدردی کرنا بھی گناہ ہے، ہم آپ کے لیے لائے ہیں اور آپ اسے پارٹ ٹائم بزنس سمجھتے ہیں"
پھر شربت کے آنے کی وجہ سے غصہ ملتوی کر دیا۔ ہمیں ہلمٹ سے الجھا کر خود شربت سے شغل کرنے لگے۔

اپنی عقل کو ہلمٹ سے ڈھانکتے ہوئے ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارے لئے تو ایک ہی کافی تھی پھر یہ دوسری
کس لیے۔ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ چہرہ شناسی کی ڈھاک جماتے ہوئے مرزا چہکے، "پوچھو بھلا دوسری کس لئے
ہے؟" ہم نے مسکین سی صورت بنا کر شربت کا گلاس دوبارہ بھر دیا۔ (یہی ایک صورت تھی جان چھڑانے کی) مطلع
صاف دیکھتے ہی کان کے قریب آ کر کہنے لگے دوسرا بھابی کے لیے ــــ "آں"! ــــ

مرزا کیا غضب کرتے ہو، اگر انہیں ہلمٹ ہی پہنانی ہے تو میرے لیے ایک ہلمٹ پروف جیک کا انتظام کرو!
خالی گلاس لینے بیگم آ گئیں۔ اور ہم نے فوراً گفتگو کا رخ بدلا۔ باواس نہ لیں۔ پوچھا "مرزا باقی دو ہلمٹ کس
لیے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ نہ تو آپ بیوی کے "مالک" ہیں اور نہ ہی موٹر سیکل کے ہماری کم فہمی سے محظوظ ہوتے
ہوئے گویا ہوئے، "میاں ہلمٹ آ گئی ہے تو موٹر سیکل بھی آ جائے گی"، ہم نے حیران ہو کر پوچھا، "کیا لاٹری نکلی ہے؟"
کہنے لگے "نہیں تقدیر کھلی ہے۔ اجی اصل مسئلہ تو ہلمٹ کے حصول کا تھا وہ حل ہو گیا تو سمجھو کہ موٹر سیکل اور اس کے لوازمات
اتنا کہہ کر معنی خیز انداز میں مسکرائے پھر کہنے لگے۔ "جیسے لڑکی، جہیز، جائداد وغیرہ۔ خود بخود آ جائیں گے۔ اس

رت انگیز انکشاف پر ہم حیران ہونے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ مرزا پھر شروع ہو گئے:

”آپ کے پاس موٹر سیکل ہو، نہ ہو، ہلمٹ ضرور ہونا چاہیئے۔ اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ ہم برجستہ کہا مرزا ”اس کیے“ یا ”ہلمٹ“ کے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہنے لگے ہلمٹ کی اس سے ایک بڑھیا مہ تو یہ ہے ـــ کہتے ہوئے ہلمٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ (ہم نے سمجھا خرگوش) نکالا اخبار کا تراشہ۔ لکھا تھا۔

عقد ثانی کے لیے ”لڑاکا“ چاہیئے۔ ایسے افراد جن کے پاس ذاتی ہلمٹ ہو (موٹر سیکل کی ضرورت نہیں) جہ ہوں۔ مرحوم کی موٹر سیکل اور بیوہ دونوں چالو حالت میں ہیں۔ (افواہ ہے کہ پہلے شوہر کا انتقال ہلمٹ سے عدم واقفیت کی بنا پر ہوا ہے) اس لیے ہلمٹ کو لازم قرار دیا گیا۔ اخبار کا تراشہ واپس کرتے ہوئے نے پوچھا کیا واقعی“ ٹالتے ہوئے کہنے لگے، یار دوسرے فائدے سنو:

”ہلمٹ حل المشکلات ہے۔ دافع بلیاتِ ارضی و سماوی ہے۔ سر کے درد کو آرام دیتا ہے۔ سفید بالوں چھپاتا ہے قانون کی حفاظت کرتا ہے۔ سر پر پہننا ضروری نہیں، ہاتھوں میں بھی پہنا جا سکتا ہے۔ غیر ٹریفک قانون سے بچاتا ہے مثلاً غلط جگہوں پر پارکنگ کرنا، یا بیچ راہ میں ٹھیر جانا وغیرہ۔“ تو ”انٹری“ ہو کہ شرعی تی ئی مضائقہ نہیں۔ سر کی حفاظت کی گیارنٹی،

... ہلمٹ سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ آدمی کا STATUES بڑھتا ہے۔ مفت میں لفٹ مل سکتی ہے، کسی قریب وغیرہ میں جاؤ تو V.I.P میں جگہ ملتی ہے؟

مرزا کی عقلمندی سے ہم کچھ مرعوب سے ہوئے۔ اگرچہ مرزا پیدا ہوتے ہی اپنی عقل فارن ہلمٹ سے ھانک چکے تھے بتھوڑی سی دلداری کی خاطر ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ پھر یہ موٹر سیکل۔ فوراً ٹوک دیا نے لگے، موٹر سیکل کی سرے سے ضرورت ہی نہیں دیکھتے نہیں ہلمٹ کی وجہ سے ”وہ“ لوگ مریخ تک پہنچ رہے یں اور پگڑی کی وجہ سے ”ہم“ ٹینک بنڈ پر بھٹک رہے ہیں۔ آج کل شہر میں موٹر سیکلیں کم اور ہلمٹ زیادہ نظر تی ہیں۔ جس کو دیکھو ہلمٹ لیے گھومتا نظر آتا ہے۔ کوئی سر پر جمائے ہوئے ہے تو کوئی بغل میں لٹکائے ہوئے ہے۔ کوئی والی بال بنانے کی کوشش میں ہے تو کوئی کشکول۔

پھر ذرا جذباتی ہو کر کہنے لگے کیا آپ کی نظر میں یہ سب بے وقوف ہیں۔ پھر خود ہی فرمانے لگے نہیں۔ یہ سب SUPERIOR کوالٹی کے لوگ ہیں آپ کی طرح بیوقوف نہیں جو ہلمٹ کے لیے موٹر سیکل بھی ضروری سمجھتے ہوں تھوڑی دیر توقف کیا۔ کہنے لگے۔ اس کٹھارا کو فوراً بیچ دو۔ اس ہاتھی کے بچے کو پالنے سے بہتر ہے کہ کسی غریب کو گود لے لو مثلاً ہمیں“ روانی میں کہہ گئے۔

ہم مرزا کی چال سمجھ گئے۔ سنبھل کر بولے مرزا ہماری نظر میں ایک معقول گاہک تم ہی ہو۔ تم ہی موٹر سیکل خرید لو مرزا بھی کب ہار ماننے والے تھے۔ فوراً کھڑے ہو گئے۔ اور بڑے اطمینان سے ”الٹی ہلمٹ“ آگے کر دی۔ ◎

اِن پڑھہ مجھونگیری (رپورٹ)

زندہ دلانِ حیدرآباد

۱۷ ویں کل ہند دو روزہ سالانہ تقاریب کا کامیاب انعقاد

انجمن زندہ دلانِ حیدرآباد' اردو ادب کی لطیف و مشکل صنف 'طنز و مزاح' کی زائد از بیس برسوں سے خدمت کرتی آرہی ہے اس انجمن نے گزشتہ بیس برس میں کبھی کل ہند تو کبھی ہندپاک پیمانے پر عظیم الشان مشاعروں ادبی اجلاس اور محفلِ لطیفہ گوئی کی کامیاب محفلیں منعقد کیں لیکن ۱۹۸۵ء میں زندہ دلانِ حیدرآباد نے شاندار "عالمی جشنِ مزاح" کا کامیاب انعقاد کرتے ہوئے طنز و مزاح کو بین الاقوامی سطح تک پہنچایا اور اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ اس مرتبہ ۱۷ ویں کل ہند دو روزہ سالانہ تقاریب (کل ہند ادبی اجلاس، محفلِ لطیفہ اور کل ہند مشاعرہ) ۷ اور ۸ نومبر ۱۹۸۶ء کو حیدرآباد میں شاندار پیمانے پر منعقد کی گئیں ان محفلوں کی مختصر رپورٹ قارئین "شگوفہ" کی خدمت میں پیش ہے۔

کل ہند ادبی اجلاس: شہرِ حیدرآباد کے قلب میں واقع نمائش کلب میں کل ہند ادبی اجلاس' (نثری مزاح نگاروں کی تقریب) سے ۱۷ ویں دو روزہ سالانہ تقاریب کا آغاز ہوا ۷ نومبر ۱۹۸۶ء ۷ بجے شام منعقد کی گئی اس اجلاس کی صدارت ملک کے نامور مزاح نگار جناب یوسف ناظم (بمبئی) نے فرمائی، جناب جی نارائن راؤ اسپیکر لیجسلیٹو اسمبلی آندھرا پردیش نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے محفل کو زینت بخشی' سب سے پہلے معتمد زندہ دلانِ حیدرآباد جناب مصطفیٰ علی بیگ اور کنوینر عابد معز نے مہمان و میزبان مزاح نگاروں اور شرکائے محفل کا خیر مقدم کیا اس کے بعد صدرِ محفل اور مہمانِ خصوصی کی گلپوشی کی گئی جناب جی نارائن راؤ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہنسنا فطرتِ انسانی ہے جو شخص دوسروں کے ساتھ خود اپنے حال و ماحول پر ہنس نہیں سکتا وہ حوصلے کی کمی اور اعلیٰ انسانی ذوق سے محروم ہوتا ہے طنز و مزاح محض ہنسی مذاق نہیں بلکہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے شعور اور ادراک کا فن ہے یہ خوشی کی بات ہے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنا کر طنز و مزاح کے عالمی ادب میں قیمتی اور لافانی اضافہ کر رہا ہے" انھوں نے کہا کہ "ایک حیدرآبادی کی حیثیت سے ان کی ابتدائی تعلیم اردو میں بھی ہوئی اس لیے وہ زندہ دلوں کے درمیان آکر مسرت و فخر محسوس کر رہے ہیں؟" جناب جی نارائن راؤ نے اپنی پُر لطف تقریر کے آخر میں ایوان اسمبلی کا ایک دلچسپ واقعہ سُنا کر محفل میں قہقہوں کا آغاز کیا کہ "ایوان میں ایک مرتبہ ایک رکن نے برہم ہو کر کہا تھا کہ "میں اسپیکر کو دیکھ لوں گا" اس پر میں نے بحیثیت اسپیکر برجستہ جواب دیا تھا کہ "ہم سب کو تو ہمیشہ خدا دیکھتا ہے لیکن بحیثیت اسپیکر میں آپ کو دیکھ لوں گا"۔ . . . قہقہے . . . اس یادگار محفل کے صدر جناب یوسف ناظم نے روایت کے خلاف بنا مو عز اور منظوم خطبہ صدارت سب سے پہلے پڑھا اور طنز و مزاح کے شگوفے چھوڑے انھوں نے کہا کہ

کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس ادبی اجلاس میں حسب روایت شگوفہ کے سوونیر کی خریدی کو داخلہ رکھا گیا تھا اور اس مرتبہ بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کا واحد ترجمان "شگوفہ" کا خوبصورت سوونیر شائع کیا گیا جس میں حصہ لینے والے ادیبوں اور شاعروں کی منتخب نگارشات کے علاوہ ان تقاریب کی تفصیلات بھی شامل تھیں۔

محفلِ لطیفہ: دوسرے دن یعنی ۸ ر نومبر ۱۹۸۶ء بروز شنبہ ۱۰/۲ بجے دن نمائش کلب کا [illegible] پھر ایکبار دعوتِ قہقہہ دی گئی کلب باذوق خواتین و حضرات سے بھر چکا تھا ٹھیک وقت پر صدرِ محفل جناب مجتبیٰ حسین جلوہ افروز ہوئے خوبصورتی سے سجائے گئے ڈائس پر صدرِ محفل کے علاوہ جناب دلیپ سنگھ (دہلی)، جناب یوسف ناظم (بمبئی)، جناب نریندر لوتھر، جناب فیاض احمد فیضی (بمبئی)، ڈاکٹر [illegible] (چاندہ)، جناب مصطفیٰ علی بیگ (معتمد زندہ دلانِ حیدرآباد) تشریف فرما تھے۔ کنوینر محفلِ لطیفہ افشاں جبین نے کارروائی چلائی اور ساتھ ساتھ برجستہ لطیفے بھی سناتی رہیں صدرِ محفل جناب مجتبیٰ حسین کے لطیفے بہت پسند کئے گئے مہمانِ خصوصی جناب دلیپ سنگھ نے اپنے ذاتی تجربات کو دلچسپ لطیفوں کی شکل میں پیش کر کے سارے ہال کو قہقہہ زار بنا دیا جناب فیاض احمد فیضی نے بھی اچھے لطیفے سنائے۔ حیدرآباد کے بزرگ لطیفہ گو جناب بالا پرشاد گوڑ نے "مجموعہ تماشہ" اور "شارٹ ہینڈ" کے علاوہ دوسرے عنوانات کے تحت لطیفے پیش کئے جناب مصطفیٰ علی بیگ نے اپنے مخصوص انداز میں لطیفے پیش کر کے خوب داد حاصل کی۔ جناب محمد حمایت اللہ نے بھی اپنے لطیفوں سے سامعین کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ مشہور صحافی جناب ذہانت علی بیگ نے حیدرآبادی تہذیب و روایات کی مٹتی ہوئی قدروں پر طنز آمیز لطیفے سنائے ان کے علاوہ جناب نریندر لوتھر نے زبردست داد و تحسین حاصل کی۔ جناب حفیظ خاں مذاق نے "جدید شاعری" پر دلچسپ خاکہ پیش کیا اس کے علاوہ جن لوگوں نے اس میں حصہ لیکر قہقہوں کو لوٹا ان میں جناب رشید قریشی، جناب طالب خوندمیری، جناب عرفان خوندمیری، جناب ہیرا پرشاد، جناب اظہر افسر، جناب احمد جلیس، جناب دولت رام، جناب کلیم صدیقی، ڈاکٹر بیگ احساس، جناب ملک معراج شامل ہیں تقریباً تین گھنٹوں تک نمائش کلب قہقہوں سے گونجتا رہا۔ سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ معتمد جناب مصطفیٰ علی بیگ کے شکریہ پر اس محفلِ قہقہہ کا اختتام عمل میں آیا۔

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ: ۸ ر نومبر ۱۹۸۶ء کی شب نمائش میدان میں عظیم الشان پیمانے پر کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا وقت سے پہلے ہی سارا میدان تشنگانِ شعر و ادب سے پُر ہو چکا تھا کچھ ہی دیر میں میدان اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کر رہا تھا اس مرتبہ حیدرآباد کے نامور مصور جناب عارف [illegible] کی امداد کے لیے ۲۵ روپیہ والی پچاس کرسیوں کی آمدنی مختص کی گئی تھی اسٹیج پر شعرائے کرام کی آمد کے ساتھ ہی دوردرشن والوں نے کیمرہ سنبھال لیا اور ساتھ ہی کنوینر مشاعرہ جناب احمد سلطان نے مہمانِ خصوصی جناب [illegible] چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش اور صدرِ مشاعرہ جناب نریندر لوتھر کو ڈائس پر [illegible] دونوں حضرات کی گلپوشی کی گئی جناب نریندر لوتھر نے اپنی مختصر تقریر میں مہمانِ خصوصی، مہمان و بیرونی شعرائے کرام اور تمام سامعین کا خیر مقدم کیا پھر زندہ دلانِ حیدرآباد کی [illegible] پر روشنی ڈالی۔ مہمانِ خصوصی نے مخاطب کرتے ہوئے زندہ دلانِ حیدرآباد کی ادبی سرگرمیوں کی ستائش کی اور مسرت کا اظہار کیا اس کے بعد زندہ دلانِ حیدرآباد کی نئی مطبوعات "الف تماشہ" (مصنف [illegible]) [illegible]

کی رسم اجراء کا خوشگوار فریضہ جناب شراون کمار چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش نے انجام دیا تمام رسومات کی تکمیل کے بعد اب مشاعرہ شروع ہوا جن شعراء کرام نے اس مشاعرے میں اپنا کلام سنایا اس کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ مشاعرے کی کاروائی پہلے جناب احمد سلطان نے پھر بعد میں جناب مصطفےٰ علی بیگ اور جناب طالب خوندمیری نے مشترکہ طور پر نہایت خوبصورتی سے چلائی مشاعرے کے اوپننگ بیٹسمین جناب سرپٹ حیدرآبادی تھے ۔

سرپٹ حیدرآبادی :-

میں بے فضول تھا جچھ بنا دیا دل نے — مجھے حسینوں پہ مرنا سکھا دیا دل نے
مری نگاہ میں میرا کوئی مقام نہ تھا — مری نگاہ پہ مجھ کو چڑھا دیا دل نے

اقبال ہاشمی :-

باپ بھی جُواری ہے بیٹا بھی جُواری ہے — گھر میں اک جواں لڑکی خیر سے کنواری ہے
نقل جانے کس کس کی آپ نے اتاری ہے — آپ کی حکومت ہے یا مزاح کاری ہے

رؤف رحیم :-

سودا یہ شاعری کا ہمارے جو سر میں ہے — ہنگامہ محفلوں میں ہے افلاس گھر میں ہے
انگریزی پڑھ رہے ہیں امیروں کے لاڈلے — اردو بیچاری صرف غریبوں کے گھر میں ہے

معین امر بمبو :-

ہو چکنگ کتنی بھی مشکل چال چل جاتے ہیں لوگ — روڈ پر پولیس کی نظروں سے پھسل جاتے ہیں لوگ
لازمی ہلمٹ ہوئی ہے جب سے بمبو کیا کریں — چکنی ہنڈی پہ ظفر کر کے نکل جاتے ہیں لوگ

جاہل سلطانپوری :-

اُن کے کوچے میں جو پہچانے گئے — مار کھائی مفت میں ہٹائے گئے
شمع تک پہنچے نہ تھے جاہل ابھی — چھپکلی کے منہ میں پروانے گئے
کسی دفتر میں بابو بننے کے قابل نہیں ہیں ہم — مگر اس دورِ آزادی میں لیڈر ہو تو سکتے ہیں
پڑھی ہے جب سے فہرستِ وزارت ایک صوبے کی — بہت خوش ہیں کہ جاہل بھی منسٹر ہو تو سکتے ہیں

ان پڑھ سوبگیری :-

بیگم میں کروں تیری شکایت تو کہاں سے — کوئی بھی مری بات ہو چلنے نہیں دیتی
چُٹلہ تو لگا لیتی ہو خود بالوں میں لیکن — کیا بات ہے داڑھی مجھے رکھنے نہیں دیتی

مصطفےٰ علی بیگ :

کتنی نیوس رُلا گیا پانی — سب کو آنسو پلا گیا پانی !
میرے پیاسے امام کے صدقے — اہمیت کتنی پا گیا پانی !
خون پی پی کے پیاسی پبلک کا — منہ پہ لیڈر کے آ گیا پانی !
عاشقوں کا ہجوم ہے نل پہ — دل کی دنیا لبھا گیا پانی !

بلین نظام آبادی :-

بیگم سے سرور پہلی ملاقات میں رہا — پچھتاوا اُس کے بعد ہر اک بات میں رہا
ہوتی ہے کچھ تو کم کسی قاتل کی بھی سزا — میں عمر بھر تمہاری حوالات میں رہا

عتاد یوسفی :-

ایک لیڈر پاؤں سے معذور تھا کہنے لگا — دیش کی خاطر بڑی قربانیاں میں نے دیں
سن کے اس کی بات کو اک منچلا کہنے لگا — لنگڑے بکروں کی مگر قربانیاں جائز نہیں

پرلت ترلی :-

ایک دن کمپونڈر سے ڈاکٹر نے یوں کہا — کھڑکیاں میں مارتا ہوں اندر تو ہے اور کھلا
موٹر کے جھٹکے تو چن کر لا سڑک پر پیک کے — کوئی قاتل گر پڑے گا زخمی ہوگا [illegible]

رحمت گورکھپوری :-

شاخ آ ہو کی روایات بتنا سیکھو — تیغ پانی کی طرح تم بھی تو بہنا سیکھو
اس ریا کاری [illegible] بچنا ہے اگر — تب تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا سیکھو

کوئی وعدہ بھی تم سے آج تک نہ ہوسکا پورا — عجب کیا ہے اگر اپنی زباں سے پھر گیا پانی!
جہاں تم ہو وہاں تالاب بارش میں بھی سوکھا ہے — شرم سے اپنی نیل سے بھی نیچے گر گیا پانی!

یہ بیٹھے بیٹھے آخر اپنا میک اپ کیوں بدلتے ہو — یہ ناٹک چھوڑ دو اب سر سے اوپر ہو گیا پانی!
ذرا یہ بھی تو دیکھو اب کہ تم ہو کتنے پانی میں — جو میک اپ تمہارا یا کاری کا سارا دھو گیا پانی!

تمہارے داغ میں پانی بھی اب پانی نہ مانگے گا — نہ جانے کس کی نیکی تھی جو تھوڑا آ گیا پانی!
یہ آخر کیوں تمہاری اور پانی کی نہیں بنتی — تمہارے سائے سے بھی دیکھ لو کترا گیا پانی!

اس محفل قہقہہ میں جناب اسمٰعیل آذر (کنک) اڈیٹر اور جناب صبغت اللہ بمباٹ نے بھی حصہ لیا۔ کنوینر جناب احمد سلطان نے شکریہ ادا کیا۔

□□

محمد بدیع الزماں (پٹنہ)

"مجھے ناشاد رہنے دو"

شاد عظیم آبادی، شاد ملیح آبادی، نریش کمار شاد اور شاد عارفی نے اگر اپنی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعات سے ہمیں شاد کیا تو بجا۔ این سین ناشاد دہلوی نے بھی ناشاد ہوتے ہوئے صرف یہی نہیں کہ اپنے طنزیہ اور مزاحیہ کلام سے ہمیں شاد کیا بلکہ طنز و مزاح کے باب میں ایک گرانقدر اضافہ بھی کیا۔ اردو کے نثری ادب میں طنز و مزاح نگاروں کی بہت ہی مختصر فہرست ہے مگر اس سے بھی مختصر طنزیہ اور مزاحیہ شعراء کی ہے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان ہی چند شعراء میں ناشاد بھی آسمانِ ادب پر درخشندہ ستارہ کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔

ناشاد کے طنز و مزاح کا سب سے نمایاں جوہر اس کی لطافت ہے۔ زمانہ کی رفتار ہی نے ناشاد کو طنز کا راستہ سجھایا۔ جب وہ زمانہ کے اخلاقی، معاشی، مذہبی، اور سیاسی زندگیوں کے مخالف پہلوؤں پر طنز کرتے ہیں تو ان کی ان پر گہری نظر رہتی ہے اور وہ ساتھ ساتھ اپنے قارئین یا سامعین کو پرانی اور نئی قدروں کا احساس بھی دلاتے چلتے ہیں اس لیے کہ ان کے طنز میں اصلاح کا مخلص جذبہ کار فرما رہتا ہے۔ ناشاد کے طنز کی تاثیر آج کے لیے بھی ہے اور آنے والے کل کے لیے بھی۔

ناشاد کے لیے غالب کی طرح، شاعری ذریعہ عزت نہیں بلکہ اپنی تجارت اور اسی سلسلہ میں دنیا کی سیر و سیاحت سے وقت نکال کر وہ شاعری کا شغل بھی کرتے رہے۔ بقول دیش دہلوی:

ناشاد صاحب جس وقت شاعر نہیں ہوتے اس وقت ایک کامیاب تاجر ہوتے ہیں اور انگریزی زبان کا ادیب۔ جوتی ناشاد نے انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، رابندر ناتھ ٹیگور، فرانسس بیکن، نپولین، شیکسپیر اور علامہ اقبال پر ضخیم کتابیں الگ الگ لکھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مادیت کی اس دنیا اور پیشہ میں لگے رہنے پر بھی ان کا جھکاؤ روحانیت کی طرف قوی ہے کیونکہ وہ انگریزی زبان میں مہا اپدیش، چانکیہ، گوتم بدھ، رامائن، مہابھارت، شیخ سعدی کا (اخلاقیات)، سقراط اور افلاطون پر بھی الگ الگ کتابوں کے مصنف ہیں۔

ناشاد کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا مجموعہ موسوم بہ "کلام بے لگام" ۱۹۶۳ء میں مکتبہ بک ڈپو۔ دہلی نے شائع کیا۔ ناشاد نے اس مجموعہ کو اپنے محترم بزرگ ڈاکٹر سر شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کے نام نامی سے منسوب کیا اور ان کے نام منسوب کیے جانے کی وجہ ناشاد نے یہ بتائی ہے کہ:

پی لی بیگم کا بیچ کر برقعہ — شرم تم کو مگر نہیں آتی
کس ادا سے وہ پوچھتے ہیں کہ اب — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
پہلے آتی تھی خود بخود ہر روز — اب کسی بات پر نہیں آتی

غالب کا ایک مشہور شعر ہے — ["نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"]

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اب ناشاد کو دیکھئے کس کس سے کرم کے طالب ہیں :-

حسینوں کو بس اِک نظر دیکھتے ہیں — رقیبوں کو ہم بے خطر دیکھتے ہیں
کما کر جو کھائیں وہ شاعر نکمے — فقط خواب میں سیم و زر دیکھتے ہیں
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں — [تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں]

غالب کو تو عشق نے نکما کر دیا ـ

عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ناشاد کو کس نے نکما کر دیا اُن ہی سے سُنئے جو شاید ان کے دل کی آواز ہو :-

کام کرنے کی تمنا دل میں ہے — ہم تو عاشق ہی نہیں آرام کے
کانگریس نے اب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے — ("ریفیوجی کی پکار")

غالب کے اشعار پر ناشاد کی چند اور دلچسپ تضمینیں پیش ہیں :-

غالب : کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
ناشاد : اچھوں کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے — اچھوں کے کبھی دل کو دکھایا نہیں کرتے — ("اچھا نہیں کرتے")

ناشاد کی غالب سے خط و کتابت بھی ہوتی رہی چنانچہ غالب کا ایک خط اور اُس کا جواب سُنئے :-

غالب نے خط لکھا مجھے جنت سے ایک دن
آؤ گے کب یہاں تمہیں شاعر بناؤں گا
شطرنج کا ہو شوق تو وہ بھی سکھاؤں گا
مے سے غرض نشاط ہو وہ بھی پلاؤں گا

میں نے لکھا جواب کہ رہنے دیں دہر میں
تضمین کر کے آپ کی غزلیں سناؤں گا
جنت کی آرزو ہے نہ شطرنج و مے کا شوق
باغِ ادب کو میں یہیں جنت بناؤں گا ("غالب سے خط و کتابت")

ناشاد نے چونکہ اکبر الٰہ آبادی سے بھی چند جام پیئے اس لیے اب قائلِ اکبر کے رنگ میں ناشاد کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن میں طنز کی وہی تیزی اور مزاح کی وہی لطافت ہے جو اکبر کے یہاں ملتی ہے۔ ناشاد نے اکبر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے :-

ناشاد: پڑھ کے وہ نظم مری دل میں تو حیراں ہو گئے　　دیکھ کر شکل مری خوب پریشاں ہو گئے
بے رخی میں تو کٹی اُن کی جوانی ساری　　آخری عمر میں کیا خاک وہ مہماں ہو گئے　　(آخری عمر)

مومن: خدا کی بے نیازی آہ مومن　　ہم ایماں لائے تھے جو بتاں سے
ناشاد: کتنے خوش پھرتے ہیں وہ گھر میں جو داماد آیا　　لوٹنے دھن کے لیے جیسے کہ صیاد آیا
بیوی کو ڈانٹتا ہے دھن سے اڑاتا ہے عیش　　جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا　　(جب دیا)

میر: ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
لیڈری کا شوق جب مجھ کو ہوا　　قرض لے کر اک الیکشن لڑ گیا
پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں قرض خواہ　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟　　(لیڈری کا شوق)

داغ: نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو　　کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے
ناشاد: وہ کل کہہ گئی مجھ سے یہ جاتے جاتے　　کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے　　(مس صاحب کا ناچ)

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

راہِ راست برو گرچہ دور است　　زنِ بیوہ مکن گرچہ حور است

تو "راہِ راست" اور "زنِ بیوہ" پر ناشاد کو سنئے ؎

کوئی دوشیزہ رہِ راست تو ملتی ہی نہیں　　زنِ بیوہ جو ملے اُس سے نکاح اب کر لیں　　(زنِ بیوہ مکن)

اور آخر میں اردو کا ایک اور مشہور شعر ؎

چند تصویرِ بتاں، کچھ حسینوں کے خطوط　　بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ناشاد کے گھر سے کیا نکلا اُن ہی سے سنئے:

کچھ عدالت کے سمن، جھوٹے گواہوں کے بیاں　　آئی قرقی تو میرے گھر سے یہ ساماں نکلا
سنگِ مرمر پہ میں مرتا رہا ساری عمر　　بعد مرنے کے مرے دل سے یہ ارماں نکلا
دن کو جو وعظ میں مصروف رہا کرتا تھا　　شب کو مسجد میں جو دیکھا تو وہ حیواں نکلا
رات کو حسن کی محفل میں وہ جنت کا فریب　　دن کو اس گھر میں جو پہنچا تو وہ ویراں نکلا　　(زندگی بھر کا حساب)

جتنی زندگیاں خدا نے بلی کو بخشی ہیں اُس سے کہیں زیادہ بار اردو شعراء کو بخشی گئی ہیں۔ "الیوریڈی" بیٹری کا سے بلی کی نو زندگیوں کا پتہ چلتا ہے اور اردو شعراء کے دیوان سے اُن کے روز مر مر کے جینے کا۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو یہ کہتا کہ یہیں ہر روز زندہ ہو جانے کے لیے کسی شاعر کی روح بل جاتی ہے۔ اردو شعراء کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ زیادہ تر اپنا مرثیہ خود لکھ جاتے ہیں۔ دوسروں کو اس کی مہلت بعد میں نہیں دیتے۔ ناشاد بھی تو اردو ہی کے شاعر ٹھہرے۔ لکھنے کو تو اپنا مرثیہ لکھ دیا مگر جب یار دوستوں نے مذاق اڑایا تو ناشاد نے جواباً عرض کیا:

محروم اور سحر و منور نے یہ کہا　　لکھا جو اپنا مرثیہ کیا یہ بھلا دیکھا؟
مرنے کے بعد شعر بھی کہتا ہے کیا کوئی؟　　کی عرض یہ تو میرا اک لطفِ غیب تھا
(مرثیہ کے بعد)